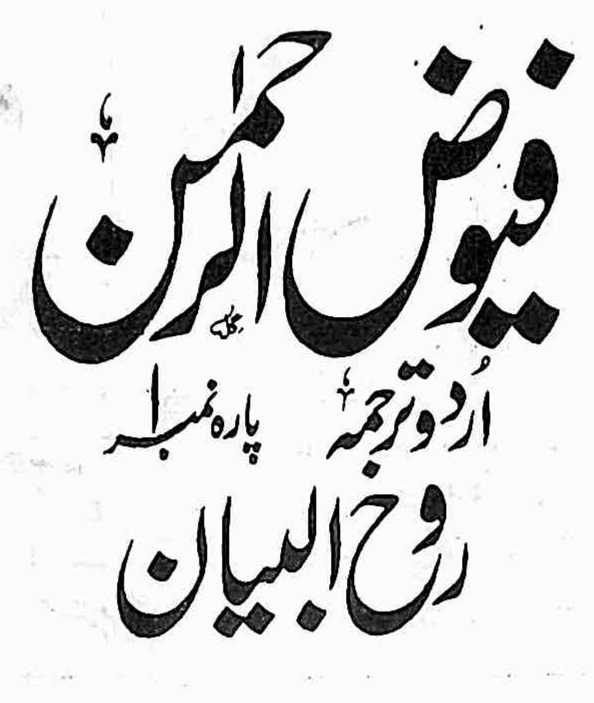


مصنف

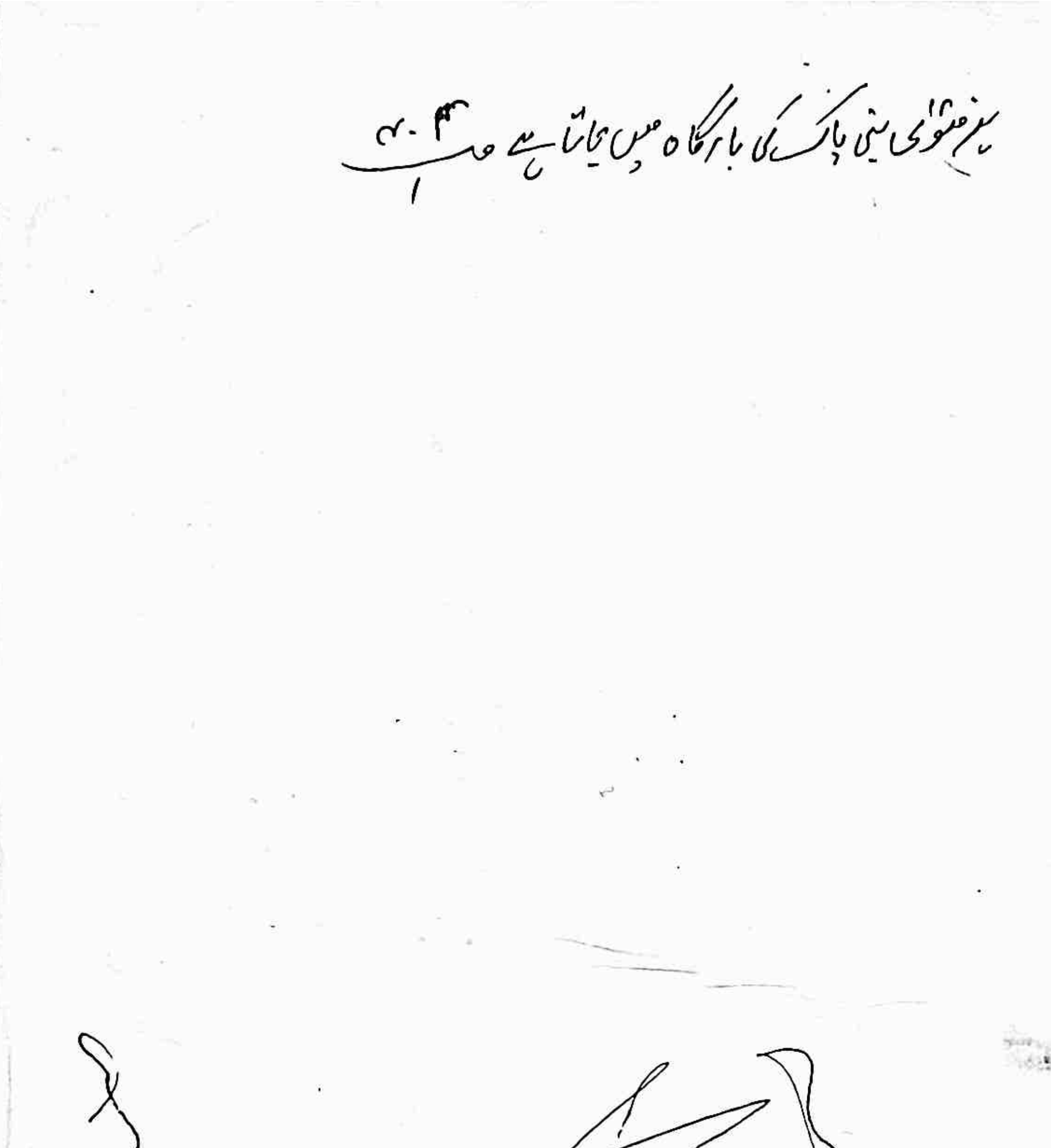
سراج العلماء زبدۃ الفضلاء
حضرت علامہ شیخ اسماعیل حقی رحمہ اللہ تعالیٰ

مترجم

شیخ التفسیر والحدیث مولانا ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی مدظلہ

ناشر

مکتبہ اویسیہ رضویہ سیرانی روڈ بہاولپور



یہ مثنوی پنی پاک کی بارگاہ میں جاتا ہے

① اسلام دشمنی کیسی – 410

② نالوطا کے دروازے بند نہیں = 333

علماء کا نبی سے اسوہ الکمال = $\frac{7}{2}$

امام غزالی اور ان کا تبصرہ = $\frac{7}{2}$

والدین سے سوال = $\frac{453}{1}$

مسجد امیہ کی حدیث جبریل کا کوڑ = $\frac{218}{2}$ $\frac{481}{1}$

علامہ اسماعیل

قیامت قائم نہ ہو جب تک ایک آدمی بھی زندہ رہے = $\frac{57}{2}$

عجیب الخلقت فرشتہ ہزار سر = $\frac{110}{2}$

آدم و نوح کے درمیان 20 قرون = $\frac{189}{2}$

ابوہریرہ کو وصیت نیکیوں کے ساتھ دیں = $\frac{315}{2}$

ویل نامی جہنم = $\frac{373}{1}$

علم کو چھپانا = $\frac{458}{1}$

جہنم کی لگام = $\frac{468}{1}$

اسلام میں نیا طریقہ = $\frac{469}{1}$

یونس کی مچھلی = $\frac{348}{1}$

والدین نبی اکرم $\frac{484}{1}$

تین لوگوں کو دینے = 293

Molana Muhammad
Abbas Nazami

نام کتاب ———— فیوض الرحمٰن اردو ترجمہ روح البیان پارہ نمبر ۱
مصنّف ———— حضرت علاّمہ اسماعیل حقّی قدس سرّہٗ
مترجم ———— حضرت علاّمہ محمد فیض احمد اویسی رضوی مدظلہٗ
کاتب ———— محمد شریف گل
سنِ طباعت ———— جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ / مارچ ۱۹۸۵ء
مصحح ———— چوہدری مشتاق محمد خاں لاہور
ناشر ———— مکتبہ اویسیہ رضویہ، ملتان روڈ، بہاولپور
باھتمام ———— صاحبزادہ عطاء الرسول اویسی

انتساب

من بندۂ فقیر یہ ہدیۂ حقیر عالی جناب سیّد الثقلین نبی الحرمین امام القبلتین وسیلتنا فی الدارین رحمۃ للعٰلمین راحۃ العاشقین مراد المشتاقین سید الانبیاء والمرسلین سیّدنا و مولانا وشفیعنا یوم الجزاء حضور پُر نور

مُحمّد مُصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے نام سے معنون کرکے اس بارگاہِ بیکس پناہ کو خداوند قدوس کا واسطہ دے کر اس ناچیز ہدیے کی قبولیت کی التجا کرتا ہوں۔

برگ سبز است ہدیۂ درویش

ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی غفرلہٗ

۱۹ صفر ۱۹۸۳ء / ۱۱ جولائی ۱۹۶۳ء

بروز جمعرات

قمر عباس تبسم نوری
27.9.99

نہیں لیا گیا۔ اگرچہ پہلے اس نام کی نذر مانی گئی ہے۔ (تفسیرات احمدیہ پ ۲ ص ۲۹)

معلوم ہوا کہ صاحب "تفسیر احمدی" وغیرہ مفسرین و محققین کی وہی تحقیق ہے جیسے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ نے کنز الایمان میں نقل کیا ہے نیز نذر و نیاز کا سلسلہ پہلے سے مسلمانوں میں جاری ہے۔ مزید تحقیق و تفصیل فقیر کی تفسیر اویسیہ اور کتاب "فیصلہ حق و باطل" میں ہے۔

ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی غفرلہٗ

پارہ اوّل کی تفسیر کا ترجمہ بہ شب بدھ بتاریخ ۱۶ محرم ۱۳۸۲ھ دس بج کر پچیس منٹ پر ختم ہوا

مطالعہ گاہ مدرسہ منبع الفیوض حامد آباد

فہرست مضامین پارہ ۱

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم   نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

تعارفِ مترجم

از الحاج چودھری مشتاق محمد خاں - ۹ ہربھجن داس سٹریٹ، بیرون موری گیٹ - لاہور

خدا کے فضل و کرم سے آج بھی بہت سے علماء اور مشایخ تبلیغِ اسلام میں سرگرم ہیں - بعض نے تو اپنے روز و شب محض اسی مقصد کے لیے وقف کر رکھے ہیں - ان کا مقصدِ حیات صرف اور صرف اسلام کی تبلیغ اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقدیس بیان کرنا ہے - وہ نورِ رسالت سے شمعِ اسلام کے نور میں اضافہ فرما رہے ہیں - انہی بزرگوں میں عالمِ اہلسنّت مفتیِ شریعت حضرت علامہ الحاج حافظ ابوالصالح محمد فیض احمد اویسی رضوی مدظلہ شیخ الحدیث جامعہ اویسیہ رضویہ ملتان روڈ بہاولپور کی ذاتِ بابرکات کا شمار ہوتا ہے -

ولادت

علم و عرفان کا یہ پیکر، فاضل نبیل، صاحبِ تصانیفِ کثیرہ ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء میں حامد آباد ضلع رحیم یار خاں کے مقام پر پیدا ہوا - آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ تھا -

حلیہ

یہ مردِ درویش نہایت ہی سادہ، موزوں قامت، اکہرا جسم، موٹی پُرکیف آنکھیں، سر پر سفید رنگ کی دستار، سفید تہبند، ٹخنوں تک نیچا کرتہ، دیسی جُوتا، سفید و سیاہ ریش بزرگی کی علامت، طبیعت میں انکسار و تواضع، سرتا پا ایثار و محبت، درس و تدریس مشغلہ اور تصنیف و تالیف اوڑھنا بچھونا ہے - مسلکِ اہلسنت کا داعی و علمبردار ہے -

تعلیم

جب آپ چار پانچ سال کے ہوئے تو آپ کے والدِ محترم نے خود قرآن مجید ناظرہ شروع کرایا - یُوں آپ کی ابتدائی تعلیم گھر سے شروع ہوئی - ابتدائی تربیت کے بعد ۱۹۴۳ء میں والد ماجد کی ہدایت اور خواہش کے مطابق حافظ جان محمد صاحب قریہ کنلاں کے پاس حفظِ قرآن پاک کے لیے حاضری دی - ڈیڑھ سال کے عرصہ میں آٹھ پارے حفظ کر لیے - اس کے بعد حضرت مولانا حافظ سراج احمد صاحب اور حافظ غلام یٰسین صاحب سے مکمل قرآن کریم حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی - پاکستان کے معرضِ وجود (اگست ۱۹۴۷ء) میں آنے پر آپ نے پہلی محراب سنائی - ستمبر ۱۹۴۷ء میں پندنامہ سعدیؒ سے فارسی کا آغاز کیا اور حکیم مولانا اللہ بخش سے تعلیم حاصل کی - علوم عربیہ کی کتبِ متداولہ حضرت مولانا الحاج خورشید احمد سے پڑھنے کے بعد جامعہ رضویہ مظہر الاسلام فیصل آباد

(سابقہ لائلپور) میں حضرت مولانا سردار احمد سے درسِ حدیث کے لیے حاضری دی۔ حضرت مولانائے موصوف کے ہاتھوں سے رسمِ دستار بندی ہوئی اور انھیں سے سندِ فراغت حاصل کی۔

اثنائے تعلیم میں بسلسلہ سلوک روحانی قادریہ اویسیہ سلسلہ کے سرچشمہ حضرت خواجہ محکم الدین صاحب سیرانی رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین الحاج خواجہ محمد الدین صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ ۱۳۸۱ھ میں ان کے وصال کے بعد شیخ الاسلام مقتدائے اہلسنت حضرت مولانا الحاج شاہ مصطفیٰ رضا سجادہ نشین آستانہ عالیہ رضویہ بریلی شریف و مفتیِ اعظم ہند حضرت مولانا مصطفیٰ رضا خاں صاحب بریلوی جگر گوشۂ امامِ اہلسنت مجددِ دین وملت شاہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی قدس سرہٗ سے بیعت کی درخواست کی جو انھوں نے قبول فرمالی اور آپ کو سلسلۂ قادریہ میں سندِ مجاز مرحمت فرمائی۔

اسمائے گرامی اساتذہ کرام

حضرت مولانائے موصوف نے حصولِ علم کے لیے مندرجہ ذیل اساتذہ کرام سے رجوع کیا:

استاد پرائمری: (۱) مولانا خیر محمد صاحب (۲) مولانا کریم بخش صاحب (۳) مولانا اللہ بخش صاحب

ناظرہ وحفظ قرآن: (۱) والد ماجد حضرت مولانا نور احمد صاحب (۲) حافظ جان محمد صاحب (۳) مولانا حافظ سراج احمد صاحب (۴) مولوی حافظ غلام یٰسین صاحب۔

علومِ فارسی وعربی: (۱) مولانا اللہ بخش صاحب (۲) مولانا عبد الکریم صاحب (۳) مولانا خورشید احمد صاحب (۴) مولانا سراج احمد صاحب مکھن بیلوی (۵) حضرت مولانا علامہ سردار احمد صاحب محدثِ پاکستان۔

تبلیغِ دین

تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے آبائی گاؤں حامد آباد میں ایک تبلیغی ادارہ "مدرسہ عربیہ منبع الفیوض اویسیہ رضویہ" قایم کیا، وہاں تقریباً ۱۵ سال تک علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔ چونکہ حامد آباد ایک معمولی سا گاؤں ہے اور آمد و رفت کا معقول انتظام نہیں ہے اس لیے سکونت ترک کر کے ۱۹۶۳ء میں بہاولپور منتقل ہو گئے۔

بہاولپور اس وقت بدعقیدہ لوگوں کی گرفت میں تھا اور اس مردِ حق شناس نے جونہی مسلکِ اہلسنت کی شمع روشن کی اس پر مشکلات کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کی پُرخلوص محنتیں بار آور ثابت ہوئیں اور ۱۹۶۷ء میں آپ نے ملتان روڈ پر زمین حاصل کر کے سیرانی مسجد اور جامعہ اویسیہ رضویہ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ راقم ان دنوں بسلسلۂ ملازمت بہاولپور میں مقیم تھا اور اویسی صاحب کے درسِ قرآن سے کئی بار مستفید ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ ان دنوں سے خواہش رہی کہ کبھی ان کے قدموں میں بیٹھ کر خدمتِ دین کا موقع ملے۔ آخر ایک مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ تمنا کسی حد تک پوری فرمادی۔

آج جامعہ اویسیہ کو مسلک اہل سنت کے مرکزی ادارہ کی حیثیت حاصل ہے جہاں آپ کا فیضِ درس جاری ہے اور

آپ کی روشن کردہ شمع کے پروانوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہورہا ہے۔ اشاعتِ دین کے علاوہ حضرت اویسی صاحب ہرسال رمضان المبارک میں اطراف واکناف سے آنے والے طلبہ کو قرآن پاک کی تفسیر بھی پڑھاتے ہیں آپ کی سالہا سال کی مسلسل محنت سے ہزاروں فضلاء، علماء اور حفاظ پیدا ہوئے جن کی فہرست بہت طویل ہے اور شمار سے باہر ہے۔ نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی آپ کے تلامذہ ملکی و ملّی اور دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ چند مشاہیر کے اسماءِ گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا حافظ عبدالمجید اویسی الٰہ آباد
۲۔ مولانا مفتی مختار احمد درانی خانپوری
۳۔ مولانا حافظ عبدالستار گھوٹکی
۴۔ مولانا قاری عبدالرحمٰن ٹھٹھہ (سندھ)
۵۔ مولانا سید محمد یوسف سرحد
۶۔ مولانا محمد ریاض احمد امریکہ
۷۔ مولانا حافظ عبدالواحد مدینہ طیبہ
۸۔ مولانا عبدالرحمٰن سندھی مدینہ طیبہ
۹۔ مولانا عزیز اللہ لاڑکانہ
۱۰۔ مولانا مفتی غلام مصطفٰی ملتان
۱۱۔ مولانا غلام محمد کوئٹہ
۱۲۔ مولانا محمد وارث خضدار بلوچستان
۱۳ مولانا محمد جمیل الرحمٰن سعودی عرب
۱۴ مولانا قاری منظور احمد سعودی عرب
۱۵۔ مولانا سید معظم الدین میاں والی
۱۶۔ مولانا محمد قاسم کوئٹہ
۱۷۔ مولانا محمد فاروق القادری کراچی
۱۸۔ مولانا محمد فاروق احمد قادری گڑھی اختیار خاں
۱۹۔ مولانا صاحبزادہ محمد اسمٰعیل نقشبندی سرگودھا
۲۰۔ مولانا مفتی غلام سرور لاہور
۲۱۔ مولانا مقصود احمد لاہور
۲۲۔ مولانا قاری محمود الحسن کولمبو سراندیپ
۲۳۔ مولانا محمد احمد امریکہ
۲۴ مولانا مفتی محمد اشرف گجرات
۲۵۔ صاحبزادہ مولانا علی احمد مانگٹ
۲۶۔ مولانا قاری محمد طیب لاہور
۲۷۔ مولانا جمال الدین کوئٹہ وغیرہ۔[1]
۲۸۔ مولانا منیر الزماں۔ ابوظہبی

یہ عاشقِ رسول عقاید کے معاملہ میں بہت متصلب واقع ہوئے ہیں اور اہانتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کرنے والوں سے کسی قسم کی رُو رعایت کے قائل نہیں ہیں۔ آپ گستاخانِ رسول کے علاوہ سب کے لیے محبت و ایثار کا مجسمہ ہیں۔ آپ کے ہاں ہروقت مسلک تصوف کی محفلیں برپا رہتی ہیں۔

سلسلۂ تصانیف

آپ جہاں ایک فاضل مدرس ہیں وہاں تحریر میں بھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ اب تک ایک ہزار کے لگ بھگ

---

[1] ان میں بعض وہ حضرات ہیں جو آپ کے زمانہ طالبعلمی کے شاگرد ہیں اور بعض ہیں جنھوں نے آپ سے چند اسباق پڑھے اور وہ ہیں جو مستقل شاگرد رہے۔

کتب و رسائل کی تصنیف فرما چکے ہیں۔ ابھی آپ طفلِ مکتب تھے کہ ایک کتاب "انگوٹھے چومنے کا بیان" تالیف فرمائی چند دیگر تصنیفات و تالیفات درج ذیل ہیں :

۱ - فیوض الرحمٰن اردو ترجمہ تفسیر روح البیان
۲ - نعم الجامی شرح شرح جامی ۸ جلدیں
۳ - فتاویٰ اویسیہ ۸ جلدیں
۴ - صدائے نوی شرح مثنوی ۲ جلدیں
۵ - شرح شرح مائتہ عامل
۶ - شہد سے میٹھا نامِ محمد
۷ - آئینہ شیعہ نما
۸ - چشمۂ نور افزا

تفسیر روح البیان کا اردو ترجمہ "فیوض الرحمٰن" کر کے حضرت مولانا اویسی صاحب نے دینِ اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دُعا گو ہوں کہ ان کو خدمتِ دین کے لیے عمر دراز عطا فرمائے ؎

ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

خدا تعالیٰ ان کی اس کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین ثم آمین

اولاد

بفضلہٖ تعالیٰ اویسی صاحب کے چار صاحبزادے ہیں : (۱) حافظ محمد صالح (۲) حافظ محمد عطاء الرسول (۳) حافظ محمد فیاض (۴) حافظ محمد ریاض ۔ اور ایک صاحبزادی کنیز فاطمہ نامی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان سب کو اپنے والد مکرم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

○



وجہِ تالیف تفسیر رُوح البیان

از حضرت مولانا علامہ اسمٰعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ

الحمد للہ الذی اظھر من نسخۃ حقایقۃ الذاتیۃ الکمالیۃ نقوش العوالم والاعلام واخرج من نون الجمع الفاقی انواع الحروف والکلمات والکلام انزل من مقام الجمع والتریہ قرآناً عربیاً غیر ذی عوج وجعلہ معجزۃ باقیۃ علیٰ وجہ کل زمان ساطعۃ البراھین والحجج والصلوٰۃ والسلام علی من ھو فاتح باب الحضرۃ فی العلم والعین والیقین سیدنا محمد الذی کان نبیاً وآدم بین الماء والطین وعلیٰ آلہ واصحابہ المتخلقین بخلق القرآن ومن تبعھم باحسان الیٰ آخر الزمان۔

حمد و درود کے بعد عرض پرداز ہے بندۂ فقیر حضرت ذبیح اللہ علیہ السلام کا ہم نام اسمٰعیل حقی واعظ مہاجر (رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ انھیں صبح و شام اور دوپہر کے فتنوں سے محفوظ رکھے) ۔جب میرے شیخ امام علامہ اور میرے استاد جو بڑے عالم اور فہیم اور اپنے وقت کے سلطان اور اپنے زمانہ میں بے نظیر ہیں اور وہ علم و عرفان کی وجہ سے مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کی حجت اور انوارِ عنایت و توفیق کے مطلع اور اسرارِ خلافت کے علی التحقیق وارث اور ان کے لیے گیارھویں صدی کے مجدد ہونے پر لوگ متفق ہیں وہ الہامِ ربانی کے معدن اور حسبی نسبی سیّد ہیں۔ حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ کے ہم نام اور قسطنطنیہ میں مقیم ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے اور ان کی طفیل ہماری امداد فرمائے، کا ارشاد ہوا کہ تم شہر بروسا (جو اولیاءِ کرام کا مرکز ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہر شر و فساد سے محفوظ رکھے) کی طرف چلے جاؤ۔ حسب الحکم ۱۰۶۰ھ میں وہاں پہنچا تو وہاں سوائے وعظ و نصیحت کے اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ یہ سلسلہ جامع مسجد کبیر (جو نورانی عبادت گاہ، مشہور و معروف مقام ہے) میں ہوا۔ اس سے قبل جبکہ میں روم کے بعض شہروں میں مقیم تھا تو میرے پاس چند صحیفے جمع تھے ان میں تفاسیر و دیگر علوم جمع کئے گئے تھے۔ وہ بھی سورۂ آلِ عمران سے کچھ تھوڑا سا آگے کی تفسیر پر مشتمل تھا اور ان میں طوالت کے باوجود متفرق اوراق تھے

میرا ارادہ ہوا کہ ان کا خلاصہ بیان کردوں۔ اور ان میں جو کمی بیشی ہو ترمیم و تنسیخ کروں اور جو مضامین بڑھانے کے لائق ہوں ان کا

اضافہ کروں۔ اگرچہ میں قلیل البضاعۃ اور قصیر الباعۃ ہوں لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے مہلت بخشی تو بوقتِ فرصت اسے تحریر میں لاؤں گا تاکہ میرے لیے یومِ آخرت کا ذخیرہ ہو بلکہ میرے لیے سفارشی بنے اس یوم میں کہ جہاں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے سوال ہے کہ اسے صالحات الاعمال، خالصات الآثار اور آخر عمر تک باقیات الصالحات سے بنائے۔ کیونکہ وہ کریم جب کسی بندہ سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے اعمال لوگوں کی نظروں میں اچھے بنا دیتا ہے اور اسے ان خیرات کا اہل بناتا ہے جو نہایت اعلیٰ اور مرغوب ہیں۔ اور وہی فیاض ہے۔

○



سببِ ترجمہ تفسیر ہٰذا

بحمدك يا مفيض الجود والخير على عبادك الاخيار يا ستار ويا غفار اغفر ذنوبنا واستر عيوبنا واعصمنا من فتن المبطلين والاشرار انت الباقى بلا زوال لم يطرء عليك ونقص ولا يجرى عليك نكص انت القادر والقدير والمختار على حبيبك الاعظم ونبيك الاكرم ونورك المعظم وسرك الافخم سيد الانبياء والابرار امام الانبياء وقدوة الاصفياء وصفوة الانام واكرم الكرام هادم بنيان الكفر والشر والاشرار وعلى آله الاطهار واصحابه الصغار والكبار۔

اما بعد فقیر ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی غفرلہٗ کو عرصہ سے ایک جامع تفسیر تحریر کرنے کا شوق دامن گیر تھا علمی بے بضاعتی کے علاوہ کم ہمتی بھی مانع تھی اور نہ ہی تفسیروں کا ذخیرہ میسر تھا۔ طویل عرصہ گزر جانے کے بعد تفسیر رُوح البیان کا مطالعہ نصیب ہوا۔ اس نے میرے شوق سابق کے خوابیدہ تصورات کو بیدار کیا۔ وہی کچھ ملا جو میں تفاسیر شتی سے چاہتا تھا کہ لُغت بھی ہو اور فقہ بھی، حدیث بھی ہو اور تفسیر بھی۔ اہلِ ظواہر بھی فائدہ اٹھائیں اہلِ تصوف بھی مستفید ہوں۔ محققین بھی اس سے استفادہ فرمائیں اور مبتدی حضرات بھی۔ جس طرح مدرسین کی نظروں میں منظور ہو اسی طرح واعظین کا مطمح نظر بھی ہو۔ چنانچہ اس کے ترجمہ کا آغاز یکم جنوری ۱۹۵۸ء سے ہوا اور یکم جنوری ۱۹۵۹ء میں "ماہ طیبہ" کوٹلی لوہاراں، ضلع سیالکوٹ کی مسلسل اشاعتوں میں شائع ہوتا رہا۔

فقیر ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی غفرلہٗ

○

روح البیان اور اس کا مصنّف مرحوم

مصنفِ رُوح البیان جناب اسمٰعیل حقی قدس سرہٗ ایک عارفِ کامل اور علامۂ دوراں اور یگانۂ زمان تھے جن کے عرفان اور فضل و کمال کا اعتراف مخالفین کو بھی ہے ۔ چنانچہ مولوی محمد صدیق حسن خاں بھوپالی نے اپنی معروف تصنیف " اکسیر فی اصول تفسیر" (ص ۸۲) میں لکھا کہ ، روح البیان فی تفسیر القرآن للشیخ العارف الکامل الشیخ اسماعیل حقی"...! ......
یعنی یہ تفسیر آپ نے اپنے شیخ عارف کامل حضرت عثمان قدس سرہٗ کے حکم سے قسطنطنیہ میں لکھی ۔ خود مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح پارہ اول کے مقدمہ میں لکھا ۔

تفسیر روح البیان کا تعارف

مولوی بھوپالی "روح البیان" کے تعارف میں لکھتا ہے کہ وھو فی ستۃ مجلدات لم یذکرہ فی کشف الظنون وقد طبع فی ھذا الزمان بمصر القاھرہ یحتوی علی معارف وحقایق علی لسان التصوف یعنی وہ چھ جلدوں میں ہے اسے کشف الظنون (جو تصانیف پر مشتمل ہے) میں نہیں لایا گیا یہ تفسیر معارف (معرفۃ کی جمع) اور حقایق (حقیقۃ کی جمع) کو حاوی ہے اور تصوف کے رنگ میں لکھی گئی ہے ۔

صدیق حسن بھوپالی کا تعارف

۱ - مخالفین کا یہی محقق خود اپنے لیے یُوں لکھتا ہے الامام العلامہ الحبر الفھامہ البرکۃ الشاملہ لمن ھو فی الھند والتھامہ الخ (حاشیہ وہابی مذہب)

۲ - مولوی اسماعیل سلفی گوجرانوالہ نے لکھا ، دقتِ نظر ، وسعتِ مطالعہ ، زہد و تقویٰ کے لحاظ سے ان کا مقام یقیناً اونچا ہے اور فہمِ قرآن میں ان کا ذہن بیحد صاف ہے بہت اکابر قدمائے سے بھی ان کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے ۔ (حیات النبی ، ص ۴۶ ، ۴۷)

۳ - مولوی اشرف سندھو نے لکھا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں اہلحدیث مسلک کے علمبردار ہیں اور وسیع النظر محقق ہیں ۔ (تاریخ التقلید ، ص ۱۴۹)

"اہلحدیث" امرتسر ۱۹۱۲ء (ص ۲۰) میں نواب صدیق حسن بھوپالوی کو "مجدّد" لکھا ہے ۔

انصاف اے اہلِ انصاف !

مولوی محمد صدیق حسن خان بھوپالی کی شخصیت سامنے آگئی اور ان کا اعتراف بھی پڑھ لیا گیا کہ یہ تفسیر معارف و حقایق کا

گنجینہ ہے۔ پھر اس کے بعد خلجان کیوں؟ وہ صرف اسی لیے کہ تصوف کے مسائل بھی اس میں موجود ہیں، اور پھر اس لیے کہ یہ تفسیر (روح البیان) عارفِ کامل حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ کے اشعار پر مشتمل ہے اور اس کے بھی چھ دفتر ہیں۔ اس کے بعد صدیق حسن مذکور نے دل کی بھڑاس نکالی ہے:

"مزج فیہ العربیۃ بالفارسیۃ من غیر امتیاز بینھما۔" یعنی مفسر نے عبارت عربی فارسی ملا کر لکھی ہے۔

جواب: (۱) اولاً تو تفسیر روح البیان پر مذکورہ بالا الزام غلط ہے اس لیے کہ فارسی عبارات تفسیر ہذا میں لائی ضرور گئی ہیں لیکن نہ ہونے کے برابر اور وہ بھی کسی معتبر اور مستند کی کتاب اور تفسیر کی نقل کے طور پر۔ اس طرح سے مصنف کو داد دینی چاہیے کہ انھوں نے تفسیر بالرائے سے کام نہیں لیا بلکہ مضمون کو دوسرے محققین اور مستند علماء سے مؤید و موثق کیا ہے۔

(۲) ہمارے دور میں انگریزی زبان عروج پر ہے، جو مصنف اپنی تصنیف میں انگریزی حروف و جملے لاتا ہے اسے جدت کا تاج پہنا کر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں۔ صاحب روح البیان کے زمانہ میں فارسی زبان کا طوطی بولتا تھا اسی لیے وہ اپنی تحریر میں فارسی جملے لائے تاکہ جدت پسند حضرات تفسیر کو سر آنکھوں پر رکھیں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ جتنی مقبولیت تاحال تفسیر روح البیان کو حاصل ہے کسی دیگر تفسیر کو نصیب نہیں۔

صدیق حسن مذکور نے اور لکھا:

واتی باراجیف کثیرۃ لاینبغی الالتفات لاینبغی الالتفات الیھا وفتاوی ضعیفۃ لا یعتمد علیھا ولیس فی الحقیقۃ من التفسیر للکتاب العزیز لشئ واورد فیہ اشعار کثیرۃ من الفرس سیما من مثنوی الشیخ جلال الدین الرومی و ھو من توابعہ من الاعتقاد والمعرفۃ ولذا اسمی کل جزء من اجزاء التفسیر بالدفتر واجتراء علی کتاب اللہ بادخال لیس منہ۔ یعنی تفسیر میں اراجیف کثیرہ لایا ہے۔ یاد رہے کہ اراجیف بالفتح ارجاف کی جمع ہے بمعنی بیہودہ لوگ، جھوٹی اور بے بنیاد باتیں (غیاث اللغات)

اویسی کی بھی سنیے

ناظرین! آپ نے دیکھ لیا، اسے کہتے ہیں تعصب۔ اور سچ ہے دروغگو را حافظہ نباشد۔ ابھی تو اس تفسیر کو معارف و حقائق کا گنجینہ اور مصنف کو عارف لکھا اور پھر اس کی تفسیر کو اراجیف جیسے گندے الفاظ جڑ دیئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

اور "فتاویٰ ضعیفہ" کا الزام بھی بے بنیاد ہے۔ یہ تعصب کی کارروائی ہے ورنہ الحمد للہ مصنف روح البیان قدس سرہ نے جتنے حوالہ جات تفسیر میں لکھے ہیں ان میں کوئی بھی ضعیف حوالہ نہیں۔

مولانا روم کی اقتداء

بھوپالی صاحب نے اپنے تئیں معقول الزام لگایا ہے کہ مصنفِ روح البیان مولانا روم کا نہ صرف متبع بلکہ اتنا بڑا

معتقد ہے کہ تفسیر کو مثنوی کے چھ دفتروں کے مطابق چھ دفتروں میں لکھ دیا۔

عرضِ اویسی غفرلہٗ

مخالف نے یہ الزام لگا کر اپنی بد مذہبی کا اظہار اور ہمارے ممدوح کی تفسیر پر علم و عرفان سے بھرپور ہونے کی مہرِ ثبوت لگا دی ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

اہل سنّت اور صوفیہ کو دعوتِ مطالعہ

مولانا روم قدس سرہٗ کی مثنوی کے عشاق بخوبی واقف ہیں کہ اس مقدس کتاب کا صرف مطالعہ ہی صاحبِ عرفان بنا دیتا ہے۔ چنانچہ مولوی اشرف علی تھانوی نے فیوض الرحمٰن (ملفوظات) میں اعتراف کیا ہے کہ صرف مثنوی کے مطالعہ سے بے ایمانوں کو ایمان اور ایمان داروں کو عرفان کی دولت نصیب ہوئی جس کی تفصیل فقیر کی کتاب "فیض القوی فی فضائل المثنوی" میں ہے۔ یوں سمجھیے کہ تفسیر رُوح البیان اہلسنّت کے مسلک اور احناف کے مذہب اور تصوفِ اسلام کا عطر ہے صرف یہی ایک تفسیر ان جملہ برکات کی جامع ہے۔

اہلسنّت کے مایہ ناز عالمِ دین کی تصدیق

حضرت مولانا فقیر محمد جہلمی یوں رقم طراز ہیں:

"شیخ اسماعیل حقی آفندی عارفِ کامل فاضل مفسر مستند سراج العلماء زبدۃ الفضلا تھے امام اعظمؒ کے مذہب کی تائید اور اعانت کی اور انھیں کے مذہب کے موافق آیاتِ قرآنی کی تفسیر فرمائی۔" (حدائق الحنفیہ)

اہلسنت خواص و عوام سے اپیل ہے کہ جب آپ حضرات مسلکِ سُنّی اور مذہب حنفی اور تصوف کے متلاشی بلکہ عاشق ہیں تو پھر رُوح البیان سے بے اعتنائی اور لاپروائی کیوں؟ آپ مخالفین کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر کیوں ہیں جبکہ ان کی تنقید کا نشانہ نہ صرف تفسیر روح البیان ہے بلکہ انھوں نے تو تمہارے اکابر اسلاف صالحین کو بھی معاف نہیں کیا۔ امام اعظم رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کے لیے کہتے ہیں کہ وہ تو صرف سولہ سترہ احادیث جانتے تھے اور بس۔ اور نبوت و ولایت پر تو ان کی تنقید مشہور ہے جب وہ مرکز کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تو پھر مرکز کو مضبوط کرنے والوں کو کب اچھی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ اسی لیے مخالفین اہل سنت اور احناف اور اصفیاء کو اپنی تحریر و تقریر میں ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔

یقین کیجیے

عوام اہلسنت کو یقین ہونا چاہیے کہ تفسیر رُوح البیان نہایت معتبر اور مستند کتاب ہے۔ اصولِ تفسیر کے عین مطابق ہے۔

اس کے مفصل دلائل تو فقیر نے "الفیضان" میں لکھے ہیں یہاں بھی چند ایک ملاحظہ ہوں۔

شرائطِ تفسیر

حضرت امام جلال الدین سیوطی قدس سرہٗ نے قرآن مجید کی تفسیر کے لیے پندرہ علوم وفنون میں مہارت تامہ کی شرط لگائی ہے اور لکھا ہے کہ جو شخص ان پندرہ علوم وفنون میں سے کسی ایک میں بھی ناقص ہو اُسے قرآن مجید کی تفسیر کرنے کا حق نہیں۔ (اتقان)

وُہ پندرہ علوم یہ ہیں :

(۱) لغت عربیہ	(۷) علم البدیع	(۱۳) فقہ
(۲) علم النحو	(۸) علم القرأت	(۱۴) علم الحدیث
(۳) علم الصرف	(۹) قواعد شرعیہ	(۱۵) علم الموہبہ
(۴) علم الاشتقاق	(۱۰) اصولِ فقہ	
(۵) علم المعانی	(۱۱) علم اسباب النزول	
(۶) علم البیان	(۱۲) علم ناسخ ومنسوخ	

بعض دیگر مفسرین نے پچیس علوم کی شرط لگائی ہے۔ ان کی تفصیل فقیر نے اپنی کتاب " احسن البیان" حصہ اول میں لکھ دی ہے۔

افسوس! کہ آجکل بعض حضرات معمولی عربی گرائمر جاننے اور دو چار اردو کی کتابیں پڑھنے کے بعد قرآن مجید کی تفسیر کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور میں تفسیرِ قرآن کی کوئی قدر نہیں رہی بلکہ معاملہ اُلٹا ہوگیا کہ تحقیقی تفاسیر کو ضعیف اور غیر تحقیقی کو قوی سمجھا جا رہا ہے۔ مثلاً عوام کے سامنے "تفسیر ابن کثیر" کا پرچار کیا جاتا ہے۔ اور اس کا اردو ترجمہ ہاتھوں ہاتھ لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہے۔ اور "تفہیم القرآن" کے مقابلے میں تمام سابقہ تفاسیر کو ہیچ ثابت کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ "تفسیر ابن کثیر" ابنِ تیمیہ کے مقلد اور خارجی مذہب کے پیروکار کی لکھی ہوئی ہے جس میں ہزاروں بلکہ بے شمار غلیظ عقاید کو درج کرکے خارجیت کا درس دیا گیا ہے۔ اور "تفہیم القرآن" کے مصنف کا تو سب کو پتا ہے کہ وہ ماڈرن دین کا داعی تھا یعنی وہ اسلام کا رُخ مدینہ منوّرہ کی بجائے انگلینڈ اور امریکہ کی طرف پھیرنا چاہتا تھا۔ فلہٰذا عوام خود سوچ لیں کہ ایسی تفاسیر کے مطالعہ سے انھیں کیا حاصل ہوگا!

ایسے ہی سابقہ تفاسیر میں تفسیر کبیر بلند پایہ سہی مگر شرائطِ مذکورہ سے یکسر خالی۔ اسی لیے علماءِ کرام نے فرمایا "تفسیر کبیر رازی میں تفسیر کے سوا باقی سب کچھ ہے۔ یعنی فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی اس تفسیر میں بہترین مضامین لکھے، لیکن تفسیری مضامین سے یکسر خالی۔ ایسے ہی "تفسیر ابن جریر" کو علماءِ کرام نے "اُم التفاسیر" کا لقب دیا مگر وہ بھی شرائطِ مذکورہ پر صحیح نہیں اُترتی۔ اسی طرح آپ متعدد تفاسیر پڑھ جائیں گے لیکن تفسیری شرائط ان میں بہت کم ملیں گی۔

شرائطِ مفسّر

مفسّرِ قرآن کے لیے جن شرائط کا ہونا مستند مفسرین نے ضروری قرار دیا ہے وہ یہ ہیں :

۱ - ذکی، فہیم ہو - قرآن فہمی کی کامل و مکمل مہارت رکھتا ہو۔

۲ - علوم مذکورہ باضابطہ ماہر و حاذق اور تجربکار اساتذہ سے سبقاً سبقاً پڑھے ہوں۔

۳ - علمائے معاصرین اور فضلائے ہم زمان کی نظر میں اس کا علم، فہم اور تقویٰ مسلّم اور معتبر ہو۔

۴ - خودرائے اور متکبر نہ ہو۔

۵ - سُنّی اور صحیح العقیدہ ہو۔

الحمدللہ جملہ اوصاف صاحبِ رُوح البیان رحمہ اللہ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ جس کا اعتراف مخالفین کو تھا اور ہے، ایک حوالہ بھوپالی کا اس کے ثبوت کے لیے پیچھے گزر چکا، تفصیل "الفیضان" میں دیکھیے۔

افسوس، اہلسنّت !

بدمذاہب کی تفاسیر کو ہمارے اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے بلکہ اپنے متبعین کو ان کے نہ پڑھنے کا حکم فرماتے۔ مثلاً زمخشری کتنا بڑا فاضل اور علامہ تھا لیکن ہمارے بزرگوں نے اس کے مطالعہ کو زہرِ قاتل قرار دیا، تو پھر آج کیوں تفسیر ابن کثیر اور بدمذاہب کی تفسیروں کو پڑھتے ہو؟ جبکہ ان میں اہلسنت اور صوفیائے کرام کے خلاف زہر اگلا گیا ہے۔ اور تفسیر رُوح البیان جو ہمارے سُنّی مسلک و مذہب حنفی اور مشربِ صوفیہ کے عین مطابق ہے اور تفسیری شرائط کے مطابق ہے پھر اس سے بے اعتنائی کیوں؟ صرف اس لیے کہ اسے مخالفین نہیں مانتے۔ وہ کیوں مانیں جبکہ مصنّف عارفِ رومی اور شیخ اکبر اور امام اعظم رضی اللہ عنہم کا متبع ہے۔

قواعدِ تفسیر

تفسیر کے لیے پانچ قواعد ضروری ہیں :

۱ - تفسیر القرآن بالقرآن

۲ - تفسیر القرآن بالحدیث

۳ - تفسیر القرآن باقوال الصحابہ

۴ - تفسیر ان امور سے جو لغتِ عربیہ اور قواعدِ اسلامیہ کے متعلق ہوں۔

۵ - تفسیر کی وہ قسم جو وجوہ مذکورہ میں سے کسی ذریعہ سے ثابت اور متیقن نہ ہو۔

روح البیان" میں جملہ شرائط بدرجہ اتم موجود ہیں۔ طرفہ یہ کہ صاحبِ تفسیر کوئی مضمون حوالہ دئے بغیر درج نہیں کرتے بلکہ

ہرایک کو شرائطِ تفسیر کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ اُنھوں نے احناف کے مسلک کے مطابق اور اہلسنت کے اصول کے مطابق اپنے اشہبِ قلم کو دوڑایا ہے۔ اور تصوف کے وہ اسرار و رموز جو ہم عارف رومی، سعدی، جامی اور حضرت ابن العربی قدس اسرارہم سے سُننا چاہتے تھے وہ صاحبِ روح البیان نے "روح البیان" میں یوں بیان کر دیے ہیں گویا کوزہ میں دریا بند کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ "روح البیان" تفسیری قواعد و ضوابط اور جملہ اصول کی جامع ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ حنفی اور تصوف اسلامی پر مشتمل ہے۔ اور دورِ حاضرہ کے وہ مسائل جن میں اہلسنت کے ساتھ مخالفین کو اختلاف ہے ان سب کو علمی تحقیق سے واضح کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس کہ اہلِ اسلام کو اس کے مطالعہ سے اندھیرے میں رکھا گیا۔ مخالفین تو اپنی عادت پر مجبور رہیں لیکن سخت افسوس ان علمائے اہلسنت پر ہے جنھوں نے اس تفسیر سے بے اعتنائی برتی۔ جس سے عوام اہلِ اسلام کو یقین ہونے لگا کہ ممکن ہے بقول مخالفین "روح البیان" غیر مستند ہو۔ حالانکہ ایسی محقق اور مستند اور کوئی تفسیر نہیں۔ فقیر نے اس تفسیر کے متعلق ایک کتاب "الفیضان علیٰ روح البیان" لکھی ہے۔ جو انشاءاللہ تعالیٰ تفسیر کی تکمیل طباعت کے بعد علیحدہ بطور مقدمہ ہدیہ ناظرین ہوگی!

خصوصیاتِ تفسیر ہٰذا از مصنف رُوح البیان قدس سرّہٗ

۱۔ اس تفسیر میں بکثرت وجوہ تفسیر بیان کرنے کے بجائے اختصار کو ملحوظ رکھ کر آیات کے اصل منشا کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ البتہ متقدمین کی معتبر و مستند تفاسیر کا خلاصہ ضرور بیان کیا جائے گا اس سے میری تفسیر کو مقبولیت حاصل ہوگی۔

۲۔ ہر آیت کے تحت مناسب لیکن دلپذیر پند و نصائح ضرور بیان کروں گا تاکہ ان سے قلوب کو جلاء اور ارواح کو سرور حاصل ہو۔

۳۔ موقعہ کے مطابق فارسی اشعار بھی لکھوں گا تاکہ اہلِ دل ان سے روحانی تسکین پائیں۔

۴۔ جن تفاسیر معتبرہ اور کتبِ فقہ و احادیثِ مبارکہ کا حوالہ دوں گا حتی المقدور ان کی اصل عبارت لکھنے کی کوشش کروں گا، البتہ کہیں کہیں بوقتِ ضرورت صرف عبارات میں ترمیم و اضافہ کروں گا لیکن مطالب و مقاصد میں جبہ بھر فرق نہیں آنے دُوں گا۔

۵۔ بہت کم ایسے مواقع آئیں گے جہاں میں اپنا نظریہ (یقول الفقیر سے) پیش کروں گا لیکن وہ بھی بحمدہٖ تعالیٰ کسی شیخ کامل اور معتبر ولی اللہ کی تقریر کا خلاصہ ہوگا۔

آغاز تصنیف رُوح البیان: اس دفتر کا آغاز ۲۲ شعبان ۱۱۰۲ھ میں ہوا۔ پہلے دفتر کی طرح اس کا آغاز شہر بروسہ میں ہوا جبکہ میں اسی شہر کی طرف ہجرت کر کے مقیم ہو گیا تھا۔ خدا کرے یہ شہر ارواحِ قدسیہ والے حضرات کا مرکز بنا رہے۔

اے اللہ العالمین! جس طرح تُو نے مجھے اس کے دفتر کے اتمام کی توفیق بخشی ہے اپنے فضل و کرم سے اس کے بقایا حصص کی تکمیل کی بھی توفیق عطا فرما اور میری اس تحریر کو قیامت کے دن میرے چہرے کی سفیدی کا سبب بنا جیسے تیرے اولیاء کرام کے

چہرے نورانی ہوں میرا بھی چہرہ نورانی ہو۔ اور اپنے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میرے گناہوں کے سیاہ دفتروں کو دھو ڈال۔ اور میں بھی صبح و شام تا دمِ زلیست تجھ سے دُعائیں مانگتا رہوں گا اور اس میں مجھے نا اُمیدی بھی نہیں۔ فلك الحمد فی الاولی والاخری علی عنایتك الکبری و اٰخر دعوٰھم ان الحمد للہ رب العالمین۔

سببِ تالیف "فیوض الرحمان" ترجمہ تفسیر ہذا

ناکارہ و آوارہ الفقیر القادری ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی رضوی غفرلہٗ عرض پرداز ہے کہ فقیر نے زمانہ طالبعلمی میں اپنے اکابر اہلسنت سے تفسیر روح البیان کا غلغلہ سُنا۔ مخالفین اہلسنت نے اسے ضعیف اور غیر معتبر گردانا۔ تحصیلِ علوم و تکمیلِ فنون کے بعد ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۱ء میں اپنے گاؤں حامد آباد ضلع رحیم یارخاں میں تعلیم و تدریس میں مشغول ہوگیا۔ انہی دنوں تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ شائع ہُوا۔ عوام میں تاثر پیدا کر دیا گیا کہ یہ زمانۂ قدیم کی معتبر تفسیر ہے۔ حالانکہ ابنِ کثیر ابنِ تیمیہ کا شاگرد اور اس کے مذہب و مسلک کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے والا ہے۔ اس نے تفسیر ابن کثیر میں اہلسنت کے خلاف بہت کچھ لکھا۔ یہ تفسیر اہلسنت و جماعت کے عقاید کے بھی خلاف ہے اور مسلکِ حنفیت کے بھی۔

فقیر قلیل البضاعۃ و عدیم الفرصت کو اتنی جُرأت کہاں کہ تفسیر جیسے اہم و مشکل ترین فن کو اپنائے۔ لیکن فضلِ ایزدی پر اُمید رکھ کر رُوح البیان کے ترجمہ کا آغاز کیا۔ یہ تفسیر بحمدہٖ تعالیٰ اصول و ضوابط اور قوانینِ تفسیر کے عین مطابق ہے اور مخالفین حضرات اسے محض اس لیے غیر معتبر و ضعیف گردانتے ہیں کہ صاحبِ رُوح البیان نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اور صوفیہ کرام میں سیدنا ابن العربی اور حضرت مولانا روم قدس سرہما کا مسلک پیش کیا ہے۔ بعینہٖ یہی ہمارا مدعا ہے اور مخالفین کے لیے موت اور سمِ قاتل۔

تفسیر ابن کثیر نہ صرف غیر مفید ہے بلکہ اس کا مطالعہ عقاید و مسائلِ احناف کے لیے مضر بھی ہے۔ اور روح البیان کا مطالعہ عقایدِ اہلسنت و مسائلِ احناف کو جِلا بخشے گا اور حضرت مولانا روم اور عارف باللہ سیدنا ابن العربی قدس سرہما کے عارفانہ کلام سے ارواح کو تازگی بخشے گا۔

معتبر تفسیر رُوح البیان

کسی کو زبان سے غیر معتبر اور ضعیف کہہ دینا صرف مخالفین کی اپنی بڑ ہے۔ ورنہ مطالعہ کے بعد قاری خود محسوس کرے گا کہ عالمِ اسلام کی جملہ تفاسیر سے بوجہ اصول و قواعد و ضوابطِ فنِ تفسیر کے تفسیر ہذا کتنا بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ طرفہ یہ کہ جناب اسمٰعیل حقی قدس سرہٗ نے ہر ایک مضمون کو مشہور و معروف اور نہایت معتبر اور مستند تفاسیر و کتب احادیث و فقہ حنفی کے حوالہ جات سے مزیّن فرمایا ہے۔ اور صُوفیانہ تفسیر کو اصولِ تفسیر میں حق مانا گیا ہے، جس کا مخالفین کے اکابر نے اعتراف کیا ہے۔ اسی لیے

تعصب سے بالا ہوکر اس تفسیر کا مطالعہ کیا جائے تو حق واضح اور روشن ہوگا۔

خصوصیاتِ ترجمہ

۱۔ فقیر نے ترجمہ میں کسی قسم کی ترمیم و اضافہ نہیں کیا محض اس نیت سے کہ عوام اس تفسیر کے مطالعہ کے بعد خود اس نتیجہ پر پہنچیں اور سمجھیں کہ گیارھویں صدی میں عقاید و مسائل یہی تھے جن کی امامِ اہلسنّت مجدّدِ دین وملّت شیخ الاسلام والمسلمین سیدنا شاہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی قدس سرہٗ نے چودھویں صدی میں ترجمانی کی ہے۔ ان کے دلائل و مسائل کو بدعت کہنا ایسے ہے جیسے امام الانبیاء حبیبِ کبریا شافعِ روزِ جزا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکینِ عرب نے بدعتی گردانا اور منافقین نے مشرک[1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کو خارجیوں نے مشرک و بدعتی کہا۔ اسی طرح امامِ اعظم اور حسن بصری اور ان کے متبعین و معتقدین کو معتزلہ نے مشرک و بدعتی ہونے کا فتویٰ جڑا۔ اسی طرح ابن تیمیہ کی پارٹی اور عبدالوہاب نجدی نے تمام اہلِ حق کو مشرک و بدعتی گردانا۔ اب اگر اعلیٰحضرت بریلوی اور ان کے تلامذہ اور معتقدین و متعلقین کو وہابی، دیوبندی، مودودی، تبلیغی، پرویزی وغیرہ بدعتی اور مشرک کہیں تو وہ مجبور رہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ سوائے مشرکینِ عرب و منافقین کے باقی ہر دور میں ہمارے اکابر و اسلاف صالحین کو بدعتی اور مشرک گرداننے والے اپنے آپ کو موحّد (اہلِ توحید) کہلاتے ہیں۔ تفصیل فقیر کی تصنیف "ابلیس تا دیوبند" میں دیکھیے۔

۲۔ چونکہ تفسیر ہذا عربی میں اور دورِ قدیم کی طرز پر لکھی گئی اس لیے فقیر نے دورِ حاضرہ کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے جگہ بجگہ عنوانات قایم کیے ہیں۔ حسبِ ضرورت کہیں قوسین میں کچھ لکھ دیا ہے یا مختصراً حواشی میں۔

۳۔ ادیبانہ طرز پر نہیں اپنے جیسے عوام کی خاطر سادہ اور آسان ترین اردو زبان استعمال کی ہے اور چونکہ فقیر نے صرف پرائمری تک سکول میں تعلیم حاصل کی ہے پھر حفظِ قرآن اور عربی علوم و فنون کی تحصیل کی، پھر ان کی تدریس و تعلیم میں مصروف ہوگیا، اس لیے ممکن ہے اردو قواعد میں غلطی بھی ہوئی ہو۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ تفسیر کا اصل منشا ادا کیا ہے اسے صرف عوام تک پہنچانا مقصود ہے ادبا و علماء سے داد لینا نہیں بلکہ میں ان سے نہایت عاجزی سے ملتجی ہوں کہ وہ اپنے علوم و دانش کے صدقے فقیر کے ٹیڑھے میڑھے ترجمے سے کیڑے نکالنے کے بجائے اصلاح فرما کر فقیر کو براہِ راست مطلع فرما کر شکریے کا موقع دیں فقیر اور عوام الناس کے درمیان روڑے نہ اٹکائیں۔ ممکن ہے مناع للخیر کی وعید ان پر صادق آجائے۔

فقیر نے تفسیر روح البیان کے سمجھنے اور اسے معتبر و مستند تفسیرِ احناف ثابت کرنے کے لیے کتاب "الفیضان علیٰ روح البیان" لکھی ہے جو زیرِ طباعت ہے۔

---

[1] دیکھیے فقیر کی تصنیف "الفیضان علیٰ روح البیان"۔

تفسیرِ صوفیانہ

اس بحث کو لکھنا ضروری ہے کہ صوفیہ کرام کی تفسیر حق ہے یا باطل؛ چونکہ صاحبِ روح البیان نے تفسیر عالمانہ کے ساتھ تفسیر صوفیانہ بھی بیان کی ہے اس لیے مخالفین یہ تاثر دیتے ہیں کہ روح البیان میں زیادہ تر تفسیر صوفیانہ ہی بیان کی گئی ہے فلہذا یہ تفسیر صرف صوفی منش لوگوں کے لیے ہے اور بس ۔ یہ ان کی نظروں کا دھوکا اور دماغ کا خلل ہے ورنہ تفسیر ہٰذا میں تفسیر عالمانہ اور تفسیر صوفیانہ ساتھ ساتھ چلتی ہیں ۔ اور صوفیانہ تفسیر اہلِ اسلام کے نزدیک حق ہے ۔ چنانچہ مخالفین کے معتمد علیہ حضرت علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ صوفیہ اور عارفین کا کلام آیاتِ قرآنیہ میں بطریقِ تفسیر نہیں ہوتا اس لیے کہ تفسیر تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی بیان کردہ مراد کا نام ہے بلکہ وہ تو صرف رموز و اشارات اور وہ لطائف ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے قلوب پر فائض فرماتا ہے ۔ اربابِ سلوک کے قلب باطنی ریاضتوں کی وجہ سے منور ہوتے ہیں اور ان پر تجلیاتِ غیبیہ کا ورود ہوتا رہتا ہے تو گاہ بگاہ ان کی زبان سے آیاتِ کلام اللہ کی تشریح میں کچھ ایسے لطائف اور معارف جاری ہوتے ہیں جن کا تعلق ظاہری علوم سے نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف روحانی تلقین اور تفہیم غیبی ہوتے ہیں ۔ یہ باطنی اشارات کلام اللہ کے اس مفہوم اور مدلولِ قطعی کو برقرار رکھتے ہوئے معتبر ہوں گے جو اصولِ شریعت نبی کریمؐ اور صحابہؓ کی تفسیر سے ثابت ہے اس لیے اگر اربابِ تصوف سے کوئی ایسی چیز منقول ہو کہ جس سے ظاہر احکامِ شریعت اور حدود کا انکار لازم آتا ہو تو وہ ہرگز مقبول اور معتبر نہ ہو گی قابلِ اعتبار صرف وہی لطائف و اشارات ہوں گے جن سے نہ احکامِ شریعت پر کوئی زد پڑتی ہو اور نہ کسی ایسے امر کا صراحتاً یا دلالۃً رد لازم آتا ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی تفسیر سے ثابت ہے ۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم لکل اٰیۃ ظھر و بطن و لکل حرف حد و لکل حد مطلعٌ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہر آیت کے لیے ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن ۔ اور ہر حرف کے لیے ایک حد یعنی حکمِ شرعی ہوتا ہے اور ہر حکمِ شرعی کے لیے ایک اطلاع پانے کی جگہ ہوتی ہے ۔ (کتاب اللہ میں سے)

ابن النقیبؒ بیان کرتے ہیں ظہرِ آیات سے وہ معانی ہیں جو اہلِ علم ظاہری علوم اور قواعدِ شریعت کے ذریعہ جانتے ہوں اور بطن سے مراد وہ اسرار ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اربابِ حقایق (اور عارفین) کو مطلع فرماتا ہے اور لکل حرف حد کے معنی یہ ہیں کہ ہر حرف کے معانی اور حقایق کا ایک منتہیٰ ہوتا ہے جو بھی اللہ تعالیٰ ارادہ فرمائے ۔ یہی وہ اسرار و حقایق ہیں جن کے بارہ میں فرمایا گیا ہے: ھو الذی لا تنقضی عجائبہ ۔ قرآن اللہ کا وہ کلام ہے کہ اس کے عجائب و لطائف کبھی ختم نہ ہوں گے ۔

تو مدلولِ قرآنی تو آنحضرتؐ اور صحابہؓ کی تفاسیر سے مقرر و متعین ہے جس میں ادنیٰ تغیر اور رد و بدل کا امکان نہیں۔ اس مدلولِ قطعی اور طے شدہ مفہوم (جس پر تمام احکامِ شریعت کا دار و مدار ہے) کے بعد باطنی اسرار و نکات اور معارف کی کوئی حد و انتہا نہیں۔

شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ کتاب "لطائف المنن" میں بیان فرماتے ہیں کہ کلام اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و تشریح میں حضرات صوفیہ اور عارفین کے بیان کردہ نکات اور اس قسم کے غرائب بیان کرنا کلام اللہ کو اس کے ظاہر مفہوم سے متغیر کرنا نہیں ہے اس لیے کہ آیت کا ظاہری مفہوم تو وہی مراد ہوتا ہے جس پر آیت ناطق ہے اور وہ قواعدِ عربیہ اور اصولِ شریعت سے سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ غرائب محض رموز و اشارات اور باطنی تفہیم ہوتے ہیں جو غیبی طور پر اللہ کی طرف سے اربابِ باطن پر القاء کئے جاتے ہیں[1]۔

قاضی بیضاویؒ آیت "الذی جعل لکم الارض فراشاً والسماء بناءً" کی تفسیر و تشریح فرمانے کے بعد آخر میں اسی نوع کے عارفانہ نکتہ کو بیان کرتے ہیں۔

ولعله سبحانه وتعالٰی اراد من الایت الاخیرة مع مادلّ علیه الظاهر وسیق الکلام فیه اشارة الی تفصیل خلق الانسان وما افاض علیه من المعانی والصفات علٰی طریقة التمثیل فمثل البدن بالارض والنفس بالسماء والعقل بالماء وما افاض علیه من الفضائل العملیة والنظریة المحصلة بوساطة استعمال العقل للحواس وازدواج القوٰی النفسانیه والبدنیة بالثمرات المتولدة من ازدواج القوٰی السماویة الفاعلیة والارضیة المنفعلة بقدرة الفاعل المختار فان لکل اٰیة ظهراً وبطناً ولکل حدٍ مطلعاً۔

(تفسیر بیضاوی ج ا ص ۴۳)

اور شاید یہ کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے آیت اخیرہ (یعنی الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء) سے ارادہ فرمایا اس مدلول کے باوجود جس پر ظاہر کلام دلالت کر رہا ہے اور جس مقصد کے لیے کلام جاری فرمایا گیا اشارہ فرمانے کا تخلیق انسانی اور اس پر فائض کردہ اوصاف و معانی اور اس کے فضائل عملیہ اور نظریہ کی تفصیل کی جانب بطریقِ تمثیل، تو بدنِ انسانی کو تشبیہ دی گئی ارض (زمین) سے اور اس کے نفس کو سماء (آسمان) سے، اور عقل کو ماء (پانی) سے اور انسان کو عطا کردہ فضائل عملیہ اور کمالات نظریہ کو جو حواس کے لیے استعمال عقل کے توسط اور قوائے نفسانیہ اور قوائے بدنیہ کے امتزاج و اختلاط سے حاصل ہوتے ہیں ان ثمرات سے تعبیر فرمایا جو کہ آسمان کی قوت فاعلیہ اور زمین کی قوت منفعلہ (قابلیہ) کے امتزاج کی وجہ سے فاعل مختار کی قدرت سے پیدا ہوتے ہیں

---

[1] بحوالہ مفتاح السعادۃ ج ا ص ۴۲۲

(اور یہ اشارہ) اس لیے کہ ہر آیت کے لیے ظہر و
بطن ہے اور ہر حکم کے لیے ایک اطلاع کا مقام ہے۔

بہر حال عارفانہ لطائف کا کلام اللہ سے استنباط ایسا ہی ہے جیسا کہ اس شعر سے حضرت علیؓ کا نام " علی " اخذ کیا جاتا ہے ؎

چشم بکشا زلف بشکن اے یارِ من
بہر تسکینِ دلِ بریانِ من

انہی لطائف و اسرار کو صاحبِ روح البیان حضرت علامہ اسمٰعیل حقی نور اللہ مرقدہٗ نے بیان فرمایا ہے جسے ہم نے "تفسیر صوفیانہ" سے موسوم کیا ہے۔ سیّدنا ابن العربی قدس سرہٗ اور ان کے معتقدین نے متعدد تصانیف و تفاسیر لکھیں اور اسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے جسے فقیر نے تفاسیر کی بحث اور دیگر مقامات پر عرض کر دیا ہے۔

چونکہ فقیر کو صوفیہ کرام سے عقیدت ہے اور تمنا رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی محبت و عقیدت میں مارے اور انہی کے زمرے میں اٹھائے اور میدانِ حشر میں ان کی رفاقت نصیب فرمائے۔ اسی لیے مضمون کو انہی کے مقدس ذکر پر ختم کرتا ہوں:

احب الصالحین ولستُ منهم
لعل الله یرزقنی صلاحاً
شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم



اٰیاتها ۷	(۱) سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ (۵)	رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ اِيَّاكَ نَعْبُدُ

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ

اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○

ترجمہ : اللہ کے نام سے شروع جو مہربان رحم والا ہے۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جو تمام جہانوں کا مالک ہے بہت مہربان رحمت والا ہے روزِ جزا کا مالک ہے اے اللہ ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ہم کو سیدھے راستے پر چلا ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، نہ ان کا جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔

تفسیر عالمانہ قرآن پاک کی تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ شریف پڑھنے میں حکمت یہ ہے کہ اعوذ باللہ شریف ایک قسم کی طلبِ اجازت اور بمنزلہ دروازہ کھٹکھٹانے کے ہے کیونکہ شاہانِ زمان کی عادت ہے کہ جب کوئی ان کے حضور میں حاضر ہونا چاہتا ہے کہ اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ پہلے اجازت طلب کرے پھر بارگاہ میں حاضر ہو اسی طرح جس کا قرآن پاک کی تلاوت کا ارادہ ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ میں اپنے محبوب کے ساتھ مناجات کا شرف حاصل کروں، تو مناجات جیسی باریابی کے لیے اسے زبان کو پاک وصاف کرنے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے کیونکہ فضول کلام کرنے اور کسی پر بہتان باندھنے سے زبان نجس ہوجاتی ہے پھر زبان کو اعوذ باللہ سے پاک کرکے تلاوت شروع کرتا ہے (کیونکہ اس سے زبان پاک ہوجاتی ہے)

تفسیر صوفیانہ اہلِ معرفت فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ طالبین تقرب کا وسیلہ اور خائفین کی مضبوط رسّی اور مجرمین کی مسرت گاہ اور ہالکین کا مرجع اور محبین کی فرصت ہے۔ یعنی خالقِ کائنات کے فرمان (جو کہ سورہ نحل میں ہے) فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ (جب تم قرآن پڑھو تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو) کی تعمیل ہے۔

مسئلہ : تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ اعوذ باللہ شریف قرآن پاک کی تلاوت سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔

سوال : نحویوں کا قانون ہے کہ جزا شرط کے بعد ہوتی ہے اور (آیت میں) فاستعذ باللہ الخ جزا ہے تو چاہیے تعوذ قرآن کی تلاوت کے بعد ہو۔

جواب : آیت میں اذا قرأت القرآن کا معنی اذا اردت القرأۃ ہے۔ یعنی تم تلاوت کا ارادہ کرو تو پھر اعوذ باللہ پڑھو۔ (گویا آیت مؤول ہے) اور یہ تاویل عام مشہور ہے۔ اس تاویل کو حقیقیہ عرفیہ کا قائم مقام کہتے ہیں۔

ف : مختار قولِ جمہور کا ہے وہ یہ کہ اعوذ باللہ شریف کے الفاظ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ہیں کیونکہ باعتبار روایت کے یہی الفاظ زیادہ مناسب ہیں۔ حدیث شریف میں ہے :

حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

اقرانیہ جبریل عن القلم عن اللوح المحفوظ۔ یعنی مجھے جبریل علیہ السلام نے قلم اور لوحِ محفوظ سے اسی طرح نقل کرکے سنایا ہے۔

اگرچہ باعتبار روایت اور مامور بہ فاستعذ باللہ کے مطابق استعیذ باللہ من الشیطان الرجیم ہے۔

شانِ نزول سب سے پہلے جو چیز جبریل علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور لائے وہ یہی تعوذ اور بسم اللہ شریف اور آیت اقراء باسم ربّك ہے۔

حلِ لغات : اعوذ بمعنے التجا، یعنی پناہ چاہتا ہوں۔ یا بمعنی استجیر یعنی امان چاہتا ہوں۔ یا بمعنی استعین یعنی امداد چاہتا ہوں۔ یا بمعنی استغیث یعنی فریاد و مدد چاہتا ہوں۔ عَوْذٌ عِیَاذٌ لَوْذٌ وَلِیَاذٌ اور صومٌ وصِیَامٌ کی طرح مصدر ہے۔

ف : تعوذ پڑھنے والے کا قول اعوذ باللہ الخ ایک قسم کی خبر ہے جو دراصل وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کر رہا ہے گویا کہہ رہا ہے:

اَعِذْنِیْ یَا رَبِّ ۔ اے میرے رب! مجھے پناہ دے دے۔

اور انشاء سے خبر کی طرف عدول کرنے میں تفاؤل بالوقوع (یعنی اچھی فال کے واقع ہونے) کا فائدہ حاصل ہوا۔ گویا پناہ مانگنا واقع ہو گیا اور یہ اسی کی خبر دے رہا ہے۔

نکتہ : تفسیر کبیر میں ہے اللہ تعالیٰ اور اس بندے کے مابین ایک وعدہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ وَاُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (تم میرا وعدہ پورا کرو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا) میں بیان فرمایا ہے۔ پس گویا بندہ کہتا ہے اے میرے اللہ! میں باوجود نقصِ بشریت کے اپنا وعدۂ عبودیت پورا کر رہا ہوں کہ اعوذ باللہ یا استغفر اللہ کا ورد کر رہا ہوں۔ پس اے کریم! آپ کے شایانِ شان ہے کہ اپنے عہدِ ربوبیت کو پورا فرمائیو اور مجھے اپنی پناہ میں لیجیو۔

تفسیر عالمانہ بِاللّٰهِ اہلِ حق کا مذہب ہے کہ یہ لفظ (اللہ) کسی کلمہ سے مشتق نہیں۔ کیونکہ اس کی کنہ میں ادراک عاجز ہے۔ اسی لیے علامہ تفتازانی تفسیر کشاف کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ جس طرح اس کی ذات و صفات میں وہم و ادراک حیران ہیں اسی طرح اس کے لفظ میں بھی جو اس پر دلالت کرتا ہے کے ادراک میں بھی حیران ہیں کہ نہ معلوم وہ اسم ہے یا صفت، مشتق، علم ہے یا غیر مشتق، علم ہے یا غیر علم۔ واللہ اعلم۔

حضرت مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

ذات او را در تصوّر کنج کو
تا در آید در تصور مثل او

ترجمہ : اس کی ذات تصورات کے گوشوں میں نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مثل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ف : استعاذہ کے تین کلمات ہیں:

۱۔ صفاتیہ ۲۔ افعالیہ ۳۔ ذاتیہ

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کو اپنی اس دُعا میں جمع فرمایا ہے :

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عَقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ ۔

ترجمہ : اے اللہ ! میں تیری رضا کی بدولت تیری ناراضگی سے اور تیری معافی کی بدولت تیری عقوبت سے اور تیری ذات کی بدولت تجھ سے پناہ چاہتا ہوں ۔

تعوذ میں اسمِ جلالی کو لیا گیا ہے جو جامع ہے تاکہ استعاذہ کی عبارت اپنے جمیع انواع کو شامل ہو جائے ۔

ف : تفسیر کبیر میں ہے کہ شرور یا تو اعتقادیات سے ہیں اور تعوذ میں جمیع مذاہب اور تمام گمراہ فرقوں کے (جو کہ بہتر ہیں) کے عقاید داخل ہو جاتے ہیں یا اعمالِ بدنیہ سے ۔ پھر اعمالِ بدنیہ بعض تو وہ ہیں جو دین کو نقصان پہنچانے والے ہیں جیسے منہیاتِ شرعیہ کہ جن اعمال سے شرع مطہر نے ممانعت فرمائی ہے اور ان کا شمار مشکل ہے ۔ اور بعض وُہ ہیں جو دین میں رخنہ تو نہیں ڈالتے مگر ہیں تباہ کن، جیسے امراض، جمیع قسم کے درد، آگ وغیرہ کا جلانا، پانی وغیرہ میں ڈوبنا، مفلسی، اندھاپن، ہاتھ پاؤں کا شل ہونا اور دیگر جملہ بلائیں اور مہلک بیماریاں کہ جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا ۔

ف : تعوذ تمام اقسامِ مذکورہ (شرور اعتقادیات، اعمال بدنیہ) کو شامل ہے ۔ پس عاقل پر لازم ہے کہ جس وقت اعوذ باللہ شریف پڑھنے کا ارادہ کرے تو ان مذکورہ بالا آفتوں کے جمیع اقسام ثلاثہ اور جمیع اقسام متناولہ کو دل میں لائے ۔ اور پہلے بتایا جا چکا ہے کہ امراض کا شمار غیر ممکن ہے اور مخلوق کی قدرت کی بھی اس کے دفع کرنے کے لیے غیر مکتفی ہے تو چاہیے یوں عرض کرے : اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْقَادِرِ عَلٰى كُلِّ الْمَقْدُوْرَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْمَهَالِكِ وَالْاٰفَاتِ ۔

(میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں، وُہ اللہ جو تمام مقدورات پر قادر ہے، تمام خوفناک مقامات و جمیع آفات سے)

ف : بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام علوم باری تعالیٰ نے چار کتب سماویہ (توراۃ، انجیل، زبور، قرآن مجید) میں جمع فرمائے ہیں ۔ اور ان چار کتب کا علم قرآن پاک میں اور قرآن پاک کا علم سورۂ فاتحہ میں اور سورۂ فاتحہ کا علم بسم اللہ شریف میں اور بسم اللہ شریف کا علم بسم اللہ کی باء میں ۔

نکتہ : تفسیر کبیر میں ہے کہ جمیع علوم کے بسم اللہ کی باء میں مجتمع ہونے میں یہ حکمت ہے کہ علم میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو اپنے مولا کا وصال نصیب ہو جائے اور بسم اللہ کی باء الصاق کی ہے اور اب معنی یہ ہوا کہ بسم اللہ کی باء بندہ کو اپنے مولا سے ملا رہی ہے ۔ اس کے علاوہ باء کے متعلق نکتے ہیں جو بسم اللہ شریف کی تفسیر میں آئیں گے ۔ اِن شاءَ اللہ تعالیٰ ۔

مِنَ الشَّيْطٰنِ شیطان بمعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہونے والا ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب شیطان نے اپنے مالک کی نافرمانی کی تو مالک لم یزل نے اُسے اپنی رحمت سے دُور فرمایا ۔ اسی نافرمانی کی وجہ سے شیطان ہو گیا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان اس نام سے بعد از لعنت موسوم ہوا ۔ ورنہ اس سے پہلے اس کا نام عزازیل

یا نازل تھا۔

سوال : تعوذ میں مستعاذ منہ یعنی جس سے پناہ لی گئی ہے یعنی اس کے قبائح اور اس کے نقصانات مثلاً دھوکہ دینا، مکر و فریب کرنا، بہکانا، وسوسہ ڈالنا، ناچاقی کرانا وغیرہ وغیرہ کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔

جواب : (مترجم) قانون ہے کہ جب مفعول کا ذکر نہ کیا جائے تو فعل عام ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی مفعول کو حذف کیا گیا ہے تاکہ شیطان کی تمام برائیوں سے پناہ کا ارادہ ہو۔

ف : (تحفۃ الاخیار امام غزالی) شیطان مذکر بھی ہے مونث بھی، بچے بھی جنتے ہیں مگر مرتے نہیں بلکہ ہمیشہ رہیں گے (تا نفخ صور)۔ اور جنات مذکر بھی ہیں اور مونث بھی۔ یہ بھی بچہ جنتے ہیں مگر ان پر موت آتی ہے۔ اور فرشتے نہ مذکر ہیں نہ مونث، نہ بچے جنتے ہیں نہ کھاتے پیتے ہیں۔ اس سے جنات کی حقیقت اور ان کا وجود ثابت ہوا۔ اور جنات کے وجود کا سوائے فلسفیوں کی چھوٹی سی جماعت کے بعض جاہل افراد یا بعض اطباء و امثالہا (یعنی ان جیسے اور) کے اور کسی نے انکار نہیں کیا۔

حکایت محی السنۃ امام غزالی قدس سرہٗ (آپ ثقلین (جن و انس) کے مفتی اعظم تھے) نے ایک دن جنات سے دنیا کے کارناموں کے متعلق پوچھا اُنھوں نے عرض کی کہ زمخشری ایک کتاب تفسیر لکھ رہا ہے جواب تک نصف حصہ تحریر کر چکا ہے۔ آپ نے فرمایا وہی تحریر کردہ کتاب (تفسیر) لے آؤ۔ جب جنات تفسیر لے آئے آپ نے اس کو نقل کر کے واپس کر دیا۔ ایک روز زمخشری کو امام غزالی قدس سرہٗ کے حضور میں حاضری کا شرف ملا تو آپ نے وہی تفسیر زمخشری کو دکھلائی۔ زمخشری دیکھ کر متعجب ہوا اور عرض کی کہ اگر کہوں کہ یہ میری تفسیر کی نقل ہے تو بھی بے جا ہے کیونکہ وہ تو میں نے ایسی جگہ چھپائی ہوئی ہے کہ بجز میرے کسی اور کو علم ہی نہیں، اگر کہوں کہ یہ وہی تفسیر ہے تو پھر یہاں کیسے آئی! اگر کہوں کسی دوسرے کی ہے تو بھی عقل نہیں مانتی۔ کیونکہ اس کے الفاظ و معانی اور وضع و ترتیب بعینہ میری کتاب جیسی ہے تو دو مصنفوں کا ایک ہی طرح کے الفاظ و معانی، وضع و ترتیب پر غائبانہ متفق ہو جانا محال ہے۔ امام غزالیؒ نے فرمایا کہ یہ کتاب تیری تفسیر کی نقل ہے، ہم کو جنات کے ذریعہ پہنچی ہے۔ زمخشری قبل ازیں جنات کے وجود کے قائل نہیں تھے۔ اس حیرت انگیز کرشمہ کو دیکھ کر اسی وقت جنات کے وجود کے قائل ہو گئے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جنات کو علم غیب حاصل ہے۔ مولا عز و جل بھی فرماتے ہیں : تبینت الجن ان لو کانوا یعلمون الغیب مالبثوا فی العذاب المہین۔ یعنی جب سلیمان علیہ السلام زمین پر آئے جنوں کی حقیقت کھل گئی۔ (یعنی وہ غیب نہیں جانتے) اگر غیب جانتے ہوتے تو اس خواری کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔

ف : پھر اُن کی حقیقت ان لوگوں کے نزدیک (جو جنات کو مجردات نہیں مانتے یہ ہے) جنات ہوائی اجسام ہیں۔ بعض کہتے ہیں یہ ناری اجسام ہیں۔ یہ مختلف شکلوں میں متشکل ہونے پر قادر ہوتے ہیں۔ مثلاً سانپ، بچھو، کتے، اونٹ، گائے، بکری، گھوڑے، خچر، گدھے۔ انسان کی شکل اختیار کرنا بھی ان کے اختیار میں ہے۔ ان میں عقل بھی ہے اور فہم بھی۔ اور بہت بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے محل اور تصویریں اور بڑے حوضوں کے برابر لگن اور لنگر دار

دیگیں تیار کرتے تھے ۔ اور وہ لوگ جو ان کے مجردات کے قائل ہیں تو وہ ان کی دو اقسام مانتے ہیں :

۱۔ ارضیہ سفلیہ

۲۔ عالیہ

ارضیہ سفلیہ۔ یہ اس لیے کہ مجردات یعنی وہ موجودات جو نہ متحیز ہیں اور نہ کسی متحیز میں حلول کرنے والے ہیں۔

عالیہ۔ ان میں بعض وُہ عالی ہیں جو اجسام کی تدبیر سے مقدس ہیں اور وُہ ملائکہ مقربین ہیں جنہیں مشائین حضرات عقول سے تعبیر کرتے ہیں اور اشراقین صاحبان ان کا انوارِ عالیہ قاہرہ نام رکھتے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو جسم کی تدبیر سے تعلق رکھتے ہیں ان کو مشائین نفوسِ سماویہ اور اشراقین انوار مدبرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان سب سے برگزیدہ حاملینِ عرش ہیں جو اس وقت چار ہیں اور قیامت میں آٹھ ہو جائیں گے۔ ان کے بعد وہ جو کہ عرش کے ارد گرد کھڑے ہیں۔ پھر کرسی والوں کا درجہ، پھر ساتویں آسمان والوں کا، اسی طرح درجہ بدرجہ آسمانوں کے ملائکہ کا، مثلاً آسمانوں کے ملائکہ میں سب سے اہم درجہ ساتویں آسمان والوں کا، اسی طرح اوّل تک۔ پھر کرۂ اثیر اور اس ہوا والوں کا، جو نسیم کی طبع رکھتی ہے۔ پھر کرۂ زمہریر والوں کا، پھر پہاڑ والوں کا، پھر ارواحِ سفلیہ والوں کا، جو نباتات اور حیوانات کے اجسام میں تصرف کرنے والے ہیں۔ اور یہی پچھلے بعض تو نورانی شکل کے ہوتے ہیں اور نہایت درجہ کے صالح ہوتے ہیں جن کو جناتِ صالحین کہا جاتا ہے اور بعض کالے رنگ اور شریر قسم کے ہوتے ہیں، اور شیطان اسی پچھلی قسم سے ہیں۔ (کذا فی تفسیر الفاتحہ للفناری)

ظاہر یہ ہے کہ لفظ شیطان سے ابلیس اور اس کے خدام مراد ہیں۔

تفسیر صوفیانہ جو بھی متکبر اور سرکش ہو، جو ذکرِ الٰہی سے روکے، وہ شیطان ہے، خواہ وہ جن ہو یا انسان۔ کما قال تعالیٰ: وَشَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ (شیاطین انسان بھی ہوتے ہیں اور جن بھی)

تفسیر عالمانہ الرَّجِيْمِ بمعنے فرشتوں کے ہٹانے سے آسمانوں سے زمین کی طرف پھینکا ہوا اور آسمان کی چنگاریوں کا مارا ہوا، جبکہ وہ آسمان کی جانب جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ یہ شیطان کی بہت بڑی مذموم صفت ہے۔ قرآن پاک میں شیطان کے اسماء بہت منحوس قسم کے گنے گئے ہیں اور اس کی صفتیں بہت مذموم طرز کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ لفظ رجیم اس کی تمام برائیوں کا مجموعہ ہے کیونکہ جتنی عقوبات اس پر عائد ہوتی ہیں یہ لفظ ان سب کا جامع ہے۔ اسی لیے ابتدا میں اس کے اسماء صفات میں اسی لفظ رجیم کو اختیار کیا گیا ہے۔

تفسیر صوفیانہ استعاذہ میں فقط زبانی جمع خرچ نہ ہونا چاہیے بلکہ اس وقت حضورِ قلب کا ہونا نہایت ضروری ہے اور قول حال و فعل کے بالکل مطابق ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ زبان سے تو کہہ رہا ہو اعوذ باللہ، مگر حال و فعل کا ورد اعوذ بالشیطان ہو۔

عارف کا استعاذہ : عارف رویت غیر اللہ اور حجاب کثرت سے پناہ مانگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان عارف کے

نور سے دُور بھاگتا ہے۔

حکایت حضرت ابوسعید خراز رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو خواب میں دیکھا تو اُسے اپنے عصا سے مارنے کا ارادہ فرمایا۔ شیطان نے عرض کی، اے ابوسعید! میں عصا کی مار سے نہیں ڈرتا۔ ہاں آفتابِ معرفت کی شعاع سے ضرور کانپ جاتا ہوں۔ یعنی وہ آفتابِ معرفت جو قلبِ مبارک کے نورانی آسمان سے طلوع ہوتا ہے۔

سوال: شیطان سے پناہ مانگنا غیر اللہ سے ڈرنا ہے اور یہ عبودیت کے خلاف ہے۔

جواب: دشمن کو دشمن سمجھنا بھی محبت کی نشانی اور غیر اللہ سے بھاگ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا بھی عبودیت کی علامت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں طاعت کے لیے تیار رہنا یونہی نصیب ہوتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرتا ہو اس سے ڈرنا اپنی عاجزی کا اظہار کرنا ہے جیسا کہ منقول ہے:

اَخَافُ مِنَ اللّٰہِ۔ اللہ سے ڈرتا ہوں۔ یعنی اس کے عذاب و غضب سے۔

اور منقول ہے:

اَخَافُ مِمَّنْ لَا یَخَافُ اللّٰہِ۔ اس سے ڈرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا۔ یعنی اس کے بُرے افعال سے۔

مولانا روم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ؎

آدمی را دشمن پنہاں بسیست
آدمی با حذر عاقل کسیست

ترجمہ: آدمی کے چھپے ہوئے دشمن بہت ہیں۔ سمجھدار آدمی وُہ ہے جو دشمن سے ڈرتا ہو۔

ف: (۱) تفسیر کبیر میں ہے کہ اعوذ باللہ پڑھنا مخلوق سے اعراض اور خالق کی طرف رجوع کرنا ہے اور حاجتِ کامل (جو نفس کو درپیش ہوتی ہے) سے رُوگردانی کر کے غنائے تامِ حقی کے ساتھ جمیع خیرات کے حصول کی طرف راغب ہونا اور اسی کی بدولت تمام بلیات کو دفع کرنا ہے۔ یہی راز ہے فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ[1] میں اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب بجز عجز کے حاصل نہیں ہوتا اور عجز سالک کا انتہائی مقام ہے۔

(۲) حضرت حسن فرماتے ہیں جس نے حقیقی طور پناہ مانگی، یعنی حضورِ قلب کے ساتھ، تو اللہ تعالیٰ اس کے اور شیطان کے درمیان تین سو پردے لٹکا دیتا ہے۔ ہر پردہ کے مابین زمین آسمان کے درمیان جتنی مسافت ہوتی ہے۔

حدیث درحکایت ابلیس خبیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر نکلے تو وہاں ابلیس ملعون کھڑا تھا۔ آپ نے فرمایا: اے کم بخت! کیا چیز تجھے مسجد کے قریب لائی ہے؟ اس نے عرض کی، حضور! مجھے اللہ تعالیٰ نے آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تجھے میرے ہاں کیوں بھیجا؟ شیطان نے عرض کی: تاکہ آپ

---

[1] ترجمہ: پس اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگو۔ — اویسی غفرلہٗ

مجھ سے اپنے حسبِ منشا کچھ پوچھیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ پہلے آپ نے اس سے نماز کے متعلق پوچھا، فرمایا کہ اے ملعون! میری اُمت کو نماز با جماعت سے کیوں روکتا ہے؟ عرض کی، حضور! جس وقت آپ کا کوئی امتی نماز باجماعت کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو مجھے تپِ محرقہ گھیر لیتا ہے۔ جب تک وہ واپس نہیں ہوتا میں اس مرض میں مبتلا رہتا ہوں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ تو ان کو علم و دُعا سے کیوں روکتا ہے؟ عرض کی، اس لیے کہ ان کی دُعا سے اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس وقت شفا ہوتی ہے جب وہ فراغت پاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اُن کو قرآن پڑھنے سے کیوں روکتا ہے؟ عرض کی: قرأت سے مَیں قلعی کی طرح (آگ میں) پگھلتا رہتا ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا: اُن کو جہاد سے کیوں روکتا ہے جبکہ وہ جہاد کے لیے نکلنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ عرض کی، جب وہ جہاد کے لیے نکلتے ہیں تو اس وقت میرے قدموں میں زنجیر ڈالے جاتے ہیں یہاں تک کہ واپس نہ لوٹیں، اسی طرح جب وہ حج کو جاتے ہیں تو ان کی واپسی تک میرے گلے میں طوق اور پاؤں میں زنجیر ڈالے جاتے ہیں اسی طرح جب وہ صدقہ کا ارادہ کرتے ہیں تو میرے سر پر کلہاڑے چلتے ہیں جو مجھے ایسے کاٹتے ہیں جیسے لکڑیوں کو کاٹا جاتا ہے۔

روحانی نسخہ

(۱) شیطان بنی آدم کی طبیعتوں پر کھانے پینے کی وجہ سے مسلّط کیا گیا۔ جب بنی آدم کھانے پینے کو خیر باد کہہ دے تو پیٹ اور فرج کی شہوت کی بیخ کنی ہوگی۔ بعدازاں شیطان کی مداخلت (یعنی گمراہ کرنا) بھی بند۔

(۲) نفس کی اصلاح کا سبب یہی پانچ نمازیں ہیں کیونکہ ان کی فرضیت بھی اصلاحِ نفس کے لیے ہے، اس لیے کہ نماز میں تین طرح کی عاجزی ہے:

(۱) بہت بڑے بادشاہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا۔

(۲) رکوع کرکے عاجزی ظاہر کرنا۔

(۳) سجدہ کرکے اظہارِ عجز کرنا۔ اور نفس بھی خشوع و خضوع اور عاجزی سے اصلاح پذیر ہوتا ہے۔

حکایت

ف: حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ جب سیدنا نوح علیٰ نبینا وعلیہ السلام کشتی سے (بعد از طوفان) باہر تشریف لائے تو ابلیس ملعون حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: اے بدبخت! یہ تو بتا کہ بنی آدم کے کون سے عادات تجھے اور تیرے لشکر کو گمراہ اور ہلاک کرنے میں معاونت کرتے ہیں؟ ابلیس ملعون نے جواب میں کہا کہ جب ہم بنی آدم کو کنجوس، بخیل، بدخواہ، سرکش اور جلد باز پاتے ہیں تو ہم گٹھڑی کی طرح اُسے جھپٹ لیتے ہیں۔ جب کسی انسان میں یہ تمام مذکورہ عادات جمع ہوتی ہیں تو ہم اس کا شیطان مرید (سرکش) نام رکھتے ہیں۔

اعجوبہ

حدیث شریف میں ہے کہ ابلیس ملعون کے سامنے ہر روز دنیا پیش ہوتی ہے۔ پھر یہ کم بخت اعلان کرتا ہوا کہتا ہے کہ کوئی ہے جو مجھ سے وہ چیز خریدے جس میں اس کا نقصان اور پریشانی ہو۔ تو دنیا دار لوگ یہ منادی سُن کر کہتے ہیں کہ اس کے خریدار ہم ہیں۔ شیطان انہیں سمجھاتا ہوا کہتا ہے: بھائیو! اتنی جلدی نہ کرو، ذرا سوچ لو، یہ تو بڑی عیب دار تجارت ہے۔ دنیادار کہتے ہیں کوئی بات نہیں ہم اسے ضرور خریدیں گے۔ شیطان کہتا ہے اس کا ثمن نہ درہم ہیں

نہ وناتیر بلکہ اس کا ثمن تمہارا وہ نیک نصیبہ ہے جو تمہیں بہشت سے عطا ہوگا۔ یعنی تم سے تمہارے نصیبہ کو چار چیزیں دے کر خریدتا ہوں :

۱۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت

۲۔ اس کا غضب

۳۔ اس کا عذاب

۴۔ اس کی دوستی سے انقطاع

یہ اشیاء دے کر میں تم سے بہشت خریدوں گا۔ دنیادار سُن کر کہتے ہیں بسروچشم۔ یعنی ہمیں یہ سودا منافع میں ہے۔ پھر شیطان کہتا ہے کہ میری خواہش ہے کہ مجھے ثمن کچھ بڑھادو (کیونکہ مجھے تجارت میں نقصان معلوم ہوتا ہے) وہ اس طرح کہ اپنے قلوب پر ان اشیاء کا ایسا گھر بناؤ اور پکا ارادہ کرلو کہ اس ارادہ سے تم ہرگز نہ ہٹو گے۔ دُنیادار کہتے ہیں ہم پہلے ہی عزم بالجزم کرچکے ہیں۔ یہ کہہ کر دنیادار دُنیا لے لیتے ہیں۔ شیطان ہنس کر کہتا ہے : بِئْسَتِ التِّجَارَةُ (یہ بہت بُری تجارت ہے)۔

حافظ شیرازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : ؎

مجو درستیِ عہد از جہان سُست نہاد

کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد ست

ترجمہ : اس جہان کمزور طبیعت سے وفا کی امید نہ رکھو اس لیے کہ اس بڑھیا نامراد کے ہزاروں داماد ہیں۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں : ؎

۱ بر مردِ ہشیار دنیا خسیست

کہ ہر مدتے جائے دیگر کسیست

۲ منہ بر جہاں دل کہ بیگانہ ایست

کہ مطرب کہ ہر روز در خانہ ایست

۳ نہ لائق بود عشق با دلبرے

چو ہر بامدادش بود شوہرے

ترجمہ : (۱) ہوشیار مرد کے نزدیک دنیا کوئی شے نہیں کیونکہ ہر آن اس کی جگہ بدلتی رہتی ہے۔

(۲) جہانِ دنیا سے دل نہ لگا کیونکہ یہ جہان بیگانہ ہے، جیسے کہ سرود بجانے والا ہر روز نئے گھر میں ہوتا ہے۔

(۳) اس محبوب سے دل لگانا اچھا نہیں جو ہر صبح نیا شوہر اختیار کرے۔

حدیث شریف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شیطان کے وسوسہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: چور اس گھر میں داخل نہیں ہوتا جس میں کوئی شے نہ ہو۔ یہ وسوسہ تو ایمان کی وجہ سے ہوتا ہے۔

فرمانِ علی سیّدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہماری نماز اور اہلِ کتاب کی نمازیں فرق صرف وسوسہ کی وجہ سے ہے کیونکہ شیطان کفار کے عمل سے تو فارغ ہو چکا ہے۔ کفار کا ہر فعل اس کی مرضی کے موافق ہوتا ہے۔ اور مومن چونکہ اس کی مخالفت اور اس کے ساتھ مجادلہ کرتے ہیں تو وہ بھی ان سے مقابلہ کرتا ہے۔ یعنی ان کے دلوں میں وسوسہ ڈال کر ان کی مخالفت کرتا ہے۔

حکایت ایک شخص خراسان سے عراق جاتا رہتا تھا اور ہر دفعہ ایک مولوی صاحب کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے رفتہ رفتہ علم و حکمت کی چار ہزار احادیث یاد کرا دیں۔ واپس وطن جانے کے لیے اپنے استاد صاحب سے اجازت طلب کی۔ استاد صاحب نے فرمایا: میں تجھے ایک ایسا کلمہ نہ سکھا دوں جو ان احادیث سے بھی زیادہ مفید ہو؟ عرض کی: ہاں جی، ضرور سکھائیے۔ مولوی صاحب نے فرمایا: تمہارے خراسان میں شیطان بھی ہے؟ عرض کیا: ہاں جی۔ فرمایا: کیا وہ وسوسہ بھی ڈالتا ہے؟ عرض کیا: ہاں جی۔ فرمایا: تو پھر تم اس کے دفعیہ کے لیے کیا کرتے ہو؟ عرض کیا: اُسے ہٹاتے ہیں۔ فرمایا: اگر پھر وسوسہ ڈالے تو؟ عرض کیا: پھر اسے دفع کرتے ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا: جب یہ خدا کا دشمن تمہیں تکلیف دے اور عبادت سے روکے تو تم اس کے وسوسہ کے روکنے کے درپے نہ ہو بلکہ ایسے ہو جاؤ جیسے چرواہے کے کُتّے کے ساتھ کوئی اجنبی آدمی ہوتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو کیونکہ وہ منجملہ کُتّوں کے ایک کُتّا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اُس کے مکر و شر سے بچائے۔ آمین

تفسیرِ عالمانہ بِسْمِ اللّٰهِ اللہ کے نام کے ساتھ۔

مسئلہ: زیادہ صحیح اور مقبول قول متاخرین احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ بسم اللہ شریف ایک آیت ہے مگر کسی سورت کا جزء نہیں ہے۔ محض سورتوں کے فرق بتانے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ ہر کام شروع کرتے وقت اس سے تبرک لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس کے ذکر سے تبرک حاصل کیا جاتا ہے۔

ف: ۱۔ بسم اللہ شریف قرآن پاک کی کنجی ہے۔

۲۔ یہ وہ پہلا کلمہ ہے جو سیّدنا آدم علیہ السلام پر نازل ہوا۔

شانِ نزول کفار کی عادت تھی کہ ہر کام شروع کرتے وقت اپنے بُتوں کے نام لیتے تھے۔ یعنی بسم اللات و العزّٰی کہتے۔ پس مومن اہلِ توحید پر لازم ہوا کہ اپنا ہر کام شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا اسمِ مبارک زبان پر لائے تاکہ اللہ تعالیٰ کا نام مقدم رہے اور فعل مؤخر۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں فعل مؤخر کر کے محذوف مانا جاتا ہے۔ یعنی اصل عبارت بسم اللہ اقرأ یا اتلوا وغیرہ تھی۔

تفسیرِ صوفیانہ مفسرین فرماتے ہیں کہ جمیع علوم بسم اللہ کی باءُ میں امانت رکھے گئے ہیں۔ گویا بسم اللہ شریف کا اصل معنیٰ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جو کچھ تھا مجھ سے تھا اور جو کچھ ہوگا مجھ سے ہوگا اور تمام عالم کا ہونا میرے توسط سے ہے اور میرے سوا کسی دوسرے کا وجود نہیں اگر ہے تو مجازی و اسمی۔ یہی مطلب ہے صوفیاءِ کرام کے اس قول کا، جو فرماتے ہیں، مَیں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ نہ ہو۔

حدیث شریف اور یہی مقصد ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث شریف کا، فرماتے ہیں: "دہر کو گالی مت دو، کیونکہ دہر تو اللہ تعالیٰ ہے۔"

سوال: کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی ابتداء میں جمیع حروف میں سے باء کو اختیار فرمایا؟ نہ الف سے۔ بلکہ بسم اللہ شریف میں سے تو الف کو حذف کرکے باء کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

جواب: اس میں دس حکمتیں ہیں:

۱۔ الف میں بلندی، تکبّر، تطاول اور باءُ میں عجز، تواضع، انکساری ہے۔ پس بمطابق قاعدہ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ باءُ الف سے رتبہ میں بڑھ گئی۔

۲۔ باءُ الصاق کے لیے آتی ہے (جس کا معنیٰ ملنا ملانا ہے) بخلاف اکثر حروف، بالخصوص الف کے کہ وہ حرفِ قطع سے ہیں (جس کا معنیٰ جدائی ہے)۔

۳۔ باءُ ہمیشہ مکسور پڑھی جاتی ہے جب کہ اس کے ظاہر و باطن میں عجز و انکسار پایا گیا ہے۔ پس اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عندیت یعنی قرب کا درجہ نصیب ہوا۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں ان قلوب کے قریب ہُوں جو میری خاطر ہمیشہ عجز و انکساری میں رہتے ہیں۔

۴۔ باءُ میں بظاہر عجز و انکسار، مگر بہ باطن اس میں بلندیِ درجات و علوِ ہمّت ہے اور یہ صفات صدیقین کے ہیں۔ یہ صفات الف میں نہیں ہیں۔ بلندیِ درجہ تو یہ کہ اس میں نقطہ ہے اور الف میں نہیں۔ اور بلندیِ ہمّت یہ کہ اس کو بہت سے نقطے پیش کیے گئے تو اس نے سوائے ایک کے باقی کو قبول نہیں فرمایا تاکہ اس کا حال اس عاشقِ صادق جیسا ہو جائے جو صرف ایک محبوب کی طلب رکھتا ہے۔

۵۔ باءُ میں قربتِ حق کی طلبِ صادق ہے کیونکہ جب اُسے نقطہ ملا تو نقطہ کو اپنے قدموں میں پھینک دیا اور نقطہ ملنے سے نازاں بھی نہیں ہوئی۔ جیم اور یا میں یہ بات نہیں اس لیے ان کے نقطے ان کے نیچے نہیں بلکہ باعتبارِ وضع حروف کے وسط میں ہیں۔ ان کو دوسرے حروف سے ملانے سے اُن کے نقطے نیچے ہو جاتے ہیں، مگر اس وقت نقطوں کا نیچے ہونا اس لیے ہے کہ جیم کو خاء سے اور یاء کو تاء سے مشابہت نہ ہو جائے بخلاف باءُ کے کہ اُس کا نقطہ ہمیشہ اس کے نیچے ہوتا ہے خواہ وہ تنہا ہو یا کسی دوسرے حرف سے ملی ہوئی ہو۔

۶- الف حرفِ علت ہے بخلاف باء کے۔

۷- باء باعتبارِ معنیٰ حرفِ تام اور متبوع ہے اگرچہ باعتبار ظاہر کے تابع ہو کر آئی ہے (یعنی حروف کی وضع کے وقت الف کے بعد میں واقع ہوئی ہے۔ اور معنی کے لحاظ سے الف باء کے تابع ہوا کرتا ہے بخلاف باء کے کہ وہ الف کی تابع ہو کر نہیں آئی۔ اور جو چیز معنوی اعتبار سے متبوع ہو وہ اقوی ہوتی ہے۔

۸- باء حرفِ عامل اور متصرف اپنے غیر میں ہے۔ اسی وجہ سے یہ صاحبِ قدرت ہے بدیں وجہ ابتداء کے لائق ہوئی بخلاف الف کے کہ وہ عامل نہیں۔

۹- باء اپنے نفسی صفات کے اعتبار سے حرف کامل ہے بایں طور کہ الصاق و استعانت و اضافت کے لیے آتی ہے۔ دوسری بات اس میں یہ ہے کہ اپنے غیر کو مکمل کرتی ہے۔ یعنی اپنے مدخول کو مجرور کرتی ہے اور اسے مکسور بمعنی متواضع بناتی ہے۔ ایسا متواضع کہ اپنے صفات اس میں پہنچاتی ہے۔ اسے یہی بلند درجہ اور قدرت حاصل ہے کہ اپنے غیر میں توحید و ارشاد کی تکمیل کراتی ہے۔ اسی تقریر کے موافق سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد ہے کہ میں وہ نقطہ ہوں جو باء کے نیچے ہے۔ پس باء کو ارشاد و دلالۃ علی التوحید کا مرتبہ عطا کیا گیا ہے۔

۱۰- باء حرفِ شفوی ہے۔ اس کے پڑھنے سے جتنے ہونٹ کھلتے ہیں کسی دوسرے حرف شفوی میں نہیں کھلتے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے عالمِ ارواح میں الستُ بربکم کے جواب میں بلٰی بولتے وقت پہلے باء سے اپنا منہ کھولا تھا۔ پس یہی پہلا حرف ہے جو انسان نے بولا اور اسی سے اپنا منہ کھولا (یہ خصوصیات باء کی ہیں) اسی وجہ سے حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا ہوا کہ اس کو باقی حروف سے چن لے۔ لہٰذا تمام حروف سے اس کو چنا اور اس کی قدر و منزلت تمام حروف سے بلند فرمائی اور اس کے برہان کو ظاہر کیا اور اس کو کلام و کتاب و خطاب کا مفتح و مبداء بنایا۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

اسم اللہ وہ ہے جو باعتبار ذات یا کسی صفت صفات سلبیہ میں سے جیسے قدوس (یہ صفت سلبیہ ہے) یا باعتبار کسی صفت صفات ثبوتیہ میں سے جیسے علیم (یہ صفت ثبوتیہ ہے) یا باعتبار کسی فعل اس کے افعال میں سے جیسے خالق کے اس پر اطلاق کرنا صحیح ہو۔ لیکن اس کے اسماء بعض علماء کے نزدیک توقیفیہ ہیں (شرح المشارق لابن الملک)۔

ف : مختار یہ ہے کہ لفظ اللہ اسمِ اعظم ہے۔

سوال : اسم اعظم تو وہ ہے کہ جس کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے جو کچھ طلب کیا جائے وہ عطا فرما دے۔ ہم تو اس کے وسیلہ سے بہت کچھ مانگتے ہیں مگر اکثر اوقات محروم رہتے ہیں۔

جواب : دعا کے لیے چند آداب و شرائط ہیں جن کے بغیر دعا مستجاب ہوتی ہی نہیں۔ نماز کی طرح دعا کے بھی شرائط و

آداب ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے باطن کی اصلاح لقمۂ حلال سے کی جائے۔ جیساکہ اس کے حق میں کہا گیا ہے: دُعا آسمان کی کنجی ہے مگر اس کے دندانے لقمۂ حلال ہے۔ سب سے آخری شرط اخلاص وحضورِ قلب ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

فادعوا الله مخلصین لـه الدین۔

(اللہ کو پکارو نرے اس کے بندے ہوکر)

کیونکہ انسان کا فقط زبان کو متحرک کرنا اور فقط منہ سے آواز نکالنا، جس میں حضورِ قلب نہ ہو۔ دروازے پر ٹھہرنے والے کی طرح محض واویلا کرنا اور چھت پر چڑھ کر کسان کے آواز دینے کی مانند ہے۔ بہرحال قلب حاضر ہو تو حضوری قلب مالک کی بارگاہ میں دعا مانگنے والے کے لیے سفارش کرے گی۔

تحقیق اسمِ اعظم حضرت شیخ مؤیدالدین جندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں وہ اسمِ اعظم کہ جس کا ذکر مشہور ہوگیا ہے اور جس کی خبر چار سُو پھیل گئی ہے اور جس کا چھپانا لازم اور ظاہر کرنا حرام ہے وہ حقیقۃً ومعنیً عالمِ حقائق و معانی سے ہے اور صورۃً ولفظاً عالمِ صورت والفاظ سے ہے۔ جمیع حقائق کما لیہ سب کی سب احادیث کا نام حقیقت ہے اور اس کا معنی وہ انسان کامل ہے جو ہر زمانہ میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ قطب الاقطاب جو اماناتِ الٰہیہ کا حامل اور اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے اور اسمِ اعظم کی صورت ولی کامل کی ظاہری صورت کا نام ہے۔

ف: اسمِ اعظم کا علم سابقہ اُمم پر حرام کر دیا گیا تھا جب تک کہ حقیقتِ انسانیہ کا اپنی اکمل صورت میں ظہور نہ ہوا، بلکہ اس کا ظہور اس زمانہ کے کامل کی قابلیت پر موقوف تھا۔ جب اسمِ اعظم کا معنیٰ اور اس کی صورت رسولِ پاک صاحبِ تاجِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مقدس سے پایا گیا تو محض اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اسمِ اعظم کا علم مباح فرما دیا۔

الرَّحْمٰنِ رحمت لغت میں رقّت یعنی نرمیِ قلب اور انعطاف یعنی کسی پر مہربانی کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی لیے بچہ دانی کو رحم کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے مافیہا پر مہربان ہوتی ہے۔ یہاں فضل واحسان مراد ہے۔ یا بہ نسبت ہمارے سبب بول کر مسبب قریب یا بعید مراد لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء باعتبارِ نتائج لیے جاتے ہیں اور وہ غایات و نتائج افعال ہیں، باعتبار مبادی کے، اور وہ مبادی انفعلات ہیں۔ اور ذات باری تعالیٰ انفعال سے مبرا ہے۔ پس معنیٰ یہ ہوا کہ وہ اپنی مخلوق پر مہربانی فرمانے والا ہے۔ ان کو رزق دینے سے یا ان سے بلیات کو دفع کرنے سے، نہ تو متقی کا رزق بوجہ تقویٰ بڑھاتا ہے اور نہ مجرم کے جرم کو دیکھ کر اس کے رزق میں کمی کرتا ہے بلکہ ہر ایک کو اپنی مرضی کے مطابق رزق دیتا ہے۔ **الرَّحِیْمِ** وہ رحم کرنے والا ہے جس سے سوال کیا جائے تو عنایت کر دے اور جس سے طلب نہ کیا جائے تو غصہ کرے بخلاف بنی آدم کے کہ وہ سوال کیے جانے پر غضب ناک ہوتے ہیں۔ رحمت اللہ تعالےٰ کی

ذاتی صفات میں سے ہے اس لیے کہ رحمت بمعنی غیر پر ارادۂ خیر کرنا اور اس سے دفعِ شر کرنا۔ اور ارادہ ذات کی صفت ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ اس صفت سے موصوف نہ ہوتا تو جمیع موجودات کو پیدا نہ کرتا۔ پس جب اس نے جمیع مخلوق کو پیدا فرمایا تو ہمیں پتا چلا کہ رحمت اُس کی ذاتی صفت ہے کیونکہ خلق بمعنی مخلوق کو وجود کی خبر پہنچانا اور ان کو عدم کے شر سے بچانا اور وجود سب کا بہتر ہے۔

ف : حضرت فرماتے ہیں کہ رحمت صفاتِ الٰہیہ کی ایک صفت ہے اور رحمت ایک حقیقت ہے لیکن دو قسم پر ہے :

(۱) ذاتی (۲) صفاتی۔

اور اسمائے ذاتی وصفاتی کا تقاضا بھی یہی ہے (کہ رحمت دو قسم ہو) پھر ان دونوں کی دو دو قسمیں ہیں، عام و خاص۔ اس اعتبار سے رحمت چار قسم ہوئی۔ پھر ان کے کئی انواع ہیں جن کا مجموعہ ایک سو تک پہنچتا ہے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :

اللہ تعالیٰ کی ایک سو رحمتیں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک رحمت تمام اہلِ دنیا کو عطا فرمائی اور ننانوے آخرت میں اپنے بندوں پر رحم فرمانے کے لیے مخفی رکھی ہیں۔

ف : رحمتِ عام و خاص ذاتی وہ ہیں کہ جن کا ذکر بسم اللہ شریف کے لفظ رحمٰن و رحیم سے ہوا ہے۔ ان میں سے رحمتِ رحمانیہ عام ہے اس لیے کہ وہ تمام اشیاء کو علماً و عیناً شامل ہوتی ہے اور رحمتِ رحیمیہ خاص ہے کیونکہ یہ اس رحمتِ عامہ کی تفصیل ہے جو ہر ایک عین کی تعیین (جو استعداد خاص کے ساتھ فیضِ اقدس کے حصول کے لیے ہوتی ہے) کی موجب ہے اور رحمتِ عام و خاص صفاتیہ وُہ ہے جو فاتحہ شریف کے رحمٰن و رحیم میں ہے۔ ان میں رحمتِ رحمانیہ عام ہے کیونکہ یہ ان فیوضات (جو رحمتِ عامہ ذاتیہ سے وجود عام علمی پر ہوئے) پر مرتب ہے۔ اور دوسری رحمتِ خاصہ ہے اور اس کی تخصیص اس استعداد اصلی کے مطابق ہے جو ہر ایک عین میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ دونوں رحمتیں (صفاتیہ جو فاتحہ کے رحمٰن و رحیم میں ہیں) رحمتِ ذاتیہ عامہ و خاصہ ہیں۔

فضائلِ بسم اللہ شریف

بعض روایات سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین ہزار اسماء ہیں۔ ایک ہزار کو سوائے ملائکہ کے کوئی نہیں جانتا اور ایک ہزار سوائے انبیاء علیہم السلام کے کسی کو معلوم نہیں اور تین سو توراۃ میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں رکھا ہے۔ پس ان تین ہزار اسماء کا معنیٰ ان تین اسماء اللہ، رحمٰن اور رحیم میں ہے۔ جس نے ان تینوں کو جانا یا ان کو پڑھا تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے تمام اسماء کے ساتھ یاد کیا۔

(۲) حدیث شریف میں ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں : جب مجھے معراج ہوئی تو تمام بہشتیں میرے

پیش کی گئیں، تو اُن میں مَیں نے چار نہریں دیکھیں:

۱ - پانی کی

۲ - دُودھ کی

۳ - شراب کی

۴ - شہد کی۔

مَیں نے جبریل سے نہروں کے متعلق پُوچھا کہ یہ نہریں کہاں سے آتی اور کہاں جاتی ہیں؟ جبریل نے کہا: حضور! جاتی تو حوضِ کوثر میں ہیں اور یہ مجھے معلوم نہیں کہ آتی کہاں سے ہیں، آپ اپنے رب سے پُوچھیے، وہ آپ کو بتائے گا یا دکھائے گا۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے رب سے التجا کی۔ رب تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ حاضر ہوا، تحفۂ سلام پیش کر کے عرض کی: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آنکھیں بند کیجئے۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ پھر عرض کی: آنکھیں کھولئے۔ میں نے دیکھا تو مجھے ایک درخت نظر آیا جو مجھے سفید موتی کا ایک قبہ معلوم ہُوا۔ اس کا ایک مقفل دروازہ سونے کا تھا اور وہ اتنا وسیع تھا کہ اگر دُنیا کے جن و انسان جمع ہو کر اس پر بیٹھیں تو ایسے معلوم ہوں گے جیسے پہاڑ پر پرندے بیٹھے ہوں۔ پس مَیں نے ان نہروں کو دیکھا کہ وہ اس قبہ کے نیچے سے آ رہی ہیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر مَیں واپس ہونے لگا۔ فرشتے نے عرض کی: حضور! اس قبہ کے اندر داخل کیوں نہیں ہوتے؟ میں نے کہا: اس میں دخول کیسے ہو، اس پر تو تالا لگا ہوا ہے اور کنجی بھی نہیں ہے۔ اس نے عرض کی: اس کی کنجی تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ پس میں نے تالا کے قریب بسم اللہ شریف پڑھی۔ بمجرد بسم اللہ شریف پڑھنے سے تالا کُھل گیا۔ پھر میں اس قبہ کے اندر داخل ہُوا تو دیکھا کہ چار نہریں اس قبہ کے چار ستونوں سے جاری ہو رہی ہیں اور ان چاروں ستونوں پر بسم اللہ شریف لکھی ہوئی ہے۔ میں نے غور سے دیکھا کہ پانی کی نہر بسم اللہ شریف کے میم سے اور دودھ کی اللہ کی ہٗ سے، اور شراب کی رحمٰن کے میم سے اور شہد کی رحیم کے میم سے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ چار نہروں کا منبع بسم اللہ شریف ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم)! جو شخص تیری اُمت میں ریا سے پاک ہو کر خالص نیت سے مجھ کو ان اسمأ سے یاد کرے گا اور کہے گا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، تو میں اسے چار نہروں سے پانی پلاؤں گا۔"

(۳) حدیث شریف میں ہے:

وہ دُعا مردود نہیں ہوتی جس کے اوّل میں بسم اللہ شریف ہو۔

(۴) حدیث شریف میں ہے:

جس نے وہ کاغذ کہ جس پر بسم اللہ شریف لکھی ہو اس کی تعظیم و تکریم اور اللہ تعالیٰ کے نام کی بزرگی کو دیکھ کر گرد و غبار اور کیچڑ وغیرہ سے زمین سے اٹھایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا صدیقین جیسا درجہ ہوگا اور اس کے والدین سے

عذاب کی تخفیف کی جائے گی اگرچہ وہ مشرک ہی ہوں ۔

(۵) احمد بونی لطائف الاشارات میں تحریر فرماتے ہیں کہ شجرِ وجود بسم اللہ شریف سے متفرع ہوا۔ اور تمام عالم اس کے سبب سے قایم ہے ۔ باعتبار اجمال و تفصیل کے یہی وجہ ہے جو شخص اس کا ورد کرتا ہے عالم علوی و سفلی میں اس کی ہیبت چھاجاتی ہے۔

حکایت (۶) روم کے بادشاہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف عریضہ بھیجا کہ مجھے سر میں ایسا درد ہے کہ اس کے علاج سے اطباء عاجز آگئے ہیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی دوا موجود ہو تو ارسال فرمائیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ٹوپی بھجوائی۔ جب شاہِ روم اس کو اپنے سر پر رکھتا تو اس کا درد تھم جاتا جب اسے اتارتا تو درد پھر شروع ہو جاتا۔ بڑا متعجب ہوا۔ ٹوپی کو کھولا تو اس میں ایک کاغذ رکھا ہوا پایا جس پر مرقوم تھا : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

(۷) شیخ اکبر قدس سرہ فتوحات میں فرماتے ہیں کہ جب سورت فاتحہ پڑھی جائے تو بسم اللہ شریف کو اس کے ساتھ ملا کر ایک دم میں پڑھنی چاہیے فصل درمیان میں ہرگز نہ ہو۔

(۸) حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھا کر حضرت جبریل سے روایت کرتے ہیں وہ قسم کھا کر حضرت میکائیل سے اور وہ قسم کھا کر حضرت اسرافیل سے اور وہ قسم کھا کر اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے (اسرافیل کو) فرمایا اے اسرافیل ! مجھے اپنی عزت و جلالت اور سخاوت کی قسم ہے جس نے ایک بار بسم اللہ شریف کو الحمد شریف کے ساتھ ملا کر پڑھا تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اسے بخش دیا، اس کی تمام نیکیاں قبول فرمائیں اور اس کے گناہ معاف کر دیے اور اس کی زبان کو ہرگز نہ جلاؤں گا، اور اس کو عذابِ قبر، عذابِ نار، عذابِ قیامت اور بڑے خوف سے نجات دوں گا، اور وہ تمام انبیاء و اولیاء سے پہلے میرے حضور میں پہنچے گا۔ (واللہ اعلم)

سُورۃ فاتحۃ الکتاب

اسماءِ سورۃ فاتحہ مع وجہ تسمیہ

(۱) اس کو فاتحہ اس لیے کہتے ہیں کہ مصاحف و تعلیم و تلاوتِ قرآن اور نماز کا آغاز اسی سے ہوتا ہے ۔ یا اس لیے کہ حمد سے ہر کلام کی ابتداء ہوتی ہے ۔ یا اس لیے کہ یہ تمام سورتوں سے پہلے نازل ہوئی ۔ یا اس لیے کہ لوحِ محفوظ پر پہلے اسی کو لکھا گیا ۔ یا اس لیے کہ دنیا میں ابواب مقاصد کا افتتاح اور آخرت میں عذابِ جنان کی ابتداء اسی سے ہے۔ یا اس وجہ سے کہ کتاب اللہ کے ابوابِ خزائن ، اسرار کے کھلنے کا وسیلہ یہی سورت ہے۔ کیونکہ یہ سورت لطائفِ خطاب کے خزانوں کی کنجی ہے۔ یا اس لیے کہ اس کے جلاء سے اہلِ بیان پر قرآن پاک کے مطالب منکشف ہو جاتے ہیں۔ وجہ

یہ ہے کہ جس نے اس کے معانی سمجھ لیے اس پر متشابہات کے تالے کھل جاتے ہیں اور اس کی نورانیت سے آیات کے انوار کا اقتباس کیا جاتا ہے۔

(۲) اس کا نام اُمّ القرآن بھی ہے اور اُم شے کے اصل کو کہتے ہیں۔ اور یہ سورت ام القرآن اس لیے ہے کہ قرآن پاک سے چار چیزیں مقصود ہوتی ہیں :

۱ - الوہیت کا اقرار

۲ - نبوت کا اقرار

۳،۴ - قضا و قدر کا منجانب اللہ سمجھنا۔

پس الحمد للہ رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم الوہیت پر دلالت کرتا ہے اور مالک یوم الدین یوم آخرت پر ، اور ایاک نعبد و ایاک نستعین جبر و قدر کی نفی کرتا ہے اور قضائے الٰہی کو ثابت کرتا ہے۔

(۳) اس کو سبع مثانی بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ اس کی سات آیات ہیں۔ یا اس لیے کہ اس کی ہر آیت قرآن پاک کے ساتویں حصہ کے برابر ہے۔ یا جس نے اس سورت کو پڑھا گویا اس نے سارے قرآن کو پڑھ لیا۔ یا اس لیے کہ جس نے ان سات آیات کو پڑھا اس پر دوزخ کے ساتوں دروازے بند ہو گئے۔ یہ سبع کے وجوہ تھے۔ مثانی اس کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ نماز میں دو بار پڑھی جاتی ہے۔ یا مثانی سے مراد یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ ہر رکعت میں حقیقۃً یا حکماً دوسری سورت ہوتی ہے یا اس لیے کہ اس کا نزول دو بار ہوا ، پہلی بار مکہ معظمہ میں ، دوسری بار مدینہ طیبہ میں۔

(۴) اس کا نام سورۃ الصلوٰۃ (۵) سورۃ الشفاء (۶) الشافیہ (۷) اساس القرآن (۸) الکافیہ (۹) الوافیہ (۱۰) سورۃ الحمد (۱۱) سورۃ السوال (۱۲) سورۃ الشکر (۱۳) سورۃ الدعاء بھی رکھا گیا ہے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں اس سورت میں پائی جاتی ہیں۔

(۱۴) اس کو سورۃ الکنز بھی کہتے ہیں۔ حدیث قدسی میں ہے : اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : سورۃ الفاتحہ میرے عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔[۱]

تفسیر عالمانہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الحمد میں لام عہد کی ہے۔ یعنی الحمد بمعنی حمد کامل۔ اور حمد کامل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی حمد خود فرمائی یا وہ جو انبیاء علیہم السلام کی زبانوں سے نکلی ، یا وہ جو اولیاء ایزد تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں۔ یا لام عموم استغراق کے لیے ہے۔ اب الحمد بمعنی جمیع محامد و اثنیہ محمود (اصلی) اور ممدوح ماؤل اور معبود حق کے لیے ، خواہ حامد عینی ہوں یا عرضی ، فرشتوں سے ہوں یا آدمیوں سے یا ان کے غیر سے۔ کما قال اللہ تعالیٰ :

وان من شیء الا یسبح بحمدہ۔ مخلوق میں کوئی ایسی شے نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد نہ کرتی ہو۔

---

[۱] اس سورۃ کے باقی اسماء فقیر کی کتاب "احسن التحریر" میں ہیں ۱۲۔ اویسی غفرلہ

تفسیرِ صوفیانہ صوفیہ کے نزدیک حمد محمود کے کمال ظاہر کرنے کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کا کمال اس کے صفات و افعال اور اس کے آثار ہیں۔

شیخ داؤد قیصری فرماتے ہیں کہ حمد تین قسم ہے :

۱ - قولی

۲ - فعلی

۳ - حالی

حمدِ قولی ' زبان سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا۔ جیسا کہ اس نے اپنی حمد انبیاءٔ علیہم السلام سے کرائی ہے۔

حمد فعلی وُہ ہے جو اعمالِ بدنیہ سے ادا کی جائے ، خواہ عباداتِ خیرات سے۔ جس میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی بارگاہ تک پہنچنا مقصود ہو کیونکہ جیسے انسان کو حمد کا زبان سے ادا کرنا لازم ہے اسی طرح ہر عضو کے مطابق حمد کی ادائیگی ضروری ہے بلکہ اس کے ہر عضو پر حمد کی ادائیگی ایسے لازم ہے جیسے شکر کی ادائیگی ہر عضو پر ، بلکہ انسان اپنے ہر حال میں حمد کی ادائیگی کا ورد رکھے۔ کما قال انبیاء علیہم السلام :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ ۔ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد ضروری ہے۔

اور ہر عضو کا حمد بجالانا ناممکن ہے بجز اس کے کہ اپنے ہر عضو کو' جس کام کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے' محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی عبادت اور تعمیل سمجھ کر وجہ مشروع میں استعمال نہ کرے ، نہ تو اس میں نفس کی لذّت کو دخل ہو اور نہ اس کی خوشنودی مقصود ہو۔

حمدِ حالی وُہ ہے جو روح وقلب سے ادا کی جائے۔ یعنی روح وقلب کا کمالاتِ علمیہ وعملیہ سے موصوف ہونا اور متخلق باخلاق ہونا۔ وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو انبیاء علیہم السلام نے فرمایا کہ وُہ ایسے متخلق باخلاق اللہ ہوں کہ کمالات ان کے نفوس و ذات کا ملکہ بن جائیں۔ اور دراصل یہ وہی حمد ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقامِ تفصیلی میں خود اپنی حمد فرمائی۔ جس کو صوفیہ مظاہر کے ساتھ موسوم کرتے ہیں۔ اسے مظاہر سے موسوم کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ ان مظاہر کو اس سے مغایرت نہیں۔ اُس کا اپنی ذات کا مقامِ جمعی میں بطریقِ حمد قولی کے اپنی حمد کرنا وہ ہے جو اس نے اپنی ذات کے صفات وکمالات اپنے صحائف و کتب میں درج فرمائے ہیں۔ اور اس کی حمد فعلی وُہ ہے جو اس نے اپنے کمالات جمالی وجلالی غیوبت سے شہود کی طرف اور باطن سے ظاہر کی طرف۔ اور علم سے عین کی طرف اپنی صفات کے میدانوں میں اور اپنے اسماء کی ولایت کے مقاموں میں ظاہر فرمائے ہیں۔

اور حمد حالی وُہ تجلّیات ہیں جو اس کی ذات میں بطریقِ فیضِ اقدس اولیٰ وبطریقِ ظہور انوارِ ازلی کے موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حامد بھی وہی ہے اور محمود بھی وہی۔ اجمالاً بھی تفصیلاً بھی۔

کسی شاعر نے کیا خُوب فرمایا ہے : ؎

لَقَدْ کُنْتُ دَھْرًا قَبْلَ اَنْ یُّکْشِفَ الْغِطَاءَ
اخالك انّی ذاکُرٌلك شاکرٌ
فلمّا اَضاء اللّیل اصبحت شاھدًا
باتّك مذکورٌ و ذکرٌ وّ ذاکرٌ

توجمہ : پردہ کھلنے سے پہلے بہت عرصہ میں اس خیال میں رہا کہ شاید میں تیرا شاکر و ذاکر ہوں۔ مگر جب اندھیرے سے اُجالا ہُوا تو کیا دیکھتا ہُوں، سُبحان اللہ! کہ یا الٰہی! ذکر بھی تُو ہے اور مذکور بھی تو اور ذاکر بھی تُو۔

اور ہر حمد قولی ادا کرنے والا اپنے محمود کو ان صفاتِ کمال سے جانتا ہے جو اس کی طرف منسوب ہیں۔ یہی بات تعریف کو مستلزم ہے۔

ف : حمد و ثنا، شکر و مدح سب کو شامل ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو اس سے شروع فرمایا کہ لِلّٰہ میں اپنی حمد و ثنا بیان فرمائی اور شکر کا بیان ربّ العٰلمین میں بیان فرما دیا، اور مدح کا ذکر الرحمٰن الرحیم مالك یوم الدین میں آ گیا۔

تنبیہ بندے کو چاہیے کہ ان تینوں طریقوں کو حمدِ حقیقی سمجھ کر حمد نہ کرے بلکہ مقلد بن کر اور مجازی حمد سمجھ کر حمد کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مدح و ثنا (جس طرح اُس کی ذات وصفات کے لائق ہیں) اس کی ذات و صفات کی حقیقت سے واقف ہونے کی فرع ہے اور اس کی ذات وصفات کی معرفت حقیقت ہے۔ کما قال تعالیٰ :

ولا یحیطون بہٖ علماً۔

(اسے معلوم کرنے پر احاطہ نہیں کر سکتے)

وقال تعالیٰ :

وما قدروا اللّٰہ حق قدرہٖ۔

(انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر شناسی کا حق ادا نہیں کیا)

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج اللہ تعالیٰ کی حمد کا حکم ہُوا کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! میری حمد فرمائیے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لا اُحصی ثناء علیك۔

(مجھ سے تیری تعریف ناممکن ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ حمد کی ادائیگی میں صرف تعمیلِ فرمان اور اظہارِ عبودیت مقصود ہوتا ہے۔ پھر لا اُحصی الخ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا:

انت کما اثنیت علیٰ نفسك۔

اس سے ثابت ہوا کہ حمد سے مراد یہی تقلیدی حمد ہے اور ہمیں بھی حمدِ تقلیدی کا حکم ہے۔ کما قال تعالیٰ:

وقل الحمد للہ وقال فاتقوا اللہ ما استطعتم۔ (التاویلات النجمیہ)

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

عطائیست ہر مُوئے از و بر تنم
چگونہ بہر موئے شکرے کنم

ترجمہ: میرے جسم کا ہر بال اس کی نعمت ہے پھر مجھ سے کب ممکن ہے کہ میں ہر بال کے لیے علیحدہ طور پر شکر ادا کروں۔

شاہراہِ سلوک

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ منہاجُ العابدین میں فرماتے ہیں کہ حمد و شکر ان سات عقبات کا آخری عقبہ ہے کہ جن کا عبور سالک کے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ اپنے حصولِ مقاصد پر فتحمند ہو۔ سب سے پہلا وُہ امر کہ جس کے سبب سے بندہ راہِ سلوک پر چلنے کے لیے متحرک ہوتا ہے۔ الہامِ سماویہ و توفیقِ خاص الٰہیہ ہے (چنانچہ) اسی طرف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جس وقت بندے کے دل میں نور داخل ہوتا ہے اس کا دل کھل جاتا ہے۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اس کا پہلا وار غرور سے کنارہ کشی، دوسرا دارِ خلود کی طرف رجوع۔ تیسرا موت کے نزول سے پہلے تیار رہنا۔ پس جبکہ بندے کے دل میں پہلے یہ بات کھٹکے کہ بے شک میرا ایک منعم ہے جس نے مجھے طرح طرح کی نعمتیں عطا کی ہیں اور پھر وُہ مجھ سے ان نعمتوں کا شکرانہ اور خدمت طلب کرے گا، میں ان سے غفلت کروں تو شاید وہ نعمتیں چھین کر مجھے عذاب میں مبتلا کر دے۔ اس کا یہ کیا تھوڑا احسان ہے کہ اپنے پیغمبرانِ عظام کو معجزات دے کر ہماری طرف بھیجا اور ان کے ذریعہ ہمیں خبر دی کہ ہمارا رب ایک ہے جو عالم اس بات پر قادر ہے کہ مطیع کو ثواب دے اور مجرم کو سزا۔ نیکی کا حکم دینے والا بھی وہی ہے اور بُرائی سے روکنے والا بھی وہی۔ اُنہی خیالات سے بندہ کے دل میں مقامِ خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اس سے خلاصی کی کوئی راہ نہیں بجز اس کے کہ اپنے صانع کی صنعت کو دیکھ کر اس کے وجود پر استدلال نہ ہو۔

اوصافِ مذکورہ کی وجہ سے بندہ کو اپنے رب کے وجود کا یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی کو عقبۂ علم و معرفت کہتے ہیں۔ یہی وہ پہلا عقبہ ہے جو سلوک کو راہ طے کرتے وقت درپیش ہوتا ہے اور اسی کی بدولت علم کے حصول کی بصیرت اور

علماء آخرت سے سوال کرنا نصیب ہوتا ہے۔

جب اسے اپنے رب کے وجود کا یقین ہو جاتا ہے تو عبادت کے لیے معرفت اسے برانگیختہ کرتی ہے لیکن وہ عبادت کے طریقہ سے لاعلم ہوتا ہے۔ پھر فرائض شرعی ظاہری و باطنی (جو اس پر لازم ہیں) سیکھتا ہے۔ جب علم معرفت کی فرائض سے تکمیل کی تو عبادت کے لیے تیار ہوتا ہے مگر اپنی بدکرداریوں سے شرمسار ہوتا ہے (جیسا کہ عام طور پر لوگوں کی حالت ہے) دل میں کہتا ہے کہ میں اطاعت کے کب لائق ہوں جبکہ مجھ سے بار بار گناہ ہوئے اور جرائم میں سر تا پا ملوث ہوں۔ اسی سے اسے خیال آتا ہے کہ کیوں نہ ہو اب تمام برائیوں سے تائب ہو جاؤں تاکہ گناہوں کی قید سے چھوٹ جاؤں اور اپنی برائیوں سے پاک وصاف ہو کر عبادت کے لائق ہو جاؤں۔ یہی ہے وہ عقبہ جو راہِ سلوک طے کرتے وقت بندے کے سامنے ہوتا ہے۔ جب سالک کو اپنے حقوق و شرائط کے ساتھ سچی توبہ نصیب ہو جاتی ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اسے چاروں طرف سے ایسے چند عوائق گھیرے ہوئے ہیں جو اسے عبادت سے مانع ہو رہے ہیں۔ غور سے دیکھنے سے یہ چار چیزیں معلوم ہوئیں:

۱۔ دنیا ۲۔ خلقِ خدا

۳۔ شیطان ۴۔ نفس

اسی کو عقبہ عوائق کہتے ہیں۔ اسی عقبہ کو طے کرنے کے لیے چار چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے:

۱۔ دنیا سے کنارہ کشی

۲۔ خلقِ خدا سے علیحدگی

۳۔ نفس سے جنگ

۴۔ شیطان سے جنگ

ان سب امور سے نفس کے ساتھ جنگ کرنا سخت مشکل ہے۔ کیونکہ اس سے علیحدگی بھی مشکل ہے۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یکبارگی سختی کر کے تابع کیا جائے (جیسا کہ شیطان کو تابع کرنا مشکل ہے) کیونکہ یہ تو ہر وقت سوار اور ہر برائی کا آلہ ہے اور اس سے اطاعتِ الٰہیہ پر موافقت کی بھی امید نہیں کیونکہ یہ برائی کا خوگر ہے۔ یہی امور خواہشات اور اس کے متعلقات کے اصل الاصول ہیں ؎

ہمی تازد ایں نفس سرکش چناں
کہ عقلش تواند گرفتن عناں

کہ تا نفس و شیطاں برآید بزور
مصاف پلنگاں نیاید زمور

ترجمہ: اس نفس سرکش کی جنگ کے لیے تقویٰ کی لگام کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ اسے تابع کر کے

نیکی کی راہوں پر بآسانی چلایا جا سکے اور بُرائی کے مقامات سے اسے روکا جا سکے۔

سالک جب یہ منزل طے کرنے کے بعد فارغ ہوتا ہے تو چند ایسی چیزیں عارض ہوتی ہیں جو عبادت سے رکاوٹ کا موجب بنتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ چار چیزیں ہیں :

(۱) رزق کہ جس کی طلب میں نفس دوڑتا پھرتا ہے، جس کی اسے ضرورت ہے۔

(۲) ہر اس شے سے خائف ہونا کہ جس سے وہ ڈرتا بھی ہے اور اس کے ساتھ امیدیں بھی وابستہ رکھتا ہے۔ اُسے چاہتا بھی ہے اور اس سے کراہت بھی کرتا ہے۔ اسے یہ بھی علم نہیں کہ اس امر میں اس کی بہتری ہے یا نقصان۔

(۳) وہ شدائد و تکالیف جو اس کو ہر سُو گھیر لیتی ہیں، بالخصوص وہ مخالفت جو خلقِ خدا سے خلاف کرنے اور شیطان کی محاربت اور نفس کو نقصان پہنچانے سے لاحق ہوتی ہیں۔

(۴) قضائے الٰہی کے مختلف امتحانات، اسی کا نام عقبۂ عوارض ہے۔ جب سالک کو یہ عقبہ پیش آئے تو اس کے قطع کرنے کے لیے ان چار چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے :

۱۔ رزق کے لیے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا۔

۲۔ اپنے جمیع امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا۔

۳۔ صبر کرنا۔

۴۔ قضائے الٰہی پر راضی ہونا۔

جب سالک اس عقبہ کو طے کر لیتا ہے تو اپنے نفس کا جائزہ لیتا ہے تو اس کو انتہائی درجہ کا کاہل و سُست پاتا ہے۔ (جیسا کہ اس کے لائق ہے) نہ عبادت میں اس کا جی لگتا ہے اور نہ اس سے اس کو خوشی ہوتی ہے بلکہ یہ غفلت، دھوکہ بازی اور گمراہی کی طرف منہمک ہے اور اسراف وفضول کا خوگر ہے (نفس کی اس بڑی خرابی کو دُور کرنے کے لیے) اسے ایک راہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی اطاعت کی راہنمائی کرے اور گناہوں سے اسے باز رکھے۔ اس کے رہنما خوف و رجاءُ ہیں۔ رجاء ان کرامات کے لیے ہے جو سالک کو بھلائی کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اور خوف ان صعوبتوں سے ہے جو اس کی عقوبات اور اہانات سے دھمکایا گیا ہے۔ یہ عقبۂ بواعث ہے جو سالک کو طے کرنا پڑتا ہے۔ اس عقبہ کو طے کرتے وقت وہ ان دونوں (خوف و رجاء) کا محتاج ہوتا ہے۔

جب اس عقبہ سے فراغت پاتا ہے تو بعد ازاں نہ کوئی شے رکاوٹ پیدا کرتی ہے اور نہ کوئی مشغلہ۔ بلکہ عبادت کے موجب و باعث حاصل ہو جائیں گے کہ جن کے سبب سے عبادت بڑے شوق سے کرنے کو جی چاہے گا۔ لیکن تھوڑے سے تامّل سے معلوم ہوگا کہ ابھی دو بڑی آفتیں باقی ہیں جن کا نام ریاء و عُجب (خود بینی) ہے (اگرچہ عبادت میں جی خوش ہوگا مگر) کبھی اطاعت لوگوں کو دکھاوے کی غرض پر کرے گا۔ کبھی اپنی عبادت کو عظیم الشان تصوّر کر کے

اپنے آپ کو مکرم ترین سمجھے گا۔ اسی عقبہ کو عقبہ قوادح کہا جاتا ہے۔ اُس کے قطع کرنے کے لیے خلوص اور باری تعالیٰ کے احسانات مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے۔

جب اُس عقبہ کو باری تعالیٰ کی حُسنِ عصمت وتائید سے طے کرے گا تو اسے عبادت کما حقہٗ ادا کرنے کی توفیق نصیب ہوگی۔ اس حال میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دریا میں ڈوبا ہوا دیکھ کر خائف ہوگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے شکر کی ادائیگی میں غفلت ہو جائے اور کفرانِ نعمت سے موصوف ہو کر مرتبۂ رفیعہ (جو کہ صالحین کی روحانی غذا ہے) سے گر جائے (اس کی وفا کے لیے حمد و شکر کا دامن تھامے رکھے)۔ یہی عقبہ حمد و شکر ہے جو سالک کی راہ میں درپیش ہوتا ہے اور سالک اس کے ورد کی کثرت سے عقبہ ہذا کو طے کرتا ہے۔ جب اس عقبہ سے فارغ ہوتا ہے تو اپنے مطلوب ومقصود کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر بقیہ عمر اسی نعمت میں بسر کرتا ہے۔ اس کا ظاہری جسم دُنیا میں ہوتا ہے لیکن اس کا دل آخرت میں معلق رہتا ہے اور ہر روز پیکِ اجل کا انتظار کرتا ہے اور دنیا سے متنفر رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا شوق اس کو ملاءالاعلیٰ تک پہنچا دیتا ہے۔ اب رب العالمین کا قاصد آکر اُسے رب تعالیٰ کی خوشنودی کی بشارت دے کر کہتا ہے: مژدہ باد (اے سالک!) تیرا رب تجھ سے ناراض نہیں۔ اسی حال میں ملائکہ اس سے بہت خوش حالت میں ملاقات کرتے ہیں۔ باقی لوگ بھی اس دُنیا فانی کو چھوڑ کر بارگاہِ ایزدی میں اور جنت کے باغات میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اور یہ سالک اپنے نفسِ فقیر کو کریم کی نعمتوں اور بہت بڑے ملک میں پاتا ہے۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

عروسی بود نوبتِ ماتمت
گرت نیک روزی بود خاتمت

ترجمہ: وہ تیرے لیے موجِ بہار ہوگی جبکہ تیرا خاتمہ ایمان پر ہو۔

حضرت امیر خسرو قدس سرہٗ اپنے وقتِ وصال فرما رہے تھے: ؎

ز دنیا می رود خسرو بزیرِ لب ہمی گوید
دلم بگرفت از غربت تمنائے وطن دارم

ترجمہ: بوقتِ نزع حضرت امیر خسرو آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے کہ دُنیا سے جی گھبرا گیا ہے اب دل کو وطن کی تمنا ہے۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ربط: حمد کو اسمِ ذاتی کے بالمقابل لانے میں جب اس طرف تنبیہ فرمائی کہ جمیع محامد کا بالذّات مستحق مَیں ہُوں۔ تو اس کے بعد اسمائے صفاتیہ لائے تاکہ دونوں استحقاق کا یکجا اجتماع ہو جائے اور وُہ یعنی رب العالمین اس بات کی برہان ہے کہ جمیع محامد ذاتی وصفاتی اور دنیوی واُخروی کا وہی مستحق ہے۔ رَبّ بمعنی تربیت واصلاح،

عالمین کے حق میں یہ ہے کہ ان کی تربیت کی غذا اور ان کے وجود کو باقی رکھنے کے تمام اسباب تیار فرماتا ہے۔ انسان کی تربیت یہ ہے کہ اس کے ظاہر (نفس) کو نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے اور اس کے باطن (دل) کو اپنی رحمت سے مزین کرتا ہے عابدین کے نفوس کو احکام شریعت سے اور مشتاقین کے قلوب کو آداب طریقت سے، اسرار محبین کو انوار حقیقت سے روشن اور منور کرتا ہے۔ کبھی انسان کی تربیت اس کے نیک اعمال سے کرتا ہے کبھی فیض کے قوی انوار کو اعضا تک پہنچاتا ہے۔ اس کی بہت بڑی شان ہے کہ اس نے ہڈیوں کو سننے کی، چربی کو دیکھنے کی اور گوشت کو بولنے کی توفیق بخشی۔ کبھی انسان کی نباتات کے دانوں اور پھلوں کی غذاؤں سے تربیت کرتا ہے اور حیوانات کے لحوم و شحوم سے، زمینوں کے اشجار و انہار اور آسمانوں کے کواکب و انوار سے انسان کی تربیت کا سامان تیار کرتا ہے۔

نصیحت اے انسان! تیرا سکون رات میں بنایا۔ نقصان پہنچانے والے اور موذیوں کی حرکات کو رات میں چلنے پھرنے سے تیرے لیے روکا، اور اپنے فضل کی طلب کے لیے تجھے دن جیسی نعمت بخشی۔ اے مغرور انسان! وہ بے پروا تیری کیسی تربیت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا گویا تیرے سوا کوئی عبد نہیں۔ مگر تو اس کی خدمت (عبادت) سے گریزاں ہے۔ اگر تجھے خدمت نصیب بھی ہوتی ہے تو تیرا مطمع نظر کوئی غیر ہوتا ہے۔

العالمین عالم کی جمع ہے اور لفظ عالم ایسی جمع ہے کہ جس کا اپنے لفظ سے کوئی واحد نہیں۔

ف: حضرت وہب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور یہ دنیا ان میں سے ایک ہے، اور اس کی آبادی اس کے ویرانہ کے مقابلہ میں اتنی مقدار رکھتی ہے جتنی جنگل میں ایک خیمہ۔

ف حضرت ضحاک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کل عالم تین سو ساٹھ ہیں، ان میں تین سو ننگے پاؤں اور ننگے جسم والے ہیں۔ اور وہ ایسے ہیں جن کو اپنے خالق کا بھی علم نہیں، وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔ اور باقی ساٹھ وہ ہیں جو کپڑے پہنتے ہیں۔ ذوالقرنین ان سے ملاقی ہوا، ان سے ہمکلام بھی ہوا۔

ف حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عالم کا صحیح اندازہ کرنا محال ہے کما قال اللہ تعالیٰ: وما یعلم جنود ربك الا ھو۔ (اور تیرا رب اپنے لشکر کو خود جانتا ہے)

ف: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاً مخلوق کو چار قسم بنایا:

۱۔ ملائکہ

۲۔ شیاطین

۳۔ جنّات

۴۔ انسان

پھر ان سب کے دس اجزاء بنائے، ان میں سے نو حصے سالم فرشتگان ہیں، باقی ایک جز انسان و جن و شیاطین ہیں۔

پھران کے دس اجزاء ہوئے ان میں نو حصے شیاطین ہیں، باقی ایک حصہ انسان وجنات کا ہے۔ پھران دونوں کو دس اجزاء پر منقسم فرمایا، ان میں سے نو حصے جنات کے، ایک حصہ انسان کا ہوا۔ پھر انسان کو ایک سو پچیس اجزاء پر تقسیم فرمایا۔ ان میں سے پورا ایک سو بلادِ ہند میں پیدا فرمایا، بعض ان میں ساطوح ہیں یعنی وہ انسان کہ جن کے سر کتوں جیسے ہیں۔ بعض ان میں سے مالوخ ہیں یعنی وہ انسان کہ جن کی آنکھیں سینہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ اور بعض ان میں ماسوخ ہیں یعنی وہ لوگ کہ جن کے کان ہاتھیوں کے کانوں جیسے ہیں، اور بعض ان میں مالوف ہیں یعنی وہ انسان کہ جن کے پاؤں اپنے قابو میں نہیں ان کا نام دوال پا ہے۔ ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور ان پچیس سے بارہ اجزاء کو بلادِ روم میں بھیجا جو کہ نسطوریہ، ملکانیہ، اسرائیلیہ کے نام سے موسوم ہیں۔ پھران ہر ایک کے چار گروہ ہیں، ان سب کا ٹھکانا بھی جہنم ہے۔ اور باقی چھ بلادِ مشرق میں بھیجے جنہیں یاجوج ماجوج، ترک، خاقان، ترک حد خلخ، ترک خزر، ترک جریر کہا جاتا ہے۔ اور باقی چھ بلادِ مغرب میں بھیجے، جو زنج، زط، حبشہ، نوبہ، بربر، مشرکینِ عرب کے نام سے موسوم ہیں۔ ان سب کا ٹھکانا بھی جہنم ہے، باقی ایک حصہ بنی نوع انسان سے اہلِ توحید کا ہے باقی سب کے سب کافر و مشرک ہیں۔ پھر اہلِ توحید بھی تہتر فرقے ہو گئے، بہتر سب کے سب خسارہ میں، یعنی اہلِ بدعت و ضلالت ہیں، صرف ایک ان میں ناجی ہے اور وہ اہل السنت والجماعت ہیں۔ اور گمراہ فرقوں کا حساب اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ جنہیں چاہے بخش دے جنہیں چاہے عذاب میں مبتلا کرے۔

حدیث شریف میں ہے سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بہتر گروہ ہوئے مگر میری امت تہتر گروہ ہوگی۔ ان میں سے ایک کے سوا باقی تمام دوزخ میں جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کی: حضورؐ! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ لوگ ہیں جو میرے اور میرے صحابہ کے متبع ہیں یعنی جس اعتقاد اور قول و فعل کا ئیں اور میرے صحابہ پابند ہیں وہ بھی اسی طرح ہوں گے۔ یہی قول حق ہے اور فلاح تک پہنچانے والی یہی راہ ہے۔ اس کے ماسوا باقی سب طریقے باطل اور دوزخ کی طرف کھینچ لے جانے والے ہیں۔ اگر وہ لوگ ان طریقوں کو جائز و حق سمجھ کر عمل کرتے ہیں تو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے ورنہ چند روز۔

تفسیر عالمانہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اس کے تکرار میں کئی وجوہ ہیں:

(۱) بسم اللہ شریف میں جن دو رحمتوں کا ذکر تھا وہ رحمتیں ذاتی تھیں۔ اور فاتحہ میں دو رحمتیں صفاتیہ کمالیہ کا بیان کیا جا رہا ہے۔

(۲) تاکہ واضح ہو کہ بسم اللہ شریف سورۃ فاتحہ کا جزو نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک سورت میں رحمت کا دوبارہ ذکر نہ ہوتا کیونکہ قاعدہ ہے کہ دو ہم جنس چیزوں کو ایک مقام پر دوبارہ ذکر کرنا خلافِ قاعدہ ہوتا ہے (اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں)۔

(۳) بندگانِ الٰہی کے لیے مستحسن ہے کہ اسے بار بار یاد کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی ایک علامت یہ بھی ہے

کہ اس کے ذکر کے ساتھ بھی محبت ہو۔

حدیث شریف میں ہے: مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ۔ (جو کسی سے محبت کرتا ہے اس کا ذکر بہت زیادہ کرتا ہے)

(۴) جب بندہ نے (فاتحہ کی تلاوت کے وقت) کہا ربّ العٰلمین۔ تو گویا کسی نے پوچھا کہ رب العالمین کون ہے؟ بتایا گیا کہ وہ رحمٰن ہے جو اپنے بندوں کو دنیا میں روزی دیتا ہے اور رحیم ہے جو ان کی قیامت میں مغفرت فرمائے گا۔ یہی نکتہ لفظ رحیم کے بعد مالک یوم الدین کے بیان میں ہے۔ یعنی اس کی ربوبیت رحمانیہ یعنی دنیا میں روزی دینے کی وجہ سے ہے یا رحیمیت یعنی آخرت میں مغفرت فرمانے کی وجہ سے۔

(۵) قاعدہ ہے کہ حمد سے رحمت نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ منقول ہے کہ سب سے پہلے حمد کرنے والے سیدنا آدم علیہ السلام ہیں۔ جب وہ پیدا ہوئے تو انھیں چھینک آئی۔ اس پر انہوں نے کہا الحمدُ للہ۔ ملائکہ نے انھیں جواب میں کہا: یَرْحَمُکَ رَبُّکَ وَلِذٰلِکَ خَلَقَکَ (تیرے اوپر اللہ رحم فرمائے اسی لیے اللہ نے آپ کو پیدا فرمایا)۔ اسی لیے خداوند قدوس نے اپنے بندوں کو حمد سکھائی کہ میری رحمت کا حصول میری حمد سے ہوگا۔

(۶) تکرار تعلیل کے لیے ہے۔ کیونکہ الحمد شریف کو ان اوصاف پر مرتب کرنا ان اوصاف کے ماخذ کی علیت کی علامت ہے۔ مثلاً رحمانیت اور رحیمیت اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ باری تعالیٰ احسان کرنے میں مختار بالذات ہے کسی سبب کا محتاج نہیں۔

رحمٰن و رحیم میں فرق

رحمٰن و رحیم میں فرق یہ ہے کہ لفظ رحمٰن باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے (کسی دوسرے پر اس کا اطلاق جائز نہیں) یا یہ کہ اس سے رحمتِ عالم مراد ہوتی ہے (دنیا و آخرت میں) یا یہ کہ اس سے بہت بڑی نعمتیں مراد ہوتی ہیں۔ پس بر بنائے وجہِ اوّل رحمٰن وہ صفت ہوگی کہ اس جیسی جنس کا صدور بندگان سے محال ہے، اور رحیم وہ صفت ہے کہ اس جیسی جنس کا صدور بندگان سے کچھ نہ کچھ ممکن ہے جیسا کہ ذوالنون مصری (رحمہ اللہ تعالیٰ) کی حکایتِ ذیل دلالت کرتی ہے۔

حکایت

ف: حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک دن ملال ہوا۔ استراحت کے لیے دریائے نیل پر سیر کرنے کے لیے گیا۔ دریائے نیل کے کنارے پر ایک بچھو کو تیز دوڑتا ہوا دیکھا، میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ بچھو مینڈک پر سوار ہو کر دریا عبور کرنے لگا، میں بھی کشتی پر سوار ہو کر پیچھے پیچھے چل دیا۔ بچھو دریا سے نکل کر پھر دوڑنے لگا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ بالآخر بچھو ایک نوجوان (جو ایک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا) کے پاس پہنچا۔ ایک بہت زہریلا سانپ درخت سے نیچے اُتر رہا تھا قریب تھا کہ اس نوجوان کو ڈستا مگر بچھو نے جاتے ہی سانپ سے لڑائی شروع کر دی۔ بچھو اور سانپ نے ایک دوسرے کو خوب ڈسا، بالآخر دونوں مر گئے اور اس نوجوان کی جان بچ گئی۔

اعجوبہ کوّے کا بچہ جب انڈے سے باہر نکلتا ہے تو وہ سُرخ گوشت کی طرح ہوتا ہے۔ ماں اسے آگ کی چنگاری سمجھ کر چھوڑ جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مچھر اسے آگ جان کر پروانہ بن کر خود بخود اس کے منہ میں گر کر اس کا لقمہ بنتے ہیں یہاں تک کہ اس کے بال و پر اُگنے لگتے ہیں۔ اس وقت اس کی ماں اسے آکر اپنی پرورش میں لے لیتی ہے۔ اسی رحمتِ عامہ کا کرشمہ دیکھ کر کہا گیا ہے:

یا رزاق الغراب فی عشه۔ (اے پروردگار! کوّے کے بچے کو آشیانہ میں پالنے والے)

یا یہ کہ لفظ رحمٰن لفظ رحیم سے عام ہے۔

سوال: جب رحمت کا یہی تقاضا ہے تو پھر ہم پر مرض و تکالیف کا نزول کیوں؟ بلکہ ہم قسم قسم کے حوادثات کا نشانہ بنتے ہیں۔

جواب: بہت سی چیزوں کو ہم رحمت سمجھتے ہیں حالانکہ وہ در اصل زحمت ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

عَسٰی ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم الخ (جس کو ہم رحمت سمجھتے ہیں اصل میں وہ زحمت ہوتی ہے)

اس کے متعلق کوئی شاعر کہتا ہے: ؎

ان الشباب والفراغ والجدۃ۔
مفسدۃٌ لکم ای مفسدۃ

ترجمہ: بے شک جوانی و فراغت و غنا آدمی کو بہت نقصان پہنچانے والی ہیں۔

دیکھیے بظاہر یہ تینوں (جوانی، فراغت، غنا) رحمت ہیں مگر شاعر انہیں زحمت سے تعبیر کر رہا ہے۔ اور دوسرا یعنی جسے ہم زحمت سمجھتے ہیں حقیقت میں وُہ رحمت ہوتی ہے۔ جیسے چھوٹے بچے کو مدرسہ میں محبوس کرنا اور اسے مار پیٹ کر تعلیم کے زیر بار کرنا، اور آکلہ کے مرض کے ہاتھ کو کاٹنا۔ بے وقوف تو ان کو بُرا محسوس کرے گا مگر دانا کی نظر باطنی اسرار پر ہوگی۔ پس ہر مشقت و تکلیف میں رحمت و عطیۂ الٰہی مضمر ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے سے شر کو دیکھ کر خیر کثیر کو ترک کر دینا شر کثیر ہے۔

رُوحانی نسخے (۱) تکالیفِ ارواح کو علائق جسدانیہ سے پاک کرتی اور دوزخ کو پیدا کرنے میں بھی یہی حکمت ہے کہ ابرار و اشرار میں تمیز ہو سکے۔ اسی طرح شیطان کی پیدائش میں بھی یہی حکمت ہے کہ بندگانِ مخلصین و غیر مخلصین میں امتیاز ہو۔ پس محقق کی یہ شان ہے کہ حقائق کو مدِّ نظر رکھے۔ جیسا کہ حضرت خضر و حضرت موسیٰ علیہما السلام کے قصّہ میں ہوا۔

(۲) جس سے طبیعت کراہت کرے۔ اس کے تحت بھی مخفی اسرار اور بلیغ حکمتیں مستتر ہوتی ہیں۔ اگر اس کی رحمت نہ ہوتی تو اس کا غضب سبقت کر جاتا۔ تو پھر دُنیا میں کوئی وجود بھی نہ ہوتا اور نہ اسم منعم کا ظہور ہوتا۔

ف: بہر حال بڑی نعمتوں کے لیے ہے۔ اس کے بعد اسم رحیم کا ذکر فرمایا تاکہ اسم وہم کا دفعیہ ہو جائے کہ جب اسمِ رحمٰن بڑی نعمتوں کے لیے ہے تو پھر اس سے حقیر اشیاء کا طلب کرنا بے ادبی ہوگی۔ جیسا کہ دستور ہے کہ کسی بڑے آدمی سے کہا جائے کہ میں آپ سے معمولی چیز کا سوال کرنا ہوں تو وُہ فرمائیں گے کہ اگر سوال معمولی ہے تو کسی معمولی آدمی سے طلب کیجئے۔

بنابریں گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں فقط رحمٰن رہوں تو تم ڈر کے مارے مجھ سے ہر شے مانگنے سے باز رہو گے۔ لیکن تمہیں معلوم ہو کہ میں رحیم بھی ہوں لہٰذا مجھ سے ہر چیز طلب کرو، یہاں تک کہ اپنے جوتوں کا تسمہ اور ہنڈیا کا نمک بھی مجھ سے مانگو۔ شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

محالست اگر سر بریں در نہی
کہ باز آیدت دست حاجت تہی

ترجمہ: اگر اسی دروازہ پر سر رکھو گے پھر محال ہے کہ اس کے بعد تیری ضرورت پوری نہ ہو۔

تفسیر صوفیانہ

اہلِ حقیقت فرماتے ہیں کہ وہ حضرات کلیہ جو اسم رحمٰن کے ساتھ مخصوص ہیں تین ہیں:

۱۔ حضرات الظہور

۲۔ حضرت البطون

۳۔ حضرت الجمع

اور تمام موجودات کے یہی تین مراتب ہیں اور ان تینوں مراتب سے خالی نہیں ہیں اور انہی مراتب کے احکام ذیل کے لوگوں پر منقسم ہیں:

(۱) سعداء

(۲) اشقیاء

(۳) وہ حضرات جو صرف روحانی نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں لیکن جسمانی نعمتوں سے دور رہتے ہیں، جیسے ارواحِ مجردہ۔

(۴) اس کے برعکس یعنی صرف جسمانی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور روحانی نعمتوں سے محروم۔

(۵) اور جامعین بین الامرین یعنی روحانی اور جسمانی دونوں نعمتوں سے پُردامن ہوتے ہیں۔

اسی طرح اہلِ جنت کی بھی کئی اقسام ہیں:

(۱) روحانی اعتبار سے علوم سے منافع یافتہ سعادت مند حضرات یعنی وہ نہ صرف ظاہری صورتوں سے نفع پانے والے ہیں بلکہ روحانی طور پر بھی مزین ہوتے ہیں کیونکہ ان حضرات نے جنت کے لیے وہ اعمال نہیں کمائے جو صرف ظاہری نعمتوں کا فائدہ پہنچائیں بلکہ انہوں نے باطنی نعمتوں کے لیے بھی بہت کچھ کیا، اگرچہ یہ لوگ بہ نسبت دیگر حضرات کے بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

(۲) مذکورہ حضرات کے برعکس، جیسے وہ زاہد و عابد جو لاعلم ہیں، کیونکہ ان کی ارواح روحانی نعمتوں سے کم نفع پانے والی ہیں۔ کیونکہ ان کو حضرات علیہ الیہ کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے۔ کیونکہ عمل کرتے وقت ان کے ارادے میں سوائے عمل کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اسی عمل کو اپنی غرض و غایت سمجھتے ہیں اسی لیے یہ لوگ موعودہ امور کی رغبت میں اور جن چیزوں سے ڈرایا گیا ہے ان کی رہبت میں رہتے ہیں۔

(۴) جامعین حضرات یعنی وہ مقدس گروہ جو روحانی وجسمانی نعمتوں کے جامع ہیں۔ وہ علم وعمل کی لذتوں پر فائزالمرام ہیں۔ جیسے انبیاء علیہم السّلام اور ان کے کامل وارث یعنی اولیاء کرام علیہم الرحمۃ والغفران۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: سہ

ہر کبوتر می پرد در مذہبے
ویں کبوتر جانبے بے جانبے

ترجمہ: ہر کبوتر اپنی راہ چلتا ہے لیکن یہ کبوتر ایسی جانب اڑتا ہے جس کی کوئی جانب اور طرف نہیں۔

تفسیر عالمانہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ عرب میں یوم اس وقت کو کہتے ہیں جو مابین طلوعِ شمس تا غروب واقع ہو۔ اور شریعت میں طلوعِ فجر یعنی صبح صادق اور غروبِ شمس کے مابین کا نام ہے اور یہاں مطلق مراد وقت ہے کیونکہ قیامت میں شمس نہیں ہوگا۔ معنیٰ یہ ہوا کہ وہ قیامت میں مالک ہے اور مالک کی یوم کی طرف اضافت ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے ہے جیسے تمام ظروف کی اضافت ان مظروف فیہ (کہ جن میں حوادثات واقع ہوئے ہیں) کی طرف ہوتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے:

یوم الاحزاب، یوم الفتح۔

اور مالک کی اضافت یوم کی طرف، یوم کے عظیم الشان ہونے اور اس کی سختی کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ یا اس کو علیحدہ کرنے میں یہ راز ہے کہ اس میں صرف احکام جاری ہوں گے۔ باقی جمیع تعلقات مابین مالک ومملوک کے بالکلیہ منقطع ہو جائیں گے۔ (مُلک ومِلک میں ربط) سختی قوت کے لیے مِلک کہتے ہیں۔ درحقیقت قوتِ کاملہ اور ولایتِ نافذہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکم کا نفوذ اور تصرف کا حق اگر بندگان کو حاصل ہے تو مجازاً۔ کیونکہ ان کی مِلک کا ابتداء وانتہاء ہے، اور بعض پر کہ کل پر۔ اس طرح جسم پر کہ عرض پر۔ اسی طرح نفس پر کہ رُوح پر۔ اسی طرح ظاہر پر کہ باطن پر، زندہ پر کہ مردہ پر، بخلاف معبودِ حق کے کہ نہ اس کے ملک کو زوال ہے نہ انتقال۔

مسئلہ: مالک کو الف کے ساتھ پڑھنے میں الف کے سوا (ملك) پڑھنے سے زیادہ ثواب ہے۔ کیونکہ مالك میں ایک لفظ زائد ہے۔

حکایت **فـ:** ابو عبداللہ محمد بن شجاع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میری عادت تھی کہ میں ہمیشہ مالك کو الف کے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک دن کسی ادیب سے سُنا کہ ملك (الف کے سوا) مالك (الف کے ساتھ) سے زیادہ بلیغ ہے۔ میں نے سُن کر ملك (الف کے سوا) پڑھنا شروع کردیا۔ نیند میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ تُو نے اپنی دس نیکیاں کیوں کم کر دی ہیں، کیا تجھے معلوم نہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن مجید کا ایک حرف پڑھا تو اُسے ہر حرف کے عوض دس نیکیاں ملیں گی اور اس کے دس گناہ معاف ہوں گے اور دس درجے بلند ہوں گے۔ پھر میں نے برسمِ سابق

مالک کو الف کے ساتھ پڑھنا شروع کردیا۔ پھر مجھے نیند میں کسی کہنے والے نے کہا کہ تُو نے مٰلک (الف کے سوا) کو کیوں ترک کردیا؟ کیا تُو نے حدیث شریف نہیں سُنی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

قرآن کو عظیم الشان کرکے اور بلیغ الفاظ سے پڑھو۔

پس میں نے امام قطرب (لغت کے ماہر) کی خدمت میں آکر مالک اور ملک کا فرق پُوچھا۔ انہوں نے فرمایا: ان کے مابین بہت بڑا فرق ہے۔ فرمایا، مالک وہ ہے جو دُنیا میں کسی چیز کا مالک ہو، اور مَلک وہ ہے جو بادشاہوں کا بادشاہ ہو۔ تفسیر ارشاد میں ہے کہ اہلِ حرمین محترمین ملک کو الف کے بغیر پڑھتے ہیں اور مِلک سے مشتق کرتے ہیں۔ جس کا معنیٰ ہے سلطانِ قاہرہ، استیلائے جابر، غلبۂ کامل، امورِ عامہ اور امر و نواہی میں تصرفِ کُلی۔ اور یوم کی طرف اضافت کی وجہ یہی یعنی ملک (الف کے بغیر) زیادہ مناسب ہے۔ دونوں کے لیے ترجیح ثابت ہے جو کتبِ تفاسیر میں مفصلاً مذکور ہے۔ اگر مزید تحقیق مطلوب ہو تو تفاسیر کا مطالعہ کیجئے۔

ربط بین الاسمآء الخمسہ اوصافِ خمسہ کو بالترتیب ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندے! میں نے تجھے پیدا کیا ہے اسی لیے عبادت کا مستحق میں ہُوں۔ پھر میں نے تجھے نعمتوں سے پالا ہے اسی لیے میں تیرا رب ہُوں پھر تو میرا نافرمان ہوا، میں نے تجھے بخش دیا، اسی لیے میں رحیم ہُوں، پھر میں تیرے عملِ فعلی و قولی پر تجھے جزا و سزا دُوں گا اسی لیے میں مالکِ یوم الدین ہُوں۔

تفسیرِ صُوفیانہ تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ مالک یوم الدّین میں اشارہ ہے کہ دین سے مراد اسلام ہے، جیسے کہ اس کا فرمان اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامِ (بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہے۔ دلالت کرتا ہے۔

اسلام دو قسم کا ہے:

اسلام ظاہری

اسلام باطنی

اسلام ظاہری، زبان کے اقرار اور اعضاء کے اعمال کا نام ہے۔ اسی کو اسلام جسدانی کہتے ہیں اور جسدانی ظلمانی ہے۔ اسی لیے رات کو ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی یہ اسلام درجہ میں کم ہے۔ اور دوسرا اسلام باطنی ہے قلب اور صدر کا نور اللہ سے منشرح ہونے کا نام اسلام باطنی ہے اور یہ اسلام روحانی نورانی ہے۔ اسی لیے دن کو نور سے تعبیر کرتے ہیں (گویا اسلام دن کی طرح چمکتا دمکتا اور نہایت اعلیٰ ہے۔ اسلام جسدانی کا تقاضا ہے کہ جسم اوامر و نواہی کا پابند ہو جائے۔ اور اسلام روحانی کا تقاضا ہے کہ قلب و رُوح احکام ازلی اور قضا و قدر کے لیے سرِ تسلیم خم ہو جائیں۔ پس ہر وہ شخص جو اسلامِ جسدانی تک پہنچا اور اس کو اسلام روحانی کا مرتبہ حاصل نہ ہُوا تو وہ دین کی سیر میں متردّد و متحیّر رہتا ہے اور اسے کئی ملوک و ملاک دکھائی دیتے ہیں جیسا کہ سیدنا خلیل علیٰ نبینا و علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ جب رات ہوئی اور آپ کو ستارہ نظر پڑا تو کہنے لگے: یہ میرا رب ہے۔ اور

جس کی سعادت کا ستارہ چمک پڑے اور اس کے جبلِ نفس کی طرف سے جب مشرقِ قلب سے شمس ایمان نورانی کا طلوع ہو جائے تو وہ رب کے نور تک پہنچا۔ پھر اس پر یوم الدین کے کشف واضح ہو جاتے ہیں۔ پس اس کے وقت کا ورود وَاَصْبَحْنَا اَصْبَحَ الْمُلْكُ (ہم اور اللہ تعالیٰ کا فرشتہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں) پر ہو جاتا ہے۔ پھر علم الیقین بلکہ حق الیقین سے اس بات کا اسے مکاشفہ ہو جاتا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا ملک حقیقی نہیں اور مالک یوم الدین کے سوا کوئی مالک حقیقی نہیں۔ جب اسے نورانی تجلی نصیب ہوئی اور مالک کے آمنے سامنے ہو کر مخاطب ہوا تو بالمشافہ ایاك نعبد و ایاك نستعین کے مبارک الفاظ سے مناجات کرنے لگ جاتا ہے۔

شمات

(۱) قانون ہے کہ شہنشاہ کی مخالفت جہان کی بربادی اور مخلوق کی تباہی کا باعث ہے۔ پس شاہوں کے شہنشاہ کی مخالفت کا کیا حال ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۂ مریم میں خود فرماتا ہے:

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ۔ (قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں)

(۲) اطاعت بہت مصالح کا موجب ہے جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں فرماتا ہے:

نحن نرزقك والعاقبة للتقوٰی (ہم تمہیں رزق عطا فرماتے ہیں اور نیک انجام تقویٰ سے نصیب ہوتا ہے)

رعیت پر لازم ہے کہ اپنے بادشاہ کی فرمانبردار رہے اور بادشاہ پر واجب ہے کہ شاہوں کے شاہ کی اطاعت میں سرگرم رہے تاکہ تمام عالم کے نظام کا نیک انجام ہو۔

(۳) مالك یوم الدین کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا تمام ملک عدل و انصاف کے ساتھ ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

ونضع الموازین القسط لیوم القیٰمة فلا تظلم نفسٌ شیئًا۔ (ہم قیامت میں عدل و انصاف کا ترازو رکھیں گے۔ پس کسی پر ذرہ برابر بھی عذاب نہ ہوگا)

پس بادشاہ مجازی اگر منصف مزاج ہو تو اس کی شاہی کے تمام انتظامات اچھے رہتے ہیں۔ چنانچہ جانوروں کے تھنوں میں دودھ بکثرت ہو جاتا ہے اور کھیت بکثرت سرسبز ہو جاتے ہیں۔ اگر بادشاہ ظالم ہو تو اس کی شاہی میں سراسر نقصان ہوتا ہے اور بھلائی دنیا سے اُٹھ جاتی ہے۔

حکایت در موجب توبہ نوشیرواں

نوشیرواں اپنے لشکر سے دُور ہو کر ایک باغ میں پہنچا۔ وہاں ایک لڑکا بیٹھا تھا اس سے ایک انار مانگا۔ لڑکے نے انار پیش کیا۔ نوشیرواں نے انار کو توڑا تو اس میں بہت پانی تھا اور میٹھا بھی خوب تھا۔ اسے پینے سے اس کی پیاس بجھ گئی۔ متعجب ہوا اور دل میں ٹھان لی کہ وہ یہ باغ اس سے ضرور چھینے گا۔ دوسری بار لڑکے سے انار مانگا، اس نے پھر حاضر کیا۔ بادشاہ نے انار توڑا تو اس میں سے بہت تھوڑا پانی نکلا اور وہ بھی ترش۔ لڑکے سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے عرض کیا: معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا ارادہ ظلم کرنے کا ہو گیا ہے۔ نوشیرواں یہ بات سنتے ہی وہیں تائب ہوا۔ پھر انار طلب کیا۔ لڑکے نے انار پیش کیا۔ بادشاہ نے

توڑا تو پہلے سے بھی زیادہ میٹھا پایا۔ لڑکے نے کہا اغلب امید ہے کہ بادشاہ نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے اور توبہ کر لی ہے ۔ نوشیرواں اس راز سے آشنا ہوگیا اور نیز دل سے توبہ کر کے آئندہ ظلم کرنے سے بالکل باز آ گیا، جس کی برکت سے تا ہنوز بادشاہ عادل کے نام سے مشہور ہے اور رہتی دنیا تک مشہور رہے گا۔ یہاں تک کہ حضور سیدعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فخراً یہ کلمات ارشاد فرمائے ہیں : "میں بادشاہ عادل کے زمانے میں پیدا ہوا ہوں "

ازالہ : تفسیر سورۂ فاتحہ میں تحریر فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ نورانی میں ظہور فرمانے کی وجہ سے فخر فرمایا ہے جس کی دلیل نوشیرواں کے عدل وانصاف کے زمانے کو بنایا۔ کیونکہ وہ کافر کہ جس پر کفر کا غلبہ ہو اس کو اچھے حال یعنی عدل کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ امام سخاوی رحمہ اللہ تعالیٰ مقاصدِ حسنہ میں فرماتے ہیں کہ حدیث مذکورہ کا کوئی اصل نہیں اور نہ ہی یہ درجہ صحت تک پہنچتی ہے۔ اگر بفرضِ محال صحیح بھی ہو تو اس پر لفظ عادل کا اطلاق اس کے اسی اسم کے دعویٰ کی وجہ سے ہے نہ اس کو اس اسم سے موصوف کرنا مطلوب ہے اور نہ اس کے عادل ہونے کی شہادت دینا مقصود ہے یا اس کو اس وصف سے موصوف کرنا محض ان کے معتقدین کے اعتقاد کی وجہ سے ہے جبکہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ عادل تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ (بتوں کے متعلق) فرماتا ہے :

فما اغنت عنهم الٰهتهم۔

(پس انہیں ان کے خداؤں نے نہ بچایا)

یہاں معبودانِ باطلہ کو الٰہ کہا گیا ہے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص غیر اللہ کے حکم کا پابند ہو اسے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اچھے لفظ سے تعبیر کریں۔

حدیث شریف حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حاکم وقت کو قیامت میں حاضر کیا جائے گا، حکم ہوگا کہ اس کو پل صراط پر لے جاؤ۔ جب وہ پل صراط کے قریب جائے گا تو پل صراط اس کو دیکھ کر لرز جائے گی اور اس کا ہر ذرہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا۔ پھر وہ حاکم اگر اللہ تعالیٰ کے فرمان کا پابند ہو کر آیا ہوگا تو پل صراط پر سے بآسانی گزر جائے گا اور اگر نافرمان ہو کر آیا ہوگا تو پل صراط پھٹ جائے گی جس کی وجہ سے وہ جہنم میں گر پڑے گا۔ اور وہاں پچاس ہزار سال بسر کرے گا۔ کذا فی تذکرۃ الموتی للامام القرطبی۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں : ؎

مہا زورمندی مکن بر کہاں

کہ بر یک نمط نماند جہاں

نماند ستم گار بد روزگار

بماند برو لعنت پائیدار

ترجمہ: اے بڑے چھوٹے پر زیادتی مت کر، اس لیے کہ جہاں ایک طرز پر نہیں رہے گا۔ ظالم کا وقت بیت جائے گا لیکن اس پر ہمیشہ لعنت برستی رہے گی۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ

ربط: اس سے قبل حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنے کلام کو ان چیزوں سے شروع فرمایا جو عارف کے حال و ذکر و فکر اور اس کے اسمائے میں تاویل کرنا اور اس کی نعمتوں میں نظر کرنا اور اُس کے عظیم شان و تاثیر سلطان پر اس کے صنائع سے دلیل پکڑنے کے مساوی ہیں۔ اب عارف کے انتہائی امر کا ذکر فرماتا ہے اور اس کا انتہائی امر یہ ہے کہ اس کے کنہ وصال میں غور و خوض کر کے اہلِ مشاہدہ سے ہو کر اس کو عین و عیاں دیکھے اس کے ساتھ آمنے سامنے مناجات کرے، اے اللہ تعالیٰ! ہمیں واصلین سے بنا، ہمیں ان لوگوں میں نہ رکھ جو سُنی سُنائی باتوں پر خوش رہتے ہیں۔

تفسیر صُوفیانہ عابد پر واجب ہے کہ (عبادت سے) پہلے معبود اور اس کی ذات کو دیکھے۔ پھر اس کی عبادت کی طرف رجوع کرے۔ اس حیثیت سے نہیں کہ عبادت اس سے ظاہر ہو رہی ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ اسے اللہ تعالیٰ سے نسبت و تعلق ہے، اس لیے کہ عارف وصال کو اس وقت حق سمجھتا ہے جبکہ جنابِ قدس کے مشاہدہ میں مستغرق ہو کر ما سوا سے غائب ہو جائے یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی ہرگز نہ دیکھے اور نہ کسی حال پر نگاہ رکھے۔ ہاں اس حیثیت سے ملاحظہ کرے کہ یہ اس کے ملاحظہ سے ایک ملاحظہ اور منتسب الیہ ہے۔ اسی لیے حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول [جو حکایتاً قرآن نے نقل فرمایا جبکہ آپ نے غارِ ثور میں فرمایا:

ولا تحزن ان اللہ معنا۔ (خوف نہ کھائیے اللہ ہمارے ساتھ ہے)

یہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو ملحوظ رکھا] کو سیدنا کلیم علیٰ نبینا و علیہ السلام کے قول پر فضیلت دی گئی ہے اس لیے کہ انہوں نے اپنا ذکر مقدم رکھا۔

تفسیر عالمانہ مفعول بہ کو مقدم کرنے میں اختصاص مقصود ہے۔ معنے یہ ہیں کہ تجھ کو عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں نہ کہ تیرے غیر کو۔ عبادۃٌ نہایت درجہ کے خضوع و زاری کو کہتے ہیں (قانون) حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن میں ہر جگہ عبادت سے توحید اور تسبیح سے نماز اور قنوت سے طاعت مراد ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کی کہ آپ پڑھیے ایاک نعبد اور اس سے مراد یہ ہو کہ تجھی سے تمنّا اور امید رکھتے ہیں نہ کہ تیرے غیر سے۔

مسئلہ: نعبد اور نستعین میں جو ضمیر مستتر ہے اس سے قاری اور اس کے ساتھ رہنے والے ملائکہ اور حاضرین نماز با جماعت مراد ہیں یا وہی اور تمام اہلِ توحید مراد ہیں۔

نکتہ اپنی عبادت میں اس توحید کی عبادت اور اپنی حاجت میں انکی حاجت کو داخل کر رہا ہے تاکہ ان کے صدقے اور ان کی برکت سے اس کی عبادت قبول ہو جائے اور اس کی حاجت پوری ہو جائے۔

مسئلہ : اسی نکتہ کی بنا پر نماز کو باجماعت پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

تفسیر صوفیانہ سیدی حضور شیخ الاکبر قدس سرہٗ اپنی کتاب "العظمۃ" میں فرماتے ہیں کہ جب بندہ اپنے نفس کو نفعل کے نون سے تعبیر کرتا ہے تو یہ نون عظمت کا نہیں ہوتا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کو ضمیر مفرد سے بیان کرتا ہے تو یہ بندہ کے قلب پر سلطان پر توحید کے غلبہ اور تحقیق کی وجہ سے ہے کہ یہ اُس کی کلیت میں ایسا سرایت کر چکا ہے کہ اس کے بولنے سے وہ لفظ ظاہر ہو رہا ہے جو کہ اس کے عقیدہ و علم و مشاہدہ و معائنہ میں ہے۔

مسئلہ : نَعْبُدُ کا نون جمع کا ہے کیونکہ بندہ اگرچہ فردانی اللطیفہ اور وحدانی فی الحقیقت ہے مگر در اصل بحیثیت اپنے لطیفہ اور ترکیب و شکل و قالب کے غیر وحدانی و فردانی ہے۔

مسئلہ : انسان کا کوئی جزء ایسا نہیں کہ جس میں حق تعالیٰ کی حقیقتِ ربانیہ کا ظہور نہ ہو۔ اور ان اجزاء کی لیاقت کے مطابق ان پر عبادت مقرر فرمائی۔ اور یہ اجزاء اگرچہ مدبرہ ہیں مگر ان کے لیے مخصوص تکلیف (جو کہ ان کی ذاتی اعتبارات کے لیے مناسب ہے) مختص ہے۔ اسی جمعیت کو دیکھ کر بندہ عرض کرتا ہے:

وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ وَإِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَإِيَّاكَ نَعْبُدُ۔

(ہم تیرے لیے نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں اور تیری طرف رجوع رکھتے ہیں اور کوشاں رہتے ہیں اور تیری رحمت کے امیدوار اور صرف تیری عبادت کرتے ہیں)

ف : اسی طرح تمام خطابات جو قرآن مجید میں آئے ہیں اُن کا یہی جواب ہے۔ علمائے ظواہر سے کسی نے مجھ سے اس مسئلہ کا سوال کیا اور وہ اس مسئلہ میں بہت حیران تھا۔ میں نے اُسے بہت سے جوابات دیے اُن میں سے ایک جواب یہ بھی تھا۔ بحمدہٖ تعالیٰ اس کی پوری تشفی ہو گئی۔

نکتہ : عبادت کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے اس لیے مخصوص ہے کہ عبادت نہایت درجہ کے خضوع کو کہتے ہیں اور اس جیسا خضوع اس ذات کے لیے شایان ہے جو نہایت درجہ کا منعم ہو اور وہ باری تعالیٰ ایسا منعم ہے کہ اس نے ہمارے لیے نفع بخش چیزیں پیدا فرمائیں اور ہمیں حیاتِ اعلیٰ عطا فرمائی جس سے ہم نفع اُٹھا رہے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

کنتم امواتاً۔ (تم مُردہ تھے)

اور فرمایا:

خلق لکم ما فی الارض جمیعاً۔ (جو زمین میں ہے میں نے تمام تمہارے لیے پیدا کیا ہے)

نکتہ : بندہ کے احوال تین زمانوں سے خالی نہیں:

(۱) ماضی (۲) حال (۳) مستقبل

زمانہ ماضی میں اس کو عدم، موت، عجز، جہالت سے منتقل فرما کر حیات، قدرت، علم کا جامہ پہنایا۔ اور زمانہ حال میں اس پر

ابواب حاجات کھول دیے اور اسباب ضروریات لازم کر دیے۔ انہی وجوہ سے وہ اپنے بندہ کے لیے رب بھی ہے اور رحمان و رحیم بھی، اور زمانہ استقبال میں مالك یوم الدّین ہے کہ اپنے بندہ کو اعمال کی جزا دے گا۔ معلوم ہوگیا کہ بندہ کے مصالح ان تین زمانوں سے خالی نہیں اور یہ امور سوائے اللہ تعالیٰ کی امداد کے پورے ہو بھی نہیں سکتے۔ لہٰذا عبادت کا مستحق بھی وہی ہے۔

لغوی بحث نَعۡبُدُ، اس کا اشتقاق یا تو عبادت سے ہے یا عبودیت سے۔ عبادت عابدیت اور عبودیت عبدیت کو کہتے ہیں اور صلوٰۃ بلا غفلت، صوم بلا غیبت، صدقہ بلا منت، حج بلا خصومت، صبر بلا شکایت، یقین بلا شبہت، شہود بلا غیب، ایصال بلا قطعیت عبادت کے اقسام ہیں۔

معتقدات وعبادت کے اقسام عبادت کے اقسام (جن کو حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اربعین میں فرمائے ہیں) دس ہیں۔ جیسا کہ ان عبادات کے اقسام سے پہلے معتقدات دس ہیں ——— پس وہ ذات ازلی، ابدی جو کہ صفات جلال و اکرام جیسی صفات سے موصوف ہے۔ وہی اول وہی آخر، وہی ظاہر وہی باطن ہے۔ یعنی اوّل ہے اپنے وجود میں، اور آخر ہے اپنے صفات و افعال میں، اور ظاہر ہے شہادت و مکونات کے ساتھ، اور باطن ہے غیبت و معلومات کی وجہ سے (۲) وہ ان چیزوں سے مقدس ہے جو اس کے کمال کے لائق نہیں اور اس کے جمال کو عیب دار کرتی ہے۔ نقائص ہوں یا رذائل (۳) اس کی قدرت تمام ممکنات کو شامل ہے (۴) اُس کا علم تمام معلومات کو محیط ہے، یہاں تک کہ چیونٹی کے سخت پتھر پر اندھیری رات میں چلنے کی آواز بلکہ اس سے زیادہ پوشیدہ باتیں جیسے کہ حرکات و سکنات کے علاوہ جتنی مخفی باتیں ہیں سب کو جانتا ہے (۵) اس کا ارادہ تمام کائنات کو شامل ہے۔ کوئی کام قلیل ہو یا کثیر، مُلک میں ہو یا ملکوت میں۔ اس کی قضا و مشیت کے سوا جاری ہو ہی نہیں سکتا (۶) اشیاء کو اوقاتِ معینہ میں پیدا کرنے میں ازل ہے اور نہ اس کی بصر سے تاریکی حائل ہے۔ کانوں کے سوراخ کے بغیر سُنتا ہے اور حدقہ و اجفان کے بغیر دیکھتا ہے (۷) اس کا کلام ازلی اور قائم بذاتہٖ ہے۔ اس کے کلام کو آواز کی محتاجی نہیں جیسا کہ مخلوق کا کلام آواز کا محتاج ہے اور قرآن مَقۡرءٌ مکتوبٌ (پڑھا ہُوا اور لکھا ہوا) اور محفوظ ہے باوجود اس کے قدیم اور قائم بذاتہٖ ہے اور سیدنا موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام بغیر صوت و حرف کے سُنا جیسا کہ اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ مولا کریم کی ذات کو بغیر شکل و رنگ کے دیکھتے ہیں (یعنی خواب میں)۔ (۸) اس کے افعال خالص عدل سے موصوف ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے فعل سے حادث اور اس کے عدل سے فائز نہ ہو۔ کیوں کر اس کے غیر کی طرف کوئی ملک منسوب نہیں۔ جب ہر شے اُس کی مِلک ہے فلہٰذا اس کے تصرف کو ظلم نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس سے ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا (یعنی اس سے ظلم ممتنع ہے) اور نہ کوئی اس پر واجب ہے بلکہ اس کی ہر نعمت کو فضل اور اس کے ہر عذاب کو عدل کہا جائے گا۔ (۹) یومِ آخرت (۱۰) نبوت کہ جس میں ملائکہ کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا بھی

شامل ہے ۔اور وہ دس قسم کے عبادات یہ ہیں :

(۱) نماز (۲) زکوٰۃ (۳) روزہ (۴) حج (۵) تلاوتِ قرآن (۶) ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرنا۔

(۷) طلبِ حلال (۸) مسلمانوں کے حقوق میں پابندیٔ صحت کے حقوق

(۹) امر بالمعروف نہی عن المنکر

(۱۰) اتباعِ سنّت جو دراصل سعادت کی کنجی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت ہے ۔کما قال تعالیٰ :

ان کنتم تحبون اللہ ۔ (اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو)

ف : مولانا جامی قدس سرّہٗ فرماتے ہیں : ؎

یا نبی السلام علیک

انما الفوز والفلاح لدیک

گر نہ رفتم طریق سنّت تو

ہستم از عاصیان اُمت تو

ماندہ ام زیرِ بارِ عصیان پست

رفتم از پائے گر نہ گیری دست

ترجمہ : اے نبی پاک ! آپ پر سلام ہو۔ فلاح وبہبود آپ کے پاس ہے اگر میں آپ کی سنّت پر عمل نہ کروں تو گنہگار ہو جاؤں ۔گناہوں کے بوجھ سے مَیں نہایت کمزور ہو گیا ہُوں۔ اگر آپ دستگیری نہ فرمائیں تو میرا کوئی ٹھکانا نہیں ۔

مراتبِ عباد اللہ متوجہینِ الی اللہ کے مراتب کے بیان میں آیا ہے کہ جب بندہ کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو اس سے اس کا ارادہ غیرِ حق کا ہو تو وہ ابھی تک حُر ہے بندہ نہیں اور اگر کسی خاص امر کا ارادہ نہیں کیا بلکہ اس ارادہ پر نیکی کرتا ہے کہ یہ اچھا امر ہے یا مامور بہ سمجھ کر اس لیے کر رہا ہے کہ اس کا اسے حکم دیا گیا ہے ۔مگر مطلقاً نہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ اپنے آمر کے ہاں حضوری کے حصول کی غرض پر تو وہ مرد ہے اگر اس سے زاید مرتبہ حاصل کیا، یعنی امر کی ادائیگی کے وقت غیرِ حق کا ارادہ نہیں کرتا تو یہ کامل فی الرجولیت ہے ۔اگر مذکورہ بالا امور کے ساتھ ساتھ اپنے فعل میں حضور مع الحق ایسا رکھتا ہو کہ نفس کو بالکل ترک کر کے بعینِ حق حق کا مشاہدہ کرتا ہو بایں حیثیت کہ مشہود کی اضافت اسی طرح فعل اور اس کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتا ہو نہ کہ اپنے نفس کی جانب ، تو یہ عبدِ مخلص ہے اور اس کی عبادت خالص ہے اگر اس میں مذکورہ بالا امور کا غلبہ بھی ہو اور ما قبل کے احکام بھی اس میں پائے جاتے ہوں تو یہ مقام فبی یسمع کا ہے (مگر وہ نہ تو ان مذکورہ اشیاء کی کسی شے سے متقید ہے نہ ان کے مجموعہ سے) جس میں ہر مرتبہ و نسبت میں سریانِ حکم مشہود احدی کی

شمولیت بھی ہے نہ یہ کہ کسی متعین امر میں ثابت ہے بلکہ اپنی فراخی اور اپنے علم صحیح سے (جس سے وہ موصوف ہوا) اور جس سے وہ ہر وقت و ہر حال میں جُدا ہوا ہے (نہ غفلت و حجاب سے) ہر وصف و حکم کو قبول کرنے کی وجہ سے ثابت ہے تو یہ کامل فی العبودیت والخلافۃ والاحاطۃ والاطلاق ہے۔ (کذا فی تفسیر الفاتحہ للصدر القونوی قدس سرہٗ)

تفسیرِ صُوفیانہ تاویلات نجمیہ میں (ایاك نعبد کی تفسیر میں) مرقوم ہے کہ بندہ کے غیبت سے خطاب کی طرف رجوع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مالک و مملوک کے مابین سوائے مملوک کے نفس کے ملک کے کوئی حجاب نہیں جب اس نے نفس کے ملک کے حجاب کو طے کر لیا تو مالک کے مشاہدہ کے ملک تک پہنچ گیا۔ جیسا کہ حضرت ابویزید رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض مشاہدات میں اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ "یا الٰہی! تجھ تک پہنچنے کی کون سی راہ ہے؟" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اپنے نفس کو ترک کر کے میرے پاس چلا آ۔"

اوصافِ نفس نفس کے اوصاف چار ہیں:

(۱) امّارہ (۲) لوّامہ (۳) ملھمہ (۴) مطمئنہ

پس عبد مملوک کو بھی چاہیے کہ اپنے مالک کو چار صفتوں سے یاد کرے:

(۱) الوہیت (۲) ربوبیت (۳) رحمانیت (۴) رحیمیت

پھر بعد از مدحِ الٰہیت و شکر ربوبیت و ثنائے رحمانیت و تمجید رحیمیت نفس کے ملک کے صفاتِ اربعہ کے حجابات کو ان چار اوصاف مبارکہ کی قوتِ جاذبہ کے طفیل عبور کرتا ہے۔ پھر اپنے نفس کی خرابی کی شبِ ظلمات سے مالك یوم الدین کی صبح صادق کے طلوع سے نجات پاتا ہے۔ ان منازل کو طے کرنے کے بعد عبد مملوک کسی شے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ جماد کی مانند عاجز ہو کر رہ جاتا ہے تو پھر اس پر اس کا مالک رحم فرماتا ہے اور اس کو اپنی لسانِ کرم سے اپنا وعدہ فاذکرونی اذکرکم یاد دلاتا ہے اور اسے اپنے پاس بلاتا ہے اور مخاطب ہو کر فرماتا ہے یاایتھا النفس المطمئنہ، پھر ارجعی الی ربك کے پاک جذبہ سے غیبتِ نفس سے نکال کر شہودِ مالکیت میں کھینچ لیتا ہے جس سے عبد مملوک مشاہدۂ جمال مالک حقیقی سے مالا مال ہو کر بندہ عاجز ذلیل خاشع وخاضع کی طرح سامنے کھڑے ہو کر پکار اُٹھتا ہے۔ جیسا کہ بعض قرأت میں ایاك نعبد کی نداء کی وجہ سے مالك یوم الدین کو منصوب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

ف: نفس دنیوی ہے اور عبادت بھی اپنی خواہشاتِ دنیوی کی کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

افرأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ۔

اور قلب اُخروی ہے اسی لیے عبادت بھی جنّت کی کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ونھی النفس عن الھوٰی فانّ الجنّۃ ھی الماوٰی۔ (نفس کو خواہش سے روکا تو جنت اس کا ٹھکانا)

اور رُوح قربی ہے اس لیے عبادت بھی قربت و عندیت کی کرتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فی مقعد صدق عند ملیکٍ مقتدر۔ (مالک قادر کے نزدیک ان کا مقام صدق مقعد میں ہے)
اور سر حضرتی ہے عبادت بھی حق تبارک و تعالیٰ کی کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس میں فرمایا ہے:

سِرٌّ بینی و بین عبدی لا یسعہ فیہ ملکٌ مقربٌ ولا نبیٌ مرسل۔
پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے عبد کو نعمتِ نماز جیسا انعام بخشا تو اس کو اپنے اور بندہ پر دو حصص پر منقسم فرمایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس پر فرمایا:

قسمت الصّلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین فنصفھا لی و نصفھا لعبدی و لعبدی ما سأل۔
پس بندہ اس نصف سے اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال پر حمد و ثنا و شکر ادا کرتا ہوا بارگاہِ لایزال کا قرب حاصل کر لیتا ہے اور پھر وہ مالک قدیم بھی محض اپنے کرم و انعام سے بندہ کے قریب ہوتا ہے۔ جیسا کہ خود فرماتا ہے:

من تقرب الی تقربت الیہ ذراعا۔ (جو میرے قریب ہوا میں اس کے بالشت بھر قریب ہوا)
یہ سب اس کے اس نصف کی بدولت ہے جو اس کو بندگیٔ عبودیت غیر سے نجات ہو رہی ہے۔ پھر اس کو خواہشات نفس بد کے ظلمات بعضھا فوق بعض سے نکالا جاتا ہے اور قلب کی مراد اور روح کے تعلق کو غیر اللہ سے علیحدہ کر کے نورِ وحدانیت اور شہود و فردانیت کے ساتھ معلق کیا جاتا ہے، جس سے اس کے نفس کی زمین اور روح کا عرش اور راز کی کرسی رب کے نور سے چمکنے لگ جاتے ہیں اور ایسے بندگان اپنے معبودِ حق (جو ان کا خالق بھی ہے اور مالک ملک بھی) کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور ان معبودانِ باطلہ (کہ جن کی پرستش میں شب و روز مصروف تھے) سے روگرداں ہو کر عروۃ الوثقیٰ کو تھام کر ایک کی عبادت میں مشغول ہو کر کہتے ہیں ایاک نعبد و ایاک نستعین۔

تفسیر عالمانہ

وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ سوال: ایاک کو دوبارہ کیوں لایا گیا؟
جواب: تاکہ اس بات پر نص ہو جائے کہ جیسے عبادت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اسی طرح استعانت (بالاستقلال) بھی اس کے ساتھ مخصوص ہے۔

اَلِاسْتِعَانَۃُ بمعنی طلب عون (مدد طلب کرنا) (قانون) یہ باب باٗ کے ساتھ اور بغیر باٗ کے بنفسہٖ متعدی ہوتا ہے۔
ایاک نستعین کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیری عبادت کرنے پر یا ان چیزوں پر کہ جن کی ہمیں طاقت نہیں ہے یا شیطان (جو کہ تیری عبادت کے مانع ہے) کی جنگ پر یا ان امور پر جو ہمیں دین و دنیا میں فائدہ پہنچائیں۔ تجھ سے امداد طلب کرتے ہیں اور ان اقوال کے لیے جامع معنی یہ ہے کہ اے اللہ! ہم تجھ سے امداد مانگتے ہیں کہ ہمیں ادائے حق اور اقامت فرائض اور تحمل تکالیف اور طلب مصالح کی توفیق بخش۔

سوال: عبادت کو استعانت پر مقدم کیوں لائے؟

جواب : ۱- تاکہ آیات کے رؤس موافق رہیں۔
۲- اس لیے کہ معلوم ہوجائے کہ طلب کے لیے تقدیم وسیلہ سے اجابت جلد تر ممکن ہوتی ہے۔
ف : جب ایاك نعبد کہا گیا تو اس سے تکبّر و تعجب پیدا ہو گیا۔ پھر اس کے ازالہ کے لیے ایّاك نستعین بولا گیا تاکہ تکبر و عجب بالکل مٹ جائیں۔

نکتہ اس آیت میں افتخار و افتقار کو یکجا جمع کیا گیا ہے۔ فخر تو اس طرح کہ ایّاك نعبد پڑھنے سے بندہ کو خیال گزرے گا کہ میں عبد بھی ہوں عابد بھی اور افتقار یوں کہ عبد کو اقرار کرنا پڑا کہ یہ عبادت مجھے اللہ تعالیٰ کی امداد توفیق سے نصیب ہوئی۔

مسئلہ : اس آیت سے اہل سنت کے مذہب کی تائید ہوگئی کہ فعل کا کسب بندہ سے ہے اور اس کی توفیق اللہ جل جلالہٗ سے ہے جیسا کہ کسب بندہ سے اور فعل کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ سے ہے اور ایّاك نعبد سے جبریہ کا رد بھی ہے جو کہ بندہ سے کسی فعل کے صدور کے قائل نہیں ہیں اور ایاك نستعین میں معتزلہ کا رد بھی ہے کہ وہ توفیق وخلق من اللہ کے قائل نہیں ہیں۔ پس حق عبادت و استعانت کا یہ ہے کہ سوائے اس مالکِ لم یزل کی بارگاہ کے کسی کے آگے نہ سر جھکائے نہ کسی کو مستقل مستعان سمجھے۔

حکایت حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے، جب آپ نے ایّاك نستعین پڑھا تو بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ جب ہوش میں آئے تو سبب پوچھا گیا، آپ نے فرمایا کہ جب میں نے ایاك نستعین پڑھا تو مجھے ڈر ہوا کہ میں اس وقت کیا جواب دوں گا۔ جب مجھے کہا جائے گا کہ ایاك نستعین پڑھتا تھا تو پھر اطباء و سلاطین کے دروازہ کو کیوں کھٹکھٹایا تھا!

حکایت و فائدہ استعانت کو مخصوص باللہ کرنے میں حضرت سیدنا خلیل علیٰ نبینا و علیہ السلام کی اقتداء ہے جبکہ وہ نمرود لعین کی قید میں تھے تو اس وقت ان کی خدمت میں سیدنا جبریل علیہ السلام حاضر ہوکر کہنے لگے کیا تجھے کوئی حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا: حسبی من سوالی علمہ بحالی[1]۔ یہاں عبد عرض کرتا ہے الٰہی! میں اس وقت تیرے خلیل علیہ السلام سے عاجزی میں کچھ کم نہیں ہوں کہ تیرے خلیل علیہ السلام کے صرف دونوں ہاتھوں و پاؤں کو باندھا گیا اور میں سب کا سب باندھا ہوا ہوں کہ نہ تو پاؤں سے چلتا ہوں اور نہ ہاتھوں سے حرکت کرتا ہوں اور نہ آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور نہ کانوں سے سنتا ہوں اور نہ زبان سے بولتا ہوں باوجود اس کے نارِ جہنم کے کنارے پر ہوں۔ پس جیسا حضرت خلیل علیہ السلام نے تیرے سوا کسی کو مددگار نہ مانا، میں بھی تیرے سوا کسی کو مددگار نہیں سمجھتا۔ اس لیے تو عرض کر رہا ہوں ایاك نعبد۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی پُرخلوص داستان سُن کر گویا جواب میں فرماتا ہے کہ اے میرے بندے! میں بھی اپنے فضل و کرم کو حضرت خلیل علیہ السلام سے تجھ پر کچھ کم عطا نہیں فرماتا۔ چنانچہ ان کے لیے فرمایا تھا یا نار کونی برداً[2] و سلاماً علیٰ ابراھیم؛

---

[1] سوالی کی ضرورت نہیں وہ میرے حال کو خوب جانتا ہے۔ عنہ
[2] اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا

اور تجھ کو تو نارِ جہنم سے نجات دے کر بہشت کے باغات بخشے۔ بلکہ کلام قدیم کے سُننے کی تجھے توفیق بخشی اور نارِ جہنم کو تیرے لیے مامور فرمایا کہ جب اس کے قریب تیرا گزر ہوگا، تو تجھے عرض کرے گی، اے مردِ مومن! مجھ سے جلد گزر جا کیونکہ تیرے نور نے میرے شعلوں کو سرد فرما دیا۔ سیدی مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ فرماتے ہیں، ؎

آتشِ عشق از یں رو اے صفی

می شود دوزخ ضعیف و منطفی

گویدش بگزر سبک اے محتشم

ورنہ ز آتشہائے تو مرد آتشم

ترجمہ: ایسے نیک بخت سے دوزخ بھی کمزور ہو کر بُجھ جائے گی اور عرض کرے گی یا حضرت! جلد گزر فرمائیے ورنہ آپ کے عشق کے شعلوں سے میری گرمی مٹ جائے گی۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ **تعلق:** (۱) امداد مطلوبہ کا بیان ہے گویا کہا گیا ہے (اے میرے بندے) میں تمہاری مدد کیسے کروں؟ تو بندوں نے عرض کی: اھدنا الصراط المستقیم۔

(۲) نیز عبادت کے بعد دُعا مانگنا قاعدہ شرعیہ (بھی) ہے۔

ف (۳) تفسیر تیسیر میں ہے کہ ایاك نعبد میں توحید کا اظہار ہے اور ایاك نستعین میں توحید کی امداد طلب کرنا ہے اور اھدنا الصراط المستقیم میں دین پر ثابت رہنے کی استدعا ہے اور استدعا تحقیقِ عبادت اور اس پر ثابت رہنے کا نام ہے۔ کیونکہ ہدایت پر ثابت قدم رہنا جمیع حاجات کا خلاصہ ہے اسی لیے اس کو تمام انبیاء علیہم السلام اور اولیاءِ کرام علیہم الرضوان نے طلب فرمایا ہے۔ کما قال یوسف علی نبینا وعلیہ السلام:

توفنی مسلماً۔ اے اللہ مجھے مسلمان فوت کرنا

اور فرعون کے جادوگروں نے (بعد از سلام) کہا:

توفنا مسلمین۔

اور صحابہ کرام نے عرض کیا:

توفنا مع الابرار۔ اے اللہ ہمیں ابرار کے ساتھ فوت کرنا

یہ استدعا اس لیے ہے کہ ظاہر حال پر اعتماد نہ کیا جائے کیونکہ انجام کبھی تبدیل ہو جاتا ہے جیسے ابلیس و برصیصا و بلعم بن باعوراء کا حال ہوا۔ سیدی مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

صد ہزاران ابلیس و بلعم در جہاں

ہم چنیں بودست پیدا و نہاں

ایں ھمہ دو را مشہور گرداینداللہ
تاکہ باشند ایں دو بر باقی گواہ
ایں دو دزد آویخت بردار بلند
ورنہ اندر قہر بس دزداں بدند

ترجمہ: بے شمار ابلیس اور بلعم ایسے ہی پوشیدہ اور چھپے ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے صرف ان دو کو مشہور فرمایا تاکہ ان دو کو دوسروں کی علامت بنائی جائے صرف ان دو کو سولی پر لٹکایا ورنہ ان جیسے ہزاروں چور اور بھی ہیں۔

تفسیر صوفیانہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تفسیر میں ہے کہ جب اس کلمہ کو عارف واصل باللہ کہتا ہے تو اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اے اللہ! ہمیں اپنی سیر کے طریق پر چلا تاکہ ہم سے ہمارے احوال کے ظلمات مٹ جائیں اور ہمارے ابدان کے پردے ہم سے ہٹ جائیں۔ پھر ہم تیرے مقدس نور سے نورانی ہو کر تجھی کو دیکھیں۔

مسئلہ: مولانا فناری رحمہ اللہ الباری فرماتے ہیں کہ سیر فی اللہ غیر متناہی ہے جیسا کہ قطب المحققین فرماتے ہیں کہ معلومات و مقدورات الٰہیہ کی کوئی انتہا نہیں، پس جہاں تک معلوم و مقدور ہے نہ بندہ کا شوق سکون پاتا ہے اور نہ وہ زائل ہوتا ہے۔

قانون: فعل ہدایت کو لام اور الیٰ سے متعدی کر کے اس کے ساتھ اختیار (جو کہ قرآن پاک میں و اختار موسیٰ قومہ الخ واقع ہوا ہے) جیسا معاملہ کیا جاتا ہے۔ (یعنی مفعول ثانی کی طرف بلا واسطہ متعدی ہوتا ہے)

قانون: صراط مستقیم ملتِ اسلام اور دینِ حق سے استعارہ ہے۔ وسیلۂ مقصود کو وسیلۂ مقصد سے، محل روحانی کو محل جسمانی سے تشبیہ دینا ہے۔

سوال: دین کو صراط کیوں کہتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی ذات اگرچہ مکانات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ مگر چونکہ بندہ کو قطع مسافات و مس آفات اور تکالیف کا نشانہ بننا لازم ہوگا تاکہ وصال و مرافات سے نوازا جائے (اور یہ چیزیں دین کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں بنا بریں اس کا نام صراط ہوا)۔

نکات باوجود ہدایت یافتہ ہونے کے پھر ہدایت کی طلب کرنے میں کئی نکتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بعد اس راہِ راست کی معرفت ضروری ہے جو اعمال شہوانیہ و غضبانیہ اور انفاقِ مال کے مابین افراط و تفریط سے پاک ہو اور مطلوب بھی یہی ہے کہ راہِ راست کی ہدایت نصیب ہو۔

(۲) اگرچہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی معرفت دلیل سے ثابت ہوگی مگر وہاں دیگر دلائل بھی ہوں گے۔ تو پھر اھدنا کے معنے یہ ہوئے کہ اے اللہ! ہمیں وہ عرفان نصیب فرما جس کی وجہ سے ہر شے میں علین تیزی ذات و صفات اور افعال کی معرفت کے دلائل کے جلوے نظر آئیں۔

(۴) اھدنا کا معنی بموجب قولہ تعالیٰ وَ اِنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا ماسوا اللہ سے اعراض کی طلب ہے۔ اگرچہ اس کا اپنا نفس کیوں نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف بالکلیہ متوجہ ہونے کی طلب میں اگرچہ بحکم ایزدی اپنے پیارے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہو جیسے سیدنا ابراہیم کو سیدنا اسمٰعیل علیہم السلام کے ذبح کا حکم ہو یا خود ذبح کے لیے تیار ہو جانا پڑے جیسا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ذبح ہونے کے لیے تیار ہو گئے یا اپنے آپ کو دریا میں پھینکنا پڑے جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے کیا یا باوجود اعلیٰ درجات پر فائز ہونے کے تکالیف کا نشانہ بننا پڑے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں قتل یا ٹکڑے ٹکڑے ہونا پڑے تو صبر سے کام لے جیسا کہ حضرت یحیٰی و حضرت زکریا علیٰ نبینا و علیہما السلام نے کیا۔

ف : یہ مقام بڑا خطرناک ہے۔ اس صراط الذین انعمت علیھم میں آسانی ہے بہ نسبت اس کے کہ اگر فرماتے صراط الذین قتلوا وضربوا۔ اور اس میں بحیثیت انعام کے انبیاء و اولیاء علیہم السلام کے مقام کی طرف ترغیب ہے۔

استقامت کے فضائل

استقامت اور پھر اس پر ثابت قدم رہنا بڑی مشکل بات ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے سورۂ ہُود اور اس کی ہم مثل سورتوں نے بُوڑھا کیا۔ کیونکہ اس میں فاستقم کما اُمرت کا حکم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے قوائے ظاہریہ و باطنیہ کے اعتبار سے تین چیزوں پر مشتمل ہے:

۱۔ صفات

۲۔ اخلاق طبعیہ

۳۔ روحانیہ

ان تینوں کے لیے افراط و تفریط کی دو دو طرفیں ہیں تو ان میں سے طرفِ وسط کی پہچان اور اس پر ثابت قدم رہنا ضروری ہوا۔ چنانچہ اس پر بہت سی آیات و نصوص دلالت کرتی ہیں۔

(۱) قال تعالیٰ لا تجعل یدك مغلولۃً الخ۔ اس میں بخل و اسراف میں اعتدال کی ترغیب ہے۔

(۲) حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی کو جس نے گوشہ نشینی اور صیام الدہر و قیام اللیل کی درخواست پیش کی۔ زجر و توبیخ کے بعد فرمایا: تجھ پر تیرے نفس کا حق ہے اور تیری زوجہ کا تجھ پر حق ہے اور تیرے ملاقاتیوں کا تجھ پر حق ہے۔ پس روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو۔ رات کو قیام بھی کرو اور نیند بھی۔ اسی طرح اپنے جمیع امور میں فرمایا:

(۳) قال تعالیٰ و لا تجھر بصلاتك و لا تخافت بھا۔ (اپنی نماز میں نہ آواز بلند کرو اور نہ پست)

(۴) و قال تعالیٰ و لم یسرفوا و لم یقتروا و کان بین ذٰلك قواماً۔ (اور نہ ہی وہ حد سے بڑھے اور نہ ہی تنگی اور وہ اس کے درمیان میانہ رو ہیں)

(۵) و قال تعالیٰ ما زاغ البصر و ما طغیٰ (نہ ہی آنکھ ٹیڑھی ہوئی اور نہ بہکی)

(۶) ایک روز حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اونچی آواز سے قرآن پڑھتے سُنا تو آپ نے

سبب پوچھا۔ عرض کی: حضور! سوتوں کو جگاتا ہوں اور شیطان کو ہٹاتا ہوں۔ آپ نے انہیں فرمایا: آواز ذرا نیچی رکھو۔ پھر جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لائے تو ان کو آہستہ قرأت کرتے پایا۔ اُن سے سبب پوچھا۔ عرض کی: حضور! جس ذات سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہے اس کو تو سُنا رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اس سے ذرا اونچی آواز سے پڑھا کرو۔ اسی طرح تمام عادات و اخلاق میں میانہ روی چاہیے (مثلاً شجاعت ایک بہتر وصف ہے جو دلیری اور بزدلی کا درمیانہ امر ہے) اسی طرح بلاغت بھی اعلیٰ وصف ہے جو ایجاز ناقص اور اطناب زاید کے مابین ہے۔

ف: ہماری شریعت بھی میزانِ اعتدال کی دلیل ہے۔ ہر ترغیب و ترہیب میں اور ہر حکم و صفت و خلق میں، یہاں تک کہ صفتِ مذمومہ کے حدود بھی بیان فرمائے۔ مثلاً جس وقت صفتِ مذمومہ کو اس حدِ شرعی کے مطابق استعمال کیا جائے تو وُہ صفت مذموم محمود ہو جاتی ہے۔ جیسے کسی کو بُرائی سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیئے روکنا یا کسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بغض رکھنا (اگرچہ یہ فعل مذموم ہے مگر جب رضائے الٰہی مدِّ نظر ہو تو یہ صفتِ مذموم محمود ہو جائے گی)

مستقیم کے اقسام

مستقیم کئی قسم پر ہے:

(۱) مستقیم بفعلہ وقولہ وقلبہ۔

(۲) مستقیم بفعلہ وقولہ دون قولہ یعنی کسی کو اپنی استقامت کا پتا نہ دے۔ ان دونوں کے لیے کامیابی ہے مگر پہلے کا درجہ اعلیٰ ہے۔

(۳) مستقیم بفعلہ وقولہ دون قلبہ۔ اس کے لیے بھی غیر سے نفع کی امید ہے۔

(۴) مستقیم بقولہ وقلبہ دون فعلہ۔

(۵) مستقیم بقولہ دون فعلہ وقلبہ۔

(۶) مستقیم بقلبہ دون قولہ و فعلہ۔

(۷) مستقیم بفعلہ دون قولہ وقلبہ۔

ان چاروں (اواخر کے) عامل کو سراسر نقصان ہے۔ ان کو نفع کی امید بھی نہیں چاہیے۔ اگرچہ مراتب میں یہ چاروں ایک دوسرے سے ادنیٰ و اعلیٰ ہیں۔

ف: استقامت بالقول سے یہ مراد نہیں کہ غیبت و چغلی یا ان جیسے اور قبیح افعال کا ترک ہو۔ ان کو تو استقامت بالفعل بھی شامل ہے بلکہ استقامت بالفعل سے یہ مراد ہے کہ کسی کو راہِ راست کی رہنمائی کی جائے۔

ف: جس کی طرف راہ دکھائی جاتی ہے اس بات سے یہ استقامت خالی بھی ہوتی ہے۔ استقامت بالفعل والقول و القلب کے اجتماع کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک مرد مسائلِ فقہ سے واقف ہے اور پُوری تحقیق سے اس کے مسائل کا عالم بن کر کسی کو یہ مسائل سکھا دے۔ اس معنی پر یہ شخص مستقیم بالقول ہے اور جب نماز کا وقت آ گیا تو بہ مطابق مسائل ظاہری

ارکان کے موافق نماز ادا کی تو اس بنا پر یہ شخص مستقیم بالفعل ہے۔ پھر اسے علم ہوا کہ نماز میں اھدنا الصراط سے اللہ تعالیٰ کی مراد حضور قلب ہے تو نماز میں حضورِ قلب بھی کیا تو اس اعتبار سے یہ شخص مستقیم بالقلب ہے۔ علیٰ ہذا القیاس باقی اقسام۔

تفسیرِ صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ ہدایت تین قسم ہے:

(۱) ہدایت عامہ یعنی عام حیوانات کو حصول منافع اور ترک نقصانات کی ہدایت کرنا۔ والیہ اشار قولہ تعالیٰ:

اعطیٰ کل شئ خلقہ ثم ھدیٰ۔ اللہ نے ہر شے کو صورت عطا کر کے ہدایت دی

اور فرمایا؛

وھدینا النجدین۔ ہم نے دو راستے بتائے

(۲) ہدایت خاصہ یعنی مومنوں کو جنّت کی راہ دکھلانا۔ والیہ اشار قولہٗ تعالیٰ:

یھدیھم ربھم بایمانھم (الآیۃ) اللہ انہیں ان کے ایمان کی ہدایت دیتا ہے

(۳) ہدایت اخص۔ درحقیقت ہدایت اسی کا نام ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کی ذات کی رہبری کرنا۔ چنانچہ یہ آیات اسی معنیٰ کی طرف اشارہ فرماتی ہیں۔

(۱) قل ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ۔ فرمایا بیشک ہدایت صرف اللہ ہی کی ہے

(۲) انی ذاھب الیٰ ربی سیھدین۔ میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں وہی مجھے ہدایت دے گا

(۳) اللہ یجتبی من رسلہٖ من یشاء یھدی الیہ من ینیب۔

(۴) ووجدك ضالاً فھدیٰ۔

یعنی آپ اپنے صحرائے وجود میں محوِ خیال تھے تو ہم نے آپ کو اپنے وجود سے طلب فرمایا اور آپ کو اپنے فضل ولطف میں پایا اور اپنے جذبات عنایت ونورِ ہدایت سے آپ کو اپنی طرف ہدایت دیتا ہوں۔ اب جو آپ کی تابعداری کریں گے اور آپ کی رضا کے طالب ہوں گے تو ان کو بشری وجود کی تاریکیوں سے نکال کر وجودِ روحانی کے نور تک پہنچا دوں گا اور ان کو راہِ راست کی ہدایت بھی دوں گا۔ کما قال تعالیٰ:

قد جاءکم من اللہ نورٌ وکتابٌ مبین یھدی بہ اللہ۔ (الآیۃ)

صراطِ مستقیم وہ دین قویم ہے کہ جس کی شہادت قرآن پاک میں درج ہے یعنی سید الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق مبارک۔ کما قال اللہ تعالیٰ؛

وانك لعلیٰ خلق عظیم۔ بیشک آپ عظیم خلق والے ہیں

ف: صراطِ مستقیم سے مراد بہشت کی وہ راہ ہے جو کہ اصحابِ یمین کے لیے ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

واللہ یدعوا الیٰ دار السلام۔ (الآیۃ) اور اللہ دارالسلام کی دعوت دیتا ہے

ف : صراطِ مستقیم سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کا سلوک جو کہ سابقین متقربین کے لیے ہے۔ کما قال تعالیٰ : الیٰ صراط مستقیم صراط اللہ۔

ف : ہر وہ راہ جو اصحاب یمین کو نصیب ہو وہ سابقین متقربین کو بھی حاصل ہے کیونکہ اصحابِ یمین کو جو جو شہود جمال اور کشف جلال حاصل ہوئے سابقین متقربین حضرات کو ان سے پہلے نصیب ہوئے اور یہ سیّد الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کا خاصہ ہے یا ان کے صدقے ان کے تابعداروں کو بھی ہوا۔ کما قال اللہ تعالیٰ :

هل هٰذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃٍ و من اتبعنی۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں : ؎

بر آتش فشاند سجادہ ات
اگر جز بحق میرود جادہ ات

ترجمہ : تیرا ٹھکانا جہنم ہے اگر تیرا طریقہ صحیح نہ ہو۔

تفسیر عالمانہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یہ جملہ اوّل جملہ سے بدل الکل ہے اور انعام بمعنی ایصالِ نعمت ہے۔ اور یہ در اصل اس حالت کا نام ہے جس سے انسان لذت پائے پھر اس کا اس لذت پر اطلاق کیا گیا جو دین سے حاصل ہوتی ہو۔

ف : ابو العباس ابن عطا فرماتے ہیں کہ منعم علیہم (جن حضرات پر انعام کیا گیا) کے کئی طبقات ہیں :

۱ - عارفین ، ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کا انعام کیا۔
۲ - اولیاء ، ان پر صدق و رضا اور یقین و صفوۃ کا انعام ہوا۔
۳ - ابرار ، ان پر علم و رافت کا لطف ہوا۔
۴ - مریدین ، ان کو حلاوت طاعت کا لطف ہوا۔
۵ - مومنین ، ان پر استقامت کا فضل ہوا۔

بعض کہتے ہیں کہ منعم علیہم انبیاء وصدّیقین وشہداء وصالحین ہیں۔ کما قال تعالیٰ :

اولئك الذین انعم اللہ علیهم من النبیین والصدّیقین والشهداء والصالحین۔

ف : یہاں صراط کی اضافت بندوں کی طرف ہے اور ان هذا صراطی مستقیما میں اللہ تعالیٰ نے صراط کو اپنی طرف مضاف کیا ، جیسا کہ دین و ہدایت کو کبھی اپنی طرف مضاف کیا۔ کما قال تعالیٰ : افغیر دین اللہ اور انّ الهدیٰ هدی اللہ۔ اور کبھی بندوں کی طرف بھی۔ کما قال تعالیٰ :

الیوم اکملت لکم دینکم اور فبهدٰهم اقتده۔

نکات ہدایت و دین و صراط کو کبھی اپنی طرف اور کبھی بندوں کی طرف مضاف کرنے میں چند نکتے ہیں:

(۱) یہ اشیا اس نے مشروع فرمائیں صرف ہمارے نفع کے لیے۔ کما قال تعالیٰ:

شرع لکم من الدین - تمہارے لیے دین مشروع فرمایا

(۲) ان میں اس کی رضامندی و اختیار ہے اور ہمارا کام ہے ان پر چلنا اور فرماں برداری۔

(۳) جب اپنی طرف انہیں مضاف کیا تو بندہ کی رعونت کا قلع قمع کیا (کہ سب اشیا اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ پھر بندہ کی طرف مضاف کیا تاکہ اسے تسلّی ہو۔

(۴) بندہ کی طرف مضاف کرنے میں اس کی عزّت افزائی کی، اور اپنی طرف مضاف کیا تاکہ شیطان کو دخل اندازی کا طمع نہ ہو۔ جیساکہ منقول ہے کہ جب آیت و للّٰہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین نازل ہوئی تو شیطان نے کہا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلم کی عزت چھیننے پر قادر نہیں ہوں لیکن مومنین کی عزّت ضرور چھین لوں گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے وللّٰہ العزۃ جمیعًا فرما کر اسے طمع سے مایوس فرما دیا۔ (کذا فی التیسیر)

ف : صراط کے تکرار میں اس طرف اشارہ ہے کہ صراط دراصل دو ہیں:

(۱) عبد سے رب کی طرف

(۲) رب سے عبد کی طرف۔

وہ راستہ جو عبد سے رب کی طرف ہے وہ خطرناک ہے کہ بہت قافلے اس میں کٹ گئے اور بہت رہ گیر اس میں رہ گئے۔ اور منادیِ عزّت اہلِ عزّت کو ندا دیتا ہے کہ اس راہ کی طلب مردود اور راہ مسدود ہے کیونکہ اس راہ پر جانے والے پر ڈاکہ زنی ہوتی ہے۔ چنانچہ شیطان ملعون کا قول قرآن پاک میں ہے لاقعدن لهم صراطك المستقيم۔ لیکن وہ راہ جو رب سے عبد کی طرف ہے، پُرامن ہے اس راہ پر چلنے والے بسلامت جاتے ہیں اور ان کی منزلیں نعمتوں سے پُر ہیں۔ اس راہ پر چلنے والوں کو آسانی میسر ہوتی ہے۔ ان کے قائدین انبیاء و صدیقین اور شہداء و صالحین ہیں۔ یہ وہ قائدین ہیں جن کے قلوب اللہ تعالیٰ کے انوار سے پُراسرار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فیوضات و تجلیات کی بارش کے مورد ہیں اور شیطان کے مکر و فریب اور عیاریوں سے انھیں معصوم و محفوظ و مامون فرمایا گیا ہے۔

ف : نعمتیں ظاہری ہیں یا باطنی۔ جیسے انبیاء علیہم السلام کو مع کتابوں کے بھیجنا اور ان کی دعوت کو قبول کرنے کی توفیق بخشنا، اور اتباعِ سنّت و اجتنابِ بدعت اور پھر نفس کو اوامر و نواہی کا پابند کر دینا اور صدق پر ثابت قدمی عنایت فرمانا، اور عبودیت کا لزوم عطا فرمانا وغیرہ۔

تفسیر صوفیانہ ارواح پر ابتدائے فطرت میں اپنے نور کے قطرات برسائے۔ جیساکہ حدیث شریف میں ہے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو ظلمت میں پیدا فرما کر پھر ان پر

اپنے نور کے قطرات برسائے۔ جس شخص پر اس نور سے کچھ پہنچا وُہ ہدایت یافتہ ہوگیا اور جو اس سے محروم رہا وہ گمراہ ہوگیا۔ گویا صراط اللہ کی راہ کُھلنا اُس نور سے ہے اور پہلی بارش وہی قطرات ہیں جس کی وجہ سے مومنین برسانے والے کے مشاہدات سے بہرہ یاب ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس ابر رحمت کے منتظر ہو کر بارگاہِ لم یزل میں عرض کرتے ہیں: اھدنا الصراط المستقیم الخ یعنی ہمیں ان لوگوں کی راہ پر چلا کہ جن پر تُو نے اپنے الطاف خاص کے دروازے کھولے، جس کی بدولت تیری امداد سے تجھی کو پایا، اور انہوں نے تجھے پا لیا ان الطاف کے واسطے سے جو تُو نے انہیں عنایت کیے۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

تشریح حدیث شریف شیخ صدر الدین قونوی قدس سرہٗ اس حدیث شریف کی تاویل میں فرماتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ وجود محض کے مقابلہ میں عدم (جو وجود کی نقیض ہے) سمجھا جاتا ہے کیونکہ لامحالہ عدم کے لیے ایک تعین متعین ہے اور عدم کے لیے ظلمت ہے جیسا کہ وجود کے لیے نور ہے۔ اس لیے ممکن کو ظلمت سے موصوف کیا جاتا ہے کیونکہ ممکن وجود سے نور پا کر ظاہر ہوتا ہے۔ پس ظلمت ممکن عدم کی ایک وجہ سے ہے جو اسے متصل ہے اور ہر وُہ کمی جو ممکن کو لاحق ہوتی ہے (اور اس کمی سے ممکن موصوف بھی ہوتا رہتا ہے) یہ اس نسبت عدمیہ کے احکام سے ہے۔ اسی طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مذکورہ میں ان اللہ خلق ... الخ والخلق فی ظلمۃ ..... الخ (جس کا ترجمہ اوپر گزرا) اشارہ ہے، اور اس حدیث شریف میں خلق بمعنی تقدیر ہے کیونکہ تقدیر ایجاد سے سابق ہے اور رش النور سے ممکنات پر وجود کا پہنچنا مراد ہے۔

تفسیر عالمانہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ یہ الذین سے بدل ہے۔ معنی یہ ہے کہ منعم علیہم وہ لوگ ہیں جو غضب اور گمراہی سے بچ گئے۔ کلمہ غیرٌ کے تین معنے ہیں:

(۱) بمعنی مغایرت، فارسی میں بمعنی جُز۔ قال تعالیٰ:

لتفتری علینا غیرہٗ۔ تاکہ تو اس کے سوا ہمیں افترا کرے

(۲) بمعنی لا، فارسی میں بمعنی نہ۔ قال تعالیٰ:

فمن اضطر غیر باغ ولا عادٍ۔ تو جو مجبور ہو جائے نہ بغاوت سے نہ حد سے بڑھ کر

(۳) بمعنی الّا، فارسی میں بمعنی مگر۔ قال تعالیٰ:

فما وجدنا فیھا غیر بیت من المسلمین۔ تو ہم نے نہیں پایا سوائے مسلمانوں کے گھر کے

یہاں ہر سہ معانی کا معنی متحمل ہے۔

ف: جب غیر بمعنی استثناء (الّا) ہو تو غیر کو منصوب پڑھنا ہوگا۔ اور غضب بمعنی بدلہ لینے کے وقت نفس کا جوش کرنے اور دل کے خُون سے انتقام کے ارادہ سے حاصل ہوتی ہے اور یہاں بمعنی رضا کی نقیض ہے یا ارادۂ انتقام یا تحقیق الوعد یا اخذ الیم یا بطش شدید یا ہتک استار، یا تعذیب بالنار مراد ہے۔ کیونکہ علم تفسیر کا قاعدہ ہے

کہ وُہ افعال کہ جن کے اوائل ہدایات اور اواخر غایات ہوں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف باعتبار ہدایات کے غیر ممکن ہوں تو اسناد کے وقت ان کے غایات کا ارادہ کیا جاتا ہے جیسے غضب وحیا اور تکبّر واستہزا وغیرہ۔ اسی طرح غم و فرحت اور ضحک و بشاشت وغیرہ اور ضلال بمعنی سیدھی راہ سے عمداً یا خطأً ہٹ جانا۔

مسئلہ : مغضوب علیہم (جن پر غضب کیا گیا) سے بے فرمان اور ضالّین سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے جاہل لوگ مراد ہیں۔ کیونکہ منعم علیہم وہ لوگ ہیں جو جامع بین العلم والعمل ہیں۔ اب ان کی نقیض وہ لوگ ہوں گے جو ان دو قوتوں عاقلہ و عاملہ میں کسی ایک میں سے ناقص ہوں۔ پس عمل سے ناقص مغضوب علیہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قاتل بالعمد کے متعلق فرماتا ہے:

فماذا بعد الحق الّا الضلال۔ تو حق کے بعد گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مغضوب علیہم سے یہودی مراد ہوں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے حق میں فرماتا ہے:

من لعنہ اللہ وغضب علیہ۔ جس پر اللہ نے لعنت وغضب فرمایا۔

اور ضآلّین سے نصاریٰ مراد ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے متعلق فرمایا ہے:

قد ضلّوا من قبل و اضلّوا۔ اس سے پہلے وہ گمراہ ہوئے اور گمراہ کیا

ف : غضب سے یہود کی طرف اور ضال سے نصاریٰ کی طرف منسوب ہونے سے تخصیص مراد نہیں کیونکہ غضب کی نسبت قرآن پاک میں نصاریٰ کی طرف بھی ہوتی ہے اور اسی طرح ضلال کی نسبت یہود کی طرف بھی، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب یہ دونوں متقابل ہوں اور جبکہ غضب بمعنی ارادۂ انتقام ہو تو اس کے معنی یہود زیادہ لائق ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ کُفر کرنے میں بڑے سرکش ہیں۔ مثلاً حد سے تجاوز کرنا اور انبیاء علیہم السلام کو شہید کرنا اور ان کا یہ قول:

ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء وغیرہ۔ بیشک اللہ فقیر ہے اور ہم غنی

سوال : اگر اعتراض پیدا ہو کہ جب منعم علیہم ان دونوں فرقوں کے غیروں کو کہتے ہیں تو پھر منعم علیہم کے بعد صرف ان کے ذکر سے کیا فائدہ۔

جواب : اس میں فائدہ یہ ہے کہ منعم علیہم ایمان کے وصف کو کمال رجأ (جس کو اللہ تعالیٰ نے انعمت علیھم سے تعبیر فرمایا ہے) سے بیان کرنے کے بعد ان دونوں فرقوں سے منعم علیہم کے ایمان کے وصف کو کمال خوف سے ذکر کرنا مطلوب ہے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر مومن کے خوف و رجاء کو تولا جائے تو دونوں برابر ہوں گے۔

ف : غضبِ الٰہی کا حکم مرتبۂ قبضہ بائیں ہاتھ کی تکمیل ہے اگرچہ اس کے دونوں مقدس ہاتھ مبارک ہیں لیکن ہر ایک کا حکم ایک دوسرے کے خلاف ہے۔ تمام زمین اس کی ایک مٹھی ہے اور تمام آسمان اس کے سیدھے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہیں اسی لیے اس کے ایک ہاتھ کے لیے عموم سعادت رحمت اور نرمی اور دوسرے ہاتھ کے لیے قہر و غضب اور اس کے لوازمات کو منسوب کیا جاتا ہے۔

۱۔ غضب کے حکم میں راز وہی تکمیل ہے جس کی طرف دونوں ہاتھوں کے مابین جمع کرنے کا اشارہ کیا گیا ہے۔

نکات ۲۔ غضب کرنے میں اپنے بندے کی حفاظت کرنا مقصود ہے جیسے آکلہ کا مریض جبکہ اس کے کسی عضو میں ظاہر ہو۔ اور طبیب کبھی اُس کا باپ ہو یا اُس کا دوست یا اس کا سگا بھائی۔ تو باوجود وافر محبت کے اس کی بیماری والے عضو کے کاٹنے میں عجلت کریں گے اس لیے کہ اس میں اچھا ہونے کی صلاحیت نہیں رہی۔

۳۔ غضب کرنے سے اپنے بندے کو پاک کرنا ہے، جیسے سونا کہ جس میں قلعی اور تانبہ کی ملاوٹ ہو تو اس سونے کو قلعی و تانبہ کی ملاوٹ سے پاک کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ اس سونے کو جلتی آگ میں ڈالا جائے۔

تفسیر صوفیانہ

ضلال حیرت کو کہتے ہیں، یہ دو قسم ہے:

(۱) مذموم

(۲) محمود

حیرت محمودہ کے تین مراتب ہیں:

(۱) مبتدیوں کی حیرت

(۲) اہلِ کشف و حجاب کے متوسطین کی حیرت

(۳) اکابر محققین کی حیرت

پہلی یعنی مبتدیوں کی حیرت پانچ چیزوں سے دفع ہوتی ہے:

(۱) مطلب راجح کو متعین کرنا، مثلاً اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے قُرب و شہود ذاتی کی طلب۔

(۲) موصل الی المطلوب کی راہ کی پہچان، مثلاً شریعتِ کاملہ پر ثابت قدم رہنا۔

(۳) وہ سبب جو مقصود حاصل کرا دے، مثلاً مرشد کریم کا دامن پکڑنا۔

(۴) اپنے مقصود کی تحصیل پر مدد دینے والی چیزوں کا التزام رکھنا۔ جیسے ذکر و فکر وغیرہ۔

(۵) مقصود سے روکنے والی چیزوں کی معرفت پھر اس کو دفع کرنے کی تجاویز کی پہچان۔ جب یہ پانچ چیزیں حاصل ہو جائیں گی تو حیرت خود بخود ہٹ جائے گی۔

اور اکابر کی حیرت سب کی سب محمود ہے۔ اس میں گمان بھی نہ لانا کہ ان کی حیرت کا سبب قصور فی الادراک ہے اور کمال جلاء و استجلاء سے نقص مانع ہے بلکہ یہ ایک ایسی حیرت ہے کہ جس کا حکم بعد کمال تحقیق بالمعروف والشہود اور ہر راز کے وجود کے معائنہ اور احدیت کے وجود پر اطلاع تام کے ہوگا۔

ف: تفسیر نجمیہ میں ہے کہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جن کو وہ نور مسطورہ بالا نہ مل سکا تو خواہش نفسانی کے جنگل میں گم ہو کر طبع و تقلید کی ظلمتوں میں جا پڑے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہود کی طرح غضب فرمایا اور

طرد و تبعید کے ساتھ ملعون بھی ٹھہرایا۔ یہاں تک کہ شرع قویم کی طرف ہدایت نہ پا سکے اور صراطِ مستقیم سے بھی ہٹ گئے۔ یعنی مرتبۂ انسانیت (جسے احسن تقویم سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس میں انسان کو پیدا کیا گیا ہے) سے دور ہو کر بندر و خنزیر سے مسخ ہو گئے صورتاً بھی اور معناً بھی۔ یا جس وقت راہِ راست سے بھٹک کر سدِّ بشریت میں پڑے تو الطافِ ربوبیت کو بھلا دیا۔ اور راہِ توحید سے چُوکے تو شیطان نے ان کے شرک کرانے پر تسلط پا لیا۔ جیسے نصاریٰ نے اپنی خواہشات اور دنیا کو معبود سمجھا اور اللہ تعالیٰ کے لیے کہتے تھے ثالث ثلثہ۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلایا تو اللہ تعالیٰ نے بھی بے توجہی فرمائی۔ یہ تقریر بموافق حال اوّل کے ہے۔ اس میں ایک وجہ اور بھی ہے اور اس وجہ میں عارض المآل معتبر ہے۔ وہ وجہ یہ ہے کہ غیر المغضوب الخ سے وُہ لوگ مراد ہیں کہ جس کو حضور کی غیبت، اور سرور کے بعد محنت، اور نُور کے بعد ظلمت نصیب ہوئی (نعوذ باللہ من الحور بعد الکور)

تفسیر عالمانہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ یعنی ان لوگوں کی راہ نہ دکھا جنھوں نے فسق و فجور کے غلبہ سے سرور کو سرور کی تبدیلی کی وجہ سے گمراہ ہوئے۔ اس میں تیسری وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ (صراطِ مستقیم کو) ملک الملوک کی طرف راہ چلنا مراد ہو (اب معنیٰ یوں ہُوا کہ یا اللہ! ان لوگوں کی راہ پر نہ چلا کہ منازل کو طے کرنے سے رُک کر قافلوں سے منقطع ہوئے تو تُو نے ان پر غضب کیا۔ اور نہ ان گمراہوں کی راہ پر چلا جو مقصود سے دُور ہُوئے۔

اٰمِیْن اٰمین اسم فعل بمعنی استجب ہے یا بمعنی افعل یارب ہے۔

قانون: یہ لفظ اَیْنَ اور کَیْفَ کی طرح التقائے ساکنین کی وجہ سے مبنی علی الفتح ہے۔

مسئلہ: سنّت یہ ہے کہ اسے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد ایک دفعہ پڑھا جائے جیسا کہ ذیل کی حدیث شریف بتاتی ہے:

فضائلِ آمین (۱) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے جبریل علیہ السلام نے آمین سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد سکھائی۔ اور عرض کیا کہ فاتحہ کے لیے آمین ایسی ہے جیسے کتاب کی مُہر۔

ف: سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہٗ اس حدیث کی توضیح فرماتے ہیں کہ اٰمین رب العالمین کی مُہر ہے۔ جس سے اپنے بندہ کی دعا پر مہر لگاتا ہے۔

نکتہ: جس طرح مہر لگے ہوئے لفافہ کو مہر کے بعد مکتوب الیہ کے بغیر کسی کو مطلع ہونے اور تصرف کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسی طرح آمین بندہ کی دعا کو نقصان سے محفوظ کرتی ہے۔

(۲) حضرت وہب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اٰمین کے ہر حرف سے ایک ایک فرشتہ پیدا کیا جاتا ہے اور وہ فرشتے آمین کہنے والے کے لیے بخشش کی دُعا طلب کرتے رہتے ہیں۔

مسئلہ: حدیث شریف میں ہے کہ دُعا مانگنے والا اور آمین کہنے والا دونوں دُعا میں شریک ہیں۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے فرمایا: قد اجیبت دعوتکما۔ حالانکہ فقط موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی اور ہارون

لہ۔ بیشک تمہاری دعوت قبول ہوئی

علیہ السلام نے آمین کہی مگر باری تعالیٰ نے ان دونوں کی طرف منسوب فرمایا۔

(۳) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب امام ولا الضآلین کہے تو آمین کہو۔ کیونکہ ولا الضالین کے بعد فرشتے بھی آمین کہتے ہیں۔ پس جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہوگا تو اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہوجائیں گے۔ اس حدیث کا نکتہ حضرت وہب کے قول میں مذکور ہو چکا ہے۔

شرح : ملائکہ کی موافقت میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں زمانہ کی موافقت، بعض کہتے ہیں اخلاص اور توجہ احدی کی موافقت، مراد ہے۔ اور ان آمین کہنے والے ملائکہ کے کہنے کے متعلق بھی اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ ملائکہ حفظہ یعنی انسان کے نگران فرشتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں ان کے غیر ہیں۔ اس کی تائید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے بھی ہوتی ہے: فان وافق قولہ قول اھل السماء .... الخ۔ تو جس کا قول اہل آسمان کے قول کے موافق ہوا۔

ف : ان دونوں اقوال کا توافق یُوں ہوسکتا ہے کہ دونوں مراد ہوں حفظہ بھی اور اہلِ سما بھی۔

تفسیر صُوفیانہ مولانا فناری رحمہ اللہ الباری فاتحہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ فاتحہ اس شخص کے لیے نسخۂ کمال ہے جو ظلمت عدم سے نکل کر تکمیل تک پہنچا اور استہلاک نورقدم سے خارج ہوکر انوار و روحانیت کی طرف چلا۔ پھر نفخ کے واسطہ سے عالمِ جسمانیہ کی طرف پہنچ جائے تاکہ اس مرتبۂ انسانیت کی تکمیل ہوجائے کہ جس کی جمعیت میں انانیت کا گمان ہے۔ بدیں وجہ جس راہ سے آیا ہے اس کی طرف ہدایت کی طلب کی محتاجی درپیش ہوئی تاکہ وجود سے عدم کی طرف حدوث سے قدم کی طرف واپسی ہو۔ پس سالک موجود کو ایسا مفقود سمجھے کہ گویا اس کا حاصل ہونا پھر ناممکن ہے (اسی خیال سے) اسے گم شدہ مقصود ایسا حاصل ہوجائے گا کہ پھر اس کے مٹ جانے کا احتمال بھی باقی نہ رہے۔

ف : جب بندوں کو اس سوال کے قبول ہونے کے بعد مرتبۂ کمال ہُوا جیساکہ اللہ تعالیٰ کا لعبدی ما سأل میں وعدہ تھا پھر اپنی طرف لعبدی میں لام تملیک کے ساتھ مضاف کیا پھر اکرم الاکرمین نے اس دعا کو آمین کی مُہر سے ختم فرمایا۔

ف : یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے مخلص ہیں کہ عام دنیا میں کسی کو طاقت نہیں کہ ان پر تصرف کر کے اللہ تعالیٰ کی لگائی ہوئی مہر کو توڑ سکے۔ اسی لیے تو شیطان خبیث (مخلص بندوں سے) ناامید ہوکر الا عبادك منهم المخلصين کہہ چکا ہے۔

مسئلہ : جمہور کے نزدیک بالاجماع فاتحہ کی سات آیتیں ہیں۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ بسم اللہ شریف آیت مستقل نہیں اور آخری آیت غیر المغضوب .... الخ ہے اور بعض اس کے برعکس بسم اللہ شریف کو مستقل سمجھتے ہیں اور غیر المغضوب ..... الخ سے آیت نہیں سمجھتے بلکہ صراط الذین سے سمجھتے ہیں۔

ف : تفسیر تیسیر میں ہے کہ اس کے کل کلمات پچیس[۲۵] اور کل حروف ایک سو تئیس[۱۲۳] ہیں۔ اور عین معانی میں اس کے کل کلمات ستائیس اور کل حروف ایک سو بیالیس[۱۴۲] بیان فرمائے ہیں۔

فضائل فاتحہ : (۱) جب اس سورۃ کو حضرت جبریل حضور علیہ السلام کی خدمت میں لائے تو اُن کے ساتھ اس وقت

سات ہزار فرشتے تھے۔

(۲) مروی ہے کہ شام سے ایک قافلہ ابوجہل کے لیے بہت سامال لے کر آیا، یہ قافلہ سات گروہ پر مشتمل تھا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اس قافلہ کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت اکثر صحابہ غریب تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر صحابہ کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احساس فرمایا جس پر اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کو نازل کیا اور فرمایا اٰتینٰك سبعًا من المثانی۔ یعنی ابوجہل کے ہر قافلہ کے عوض آپ کو فاتحہ عطا فرمائی۔ پس باوجود آپ کے اس بڑے عطیہ کے ابوجہل آپ کے عطیہ کی طرف نظر اٹھاکر بھی نہیں دیکھتا تو آپ بھی اس کی دنیائے کمینہ کو نظرانداز فرمایئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو جو کہ صرف صحابہ کے لیے تھی نہ کہ اپنے لیے تو ارشاد فرمایا اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! غم نہ کھائیے اس صورت کی برکت اور نفع مال کے نفع سے بہت زاید ہے۔ پس آپ اپنے صحابہ کے لیے اپنے باز و بچھا دیجئے کیونکہ آپ کا تواضع کرنا ان کے لیے ان کی آرزو پوری ہوجانے سے بہت مرغوب ہے۔

(۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر یہ سورت تورات میں ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم یہودیت کی طرف میل نہ کرتی اور اگر انجیل میں ہوتی تو عیسیٰ علیہ السلام کی قوم نصرانی نہ ہوتی اور اگر زبور میں ہوتی تو داؤد علیہ السلام کی قوم کو مسخ نہ ہوتا۔ پس جس نے اسے پڑھا اللہ تعالیٰ اسے اتنا دے گا کہ گویا اس نے سارا قرآن پاک پڑھا ہے اور گویا اس نے تمام مومنین مرد و عورت پر صدقہ (خیرات) کیا ہے۔

(۴) اس کے حروف معجمہ بائیس[۲۲] ہیں اور حضور علیہ السلام کے بعد از آغاز وحی بھی بائیس سال تھے۔

(۵) اس میں سات حروف نہیں ہیں ثا ثبور کی، جیم جحیم کی، خا خوف کی، زا زقوم کی، شین شقاوت کی، ظا ظلمت کی، فا فراق کی۔ پس جو شخص اس سورۃ کو صحیح اعتقاد اور پوری تعظیم سے پڑھے گا تو وہ ان اشیاء مذکور سے پرامن رہے گا۔

(۶) حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجنے کا پختہ ارادہ فرمالیتا ہے مگر جب اس قوم کے بچے مدرسہ میں الحمد للہ رب العالمین الخ پڑھتے ہیں تو اس قوم سے چالیس سال تک عذاب اٹھالیتا ہے۔

(۷) پہلے بیان ہوچکا ہے کہ جمیع علوم جمیع کتب سماویہ میں ہیں اور ان کے علوم قرآن پاک میں ہیں۔ اور قرآن شریف کے علوم سورۃ فاتحہ میں ہیں۔ پس گویا جو شخص اس سورت سے واقف ہوا اور جس نے اسے پڑھا اس نے تمام علوم کو پڑھا۔

ف: تفسیر کبیر میں ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ مقصود تمام کتب سے علوم اصول فروع، مکاشفات کا حاصل کرنا ہے اور یہ سورت تمام علوم کو شامل ہے جیسا کہ معلوم ہوچکا۔

خلاصہ سُورۃ فاتحہ

مولانا فناری رحمہ اللہ الباری فرماتے ہیں کہ معلوم ہوچکا ہے کہ فاتحہ کے اوّل سے یوم الدین تک اُن عقاید کا بیان ہے جو الٰہیات کے ساتھ ذاتاً وصفۃً وفعلاً متعلق ہیں کیونکہ حمد کا حصر کمالات ذاتیہ و صفاتیہ و افعالیہ کو مقتضی ہے بعد ازاں نبوت وولایات کا بیان ہے کیونکہ یہ سب سے بڑی اور مخصوص نعمتیں ہیں۔ پھر عقاید اخرویہ کا ذکر ہے کیونکہ وہ باری تعالیٰ آخرت کے جمیع امور کا مالک ہے۔ پھر ان دونوں کے مابین ایاك نعبد وایاك نستعین الخ واقع ہے۔ یعنی عبادات کے وُہ احکام جو عابد معبود کے مابین رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ عبادات یا تو معاملات ہیں یا وعیدات۔ کیونکہ استعانت یا تو حصولِ نفع کے لیے ہوتی ہے یا نقصان کو دفع کرنے کے لیے۔ پھر اس کے آخری حصہ میں مومن کو وجوہِ ہدایت کی طلب کا طریقہ ترتیب مذکورہ پر سکھایا گیا ہے۔ مثلاً قسمِ اوّل میں ایمان کی طرف اور قسم دوم میں اسلام کی طرف اشارہ فرمایا گیا۔ یہی احسان کے وجوہ ہیں۔ یعنی مراتبِ ثلاثہ جو کہ اخلاق روحانیت محمودہ ہیں۔ پھر ان مراتب معہودہ کا بیان ہے جس کو سیدِ دو جہاں علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ارشادِ گرامی ان تعبد ربك كانك تراه میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ پھر ان کمالاتِ مشہودہ کا ذکر ہے جو مطالع جلال کے استغراق کے وقت حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی وہ استغراق جو کاف تشبیہ (جو کہ حدیث ان تعبد ربك كانك تراه میں مذکور ہے) کو ہٹانے والا اور تنزیہ جبر کے غضب اور نسبتِ قدر کی گمراہی کا دافع ہے اسی کو علومِ مکاشفات سے موسوم کرتے ہیں۔ (واللہ اعلم باسرار کلیۃ المنطبعات)۔

۸

سورۂ بقرہ

سورۃ البقرۃ مدنیۃ وھی مائتان و ستۃ وثمانون آیۃ و اربعون رکوعاً
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

ترجمہ : وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) جس میں کوئی شک کی گنجایش نہیں یہ ڈر والوں کو ہدایت دیتی ہے وہ جو بے دیکھے ایمان لاتے ہیں اور نماز قایم کرتے ہیں اور ہمارے دیے ہوئے رزق سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں اور وہ جو کہ ایمان لاتے ہیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف نازل ہُوا اور وہ جو تم سے پہلے نازل ہوا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے والے نہیں اللہ نے ان کے

دلوں اور کانوں پر مُہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

تفسیر عالمانہ سورۂ بقرہ مدنیہ ہے اس کی ۲۸۷ آیتیں ہیں۔
اہل تفاسیر فرماتے ہیں کہ سب سے لمبی سُورت بقرہ اور سب سے چھوٹی سورۃ کوثر ہے۔ اور سب سے لمبی آیت آیۂ مداینۃ یعنی یاایھاالذین امنوا اذا تدا ینتم اور سب سے چھوٹی آیت والضحی اور والفجر ہے۔ اور سب سے لمبا کلمہ فاسقینکموہ ہے۔

سوال: سورۂ بقرہ سب سورتوں سے لمبی کیوں ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟
جواب: وہ یہ ہے کہ اس میں احکام کو تفصیل وار اور مثالیں دے کر اور دلائل قائم کرکے ذکر فرمایا ہے اور دوسری سورتوں میں یہ طرز نہیں ہے۔ اسی لیے اس کا نام فسطا طالقرآن بھی ہے۔

ف: ابن العربی رحمہ اللہ احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ میں نے بعض بزرگوں سے سُنا ہے کہ اس میں ایک ہزار امر اور ایک ہزار نہی اور ایک ہزار حکمتیں اور ایک ہزار خبریں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی عُظمِ فقاہت سے ابسے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حفظ کرنے میں آٹھ سال صرف فرمائے۔ (کذا فی اسئلۃ الحکم)

حکایت امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں کہہ بیٹھا کہ اس سورہ کریمہ کے فوائد و نفائس سے دس ہزار مسائل اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس بات کو بعض حاسدین اہل لغی (سرکشوں) نے بہت بعید سمجھا۔ جب میں نے اس قرآن کی تفسیر (کبیر) کی تصنیف کا ارادہ کیا تو پہلے اس کا مقدمہ لکھا تاکہ یہ مقدمہ تنبیہہ کی طرح ہو جائے۔ اس بات پر کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ امر ممکن الحصول اور قریب الوصول ہے۔

سوال: سورتوں کو لمبا، درمیانہ، چھوٹا کیوں مقرر کیا گیا؟
جواب: تاکہ تنبیہہ ہو کہ معجزہ کے لیے سورۃ کا لمبا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ سورۂ کوثر جس میں صرف تین آیتیں ہیں ایسے ہی معجزہ ہے جیسے سورۂ بقرہ۔

ف: سورتوں کو مقرر کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ تعلیم میں آسانی اور اطفال کو تدریجاً بڑی سورت پڑھانے میں سہولت ہو جائے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جو بندوں پر فرمایا اور اس میں ترغیب بھی ہے اور توسیع فضیلت بھی۔ نماز میں بھی اور دیگر اعمال میں بھی۔ مثلاً سورۂ اخلاص کو ایک بار پڑھنے سے قرآن پاک کی تہائی کے برابر ثواب ملتا ہے۔ جس نے یہ راز سمجھا وہ سورتوں کے مقرر کرنے کے بھید سے آشنا ہو گیا۔

سوال: اس میں کیا حکمت ہے کہ نزولِ قرآن کے متعدد مقامات میں مختلف مشاہد ہیں۔ مثلاً کوئی آیت مکیہ ہے اور کوئی مدنیہ، کوئی لیلیہ ہے کوئی نہاریہ، کوئی سفریہ ہے کوئی حضریہ، کوئی شتائیہ ہے کوئی صیفیہ اور کوئی نومیہ کوئی برزخیہ ہے۔

یعنی لیل و نہار کے مابین نازل ہونے والی۔ اور کوئی ارضیہ ہے کوئی سماویہ، اور کوئی غاریہ ہے یعنی وُہ جو غار میں نازل ہوئی۔ یعنی زمین کے تحت، اور برزخیہ وہ جو کہ مکہ شریف و مدینہ طیبہ کے مابین نازل ہوئی اور کوئی عرشیہ معراجیہ ہے۔ یعنی معراجیہ وہ جو معراج میں سورۂ بقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں۔

جواب: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحیِ الٰہی کا نزول جن مقامات یا اوقات میں ہوا اس سے ان کو شرافت و بزرگی نصیب ہوئی جیسا کہ شبِ معراج کے نکات میں سے ایک نکتہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضور سرورِ انبیاء علیہ السلام کا ان مقامات پر تشریف لے جانا محض ان مقامات کی عزت افزائی کے لیے تھا۔ گویا کہ کون و عرش و جنّات کا ہر ہر مقام لسانِ حال سے پکار رہا تھا کہ الٰہی! اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں کے قدوم سے ہمیں سرفراز فرما تاکہ اعیان و کبار کی آنکھیں تیرے محبوب سیّد السادات و منبع الموجودات کی نعلین مبارک کی غبار کو سُرمہ بنالیں۔ تیرا محبوب وُہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتا تو نہ کون کو وجود کی خوشبو نصیب ہوتی اور نہ حضرتِ کون سے لمعۂ شہود ظاہر ہوتا۔

حدیث شریف جیسا کہ حدیث قدسی میں فرمایا گیا ؛

لولاک لما خلقت الافلاک۔ یعنی اے محبوب! آپ نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا۔ (صلی اللہ علی حبیبہ باعث الکونین و وارث الثقلین جدّ الحسن والحسین وعلیٰ اٰلہٖ و اصحابہٖ اجمعین)

الٓمّٓ

سوال: سورۂ بقرہ کو الٓمّٓ (کلام متشابہ) اور سورۂ فاتحہ کو حرف ظاہر (محکم) سے ابتداء فرمانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اتقان میں فرمایا ہے کہ سورۂ بقرہ کو الٓمّٓ سے شروع فرمانے کی نسبت میرا خیال یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کو حرفِ ظاہر سے شروع کیا گیا تاکہ ہر خاص و عام کو اس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو تو پھر سورۂ بقرہ میں حرفِ متشابہ (جو کہ بعید از تاویل ہے) لایا گیا تاکہ اس کا مرتبہ عقلاء و حکماء کو معلوم ہو تاکہ وہ اس کے مقابلہ سے عاجز ہو کر کلامِ الٰہی میں ان حروف سے عبرت پکڑ کر اس کی آیات میں تدبّر کریں (کذا فی خواتم الحکم وحل الرموز وکشف الکنوز بالله للشیخ المعروف بہ علی دده)

ف: مفسرین نے حروفِ مقطعات کے بارے میں بہت کلام کیا اور ان کی مراد میں بہت لمبی چوڑی بحث کی ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ علوم مستورہ و اسرار محجوبہ ہیں۔ یعنی ان متشابہات سے ہیں کہ جن کا علم اللہ تعالیٰ نے پوشیدہ رکھا ہے۔ یہ قرآن کا مخفی راز ہے۔ ہمارے لیے ان کے ظاہر پر ایمان لانا ضروری اور ان کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا لازمی ہے۔ ان کے ذکر کرنے میں ایک فائدہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ بھی ایمان ہونا چاہیے یا یُوں کہو کہ الف

اللہ کا ہے۔ لام لطیف کا اور میم مجید کا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اللہ لطیف و مجید ہوں اور الٓر کا معنی انا اللہ واریٰ ہے اور کٓھٰیٰعٓصٓ بمعنی انا اللہ الکریم الھادی الحکیم الصادق ہے۔[1] اسی طرح قٓ میں اس طرف اشارہ ہے کہ میں اللہ قادر و قاہر ہوں۔ اور نٓ میں اشارہ ہے کہ میں اللہ و ناصر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ یہ حروفِ مقطعات سب کے سب اللہ تعالیٰ کے کسی اسم سے لیے گئے ہیں اور کلمہ کے بعض حروف کو لے کر باقی کو حذف کرنا کلامِ عرب میں شائع ہے۔ کما قال الشاعر:

قلت لہا قفی فقالت قٓ

یعنی میں نے اسے کہا ٹھہر جا' تو اس نے کہا ق 'و قفت' یعنی ٹھہر گئی ہوں۔

اور بعض فرماتے ہیں کہ یہ حروف بعض سورتوں کے اوائل میں ذکر کیے گئے ہیں تاکہ یہ حروف دلالت کریں کہ قرآن پاک ان حروف یعنی ا ب ت ث سے مرکب ہے پھر اُن کے بعض علیحدہ ہو کر آئے اور بعض مرکب ہو کر، تاکہ قرآن کے مقابل کو تنبیہ ہو۔ اور یہ آگاہ کرنا بھی مقصود ہے کہ قرآن شریف ان حروف سے مرکب ہے جن حروف سے تم لوگ اپنے کلام مرکب کرتے ہو۔ اگر یہ بشر کی طاقت سے باہر نہ ہوتا اور خالقِ کائنات کی طرف سے نازل کردہ نہ ہوتا تو وہ لوگ اس جیسا قرآن لانے پر قادر ہوتے۔ یہ وہ تقریر ہے جس پر اہلِ تحقیق کامیاب ہوئے لیکن اس پر ایک اعتراض پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ اس تقریر کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کوئی معنی و اسرار نہیں ہیں حالانکہ سرورِ انبیاء علیہ التحیۃ والثنا' کو اولین و آخرین کے علوم دئے گئے ہیں۔

الٓمٓ اور باقی حروفِ مقطعات ان مواضع و مخفی اسرار سے ہیں کہ جن کے الفاظ سے مابین محبوب و محب کے پردہ دیا گیا ہے کہ ان کے سوا ان کا علم کسی اور کو نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا علم اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت عنایت فرمایا کہ نہ اس وقت کسی ملک مقرب کی رسائی تھی نہ کسی نبی مرسل کی تاکہ ان حروف سے بواسطہ لسانِ جبریل اپنے محبوب سے راز و نیاز کی باتیں کرے کہ جس کا نہ جبریل کو علم ہو نہ کسی دوسرے کو۔ اس تقریر کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو بعض اخبار میں آیا ہے کہ جب جبریل علیہ السلام کٓھٰیٰعٓصٓ لائے تو جبریل نے کہا: کاف۔

حضور علیہ السلام نے کہا: میں نے جان لیا۔

جبریل نے کہا: یا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا: علمت۔ (میں نے جانا ہوا ہے)

پھر جبریل علیہ السلام نے کہا: ع۔

حضور علیہ السلام نے کہا: علمت۔ (مجھے علم ہے)

جبریل نے کہا: ص۔

حضور علیہ السلام نے کہا: علمت۔ (مجھے معلوم ہے)

---

[1] میں اللہ کریم ہادی حکیم اور سچا ہوں

جبریل علیہ السلام نے عرض کیا : یا حضرت ! جس کا مجھے ابھی علم نہیں آپ نے کیسے جان لیا۔

حروفِ مقطعات کا شانِ نزول

حضرت الشیخ اکبر قدس سرہٗ الٓمٓ ذٰلک الکتٰب کی تفسیر کی ابتداء میں فرماتے ہیں کہ وہ حروف مجہولہ جن کو اللہ تعالیٰ نے سورتوں کے اوائل میں نازل فرمایا ہے ان کے نزول کا سبب یہ ہے کہ مشرکین عرب قرآن پاک کے نزول کے وقت لغویات و بکواس بکتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت ان مقطعات کو نازل فرمایا تاکہ ان کے خیالات نازل کردہ کلام الٰہی کی طرف میل کریں۔ پھر جب انھیں سنیں تو اس کے خلاف نہ چلیں اور فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ وہ ہر عجیب و غریب امر کی طرف مائل ہوتا ہے پھر لغویات سے منہ پھیر کر اس امر کی طرف کان دھرتا ہے اور مقصود بھی یہی تھا کہ کفارِ عرب لغویات سے ہٹ کر قرآن پاک کے وہ احکام سنیں جو ان حروف کے بعد آنے والے ہیں تاکہ ان کے خیالات حروفِ مقطعات اور مرکبات (یعنی وہ جملے جو ان مقطعات سے مرکب ہوئے ہیں) میں مستغرق ہو جائیں۔ ان کے علم سے انھیں محروم رکھا۔ جس سے ان کا بہت بڑا شر دفع ہو گیا جو اُن کے تکبّر اور ہٹ دھرمی و لغویات سے ہر روز ہوتا تھا۔ یہ مومنوں کے لیے رحمت کا سبب بنا اور حکمتِ الٰہی کا ظہور ہوا۔

ف : بعض عارفین فرماتے ہیں کہ جو کچھ ان حروفِ مقطعات کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ محض اپنے خیالات و عندیات میں اور قائل کا اپنا تخمینہ پیش کرنا ہے کی حقیقت نہیں ہوا کرتی۔ ہاں اللہ تعالیٰ اپنی مراد پر کسی کو مطلع کر دے۔ یہ اس کا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرما دے۔ فقیر جامع (مصنفِ روح البیان) کہتا ہے کہ میرے شیخ اکمل نے کتاب اللائحات الباقیات کے حواشی پر الٓمٓ کے خواص علی طریق الحقیقت تحریر فرمانے کے بعد فرمایا کہ بہت سے زائغین عن العلم کے ان متشابہات میں قدم پھسلے ہیں اور بہت سے راسخین فی العلم کے عقول اس بارہ میں متحیّر ہیں اور بعض یہ تو بوجہ ادب اس کے بیان میں توقف فرما کر اس کی بحث و تجسس سے اعراض کر کے کہتے ہیں :

اٰمنا بہ کُلٌّ من عند ربّنا۔ ہم اس پر ایمان لائے یہ تمام کلام ہمارے ربّ سے ہے

اور بعض اس کی تاویل کرتے ہیں مگر ایسی کہ جو مرام مقام سے نہایت بعید۔ مگر ان کی تاویلیں شرعاً مستحسن اور دیناً و عقلاً مقبول ہیں لیکن مقصود و مقام کو (جو فی الواقع وہی مطلوب و مقصود ہو) کوئی نہیں پہنچ سکتا سوائے عقل والوں کے۔ مگر وہ بھی جن کو تذکیر و اطلاع و الہامِ الٰہی نصیب ہو۔ کیونکہ ان حضرات کو خصوصیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے ماسوا کو ان اسرار سے دُور رکھا جاتا ہے۔ اور یہ خصوصیت الٰہیہ ازلیہ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انھیں عطا ہوئی۔ نہ تو وہاں نفوس کی رسائی ہے اور نہ عقول کی پہنچ۔ محض اللہ تعالیٰ کا فیض و فضل و الہام ہے۔

مسئلہ : حضرت بسطامی عبد الرحمٰن قدس سرہٗ (مولف لطائف المسکیہ) بحر الوقوف میں فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو حروفِ مقطعات کے علوم و اسرار بواسطۂ وحی ربانی اور القائے صمدانی اور بعض اولیائے کرام کو بواسطہ کشف جلی و فیض علی ربانی حاصل ہیں اور بعض علماء کو نقل صحیح و عقل رجیح سے ان کا پتا چلا ہے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے متعلقین کو

بعض اسرار کی خبر دی ہے بطریق کشف کے یا بطریق شہود کے یا بطریق رسم وجدود کے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالے نے ان حروف کے اسرار اس امت کے اکثر لوگوں سے مخفی رکھے ہیں کیونکہ اس میں بہت عجیب حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ اور اکابر کو بھی اس کے عرفان ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن صرف بعض ان اسرار کی اجازت ہے جو اس ترکیب خاص پر مشتمل ہیں جن میں تسخیرات و تاثیرات فی العوالم العلویات و السفلیات وغیرہ کے انواع پائے جاتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

تفسیر تحبیر میں لکھا گیا ہے کہ نماز کی ہیئت (جو قرآن پاک میں ذکر کی گئی ہے) تین طرح ہے (۱) قیام کما قال اللہ تعالیٰ قوموا للہ قانتین۔ (فرمانبردار ہوکر اللہ کے لیے قیام کرو)

(۲) رکوع۔ ۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وارکعوا مع الراکعین۔ (رکوع والوں کے ساتھ رکوع کرو)

(۳) سجود۔ کما قال اللہ تعالیٰ؛ واسجد واقترب۔ (سجدہ کرو اور قریب ہوجاؤ)

پس الف سے (جو الم میں ہے) قیام کی طرف اشارہ ہے اور لام میں رکوع کی طرف اور میم میں سجدہ کی طرف۔ یعنی جس نے سورۃ فاتحہ (جوکہ نماز میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا ہے۔ جوکہ مومنین کی معراج ہے) پڑھی تو اللہ تعالے اُسے وُہ راہِ ہدایت عنایت فرمائے گا جو بندہ اھدنا الصراط المستقیم میں طلب کر رہا ہے۔

مسئلہ: تلاوت کا اجر جیسے محکم سے حاصل ہوتا ہے ایسے ہی متشابہ سے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے کتاب اللہ سے ایک حرف پڑھا اسے ایک نیکی ملے گی جوکہ دس نیکیوں کے برابر ہے، اور میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف۔ پس الم پڑھنے سے تین نیکیاں (جوکہ تیس نیکیوں کے برابر ہوں گی) عطا ہوں گی۔

تفسیر عالمانہ

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ یہ اشارہ جو ذٰلك سے فرمایا گیا ہے اشارہ بعید ہے حالانکہ یہ کتاب بعید نہیں۔ تو یہ اس لیے ہے کہ یہ کتاب (قرآن) چونکہ موعود تھی اور اس کا کتب سابقہ میں وعدہ کیا گیا تھا۔ اس لیے اس لحاظ سے اسے بعید قرار دے کر فرمایا گیا (کہ وہ کتاب، جس کا وعدہ کتب سابقہ میں کیا گیا تھا)۔

حدیث شریف

خدا تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تو وہ ایک ہزار سورۃ پر اور ہر سورت ایک ہزار آیت پر مشتمل تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: الٰہی! اس کتاب کو کون پڑھ سکے گا اور کون اسے زبانی یاد کر سکے گا؟ خدا تعالیٰ نے جواب دیا: اے موسیٰ! میں اس سے بھی زیادہ ضخیم کتاب نازل فرماؤں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: کس پر؟ فرمایا، خاتم النبیین پر۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: الٰہی! ان کی اُمت اسے کیسے پڑھ سکے گی جبکہ ان کی عمریں بہت تھوڑی ہوں گی۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا: میں اُن پر وہ کتاب ایسی آسان کردوں گا کہ اُن کے چھوٹے بچے بھی اسے پڑھ سکیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: الٰہی! اور تو یہ کیسے فرمائے گا؟ فرمایا: میں نے زمین پر ایک سو تین کتابیں نازل فرمائی ہیں پچاس شیث علیہ السلام پر، تیس ادریس پر،

بیس ابراہیم پر، تورات تجھ پر، زبور داؤد پر، انجیل عیسیٰ پر۔ اور ساری کائنات کا ان میں میں نے ذکر کیا۔ اور ان ساری کتابوں کے جملہ معانی کو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کتاب میں ذکر کروں گا۔ اور ان سب حقایق کو میں قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں جمع کر دوں گا اور ان سورتوں کو میں تیس پاروں میں اور ان سب کے مطالب کو سورۃ فاتحہ کی سات آیتوں میں اور پھر ان کے معانی کو سات حرفوں میں، اور وہ سات حرف بسم اللہ کے ہیں۔ پھر ان سب حقایق کو الحمد کے الف میں جمع کر دوں گا پھر سورۂ بقر شروع فرماؤں گا۔ پس جب توراۃ میں اللہ نے اس کا وعدہ فرمایا اور پھر حضور علیہ السلام پر نازل فرمایا تو یہودیوں نے اس بات سے انکار کیا کہ یہ وہی کتاب موعود نہیں ہے تو اللہ نے فرمایا:

ذٰلك الكتاب - یعنی یہ وہی کتاب ہے جس کا وعدہ فرمایا گیا تھا۔ (کذا فی تفسیر التیسیر تحت آیت ہذا)

اس کے علاوہ اعراب کے دیگر وجوہ بھی ہیں جو دیگر تفاسیر میں ہیں۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ لفظ ریب' لا کا اسم ہے اور فیہ اس کی خبر ہے اور ریب در اصل "رابنی الشئی" سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جبکہ متکلم کو کسی بات کا شک ہو اور نفس کے قلق و اضطراب کو بھی ریب کہتے ہیں۔ اور شک کو بھی ریب اسی لیے کہتے ہیں کہ ریب نفس کو اضطراب میں ڈال کر اس سے اطمینان زائل کر دیتا ہے۔

حدیث شریف اسی لیے حدیث شریف میں فرمایا گیا:

دع ما یریبك الی ما لا یریبك - (جو تجھے شک میں ڈالے اسے چھوڑ اس کی طرف متوجہ ہو جو تجھے شک میں نہ ڈالے اور یہ بھی اسی طرح کہ شک میں اضطراب ہے اور صدق میں اطمینان۔ اسی لغت کی مناسبت سے حوادثات (جس میں خوف ہو) ریب سے تعبیر کرتے ہیں اور ریب شک سے اخص ہے۔ پس ہر ریب کو شک کہا جا سکتا ہے اور ہر شک کو ریب نہیں کہا جا سکتا۔ اور شک اس تردد بین النقیضین کو کہتے ہیں جس میں شک کرنے والا (ایک) نقیض کو دوسری نقیض پر ترجیح نہ دے سکے۔

سوال: ظرف کو یعنی فیہ کو ریب پر کیوں مقدم نہیں کیا گیا۔

جواب: تاکہ یہ گمان نہ ہو کہ دیگر کتب میں تو شک ہے مگر اس میں نہیں۔ کیونکہ قانون ہے کہ ظرف کی تقدیم سے حصر مقصود ہوتی ہے۔

سوال: کفار کو اس میں شک تھا، چنانچہ وہ اس کے کتاب اللہ ہونے کے منکر تھے اور مبتدعین اہل قبلہ کو متشابہات کے معانی میں شک تھا۔ چنانچہ وہ اس کے ظاہری معنوں کی وجہ سے گمراہ ہو گئے اور علماء کرام کو متشابہات کے وجوہ میں شک ہے۔ چنانچہ وہ کسی یقینی معنے پر نہیں جم سکے اور عوام کو خود متشابہات میں شک ہے کیونکہ وہ ان کے معانی سے بے خبر ہیں۔ پھر آیت میں لا ریب فرما کر نفی شک کا کیا معنی؟

جواب: یہ نفی کتاب سے ہے نہ کہ لوگوں سے۔ یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں شک کا گزر بھی نہیں ہوا، اور نہ اس میں

عیب کی گنجائش ہے۔

ف : اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں خبر بمعنی نہی ہو۔ یعنی لا ریب بمعنی لا ترتابوا۔ جیسا کہ اس آیت فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج میں (نفی بمعنے نہی ہے) بمعنے لا ترفثوا ولا تفسقوا ولا تجادلوا۔ (کذا فی الوسیط والعیون)

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ھدًی بمعنی رشد و بیان، للمتقین یعنی یہ قرآن پاک ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جنہے ہدایت کی طرف میلان ہے اور اس کی طرف رجوع رکھتے ہیں۔

اسی طرح حدیث من قتل قتیلا فلہٗ سلبہٗ کی تقریر ہوگی۔ اور تفسیر الارشاد میں ہے کہ متقین وہ لوگ ہیں جو حالاً و مالاً تقویٰ سے موصوف ہیں۔

سوال : ہدایت میں صرف متقین کو کیوں مخصوص کیا گیا ؟

جواب : وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس سے نور حاصل کرنے والے اور اس کے آثار سے نفع پانے والے ہیں اگرچہ اس کی ہدایت ہر ناظر مومن و کافر کو شامل ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا :

ھدًی للناس۔ یعنی یہ قرآن تمام لوگوں کے لیے ہدایت یعنی بیان ہے۔ اور راہ دکھانے کی بنا پر (خصوصی طور) متقین کے لیے ہدایت ہے۔

تیسیر میں فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی شے سے نفع حاصل کرنے والا ہو تو اسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ صرف تیرے لیے ہے یعنی تو اس سے نفع حاصل کرنے والا ہے نہ کوئی اور۔ پس وہ لوگ جو اس کتاب سے ہدایت یاب نہ ہو سکے تو کتاب اللہ کے ہادی ہونے کے منافی نہیں، جیسے سورج سورج ہی ہے اگرچہ نابینا اس کی روشنی سے بے بہرہ ہے اور شہد شہد ہی ہے اگرچہ صفراوی مزاج اس کے ذائقہ سے محروم ہے اور مشک مشک ہی ہے اگرچہ مزکوم کی ناک اس کی خوشبو سے بے نصیب ہے، بہت بڑی خرابی ہے اس بدبخت کے لیے کہ اس کے سامنے بحرِ ذخار بھی موجود ہے مگر وہ ابھی پیاسا ہے اور ماہِ بدر اپنی پوری روشنی میں چمک رہا ہے مگر وہ ابھی اندھیرے میں ہے اور پاک کرنے والا بھی حاضر ہے مگر وہ تا ہنوز خباثت سے پاک نہیں ہو سکا۔ باغات پر رونق بھی سامنے ہیں۔ مگر وہ ابھی سوکھا ہے بلکہ بڑی حسرت تو اس بدنصیب کے لیے ہے جو فسق و فجور سے پاک نہیں ہو سکا حالانکہ قرآن جیسا آمر و ناہی اور رغبت و رہبت کے فرق بتانے والا (کہ جس کے وعدے متواتر اور اس کی وعیدیں متظاہر ہیں) اس کے گھر کا مہمان ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وانہٗ لحسرۃٌ علی الکافرین۔

المتقی، افتعال کے باب کا اسم فاعل وقایۃٌ سے مشتق ہے (وقایۃٌ بمعنے بہت زیادہ بچاؤ)۔

مفسر بغوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اتقاءٌ سے ماخوذ ہے اور اتقاءٌ دراصل حاجز بین الشیئین کا نام ہے

اسی محاورے کو لے کر اہل عرب بولتے ہیں:

اتقی بترسہ - یعنی فلاں شخص نے اپنی ڈھال کو اپنے (اور جس کا وہ ارادہ کر رہا ہے) کے مابین حاجز بنادیا۔

حدیث شریف میں ہے:

کنا اذا احمر الناس اتقنا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یعنی جب جنگ اپنی شوخی میں آجاتی تو ہم خدا کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دشمنوں کے مابین حاجز ہوجاتے۔

پس گویا متقی اللہ کی فرمانبرداری اور اس کے نواہی سے اجتناب کو اپنے اور عذابِ الٰہی کے مابین حاجز بناتا ہے۔

ف: عرفِ شرع میں تقوٰی ہر اس چیز سے پوری طرح بچاؤ کرنے کو کہتے ہیں جو آخرت میں نقصان پہنچائے۔ اس کے تین درجے ہیں:

(۱) کفر سے بری ہو کر ہمیشہ والے عذاب سے بچنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

والزمهم كلمة التقوى - اور ان پر تقوٰی کا کلمہ لازم کردیا۔

(۲) جو علم یا ترکِ عمل گناہ میں ڈالے اگرچہ صغائر ہوں (عند البعض) سے کنارہ کشی کرنا۔ یہی تعریف شرع میں متعارف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اسی معنی کی مراد لی گئی ہے:

ولو ان اهل القرىٰ اٰمنوا واتّقوا - اگر بستی والے ایمان لائیں اور خدا سے ڈریں

(۳) اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ کے راز سے باز رکھے اور اس سے باطل کو جدا کر دے۔ درحقیقت یہ وہی تقوٰی ہے جس کا حکم قرآن پاک کی اس آیت میں دیا گیا ہے:

یاایها الذین اٰمنوا اتقوا اللہ حق تقاته - اے ایمان والو اللہ سے خوب ڈرو

ف: تقوٰی کے انتہائی مراتب وہ ہیں جہاں انبیاء علیہم السلام پہنچے جنہوں نے ریاستِ نبوت و ولایت دونوں کو حاصل فرمایا اور ان کو عالمِ اشباح کی کسی چیز نے عالمِ ارواح کی پرواز سے نہ روکا اور نہ مصالحِ خلق کے خلط و ملط نے (انہیں) شئونِ حق کے استغراق سے رکاوٹ کی کیونکہ ان حضرات کے نفوسِ زکیہ (جو قوتِ قدسیہ سے تائید دئے گئے ہیں) کمال استعداد رکھتے ہیں۔

مسئلہ: کتابِ مبین کی ہدایت ان تمام مذکورہ صاحبانِ مراتب کو شامل ہے (مثلاً) عوام کو ہدایت اسلام اور خواص کو ہدایتِ ایقان و احسان اور خاص الخاص کو ہدایت کشف حجاب و مشاہدہ اعیان نصیب ہوتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ متقین وہ لوگ ہیں جنہوں نے میثاق کے بعد اللہ تعالیٰ کے عہد کی وفا کی۔ اس تقریر کی تائید قرآن کی اس آیت اوفوا بعهدی اوف بعهدكم واياى فاتقون

یعنی اے میرے بندے! جب تم نے روزِ میثاق میں اپنے قول بلٰی سے میری ربوبیت کا اقرار کیا تھا تو اب تمہیں چاہیئے کہ جس کا عہد کر چکے ہو اسے ایفاد کرو اور وہ وعدہ یہ تھا کہ تم خالص میرے عبد ہو جاؤ۔ پھر میں بھی جو تمہارے ساتھ وعدہ کر چکا ہوں اُسے پُورا کروں گا۔ اور وہ وعدہ یہ تھا کہ میں تمہیں اپنی طرف پہنچاؤں اور سیدھی راہ پر چلاؤں گا۔

حکایات

(۱) رسالہ قشیریہ میں ہے کہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جیسا متقی ہونا چاہئے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے پاس گھی کے چالیس بڑے گھڑے تھے ان میں سے ان کے غلام نے چُوہا نکالا۔ انہوں نے پُوچھا کس گھڑے سے نکالا؟ غلام نے کہا، یاد نہیں رہا۔ آپ نے یہ سُنتے ہی ان تمام گھڑوں کو پانی کی طرح زمین پر بہا دیا۔

(۲) حضرت بایزید بسطامیؒ کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے ہمدان سے کُسم کے بیج خریدے۔ جب آپ واپس بسطام پہنچے تو آپ نے اس میں دو چیونٹیوں کو پریشان پھرتے دیکھا تو ان چیونٹیوں کو بسطام سے اٹھا کر ہمدان میں اس جگہ چھوڑ آئے جہاں سے کسم کا بیج خریدا تھا۔

(۳) حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے مقروض کے درخت کے سایہ کے نیچے نہ بیٹھتے تھے۔ آپ سے وجہ پُوچھی جاتی تو آپ فرماتے حدیث شریف میں ہے:

"جس قرض سے نفع اٹھایا جائے وُہ سُود ہے۔"

(۴) حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جنگل میں اپنا کپڑا دھویا تو آپ کے ساتھی نے عرض کی کہ سامنے والے باغ کی دیوار میں میخ گاڑ کر کپڑے کو خشک کر لو۔ آپ نے جواب دیا کہ غیر کی دیوار میں میخ گاڑنا درست نہیں ہے۔ پھر اس نے عرض کی: کسی درخت کی ٹہنی پر لٹکا دیجئے۔ آپ نے فرمایا: کپڑے کے بوجھ سے درخت کی ٹہنیاں ٹوٹ پڑیں گی اور یہ بھی ٹھیک نہیں۔ پھر اس نے عرض کی کہ اس کو زمین پر ڈال دو۔ آپ نے فرمایا: میرے کپڑے کی وجہ سے جانوروں کی گھاس چھُپ جائے گی اور یہ بھی نامناسب ہے۔ بالآخر آپ نے اپنی پیٹھ پر کپڑے کو ڈال لیا جس سے ایک جانب کو خشک کیا اسی طرح پھر جانبِ ثانی کو۔

تفسیر عالمانہ

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ یہ جملہ متقین کی صفت مقیدہ ہے۔ اگر تقوٰی کی تفسیر ترک ما ینبغی سے کی جائے تو اس جملہ کا متقین کے بعد آنا ایسے ہوگا جیسے خالی از زیورات کو زیورات سے آراستہ کیا جائے اور صیقل شدہ لوہے پر تصویر بنائی جائے اور یہ صفت موضحہ بھی ہو سکتی ہے۔ اگر تقوٰی کی تفسیر ایسی عام ہو جو فعل طاعت و ترک معصیت پر مشتمل ہو کیونکہ یہ تفسیر اصل اعمال و اساس حسنات یعنی ایمان، نماز، صدقہ کو شامل ہے اور یہ تینوں چیزیں اصل و اساس ہیں اس لیے کہ یہ تمام اعمالِ نفسانیہ اور عباداتِ بدنیہ و مالیہ کی جڑ ہیں۔ اور تمام گناہوں سے بچنا انہی سے ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

انّ الصّلٰوۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر۔ بیشک نماز فحش اور برائی سے روکتی ہے

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں؛

"نماز دین کا ستون اور زکوٰۃ اسلام کا پُل ہے۔"

ف : ایمان تصدیق بالقلب کو کہتے ہیں اور ایمان بمعنے امن دینا۔ چونکہ تصدیق کنندہ مصدق (جس کی تصدیق کی جائے) کو امن دیتا ہے۔ یعنی اپنی تکذیب سے اسے امن والا بنا دیتا ہے یا اس لیے کہ تصدیق کنندہ اسی فعل سے اپنے آپ کو عذابِ الٰہی سے بچا لیتا ہے (اسی لیے ایمان کو ایمان کہتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کو مومن اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے فضل سے اپنے بندوں کو عذاب سے امان دینے والا ہے۔

ف : کراشی میں فرماتے ہیں کہ شریعت میں ایمان تصدیق بالجنان و اقرارٌ باللسان وعمل بالارکان کو کہتے ہیں۔ اور اسلام خضوع و انقیاد کا نام ہے۔ پس ہر اسلام ایمان نہیں۔ جبکہ کسی شخص میں تصدیق نہ ہو۔ مثلاً شخص ظاہر میں تو مسلمان ہے مگر باطن میں غیر مصدق۔

مسئلہ: ف ابوسعود رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ایمان شریعت میں نہیں متحقق ہو سکتا جب تک کہ ضروریاتِ دین (جن کے متعلق معلوم ہو چکا کہ یہ ہمارے سچے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی ضروریات سے ہیں) جیسے توحید و رسالت اور قیامت کے بعد اٹھنا اور اس کی جزا وغیرہ کی تصدیق نہ کی جائے۔

ف : پھر اس میں اختلاف ہے کہ کیا اتنا کافی ہے یا اس میں اقرار کا ہونا بھی ضروری ہے۔ پہلا مسلک شیخ ابوالحسن اشعری اور ان کے تابعین کا ہے اور دوسرا مذہب (سیدنا) امام ابوحنیفہ اور ان کے متبعین رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے، اور یہی حق ہے۔ کیونکہ امام صاحب نے ان دونوں کو ایمان کے دو اجزا قرار دیا۔ صرف فرق اتنا ہے کہ اقرار ایسا رکن ہے کہ عذر کے وقت ساقط ہو جانے کا احتمال رکھتا ہے جیسا کہ اکراہ کے وقت ساقط ہو جاتا ہے۔

ف : جمہور محدثین اور معتزلہ وخوارج کا خیال ہے کہ ایمان تین چیزوں کا نام ہے؛

۱۔ تصدیق بالجنان (دل سے)

۲۔ اقرارٌ باللسان (زبان سے)

۳۔ عمل بالارکان (اعضاء سے)

پس جس کے اعتقاد میں خلل ہے وہ منافق ہے اور جس کے اقرار میں نقص ہے وہ کافر ہے اور جس کے عمل میں کمی ہے وہ ہمارے نزدیک بالاتفاق فاسق ہے مگر خوارج کے نزدیک کافر ہے اور معتزلہ کے نزدیک خارج از ایمان ہے مگر درجۂ کفر تک ہنوز نہیں پہنچا۔

بِالْغَیْبِ غیب مصدر ہے مگر توسعاً بمعنے غائب ہے۔ جیسے اہلِ عرب زائر کو زَوْرٌ کہتے ہیں۔ اور عرف میں غیب وُہ ہے جو حس اور عقل سے ایسا پوشیدہ ہو کہ ان دونوں کے ادراک میں ابتداءً بطریق البداہتہ نہ آسکے۔ یہ دو قسم ہے:

پہلا وہ کہ جس پر کوئی دلیل نہ ہو۔ وعندہ مفاتیح الغیب میں یہی غیب مراد ہے۔

دوسرا وہ کہ جس پر دلیل قائم کی جا سکے۔ جیسے صانع اور اس کے صفات اور نبوات اور اس کے متعلقات جیسے احکام و شرائع اور یومِ آخرت جیسے بعث و نشور حساب و جزاءُ اور آیت میں بھی یہی غیب مراد ہے۔

قانون: لفظ بأ (بالغیب میں) لفظ ایمان کا صلہ ہے یا ایمان میں اعتراف کا معنیٰ متضمن ہے یا ایمان بمعنے وثوق ہے۔ اور (ترکیبی اعتبار سے) بالغیب مفعول کے قائم مقام ہے۔ اگر غائب کو اپنے حال پر چھوڑ کر بمعنے غیبۃ (مصدر) کیا جائے تو باءؔ کا متعلق محذوف ہو کر فاعل سے حال واقع ہوگا۔ گویا اصل عبارت یُوں ہے:

یؤمنون بالغیب متلبسین بالغیبۃ۔ ایمان لاتے ہیں غیب کے ساتھ الحالیکہ وہ غیب سے متلبس ہیں یا یُوں ہے:

یؤمنون غائبین عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر مشاھدین لما فیہ من شواھد النبوۃ۔ اسی معنے پر روایت ذیل دلالت کرتی ہے۔

روایت مع حکایت حضرت حارث بن نفیر (تابعی) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (صحابی) سے عرض کی: اے اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم آپ کو اس لیے افضل سمجھتے ہیں کہ تم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت و صحبت سے باریاب ہو چکے ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم بھی تمہیں اعلیٰ قدر تصور کرتے ہیں کہ تم نے بغیر زیارت ایمان قبول کیا۔ کیونکہ افضل ایمان وہ ہے جو بغیر دیکھے ہو۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے (استشہاداً) یہ آیت یؤمنون بالغیب تلاوت فرمائی۔ (کذا فی تفسیر ابی اللیث)

یا یہ عبارت یُوں ہے:

یؤمنون بالغیب ای غائبین عن المؤمنین۔ یؤمنون بالغیب کا معنیٰ ہے اہلِ ایمان سے وہ غائب ہیں نہ منافقین کی طرح کہ وُہ جب مومنین کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم مومن ہیں، اور جب اپنے رؤسا کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ہیں۔

ف: بعض کہتے ہیں کہ غیب سے مراد قلب ہے۔ کیونکہ قلب پوشیدہ یعنی غائب ہے۔ اب معنے یہ ہوئے کہ لوگ دل سے ایمان لاتے ہیں نہ یہ کہ زبان سے تو دعویٔ ایمان مگر قلوب اس کے خلاف۔ پس اس معنے پر بالغیب میں باءؔ ظرف آلہ کیلئے ہوگی

لہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غائب ہو کر ایمان لاتے ہیں، یعنی آپ کے شواہد نبوت کا مشاہدہ نہیں کرتے

حدیثِ جبریل

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلِ پاک میں ہم بیٹھے تھے کہ ایک مرد تشریف لایا جو سفید پوشاک پہنے ہُوئے تھا اور نہایت سیاہ بالوں والا تھا۔ اگرچہ دور کا معلوم ہوتا تھا مگر اس پر سفر کے آثار ناپید تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کا واقف نہیں تھا۔ تشریف لاتے ہی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت قریب بیٹھ گیا یہاں تک کہ اس کے گھٹنے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں کو مس کر رہے تھے۔ عرض کی:

حضور! اسلام کیا شے ہے؟

آپ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کو واحد لاشریک اور مجھے اس کا رسول برحق ماننا اور نماز قایم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور روزۂ رمضان رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اگر وسعت ہو تو۔

جواب سُن کر کہا، صدقت[1] یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہمیں اس کے سوال اور پھر اس کی تصدیق پر بڑا تعجب ہُوا۔ پھر عرض کی:

"حضور! ایمان کسے کہتے ہیں؟"

آپ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر اور موت کے بعد اُٹھنے اور جنت و نار پر اور اس کی بُری اور بھلی تقدیر پر ایمان لانا۔

جواب سُن کر کہا، صدقت۔ (آپ نے سچ فرمایا)

پھر عرض کی، حضور! احسان کے متعلق بھی تشریح فرما دیجئے۔

آپ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو کم از کم اتنا ضرور خیال ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

عرض کی، صدقت۔

پھر عرض کی، حضور! قیامت کب آئے گی؟

آپ نے فرمایا کہ جس سے سوال ہو رہا ہے وہ سائل سے (اس معاملہ میں) زیادہ عالم نہیں۔

پھر عرض کی: حضور! اس کے علامات تو بیان فرما دیجئے۔

آپ نے فرمایا: قربِ قیامت میں لونڈی اپنے سردار کو جنے گی اور ننگے جسم اور ننگے پاؤں والے اور چروا ہے

---

[1] یارسول اللہ آپ نے سچ فرمایا

تنگدست اپنی اپنی بلڈنگوں پر نازاں ہوں گے۔ عرض کی، صدقت۔ بعدازاں وُہ صاحب تشریف لے گئے۔

تھوڑی دیر بعد مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! جانتے ہو یہ کون شخص تھا؟

میں نے عرض کی: اللہ ورسولہٗ اعلم۔

آپ نے فرمایا: یہ جبرئیل علیہ السلام تھے تمہارے ہاں تشریف لاکر تم کو دین کی باتیں سکھاتے ہیں اور میرے ہاں جس صورت میں تشریف لاتے ہیں میں انہیں پہچان لیتا ہُوں اور اب بھی میں نے پہچان لیا تھا۔

ف: غیبؐ دوقسم ہے: ایک وہ جو تجھ سے غائب ہے۔ دوسرا وہ جس سے تُو غائب ہے۔ پس وہ غائب جو تجھ سے غائب ہے وہ عالمِ ارواح ہے کہ تو اس کے ہاں حاضر تھا جبکہ تو اس عالم میں روح کے ساتھ تھا اور الست بربکم میں ایک ذرّہ کی طرح تیرا وجود تھا اور اس وقت حق کے خطاب سن رہا تھا اور آثارِ ربوبیت کا مطالعہ فرمارہا تھا اور فرشتگان کا مشہود بھی ہوتا تھا اور ارواحِ انبیاء و اولیاء وغیرہم سے بھی تعارف ہوتے رہے۔ جب تو عالمِ جسمانیت سے متعلق ہوا اور جب تو حواس خمسہ کے ساتھ یعنی محسوسات جو کہ عالمِ اجسام سے ہے کو دیکھنے لگا تو پھر وہ غیب تجھ سے غائب ہوگیا۔ اور دوسرا غیب کہ جس سے تو غائب ہے وہ غیب الغیب ہے یعنی بارگاہِ لم یزل کا حضور کہ تُو اپنے وجود کے اعتبار سے اس سے غائب ہے مگر وُہ اپنے وجود کے اعتبار سے تجھ سے غائب نہیں وہ تیرے ساتھ ہے جہاں بھی تو ہے تو اس سے بعید ہے مگر وہ تیرے ہر وقت قریب ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ؎

ؐ جو شے ہمیں نظر نہ آئے وہ ہمارے لیے غیب ہے۔ مثلاً فرشتے، یہ ہمیں نظر نہیں آتے یہ ہمارے لیے غیب ہیں۔ ایک ذات پاک ایسی بھی ہے جو ان فرشتوں کے لیے بھی غیب ہے اور وہ ذات پاک خداوند کریم جل شانہٗ کی ہے۔ گویا خدا تعالیٰ غیب در غیب ہے۔

اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے شبِ معراج اس 'غیب در غیب' کو بھی دیکھ لیا۔ پھر غور فرمائیے کہ جس مبارک آنکھ نے 'غیب در غیب' کو بھی دیکھ لیا ہو اس پیاری آنکھ سے اور کون سی چیز غائب رہ سکتی ہے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

اور کیا غیب تم سے نہاں ہو بھلا
جب نہ خدا ہی چھپا تم پہ کروڑوں درود

(اویسی غفرلہٗ)

دوست نزدیک تر از من بمنست

دین عجب تر من از وے دورم

چہ کنم با کہ تواں گفت کہ او

در کنار من و من مہجورم

ترجمہ : میرا دوست میری ذات سے بھی زیادہ قریب ہے اور یہ بات اس سے بھی زیادہ عجیب ہے کہ میں اس سے دُور ہوں ۔ میں کیا کروں کس سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ میری بغل میں ہے اور میں اس سے جدا ہوں ۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ ۔ الصلٰوۃ بمعنے الدّعا ہے ۔ جیسے آیت وصلّ علیھم میں صلٰوۃ بمعنے دعا ہے ۔ اور بمعنے ثنا بھی آیا ہے کہ انّ اللہ و ملٰئکتہٗ یصلّون میں صلٰوۃ بمعنی ثنا ہے ۔ اور بمعنی قرأۃ بھی ۔ جیسا کہ ولا تجھر بصلٰوتک میں صلٰوۃ بمعنی قرأۃ ہے ۔ اور بمعنے رحمت بھی ۔ جیسا کہ اولٰئک علیھم صلواتٌ من ربھم میں صلٰوۃ بمعنے رحمت ہے اور بمعنے مخصوصہ افعال واذکار جنہیں شرع پاک نے مقرر فرمایا ہے ۔ اور شرع میں بھی صلٰوۃ کو صلٰوۃ اسی لیے کہتے ہیں (کہ اس میں معانی مذکورہ پائے جاتے ہیں) مثلاً اس کے قیام میں قرأت ہے اور تعوذ میں ثنا و دعا ہے اور اس کے عامل کو رحمت نصیب ہوتی ہے ۔ اور آیت ہٰذا میں لفظ صلٰوۃ اسم جنس ہے جس سے پانچوں نمازوں کا ارادہ کیا گیا ہے ۔

اور اقامت بمعنے مواظبت ہے ۔ قَامَتِ السُّوق سے ماخوذ ہے ۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جبکہ بازار کی رونق گرم ہو جائے ۔ یا یہ معنیٰ کہ اس کی ادائیگی میں ایسی جدوجہد کرتے ہیں کہ اس میں فتور و سُستی کو راہ تک بھی نہیں ملتی ۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے :

قَامَ الْاَمْرُ وَاَقَامَہٗ ۔

یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کسی امر کو جدوجہد کے ساتھ کیا جائے ۔ اس کی نقیض قعد عن الامر و تقاعد ہے ۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی امر میں سُستی برتی جائے ۔ یا اقامت بمعنے ادائیگی ہے ۔ جیسا کہ مؤذن کہتا ہے :

قد قامت الصّلٰوۃ ۔

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ نماز میں شروع ہو گئے اور ادائیگی کو اقامت سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس میں قیام ہے جیسا کہ اسے قنوت اور رکوع و سجود سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس میں یہ اشیاء پائی جاتی ہیں یا اقامت بمعنے تعدیل ارکان و حفاظت ہے ۔ یعنی اس کی ایسے حفاظت کرتے ہیں کہ اس کے فرائض و سنن میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا ۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس میں یہ اشیا پائی جاتی ہیں ۔ یا اقامت بمعنے تعدیلِ ارکان و حفاظت کے ہے

یعنی اس کی ایسی حفاظت کرتے ہیں کہ اس کے فرائض، وسنن میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا۔ اس کی شہادت اہلِ عرب کے قول "اقام العود" سے ہوتی ہے کہ وہ اس قول کو اس وقت بولتے ہیں جب کہ لکڑی کو سیدھا اور پورے موقعہ پر کھڑا کیا جائے۔ یہی معنے زیادہ ظاہر ہیں کیونکہ زیادہ مشہور اور اقرب الی الحقیقت ہے اور مندرجہ تنبیہہ پر متضمن ہونے کی وجہ سے زیادہ مفید ہے اور مدح کے لائق بھی وہی شخص ہے جو نماز کے حدودِ ظاہرہ از قسم فرائض وسنن اور حقوقِ باطنہ جیسے خشوع اور دل سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کی طرف کی رعایت کرتا ہے، نہ وہ نمازی جو اپنی نمازوں میں غفلت کرتے ہیں۔

ف : حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب کسی کو دیکھو کہ نماز پڑھتے وقت رکوع و سجود میں عجلت کر رہا ہے تو اس کے عیال پر رحم کرو۔ (یعنی ایسا کرنے سے معاشں میں تنگی ہوتی ہے)

حکایت حاتم زاہد عاصم بن یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عاصم نے کہا: اے حاتم! تُو نے نماز کو کبھی اچھا کر کے ادا کیا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ عاصم نے کہا: وہ کیسے؟ حاتم نے کہا: جب نماز کا وقت قریب ہوتا ہے تو کامل وضو کر کے نماز پڑھنے کے مقام پر پہنچ کر اطمینان سے نماز پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ پس نماز کی ادائیگی میں یہ خیال کرتا ہوں کہ گویا کعبہ میرے سامنے ہے اور مقام ابراہیم سینہ کے بالمقابل ہے اور میرا مالک میرے دل کو ملاحظہ فرما رہا ہے اور میرا قدم پُل صراط پر ہے اور جنت میرے دائیں اور دوزخ میرے بائیں، اور ملک الموت میرے پیچھے ہے اور یہی تصور ہوتا ہے کہ یہ میری آخری نماز ہے۔ پھر تکبیر کہتا ہوں احسان کی اور قرأت پڑھتا ہوں تفکر کی اور رکوع کرتا ہوں تواضع کا اور سجدہ کرتا ہوں خشوع کا پھر قعدہ کرتا ہوں اتمام کا اور تشہد پڑھتا ہوں رجاء کی۔ پھر ایک سلام پھیرتا ہوں سنت پر اور دوسرا اخلاص پر۔ پھر قیام کرتا ہوں خوف و رجاء کے مابین، پھر صبر پر پابند ہوں۔ عاصم نے کہا: اے حاتم! تم ایسے نماز ادا کرتے ہو؟ حاتم نے کہا: ایسے نماز ادا کرتا ہوں، نہ صرف ایک بار بلکہ تیس سال کامل ہو گئے۔ عاصم رو پڑے۔ اور کہنے لگے: ہائے افسوس! میں ایسی نماز کبھی ادا نہ کر سکا۔ (کذا فی تنبیہ الغافلین)

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

کہ داند چو در بند حق نیستی
اگر بے وضو در نماز ایستی[1]

فضائل و مسائل نماز اللہ تعالیٰ نے نماز میں چند چیزوں کا حکم فرمایا ہے:

(۱) اقامت کا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: واقیموا الصلوٰۃ۔ نماز قائم کرو

(۲) محافظت و مداومت کا۔ کما قال: الذین ھم علیٰ صلاتھم دائمون۔ اور ہم

(۳) پورے وقت میں ادا کرنے کا۔ کما قال: وکانت علی المؤمنین کتاباً موقوتا۔ اور نماز اہل ایمان پر فرض ہے

(۴) جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا۔ کما قال: واركعوا مع الراکعین۔ رکوع والوں کے ساتھ رکوع کرو

---

[1] حب تو حق کے تصور میں نہیں تو تیری نماز ایسی ہے جیسے تو نے بے وضو ہو کر پڑھی

(۵) خشوع کے ساتھ ادا کرنے کا۔ کما قال: الذین ھم علیٰ صلاتھم خاشعون۔
بربنائے ایں وجوہ لوگ بھی چند قسم ہوئے:
(۱) سرے سے نماز کے منکرین۔ ان سب کا سردار ابوجہل ہے۔ اس کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
فلا صدّق ولا صلّی۔
ان کا انجام بھی بیان فرمایا:
وما سلککم فی سقر قالوا لم نک من المصلین "تا" وکنا نکذب بیوم الدین۔
(۲) اس کی حقانیت کے قائل تو ہیں مگر ادا نہیں کرتے، یہ اہلِ کتاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
فخلف من بعدھم خلفٌ۔ خلف سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔
پھر فرمایا:
اضاعوا الصلوٰۃ۔
پھر ان کے انجام کے متعلق فرمایا:
فسوف یلقون غیّا۔ عنقریب دوزخ میں داخل ہو گئے۔
ف: لفظ غیّ کے متعلق کہا گیا ہے کہ دوزخ کا ایک ایسا طبقہ ہے جو تمام طبقات سے زیادہ سخت ہے۔ جس سے لوگ دن میں کئی بار فریادی ہوتے ہیں۔ بعد ازاں فرمایا:
الّا من تاب۔ یعنی یہودیت و نصرانیت سے توبہ کرلے۔
اور فرمایا: و اٰمن یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے و عمل صالحاً یعنی نماز کا پابند ہو جائے تو پھر اس طبقہ سے بچ جائے گا ورنہ نہیں۔
(۳) بعض وُہ ہیں کہ بعض نمازیں ادا کرتے ہیں اور بعض قاصر اور کاہل ترین ہوتے ہیں۔ یہ لوگ منافق ہیں۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
ان المنافقین یخادعون اللہ وھو خادعھم واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ۔ اور ان کا انجام ویل ہے اور ویل جہنم میں ہے کہ اگر اس میں تمام دنیا کے پہاڑ ڈالے جائیں تو وہ اس کی گرمی سے پگھل جائیں گے۔
حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس نے نماز کو چھوڑے رکھا، یہاں تک کہ اس کا وقت چلا گیا تو اس کو جہنم میں ایک حقب تک رکھا جائے گا اور حقب اسّی سال کا ہے اور سال تین سو ساٹھ دن کا۔ اور اس کا ہر ایک دن تمہاری گنتی کے ہزار سال جیسا ہے۔

مسئلہ: نماز کو وقت سے بے وقت کر کے پڑھنا گناہِ کبیرہ ہے اور کبیرہ گناہوں سے سب سے چھوٹے کے متعلق کہا گیا ہے کہ گویا اس نے اپنی ماں کے ساتھ ستر بار زنا کیا۔ (کذا فی روضۃ العلماء)

(۴) وہ حضرات ہیں جو اس کی فرضیت کے قائل ہیں اور پورے وقت میں شرائط کے مطابق ادا کرتے ہیں۔ ان سب کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ان ربّك يعلم انّك تقوم ادنٰى من ثلثي الّيل - بیشک تیرا رب جانتا ہے کہ تم رات کی دو تہائی حصّہ قیام کرتے رہوگے

اور فرماتا ہے:

قل انّ صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله ربّ العٰلمين - فرمایئے میری نماز و عبادات اور مرنا جینا رب العٰلمین کیلئے ہے

اور حضور علیہ السلام کی شان تھی بھی ایسی ہی۔ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتا ہے:

قد افلح المؤمنون الّذين هم في صلٰوتهم خٰشعون - وہ اہل ایمان کامیاب ہوئے جو نمازوں میں خشوع کرتے ہیں

ان کے انجام کے متعلق بھی یہ مژدہ سنایا:

اولٰئك هم الوارثون الّذين يرثون الفردوس - وہی جنت الفردوس کے وارث ہیں

ف: بہشت کا ایک بلند مقام اور پُر رونق مقام ہے۔ مومن وہاں پہنچ کر اپنی من بھاتی آرزو پائے گا اور اپنے مالک کے دیدار سے بھی سرشار ہوگا۔

لطیفہ: حکما فرماتے ہیں، ستارہ ہو جا، اگر تجھے طاقت نہیں تو چاند ہو جا، ورنہ سورج ہو جا۔

تشریح یعنی ساری رات عبادت میں مصروف رہ جیسا کہ ستارہ تمام رات چمکتا ہے۔ یا چاند کی طرح ہو جیسا کہ وہ رات کے بعض حصّہ میں روشن رہتا ہے تو بھی رات کے بعض حصہ میں عبادت گزار ہو۔ ورنہ سورج کی طرح ہو۔ یعنی رات کو اگر تجھے عبادت کا موقع میسر نہیں ہوتا تو دن کی عبادت کو غنیمت سمجھ (کذا فی زہرۃ الریاض)

نماز باجماعت کے مسائل

(۱) نماز باجماعت ادا کرنا فرض کفایہ ہے مگر عام علماء کے نزدیک فرض نہیں۔ یہاں تک کہ تنہا نماز پڑھنے سے ان کے نزدیک نماز ہو جاتی ہے مگر جماعت کی فضیلت سے محرومی ہے۔

(۲) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ نماز باجماعت ادا کرنا سنت نہیں بلکہ فرض ہے۔ اگر کسی نے جماعت کے بغیر نماز پڑھی تو اس کی نماز نہ ہوئی۔

(۳) لیکن ہمارے (احناف) کے نزدیک اگرچہ نماز باجماعت فرض نہیں مگر مسلمان پر ضروری ہے کہ اس کی حفاظت و مداومت ضرور کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يا قومنا اجيبوا داعي الله - اے میری قوم اللہ کے داعی کا کہا مانو!

داعی اللہ سے مراد بعض کے نزدیک وہ موذنین ہیں جو پانچوں اوقات نماز کے لیے بلاتے ہیں۔

مسئلہ: شرابی، قاتلِ ناحق، چغل خور، والدین کے بے فرمان، کاہن، ساحر، گلہ گو، ان سب سے تارکِ جماعت بُرا ہے۔ توراۃ، انجیل، زبور، قرآن میں اسے ملعون کہا گیا ہے اور ملائکہ بھی اُسے ملعون کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ جب بیمار ہو تو اس کی طبع پُرسی نہ کرو اور جب مرجائے تو اس کے جنازہ پر بھی نہ جاؤ۔

نماز با جماعت کے فضائل

حدیث شریف[۱]: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تارکِ جماعت مجھ سے نہیں اور نہ میں اس سے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نہ اس کی فرضی عبادت قبول کرے گا نہ نفلی۔ اگر اسی حالت میں اس پر موت آگئی تو وہ جہنم کا مستحق ہوگا۔ (کذا فی روضۃ العلماء)

حدیث شریف[۲]: نصاب الاحتساب میں ہے، حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مجھے خیال آتا ہے کہ کسی کو نماز پڑھانے کا حکم دے کر اس قوم کا معاینہ کروں جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتی۔ پس اُن کی اس حالت (ترکِ جماعت) کو دیکھ کر اُن کے گھروں کو جلا دُوں۔

مسئلہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو سنّتِ مؤکدہ کا تارک ہو اس کے گھر کو جلانا جائز ہے۔

تنبیہ: تارکِ سنّت کے لیے اتنا سخت حکم ہے اب تم خود سوچ لو کہ فرض و واجب کے ترک پر کتنی سزا ہوگی[۱]۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ معصیت کے آلات کو جلانا جائز بلکہ ضروری ہے۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کلمۂ شہادت کے لیے مبعوث فرمایا۔ جب اس کی تصدیق ہوگئی تو نماز کا حکم دیا۔ اس کی تصدیق کے بعد زکوٰۃ کا حکم دیا۔ اس کے بعد روزۂ رمضان کا حکم صادر فرمایا۔ پھر حج کا ارشاد نازل فرمایا۔ بعد ازاں جہاد کا۔ اس پر دینِ متین کی تکمیل ہوگئی۔

ف: حضرت مقاتل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام مکہ معظمہ میں دو رکعت صبح کو اور دو رکعت شام کو پڑھتے تھے۔ پھر جب آپ کو معراج ہوئی تو آپ کو پانچوں نمازوں کا حکم ہوا۔ (کذا فی روضۃ الاخیار)

سوال: نماز شبِ معراج میں کیوں فرض ہوئی؟

جواب: چونکہ شبِ معراج افضل الاوقات اور اشرف الحالات اور اعز المناجات ہے اور نماز بھی بعد از ایمان افضل الطاعات اور ادائیگی کے لحاظ سے احسن الہیات ہے پس افضل عبادت کو اس افضل وقت (کہ جس میں بندہ کو اپنے

---

[۱] نیز منقول ہے کہ بے نماز کو قرض بھی نہ دینا چاہیے اس لیے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کا عائد کردہ "قرض" ادا نہیں کرتا تو وہ تمہارا قرض کب ادا کرے گا۔ (اویسی)

رب کا وصال اور اس کا قرب حاصل ہوا) میں فرض کیا گیا۔

نکات (۱) نماز کی فرضیت میں ایک حکمت یہ ہے کہ جب حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں پر تشریف لے جا کر ملکوت سمٰوات کے ذرہ ذرہ کی سیر فرمائی اور اس کے مکینوں یعنی ملائکہ کی عبادات کا بھی معائنہ فرمایا تو ان کی کثرتِ عبادت پر آپ کو رشک ہوا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے اُمت کے لیے ملائکہ کی عبادت کا عرض کیا اللہ تعالیٰ نے بمطابق معروض تمام ملائکہ کی عبادت کا مجموعہ صلوٰۃِ خمسہ میں جمع فرمادیا۔ بایں طور کہ وہ فرشتے بعض قیام میں تھے اور بعض رکوع میں اور بعض سجدہ میں اور بعض تسبیح کہہ رہے تھے وغیرہ وغیرہ۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان تمام ملائکہ کی عبادات کے اجر و ثواب صلواتِ خمسہ کی ادائیگی پر عطا فرما دیئے۔

(۲) نماز دو یا تین چار رکعت اس لیے فرض ہوئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج بعض ملائکہ کو دیکھا بعض دو پروں والے تھے بعض تین والے بعض چار والے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہیئات کو انوارِ صلوات میں متشکل فرمایا۔ بایں طور کہ جب اعمال کے ملائکہ ارواح عبادات کو آسمان کی طرف لے جاتے ہیں تو یہ عبادات نورانی شکلوں میں متمثل ہوتی ہیں چنانچہ اس کے متعلق احادیث میں وارد ہوا ہے :

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے پروں کو تین مراتب میں منقسم فرمایا اور نمازی کو بھی انہی تین قسموں کے پر عطا ہوئے کہ وہ ان سے ملائکہ کے موافق ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کرے تاکہ ملائکہ اس کے لیے استغفار کریں۔

(۳) نماز کو پانچ اوقات میں اس لیے فرض کیا گیا کہ جب حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم شبِ معراج اللہ تعالیٰ سے امت کے لیے تخفیف کی عرض کی اور واپسی کا عزم فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) انهن خمس صلوٰت كل يوم وليلة بكل صلوٰةٍ عشر حسنات فتلك خمسون صلوٰةً۔

یعنی اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم)! دن اور رات میں پانچ نمازیں ہیں اور ہر نماز دس کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے ان کی پچاس نمازیں ہوئیں۔

ف : ہم سے پہلی امتوں پر پچاس نمازیں فرض تھیں۔ پس شبِ معراج اُمت پر تخفیف فرما کر پانچ مقرر کر دیں۔ مگر اپنے فضل و کرم سے ثواب پچاس کا عنایت فرمائے گا۔

(۴) سابقہ امتوں پر نماز متفرق طور پر فرض تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے لیے تفریق کو جمع سے بدل دیا۔ کیونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین و دنیا کے جمیع فضائل و کمالات کے جامع ہیں۔ اسی طرح آپ کی اُمت سابقہ اُمم کے اعتبار سے۔

ف : (۱) سب سے پہلے فجر کی نماز سیدنا آدم علیہ السلام نے پڑھی اور ظہر کی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اور

اور عصر کی یونس علیہ السلام نے اور مغرب کی عیسیٰ علیہ السلام نے اور عشاء کی موسیٰ علیہ السلام نے۔

تنبیہ : یہی راز ہے نماز کو پانچ اوقات میں ادا کرنے کا۔

(۲) بعض روایات میں ہے کہ ان پانچ نمازوں کو سب سے پہلے ادا کرنے والے سیدنا آدم علیہ السلام ہیں، پھر بعد میں انبیاء علیہم السلام متفرق طور پر ادا فرماتے رہے۔

(۳) وتر سب سے پہلے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں ادا فرمائے۔ اسی لیے آپ نے فرمایا: میرے لیے میرے رب نے ایک اور نماز زاید فرمائی ہے۔ یعنی پنجگانہ نماز سے یا رات کی نماز سے۔

(۴) سب سے پہلے (آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے حکم میں) سبقت کرنے والے جبریل علیہ السلام ہیں جس کی وجہ سے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کے خادم و رفیق مقرر ہوئے۔

(۵) سب سے پہلے سبحان اللہ کہنے والے حضرت جبریل اور الحمدللہ کہنے والے حضرت آدم اور لا الٰہ الا اللہ کہنے والے حضرت ابراہیم اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کہنے والے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ تمام مذکورہ بالا تقاریر کشف الکنوز و حل الرموز کی ہیں۔

ف : (۶) حکم شاذلیہ اور اس کی شرح میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ انسان سے کئی مذاہب ظاہر ہوں گے تو پھر (بہ بنائے مصلحت) اس کی طاعات کے انواع بھی کئی مقرر فرمائے۔ تاکہ جب ایک نوع سے ملال کرے تو دوسرے نوع میں شروع ہو کر راحت حاصل کرے۔ اور یہ بھی علم تھا کہ انسان میں وہ حرص ہے جو اسے مختلف ملتوں کی طرف کھینچ کر اسے مقصودِ اعلیٰ تک پہنچنے سے روکے رکھے گا، تو پھر اس پر چند واقعات کی پابندی لگا دی۔ مثلاً آٹھوں پہروں میں پانچ وقت کی نماز اور سال میں ایک ماہ کا روزہ اور دو سو درہم سے پانچ درہم زکوٰۃ اور عمر بھر میں صرف ایک دفعہ حج بیت اللہ پھر فرض کی تفاصیل کے لیے وہ وقت ہے جو دوسرے فرض کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ سب کچھ انسان کے لیے رحمت اور اس کے عبد بننے کی سہولت کے موجبات ہیں تاکہ اس سے ان کی ادائیگی کا خیال ہٹ نہ جائے۔ اور اوقات میں وسعت کر دی تاکہ بندہ کو اس میں ادائیگی کا خیال باقی ہو۔ حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ فرماتے ہیں : ؎

۱ گر نباشد فعلِ خلق اندر میاں
پس مگو کس را چرا کردی چناں

۲ یک مثال اے دل پئے فرقے بیار
تا بدانی جبر را از اختیار

۳ دست کاں لرزاں بود از ارتعاش
وانکہ دستے را تو لرزانی ز جاش

۴ ہر دو جنبش آفریدہ حق شناس
لیک نتواں کرد ایں باآں قیاس

ترجمہ : (۱) اگر مخلوق کا درمیان میں دخل نہ ہو تو پھر تم آپس میں کیوں کہتے ہو کہ تم نے یہ کیوں کیا۔

(۲) تمہیں صرف ایک مثال دیتا ہوں کہ تم جبر و اختیار کے درمیان فرق کر سکو۔

(۳) دیکھئے ایک ہاتھ کانپتا ہے رعشہ کی بیماری سے، لیکن تم اپنا ہاتھ ہلاتے ہو اپنے اختیار سے۔

(۴) اگرچہ ان دونوں ہاتھوں کی حرکتوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے لیکن ایک مجبوراً کانپ رہا ہے دوسرا اختیار سے ہل رہا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ نماز کی ابتداً اقامت سے ہے۔ پھر اس پر مداومت کا حکم ہے۔ نماز کی اقامت کا یہ مطلب ہے کہ اس کو اپنے اوقات میں ادا کرنے اور اس کے رکوع وسجود کو پورا کرنے اور اس کی حدود پر ظاہراً و باطناً پابندی کرنے پر محافظت کی جائے اور نماز پر مداومت کا مطلب یہ ہے کہ اس نفحاتِ ربوبیت کے لیے جمع ہمت کے ساتھ مداومت کرنا، اور وہ نفحات نماز میں امانت رکھے گئے ہیں جیسا کہ حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نماز کی ظاہری صورت صورتِ تعرض ہے اور اس امر کی صورت جذبۃ الحق ہے جو کہ غیر کی عبودیت کے ارتکاب سے روکتا ہے اور نماز کی باطنی صورت حقیقی تعرض ہے۔ پس نماز کی ہر ظاہری شرط اور رکن اور سنت وہیئت میں ایک راز ہے جو حقیقی تعرض کی طرف دلالت کرتا ہے۔

صوفیہ کا وضو نماز کے شرائط میں سے ایک شرط وضو ہے جس کے ہر مستحب وسنت و فرض میں راز ہے جو ایسی طہارت پر دلالت کرتا ہے جس سے اقامتِ صلوٰۃ کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہاتھ دھونے میں نفس کو گناہوں کے کیچڑ اور قلب کو صفاتِ ذمیمہ حیوانیہ اور سبعیہ شیطانیہ کے کیچڑ سے صاف کرنے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا ہے:

وثیابك فطهّر۔ یعنی اپنے ثیاب کو پاک کرو۔

تفاسیر میں ثیاب بمعنی قلب بھی آیا ہے اور منہ دھونے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اپنے ارادہ کے منہ کو ظلمتِ حبِ دنیا کی گرد و غبار سے پاک رکھا جائے کیونکہ حُبِّ دنیا تمام گناہوں کی جڑ ہے۔

صوفیہ کی نماز نماز کی شرائط سے ایک شرط استقبالِ قبلہ بھی ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قرب و مناجات کے لیے طلبِ حق کے ماسواسے اعراض اور حضرتِ ربوبیت کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔ اور رفع الیدین میں اس طرف اشارہ ہے کہ ارادوں کے ہاتھ دُنیا و آخرت کی طلب سے دور ہوں۔ اور تکبیر میں اللہ تعالیٰ

کی تعظیم مقصود ہو۔ کیونکہ وہ کریم مومن کے دل میں باعتبارِ طلب و محبت و تعظیم کے سب سے بڑا ہے اور تکبیر کے ساتھ نیت کی مقارنت میں اس طرف اشارہ ہے کہ طلب میں نیت ہو۔ پس بندہ کو چاہیئے کہ اس سے سوائے اُس کی ذات کے کسی اور کی طلب نہ کرے۔ کیونکہ جس نے اس کے غیر کو طلب کیا تو گویا اُس نے اسی کو اپنا بڑا اور معظّم مطلوب سمجھا نہ کہ اللہ تعالیٰ کو۔ بنا بریں اس کی حقیقۃً نماز جائز نہ ہوگی۔ جیسا کہ بظاہر اس کی نماز سوائے تکبیر تحریمہ کے جائز نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی شخص (بجائے اللہ اکبر کے الدنیا اکبر یا العقبی اکبر کہے تو اُس کی نماز جائز نہیں جب تک کہ اللہ اکبر نہ کہے۔ اسی طرح حقیقۃً بھی (نماز صحیح نہ ہوگی) جب تک کہ نماز میں اُس کی ذات کو مقصود نہ سمجھے اور سیدھے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر اور سینے پر رکھنے میں اشارہ ہے کہ بندے اپنے مالک کے سامنے یونہی پیش ہوتے ہیں۔ اور (سینہ پر ہاتھ رکھنے سے) قلب کو ماسوا اللہ کی محبت سے محفوظ کرنا ہے۔ اور انی وجہت وجہی للذی سے شروع کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ حق کی طرف توجہ اور غیر سے اعراض ہونا چاہیئے اور اس میں فاتحہ کے وجوب اور قرأۃ کی فرضیت اور ان کے سوا نماز کے عدمِ جواز میں بندے کی حقیقت تعرض (جو کہ نفحات الطافِ ربوبیت کی طلب میں ہوتا ہے) کی طرف اشارہ ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس کو باری تعالیٰ کی حمد و ثنا و شکر اور طلب ہدایت سے طلب کیا جائے۔ اور یہ ہدایت دراصل وہ جذباتِ الٰہیہ ہیں کہ جس کا ایک جذبہ ثقلین کے عمل کے برابر ہے اور بندے کا تقرب نصف نماز میں ہے جو کہ بندہ اور مالکِ لم یزل کے مابین نصف و نصف تقسیم کی گئی ہے۔

اور قیام و رکوع و سجود میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ کا رجوع عالمِ ارواح اور مسکن غیب کی طرف ہے۔ اس لیے کہ یہ (اس عالم و مسکن سے آیا ہے) پھر اس کا پہلے تعلق نباتیۃ سے ہوا، پھر حیوانیت سے، پھر انسانیت سے۔ پس قیام انسان کا خاصہ ہے اور رکوع حیوانیت کا اور سجود نباتات کا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ۔

بندے کا ان ہر سہ مراتب سے نفع بھی ہے اور نقصان بھی۔ اور روح علوی جو کہ نورانی ہے اس کا اس جسدِ سفلی (جو کہ ظلماتی ہے) سے متعلق کرنے میں بھی نفع مقصود ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

حدیثِ قدسی "میں نے مخلوق کو اس لیے پیدا فرمایا کہ وہ مجھ سے بہرہ یاب ہو (نہ اس لیے کہ میں اس سے فائدہ حاصل کروں)"۔

تاکہ رُوح سفلیات کے تمام مراتب سے فائدہ اٹھائے جو کہ وُہ مراتب علویات سے نہ پا سکا۔ اگرچہ وہ پہلے خسارہ کی آزمائش میں بتلا ہوا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ... الخ

یعنی بندہ نورِ ایمان و عملِ صالح سے بلائے خسران (جو کہ مراتب سفلیہ سے ہے) نجات پا کر ان مراتب علویہ

کے منافع سے باریاب ہوگا۔ مثلاً نماز کے قیام (جو کہ عاجزی و تواضع کے ساتھ ہو) سے تجبر و تجبر (جو کہ انسان کا فطرتی ہے) سے نجات پاکر کامل انسان ہوجائے گا اور اس کے بعد اس کی زبان انا ربکم الاعلیٰ کہہ اُٹھے گی (اگر باوجود انہماک علوہمت کے منافع سے کامیاب ہوگا۔ جو کہ یہ انسانی تکمیل ہے۔ جب اس تکمیل سے کامیاب ہوجاتا ہے تو مکون (یعنی خالقِ کائنات) کی طلب میں عالمِ کون کی طرف التفات بھی نہیں کرتا، جیسا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا (شبِ معراج) حال تھا۔ جس کو قرآن پاک یُوں بیان فرماتا ہے: ما زاغ البصر وما طغیٰ لقد رای من ایات ربہ الکبریٰ۔

نہ آنکھ ٹیڑھی ہوئی اور نہ دوڑے بیشک اپنے رب کی بہت بڑی نشانی دیکھی

پس جب بندہ تجبرِ انسانی سے نجات پاتا ہے تو قیامِ انسانی سے رکوعِ حیوانی کی طرف رجوع کرتا ہے جو کہ خضوع و انکسار کا حامل ہے۔ پس رکوع کی بدولت صفتِ حیوانیہ کے خسارہ سے نجات پاکر تحمل اذی اور حلم کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ پھر رکوع حیوانی سے فارغ ہوکر سجود نباتی کا رُخ کرتا ہے۔ پس سجود کی برکت سے ذلتِ نباتیہ و دنائت سفلیہ کے خسران سے نجات پاکر اس خشوع کے منافع سے بہرہ یاب ہوا، جس میں فلاحِ ابدی و نور سرمدی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قد افلح المؤمنون الذین فی صلاتھم خاشعون۔

خشوعِ عبودیت کے عروج کا کامل آلہ ہے۔ اسی سے انسان کو جسدِ نورانی سے تعلق نصیب ہوا اور ایسا خشوع عالم میں کسی کو نہیں عنایت ہوا۔ یہ وہی رازِ امانت ہے کہ جس کے تحمل سے ملائکہ وغیرہ نے انکار کر دیا تھا جس کو آیت واشفقن منہا وحملہا الانسان میں ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اباء خشوع کی نقیض ہے اور انسان میں چونکہ استعدادِ خشوع موجود تھی اس کی بدولت امانت کا بوجھ اُٹھا لیا اور خشوع کی تکمیل سجدہ سے ہوتی ہے کیونکہ اسی سے صورتِ انسان و ہیئتِ نماز میں کمال درجہ کے عجز کا اظہار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اسی سے رُوح کا عالمِ سفلی سے قطع تعلق احسن طریق سے ہوتا ہے اور مراتبِ انسانیہ وحیوانیہ و نباتیہ سے اعراض و عالمِ روحانی علوی کی طرف اسی انانیت وجود کی بدولت ہوتا ہے اور نفحاتِ الطافِ حق کے لیے کمال تعرض اسی سے ہوتا ہے اور بذل المجہود جو کہ نمازی کے لیے شرطِ اول ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ویقیمون الصلوٰۃ اسی سے میسر ہوتا ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ رزق لغت میں بمعنی عطا ہے اور عرف میں اہلِ سنت کے نزدیک وُہ شے ہے جس سے حیوان نفع اٹھائے خواہ حلال ہو یا حرام۔ اور یہاں قرینہ کی وجہ سے حلال شے مراد ہے کیونکہ یہ مدح کا مقام ہے اور مفعول کی تقدیم میں دو فائدے ہیں:

۱۔ اہتمام

۲۔ رؤس آیات کی محافظت اور مِنْ تبعیضیہ داخل کر کے اسراف (جو کہ شرعاً ممنوع ہے) سے منع کیا گیا ہے۔

سوال : رزقنا جمع کا صیغہ ہے۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ناجائز ہے کیونکہ وُہ تو وحدہٗ لاشریک ہے۔
جواب : جمع کے صیغے بادشاہوں کے لیے بولے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے اور شاہوں کا شاہ ہے۔
ف : بادشاہوں کی اپنی گفتگو چار طریقوں سے ہوتی ہے :

۱۔ صیغۂ واحد کے ساتھ، جیسے کوئی بادشاہ کہے، فَعَلْتُ کذا۔ میں نے ایسے کیا

۲۔ جمع کے ساتھ، جیسے : فعلنا کذا۔ ہم نے ایسے کیا

۳۔ صیغہ مجہول کے ساتھ، جیسے : رُسِمَ لکمُ۔ تمہارے لیے کہا گیا

۴۔ اپنے آپ کو غائب قرار کر کے فعل کی نسبت اپنے اسم کی طرف کر دینا۔ جیسے خود کہے : اَمَرَکُمْ سُلطانکمُ۔
اور قرآن پاک چونکہ عرب کی لغت میں نازل ہوا، بنا بریں اللہ تعالیٰ نے انہی چار طریقوں کو اپنے لیے استعمال فرمایا ہے۔
چنانچہ اپنی ذات سے خبر دیتے ہوئے فرمایا :

ذرنی و من خلقت وحیداً۔ یعنی صیغہ واحد کے ساتھ۔ مجھے اور اسے چھوڑ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔

اور فرمایا :

انّا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر۔ صیغہ جمع کے ساتھ۔ بیشک ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اُتارا

اور فرمایا :

کتب علیکم الصّیام۔ وغیرہ تم پر روزے فرض ہوئے

اور طریقۂ غیب بھی کئی بار فرمایا۔ کما قال :

الذی خلقکم وغیرہ وغیرہ (کذا فی تفسیر التیسیر) وہ جس نے تمہیں پیدا کیا۔

میرے شیخ قدس سرہٗ کی تقریر اس کے متعلق یُوں ہے کہ واحد کا صیغہ باعتبار ذات کے ہے اور جمع کا باعتبار اسماء وصفات کے، اور کثرت اسماء وصفات وحدۃ ذات کے منافی نہیں کیونکہ مآل ہر ایک کا ایک ہی ہے۔

انفاق و انفاد ایک ہی شے ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ انفاد میں تمام مال خرچ کرنا مراد ہوتا ہے اور انفاق میں ایسا نہیں ہوتا۔ اور یہاں انفاق سے نیک راہ میں خرچ کرنا مقصود ہے فرض ہو یا صدقہ یا نفل۔

اور جس نے صرف زکوٰۃ مراد لی ہے تو اس نے خیرات کی بہترین نوع اور ان کے اصل کا ذکر کر کے باقیوں کو ترک کر دیا اور زکوٰۃ مراد لینا موزوں ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جمیع عطا کردہ معاون مراد ہیں خواہ ظاہری ہوں یا باطنی۔
اس کی تائید اس حدیث شریف سے ہوتی ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس علم سے کچھ ظاہر نہ کیا جائے اس خزانہ کی طرح ہے کہ جس سے کچھ خرچ نہ کیا جائے۔

اور جن حضرات نے اس آیت کی تفسیر وممّا خصصناھم بہٖ من انوار المعرفۃ یفیضون سے کی ہے وہ

ف ۱ : وہ جنہیں ہم نے انوار معرفت سے مخصوص کیا وہ فیض پہنچاتے ہیں

وہ بھی تعمیم کے قائل ہیں۔ مگر زیادہ مناسب یہ ہے کہ انفاق سے مراد زکوٰۃ ہے۔ لیکن ہر شے کی زکوٰۃ اس کی جنس سے ہوا کرتی ہے جیسا کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دار کی زکوٰۃ یہ ہے کہ اس میں ایک مہمان خانہ بھی تیار کیا جائے۔ (کذا فی الرسالۃ القشیریہ)

نمکین اقوال (۱) اہلِ شرع کا انفاق اموال کی حیثیت سے ہوتا ہے لیکن اہلِ حقیقت کا جان سے۔ مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں : ؎

آں درم دادن سخی را لائق است
جاں سپردن خود سخائے عاشق است

ترجمہ : عوام کی سخاوت پیسے خرچ کرنا اور عاشق کی سخاوت جان جانجاناں کو پیش کرنا ہے)

(۲) اغنیاء کا انفاق مال سے ہوتا ہے کہ مال کو ضرورت مندوں سے روک نہیں رکھتے اور عابدین کا انفاق نفوس سے ہوتا ہے کہ نفوس کو خدمات کے وظائف سے باز نہیں رکھتے اور عارفین کا انفاق قلوب سے ہوتا ہے کہ قلوب کو مراقبہ کے حقایق سے دُور نہیں فرماتے۔ اور عاشقین کا انفاق ارواح سے ہوتا ہے کہ ارواح کو جاری کردہ قضاء سے نہیں روکتے۔

(۳) اور یہ بھی کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اغنیاء کا انفاق جیب سے مال نکالنا اور فقراء کا انفاق قلوب سے اغیار کا نکالنا ہے۔

نکتہ آیت میں اوّلاً ایمان کا ذکر ہے اسے قلوب سے تعلق ہے پھر نماز کا اسے بدن سے، پھر انفاق کا اسے مال سے، اور یہ تینوں عبادات کا مجموعہ ہیں۔ چنانچہ ایمان میں نجات ہے اور صلوٰۃ میں مناجات اور زکوٰۃ میں درجات (یا یُوں کہو کہ) ایمان میں بشارت ہے اور صلوٰۃ میں کفارہ اور زکوٰۃ میں طہارت (یا یوں کہو کہ) ایمان میں عزت ہے اور صلوٰۃ میں قربت اور زکوٰۃ میں زیادۃ۔

شانِ خلفائے راشدین آیت ہذا میں چار چیزوں کا بیان ہے:

۱۔ تقویٰ
۲۔ ایمان بالغیب
۳۔ اقامتِ صلوٰۃ
۴۔ انفاق

اور یہی چار اوصاف خلفائے راشدین کے ہیں۔ مثلاً آیت میں مومنین کی فضیلت تقویٰ سے بیان فرمائی۔ اور یہ

صفت صدیق اکبر کی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا:

فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنیٰ۔

اور ایمان بالغیب حضرت عمر کی صفت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یاایھا النبی حسبك الله ومن اتبعك من المؤمنین۔

اور اقامت صلوٰۃ حضرت عثمان کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ام من ھو قانت اٰناء الیل ساجداً وقائماً۔

اور انفاق حضرت علی کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

الذین ینفقون اموالھم بالیل والنھار۔ (الآیۃ)

ف : بعض قوم یعنی صوفیہ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک عطا کے لحاظ سے سخاوت پہلا رتبہ ہے۔ اس کے بعد جود، اس کے بعد ایثار، مثلاً کوئی شخص اپنا کچھ مال اپنے لیے رکھ لے اور کچھ خیرات کر دے۔ اسے صاحبِ سخاوت کہیں گے۔ اور کوئی ایسا شخص ہو کہ کچھ مال اپنے لیے رکھ کر باقی اکثر خرچ کر دے اسے صاحبِ جود کہا جائے گا۔ اور کوئی ایسا شخص ہو کہ خود تو اپنی ضرورت کے لیے تنگ ہو مگر جو کچھ اسے حاصل ہو وہ دوسروں کے لیے خرچ کر دے اسے صاحبِ ایثار کہا جائے گا۔ انفاق کے بہت سے فضائل ہیں منجملہ ان کے ایک حکایت ملاحظہ فرمائیے۔

انفاق کے فضائل

حکایت : ابوعبداللہ الحارث الرازی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی ایک نبی کی طرف وحی بھیجی کہ میں نے فلاں شخص کے لیے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ اس کی نصف عمر فقر میں بسر ہو اور نصف دولت مندی میں۔ آپ نے اسے بلا کر پوچھا کہ وہ کس طرح چاہتا ہے۔ اُسے بلایا گیا اور سارا ماجرا سُن کر عرض کی: مجھے اجازت ہو تاکہ میں اپنی زوجہ سے مشورہ کر لوں۔ اس نے اپنی عورت کو حال سُنایا تو اس نے کہا: پہلے دولت مندی کی تمنا ظاہر کرو۔ مرد نے کہا میرا خیال ہے کہ پہلے فقر ہونا چاہیے کیونکہ سُکھ کے بعد دُکھ مصیبتِ عظیم ہے اور دُکھ کے بعد سُکھ نعمتِ عظمیٰ اور موجبِ راحت ہے۔ عورت نے کہا: آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر اس بار میرے کہنے پر عمل کر لو۔ اُس شخص نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر دولت مندی کی آرزو ظاہر کر دی۔

نبی علیہ السلام کی دُعا سے وعدہ پورا ہوا اور وہ شخص صاحبِ جائداد ہو گیا۔ عورت نے کہا: اگر تُو اس دولت کی پائیداری چاہتا ہے تو اسے خلقِ خدا پر خرچ کر۔ چنانچہ اس نے اس پر عمل کیا۔ جب وہ ایک کپڑا خریدتا تو دوسرا کسی مسکین کے لیے بھی خرید لیتا۔ جب نصف عمر ختم ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا کہ اگرچہ اب اس کی باری فقر کی آ گئی۔ مگر چونکہ اس نے میری نعمتوں کا حق ادا کیا فلہذا اسے مژدہ سنا دو کہ اس کی باقی عمر بھی دولت مندی میں بسر ہو گی۔ مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

ہر کہ کارد گر انبارش تہی
لیکش اندر مزرعہ باشد بہی
وانکہ در انبار ماند و صرفہ کرد
اسپش و موش حوادثہاش خورد

ترجمہ : کھیتی بوتے وقت بندہ خالی ہاتھ ہو جاتا ہے لیکن اس کا ثمرہ کھیتی پیدا ہو جانے کے وقت ہوتا ہے اور جو اپنی گندم نہیں بوتا اسے گھر میں رکھ چھوڑتا ہے تو اسے جانور کھا جاتے ہیں یا چوہے، یا دیمک کا شکار ہو جائے گی۔

حضرت حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں :ــ

احوال گنج قارون کایام داد برباد
باغچہ باز گوید تا زر نہاں ندارد

ترجمہ : قارون کے خزانے کے حالات سخاوت کے زمانے کی طرح برباد ہیں باغیچے سے کہو کہ وہ اپنا دفینہ پوشیدہ نہ رکھے)

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ و ممّا رزقنٰھم کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ وجود کے اوصاف (جو کہ ہم نے عطا کئے ہیں) اس نماز (جو کہ بندہ اور اس کے مولیٰ کے مابین منقسم ہے) کے حق نصف میں خرچ کرتے ہیں۔ جب کار دشوار ہونے لگتا ہے اور تعرض منتہا کو پہنچتا ہے تو عنایت ازلیہ نفحات الطاف کے ساتھ بندہ کو مدرک ہوتی ہے اور اسے درجاتِ قرب کی ہدایت دی جاتی ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج اُدنُ مِنّی کے خطاب سے جذبۂ حق حاصل ہوا۔ ایسے ہی بندہ کو وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ کے خطاب سے جذبۂ حق نصیب ہوتا ہے۔

صوفیہ کی تشہد و فراغت از صلوٰۃ

سجدہ کے بعد تشہد پڑھنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ حجابات انانیت سے نجات پاکر جذباتِ ربانیہ کی بدولت شہود جمالِ حق میں پہنچ رہا ہے اور اس میں الفاظ (مخصوصہ) پڑھنے میں یہ طریقہ سکھایا جا رہا ہے کہ بادشاہوں کی بارگاہ میں تحائف ثناء اور اظہار طلبِ دیدار کے ساتھ حاضری دینی چاہیے اور دائیں بائیں سلام پھیرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ دارین پر سلام ہو اور ہر اس داعی جاہل پر بھی جو بندہ کو دائیں جانب سے نعیم جنت کی طرف اور بائیں جانب سے لذات و شہوات کی طرف بلاتا ہے اور بندہ یہ مقام اجابات و مناجات اور درجات قربات کا ہے۔ اور وہ اس وقت بحرِ کرامات میں مستغرق ہوتا ہے بلکہ (یوں کہئے کہ) جذباتِ الٰہیہ کی قید میں مقید ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا۔

مسئلہ : اس وقت اہلِ شرع تو نماز سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر اہلِ حق دائمی صلوٰۃ میں ابھی داخل ہو رہے ہیں ۔
چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۔ اور وہ جو نمازوں پر مداومت کرتے ہیں

ف : بعض لوگ ایسے ہیں جو نماز کی حفاظت کرتے ہیں اور نماز ان کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۔ (بیشک نماز فحش اور برائی سے روکتی ہے)

یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان بالغیب رکھتے اور نماز قایم کرتے ہیں اور اللہ کے دیے ہوئے سے ان نعمتوں کے عوض خرچ کرتے ہیں جو ان کے لیے آخرت میں تیار ہے جس کی جزا اللہ تعالیٰ نے دی ہے کہ میں نے اپنے بندوں کے لیے ایسی اعلیٰ شے تیار کر رکھی ہے کہ جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال گزرا ہے ۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہمارے لیے وہ شے تیار کی گئی ہے جو نہ آنکھوں کے ادراک میں آسکتی ہے اور نہ کانوں کے نہ قلوب کے ۔ اور یہ بھی انھیں معلوم نہیں ہوا کہ ان تیار شدہ نعمتوں اور ہمارے مابین سوائے ہمارے اپنے وجود کے کوئی شے حائل نہیں ہے تو ان کی خواہش ہوئی کہ انہیں وہ نار نصیب ہو (جو ان کے لیے حجاب بنا ہوا ہے) سے آ جلا دے ۔ چنانچہ انہیں اس صلوٰۃ کی جانب نار محسوس ہوئی ۔ جب وہ اس کے قریب پہنچے تو ندا آئی کہ مبارک ہے وہ شخص جو اس نار کے اندر ہے اور جو اس کے قریب ہے ۔ پاکی ہے رب العالمین کے لیے ۔ پھر وہ حضرات وجود کے اوصاف کو اس نار کا ایندھن بنا کر وجود کو اسی نار میں جلاتے ہیں ۔ اسی طرز پر وہ حضرات نماز میں قایم رہتے ہیں یہاں تک کہ ہاتف غیبی ندا دیتا ہے کہ اے انکو

وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم انتم لہا واردون ۔

خلاصہ یہ کہ وجود اور وہ اشیا جو اس کے لیے تیار کی گئی ہیں ، مال ہو خواہ جاہ ، قربت الی اللہ کے راہ پر خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وجود عنایت فرماتا ہے ۔ جیسا کہ اپنے حبیب علیہ السلام کو فرمایا :

أُنفق علیك ۔

جس کی وجہ سے یہ شخص بلا انانیت الوجود کے ساتھ باقی رہے گا اور اسے اپنے نور سے دائمی صلوٰۃ نصیب ہو گی جس کی برکت سے یہ شخص انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے گا ۔

تفسیر عالمانہ

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ ۔ **شانِ نزول** : یہ آیت اہلِ کتاب (یعنی جو اہلِ اسلام ہیں) کے حق میں نازل ہوئی اور اس کا ماقبل ومما رزقنٰھم ینفقون تک مومنینِ عرب کے حق میں نازل ہوا ۔ بما انزل الیك سے سالم قرآن اور تمام شریعت مراد ہے ۔

سوال : اگر اس سے تمام قرآن مراد ہو تو پھر اس کو ماضی سے تعبیر کرنا ٹھیک نہیں ۔ کیونکہ اس آیت کے نزول کے بعد بہت کچھ نازل ہوا ۔

---

۵۱ اور وہ جسے اللہ کے سوا پوجتے ہیں وہ جہنم کا ایندھن ہیں اور تم اس میں داخل ہونے والے ہو

جواب "۱": یہاں پر تغلیب کا حکم جاری کیا گیا ہے۔ یعنی جو نازل ہو چکا اس کو جو ابھی نازل نہیں ہوا غالب قرار دے کر تمام کو نازل شدہ تصور کیا گیا۔

(۲) جو ابھی نازل نہیں ہوا اسے بمنزلہ واقع کے قرار دیا گیا جیسا کہ جنات کے قصہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

اِنّا سمعنا کتاباً انزل من بعد موسٰی۔ بیشک ہم نے ایسی کتاب سنی جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد اتری

یہاں جنات کہہ رہے ہیں کہ ہم نے وہ کتاب سُن لی جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی تھی حالانکہ انہوں نے بعض آیات سُنیں۔

(۳) کواشی میں ہے کہ قرآن پاک حکماً ایک شے ہے کیونکہ اس کے بعض پر ایمان لانا گویا تمام قرآن پر ایمان لانا ہے۔

بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ اس سے وہ قرآن مراد ہے جو تلاوت کیا جاتا ہے اور وہ وحی مراد ہے جو تلاوت نہیں کی جاتی۔ اور تلاوت کردہ یہی سُورتیں اور آیات ہیں۔ تلاوت نہ کی ہوئی وحی وہ ہے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تعدادِ رکعات اور نصابِ زکوٰۃ اور حدود و جنایات بیان فرمائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الاّ وحیٌ یُّوحٰی۔

ف: آیت ہذا میں انزال بمعنے وحی ہے اور بمعنے اعلاً، یعنی نیچے سے اوپر کو جانا۔ اور اگر انزال کو اوپر سے نیچے آنے پر محمول کیا جائے تو معنیٰ یُوں ہوگا کہ جبریل علیہ السلام تبلیغ کے لیے اوپر سے نیچے لے آئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ونزل بہ الروح الامین۔

یعنی انزال بمعنی اوپر سے نیچے آنا۔ اور وہ اس طرح ہوا کہ معانی نیچے پہنچائے گئے۔ ان ذواتِ مقدسہ کے توسط سے جو ان معانی کی حامل تھیں۔

ف: باقی کتبِ الٰہیہ کے نزول کے متعلق صحیح علم اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ فرشتہ اللہ تعالےٰ کی جناب سے لوحِ محفوظ سے حاصل کر کے انبیاء علیہم السلام پر نازل کرتا تھا۔ پھر وہ حضرات اس فرشتہ سے یاد فرما لیتے۔

وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ سے توراۃ، انجیل اور دیگر آسمانی کتابیں مراد ہیں۔

مسئلہ: ان کتابوں پر مجملاً ایمان لانا فرض عین ہے اور قرآن پاک پر اس حیثیت سے کہ ہم اس کی تفاصیل کے مطابق عبادت بجا لانے والے ہیں۔ بالتفصیل ایمان لانا فرض کفایہ ہے۔ کیونکہ اس کی تفصیل پر ایمان لانے کا وجوب تمام لوگوں پر خرچ اور معاش میں خلل پڑنے کا موجب ہے۔

ف: تیسیر میں فرمایا ہے کہ تمام کتب پر ایمان لانا باوجودیکہ ان کے احکامات ایک دوسرے کے مخالف ہیں، دو قسم ہے:

۱ ۔ اس بات کی تصدیق کرنا کہ یہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں ۔
۲ ۔ اوران پر ایمان لانا کہ جن کے احکام منسوخ نہیں ہوئے ۔
وَبِالْاٰخِرَةِ آخر (جو کہ اوّل کا مقابل ہے) کی تانیث ہے اور معدودات کا وہ اسم ہے جو کسی کا لاحق ہو ، اور یہ دراصل دار (محذوف) کی صفت ہے ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے :

وتلک الدار الاٰخرة ۔

اور یہ ان صفات سے ہے جن پر اسمیت غالب ہوتی ہے اور ایسے ہی لفظ الدنیا اور اٰخر (بفتح الخاٗ) وہ جو اوّل کے قریب ہے یعنی دوسرا ۔

ف : دُنیا کو دُنیا اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ باعتبار آخرت کے قریب ہے اور آخرت کو آخرت اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ مؤخر ہے اور دنیا کے بعد ہے ۔

هُمْ يُوقِنُونَ الایقان بمعنے نظر واستدلال سے شک اور شُبہ کی نفی کرکے کسی شے کے علم میں پختگی حاصل کرلینا ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے علم کو یقین سے موسوم نہیں کیا جاتا اور نہ ہی علوم بدیہیہ کو ۔ اب ھُم یوقنون کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ ایسا یقین رکھتے ہیں کہ ان میں وہ اوہام وشکوک نہیں جو اہلِ کتاب میں پائے جاتے ہیں جو کہ منجملہ اُن کے یہ شکوک بھی ہیں کہ وُہ کہتے ہیں کہ بہشت میں یہود ونصارٰی کے سوا اور کوئی نہیں داخل ہوگا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں نارِ جہنم مس نہیں کرے گی مگر چندروز ، اور ان کا اس بات کا اختلاف کہ کیا بہشت کی نعمتیں دُنیا کی نعمتوں کی طرح ہیں ، یا وہ دیگر نعمتیں ہیں ۔ اور کیا یہ نعمتیں دائمی ہیں یا چند روزہ ۔ ان سے ایک گروہ تو اس بات کا قائل تھا کہ بہشت میں کھانے اور پینے اور نکاح کی اشیاء کی لذتیں دنیوی لذتوں جیسی ہوں گی ۔ اور بعض کہتے ہیں نہیں بلکہ یُوں ہوگا کہ دنیا میں ان اشیاٗ کی محتاجی جسم کے تزاید اور تناسل و توالد کی بنا پر ہے اور چونکہ اہلِ جنت ان باتوں سے مستغنی ہوں گے بنا بریں صرف وہ نسیم و رواح عقبہ اور سماع لذیذ و سرور کی لذتیں پائیں گے ۔

سوال : یُوقنون پر ھُم ضمیر کو مقدم کرکے حصر کیوں کیا گیا ۔

جواب : اہلِ کتاب پر تعریض ہے اس لیے کہ وہ جس طرح امرِ آخرت کو ثابت کرتے ہیں وہ حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ آخرت کے بارہ میں وہ جو اعتقاد رکھتے ہیں کسی حد تک صحیح نہیں ، چہ جائیکہ انہیں مرتبہ یقین حاصل ہو ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضمیر کی تقدیم تخصیص کے لیے ہے ۔ یعنی جو لوگ قرآن پاک اور کتبِ سابقہ پر یقین رکھتے ہیں وہ آخرت حقیقت پر متصور جو اس عقیدہ کی طرف متجاوز نہیں کہ جس کا کفار و اہلِ کتاب اثبات کرتے ہیں ۔

ف : (۱) ابو اللیث رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یقین تین قسم ہے :

(۱) یقینِ عیاں ، (۲) یقینِ خبر ، (۳) یقینِ دلالت

یقینِ عیاں وُہ ہے جو مجرد شے کے دیکھنے سے شک زائل ہو جائے۔

یقینِ دلالت وہ ہے کہ مثلاً کوئی دُور سے دُھواں دیکھے تو اس سے اسے آگ کا یقین ہو جائے گا اگرچہ اُسے آگ دکھائی بھی نہیں دے رہی۔

یقینِ خبر وُہ ہے کہ کسی ایک کو مثلاً یقین ہے کہ اس عالمِ دُنیا میں ایک شہر ہے جسے بغداد کہا جاتا ہے اگرچہ وہ وہاں تک نہیں پہنچا۔ اور آیت میں یقینِ خبر اور یقینِ دلالت مراد ہیں کیونکہ آخرت حق ہے۔ علاوہ ازیں خبر دیکھنے سے معائنہ ہو جاتی ہے۔

(۲) ظاہر شریعت کا نام علم الیقین اور اس میں خلوص کرنے کا نام عین الیقین اور اس کے مشاہدہ کا نام حق الیقین ہے۔ علم الیقین وہ علم ہے جو ادراکِ باطنی کے ساتھ فکرِ صائب و استدلال سے حاصل ہو اور یہ علم ان علماء کو حاصل ہے جو مومنین بالغیب ہیں اور یہ مرتبہ علمیہ ارواحِ قدسیہ کی مناسبت کے بغیر زاید نہیں ہوتا۔ اس مرتبہ کے حصول کے بعد یہ علم عین ہو جاتا ہے اور عین کا سوائے اس یقین (جو کہ معلوم کے مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے) کے کوئی مرتبہ نہیں اور یہ مرتبہ زاید نہیں ہوتا کہ دُوئی دور نہ ہو۔ پھر یہ مرتبہ حق ہو جائے گا اور اس مرتبہ یعنی حق الیقین کی زیادتی اس وقت ہوتی ہے جبکہ اس کے بُعد کو حجاب کا ورود نہ ہو۔

(۳) عین الیقین اولیاء کرام کو حاصل ہوتا ہے اور حق الیقین انبیاءِ عظام کو۔

روحانی نسخے

(۱) یہ درجات و مراتب مجاہدہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔ ہمیشہ باوضو رہنا اور تھوڑا طعام کھانا اور ذکرِ کثیر کرنا اور ملکوت السمٰوٰت والارض میں فکر کے ساتھ خاموش رہنا اور سنن و فرائض ادا کرنا اور ماسوائے حق (اغراضِ نفسانی) کو ترک کرنا۔ اسبابِ دنیویہ قلیل اور نیند بھی کم اور اکلِ حلال و صدقِ مقال کا پابند رہنا اور قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنا۔ یہ امور مذکورہ بالا معائنہ و مشاہدہ کی کُنجی ہیں۔ (کذا فی شرح النصوص المسمی باسرار البرور بالوصول الی عین النور)

(۲) آخرت سے عین الیقین کا ثمرہ اس بات میں ہے کہ اس کی تیاری میں رہنا چاہیے۔ چنانچہ بزرگوں کا قول ہے کہ دس آدمی بہت بڑے دھوکہ میں ہیں:

(۱) جسے یقین ہے میرا خالق اللہ ہے مگر وہ اس کی عبادت سے قاصر ہے۔

(۲) جسے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا رازق ہے مگر وہ اس سے غیر مطمئن ہے۔

(۳) جسے یقین ہے کہ دنیا فانی ہے مگر اس پر سہارا کرتا ہے۔

(۴) جسے یقین ہے کہ میرے ورثہ میرے دشمن ہیں مگر ان کے لیے مال جمع کر رہا ہو ؎

تو باخود ببر توشۂ خویشتن   کہ شفقت نیاید ز فرزند و زن

ترجمہ: تُو اپنا زادِ راہ اپنے ساتھ لے جا، مرنے کے بعد نہ تیری عورت تیری خبر گیر ہوگی نہ تیرا لڑکا۔

(۵) جسے یقین ہے کہ موت ہرگز نہیں چھوڑے گی مگر اس کی تیاری نہیں کر رہا۔

(۶) جسے یقین ہے کہ اس کا رہنا سہنا قبر میں ہے مگر اس کی تعمیر نہیں کرتا۔

(۷) جسے یقین ہے کہ اس کا محاسب اس سے پائی پائی کا حساب لے گا مگر اپنے حساب کو درست نہیں رکھتا۔

(۸) جسے یقین ہے کہ پُل صراط پر سے اس کا گزر ہونا ہے مگر اپنے گناہوں کے بار کو ہلکا نہیں کرتا۔

(۹) جسے یقین ہے کہ دوزخ فجّار کا مقام ہے مگر اس سے نہیں بھاگتا۔

(۱۰) جسے یقین ہے کہ جنّت نیک لوگوں کی قرار گاہ ہے مگر اس کے لیے نیک عمل نہیں کرتا۔ (کذا فی التیسیر)

(۳) حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یقین قصر امل کا اور قصر امل زُہد کا موجب ہے اور زہد حکمت پیدا کرتا ہے اور حکمت نیک انجام کی طرف غور کرنے کی توفیق بخشتی ہے۔

ف: حضرت ابوالآفاق رحمہ اللہ تعالیٰ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قولِ مبارک (جو کہ آپ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لیے فرمایا ہے کہ اگر اُن کا یقین زیادتی میں نہ ہوتا تو وہ ہوا کی طرح نہ اُڑتے) کے بارہ میں فرماتے یہ دراصل اپنا حال (جو آپ کے ساتھ شبِ معراج میں ہوا) بیان فرمایا کیونکہ معراج کے لطائف سے ایک لطیفہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے براق کو دیکھا وہ اُڑنے سے ٹھہر گیا۔ مگر ہم اُوپر کو جا رہے تھے۔

حکایات

(۱) حضرت ابوتراب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک لڑکے کو دیکھا جو خرچ کے بغیر جنگل میں جا رہا تھا، میں نے دل میں کہا اگر اسے یقین نہ ہوتا تو جنگل میں ہلاک ہو جاتا۔ آخر میں نے لڑکے سے پُوچھا: اے بیٹے! تُو ایسے جنگل میں خرچ کے بغیر کیسے سفر کر رہا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا: اے بزرگ! ذرا سر اٹھا کر غور سے دیکھیے، کیا آپ کو اللہ کا غیر دکھائی دیتا ہے؟ میں نے کہا: بیٹے! جاؤ جہاں دل چاہے، تمہارے لیے بہت کامیابی ہے۔

(۲) حضرت ابراہیم خواص رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں معاش کی طلب میں چلا اور خیال تھا کہ اکلِ حلال نصیب ہو۔ اسی اثناء میں مچھلی کا شکار کیا۔ ایک دن میں نے جال دریا میں پھیلایا جس سے ایک مچھلی ہاتھ آئی۔ دوسری بار دوسری ہاتھ آئی۔ تیسری بار ارادہ ہوا جس پر ہاتفِ غیبی نے کہا "خدا کرے تجھے معاش نصیب نہ ہو۔ تُو شکار بھی انہیں کرنے آیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہیں اور تُو اللہ تعالیٰ کے ذاکرین کو قتل کر رہا ہے" میں نے یہ آواز سنتے ہی جال کو توڑ ڈالا اور ہمیشہ کے لیے شکار کرنا ترک کر دیا۔

تفسیر صوفیانہ

جو شخص حجاب وجودی کی ذلت سے نجات پاتا ہے تو اُسے امورِ اُخرویہ کے ایقان کی عزت نصیب ہوتی ہے۔ اس سے قبل وہ من وراء الحجاب ایمان رکھتا ہے۔ اب

حجابات اُٹھ جانے سے مُوقن ہو گیا جیسا کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ اگر حجاب ہٹ جائے تو میں یقین میں زیادتی حاصل کر لوں گا، کیونکہ جس سے حجابات ہٹ جائیں تو اس کے لیے امورِ اُخرویہ کے پردے حائل نہیں ہوں گے۔ حجابات ہٹ جانے سے بندگانِ خدا مرتبۂ ایمان سے خلاص پا کر مرتبۂ ایقان تک پہنچ جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وبالاٰخرۃ ھم یوقنون۔ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں

لیکن یہ ایقان خاص ہو گا کیونکہ ایمان باللہ و بالکتب سے ہمیشہ ہمیشہ تک خلاص نہیں پاتا۔ یہ ایک راز کی بات ہے اور میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ ان دونوں مراتب کے مابین فرق کرتا ہو کیونکہ انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ تمام اُمورِ اُخرویہ کا دنیا میں کشف کے ساتھ مشاہدہ کرے۔ ہاں آخرت میں بطریقِ مشاہدہ کے ان امور سے ایقان حاصل کرے گا اگرچہ اس سے قبل ان سے صرف ایمان رکھتا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فکشفنا عنك غطاءك فبصرك الیوم حدیدٌ۔ تو ہم نے تیرا پردہ اُٹھایا تو آج تیری آنکھ تیز ہے۔

باقی رہا اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، یہ تو کسی انسان کے امکان میں نہیں کہ اُن کا کلی طور پر مشاہدہ کرے کیونکہ وہ کل اور جزء سے منزّہ ہے اور اربابِ مشاہدہ اگرچہ شہود جمالیہ و جلالیہ کے مشاہدہ سے عین الیقین بلکہ حق الیقین کے ساتھ بہرہ ور ہوئے ہیں۔ لیکن وہ مشاہدات کہ جن کے مشاہدہ سے تاہنوز محروم ہیں۔ ان کے ساتھ ایمان رکھنے کے مرتبہ سے انہیں خلاص میسر نہیں ہوا اور نہ توالی ابد الآباد اس کے علم کو احاطہ کر سکتے ہیں بلکہ اس کے علم میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے، ہاں جس کے لیے وہ مالکِ حقیقی چاہے۔ ذٰلك فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

تفسیر عالمانہ اُولٰٓئِكَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ۔ **ربط**: اُولٰٓئِكَ یہ جملہ محل رفع میں ہے۔ اگر متقین کے دو موصول سے ایک کو اس سے علیحدہ کیا جائے تو یہ جملہ اس کی خبر ہے (اور وہ مبتدا) گویا کہ جب ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کہا گیا تو سائل نے پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے کہ یہ لوگ ہدایت سے کیوں مخصوص ہو رہے ہیں تو جواب میں کہا گیا الذین یؤمنون، اگرچہ یہ جملہ سابقہ کی خبر نہ ہو تو جملہ مستانفہ قرار دیا جائے گا۔ پھر مطلب یہ ہوا کہ یہ جملہ سابقہ احکام اور صفاتِ متقدمہ کا نتیجہ ہو گا اور یہ ایسی جمع ہے کہ اس کا اپنے لفظ سے کوئی واحد نہیں۔ یہ مبنی علی الکسر ہے یہ کاف ذٰلك کے کاف کی طرح خطاب کا ہے۔ یعنی اس سے پہلے جو مذکور ہے۔ یعنی وہ متقین جو موصوف بالایمان بالغیب اور باقی دیگر اوصاف کے موصوفین تھے۔ اور اس میں اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ لوگ دیگر لوگوں سے متمیز ہیں۔ اس کے سبب سے امورِ مشاہدہ کے امور میں منسلک ہیں۔ باقی رہا اس میں اسمِ بعید کے ساتھ اشارہ کرنا سو وہ ان کے بلند درجات اور فضل میں رفعِ مراتب کی وجہ سے ہے۔ اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے اور علیٰ ھدًی اس کی خبر، اور ھُدًی میں جو تنکیر سے ابہام سمجھا جا رہا ہے۔ یہ تفخیم شان کے لیے ہے۔ گویا کہا گیا ہے کہ وہ لوگ بڑی ہدایت پر ہیں کہ جس کی کُنہ کو نہیں پہنچا جا سکتا اور نہ اس کی قدر معلوم ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ محاورۂ عرب میں کہا جاتا ہے

لَوْ اَبْصَرْتُ فلاناً ابصرتَ رَجُلاً۔

سوال : لفظ علیٰ کو یہاں لانے سے کیا فائدہ حاصل ہوا؟

جواب : ان کے حال کو (جو ہدایت کے ساتھ ملابس ہے) اس شخص کے حال سے تشبیہ دینا مقصود ہے جو کسی شے کو قبول کرکے اس پر ایسا حاوی ہوجائے کہ اس میں وہ جیسے چاہے تصرف کرے۔

روحانی نسخہ یہ اوصاف یعنی جن کے لیے دلائل قایم کئے گئے ہیں، فکر کو فارغ کرکے ان کی طرف نظر کو دائماً متوجہ رکھنے اور نیک عمل میں نفس کے محاسبہ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی اُن کو اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں قبل از موت ہدایت دے کر اور فلاح کی راہ جتلا کر مکرم فرمایا ہے۔

من ربّھم محذوف سے متعلق ہوکر ھُدًی کی صفتِ مبیّنہ ہے اور اس کی تاکید کر رہی ہے۔ یعنی یہ لوگ اس ہدایت پر ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں نصیب ہوئی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تمام انواع اور اُس کی توفیق کے جمیع فنون کو شامل ہے اور اس میں عنوانِ ربوبیت اور پھر ان کی طرف اضافہ کرنے میں حرف موصوف یعنی ہدایت اور مضاف الیہم یعنی مومنین کی تفخیم شان اور ان کی بزرگی کا اظہار مقصود ہے اور آیت ہذا میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ ہدایت ان لوگوں کے لیے ہے جو ان صفات مذکورہ کے موصوف ہیں اور ان آیات قولوا اٰمنّا وما اُنزل الینا سے لے کر فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم به فقد ھتدوا میں اشارہ ہے کہ یہ ہدایت طاعات کے بغیر اقرار اور اعتقاد سے حاصل ہوتی ہے اور یہ فرق اس لیے ہے کہ یہاں پر ایمان کی شرافت اور اس کی قدر کے عظیم شان اور اس کے امرِ علو کا تذکرہ ہو رہا ہے کیونکہ ایمان میں جب پختگی پائی جائے گی تو نفس کی مخالفات اسے نقصان نہ پہنچائیں گی بلکہ اُن پر قابو پاکر نفس کو گناہوں کی سرکشی کے بعد توبہ کی راہ دکھلائے گی۔ پھر وہ جیسے آج دنیا میں ایمان کی راہ حاصل کرے گا تو کل آخرت میں بہشت کی راہ پر سیدھا چلا جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت یھدیھم ربھم بایمانھم ۔۔ الخ بیشک مومن اور نیک لوگوں کو اس ایمان کی وجہ سے دعوت دیتا ہے اس وجہ سے کہ مطعین کے سامنے اور دائیں جانب ان کے ایمان کا نور دوڑتا ہوگا اور وہ اپنی طاعات کی سواریوں پر سوار ہوں گے اور ملائکہ ان کے استقبال کے لیے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

یوم نحشر المتقین الی الرحمٰن وفداً ۔ (اس دن ہم متقیوں کو وفد بنا کر ہم اس کے ہاں جمع کریں گے

اور فرماتا ہے :

وتلقھم الملٰٓئکة ۔ انہیں ملائکہ ملیں گے

اور مجرمین تن تنہا پڑے ہوں گے، قیامت کی تکالیف برداشت کر رہے ہوں گے۔ نہ تو ان کے لیے نورِ طاعات ہوگا اور نہ ملائکہ استقبال کے لیے آئیں گے۔ پھر نہ انہیں کوئی راہ ملے گی نہ راہ بتانے والا۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ

فرمائے گا: اے میرے مجرم بندے! جنّت والے آج کے دن میوہ خوری میں مشغول ہیں اور وہ اپنے بہترین ثواب کے حصول کی وجہ سے تمہارے لیے فارغ بھی نہیں اور اہلِ نار خود شدتِ عذاب میں مبتلا ہیں وہ بھی تم پر رحم نہیں کر سکتے۔

اے مسکینو! تم پر میری طرف سے سلام ہو۔ اب تم کس حال میں ہو۔ اگرچہ تمہارے ہم جنس لوگ تم سے سبقت لے گئے اور تمہیں ہدایت نہ دے سکے پس اس وقت تمہیں راہِ راست دکھلاتا ہوں۔ اگر میں وہ معاملہ کروں کہ جس کے تم مستحق ہو، پھر میرے کرم کا اظہار نہیں ہوگا۔ (کذا فی تفسیر)

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ؎

۱ نہ یوسف کہ چنداں بدرید بلند
چوں حکمش رواں گشت قدرش بلند

۲ گنہ عفو کرد آلِ یعقوب را
کہ معنی بود صورتِ خوب را

۳ بکردار بد شاں مقید نہ کرد
بضاعات فرجات شاں رد نکرد

۴ زلطفت ہمیں چشم داریم نیز
بریں بے بضاعت بہ بخش اے عزیز

۵ بضاعت نیاوردم اِلّا اُمّید
خدایا ز عفو مکن نہ اُمّید

ترجمہ: (۱) نہ حضرت یوسف علیہ السلام کہ جنہوں نے جلاوطنی اور قید و بند کی مصیبتوں کو جھیلا جب آپ کا حکم رواں ہوا تو آپ کی قدر بلند ہوگئی۔

(۲) تمام آلِ یعقوب کے گناہوں کو معاف کیا کیونکہ خوب صورتی کے لیے خوب سیرتی بھی لازمی ہے۔

(۳) ان کے بُرے کردار کی وجہ سے ان کو قید نہ کیا، ان کے معمولی سامان کی طرف بھی توجہ نہ کی۔

(۴) آپ کی مہربانی سے بھی ہم یہی امید رکھتے ہیں کہ اے عزیز! اس بے سروسامان کو بھی کچھ دے دے۔

(۵) میں امید کے سوا کوئی سامان نہیں لایا، اے خدا! مجھے اپنی معافی سے نااُمید نہ کر۔

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ - **سوال:** اولٰئك کا تکرار کیوں؟

جواب: تاکہ دلالت ہو کہ ہدایت یافتہ کی غیروں سے تمیز دینے میں دونوں ضروری ہیں۔ اور حرف عطف ہیں درمیان میں لانے سے اس طرف تنبیہ ہے کہ دونوں درحقیقت متغایر ہیں اور مبتداء و خبر کے مابین ضمیر فصل کی لانے میں بتایا گیا ہے

کہ اس کا ما بعد خبر ہے صفت نہیں، اور یہ بھی بتایا گیا کہ مسند صرف مسند الیہ کے لیے ثابت ہے نہ اس کے غیر کے لیے۔
اب معنیٰ یہ ہوگا کہ فلاح کی صفت صرف ان لوگوں پر مقصور ہے ان کے ماسوا کسی غیر یعنی یہود و نصاریٰ پر پہنچتی بھی نہیں۔
اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ متقین کی صفت سوائے فلاح کے اور کوئی ہے بھی نہیں۔ یہ قصر قصر الصفت علی الموصوف ہے، نہ کہ برعکس۔ جب یہ بات ہے تو مذکورہ خرابی کیوں لازم آئے۔ اَلْمُفْلِحُ فائز المرام کو کہتے ہیں۔ گویا مفلح وہ ہے جس کے لیے کامیابی کے دروازے کھلے ہیں اور ان پر بند نہیں ہوتے۔

فائدہ : یہ ترکیب (ف ل ح) شق فتح قطع کے معنیٰ پر دلالت کرتی ہے اسی لیے کسان کو فلّاح کہتے ہیں کہ وہ زمین کو چیرتا ہے۔ عرب میں کہاوت مشہور ہے :

اَلْحَدِیْدُ بِالْحَدِیْدِ یُفْلَحُ اَیْ یُقْطَعُ۔ لوہا لوہے کو کاٹتا جاتا ہے۔

اب معنیٰ یہ ہوا کہ وہ لوگ قیامت میں جنّت میں فائز المرام اور دوزخ سے نجات پانے والے ہوں گے۔

مسئلہ : متقین کے لیے دنیا اور آخرت میں فلاح بہبودی قطعی الثبوت اور یقینی ہے۔

ف : فلاح تین قسم ہے :

(۱) نفس پر قابو پا لینا، بایں طور کہ اس کی خواہشات کی متابعت نہ کرنا۔ اور
دنیا کے امور پر قابو پانا، بایں طور کہ اس کے خوشنما بہاروں پر غرّہ نہ ہونا۔ اور
شیطان پر قابو پانا، بایں طور کہ اس کے وسوسہ اور بُرے دوستوں کی صحبت میں مبتلا نہ ہونا۔ ایسے لوگ نفس و شیطان سے محفوظ رہتے ہیں۔

(۲) کفر اور ضلالت اور بدعت و ضلالت اور غرورِ نفس و وسوسۂ شیطان اور زوال و فقدانِ ایمان اور وحشتِ قبور اور سہول یوم النشور اور پُل صراط کی لغزش اور زبانیہ کی شدید و غلیظ کی تسلیط اور بہشت کی محرومی اور قطع رحمی اور دوستوں کے ساتھ چین بجبین کے اسباب سے نجات پانا۔

(۳) ملک ابدی اور نعمتِ سرمدی اور لازوال ملک و نعمت غیر منتقلہ کے حصول اور وہ سرور کہ جس میں حزن نہ ہو اور وہ جوانی کہ جس میں بڑھاپا نہ ہو اور وُہ راحت کہ جس میں شدّت نہ ہو اور وہ صحت کہ جس میں مرض نہ ہو اور وہ حصولِ نعمت کہ جس میں حساب نہ ہو اور وُہ دیدار کہ جس کے سامنے نقاب نہ ہو۔ (کذا فی تفسیر التیسیر)

ف : اسی آیت سے فرقہ وعیدیہ نے فسّاق اہلِ قبلہ کا دائمی عذاب میں مبتلا ہونے کا استدلال کیا ہے۔ ان کو جواب یُوں دیا جائے گا کہ مفلحون سے مراد کامل فی الفلاح نہیں۔ بنا بریں جو لوگ متقین کے ان اوصاف سے موصوف نہیں کہ ان کو فلاح کامل نصیب نہیں، نہ یہ کہ انھیں سرے سے فلاح حاصل نہیں۔

(کذا فی التفسیر البیضاوی)

تفسیر صوفیانہ حضرت شیخ نجم الدین دایہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ھدًی کو نکرہ کر کے اس لیے لایا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ وہ لوگ اپنے رب کے کشوف سے ایک کشف اور اس کے انوار سے ایک نور اور اس کے رازوں سے ایک راز اور اُس کے الطاف سے ایک لطف اور اس کے حقائق سے ایک حقیقت پر ہیں۔ کیونکہ وہ انعامات جو انبیاء عظام و اولیاء کرام پر اپنے کمال ذات وصفات اور انعام و احسان سے فرماتے ہیں۔ یہ تمام بہ نسبت اس کے جو کہ اس کے ہاں ہے اس کے بحرِ محیط سے ایک قطرہ ہے جس سے ہمیشہ ہمیشہ خرچ کرنے سے واقعی کمی نہیں ہوتی۔

حدیث شریف حضور انور فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ پُر ہے کہ جس کو شب و روز کی سخاوت کم نہیں کرتی۔"

اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ متقین اس ہدایت کے سبب سے بما اُنزل الیك و ما انزل من قبلك پر ایمان لاتے ہیں۔ اور آخرت پر بھی انہیں یقین ہے اور وہ ہیں بھی ایسے کامیاب کہ وہ نورِ نارِ حیاۃ سے وجود کے حجابات سے نجات پا کر آخرت کا مشاہدہ کر چکے ہیں اور ان کو عنایت ربانی کشش فرما کر مقاماتِ قربت اور اسرارِ پُر عزت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے اور کسی مرتبہ کو سوائے فناہیت کے نہیں چھوڑتے۔ ان حضرات نے سعادتِ عظمیٰ اور مملکتِ کبریٰ سے کامیابی پائی ہے اور درجۂ عالیہ کو حاصل کر چکے ہیں۔ اور قولِ حق ان کو محقق ہو چکا۔ حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں: ؎

گر ہمی خواہی کہ بفروزی چوں روز
ہستی ہمچوں شب خود را بسوز
ہستیت دہ بدست آں ہستی نواز
ہمچو مس از کیمیا اندر گداز

ترجمہ: اگر تُو چاہتا ہے کہ دن کی طرح چمکے اپنی ہستی کو رات کی طرح جلا دے۔ اپنی ہستی کو اُس ہستی نواز کے ہاتھ میں دے دے جس نے تانبے کو پگھلا کر سونا کر دیا۔

تفسیر عالمانہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ (ربط) جب خداوند قدوس نے اپنے مخصوص بندوں اور مخلص ولیوں کے ذکر کے ساتھ ان کے ان اوصاف (کہ جن کے سبب سے وہ ہدایت و فلاح کے اہل ہوئے) کا ذکر کیا تو بعد میں اُن کے ان اضداد سرکش اور نافرمانوں کو بیان فرمایا کہ جن کو نہ ہدایت نے نفع پہنچایا اور نہ آیات و نُذر نے فائدہ دیا۔

ف: اسم موصوف کی تعریف یا تو عہد کے لیے ہے تو اس سے مخصوص آدمی مراد ہیں جیسے ابولہب، ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور احبارِ یہود وغیرہم۔ یا جنس کے لیے ہے، اس صورت میں اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو کفر پر ایسے

مُصر ہیں کہ جن کے پھرنے کا امکان بھی نہ ہو اور غیر مُصر دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ مگر یہاں موصول کے مسند (سواءٌ علیھم) مُصرین سے مختص ہونے کی دلیل سے غیر مصرین مراد نہیں ہو سکتے۔

الکفر لغت میں بمعنے تغطیہ وستر ہے اور شریعت میں ان احکامات اور اعتقادات کے انکار کو کہتے ہیں جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لانا واضح طور پر معلوم ہو چکا ہے۔

سوال : لباس اغیار اور شد زنار بلا اضطرار و دیگر وہ شعائر کفریہ (جو ان دونوں کے مشابہ ہیں) کو کفر میں کیوں شمار کیا گیا ہے؟

جواب : چونکہ یہ چیزیں تکذیب پر دلالت کرتی ہیں بنا بریں یہ بھی کفر میں شمار کی گئی ہیں۔ کیونکہ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا دم بھرتا ہے تو اس کو ان اعمال کے ارتکاب کی جرأت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان اعمال کے ارتکاب کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے، جیسے زنا، شراب وغیرہ۔ اسی بنا پر یہ کفر میں شمار ہوئے نہ یہ کہ یہ تمام فی نفسہٖ کفر ہیں۔

ف : لفظ کافر قرآن پاک میں چار معنوں میں استعمال ہوا ہے،

(۱) نقیض المومن۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا

(۲) انکار از وجوب۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ۔ وہ جو کفر کرے تو اللہ عالمین سے بے نیاز ہے

یہاں پہ کفر بمعنے انکار عن وجوب الحج مراد ہے۔

(۳) نقیض الشاکر۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ۔ میرا شکر کرو میری ناشکری نہ کرو

(۴) بری ہونے والا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَیَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَکْفُرُ بَعْضُکُمْ بِبَعْضٍ۔ یعنی قیامت میں اے کافرو! تم ایک دوسرے سے برأت ظاہر کرو گے۔ (کذا فی التیسیر)

ف : بُغوی فرماتے ہیں کہ کفر کی چار قسمیں ہیں؛

(۱) کفر الانکار، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو جانتا ہو نہ اس کی ذات کا معترف ہو۔

(۲) کفر الجحود، وہ یہ کہ دل میں تو اللہ تعالیٰ کو خوب جانتا ہو مگر زبان سے معترف نہ ہو۔ جیسے ابلیس کا کفر۔

(۳) کفر العناد، وہ یہ کہ دل میں تو جانتا ہو مگر زبان سے اقرار نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَلَمَّا جَآءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِہٖ۔ لیکن اس عدم اعتراف کو اپنا دین نہ سمجھتا ہو۔ جیسے ابو طالب کا کفر۔ چنانچہ وہ کہتا ہے: ؎

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ دِيْنَ مُحَمَّدٍ

مِنْ خَيْرِ اَدْيَانِ الْبَرِيَّةِ دِيْنًا

لَوْلَا الْمَلَامَةُ اَوْحَذَارُ مُسَبَّةٍ

لَوَجَدْتَنِيْ سَمْحًا بِذَالِكَ مُبِيْنًا

یعنی بے شک مجھے علم ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین دنیا کے تمام ادیان سے بہتر ہے۔ اگر ملامت اور عرب کی گالیوں کا خطرہ نہ ہوتا تو میں اس دین کو واضح طور پر بیان کرتا۔

(۴) کفر النفاق، وُہ یہ کہ زبان سے اقرار، مگر دل میں اعتقاد صحیح نہ رکھتا ہو۔

مسئلہ: ان تمام انواع کا حکم یہ ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں حاضر ہوگا اگر ان چاروں میں سے کوئی ایک قسم اس میں پائی گئی تو اسے اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا۔

ف: ابو طالب کے متعلق ولا تسئل عن الاصحاب الجحیم کی تفسیر میں مفصل بیان آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ

سَوَاءٌ علیھم میں علیھم بمعنی عندھم اور سواءٌ اسم ہے بمعنے استواء۔ یہ بھی بطریق مبالغہ کے دوسرے مصادر کی طرح لغت میں بمعنے مستوٍ واقع ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

تعالوا الیٰ کلمۃٍ سواءٍ بیننا وبینکم۔ اس کا مرفوع ہونا ان کی خبر کی وجہ سے ہے۔

ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ اس کے مخاطب حضور علیہ السلام ہیں۔ اس کا مرفوع ہونا بر بنائے فاعلیت ہے کیونکہ ہمزہ اور لفظ ام کو ان کے مدخولین میں استواء کے معنے کو محقق کرنے کے لیے استفہامیت سے خالی کیا گیا ہے۔ جیساکہ قرآن پاک کی اس آیت استغفر لھم او لا تستغفر لھم میں امر و نہی کو اپنے معنے سے خالی کیا گیا ہے اور اللھم اغفر لنا ایتھا العصابۃ کو محض تخصیص کے لیے ندا سے خالی کیا گیا ہے گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور علیہ السلام کو کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا ان کو آپ کا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ جیساکہ کہا جاتا ہے،

ان زیدا مختصم اخوہ وابن عمہ الا نذار۔

در اصل اس اعلام کو کہتے ہیں کہ جس میں تخویف ہو۔ پس ہر منذر (ڈرایا ہوا) معلم (خبر دیا ہوا) ہوتا ہے لیکن ہر معلم منذر نہیں ہوتا۔ (کذافی تفسیر ابی اللیث) یہاں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور معاصی پر سزا ملنے سے خوف دلانا مقصود ہے۔

سوال: یہاں بدوں بشارت کے انذار پر اقتصار کیا گیا ہے، کیوں؟

جواب: یہ لوگ بشارت کے اہل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں انذار اور نفوس پر زیادہ اثر کن ہے، اس لیے کہ دفع ضرر جلب نفع سے اہم ہوتا ہے اور یہ لوگ نہ تو جلب نفع کے پیچھے لگے اور نہ بشارت کی طرف دھیان لگایا۔

سوال : یہاں پر سوائٌ علیھم کے بجائے سوائٌ علیك کیوں نہ فرمایا۔ جیسا کہ بت پرستوں کے لیے فرمایا : سوائٌ علیھم ادعوتموھم ام انتم صامتون ؟ پکارو یا چپ رہو تمہارے لیے برابر ہے

جواب : حضور علیہ السلام کے لیے انذار اور اعلام برابر نہیں تھا بلکہ آپ کو انذار کا ثواب ملتا تھا ، اگرچہ کفار ایمان نہ بھی لائیں بخلاف عبدۃ الاصنام کے کہ ان کے لیے دونوں امر برابر تھے۔ اس کی نظیر امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے کہ آمر کو تو ثواب حاصل ہوگا خواہ مامور اس پر عمل بھی نہ کرے۔ گویا یہ لوگ ہود علیہ السلام کی قوم کی طرح تھے کہ انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کو کہا :

سوائٌ علینا اوعظت ام لم تکن من الواعظین۔ ہمیں نصیحت کرو یا نہ کرو ہمارے لیے برابر ہے

اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتا ہے :

سوائٌ علیھم ..... الخ

اور یوم قیامت انہیں کہا جائے گا :

اِصلوھا فاصبروا اولا تصبروا سوائٌ علیھم انّما تجزون ماکنتم تعملون۔

اور اللہ تعالیٰ ان کے قول جو کہ وہ یوم قیامت میں کہتے ہوں گے سے خبر دیتے ہیں سوائٌ علینا اجزعنا ام صبرنا مالنا من محیص۔ یعنی ہمارے لیے نصیحت و ترکِ نصیحت دونوں برابر ہیں۔

ف : جوانی اور بڑھاپے میں یکساں نافرمان رہنا ، اسی طرح حالتِ مرض و صحت میں اور نعمت و محنت میں اپنے مالک سے اعراض کرتے رہنا۔ اسی طرح قریبی و بعیدی رشتہ داروں پر سنگ دل رہنا ، اسی طرح ظاہر و باطن میں ٹیڑھا رہنا وغیرہ مذکورہ افعال کے مرتکب کو ڈرنا چاہیے کہ جب اسے یہ افعال یکساں معلوم ہوتے ہیں تو کیا اسے ذیل کی باتوں سے کوئی بات بھلی لگتی ہے۔ موت کے وقت توبہ نصیب ہو یا نزع روح کے وقت گناہوں پر اصرار کرنا۔ اور پھر توبہ سے سکوت ، اولیاء اللہ کی زیارت یا اس سے محرومی اور مشکل امور میں سفارشی کا ہونا نہ ہونا۔ جب یہ باتیں یکساں اچھی نہیں لگتیں تو اس کے لیے گزشتہ افعال یکساں نہ ہونے چاہئیں بلکہ اچھے اعمال پر استقامت اور بُرے اعمال سے اجتناب چاہیے۔ (کذا فی تفسیر التیسیر)

لَا یُؤْمِنُوْنَ (ترکیب) یہ مستقل اور علیحدہ جملہ اور ماقبل کی تاکید کرنے والا ہے اور ماقبل میں جو استواءُ کے اعتبار سے ہمال تھا ، اس کو بیان کرنے والا ہے بنا بریں اس پر اعراب کا کوئی محل نہیں ہے۔

اس میں حضور علیہ السلام کے لیے تخفیف بھی ہے اور ان کو تسلی بھی دلائی جا رہی ہے کہ اے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ! آپ کو معلوم ہو کہ کفار ایمان نہیں لائیں گے۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے بہت طویل مدت نصیحت فرماتے اور دکھ درد اٹھاتے دیکھا تو فرمایا :

ے دوزخ میں داخل ہو کر صبر کرو یا نہ کرو تمہارے لیے برابر ہے تم اپنے کردار کی سزا بھگتو گے

لن یؤمن من قومك الا من قد اٰمن۔

جب نوح علیہ السلام کو اس خبر کا یقین ہُوا تو ان کی ہلاکت کے لیے دُعا فرمائی۔ اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوا۔

ف : اگر اسم موصول سے مخصوص لوگ مراد ہوں تو آیت میں غیبی خبر کا اظہار ہے۔ یہ بھی حضور علیہ السلام کا معجزہ ہے کہ قبل از واقعہ خبر دے دی۔

مسئلہ : آیت میں بندگان کے افعال کا ثبوت ہے کیونکہ لا یؤمنون کے فاعل بندگان ہی ہیں۔ آیت سے ثابت ہوا کہ بندہ کفر اپنے خیال سے کرتا ہے نہ اس پر جبر ہوتا ہے نہ اکراہ، ورنہ فرماتا:

لا یستطیعون۔ بلکہ فرمایا، لا یؤمنون۔

سوال : جب اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ کفار ایمان نہیں لائیں گے تو پھر اپنے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کے لیے کیوں تکلیف دی؟

جواب : جاننے کے باوجود انذار کا حکم الزام حجت کے لیے تھا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی ہدایت کے لیے بھیجا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ فرعون ایمان نہیں لائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

رُسُلاً مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔

اور فرمایا وَلَوْ اَنَّآ اَھْلَکْنٰھُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِہٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ۔

ہم نے اس سے پہلے انہیں عذاب سے ہلاک کیا تو کہتے کہ ہمارے ہاں رسل کیوں نہ بھیجے کہ ہم تیری آیات کی اتباع کرتے

سوال : جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے تو پھر خبر دے کر انہیں ہلاک کیوں نہ کیا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو کفار کے حال کی خبر دے کر انہیں ہلاک کر دیا۔

جواب : چونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ اور فرمایا:

وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم وما کان اللہ معذبھم وھم یستغفرون۔

بنا بریں نہ انہوں نے عذاب کی دُعا مانگی اور نہ اللہ تعالیٰ نے کفار پر عذاب بھیجا۔

ف : کسی چیز کے وقوع و عدمِ وقوع کی خبر دینے سے اس پر بندہ کی قدرت کی نفی نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے فعل یا کسی بندے کا اس کے اپنے اختیار سے کسی فعل کی خبر دے تو اس سے تکلیف مالایطاق کا جواز لازم نہیں آتا۔

تفسیر صوفیانہ

امام قشیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنی صفت کے پردہ میں شہودِ حق سے محجوب ہوتا ہے اس کو یہ دونوں قول (ایک جو اسے حق کی راہ دکھائے، دوسرا وہ جو اسے حظِ نفسانی کے منافع حاصل کرنے پر امداد کرے) برابر معلوم ہوتے ہیں بلکہ ایسا شخص دائمی غفلت کی طرف زیادہ مائل

ے رسول کرام بھیجے خوشخبری دیں ڈرائیں تاکہ رسل کرام آنے کے بعد اللہ کی لوگوں پر کوئی حجت نہ ہو۔

ہوتا ہے اور غفلت کی طرف زیادہ کان دھرتا ہے۔ جیسا کہ کافر (کہ جسے ازل سے بدبختی نصیب ہوئی وہ بھی شہود و غیب اور حق سے محجوب رہتا ہے۔ پھر وہ نہ تو راہِ راست کو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اس پر چلنے کا قصد کرتا ہے۔ اور فرمایا جو شخص وادیِ ظلمات میں جا پڑتا ہے تو اس کے سامنے ناصح کی نصیحت اور گمراہ کن لوگوں کی گمراہی یکساں معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے احوال سے اللہ تعالیٰ نے انصاف (حق و باطل کی تمیز) کی برکات چھین لی ہیں۔ اسی لیے وہ دائمی ارشاد کی طرف دل بھی نہیں لگاتا۔ جیسا کہ مقولہ مشہور ہے:

وَعَلَى النَّصُوحِ نَصِيحَتِيْ وَعَلَىٰ عِصْيَانِ النَّصُوحِ۔ نصوح کو میری نصیحت تو پہنچی لیکن نصوح گناہ پر کمربستہ ہے

تفسیر عالمانہ

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ (ربط) جب اللہ تعالیٰ نے کفار کی صفات اور ان کے حالات ذکر فرمائے تو بعد ازاں ان کی سزاؤں کا بیان شروع فرمایا گویا یہ آیت مضمونِ سابق کی بمنزلہ تعلیل کے ہے۔

حلِ لغات: ختم بمعنے چھپانا۔ شے کو مہر لگا کر پختہ کرنے کو ختم اس لیے کہا جاتا ہے کہ گویا اسے آخری منزل تک پہنچا کر لوگوں کی نگاہوں سے چھپایا گیا ہے۔ قرآن مجید کے ختم کو بھی اسی لحاظ سے ختم کہا جاتا ہے کہ یہ آخری فعل تھا کہ جہاں ہم اسے جمع کرتے کرتے آخر کو پہنچے، یہاں حقیقۃً ختم کرنے کا معنیٰ نہیں بنتا۔

سوال: کفار کے قلوب پر مہر لگانے کا کیا معنیٰ ہے؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں ایک ایسی ہیئت موجود ہے جو انہیں کفر کو پسند اور گناہوں پر جرأت کرنے اور ایمان اور طاعات کو قبیح سمجھنے پر مجبور کرتی ہے اس لیے کہ ان پر گمراہی سوار ہے اور تقلید کفر میں منہمک ہیں اور صحیح نظر کے استعمال سے دور پھرتے ہیں۔ بنا بریں ان کے قلوب نہ تو اب انذار سے گھبراتے ہیں اور نہ ہی ان پر حق اثر انداز ہوتا ہے، استعارۃً اسے ختم سے تعبیر کیا گیا۔ دوسری آیت میں اس ہیئت کو طَبع سے تعبیر کیا گیا ہے کما قال اللہ تعالیٰ:

طبع اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم۔ اللہ نے انکے قلوب کانوں اور آنکھوں پر مہر لگائی

اور ایک مقام پر اسے اغفال (غافل کر دینا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

ولا تطع من اغفلنا قلبہٗ عن ذکرنا۔ اور اس کی اطاعت نہ کرو جس کے قلب پر ہم نے اپنے ذکر سے غفلت کی مہر لگائی ہے۔

اور ایک مقام پر اسے اقساءً (دل کھوٹا کرنا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

وجعلنا قلوبھم قاسیۃً۔ (اور ہم نے ان کے دل کھوٹے بنا دئے)

سوال: کیا وجہ ہے کہ ان کا اسناد کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اور کبھی کفار کی طرف؟

جواب: چونکہ تمام ممکنات کا وجود اس باری تعالیٰ کی قدرت سے ہے۔ اس اعتبار سے ان کا اسناد

اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے۔ اور پھر چونکہ ان کے اسباب خود کفار نے بنائے، بنا بریں ان کی طرف ان کا اسناد ہوتا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ :

بل طبع اللہ علیہا بکفرھم ۔ (بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگائی)

اور فرمایا :

بانّھم اٰمنوا ثمّ کفروا فطبع علیٰ قلوبھم ۔ (بایں وجہ کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہوئے تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی)

ف : یہ آیت ختم اللہ علیٰ قلوبھم .... الخ ان کی بُری صفات کو ظاہر کرنے اور ان کے بُرے انجام کو بیان کرنے کے لیے ہے۔

حلِ اشکال : یہ مُہر لگانا اُن کے کُفر کی جزا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ہدایت کے راستے آسان فرما دیے لیکن وہ ان سے عمداً روگرداں رہتے ہیں۔ اب وہ اعتراض خود بخود رفع ہوگیا جو کہا جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگا دی ہے تو ہدایت پانے سے تو معذور ہو گئے پھر ان کو سزا کا کیا معنیٰ !

ف : شیخ نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ لفظ ختم کا اسناد اللہ تعالیٰ کی جانب اسی لیے ہے تاکہ تنبیہ ہو جائے کہ کفار کا حق قبول کرنے سے منکر ہو جانا ایسے ہے کہ یہ عادت ان کی پیدائشی ہے نہ کہ عارضی۔ اور تیسیر تفسیر میں ہے کہ کفار کے قلوب وغیرہ پر مُہر لگ جانا اہلِ حق کے نزدیک عقوبتِ الٰہی ہے جو کہ نہ تو بندے کو ایمان سے روکتی ہے اور نہ یہ کفر پر مجبور کرتی ہے۔ بلکہ یہ انہیں اس بات کی سزا ملی ہے جو انہوں نے اپنے اختیار اور سرکشی سے اختیار کی۔ (یعنی کفر)، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے اُس لطف سے محروم ہو گئے جو اس نے ان کے لیے راہِ ہدایت آسان فرمایا تاکہ اس کی وجہ سے ایمان کی دولت سے نوازے جاتے اور کفر جیسی مصیبت سے محفوظ ہو جاتے۔

مسئلہ : اس سے ثابت ہو گیا کہ ایمان لانے کے خطاب کا جو اللہ تعالیٰ نے عموماً حکم فرمایا :

اٰمنوا باللہ ورسولہ ۔ (ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر)

میں داخل ہیں اور جو اس نے عموماً کفر سے اپنے ارشادِ گرامی میں فما لھم لا یؤمنون (ان کے لیے کیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے) روکا ہے روکے گئے ہیں۔ اگر وہ ایمان لانے سے مجبور محض اور بالکل عاجز ہوتے تو ان کو نہ ہی خطاب ہوتا نہ ہی زجر و توبیخ کی جاتی۔ جیسے قیامت میں ان کے منہ پر مُہر لگ جائے گی اور وہ بول نہ سکیں گے۔ پھر چونکہ وہاں وہ لوگ حقیقۃً کلام کرنے سے عاجز ہوں گے اسی لیے ان سے خطاب نہیں ہوگا۔

مسئلہ : اس سے ثابت ہوا کہ بندہ اپنے افعال میں مختار ہے اگرچہ ان افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

حلِ لغات : القلوب، قلب کی جمع ہے بمعنے دل۔ اور قلب کو اس لیے قلب کہا جاتا ہے کہ وہ جملہ امور میں منقلب اور جملہ اعضا میں متصرف ہے۔ شیخ کی تفسیر میں ہے کہ قلب ایک گوشت کا ٹکڑا ہے صنوبری شکل کا، رگِ ذہنین

کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا ہے۔ اور وتین ایک رگ ہے جو قلب کے اندر ہے۔ جب بندہ مرتا ہے تو اسے کاٹ دیا جاتا ہے اسے ابہر بھی کہتے ہیں۔

اور تفسیر کواشی میں ہے کہ قلب دل ہیں کالے رنگ کا ایک گوشت کا ٹکڑا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صنوبری شکل کا ہے جو وتین کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا ہے۔

تعریفات سید میں ہے کہ قلب ایک لطیفۂ ربانی ہے، اسے اسی دل سے تعلق ہے جو صنوبری شکل کا سینہ کی دائیں جانب رکھا ہوا ہے۔ اور اسی لطیفہ کو ہی حقیقتِ انسان کہا جاتا ہے۔

عارف جامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ؎

نیست ایں پیکر مخروطی دل
بلکہ ہست ایں قفس طوطیِ دل
گر تو طوطی ز قفس نشناسی
بخدا ناس نۂ نسناسی

ترجمہ: یہ ٹیلے جیسی شکل والا جسم نہیں ہے بلکہ دل کی طوطی کا یہ پنجرہ ہے۔ اگر تو پنجرے میں سے طوطی کو نہ پہچانے خدا کی قسم تو انسان نہیں بلکہ نسناس ہے۔

آیت میں قلب سے دل کی قوتِ عاقلہ کا محل مراد ہے۔ کبھی اس سے معرفت اور عقل مراد لی جاتی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ۔ (بیشک اس میں اس کے لیے نصیحت ہے جس کا دل ہے)

یا مُہر لگائی ان کے کانوں پر۔ ان کے کانوں کو ایسا کر دیا کہ وہ حق کے سننے سے بالکل معطل ہو چکے ہیں اور نہ ہی حق کی طرف لو لگاتے ہیں نہ اسے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں گویا انہیں مُہر لگا کر حق سننے سے محفوظ کر لیے گئے ہیں یہ ان پر سزا ہے بوجہ اس کے کہ انہوں نے بُرائی کو اختیار کیا اور باطل کی طرف رجوع کیا۔ بلکہ حق پر باطل کو ترجیح دی۔

اور سمع قوتِ سامعہ کے ادراک کا نام ہے۔ کبھی اس قوت پر اور کبھی اس عضو پر جو اس قوت کا حامل ہے پر بھی اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہاں پر یہی عضو مراد ہے کیونکہ مہر لگانے کا یہی معنیٰ مناسب ہے۔ اور مُہر بھی اسی پر لگائی گئی۔

سوال: قلوب کو جمع اور سمع کو واحد کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: اس کے کئی جواب ہیں۔ (۱) سمع دراصل مصدر ہے اور مصدر نہ تثنیہ ہوتا ہے نہ جمع۔ اس لیے کہ مصدر میں ہر سہ معانی یعنی واحد تثنیہ جمع کی صلاحیت ہے۔ قال تعالیٰ:

(اِنَّہُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّ اَکِیْدُ کَیْدًا)۔ (بیشک وہ مکر کرتے ہیں اور میں ان کے مکر کی انھیں سزا دُوں گا)

سوال : لفظ بصر کو واحد اور جمع کے ساتھ کیوں استعمال کیا گیا حالانکہ وہ بھی تو سمع کی طرح مصدر ہے۔
جواب : (۱) بصر' عین کا اسم ہے۔ جب وہ اسم ہوا تو مصدریت ختم ہو گئی اس کے بعد اسے جمع لانا بھی جائز ہو گیا۔

(۲) (برائے سوال نمبر ۱) یہاں دراصل مضاف محذوف ہے۔ اصل میں عبارت یوں تھی:
ای علیٰ مواضع سمعھم و حواسہ۔ (ان کی سمع و حواس کی جگہوں پر)

جیسے اس آیت میں مضاف محذوف ہے قال تعالیٰ : واسئل القریۃ ای اھل القریۃ۔ اس محذوف سے ثابت ہوا کہ سمع فعل ہے اور فعل پر مُہر نہیں بلکہ محلِ فعل پر لگائی جاتی ہے۔

(۳) سمع سے سارے کافر مراد ہیں اس لیے کہ جمع کی طرف مضاف کرنے سے تمام افراد مراد ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں واحد کے صیغے میں التباس نہیں ہوتا' جیسے کُلُوا فِی بَعْضِ بطنکم ای بطونکم کیونکہ ایک بطن سب کو مشترک نہیں۔

(۴) سیبویہ کا قول ہے کہ یہ دو جموں یعنی قلوب و ابصار کے درمیان واقع ہوا ہے فلہٰذا اس کی دلالت بھی جمع پر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : یخرجھم من الظلمات الی النور، ای الی الانوار۔ یہاں ظلمات جمع کی وجہ سے نور بمعنے انوار ہوگا۔ (انہیں ظلمات سے انوار کی طرف نکالتا ہے)

سوال : مُہر کے لیے قلوب کا ذکر پہلے کیوں ہے ؟
جواب : تاکہ پتا چلے کہ ایمان نہ لانے میں اصل دل ہے باقی اعضاء اس کی فرع ہیں۔
سوال : سمع کو ابصار پر کیوں مقدم کیا گیا ہے؟
جواب : اس لیے کہ سمع اور قلوب کا آپس میں اشتراک ہے بخلاف ابصار اور قلوب کے۔

ف : سمع بصر سے افضل ہے کیونکہ قرآن پاک میں اول سمع کا ذکر کیا گیا ہے بعد کو بصر کا۔ دوسرا یہ کہ کوئی نبی بہرا پیدا نہیں کیا گیا۔ اس بنا پر سمع نبوت کی شرط واقع ہوئی بخلاف بصر کے۔ تیسرے یہ کہ سمع بھی عقل کی تکمیل ہے اس لیے کہ وہ حصولِ عرفان کے لیے عقل کو مدد دیتی ہے۔

وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ ۔ الصار' بصر کی جمع ہے۔ بصر آنکھ کے ادراک کو کہتے ہیں۔ کبھی مجازاً قوتِ باصرہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور اس معروف کو بھی کہا جاتا ہے اور یہاں پر یہی مراد ہے اس لیے کہ پردہ آجانے کے لیے عضو کا معنیٰ زیادہ مناسب ہے۔ **غِشَاوَةٌ** بمعنی پردہ۔ اور یہاں پر حقیقی پردہ مقصود نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اُن کی آنکھوں پر ایک ایسی حالت پیدا کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ آنکھیں آیاتِ ربانیہ (جو ان کے نفوس اور زمانہ میں پائی جاتی ہیں) کا ادراک نہیں کر سکتیں جیسے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کا کام ہے گویا کہ اُن پر پردہ آگیا ہے جس کی وجہ سے وہ اشیاء کو نہیں دیکھ سکتیں۔ غشاوۃ کو نکرہ لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی آنکھوں پر ایک

قسم کا پردہ ہے جو عرفی معنے کے برعکس ہے۔ یعنی آیاتِ ربانیہ سے اندھا ہوجانا۔ غشاوۃٌ مبتدأ مؤخر اور علیٰ ابصارھم اس کی خبر مقدم ہے۔

سوال: قلوب اور سمع کے لیے مہر اور ابصار کے لیے پردہ۔ اس کا کیا مطلب ہے۔

جواب: قلب اور سمع کا ادراک جمیع جوانب سے ہوتا ہے۔ اسی لیے ان پر مہر لگانا جمیع جوانب کے لحاظ سے ہے اور بصر کا ادراک جانبِ مقابل سے ہوتا ہے اسی لیے اس کے لیے پردہ اس کے مقابلہ کے اعتبار سے ہے۔

ف: تیسیر میں ہے آیت میں قلوب، سمع، ابصار کا ذکر اس لیے ہے کہ خطاب ان تینوں کے اعتبار سے ہے۔ کما قال تعالیٰ:

(۱) افلا تعقلون (کیا نہیں سمجھتے ہو)
(۲) افلا تبصرون (کیا نہیں دیکھتے ہو)
(۳) افلا تسمعون (کیا نہیں سنتے ہو)

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (حلِ لغات) یعنی وہ عذاب جو شدید القوۃ ہے اسی سے عظم (ہڈی) کو لیا گیا ہے اور عذاب وزن اور معنے کے لحاظ سے نکالٌ کی طرح ہے۔ عرب میں کہتے ہیں:

اَعْذَابُ عن الشیٔ۔ (وہ فلاں شے سے زیادہ روکنے والا ہے)

یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کو کسی شے سے روکا جائے۔ اور عذاب کو عذاب بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ عاقل اگر تامل سے کام لے تو یہ عذاب اسے برائی سے روک لیتا ہے اور اسی سے اَلْمَاءُ الْعَذْب کو لیا گیا ہے کیونکہ میٹھا پانی پیاس کو ہٹا دیتا ہے بخلاف ملح (نمکین پانی) کے کہ وہ پیاس کو الٹا بڑھاتا ہے۔ اس پر یہ علامت بتاتی ہے کہ انہوں نے (میٹھے) پانی کا نام نقاح رکھا ہے کیونکہ یہ پیاس کو ہٹاتا ہے۔ اور فرات کو اسی لیے فرات کہتے ہیں کہ وہ دل کو تسکین بخشتا ہے اور فرات میٹھے پانی کو کہتے ہیں۔ رفت سے ماخوذ ہے۔ یعنی قلب۔ اور بعض نے کہا: عذاب کو عذاب اس لیے کہا گیا کہ یہ اس کی وہ جزا ہے جس سے اس کا دل خوش ہوا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فذوقوا عذابی۔ (پس میرے عذاب کو چکھو)

سوال: چکھنا تو اچھی شے کے لیے ہوتا ہے اور یہاں اچھائی کیسی؟

جواب: یہ اس اچھائی کی جزا ہے جو اس نے دنیا میں اپنی خواہش پوری کرنے پر عمل میں لائی۔ اور العظیم، حقیر کی نقیض ہے۔ اسی اعتبار سے عظیم کبیر سے فوق ہوگا جیسا کہ حقیر، صغیر سے کم ہے۔

ف: تفسیر تیسیر میں فرمایا کہ عظیم بمعنے کبیر یا کثیر یا دائم ہے۔ یعنی دوزخ میں ہمیشہ کے لیے عذاب دینا۔ چونکہ وہ عذاب بہت بڑا ہوگا۔ اسی وجہ سے اسے عظیم سے موصوف کیا گیا۔ اور اس میں دوزخیوں کی بیڑیاں اور زنجیر بڑے بڑے

ہوں گے۔ اس لیے یہ آیت بمنزلہ وعید کے ہوگی اور جس کے وہ آخرت میں مستحق ہیں اس کا بیان ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دُنیا میں قتل اور قید کی سزا اور آخرت میں جہنم کی آگ میں جلانا، اور عظیم سے اسی لیے موصوف کیا گیا کہ اس کے ہم جنس پر قیاس کیا جاسکے۔ اور نکرہ بھی اس لیے کہ ان کو اتنا بڑا عذاب ہوگا کہ جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ سمجھدار کو چاہیے کہ وہ عذاب الیم اور عقابِ عظیم سے بچتا رہے۔ یعنی گناہوں پر اصرار نہ کرے اور نہ ہی کسی گناہ کا ارتکاب کرے۔ بعض نے کہا ہے اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ زبان کو ہر برائی سے روکے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں؛ ؎

بگراہ گفتن نکو میروی

گناہ بزرگست وجور قوی

مگو شہد شیریں شکر فائقست

کسی راکہ سقمونیا لائقست

(ترجمہ: کسی کو گمراہ کہنا بہت اچھی روش ہے درحقیقت گناہ بڑا اور ظلم قوی ہے۔ یہ بات مت کہو کہ میٹھا شہد شکر سے بڑھ کر ہے اس شخص کے لیے کہ جس کی طبیعت کے لیے سقمونیا (زہریلی دوائی) زیادہ لائق ہے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
بنی آدم کے قلوب لوہے کی طرح زنگ آلود ہوجاتے ہیں۔

عرض کیا گیا: ان کی صفائی کا کیا علاج ہے؟

آپ نے فرمایا: ۱۔ تلاوت قرآن ۲۔ کثرتِ ذکر اللہ ۳۔ کثرتِ ذکرِ موت۔

ف: تمام گناہوں کی اصل تین چیزیں ہیں؛

(۱) حرص

(۲) حسد

(۳) کبر

پھر ان تین چیزوں سے چھ اور حاصل ہوجاتی ہیں جس سے کل نو ہوئیں:

۱۔ سیر ہو کے کھانا ۲۔ نیند بہت کرنا

۳۔ دنیوی راحت کے درپے رہنا ۴۔ مال

۵۔ مرتبہ ۶۔ حکومت کی محبت

حُبِّ مال وریاست بہت بڑے گناہ ہیں جو اپنے صاحب کو کفر و ہلاکت کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں۔

حکایت ایک نوجوان بادشاہ نے اپنے خادموں سے کہا مجھے بادشاہی کرنے میں بڑی راحت ہوتی ہے (بتاؤ) کیا تم لوگ بھی لذّت پاتے ہو یا صرف مجھے اس کی لذّت محسوس ہوتی ہے؟ سب نے کہا ہم لوگ بھی بادشاہی سے متلذذ ہوتے ہیں۔ اس نے کہا، تو پھر کیا کوئی ایسی تجویز ہے کہ جس سے مجھ سے یہ بادشاہی نہ چھنے اور میں ہمیشہ کے لیے بادشاہ رہوں۔ انہوں نے کہا، ہاں ایک تجویز ہے، وہ یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سرگرم رہیں اور اس کی نافرمانی سے کنارہ کش رہیں۔

اس پر اُس نے اپنے شہر کے تمام علماء و صلحاء بلائے اور اُن سے کہا کہ تم لوگ میرے نگران رہو، جو کام نیک ہوں اُن کا مجھے حکم دو اور جو بُرے ہوں اُن سے مجھے روکے رہو۔ چنانچہ وہ اسی طرح کئی سال عامل رہا جس کی برکت سے اس کو چار سو سال بادشاہی کرنا نصیب ہوئی۔ ایک دن اس کے پاس ابلیس ملعون انسانی شکل میں آ پہنچا اور آ کر پوچھا: آپ کون ہیں؟ بادشاہ نے کہا: بنی نوع انسان سے ایک انسان ہُوں۔ اُس نے کہا: نہیں، اگر آپ بنی آدم سے ہوتے تو جس طرح باقی لوگ مر چکے ہیں آپ بھی مر چکے ہوتے، بلکہ آپ تو معبود ہیں، آپ کو چاہیے کہ آپ تمام لوگوں سے اپنی پرستش کرائیں۔ یہ بات بادشاہ کے دل میں اُتر گئی۔ چنانچہ اس نے ایک دن منبر پر علی الاعلان کہا کہ اے لوگو! اب تک جو بات میں نے تم سے چھپائے رکھی تھی اب اس کے اظہار کا وقت آگیا ہے۔ وہ یہ کہ میں تم لوگوں کا عرصہ دراز سے مالک بنا بیٹھا ہُوں۔ اگر میں بھی بنی آدم ہوتا تو مجھ پر موت آ جاتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ میں بنی آدم سے نہیں ہُوں بلکہ تمہارا خدا ہوں، اب تمہیں میری عبادت کرنی چاہیے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے نبی کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا کہ آپ اس بادشاہ کو متنبہ کر دیں کہ میں نے اسے بادشاہی اس لیے دے رکھی تھی کہ اس نے میری عبادت سے منہ نہیں پھیرا تھا، اب جبکہ اس نے میری اطاعت سے منہ پھیر لیا ہے میں بھی اس سے بادشاہی چھین کر اس پر بخت نصر (بادشاہ) کو مسلّط کرتا ہُوں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا اور اس پر اسی روز سے بخت نصر غالب آگیا، اس نے اس کی گردن مار دی، اور اس کے خزانہ کو اٹھانا شروع کیا۔ اس سے ستر کشتیاں سونے کی برآمد ہوئیں (علاوہ دیگر سامان کے)۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

جز عنایت کے کشد چشم را
جز محبت کے نشاند خشم را
جہد بے توفیق خود کس را مباد
در جہان واللہ اعلم بالرشاد

(ترجمہ: مہربانی کے سوا وُہ اپنی آنکھ کو کب کھولتا ہے اور محبت کے سوا وہ غصہ کو کب پیتا ہے اس کی توفیق کے بغیر کس کی طاقت ہے دُنیا میں ہدایت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے)

تفسیر صوفیانہ ختم میں سوابق احکام قدر کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا خلیفہ کے لیے بموافق حکمت اور ارادۂ ازلیہ سعادت وشقاوت کے ساتھ آغاز ہوا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

فمنھم شقیٌّ و سعید - (بعض ان میں بدبخت اور بعض نیک بخت ہیں)

باوجودیکہ ان میں ایمان وکفر قبول کرنے کی بہتر استعداد پائی جاتی تھی۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذرات کو اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے خطاب سے مخاطب فرمایا تو ان سب نے بلیٰ کہا۔ پھر ان ذرات کو ان کے قلوب میں امانۃً رکھا۔ پھر قلوب کو اجسام میں اور اجسام کو دُنیا میں، گویا ذرّات کو تین اندھیروں میں بند کیا گیا۔ پھر دل کا دریچہ عالمِ غیب کی طرف بواسطہ ذرّات کے کھُلا رہتا ہے جو کہ امانت رکھے ہوئے ہیں جنہوں نے اللہ کے خطاب کو سُنا اور کمالِ حق کا مشاہدہ کیا یہاں تک کہ بچے کی ولادت ہوتی ہے۔

حدیث شریف جیسا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنائیں یا نصرانی یا مجوسی۔

اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اشقیاء کو والدین کی تربیت میں سپرد فرماتا ہے اَنْتُمْ وَ اٰبَاؤُکُمْ فی ضلالٍ مبین - اس بنا پر اس کی شقاوت مقدرہ تقلید اور صفات نفسانیہ ظلمانیہ اور خواہش و طبیعت میں مضمر تھی۔ پھر اس شقاوت کی تاثیر وظلمت اور میل کچیل دل میں داخل ہو کر اس میں شقاوت اور سیاہی پیدا کر دیتی ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتی ہے یہاں تک کہ وہ دریچہ جو ذرّات کی طرف کھلا ہوا تھا اسے بند کر دیتی ہے جس کی وجہ سے دل اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اہلِ شقاوت نہ تو ذرات کے ساتھ (جو بجانبِ حق تھے) دیکھ سکتے ہیں اور نہ سُن سکتے ہیں۔ اسی بنا پر انبیاء علیہم السلام کا انکار کرتے ہوئے کفر کر بیٹھتے ہیں اور نہ ہی ان کے فرامین مقدسہ کی طرف دھیان رکھتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس پر اس کے کفر کی وجہ سے اُن پر شقاوت کی مُہر لگاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا :

بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ - (ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگائی)

تقدیر ایک پوشیدہ راز ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ سعادت مندی کے آثار سعادت مندوں کے اقرار اور بدبختی کے آثار بدبختوں کے انکار سے ظاہر ہوتے ہیں۔ تقدیر سے انکار کرنے کی مثال بیج جیسی ہے جو زمین میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ اس کا اظہار شجر کی وجہ سے ہوگا۔ کیونکہ وہ شجرہ میں مستور ہے۔ اب درخت سے خارج ہو کر ٹہنیوں میں جاگزین ہے لیکن ہے پوشیدہ۔ یہاں تک کہ ٹہنیوں سے خارج ہو کر ثمرہ کی شکل میں آجاتا ہے لیکن اب بھی مخفی ہے۔ یہاں تک کہ ثمرہ سے ظاہر ہو گیا اور بیج کے ظہور کا خاتمہ ہو گیا ثمرہ کی وجہ سے۔ اسی طرح تقدیر کا راز ہے اور یہ بھی سعادت وشقاوت کا بیج ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں پوشیدہ ہے یہاں تک کہ انسان کے وجود کے شجرہ سے ظاہر ہوا۔ پھر اس انسانی شجرہ میں وہی سعادت وشقاوت پوشیدہ رہی، پھر اس کا ظہور اخلاق کی ٹہنیوں سے ہوا لیکن وہی

(باقی برصفحہ ۱۳۳)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ ؕ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ
اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ۬ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ
قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ
لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا
مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝
مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّاۤ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ
فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ صُمٌّ ۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ ۙ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ
فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ
وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا
فِيْهِ ۙ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ع

ترجمہ : اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہیں اور وہ ایمان والے نہیں فریب دینا
چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو اور انہیں شعور نہیں ان کے
دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ان کے جھوٹ کا
بدلہ ہے اور جو ان سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں خبردار وہی فسادی ہیں
مگر انہیں شعور نہیں اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کیا ہم احمقوں کی طرح
ایمان لے آئیں خبردار وہی احمق ہیں مگر جانتے نہیں اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے
اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو یونہی ہنسی کرتے تھے اللہ ان سے

استہزا فرماتا ہے جیسا اس کی شان کے لائق ہے اور انھیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہیں - یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ نہ جانتے تھے ان کی کہاوت اس طرح کی ہے جس نے آگ روشن کی تو جب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ انہیں کچھ نہیں سوجھتا وہ بہرے گونگے اندھے ہیں تو پھر وہ آنے والے نہیں یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں بوجہ کڑک کے موت کے خطرہ سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اُچک لے جائے گی۔ جب کچھ چمک ہوئی تو اس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا تو کھڑے رہ گئے اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۳۱) بیج اب بھی ان ٹہنیوں میں پوشیدہ ہے۔ اب وہ اعمال کے ثمرہ میں ظاہر ہونے لگی۔ یعنی اقرار و انکار اور ایمان و کفر۔ اب جبکہ ان کا ظہور ہو گیا تو تقدیر کے راز پر مہر لگ گئی اور وہی یعنی سعادت و شقاوت ثمرۂ ایمان و کفر سے ظاہر ہوئی۔ پس تقدیر کا راز سعادت و شقاوت کی مہر لگانے سے ظاہر ہو گا۔ پس جن لوگوں کے دلوں پر کفر کی مُہر لگائی اگرچہ اس مُہر کے نقش احکام ازلیہ اور تقدیر کے راز سے ہیں یہاں تک کہ وصال کی دولت سے محروم ہو گئے۔ اسی سے ان کے کانوں پر مُہر لگائی کہ اب وہ مالکِ ذوالجلال کے خطاب کو نہیں سُن سکتے اور ان کی آنکھوں پر اندھا پن اور گمراہی کے پردے ہیں کہ اب وہ اس جلال و کمال کو نہیں دیکھ سکتے۔

تفسیر آیاتِ صفحہ گزشتہ :

تفسیر عالمانہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ (ربط:) جب باری تعالیٰ نے اپنی مبارک کتاب کے حال کی شرح کا آغاز فرمایا تو اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو اس کی خاطر دین کو خالص کرنے والے ہیں اور اس معاملہ میں اُن کی زبانیں اُن کے قلوب کے موافق ہیں۔ پھر دوسرے نمبر پر ان لوگوں کا بیان ہوا جنہوں نے ظاہراً و باطناً کفر سے حصّہ لیا اور تیسرے نمبر پر ان لوگوں کا ذکر ہوا جو نمبر میں تیسرے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے صرف زبان سے ایمان کا اظہار کیا لیکن ان کے قلوب نعمتِ ایمان سے بہرہ ور ہیں۔ اس تیسرے گروہ کا بیان تقسیم کی تکمیل کے لیے ہے۔

ف : یہ منافق کفار سے بہت زیادہ خبیث اور اللہ کے نزدیک مبغوض ترین لوگ ہیں کیونکہ انہوں نے فریب اور استہزا کرتے ہوئے کفر میں خلط ملط کر دیا اس لیے ان کی خباثت بیان کرنے میں طوالت کی گئی۔

نکتہ : قاشانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کفار (جو اپنے کفر پر اصرار کرنے والے ہیں اور ان کے دلوں پر

مہر لگ چکی ہے) کے ذکر میں صرف دو آیتوں پر اکتفا کرنے اور منافقین کے اوصاف (قبیحہ) بیان کرنے میں تیرہ آیتوں کو لانے میں نکتہ یہ ہے کہ کفار سے پوری طرح اعراض اس لیے کیا گیا ہے کہ اب ان میں نہ کلام اثر کرتا ہے اور ان کو خطاب فائدہ پہنچاتا ہے بخلاف منافقین کے کہ کبھی ان میں توبیخ و تعییر اثر کر جاتی ہے اور ان پر طعن و تشنیع اور ان کو اپنے حالات و عادات اور اندرونی امراض و خباثتِ نیت ظاہر کرائے جانے میں ہو سکتا ہے کہ شاید اس طریق سے اپنی بُری عادات سے باز آجائیں اور ان کی صورتِ حال کو قبیح طرز میں بیان کرنے اور ان کو اور ان کے بُرے طریقوں کو بُری مثالوں سے انہیں رد کا جا سکتا ہے۔ اس طرز سے اُن کے قلوب نرم ہو جائیں گے اور ان کے نفوس فرمانبرداری میں آجائیں گے اور وہ رذائل کہ جن میں وہ خراب ہو رہے ہیں اُن سے دُور ہو جائیں گے۔ پھر وہ اس دائرہ میں آسکیں گے جس کو اللہ تعالیٰ نے اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا میں بیان فرمایا ہے۔

النّاس، انسان کی جمع ہے۔ انسان کو انسان اس لیے کہا گیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھلا دیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔

اس معنے پر اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ کی تفسیر میں آیا ہے کہ لکنود بمعنے نعمتوں کو بُھلا دینے والا اور تکالیف کو بہت زیادہ یاد کرنے والا۔

بعض کہتے ہیں کہ انسان کو انسان اس لیے کہا گیا کہ وہ ان کے ظہور کی وجہ سے اُنس بمعنے اَلْبَصَر سے مشتق ہے اور یہ ظاہر ہیں اور نظر آنے والے ہیں اس لیے ان کو بشر بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ جنّات کو جِنّ کہا گیا ہے ان کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے۔ یعنی وہ لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اُنس سے مشتق ہے (جو کہ وحشت کی ضد ہے) کیونکہ وہ اپنے ہم جنس سے مانوس ہوتے ہیں، یا اس لیے کہ ان کے ارواح اُن کے اجسام سے اور ان کے اجسام ان کے ارواح سے مانوس ہیں۔

قانون: الناس میں لام جنس کی ہے اور مَن یقول میں مَن موصوفہ ہے کیونکہ کوئی مخصوص انسان مراد نہیں۔ گویا کہ کہا گیا ہے ومن الناس ناسٌ یقولون یعنی صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں۔

القول۔ (قول کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے:)

۱۔ مفید کلام بولنا

۲۔ مقول (یعنی مصدر بمعنے مفعول)

۳ - وہ معنیٰ جو نفس میں متصور ہوتا ہے۔ جسے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۴ - بمعنے رائی۔

۵ - مذہب

پچھلے تینوں معانی مجازی ہیں۔

سوال : یقول میں ضمیر واحد کی لائی گئی ہے اور اٰمنّا میں جمع کی، اس کی کیا وجہ ہے ؟

جواب : لفظ من میں دو اعتبار ہوتے ہیں ؛ لفظی، معنوی۔ اس کے لفظی اعتبار سے یقول میں ضمیر مفرد کی لائی گئی کیونکہ لفظ مَن لفظاً مفرد ہے اور اٰمَنّا میں اس کے معنے کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ من معناً جمع ہے۔

یا النّاس میں لام عہد کی ہے اور معہود وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور من موصولہ ہے۔ اس سے مراد عبداللہ بن اُبی بن سلول اور اس کے ساتھی اور اس کے ہم مثل وہ منافقین ہیں کہ جنہوں نے اسلام کا معتقد ہونا اس لیے ظاہر کیا تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کرام علیہم الرضوان سے بچ جائیں حالانکہ ان کے اعتقادات فی الحقیقت اُن کے خلاف تھے۔ اکثر ان میں یہودی تھے۔ وہ تو منافقت پر ہمیشہ کمربستہ رہتے۔ اسی بنا پر ان کو بھی ان کفار میں گنا گیا جن کے قلوب پر مہر لگائی جاچکی ہے اور اس زیادتی سے جو کہ انہوں نے کفر پر زیادتی کی (یعنی منافقت) کی خصوصیت سے ان کا کفار میں داخل ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہر جنس کا نوع ہوتا ہے اور یہ بھی چند زیادتیوں سے اُن کے بعض بعض سے متنوع ہیں۔ اس تقریر کی بنا پر دوسرے گروہ کی یہ دوسری تقسیم ہوئی۔

اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی ہم اللہ تعالیٰ کو صدقِ دل سے مانتے ہیں اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

اور یومِ آخر سے مراد حشر سے لے کر الی مالانہایہ ہے۔ یعنی وقت دائم جو کہ ختم ہونے والے اوقات کا آخری وقت ہے اور اس سے مراد قیامت کا دن ہے یا حشر سے لے کر بہشتیوں کا بہشت میں اور دوزخیوں کا دوزخ میں داخل ہونے تک، کیونکہ ایامِ معدودہ کا یہ آخری یوم ہے کیونکہ اس کے ماسوا کوئی حد نہیں اور اس کو آخر بھی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وُہ دنیا میں بعد میں آنے والا ہے۔

سوال : ایمان کو ان دونوں یعنی باللہ و بالیوم الاٰخر سے کیا تخصیص ہے ؟

جواب : وہ لوگ مدعی تھے کہ ہم ایمان کی دونوں جانبین کو حاوی ہیں اور اس کی دونوں اطراف کو احاطہ کرنے والے ہیں۔ اس پر انہیں خبردار کر دیا گیا کہ تم لوگ اپنے اس گمان پر پُورے نہیں بلکہ منافقت کر رہے ہو۔ علاوہ ازیں وہ اس قول کے کرنے سے منافقت کر سکتے ہیں کیونکہ یہ لوگ یہودی تھے اور یہودی اگرچہ اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے تھے مگر ان کا یہ ایمان کالعدم تھا کیونکہ ان میں ذیل کی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے اعتقاد میں یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں سے

تشبیہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔

اور کہتے تھے کہ بہشت میں سوائے ہمارے کوئی بھی داخل نہ ہوگا۔

اور کہتے تھے کہ ہم دوزخ میں داخل نہیں ہوں گے مگر چند روز۔ وغیرہ

اور گمان رکھتے تھے کہ ہمارے اور مومنین کے ایمان میں کوئی فرق نہیں۔

ف : ان کی عبارت کو بعینہٖ نقل کرنے میں اُن کی کمال خباثت کا بیان کرنا ہے کیونکہ وُہ باتیں جو وہ کہا کرتے تھے اگرچہ کبھی اُن سے بلا دھوکہ اور فریب صادر بھی ہو جائیں تو ان کو ایمان نہیں کہا جا سکتا کیسے کہا جائے جبکہ وہ یہی اقوال مومنین کو دھوکا دینے اور ان کے ساتھ استہزاء کرنے کی بنا پر کہہ دیا کرتے تھے تو یہ خالص ان کی خباثت اور نرا کفر ہی کفر ہوگا۔

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ لفظ لَيْسَ کا نائب ہے اس لیے اس کے بعد باء زائدہ آئی ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ وہ لوگ تصدیق کرنے والے نہیں ہیں کیونکہ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اس کا خلاف دل میں رکھتے ہیں بلکہ یہ لوگ منافق ہیں۔

ف : ان پر یہ حکم لگانا کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ ان کے اس دعویٰ کی نفی ہے کہ وہ بالیقین والقطع مدعی تھے کیونکہ ما کی خبر میں باء داخل کر کے ان سے اصل ایمان کی نفی داخل کر دی گئی ہے اسی لیے تو وماھم من المؤمنین نہیں فرمایا۔

علاوہ ازیں وجہ کے پہلا جملہ یعنی وماھم بمؤمنین دوسرے یعنی وماھم من المؤمنین سے زیادہ بلیغ ہے۔

مسئلہ : اس آیت سے معلوم ہوا کہ وہ دعویٰ مردود ہوتا ہے کہ جس کی صحت پر دلائل صحیح نہ پائے جائیں۔

حکمت اہلِ عرب کہتے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو اس بات سے سنوارا کہ جو اس میں نہیں ہے تو وہ اپنے دعویٰ کرنے سے امتحان کے وقت شرمسار ہوگا اور جو شخص اپنی تعریف کرتا ہے ندامت اٹھائے گا۔

اور جو اپنی مذمت کرتا ہے وہ تعریف کیا جائے گا۔ جیسا کہ فرعون نے اپنی مدح میں کہا:

وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (اور میں مسلمانوں سے ہوں)

تو اس کی مذمت ان الفاظ سے کی گئی:

وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (اور تو مفسدوں سے تھا)

اور حضرت یونس علیہ السلام نے تواضعاً فرمایا:

اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (بیشک میں ظالموں سے ہوں)

توان کے لیے فرمایا گیا:

فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ۔ (اگر وہ نہ ہوتا تسبیح کرنے والوں سے)

حضرت حافظ شیرازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں تا سیہ رُو شود ہر کہ در و غش باشد

ترجمہ: اچھا ہے اگر پرکھنے اور امتحان کے لیے کسوٹی درمیان میں ہو تاکہ جس کسی کے اندر کھوٹ ہو وہ سیہ رو ہو جائے۔

حکایت ایک شخص کا ایک شاگرد ہمیشہ اپنے لیے امانت کا دعوی کرتا تھا مگر شیخ کو اس کے خلاف آثار نظر آتے تھے مگر تلمیذ بہت اعتماد سے کہتا کہ مجھے آزما لیجئے۔ اس سے اس کا مقصود یہ تھا کہ مجھے اسرارِ الٰہیہ سے کسی ایک راز کا انکشاف بخشا جائے۔ ایک دن شیخ نے اپنے ایک اور شاگرد جو اس کا ساتھی تھا پکڑ کر اپنے گھر چھپا لیا، اور مینڈھے کو پکڑ کر ذبح کر کے ایک صندوق میں رکھ لیا۔ اس اثنا میں وہی امانت کا مدعی تلمیذ آگیا۔ استاد صاحب کو دیکھا کہ خُون آلود ہیں اور صندوق بھی سامنے پڑا ہے اور چھُری ہاتھ میں ہے۔ تو عرض کی کہ حضرت جی! یہ کیا ماجرا ہے؟ استاد صاحب نے فرمایا کہ مجھے فلاں شاگرد پر غصہ آگیا۔ غصہ میں آکر میں نے اُسے قتل کر دیا۔ اس سے اُستاد صاحب کی مراد یہ تھی کہ میں نے اُس کی خواہشاتِ نفسانیہ کی ایسی بیخ کنی کر دی ہے تاکہ وہ میری مخالفت نہ کرے۔ اس نابکار شاگرد نے سمجھا کہ وہ مقتول تلمیذ اسی صندوق میں ہے۔ پھر استاد صاحب نے اس شاگرد سے فرمایا کہ اے میرے عزیز! اس راز کو اپنے دل میں رکھنا اور اس مقتول تلمیذ کے صندوق کو جو کہ میرے سامنے ہے میرے گھر دفن کر دو۔ (اس امر سے اصل میں اس شاگرد کی آزمائش کرنا مقصود تھا) اور بعد ازاں اتنے میں اس گمشدہ تلمیذ کا باپ جو اپنے بیٹے کی تلاش میں تھا وہی نابکار شاگرد اس کے باپ کو کہنے لگا کہ تیرے بیٹے کو ہمارے استاد صاحب نے قتل کر کے اپنے گھر میں دفن کر دیا ہے۔ شدہ شدہ یہ بات سلطانِ زمان تک پہنچی۔ بادشاہ نے سُن کر توقف فرمایا کیونکہ اس بزرگ کی بزرگی سے وہ خوب واقف تھا مگر تاہم شیخ کی خدمت میں قاضی اور دیگر فقہا کو بھیج کر تفتیش شروع کر دی۔ اس واقعہ سے تلمیذ نابکار بڑا خوش ہوا اور استاد صاحب کو خوب گالیاں دیں اور گواہوں کو ساتھ لے کر آئے تاکہ اس مذبوح لڑکے کو بچشم خود دیکھ سکیں۔ چنانچہ جب صندوق کو کھولا تو ذبح شدہ مینڈھا اس میں پایا اور اس گھر سے وہ لڑکا صحیح سلامت باہر نکل آیا۔ جس سے اس شاگرد کو سخت شرمندگی اٹھانا پڑی۔ مگر اب ندامت سے کیا فائدہ! (کذا فی الرسالہ الموسوم بالحکم المربوط فیما یلزم اہل طریق اللہ من الشروط مصنفہ شیخ الاکبر ابن العربی قدس سرہ العزیز)

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ اسرار امینوں کو دئے جاتے ہیں اور انوار ادیبوں کو دئے جاتے ہیں۔ حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

حدیثِ دوست نہ گویم مگر بحضرت دوست
کہ آشنا سخن آشنا نگہ دارد

ترجمہ: دوست کی بات دوست کو کہی جاتی ہے اس لیے کہ راز دان راز دان کی بات کو باحفاظت رکھتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ من النّاس میں النّاس سے مراد وُہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالےٰ اور اُس کے وعدۂ یوم میثاق کو بُھلادیا ۔ پھر اُن میں بعض تو وُہ ہیں جو منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالےٰ کے ساتھ ایمان لائے ۔ لیکن ان کے قلوب اس کے خلاف گواہی دیتے ہیں ۔ ایمان حقیقی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نور سے ہو، جس کو اللہ تعالیٰ اپنے خواص کے قلوب میں ڈالتا ہے ۔ اور یوم آخر پہ ایمان لانے کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نور سے یوم آخرت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے آخرت پر ایمان لاتے ہیں ۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ کے نور سے نہ دیکھا تو اسے عالمِ غیب کا مشاہدہ بھی نصیب نہ ہوا، نہ وہ غیب کو جان سکے گا نہ مومن باللہ ہوگا اور نہ مومن بالیوم الآخر اس لئے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا دما ھم بمؤمنین یہ وہ لوگ نہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کے نور سے ایمان لاتے ہیں ۔
اس آیت کا معنیٰ اور بھی ہے وہ یہ کہ وہ لوگ حقیقی ایمان کی طرف جانے کے لیے تیار نہیں کیونکہ وہ لوگ نہایت غفلت و خُذلان میں ہیں ۔

تفسیر عالمانہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ (ربط:) جملہ سابقہ میں جو بقول گزرا ہے اس کا بیان ہے اور منافقین جو اپنی غرض (اٰمنّا باللہ) بیان کرتے تھے اس کی ان کو توبیخ ہو رہی ہے ۔ یا جملہ مستانفہ ہے جو ایک سوال مقدر کا جواب ہے ۔ سوال یہ ہے گویا سائل نے پُوچھا کہ ان منافقین کی جزا کیا ہے جو مُنہ سے تو گواہی دیتے ہیں لیکن وہ مومن نہیں ۔ تو اس کے جواب میں فرمایا ؛ یخٰدعون اللہ ۔ معلوم رہے کہ یخٰدِعون بمعنے یَخْدَعُوْن ہے ۔ فَعَلَ کو فَاعَلَ کے وزن پر مبالغۃً لایا گیا ہے اور یُخٰدِعُوْنَ اپنے ظاہری معنے پر نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی شے مخفی نہیں اور منافقین کا دھوکا بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہ ... ان کی غرض دھوکا سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی ۔ اس معنے پر مضاف محذوف ہوگا ۔ یعنی یخٰدعون رسول اللہ ۔ یا یوں ہو کہ جو معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جا رہا ہے یہ در اصل اللہ تعالیٰ سے ہو رہا ہے کیونکہ آپ در اصل زمین پر اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں ۔ اس کے بندوں کو اس کے اوامر و نواہی سناتے ہیں ۔

مسئلہ ؛ ثابت ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ دھوکا کرنے کو اپنے ساتھ دھوکا کرنے سے تعبیر فرما رہا ہے ۔

سوال : وہ منافقین تو کفار سے بھی زیادہ خبیث اور اہل الدرک الاسفل من النار تھے ۔ پھر ان پر مومنین کے احکام جاری کرنے کا کیا معنیٰ ؟

جواب : یہ صرف مہلت دینے کی وجہ سے ہوا ۔

سوال : رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین ان کی منافقت کو جانتے ہوئے بھی ان پر اسلام کے احکام جاری کرتے اور ان کے حال کو کسی پر ظاہر نہیں کرتے مخفی رکھتے یہ کیوں ؟

جواب : اللہ تعالیٰ کے فرمان کو مان کر تاکہ مخادعہ دونوں جانب سے ہو جائے۔ اگر ان پر یہ احکام جاری نہ ہوتے تو کافروں میں مل جاتے اور پھر ان کو اس دھوکا دہی کی جزا کیسے ملتی۔

حلِ لغات : خَدَعٌ بمعنے برائی کے پہنچانے کے ارادہ پر اپنے ساتھی کو اپنے ارادہ کے خلاف پاکر اسے دھوکا میں رکھ کر خود بآسانی مکروہ امر سے نجات پانا۔ اہلِ عرب کے قول خبٌّ خادعٌ و خَدِعٌ سے ماخوذ ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ شکاری اپنا ہاتھ گوہ کے ہاتھ میں ڈالے اور اسے خیال ہو کہ شاید وہ میری طرف متوجہ ہے حالانکہ وہ کسی دوسرے دروازہ سے نکل جائے۔ یہاں پر دونوں معنے مناسب ہیں کیونکہ منافقین کا ارادہ بھی یہی تھا کہ مومنین کے مخالفین کو راز بتا کر خود تکالیف سے بچ جائیں جو باقی کفار کو مومنین کی جانب سے بوجہ قتل اور مال چھن جانے اور قید ہو جانے سے پہنچتی تھیں۔ علاوہ ازیں ان کا دنیاوی مصلحتوں کے نظم ونسق کو بھی حاصل کرنا مقصود تھا بایں طور کہ جس طرح مومنین کو عطیہ جات ملتے تھے انھیں بھی ملتے رہیں۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی مومنین سے بھی دھوکا کرتے ہیں جبکہ انھیں دیکھ کر اٰمنّا باللہ کہتے ہیں حالانکہ وہ ایماندار نہیں ہیں۔ اس کا عطف پہلے جملہ پر ہے۔ یہاں پر مُخَادَعَۃٌ کا حقیقی معنیٰ ہوگا۔ کیونکہ حقیقی معنیٰ ممکن ہے۔ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ (حل لغات) نفسٌ شے کی ذات اور حقیقت کو کہتے ہیں۔ کبھی روح کو بھی نفس کہتے ہیں۔ کیونکہ نفس اسی سے زندہ ہے۔ اور قلب کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ یہ قلب کا محل اور متعلق ہے۔ اور خون کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ نفس کا قوام اسی کے ذریعے سے ہے اور پانی کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ اس کی نفس کو بہت ضرورت ہے۔ یہاں پر پہلا معنیٰ مراد ہے۔ کیونکہ بیان یہ کرنا ہے کہ دھوکا بازی کا نقصان دراصل ان کی طرف راجع ہے۔ ان سے متجاوز ہو کر کسی دوسرے تک نہیں پہنچتا ہے۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اپنے ساتھ کر رہے ہیں اس کا نقصان صرف انھیں ہوگا کیونکہ ان کے فعل کا دائرہ انہیں پر بند ہے۔

جنہوں نے صیغہ (مفاعلہ) کے معنے صحیح رکھنے کا پورا اہتمام رکھا تو وہ اس طرح ترجمہ کریں گے کہ وہ معاملہ جو دھوکا بازوں کے معاملہ سے مشابہ ہے سوائے اپنے نفسوں کے کسی دوسرے کے ساتھ نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ نقصان سوائے ان کے دوسروں کو محیط نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی منافقت کی اطلاع دے دے گا جس کی وجہ سے وہ دنیا میں شرمساری اٹھائیں گے اور آخرت میں سخت عذاب کے مستحق ہوں گے۔ مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں : ؎

بازیٔ تو دیدم اے شطرنج باز
بازیٔ خصمت ببیں پہن دراز

ترجمہ : اے شطرنج کھیلنے والے! میں نے تیرا کھیل دیکھا ہے اپنے دشمن کا کھیل بھی دیکھ جس کا میدان وسیع ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ کر رہے ہیں قیامت میں بھی ان سے ایسا ہی کیا جائے گا۔ چنانچہ مروی ہے کہ جب یہ لوگ جہنم میں ڈالے جائیں گے تو عرصہ دراز تک عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے فریاد ی ہوں گے اور بخشش طلب کریں گے تو کہا جائے گا دروازے کھلے ہیں۔ جہنم سے نکل کر جب بہشت کے قریب پہنچیں گے تو دروازے بند کر دئے جائیں گے اور انہیں لوٹا کر شیاطین وطواغیت کے ساتھ دوزخ میں بند کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اِنَّھُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّ اَکِیْدُ کَیْدًا۔ (بیشک مکر کرتے ہیں اور میں ان کے مکر کی انہیں جزا دوں گا)
(بے شک وُہ مکر کرتے ہیں اور ہم بھی ان کے مکر کی انہیں سزا دیں گے)

حدیث شریف بعض لوگوں کو بہشت میں داخل ہونے کا حکم ہوگا، جب وہ بہشت کے قریب ہوں گے اور اس کی خوشبوئیں اُن کے دماغوں میں پہنچیں گی اور اسی کے محلات پر نظر کریں گے اور ان اشیاء کو دیکھیں گے جو اللہ تعالیٰ نے بہشت کے لیے تیار فرمائیں انھیں ندا ہوگی کہ بہشت سے دُور ہو جاؤ تمہارے لیے اس میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔ حسرت وندامت کے ساتھ لوٹیں گے۔ جس طرح ان کی یہ رسوائی ہوگی ایسی نہ پہلے کسی سے ہوئی اور نہ کبھی آئندہ کسی سے ہوگی۔ عرض کریں گے : الٰہ العالمین! قبل اس کے کہ وُہ اشیا جو تُو نے اپنے اولیا کے لیے بہشت میں تیار کی ہیں ہمیں دکھاتا اور دوزخ میں داخل فرمالیتا تو اچھا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا : میں نے ارادہ کیا ہے کیونکہ تم وہی تو ہو کہ جب تم تنہائی میں ہوتے تو اپنے وساوس سے میرے ساتھ قسم قسم کے جنگ وجدال میں رہتے اور جب مومنوں سے ملتے تو بات کو چھپا کر ریا سے کام لیتے ہوئے جو کچھ دل میں ہوتا اس کے خلاف کا اظہار کرتے۔ تم دنیا والوں سے تو ڈرتے تھے مگر میرا ڈر تم کو کبھی یاد نہ آیا۔ لوگوں کو تم نے بزرگ سمجھا مگر میری بزرگی کا تمہیں لحاظ نہیں تھا اور لوگوں کے لیے تم (غلط روی) کو چھوڑ دیتے مگر میرے لیے تم نے کوئی (بُرا عمل) نہ چھوڑا۔ پس آج کے دن میں تم کو اپنی نعمتوں سے محروم رکھ کر عذاب شدید میں مبتلا کر رہا ہوں۔ (کذا فی روضۃ العلماء و تنبیہ الغافلین)

وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۞ (ربط) یہ جملہ، جملہ وما یخدعون کی ھُم ضمیر سے حال ہے۔ یعنی اپنے نفوس پر دھوکا کے وبال سے کمی نہیں کرتے اور غفلت وغوایت میں منہمک ہونے کی وجہ سے اس خرابی کا انھیں علم بھی نہیں ہوتا۔ طوقِ وبال خداع اور پھر اس کے نقصان کا عود اُس کی طرف لوٹنے کے ظہور کو ایسا کالمحسوس بیان کیا کہ سوائے ماؤف الحواس کے کسی پر مخفی نہیں۔ ان کو بمنزلہ جمادات کے بنایا گیا، بلکہ بہائم کے رتبے سے بھی انہیں گرایا گیا بایں طور کہ ان سے حس حیوانی سلب کی گئی ہے پس ان کے حق میں کہا جا سکتا ہے بل ھم اضل (وما یشعرون) یہ لایعلمون سے زیادہ احسن اور زیادہ بلیغ ہے۔ الشعور بمعنی الاحساس ہے یعنی علم الشئ بمعنے علم حس ہے اور مشاعر انسان بمعنے حواس۔ انسان کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا ہر حاسّہ شعور اور نصیحت قبول کرنے کا محل ہے۔ پس منافق جو بھی عمل کرتا ہے اس کا اس کے وبال کا اسے علم بھی نہیں ہوتا اور مومن چونکہ اپنے ہر عمل کے وبال کو جانتا ہے بنا بریں اللہ تعالےٰ کے

سامنے منافق کا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔

سوال: اس آیت میں تو اس کے جاننے کی نفی کی گئی ہے اور دوسری آیت و تکتمون الحق وانتم تعلمون میں ان کے جاننے کا ثبوت ہے۔

جواب: اس کا حقیقۃً تو انہیں علم تھا لیکن انہیں اپنے کیے کا علم نہیں ہوتا تھا فلہٰذا وہ لاعلم ہی تھے اُن کی مثال صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ والی آیت ہے۔ وہ لوگ اگرچہ حقیقۃً ناطق اور سامع اور ناظر تو تھے لیکن چونکہ وہ اس سے نفع نہ اٹھا رہے تھے بنا بریں گویا وہ گونگے اور بہرے اور اندھے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کے پاس ہتھیار ہو مگر وہ اسے استعمال نہیں کرتا تو وہ اور وہ شخص کہ جس کے پاس ہتھیار نہ ہو برابر ہیں۔ اسی طرح وہ عالم جو اپنے علم کے مطابق عامل نہ ہو وہ اور جاہل برابر ہیں۔ اسی طرح وہ دولت مند جو اپنے مال سے نفع نہیں اٹھاتا وہ اور مفلس برابر ہیں۔ پس کفار کے لیے علم کا اثبات الزامِ حجت کے لیے ہے اور جہل کا اثبات ان کی کمی کے اظہار کے لیے ہے بخلاف اہلِ ایمان کے کہ ان کے لیے علم کا اثبات ان کی کرامت کے اثبات کے لیے ہے اور ذکرِ جہل معصیت میں معذور ہونے کی تلقین سکھانے کے لیے ہے۔ (کذا فی التیسیر)

سبق مومن کے شایانِ شان یہ ہے کہ علم وعمل کے زیور سے آراستہ ہو اور خطا و گناہ سے کنارہ کش رہے۔ اور اپنے رب کی خالص رضا کی خاطر اس کی اطاعت کرے اور قلبِ سلیم سے اس کی عبادت میں مصروف رہے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اپنی امت پر جیسا کہ ان کے شرک اصغر سے خائف ہوں ان کے کسی اور عمل سے خائف نہیں۔ عرض کیا گیا: شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: ریاء (شرک اصغر ہے) قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اعمال کی جزا دے گا تو ریاکار لوگوں کو فرمائے گا کہ تم ان حضرات کے پاس جاؤ جن کے سامنے دنیا میں اپنے اعمال ریاء کے طور پر کرتے تھے۔ کیا تمہارے لیے ان کے پاس کوئی بھلائی ہے (نہیں ہرگز نہیں) یہ ان کو اس لیے کہا جائے گا کہ ان کا یہ عمل بطور دھوکا کے ہوگا۔ بنا بریں ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے گا جو دھوکا بازوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ (تنبیہ الغافلین)

شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ؎

چہ قدر آور بندۂ رئیش
کہ زیر قبا دارد اندام پیش

ترجمہ: اس آدمی کی کیا قدر ہے جو ریاکاری کا لباس پہنے ہوئے ہے کہ وہ اپنی قبا کے نیچے کئی جسم رکھتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ جب اللہ تعالیٰ نے بعض بندوں کے لیے شقاوت مقدر فرمائی تو پوشیدہ تقدیر کا بیج ان کے اعمال میں بویا جس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ دھوکہ بازی کا پھل نمودار ہوا اور یہ اسے

معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ دھوکا دہی پوشیدہ تقدیر کے بیج کا نتیجہ ہے جو اس کی نظروں میں زینتِ دُنیا اور اس کے قلب میں حُبِّ شہوات کے ذریعہ ظاہر ہو رہا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ ۔ (لوگوں کے لیے شہوات کی محبت سنگاری گئی ہے)

تو یہ بندہ زینتِ دُنیا اور طلبِ شہوات میں اللہ تعالیٰ اور سعادتِ اُخرویہ سے دھوکا کھا بیٹھا۔ پس دراصل وہی دھوکا باز مکر ساز ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ۔ (وہ اللہ تعالیٰ سے دھوکا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دھوکا کی انھیں سزا دے گا)

اس تقدیر پر اب معنیٰ یہ ہوا کہ یہ لوگ درحقیقت دھوکا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو، جس کی حقیقت ان کے اللہ تعالیٰ اور مومنوں کے ساتھ دھوکا دہی سے ظاہر ہو رہی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ کفر کی وجہ سے دھوکا دینے سے پہلے دوزخ کے مستحق ہو چکے تھے اگرچہ ان سے ایمان کا امکان تھا مگر چونکہ وہ لوگ بطور دھوکا دہی کے منافقت کے اظہار میں شروع ہوئے تو ان کے قدم درک اسفل من النار میں پھسلے جس سے ان کا ایمان قبول کرنا اور ان سے ممکن ہونے کی استعداد ختم ہو گئی۔ پس ان کے دھوکا دینے اور مکر کرنے کا نقصان ان کی طرف راجع ہوتا ہے جس کی انہیں خبر بھی نہیں ہوتی وما یشعرون، یعنی انہیں تقدیر ازلی کے راز کا پتا نہیں کہ ان کا مکر و فریب کرنا اس کی تقدیر کے راز کے نتائج سے ہے وجہ دراصل یہ ہے کہ اُن کے قلوب بیمار ہیں اور روحانی مریض تقدیر کے راز سے واقف نہیں ہوتا۔

فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ (حل لغات) زاد کبھی متعدی ہو کر آتا ہے، جیسا کہ اس آیت شریف میں ہے اور کبھی لازم ہو کر، جیسا کہ آیت فَاَرْسَلْنَا اِلٰی مِائَۃِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ میں ہے اور مرض درحقیقت اس عارضہ کو کہتے ہیں جو بدن کو لاحق ہوتا ہے اور اس کو حدِّ اعتدال (جو اس کے لائق ہے) سے خارج کر کے اس کے اعضاء میں ایسا خلل پیدا کر دے کہ اُسے درجۂ موت تک پہنچا دے اور مجازاً عوارض نفسانیہ پر بولا جاتا ہے کہ جن سے انسانی کمالات میں خلل واقع ہو جائے، جیسے جہل سوءِ عقیدت، حسد، کینہ، گناہوں کی محبت وغیرہ اور دیگر فنونِ کفر جو انسان کو روحانی ہلاکت میں ڈالنے والے ہیں۔ کیونکہ یہ امور فضائل کے حصول سے مانع ہیں اور حیات حقیقیہ ابدیہ کے زوال کے موجب ہیں اور آیتِ کریمہ اس مجازی و حقیقی دونوں معنوں کا احتمال رکھتی ہے کیونکہ ان کے قلوب اس ریاست جو انھیں حاصل تھی کے چھن جانے سے جل چکے تھے اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر میں ترقی اور ان کی شان میں روز بروز زیادتی سے حسد میں آ کر آزار رسیدہ تھے اور علاوہ ازیں ان کے دل چونکہ کفر اور بُرے عقاید اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے صدمہ یافتہ ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماریوں میں یُوں اضافہ فرمایا ہے کہ ان کے دلوں پر مُہر ثبت فرمائی (کیونکہ اسے علم تھا کہ ان پر نہ تو نصیحت اثر کرے گی اور نہ ہی کسی کا ڈر کارگر ہوگا) اس لیے جب بار بار وحی نازل ہوتی اور تکالیفِ شرعیہ کا حکم صادر ہوتا اور مسلمانوں کو فتح و نصرت نصیب ہوتی تو اُن (منافقین) کے مرض میں

[illegible]

اضافہ ہوجاتا۔ پھر جُوں جُوں تکالیفِ شرعیہ کا نزول ہوتا جاتا اسی قدر ان کی بیماریٔ کفر بڑھتی جاتی۔ سب سے بڑا بوجھ ان پر شہادت کے کلمہ شریف کا تھا جس کے پڑھنے سے وُہ کتراتے۔ بعدازاں طاعات کے احکام ہوتے گئے تو وہ بھی کفر میں بڑھتے گئے۔ اسی وجہ سے کل قیامت میں انہیں لحظہ بہ لحظہ عذاب بڑھتا رہے گا۔ کما قال تعالیٰ :

وَزِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ۔ (اوران کا ہم نے عذاب پر عذاب بڑھا دیا)

اور اسی طرح مومنین بھی روز بروز ہدایت میں بڑھتے رہے۔ کماقال تعالیٰ :

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى۔ (اور اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ہدایت میں بڑھاتا ہے)

اس لیے کل قیامت میں انہیں فضل وکرم فراواں نصیب ہو گا۔ کما قال تعالیٰ :

وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ (اور قیامت میں اپنا فضل انہیں بڑھ کر عطا فرمائے گا)

تفسیر صوفیانہ

حضرت قطب علامہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دل کے امراض یا تو دین سے متعلق ہیں جیسے بُرے عقاید اور کُفر، یا اخلاق سے متعلق ہیں۔ اخلاق دو قسم کے ہیں :

رذائل فعلیہ، جیسے خیانت، حسد۔ یا

رذائل انفعالیہ، جیسے ضُعف اور بزدلی پر مرض کو اولاً محمول کیا جائے کفر ہے۔ پھر ہیئات فعلیہ پر، پھر ہیئات انفعالیہ پر۔

سوال : بعض لوگ کہتے ہیں کہ فزادھم اللّٰہ بددُعا ہے۔

جواب : یہ مطلب غلط ہے کیونکہ بددعا تو عجز پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ عجز سے پاک ہے۔

ف : بندوں کو دُعا کا طریقہ سمجھایا گیا ہے کہ جب تم سے کام نہ بنے تو دُعا کو عمل میں لایا کرو۔ اور یہ بھی بتایا گیا کہ منافقین کے لیے بددعا کرنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے درکِ اسفل تیار کیا ہے اسی طرح محمول ہوں گے۔ قاتلھم اللّٰہ دعفا اللّٰہ وغیرہ وغیرہ۔

تفسیر عالمانہ

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ یعنی آخرت میں اُن کے لیے سخت عذاب ہے۔ اس عذاب کا درد ان کے قلوب تک پہنچے گا۔

اور الیم بمعنے مولم بفتح اللام، اسم مفعول از ایلام۔ عذاب کو الیم سے موصوف کرنا مبالغہ کی بنا پر ہے اور وہ دراصل معذب بفتح الذال کی صفت ہے۔ جیسا کہ اہلِ عرب کے قول جد جدہ میں جدّ، جادّ کی صفت ہے۔ اور مبالغہ لانے میں وجہ یہ ہے کہ الم ایسے درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ معذب عذاب جو کہ اس کا متعلق بہ ہے کی طرف سرایت کر گیا ہے۔

بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ باء سببیت کی ہے یا مقابلہ کی، اور ما مصدریہ، دراصل یکذبون پر داخل ہے

اور لفظ کانوا زاید ہے جو دوام اور تجدید کا فائدہ دے رہا ہے۔ یعنی ان کے کذب متجدد مستمر جو کہتے ہیں امنّا الخ کی وجہ سے (انھیں) عذاب دردناک ہوگا۔ اس میں اشارہ ہے کہ کذب قبیح اور بہت بُرا عمل ہے اور تنبیہ ہے کہ منافقین کو عذاب صرف ان کے کذب کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ عبارت کے ظاہر سے ثابت ہے کہ ان کے عذاب کا سبب صرف کذب ہے، حالانکہ سامع کو بخوبی معلوم ہے کہ عذاب مختلف وجوہ سے ہوگا اور صرف کذب کی وجہ پر اقتصار کرنے میں یہ سمجھانا مطلوب ہے کہ کذب نہایت درجہ کا قبیح ہے اس سے کمال درجہ کی نفرت چاہیے۔

ف : واقعہ کے خلاف وقوع کی خبر دینے کا نام کذب ہے۔

سوال : سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تین جھُوٹ کی روایت کا کیا مطلب ہے؟

جواب : اس روایت میں کذب بمعنے تعریض ہے اور چونکہ ان باتوں کو لفظاً کذب سے مشابہت ہے۔ بنا بریں ان پر کذب کا اطلاق کیا گیا۔

سوال : ان تین جھُوٹی باتوں کی تفصیل کیا ہے؟

جواب : پہلا وہ قول جو کہ آپ نے کفّار کو فرمایا: اِنّی سقیم۔ یعنی میں بیماری یا موت کی جانب جانے والا ہوں۔ یا میں تمہارے بُرے عمل جو کہ تم جا کر نجوم پرستی کرو گے تو میں غصہ میں آ کر بیمار ہو جاؤں گا۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا تاکہ وہ لوگ انھیں ساتھ لے جانے پر مجبور نہ کریں اور اُن سے باز رہ کر ان کے بتوں کو ان کی عدم موجودگی میں پارہ پارہ کر دیں۔

دُوسرا ان کا وہ قول ہے جو انہوں نے بتوں کو توڑ کر کلھاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا تو قوم نے پُوچھا: یہ خرابی کس نے کی؟ تو آپ نے فرمایا:

بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ۔ (بلکہ یہ ان کے بڑے نے کیا ہے)

یہ قول آپ نے علیٰ سبیل الالزام فرمایا کہ بالفرض والتقدیر اگر اسے خدا سمجھا جائے تو یہ کام اُس نے ہی کیا ہے کیونکہ جو معبود ہوتا ہے تو اسے قدرت حاصل ہوتی ہے کہ یہ کام کر سکے۔ اگر وہ ایسے کام نہیں کر سکتا تو وہ عاجز ہوگا اور عاجز الوہیت کے درجہ سے محروم ہوتا ہے اور نہ ہی وہ عبودیت کا مستحق ہے جب تم نہیں مانتے تو ان کو سجدہ کرنا بے سود ہے گویا آپ نے یہ قول ان کے ساتھ بطور تمسخر و استہزاء کے فرمایا۔

تیسرا آپ کا وہ قول کہ جب ظالم بطور ظلم مسافرین کو پکڑ کر عورتوں سے بدفعلی کرتا تھا۔ جب اس ظالم کے سپاہی پکڑنے آئے اور آپ سے بی بی سارہ کے متعلق پُوچھا کہ یہ آپ کی کیا لگتی ہے تو آپ نے فرمایا: ھٰذِہٖ اُخْتِی۔ اس سے مراد آپ کی اخوتِ دینی تھی۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا تاکہ ان کی بیوی اس ظالم کے پنجہ سے بچ جائے کیونکہ اس کی عادت تھی کہ وہ ان عورتوں کو پکڑتا جن کے شوہر موجود ہوتے۔ کیونکہ اس کا خیال یہ تھا کہ جب یہ عورت اپنے شوہر سے راضی ہے تو بادشاہ اس کے شوہر سے زیادہ حقدار ہے۔ اور جن عورتوں کے شوہر نہیں ہوتے تھے ان کی مرضی کے سوا

اس کا کوئی چارہ نہیں تھا۔

سوال: سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں اور چاند و سورج کو دیکھ کر کیوں فرمایا: ھٰذا ربّی۔ حالانکہ آپ کو یقین تھا کہ یہ (سورج، چاند، ستارے وغیرہ) معبود نہیں ہیں۔

جواب: یہ استدراج ہے یعنی خصم کے ساتھ نرم بات کہہ کر اپنی طرف مائل کرانا یہ بھی تعریض کی ایک قسم ہے کیوں کہ اس قول سے آپ کی غرض ان کے قول کی نقل حکایت تھی تاکہ اُن کے اپنے قول سے ان کا ابطال ہو جائے۔

کذب کی مذمّت جھوٹ کبیرہ ذنوب اور بُرے عیوب میں سے ہے اور تمام گناہوں کا سر ہے اور اسی سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور تمام بُری عادتوں سے مبغوض ترین ہے اور ایمان کا بالمقابل یہی کذب ہے۔ بہرحال اس سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا: میں تمہیں جُھوٹ میں ایسے گرتا ہوا دیکھتا ہُوں جیسے پروانہ آگ میں گرتا ہے۔

مسئلہ جھوٹ کیسا ہی ہو جھوٹ لکھا جائے گا۔ ہاں تین ایسے جُھوٹ ہیں جن کا گناہ نہیں لکھا جاتا:

(۱) جنگ میں جُھوٹ بولنا کیونکہ اَلْحَرْبُ خَدَعَةٌ۔ (جنگ دھوکا ہے)

(۲) دو آدمیوں کی آپس میں صلح کرانے میں۔

(۳) اپنی عورت سے ایسی بات کرنا کہ جس سے وہ خوش ہو۔ مثلاً یُوں کہے کہ دنیا میں مجھے تجھ سے زیادہ محبوب کوئی نہیں۔ اسی طرح عورت بھی اپنے مرد کو کہہ سکتی ہے۔

یہ تین ایسے فعل ہیں جن کے متعلق احادیث میں صراحۃً استثناء وارد ہوا ہے۔ اسی کے مطابق وہ مسئلہ ثابت کیا گیا ہے کہ اپنے یا غیر کے لیے کوئی ایسی بات خلافِ واقعہ کہہ دے کہ جس سے جائز غرض ہو۔ فارسیوں کا مشہور مقولہ ہے:

دروغ مصلحت آمیز بہ از راست فتنہ انگیز (جھوٹ مبنی بر مصلحت اس سچ سے بہتر ہے جو فتنہ انگیز ہے)

لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ غیر کی خاطر ہو اگر اپنے لیے ہو تو سچ بولنا ہی اولیٰ ہے۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

تا نیک ندانی کہ سخن عین صوابست
باید کہ گفتن دہن از ہم نکشائی
گر راست سخن گوئی و در بند بمانی
بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

ترجمہ: جب تک تجھے پتا نہ ہو کہ بات اچھی ہے چاہیے کہ تو اس کے کرنے کے لیے منہ نہ کھولے اگر تو سچی بات کہے اور منہ کو بند رکھے تو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ تو جھوٹ کو قید سے رہائی دلائے۔

مسئلہ: کذب درحقیقت کذب فی العبودیت اور قیام بحقوق الربوبیت ہی ہے جیسا کہ منافقین اور ان کے متبعین کا طریقہ تھا۔

نصیحت جو لوگ جھوٹ کے عادی ہیں ان کی اقتدا نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ ہلاکت اور مالکِ کائنات کی رحمت سے دور ہٹاتے ہیں۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

صبح کاذب کاروانہا راز دست

کہ بہوئے روز بیروں آمدست

صبح کاذب خلق را رہبر مباد

کہ دہد بس کاروانہا را بباد

ترجمہ: صبح کاذب نے بہت سے قافلے مارے اس لیے کہ دن کی خوشبو سے آئی ہے خدا کرے صبح کاذب کسی کی رہبر نہ ہو، اس لیے کہ اس نے بہت سے قافلے برباد کئے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ علامہ قاشانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کے معنے میں فرماتے ہیں کہ منافقین کے قلوب رذائل نفسانیہ شیطانیہ اور صفات بشریہ کی وجہ سے تجلیاتِ ربانیہ سے محجوب و مستور ہیں۔

تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ منافقین کے دلوں میں مرض ہے۔ یعنی وہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مرض میں اضافہ فرمایا ہے۔ اس کی توضیح یوں ہے چونکہ وُہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہو کر دھوکا دہی کی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں اس وجہ سے وصالِ حق اور دیدارِ رب سے محروم ہوئے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے کہ وصول الی اللہ سے محروم رہیں گے جھوٹ بولنے کی وجہ سے کہ صرف زبانی طور پر کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لائے حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔

ایمان حقیقی ایک نور ہے جب کسی مومن کے دل میں داخل ہوتا ہے تو اسے اس کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ جیسے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو مکشوف ہوا کہ حضور علیہ السلام نے اُن سے پُوچھا:

کیف اصبحت یا حارثة۔ (اے حارثہ! کیسے گزری؟)

اس نے جواباً عرض کی:

اصبحت مومناً حقاً (میں نے مومن برحق ہو کر گزاری)

آپ نے فرمایا: مومن کے ایمان کی ایک حقیقت ہوتی ہے تیرے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ عرض کی: میں نے اپنے

نفس کو دُنیا سے رُوگرداں کرلیا ہے ۔ اب شب و روز نہایت چین سے گزر رہے ہیں ، یہاں تک کہ اب سونا اور پتھر میرے لیے برابر ہیں ۔ اور یہ کیفیت ہے کہ بہشت اور دوزخ میرے سامنے ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا : اَصَبْتَ فَالْزُمْ ۔ ٹھیک ہے اور اسی پر قائم رہ ۔

مولانا روم رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ؎

۱ اہلِ صیقل رستہ انداز بُو و رنگ
ہر دمی بینند خوبی بے درنگ

۲ نقش و قشر و علم را بگذاشتند
رایت عین الیقین بفراشتند

۳ برتر انداز عرش و کرسی و خلا
ساکنانِ مقعدِ صدقِ خدا

۴ علم کاں نبود ز ہو بے واسطہ
آں نپاید ہمچوں رنگ ماشطہ

ترجمہ : (۱) قلعی گر رنگ و بُو سے آزاد ہو گئے ہر سانس میں بغیر کسی انتظار کے خوبی دیکھتے ہیں ۔
(۲) انہوں نے نقش ، چھلکے اور علم کو چھوڑ دیا ہے اور عین الیقین کی ولایت میں جھنڈے گاڑ دئے ہیں ۔
(۳) وہ عرش ، کُرسی اور خلا سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں وہ خدا کی سچائی کی بیٹھک میں رہنے والے ہیں ۔
(۴) ان کا علم اللہ ہُو سے بے واسطہ نہیں ہے ۔ وہ کنگھی کرنے والی کے رنگ کی طرح ظاہری زیبائش نہیں ہوتا ۔

تفسیر عالمانہ

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ یعنی جب ان منافقین کو اہلِ اسلام کہتے ہیں کہ زمین میں فساد نہ کرو ۔ لا تفسدوا کا اسناد قیلَ کی طرف لفظی ہے ۔ گویا انہیں یہی قول کہا گیا ۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے تم کہو کہ یہ الف ان تینوں حرکتوں میں ایک ہے اور فساد بمعنی کسی شے کا اعتدال سے خارج ہونا ، اور اصلاح کی ضد ہے ۔ ہر دو نفع و نقصان کو عام ہیں اور زمین میں فساد کا مطلب یہ ہے کہ تم زمین میں جنگ اور ایسے فتنے (جو بندوں کے احوال کی استقامت کا زوال اور اُن کی معاش و معاد کے امور میں اختلال کا موجب ہے) برانگیختہ نہ کرو ۔ اور جس فعل سے انھیں روکا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ مؤمنین کے اسرار کو کفار تک پہنچاتے اور پھر ان کو مسلمانوں کی جنگ پر انگیختہ کرتے ۔

علاوہ ازیں طرح طرح کے شرور وفتن کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس عمل سے چونکہ فساد برپا ہوجاتا ہے بنا بریں

انہیں کہا گیا لا تفسدوا ...... الخ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو کہا جائے:

لا تقتل نفسك بيدك - یعنی اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو قتل مت کر۔

یا کہا جاتا ہے:

لا تلق نفسك في النار - یعنی اپنے آپ کو آگ میں نہ ڈال۔

یہ جملے اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص ایسا عمل کر رہا ہو جس کا انجام وہی ہو جس کا ذکر کیا گیا ہے۔

ف : حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے قبل کھلے بندوں زمین پر معاصی کا ارتکاب ہوتا - آپ کی بعثت شریفہ کی برکت سے وہ فسادات دفع ہو گئے تو پھر نتیجہ یہی ہوا کہ یہ لوگ زمین پر نیکی و اصلاح کے بعد فساد برپا کرنے والے ہیں۔ (کذا فی تفسیر ابی اللیث)

قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ یہ جملہ اِذَا کا جواب اور ناصح کا علی سبیل المبالغہ رد ہے۔ اب اس عبارت کا معنیٰ یہ ہوا کہ ہمیں ایسی نصیحت کرنا بے سود ہے کیونکہ ہمارا کلام تو اصلاح کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اور ہمارا حال فساد کی ملاوٹوں سے بالکل پاک اور مبرا ہے اور ان کا یہ جواب اس لیے تھا کہ انہیں اپنا فساد بصورتِ اصلاح معلوم ہوتا تھا کیونکہ اُن کے قلوب فساد کے مرض میں مبتلا تھے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

افمن زين له سوء عمله فراه حسناً - (تو کیا جس کا برا عمل ایسا سنگار اگیا کہ جسے وُہ اچھا سمجھتا ہے)

اسی لیے انہوں نے اپنے فعل کو فساد پر محمول کرنے کا انکار کرتے ہوئے اس کے لیے خالص اصلاح کا دعویٰ کر دیا۔

ف : اس جملہ میں اِنَّمَا زَيْدٌ مُنْطَلِقٌ کی طرح قصر الموصوف علی الصفۃ ہے۔ ابن التمجید فرماتے ہیں کہ جب انہیں مسلمانوں نے کہا: لا تفسدوا۔ تو انہوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کا مقصد یہ ہے کہ ہم لوگ فساد و اصلاح میں خلط و ملط رکھتے ہیں تو اُن کے جواب میں کہہ دیا کہ ہم تو صرف اصلاح کے کاربند ہیں۔ اصلاح سے ہم تجاوز کر کے افساد کی طرف جاتے بھی نہیں ہیں۔ جب ہمارا یہی کام ہے تو ہم میں لزوماً خلط نہ رہا۔ ان کی یہ تقریر قصر الافراد کے قبیل سے ہوگی۔ کیونکہ یہ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مسلمان ہمارے لیے افساد و اصلاح کے مابین شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُن کے اس خیال کے جواب میں خداوند قدوس نے فرمایا:

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ خبردار! اے مسلمانو! جان لو کہ بے شک وہ لوگ فساد کرنے والے ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنے لیے ان دونوں صفات میں سے ایک کا اثبات اور دوسری کی نفی کر کے اس کا اعتقاد ظاہر کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتقاد کا عکس کر کے جس بات کا اثبات کر رہے ہیں اس کی نفی اور جس کی وہ نفی کر رہے ہیں اس کا اثبات فرمایا۔ اب معنی یہ ہوا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو فساد میں ڈالنے اور لوگوں کو ایمان سے ہٹانے والے ہیں - یہ تو فساد سے نکل کر اصلاح کی طرف جاتے بھی نہیں۔ یہ تقریر قصر الشئ علی الحکم کے قبیل سے ہوگی۔ بس یہ لوگ فساد سے

گزر کر دوسری طرف چل بھی نہیں سکتے۔ اس لیے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کے سوا اور کوئی مفسد ہے بھی نہیں۔ اس کے بعد استدراکاً فرمایا وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ اور لیکن انھیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ہم مفسد ہیں۔ باوجودیکہ انھیں امورِ محسوسہ کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ تم مفسد ہو۔ لیکن ان میں ایسی حس نہیں کہ جس سے انھیں اپنا فساد محسوس ہو سکے۔

ف: شیخ صاحب اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ شعور کو افساد کے بالمقابل لانا نہایت موزوں ہے کیونکہ ان کا افساد عادۃً کالمحسوس ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے مسلمانوں کی شرافت اور منافقین کی شرارت کا ثبوت ملا۔ منافقین نے جو اعتراضات مسلمانوں پر کیے ان کا جواب خود دیا، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے کہ جب ولید بن مغیرہ نے آپ کو کہا کہ آپ مجنون ہیں تو اس کے قول کی نفی میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ما انت بنعمة ربك بمجنون۔ تم اپنے رب کی نعمت کی وجہ سے مجنون نہیں۔

پھر اس ملعون کی مذمت میں فرمایا:

ولا تطع كل حلاف مهين همّاز مشّاء بنميم منّاع للخير معتدٍ اثيم عتلّ بعد ذٰلك زنيم۔

یعنی وہ بدبخت حلّاف ہے حقیر عیب دار ہے۔ لوگوں کے پاس چغلخوری کی غرض پر جاتا ہے۔ مال کے لیے بخیل اور ظالم و فاجر غلیظ القلب اور خشک اللسان ہے۔ علاوہ ازیں ولد الزنا (حرام زادہ) ہے۔ اس کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بمقتضائے قولِ باری تعالیٰ (فاتخذه وكيلا) جس نے خداوند قدوس کو اپنے معاملات کا کفیل کار سمجھ لیا تو پھر اللہ تعالیٰ بھی آپ کے جملہ امور کی کفایت فرماتا ہے جیسا کہ اہلِ حقایق فرماتے ہیں کہ خوارق عادات اقطاب اور خلفاً سے بہت کم صادر ہوتے ہیں بلکہ زیادہ تر اُن کے وزراء اور خلفاً سے صدور ہوتا ہے کیونکہ وہ تو عبودیتِ تامہ میں مستغرق اور فقرِ کلّی کے ساتھ موصوف ہوتے ہیں اسی لیے وہ اپنے لیے تصرف کرتے ہی نہیں اور اقطاب کے کمالات اور جو اللہ تعالیٰ کے ان پر الطاف ہوتے ہیں من جملہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھیں جہلاء کی صحبت میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ انھیں علماً، ادباء، امناء کی صحبت نصیب فرماتا ہے۔ پھر یہی لوگ ان کے بار اٹھاتے ہیں اور اُن کے احکام و اقوال کا اجراء کرتے ہیں۔ ان کی مثال کے لیے آصف بن برخیا حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر کا واقعہ ہی کافی ہے کہ وہ اس وقت اپنے زمانہ کے قطب اور متصرف فی الامور اور اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے۔ اس سے جو ظاہر ہوا وہ ہر ایک کو معلوم ہی ہے کہ بلقیس کا بہت بڑا تخت لے آئے جیسے کہ قرآن پاک نے بیان فرمایا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلاتِ نجمیہ میں ان دونوں آیتوں و اذا قيل لهم... الخ کی تحقیق میں اشارہ فرمایا کہ انسان کو اگرچہ ابتداءً زمین کی خلافت کا اہل بنا کر پیدا کیا جاتا ہے مگر وہ ہوا و ہوس اور صفاتِ نفسانیہ سے مغلوب ہو کر فساد کی طرف مائل ہوتا ہے اسی لیے ملائکہ نے اس کے متعلق کہا: قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها۔

پس شریعت کے اوامر و نواہی سے معدنِ نفس کے چنگل سے نکل کر جوہرِ خلافت کا اہل بن جاتا ہے۔ پس اہلِ سعادت تو وہ مومن ہیں جو داعی الی الحق کے فرمانبردار ہو کر اس کے اوامر و نواہی کے پابند ہو جاتے ہیں۔ اور اہلِ شقاوت وہ کافر و منافق ہیں جو دین سے خروج کر کے نفس کی خواہشات کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو۔ یعنی اپنی حسنِ استعداد و صلاحیت للخلافۃ فی الارض کو خواہشاتِ نفسانیہ کی اتباع اور دنیا کے حصول کے حرص میں آ کر ضایع نہ کرو۔ تو اس کے جواب میں کہتے ہیں ہم تو مصلح ہیں۔ پس اسی دھوکا میں وہ کسی کی نصیحت قبول نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

کسے را پندار در سر بود

مپندار ہرگز کہ حق بشنود

ز علمش ملال آید از وعظ ننگ

شقایق بباراں نروید ز سنگ

ترجمہ: جس کسی کے دماغ میں غرور ہوتا ہے تو اس کے متعلق خیال نہ کر کہ وہ سچی بات سنے گا اسے علم سے ملال پیدا ہوگا اور اسے وعظ سے بدنامی پیدا ہوگی۔ پتھروں کے نیچے باوجود بارش ہونے کے بھی گلِ شقایق نہیں اُگتا۔

اُن کے اس غلط خیال کی اللہ تعالیٰ نے تکذیب فرمائی اور فرمایا: الا انّھم ھم المفسدون۔ یعنی آخرت کی بہتری کو دنیا کی بہتری سے خراب کرتے ہیں۔ ولکن لا یشعرون یعنی انھیں اپنے حال کو ضایع کر دینے اور بُرے اعمال اور بہت بڑے وبال جو کہ اچھے فعل کو خراب کرتا ہے اور پھر اس پر بہتری کے دعویٰ کرنے کا شعور بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا۔ الآیۃ (کیا ہم تمھیں ان لوگوں کی خبر نہ دیں جو اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارہ والے ہیں)

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

اے کہ خود را شیرِ یزداں خواندۂ

سالہا شد با سگے درماندۂ

چوں کند ایں سگ برائے تو شکار

چوں شکار سگ شد ستی آشکار

ترجمہ: اے فلاں! تُو جو اپنے آپ کو خدا کا شیر سمجھتا ہے بہت عرصہ گزر گیا لیکن تا حال کتا ہی رہا۔ جب تجھے کتا شکار کرتا ہے تو پھر تو کتّے کے شکار کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔

تفسیر عالمانہ وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا یعنی جب مومنین کی جانب سے انہیں بطریق امر بالمعروف ونہی عن المنکر (جو کہ نصیحت کا اتمام اور رہبری کا اکمال ہے) کہا جاتا ہے کیونکہ ایمان کا کمال ان دونوں چیزوں سے ہوتا ہے یعنی جو چیز بندہ کے شایاں نہیں اس سے اعراض کرنا، وہ لا تفسدوا فی الارض میں بیان کیا گیا اور جو چیز حاصل کرنے کے لائق ہے اسے آمنوا میں بیان فرمایا ہے۔

نکتہ : مومن بہ کو بیان نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود بخود ظاہر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان لاؤ۔

ف : آمنوا بمعنے افعلوا الایمان ہے۔

كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ یہ کاف محلاً منصوب ہے بایں معنی کہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ اب عبارت یوں ہوگی :

آمنوا ایماناً مماثلا لایمانهم۔ یعنی ایمان لاؤ جو کہ مومنین کے ایمان کے مماثل ہو۔

یہ ما مصدریہ یا کافہ ہے۔ یعنی ایمان کو محقق کرو جیسا کہ مومنین کا ایمان محقق ہے۔ الناس میں الف لام جنس کا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو کامل فی الانسانیۃ اور عاقل باقتضاء العقل ہیں یا الف لام عہد کا ہے اور اس سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ مراد ہیں یا ان منافقین کے دوست مراد ہیں۔ یعنی ان کے ہم جنس لوگ جیسے عبد اللہ بن سلام اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم۔ اب معنی اس طرح ہوگا کہ وہ ایمان لاؤ جو کہ خالص مخلص اور نفاق کی ملاوٹوں سے پاک وصاف اور مومنین کے ایمان کے مماثل ہو۔ یعنی امر بالمعروف کے بالمقابل صاف صاف انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ط اس جملہ میں ہمزہ انکار کا ہے اور لام کا مشار بہا الناس الکاملین ہیں یا معہودین یا مطلق مومنین۔ اور وہ بھی ان کے گمان فاسد کی بنا پر ان میں داخل ہیں۔ السفہ بمعنے خفۃ العقل اور سخافۃ رائی۔ یہ دونوں چیزیں قصور عقل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے بالمقابل الحلم والاناۃ مستعمل ہوتے ہیں اور مومنوں کو اس صفت کی منسوب کر رہے ہیں باوجودیکہ وہ حضرات رشد وہدایت ووقار کے انتہائی مراحل طے کیے ہوئے ہیں وہ اس لیے کہ ان لوگوں کے نفوس کمال درجہ کے ساتھ سفاہت میں منہمک اور گمراہی میں غرق ہیں اور وہ بُرے اعمال کو اچھے سمجھنے والے لوگ ہیں۔ پس جو شخص گمراہی کو ہدایت اور ہدایت کو گمراہی سمجھتا ہو اس کا کیا علاج ہے! یا مومنین کو ان کی حقارت کی وجہ سے سفاہت سے منسوب کرتے تھے کیونکہ اکثر مومنین فقراء وتنگدست تھے بلکہ بعض اُن میں سے مملوک تھے جیسے حضرت صہیب اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ اور محض تکبر اور مومنین کی شان میں لاپروائی کرتے ہوئے کہہ دیا۔ یہ اس وقت ہوگا جب الناس سے حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان جیسے صحابی مومنین مراد ہوں۔

سوال : جب وہ کھلم کھلا انؤمن کما امن السفہاء کہہ رہے ہیں تو پھر ان کو منافق کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

جواب : (۱) منافقین لعنہم اللہ تعالیٰ یہ قول اپنے دل میں کہتے نہ کہ زبان سے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے راز فاش

فرماتے ہوئے اُن کے بھید ظاہر فرما دئے تاکہ ان کی عداوت کی انہیں سزا مل جائے۔ اس کی مثال مومنین کا وہ حال ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے حسنِ کلام (جو کہ ابھی اُن کے دل میں پوشیدہ تھی) کو محبت کی بنا پر ان کے خلوص کو ظاہر فرما دیا۔ جیسا کہ سورۂ دہر میں فرمایا:

ویوفون بالنذر تا انما نطعمکم لوجہ اللہ۔ الخ

حالانکہ یہ قول مومنین کے دل میں تھا، انہوں نے زبان سے نہیں کہا تھا مگر خداوند قدوس نے اُن کی عزت افزائی اور ان کی شان کو بلند فرماتے ہوئے ظاہر فرما دیا۔ یہ قول صاحبِ تیسیر کا ہے۔

(۲) یہ قول منافقین آپس میں کہتے اور مومنین سے بالکل مخفی رکھتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو مطلع فرما دیا۔ یہ قول مفسر بغوی کا ہے۔

(۳) ابوالسعود تفسیر الارشاد میں فرماتے ہیں کہ یہ قول اگرچہ مومنین کے سامنے ظاہر بھی ہو گیا ہو جبکہ انہیں نصیحت کی گئی اور ان کی نصیحت کے جواب میں یہ کہہ دیا ہو تب بھی ان کی منافقت میں فرق نہیں آتا اور نہ ہی انھیں مجاہر کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کفر کے اقسام میں یہ ایک عجیب قسم اور اس کے فنون میں سے یہ ایک عجیب فن ہے کہ اس میں بھی شر کا احتمال ہے اور خیر کا بھی یوں محمول کیا جا سکتا ہے کہ منافقین نے مومنین کو نصیحت کے جواب میں کہا کہ ہم اچھے لوگوں کی طرح ایمان لانے والے ہیں نہیں اور منافقت کی جو تم ہمیں تہمت لگاتے ہو اس سے ہم بری ہیں۔ نہ ہی ہم سفہا کی طرح ایمان لاتے ہیں اور نہ ہی پاگلوں کی طرح۔

(۴) ناصحین کو نصیحت کرنے کے بعد منافقین نے استہزاء کیا۔

(۵) ریا کرتے ہوئے جواب دیا اس میں ان کا ارادۂ خیر بیان کرنے کا تھا۔ اور مومنین تو انہیں پہلے معنے کی وجہ سے ایمان کا حکم دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید یوں فرمائی:

الا انھم ھم السفہاء ولکن لا یعلمون۔ یہی لوگ بیوقوف ہیں، بے وقوفی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنے نقصان کو معلوم نہیں کر سکتے۔ اور مومنین چونکہ ایمان واخلاص کی وجہ سے بیوقوفی سے دُور ہو کر علم وحق میں راغب ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے علماء اور ان کے متبعین کا وصف ہے۔ اس جملہ میں اُن کے رد اور ان کی جہالت بیان کرنے میں بڑا مبالغہ ہے کیونکہ وہ جاہل جو خلافِ واقعہ پر اپنی جہالت پر جما ہوا ہو وہ اس بے وقوف اور معترف بالجہل سے زیادہ گمراہ اور جہالت میں زیادہ مکمل ہے کیونکہ واقف معترف بالجہل کو معذور سمجھا جاتا ہے اور کبھی اسے آیات وعیدات نفع دے دیں گی۔

ف: پہلی آیت وما یشعرون میں ان کی حس کی نفی ہے اور دوسری آیت میں دانائی کی (کہ جس میں صلاح وفساد کے مابین تمیز کی جاتی ہے) اور تیسری آیت میں علم کی نفی ہے۔ اور ان تینوں کی اس طرز سے نفی کرنے میں ایک لطیف اور دقیق معنیٰ پیدا ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ:

(۱) حس کی نفی تو بدیہی بات ہے کہ ان کی دھوکا سازی کمال درجہ کی جہالت ہے جو کہ ان کی حس نہ ہونے کی دلیل ہے۔

(۲) اور دوسری بات میں انہیں پتا نہیں چلتا۔ اس بات پر تنبیہ ہے کہ اس بات کا پتا نہ چلنا انہیں لازم ہے کیونکہ جسے حس نہ ہو تو اس سے دانش خود بخود مفقود ہو جاتی ہے۔

(۳) تیسری آیت میں علم کی نفی فرمائی۔ یہ بھی اس ملازمہ کی بدولت کہ جسے دانش نہیں اُسے علم کی دولت سے بھی محرومی ہوتی ہے۔

مکالمہ جبریل و آدم علیٰ نبینا وعلیہم السلام جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم کو پیدا فرمایا تو جبریل ان کے پاس تین تحفے لائے:

(۱) علم (۲) حیا (۳) عقل

اور فرمایا: اے آدم! ان تینوں میں جسے دل چاہے اختیار کرو۔ حضرت آدمؑ نے عقل کو اختیار فرما لیا۔ حضرت جبریل نے علم و حیا کو اشارہ کیا کہ تم اپنے اپنے مقامات پر واپس چلے جاؤ۔ انہوں نے کہا عالمِ ارواح میں ہم یکجا تھے اب عالمِ اشباح میں ایک دوسرے سے جدائی گوارا نہیں۔ فلہذا اب ہم عقل کے پیچھے ہوتے ہیں۔ جبریلؑ نے فرمایا: اچھا، چلو جاؤ۔ آدمؑ کے دماغ میں عقل ٹھہر گئی اور دل میں علم اور آنکھ میں حیا۔ مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

جملہ حیوا نرا پئے انسان بکش

جملہ انسانرا بکش از بہر ہُش

ہُش چہ باشد عقل کل ہوشمند

ہوش جزئی ہش بود اما نزند

لطف او عاقل کند مرنیل را

قہر او ابلہ کند قابیل را

ترجمہ: تمام حیوانات کو انسان پر اور تمام انسانوں کو ہوش پر قربان کیجئے۔ ہوش کیا ہے، ہوشمند کی عقل۔ اور وہ ہوش حقیقی کا جز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم نیل کا عاقل بنا دیتا ہے ایسے ہی اس کا قہر قابیل کو بیوقوف بناتا ہے۔

سبق: عاقل کو چاہیے کہ علم و معرفت کے حصول میں جلدی کرے تاکہ اُن کی بدولت توحید الفعل والصفۃ کے مرتبہ کو پائے۔

ف: امام قشیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، عقل کے نجوم شیطان کے لیے رجوم اور علوم کے لیے چاند اور اصل قلب کے انوار و استبصار اور معارف کے سورج ہیں اور ان کا عارفین کے اسرار پر طلوع ہے۔

ف: علم لدنی وہ ہے جو کسی خارجی سبب مالوف کے بغیر بیتِ قلوب میں تشریف لائے اور قلب کے دو دروازے ہیں

ایک الی الخارج جو کہ حواس سے علم حاصل کرتا ہے، اور دوسرا الی الداخل جو الہام کے ذریعہ علم حاصل کرتا ہے۔ دل کی مثال اس حوض جیسی ہے جس میں پانچ نہریں جاری ہوتی ہیں جب تک کہ اس میں نہروں سے پانی پہنچتا رہے گا پانی میلا کچیلا ہوگا بخلاف اس صورت کے کہ اس کا پانی اس کی گہرائی سے لیا جائے تو وہ پانی صاف شفاف ہوگا اسی طرح دل کا حال ہے کہ جب اُسے حواس ظاہرہ سے علم ہوتا ہے تو اُس میں میل کچیل اور شک و شبہ کی ملاوٹ ہوتی ہے بخلاف اس کے کہ جب اسے صمیم قلب سے بطریق فیض کے حاصل ہو تو وہ نہایت صاف اور افضل و اعلیٰ ہوتا ہے اور شیخ زین الدین الخافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بڑا تعجب ہے اس شخص کے لیے کہ وہ اس طریقہ میں داخل ہو اور ارادہ کرے کہ حقیقت کی طرف پہنچ جائے اور اسے وہ اصطلاحات بھی نصیب ہو جائیں کہ جن سے وہ قرآن و حدیث سے معانی کا استخراج کر سکتا ہے مگر باوجود اس کے پھر بھی ذکر اللہ و مراقبہ اعراض ما سواء اللہ میں مشغول نہیں تاکہ اس کے دل میں علمِ لدنیہ کی بارش ہو۔ اگر اسی طرح ہزار برس صرف اصطلاحات کی تدریس و تصنیف میں بسر کرے تو نہ علوم لدنیہ کی خوشبو نصیب ہوگی اور نہ ہی ان کے آثار و انوار سے روشنی میسر ہوگی۔ پس وُہ شخص جو عالم بلا عمل ہے وہ عقیم ہے۔ اور عامل بلا علم بیمار اور سقیم ہے اور عمل بالعلم صراطِ مستقیم ہے۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

آنکہ بے ہمت چہ با ہمت شدہ

و آنکہ با ہمت چہ با نعمت شدہ

ترجمہ: بے ہمت با ہمت کیا ہوگا، با ہمت نعمت سے بہرہ ور ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ جب اہلِ غفلت و نسیان کو کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی طرح ایمان لاؤ کہ وہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں کہ الست بربکم کو بھلا چکے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی ہمتوں اور اس کی آیات میں تدبر کر کے سنبھل کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاہدہ علی التوحید والعبودیۃ پر ملازمت کر لی جس سے وہی مواعد و مواثیق یاد آ گئے۔ پھر انہوں نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم (اور جو احکام آپ اپنے ساتھ لائے) پر ایمان لایا تو ان کو اہلِ شقاوت کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں سفہاء کی طرح، اسی طرح غافلین مدعیانِ اسلام کو جب ایمان تقلیدی (جو کہ انہیں آباؤ اجداد سے وراثت میں ملا ہے) سے ایمان حقیقی کی طرف جو سچی طلب سے حاصل ہوتا ہے اور ترکِ محبت دنیوی اور ترکِ اتباعِ ہوا و ہوس اور رجوع الی الخلق اور باطل میں مشغلہ بازی سے بلایا جاتا ہے تو اربابِ قلوب و اصحابِ کرامات عالیہ کو بیوقوفی اور جنوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور انہیں عجز و ذلت و قلت و مسکینی کی حالت میں پاکر حقارت سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم دنیا کو چھوڑ دیں۔ جیسے ان سفہاء فقراء نے ترک کر دی ہے۔ پس ہم مخلوق کے محتاج رہیں جیسے کہ یہ لوگ مخلوق کے محتاج ہیں اور وہ اس بات سے لاعلم ہیں کہ دراصل وہی بیوقوف ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الا انّھم ھم السفھاء ولکن لا یعلمون ۔ (خبردار وہی بیوقوف ہیں لیکن وہ نہیں جانتے)
یہ لوگ دو وجہوں سے بیوقوف ہیں؛
ایک تو اس طرح کہ یہ لوگ دنیا کو دین میں اور باقی کو فانی کے عوض بوجہ اپنی بیوقوفی اور عدمِ رشد کے بیچتے ہیں ۔
دوسرے اس طرح کہ انہوں نے اپنی عقل کو بے وقوفی میں ڈالا اور یہ نہ جانا کہ ان میں قربت و درجاتِ علیا کی حُسنِ استعداد ہے۔ اس بنا پر وہ حیوٰۃِ دنیا پہ راضی ہو کر متقیوں کے مراتب اور عقل والوں کے مشارب سے منہ موڑ دیا ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ؛

ومن یرغب عن ملّۃ ابراھیم الاّ من سفہ نفسہٗ ۔ ملتِ ابراہیمی سے بیوقوف ہی رُوگردانی کرتا ہے ۔
کیونکہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا یعنی جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اس نے غیر کو بالکل ترک کر دیا اور اہل اللہ و خاصانِ خدا کو پہچان لیا ۔ پھر نہ تو ان سے منہ موڑتا ہے نہ انھیں سفاہت کی طرف منسوب کرتا ہے بلکہ ان کو عزّت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیونکہ جو فقراُ ہیں در اصل وہی تحت آسمان بادشاہ ہیں اور اُن کے چہرے اللہ کی بارگاہ میں سورج اور چاند کی طرح نورانی ہوتے ہیں لیکن عزّت کے قبّوں کے نیچے پوشیدہ اور غیروں کی نظروں سے محجوب ہوتے ہیں۔ مثنوی شریف میں ہے ؛ ؎

۱ مہر پاکاں درمیان جاں نشاں
دل مدہ الاّ مہر دل خوشاں

۲ گر تو سنگ وصخرہ و مرمر شوی
چوں بصاحب دل رسی جوہر شوی

۳ آنہم تحتِ قبائی آمنون
جز کہ یزد ایشاں نداند ز آزمون

ترجمہ :(۱) نیک لوگوں کی محبت میں جان دے دے، دل صرف انہی کو دے جو خوش دل ہیں۔
(۲) اگرچہ تُو سخت پتھر اور سنگِ مرمر ہے جب اللہ والوں کے ہاں حاضر ہو گا گوہر ہو جائے گا ۔
(۳) وہ آمنون کی قبا میں مخفی رہتے ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے ان کے حالات کو اور کوئی نہیں جانتا۔

تفسیر عالمانہ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔ (ربط:) اس آیت میں منافقین کے اس معاملہ کا بیان ہے جو کہ وہ مومنین اور کفّار کے ساتھ کرتے تھے اور جو باتیں ان سے سرزد ہوئیں ان کا بیان ہے ۔ پس اس میں ان کے مذہب کا بیان اور ان کی منافقت کی تمہید ہے ۔
ف : اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ آیت مضمون کے لحاظ سے مکرر نہیں ۔ یعنی جب مومنین کو دیکھتے ہیں اور اُن سے

ملاقات اور ان سے باتیں کرتے ہیں۔

ف : اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد مہاجرین و انصار ہیں۔

قَالُوْٓا بطورِ جھوٹ کہتے ہیں اٰمَنَّا تمہاری طرح ہم ایمان لاتے اور تصدیق کرتے ہیں۔

شانِ نزول مروی ہے کہ ایک دن عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین اور اس کے ساتھی شہر سے باہر نکلے۔ اُدھر صحابہ کرام بھی تشریف لا رہے تھے۔ عبداللہ ابن ابی اپنے ساتھیوں کو کہنے لگا، دیکھئے میں ان سفہاء کو تم سے کیسے ہٹاتا ہوں۔ چنانچہ صحابہ کرام قریب ہوئے تو سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑ کر خوشامد کرنے لگا کہ "مرحبا، مرحبا! صدیق آپ ہیں بنی تمیم کے قبیلہ کے سردار اور شیخ الاسلام اور ثانی فی الغار ہیں۔ اپنے جان و مال کو اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نثار کرنے والے ہیں۔" پھر سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی ایسے ہی کہنے لگا کہ "مرحبا! آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد اور بنی ہاشم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام کے سردار ہیں۔" حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: "اے عبداللہ! خدا تعالیٰ سے خوف کر، منافقت چھوڑ دے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک منافقین بدترین ہیں۔" عبداللہ ابن اُبی منافق نے کہا: "اے ابوالحسن! بات نہ بڑھائیے، واللہ باللہ ہم آپ لوگوں کی طرح ایمان دار ہیں اور لوگوں کی طرح اسلام کی تصدیق کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ"۔ جب وہ کمبخت اپنے دوستوں سے ملا تو کہتا تھا "تم نے دیکھ لیا کہ میں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے! تم بھی جب اُن سے ملو تو ایسے ہی کیا کرو۔" اس کے ساتھی اس کی تعریفیں کرتے ہوئے کہتے تھے کہ خدا کرے جب تک زندہ رہو عیش و آرام سے بسر کرو۔ جب مسلمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں واپس آئے تو آپ کو یہ سارا ماجرا سنایا جس پر یہی آیت اُتری۔

وَاِذَا خَلَوْا اور جب وہ اپنی خلوت گاہ میں جمع ہوتے ہیں۔ (الی) بمعنے مع ہے۔ یا یہ معنیٰ ہے کہ جب خلوت میں جاتے ہیں۔ اب الی بمعنے با، یا مع کے ہوگا۔ اسی محاورہ کے مطابق کہا جاتا ہے:

خَلَوْتُ بِفُلَانٍ اِلَیْهِ۔ (میں فلاں کے ساتھ خلوت میں رہا)

یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ متکلم کسی کے ساتھ خلوت میں جائے۔ اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ جو کہ تمرد و عناد میں ان کے ہم مثل ہیں اور ان کی طرح کفر کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ شیاطین کی اضافت منافقین کی طرف مماثلت فی الکفر کی وجہ سے ہے یا شیاطین سے مُراد اُن کے سردار ہیں اور قائلین ان کے چھوٹے، اور ہر متمرد کو شیطان کہا جاتا ہے۔ امام ضحاک فرماتے ہیں کہ شیاطین سے مُراد اُن کے کاہن ہیں۔ وُہ کاہن بنی قریظہ میں کعب بن اشرف اور بنی اسلم میں ابوبردہ اور جُہینہ میں عبدالدار اور بنی اسد میں عوف بن عامر اور شام میں عبداللہ بن سوداء تھے۔ اور اہلِ عرب کا اُن کے حق میں یہ اعتقاد تھا کہ یہ لوگ غیب پر مطلع ہیں اور پوشیدہ اسرار کو اچھی طرح جانتے اور مریضوں کا علاج

کرتے ہیں ۔عرب میں ایسا کوئی کاہن نہ تھا جس کے ساتھ ایک شیطان نہ ہو، جو اس کی طرف کہانت کا القاء نہ کرتا ہو۔ اور ان کا قرآن نے 'شیطان' نام اسی لیے رکھا کہ یہ لوگ حق سے دُور تھے اور شیطان کا اشتقاق بھی شطون سے ہے بمعنے بُعد۔ کذا فی التیسیر۔

قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ کہتے ہیں کہ ہم تمہارے دین و اعتقاد کے موافق ہیں یہاں تک کہ تم میں سے ہم کسی حال میں جُدا نہیں ہوں گے ۔

ان کی اس تقریر کے بعد گویا ان پر اعتراض ہوا کہ جب تم لوگ ہمارے ساتھ ہو تو پھر مومنین کے کلمۂ شہادت پڑھنے اور اُن کی مجلسوں اور مسجدوں میں آنے جانے اور ان کے ساتھ حج کرنے اور جنگ کے لیے جانے میں کیا فائدہ؟ تو ان کے جواب میں کہتے ہیں اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○ یعنی مومنین کے ہاں ایمان ظاہر کرکے ہم ان سے استہزاء کرتے ہیں یہانتک کہ اس وقت ہمارے دلوں میں ایمان کی حقیقت کا خیال بھی نہیں گزرتا ۔ انھیں ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ ظاہرًا و باطنًا تمہارے ساتھ ہیں حالانکہ ہم اُن کے ساتھ صرف ظاہر میں ہیں تاکہ ہم اُن سے اموالِ غنیمت اور ان کی لڑکیوں سے شادیاں اور ان کے پوشیدہ اسرار سے مطلع اور ان سے اپنے اموال و اولاد اور عورتوں کی حفاظت کرسکیں ۔

حلِ لغات : الاستهزاء بمعنے دوسرے کو جاہل سمجھنا اور اس سے مسخری کرنا اور حقیر سمجھنا ۔

اب معنیٰ یُوں ہُوا کہ ہم اپنا اسلام ظاہر کرکے حضور علیہ السلام اور ان کے اصحاب کو جاہل سمجھ کر ان کا تمسخر اڑاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذکورہ تقریر کے رد میں فرمایا : اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں استہزاء کی سزا دے گا یا یہ کہ اس استہزاء کا وبال ان کی طرف لوٹے گا ۔ پھر وہی استہزاء کیے ہوئے ٹھہریں گے یا ان پر حقارت و خرابی نازل ہو گی جو کہ استہزاء کو لازم ہے یا ان کے ساتھ مُسْتَهْزِئ جیسا معاملہ کیا جائے گا، یا دنیا میں ان پر مسلمانوں کے احکام جاری کرکے چند روز مہلت دے کر اور نعمتوں میں زیادتی کرکے ان کی سرکشی و طغیانی کو بڑھاتا ہے ۔ آخرت میں ان کے ساتھ ایسے ہی ہو گا ۔

چنانچہ مروی ہے کہ جب یہ لوگ دوزخ میں ہوں گے تو ان کے لیے بہشت کا دروازہ کھولا جائے گا ۔ یہ لوگ بہشت کی طرف دوڑیں گے ۔ جب بہشت کے قریب پہنچیں گے تو دروازہ بند کر لیا جائے گا ۔ پھر ان کو دوزخ کی طرف لوٹایا جائے گا ۔ مومنین تخت پر بیٹھ کر ان کی اس حالت کو دیکھ کر ہنسیں گے ۔ جیسا کہ یہ لوگ دنیا میں مومنین پر ہنستے تھے ۔ یہ فعل ان کے ساتھ دنیا کے فعل کے عوض ہو گا ۔ اور اسی طرح اُن کے ساتھ کئی بار کیا جائے گا ۔

وَيَمُدُّهُمْ ان کو بڑھائے گا اور قوت دے گا ۔

حلِ لغات : مَدَّ الجَيش و اَمَدَّهٗ سے ماخوذ ہے ۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جبکہ لشکر کو قوت ہو ۔ اَمدّ فی العمر (یعنی عمر میں زیادتی کرنا) سے ماخوذ نہیں کیونکہ وہ اُملی لهم کی طرح لام سے متعدی ہوتا ہے ۔ اسی یہ

ابنِ کثیر کی قرأت دلالت کرتی ہے۔

فِیْ طُغْیَانِہِمْ اس کا متعلق یَمُدُّھُمْ ہے اور طغیان بمعنے مرمیں حد سے تجاوز کرنا۔ اس سے سرکشی میں اُن کی زیادتی اور ان کا کفر میں غلو کرنا مراد ہے اور طغیان کا اُن کی طرف مضاف ہونے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سرکشی اُن کے ساتھ مخصوص ہے اور اس بات کی تائید ہے کہ اُن کے بُرے اختیار کی وجہ سے انھیں مہلت دی گئی ہے۔

یَعْمَھُوْنَ ٥ یعنی گمراہی میں حیران پھرتے ہیں یہ دنیا میں ان کو استہزاء کی سزا ہے اور ھُمْ ضمیر منصوب یا مجرور سے حال ہے کیونکہ مصدر مضاف ہے اور وہ حکماً مرفوع ہے اور اَلْعَمَہُ بصیرت کا اندھا پن۔ جیسے عُمْیٌ بصارت کا اندھا پن۔ بصیرت کا اندھا پن بمعنے تحیّر اور تردّد ہے بایں حیثیت کہ اسے علم نہ ہو کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

تفسیر صوفیانہ ٥ ان دونوں آیتوں میں اشارات ہیں، قولہ تعالیٰ اِنَّا معکم یہ کہ جو شخص اپنے ارادہ اور لوگوں کی جبلّی عادت کو جمع کرنا چاہے تو یہ محال ہے کیونکہ:

الضِّدّان لا یجتمعان۔

(دو ضدیں کبھی جمع نہیں ہوتیں)

جس کے ہر طرف دوست ہوں اور اُس کا ہر سُو دِل کا تعلق ہو تو اس کے کئی تصورات ہوں گے۔ اور علائق میں بٹ جائے گا۔ یہی حال منافقین کا ہے کہ وہ ہمیشہ تردّد میں رہتے ہیں۔ کفّار کے ساتھ رہ کر اُن کے مفاسد اور مسلمانوں کے ساتھ اُٹھ بیٹھ کر اُن کی بھلائیاں جمع کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ محال ہے، جیسے اجتماع النقیضین محال ہے۔ بنا بریں بیچارے دار اور دروازے کے درمیان پھنسے رہے۔ کما قال تعالیٰ:

مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَا اِلٰی ھٰؤُلَاۗءِ وَلَا اِلٰی ھٰؤُلَاۗءِ۔

اسی طرح ان دونوں کا ہے جو چاہتے تو کچھ ہیں لیکن عادت کو نہیں چھوڑتے۔ مقاصدِ دارین کے طالب ہوتے ہیں اور دین کے مراتب کے متمنّی ہوتے ہیں لیکن دُنیا کی خواہشات میں تتر بتر رہتے ہیں، اس وجہ سے اپنے مقاصد میں پُورے نہیں اُترتے۔

حدیث شریف حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لَیْسَ الدِّیْنَ بِالتَّمَنِّیْ۔

(دین صرف آرزو کرنے سے ہی حاصل نہیں ہوتا)

اور فرمایا:

بُعِثْتُ لِرَفْعِ الْعَادَاتِ وَدَفْعِ الشَّھَوٰتِ۔

(میں عادات کو بلند کرنے اور خواہشات کو مٹانے کے لیے مبعوث ہُوا ہوں)

حدیث شریف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اَلدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ ضَرَّتَانِ۔
(دنیا و آخرت آپس میں سوکنیں ہیں)
جو شخص ان دونوں کو جمع کرنا چاہے وہ دھوکا میں ہے اور فریب خوردہ ہے۔ اور جو شہوت رانی کر کے بلند درجات تک پہنچنے کا خواہشمند ہے اسے مسخرہ سمجھو۔ جو اس راہ پر چلنے والے کے ساتھ استہزاء کرتا ہے نقصان اٹھاتا ہے۔ بہت سے اس راہ پر چلنے والے اس دریا میں غرق ہوئے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کے حرص رکھنے والوں کو مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی طلب میں حدِ احتیاج سے متجاوز ہو کر دنیاوی مقاصد کے دروازوں پر دستک دینے میں منہمک ہوتے ہیں۔ جس قدر زیادہ دُنیاوی امور میں انہماک ہوتا ہے اسی قدر ان کی طلب میں حیران رہتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ:
انّ الانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ۔ (بیشک انسان سرکش ہے یہ کہ اسے دیکھا تو بے پروا ہوگیا)
اس لیے دنیا کی طلب میں قسم قسم کے حیلے کرتے ہیں۔ اس کی سزا استہزاء ہے اور استہزاء کی سزا رسوائی اور مہلت دینا ہے جس کی وجہ سے وہ سرکشی میں پھنسے اور سرکشی کی سزا حیرانی ہے جو ہمیشہ گمراہی میں حیران پھرتے ہیں جنہیں باطل سے نکلنا اور حق کی طرف رجوع کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ف: اللہ یستھزئ بھم میں ایک اور اشارہ بھی ہے وہ یہ کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مومنین کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا مرتبہ ہے بایں معنیٰ کہ کفار کا ان سے استہزاء کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمۂ کرم لگایا ہے کہ انہیں کفار کے استہزاء کے جواب کے لیے معارضہ کی ضرورت نہ پڑے۔ مومنین کی طرف سے استہزاء کا معاملہ ایسا اتم فرمایا کہ جس کے بعد اس سے اور کوئی مزید بلیغ استہزاء نہیں ہے حالانکہ کسی دوسرے سے استہزاء سے روکا ہے۔ کما قال:

لا یسخر قومٌ من قوم۔ (کوئی قوم کسی دوسری قوم سے استہزاء نہ کرے۔
اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں استہزاء کو جہالت سے تعبیر فرمایا۔ کما قال:
قالوا اتتخذنا ھزوًا۔ (انہوں نے کہا کیا آپ ہمارے ساتھ استہزاء کرتے ہیں)
اور فرمایا:

أعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین۔ (میں پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں سے ہو جاؤں)
ف: جب لوگوں سے استہزاء بہت قبیح امر ہے پھر اللہ تعالیٰ سے استہزاء کس قدر قبیح ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے:
اَلْمُسْتَغْفِرُ مِنَ الذَّنْبِ وَھُوَ مُصِرٌّ عَلَیْہِ کَالْمُسْتَھْزِئُ بِہٖ۔ (جو گناہوں کی معافی

مانگنے کے بعد پھر اسس پر اصرار کرے تو یوں سمجھو کہ اُس نے اللہ تعالیٰ سے استہزاء کیا)

تیسرا اشارہ یہ بھی ہے کہ و یمدھم فی طغیانھم سے بتایا گیا ہے کہ بندوں کے لیے لائق نہیں کہ وہ اپنی لمبی لمبی عمروں سے فریب خوردہ ہوں اور مال و اولاد کی زیادتی سے دھوکا کھائیں۔ چنانچہ طویل العمر اور کثیر المال والاولاد دشمنوں کے لیے فرمایا ہے۔ چنانچہ،

وَيَمُدُّهُمْ۔ یعنی ان کی عمریں بڑھا دیتا ہے۔

اور فرمایا: يَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنُوْنَ۔ یعنی وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کے مال اور اولاد میں اضافہ کرتے ہیں۔

پھر جتنی زیادتی ہوجائے گی اسی قدر سزا زائد ہو گی۔ کما قال:

وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا۔

(دُنیا میں اپنے دشمن کا مال بڑھاتا ہے)

کما قال:

مَالًا مَّمْدُوْدًا۔ (مال بڑھا ہوا)

(اور اپنے دوستوں کے لیے بہشت کے باغات بڑھائے گا)

کما قال:

وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ۔ (اور سائے دراز)

قصہ معراج کا ایک عطیہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں فرمایا کہ یہ بھی ایک نعمت ہے کہ میں آپ کی اُمت کے لوگوں کی عمریں چھوٹی بناؤں گا تاکہ ان کے گناہ زیادہ نہ ہوں۔ اور ان کے مال تھوڑے کر دوں گا تاکہ قیامت میں اُن کا حساب لمبا نہ ہو۔ اور سب سے پیچھے انھیں اس لئے بھیجا تاکہ قبروں میں انھیں زیادہ دیر نہ رہنا پڑے۔

معراج میں حضور کو حکم ربانی مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شبِ معراج میں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: اے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم)! اچھے لباس اور بہترین طعام اور اعلیٰ بچھونے سے احتراز فرمائیے اس لیے کہ نفس تمام بُرائیوں کا مرکز اور منبع ہے اسے نیکی کی طرف بلاؤ تو وہ برائی کی طرف کھینچتا ہے، اور طاعت کے لیے تو اس کا جی چاہتا ہی نہیں۔ ہاں بُرائی کا شیدائی ہے اور جب سیر ہوتا ہے تو سرکشی کرتا ہے اور کثیر مال پاتا ہے تو تکبّر کرتا ہے جو اچھی بات ہوتی ہے اسے بھلا دیتا ہے۔ عیش و طرب میں غفلت کا خوگر ہے، شیطان کا گہرا دوست ہے۔ کذا فی مشکوٰۃ الانوار۔

تفسیر عالمانہ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وہ منافقین جن کے اوصافِ شنیعہ بیان کیے گئے ہیں اب وُہ لوگ اپنے ماسوا سے ایسے علیحدہ ہو چکے ہیں کہ گویا وُہ موجود و مشاہد ہیں اور اس ہاں بُعد کا معنیٰ بوجہ ان کے سوٗ حال اور شر میں بُعدِ مرتبہ کے ہے۔ اولٰئك بوجہ مبتدا ہونے کے مرفوع ہے اور اس کی خبر الذین اشتروا الضللة بالهدٰی ہے۔

حلِ لغات: اشتراء دراصل مطلوبہ اشیا کے حصول میں ثمن خرچ کرنے کا نام ہے پھر اس چیز کے لیے استعارہ کیا گیا ہے جو قبضہ میں ہو۔ دوسرے چیز کے حاصل کرنے کے لیے، پھر اس سے بھی کچھ آگے وسعت دیتے ہوئے کسی شے میں رغبت کرنا اس طمع پر کہ اس کے عوض کوئی دوسری چیز ملے گی، کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہاں پر اشتراء سے ان کا وہ معاملہ مراد ہے جو ان کے حالات میں گزر چکا ہے۔

اشتروا الضللة، ضلالت سے کفر اور حق وصواب سے اعراض کرنا مراد ہے۔

بالهدٰی ہدٰی سے ایمان اور سلوک فی الصراط المستقیم اور اس پر استقامت پکڑنا مراد ہے۔ اس میں استعارہ کیا گیا ہے یعنی ضلالت میں رغبت کرنے سے ایمان کی بجائے گمراہی لینا ہے۔ اور پھر ایمان سے روگردانی کرنے کا مطلب لیا گیا ہے۔ یعنی انہوں نے ایمان کی بجائے گمراہی کو پسند کیا اور ایمان کو گمراہی سے تبدیل کر لیا اور ایمان کے بجائے گمراہی لے لی۔

سوال: انہوں نے ہدایت دے کر گمراہی خریدی۔ کیا ہدایت اُن کے ہاتھ میں تھی؟

جواب: استعارہ تو آپ سُن چکے۔ استعارہ کا یہ معنیٰ ہے کہ ہدایت حاصل کرنے کی انھیں قدرت تھی اور وہ وہی استعداد ہے جو ہر شخص میں رکھی گئی ہے۔ پھر انہوں نے گمراہی کی طرف میلان کر کے ہدایت کو ضایع کر دیا۔ یعنی ہدایت کو ترک کر دیا اور باء معاوضات میں متروک شے پر داخل ہوتی ہے۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ اگر ایجاب وقبول نہ بھی ہو تب بھی لینے دینے سے بیع ہو جاتی ہے کیونکہ ان لوگوں کو ترکِ ہدایت واخذ ضلالت پر مشتری کہا جا رہا ہے اگرچہ اس تبادلہ میں انہوں نے کوئی کلام بھی نہ کیا۔ کذا فی التیسیر

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ یہ مجاز کے لیے ترشیح ہے۔ یعنی انہوں نے اس تجارت میں نفع نہ پایا۔ کیوں کہ نفع کا اسناد تو درحقیقت اربابِ تجارت کی طرف ہوتا ہے اور اس میں خود تجارت کی طرف اسناد کرنا بہنائے توسع ہے کہ تجارت کو فاعل سے متلبس اور مشابہ کر کے فاعل کا حکم لگا دیا گیا۔ یہاں تک کہ اب ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ خود تجارت نفع ونقصان کا سبب ہے۔ اور فاء کو اس لیے داخل کیا گیا کہ یہ کلام شرط کے معنیٰ کو متضمن ہے۔ دراصل عبارت یُوں تھی: واذا اشتروا فما ربحوا۔ (کواشی) (جب انھیں خریدا تو نفع نہ پایا)

اور تجارت تاجروں کی ایک صنعت کا نام ہے جو نفع کے حصول کی غرض سے بیع وشراء کا کام کرتے ہیں۔

اور مرابحہ اس زیادتی کا نام ہے جو راس المال سے زاید ہوتی ہے۔

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ یعنی تجارت کے طریق پر وہ ہدایت یافتہ نہیں ہیں۔ کیونکہ تجارت سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ راس المال بھی بچ جائے اور نفع بھی حاصل ہو۔ اگر ایک دفعہ نفع دستیاب نہ ہو سکے تو دوسری بیع میں اصل کی بقاء کی وجہ سے جبراً نقصان ہو جائے گا۔ لیکن جس کا اصل مال بھی ضائع ہو جائے اس کی تجارت کا ہے کی۔ اور ان لوگوں نے تو اپنے راس المال کو ہی ضائع کر رکھا ہے کیونکہ ان کا راس المال فطرۃ سلیمہ اور عقل خالص تھا۔ جب انہوں نے ان گمراہیوں کا اعتقاد اپنے میں راسخ کر لیا تو اُن کی استعداد باطل اور عقل ختم اور سرے سے راس المال ہی نہ رہا کہ جس سے وُہ حق و کمال کو پہنچ کر کچھ فائدہ مند ہوں۔ لیکن اس لحاظ سے وُہ خاسر ہو کر اپنے نفع سے ناامید ہو گئے اور اصل کو گم کرتے ہوئے تجارت کی راہ سے ہزاروں کوس دُور جا پڑے۔

نکتہ : مھتدی وہ ہے جو دنیا اور خواہشِ نفسانی ترک کر کے طاعت وعبادت میں مشغول ہو، نہ وُہ جو کہ نفسانی خواہش کا حکم کرے تو وہ اس پر عمل کر کے ہدایت کو خواہش نفسانی سے مخلوط کر دے۔

حکایت شیخ استاذ ابی علی دقاق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک دولت مند تاجر مرید تھا وہ بیمار ہو گیا۔ شیخ صاحب اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور بیماری کا سبب پُوچھا۔ عرض کی: حضور! رات کو تہجد کی ادائیگی کا ارادہ ہوا اور اُٹھ کر وضو کرنے کا قصد کیا تو گرمی کے آثار نمودار ہوئے اور اب یہاں تک نوبت ہے کہ مجھے سخت بخار ہے۔ شیخ نے فرمایا: بیٹے! فضول بات سے بچو۔ تجھے ایسی تہجد فائدہ نہیں دے گی جب تک کہ تم دنیوی معاملات کو ترک کر کے دنیا کی الفت دل سے خارج نہ کرو گے۔ اب تیرے لیے پہلے یہ ضروری ہے، پھر نوافل ادا کرو۔ دردِ سر کے اندر ہو اور دوا پاؤں پر ملتے رہو، اسی طرح ہاتھ کو نجاست لگی ہو اور دامن وغیرہ کو دھوتے رہو تو اس سے کیا فائدہ! ایسے ہی تم اپنا حال سمجھو۔

ف : بعض مشایخ فرماتے ہیں کہ خواہشات کی ایک علامت یہ ہے کہ بندہ خیرات و نوافل میں تو تیز مگر واجبات کے حقوق میں سست ہو۔ اور یہ عادت عام مخلوق میں ہے (مگر جسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے)۔ چنانچہ تم خود ہی تجربہ کر لو کہ بعض صاحبان ایسے ہوتے ہیں کہ نوافل و اوراد غیر واجبہ (جو سخت سے سخت ہوں گے) کی ادائیگی میں بڑے چست و چالاک ہوں گے مگر ضروری فرض کی ادائیگی میں کماحقہٗ دل چسپی نہیں ہوگی۔ عاقل کو چاہیے کہ اوّلاً راس المال کو حاصل کرے پھر اس نفع کے حصول میں کوشش کرے کہ جو کہ اصل راس المال سے حاصل ہو، اور یہ عمل اختیاری ہے نہ کہ اضطراری۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے معاملہ میں سست و کمزور دیکھ کر اپنی طاعت وعبادت فرض فرمائی ہے کیونکہ انھیں اس کی اطاعت وعبادت کی طرف لے آنے والی کوئی ایسی شے نہیں جو انھیں مجبور کر کے لے آئے۔ لیکن یہ حال اکثر مخلوق کا ہے۔ ہاں اہل اللہ و اولیاءِ کرام اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔ مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

۱ اختیار آمد عبادت را نمک
ورنہ میگردد بنا خواہ این فلک

۲ گردش او را نہ اجر و نہ عقاب
کہ اختیار آمد ہنر وقتِ حساب

۳ ائتیا کرھاً مہار عاقلاں
ائتیا طوعاً بہارِ عاشقاں

۴ ایں محب دایہ لیک از بہر شیر
واں دگر دل دادہ بہر آں ستیر

ترجمہ : (۱) اختیاری معاملہ عبادت کو فائدہ دیتا ہے ورنہ افلاک تو شب و روز عبادت میں گھوم رہے ہیں۔

(۲) لیکن بے اختیار ہو کر افلاک کی گردش پر نہ ثواب نہ عذاب اس لیے کہ اختیار سے ہی عبادت لکھی جاتی ہے۔

(۳) ائتیا کرھاً (مجبور ہو کر آؤ) عاقلوں کی مہار اور ائتیا طوعاً (خود بخود آؤ) عشاق کی دام ہے۔

(۴) بچہ دایہ کا عاشق ہے لیکن صرف دودھ کے لیے۔ اور وہ اپنے محبوب کا دائمی عاشق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ پر اپنی اطاعت واجب فرمائی ہے۔

اور دراصل اس پر طاعت واجب فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ بہشت میں داخل ہو کیونکہ اس امر کا مرجع بہشت ہی ہے اور یہ اسباب عدمیہ ہیں۔ اور نفس کی ہمیشہ یہی عادت ہے کہ اچھی باتوں سے ہٹ کر بُرے کام میں مشغول ہوتا ہے جسے خواہش ہو کہ اسے اللہ تعالیٰ اس خواہش نفسانی سے محفوظ رکھے جو نیکیوں سے باز رکھنے والی ہے۔ اور اس غفلت سے بچالے جو اسے بہترین حالات سے دُور رکھتی ہے تو اُسے چاہیے کہ وہ قادرِ قدیر کی بارگاہ میں گڑگڑائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وکان اللہ علیٰ کلّ شیءٍ مقتدراً

(اور اس کی قدرت ہر شے سے متعلق ہے)

اور اس کا نیکی کو پالینا بھی ایک شے ہے جو اللہ تعالیٰ عطا فرما دے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ تجھے یہ مقام حاصل ہو تو تُو اپنے جیسے لوگوں کو دیکھ کہ انہوں نے ان مراتب کو کیسے حاصل کیا۔ جیسے حضرت ابراہیم بن ادہم و فضیل بن عیاض و ابن المبارک و ذوالنون مصری و مالک بن دینار، اور اسی طرح کے دیگر محرم رازِ حق (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)۔ حافظ شیرازی رحمہ اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں ؛ ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست ورنہ طبیب ہست

ترجمہ: عاشق اپنے معشوق کے ہاں حاضر ہوا لیکن اس نے توجہ نہ فرمائی۔ اسے کہو کوئی حرج نہیں درد نہ ہو تب بھی طبیب موجود ہے تجھے بفضلہٖ تعالیٰ درد بھی ہے۔

تفسیر صوفیانہ کاشانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آیت میں ہدایت سے نورٌ علیٰ نور (آیت سورۂ نور) کا دوسرا نور مراد ہے اور وُہ نور فطری ازلی ہے جسے محققین فیض ربانی کی استعداد مراد لیتے ہیں۔ اور ضلالۃ سے مراد وہ فطرۃ ہے جو اس نور ازلی کے لیے حاجب ہے جو طبیعت فاسدہ اور مقاصد ہیولانیہ فاسقہ خواہشات نفسانیہ اور طرقِ شیطانیہ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اور ربح سے مراد وہ نور اول ہے جسے بندگان حاصل کرتے ہیں لیکن توجہ حق و اتصال بعالم قدس اور غیر اللہ سے بالکل علیحدگی اختیار کرنے کی وجہ سے اور پھر اس مالک کی قوت کو شاملِ حال سمجھ کر اور غیر وہم ایسا بھول جائے کہ روح صرف مشاہدۂ ربانی میں مصروف ہو بلکہ ذاتِ حق کی تجلیات میں ایسا جل بھن جائے کہ ہستی موہوم بالکل رہے بھی نہ۔

اور خسران سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنا دارین کا فائدہ ضائع کر دیا اور اس خرابی سے نورِ حق اُن سے محجوب ہو گیا۔ کما قال تعالیٰ :

کلّا بل ران علیٰ قلوبھم ما یکسبون کلّآ انّھم عن ربھم یومئذٍ لمحجوبون۔[1]

اور تاویلاتِ نجمیہ میں ہے : ان لوگوں کا سرکشی میں پھنس کر اندھا ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دُنیوی امور میں خوش ہیں اور اس سے مطمئن ہیں۔ اس وجہ سے گمراہی اُن کے دلوں کی گہرائیوں پر اثر کر گئی ہے۔ پھر یہی سزا نصیب ہُوئی جس کا ذکر آیت میں ہے۔ اسی لیے آیت اولٰئك الذین اشتروا الضللۃ میں فعل کی نسبت ان کی طرف ہوئی۔ اشتراء کا لفظ بھی اسی لیے فرمایا کہ انہوں نے ہدایت کی استعداد اپنے سے بالکل نکال دی ہے اب اس کی طرف راجع ہوتے بھی نہیں اور نہ ہی اس تجارت سے انہیں کوئی نفع ہے اور جو شخص آخرت کی بجائے دنیا سے راضی ہو اس کا نقصان بھی ظاہر ہے اور جو صرف دنیا و عقبیٰ کا طالب ہو اور مُولا کا طالب نہ ہو۔ وہ تو بہت زیادہ گھاٹے میں ہے اور اس سے زیادہ محرم کوئی ہے بھی نہیں۔ جب اُخروی نعمتوں سے محروم ہو جائے تو اسے جہنم کی سزا ہے۔ پھر جو اپنے محبوب کی طلب اور اس کے دیدار سے محروم ہو تو اس کی سزا کتنی زیادہ ہو گی اور پھر انھیں ہدایت بھی کب نصیب ہو جبکہ انہوں نے قبولِ ہدایت کی استعداد ہی ختم کر ڈالی ہے۔

---

[1] خبردار ان کے قلوب پر زنگ چڑھ گیا اس وجہ سے جو وہ عمل کرتے خبردار ایسے لوگ اپنے ربّ سے حجات میں نہیں

تفسیر عالمانہ مَثَلُهُمْ ، مثل دراصل نظیر کو کہتے ہیں ۔ پھر ہر اس قول کو کہا جانے لگا جو اس واقعہ واردہ کے مشابہ ہو اور پھر اس میں کسی قسم کی تبدیلی بھی نہ کی جائے اور مثل بھی ہر اس قول میں بیان کی جاتی ہے جس میں ایک قسم کی غرابت ہو اس لیے اسے تغییر سے محفوظ رکھا جاتا ہے ۔ پھر استعارہ کیا گیا ہے ہر اس حال یا قصہ یا صفت کے لیے کہ جس میں عجیب و غریب شان اور غرابت ہو ۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے :

مثل الجنّة التی وعد المتقون اور و للہ المثل الاعلیٰ ۔

یعنی وہ وصف کہ جس میں شانِ عظمت وجلال ہے ۔

ربط : جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حال حقیقت بیان فرمائی تو اس کے بعد مزید وضاحت کی خاطر مثال دی کیونکہ مثال عقل کا اچھا ذریعہ اور وہم کو قابو کرنے میں اقویٰ وسیلہ ہے ۔ غبی جاہل کو سمجھانے اور منکر سرکش کے حملہ سے محفوظ ہونے میں ۔ کیوں نہ ہو جبکہ تمثیل میں منکر کو معروف کی صورت میں دکھایا جاتا ہے اور وحشی کے سامنے ہیئت مالوف میں ظاہر ہونا اور خیالی شے کو محقق بنا کر دکھانا اور معقول کو محسوس کی شکل میں پیش کرنا اور معانی کو اشخاص (یعنی ملبوس) کی تصویر میں لانا یعنی مثال سے خفی کو جلی سے اور غائب کو حاضر سے تشبیہ دینا مقصود ہوتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں انہی تمثیلات کو بہت بیان فرمایا ہے اور انجیل میں تو ایک سورۃ کا نام سورۃ الامثال ہے اور قرآن پاک میں ہزار آیات ہیں جن میں امثال وعبرتیں ہیں ۔ اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ 'اتقان' میں لکھتے ہیں کہ قرآن پاک کے اعظم علوم میں سے علمِ امثال بھی ہے لیکن لوگ اس سے غافل ہیں ۔ مثلهم کا معنیٰ یہ ہے کہ اُن کا حال عجیب الشان ہے ۔

كَمَثَلِ الَّذِی تخفیف کی خاطر اسم موصول کی جمع کی بجائے واحد کو رکھا گیا کیونکہ یہ لفظ (الّذی اپنے صلہ کی وجہ سے جمع کا معنیٰ دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وخُضتم کالذی خاضوا ۔ (اور تم نے ان کی طرح غور و خوض کیا جنہوں نے پہلے ایسے کیا تھا)

اور الذی بمعنی الذین پر کلام کا ماقبل و مابعد قرینہ ہی ہے ۔ علاوہ ازیں استوقد نارا" میں ضمیر واحد کا لایا گیا ہے اس کے ظاہر کا اعتبار کر کے اور باقی آئندہ افعال میں صیغہ جمع کا ہے الّذی کے معنیٰ کا اعتبار کر کے ۔

اِسْتَوْقَدَ - الاستیقاد بمعنے طلب الوقود اور اس کے حصول میں سعی کرنا ۔ یعنی آگ کا روشن کرنا اور اس کے شعلے بلند کرنا ۔ **نَارًا** اور نار ایک جوہر لطیف ہے جو روشنی دینے والی اور جلانے والی شے ہے اور نور اس کے ضوء کا نام ہے ۔ اسی طرح ہر نورانی شے کے ضوء کو بھی نور کہتے ہیں جو ظلمت کی نقیض ہے[1] ۔ یعنی

---

[1] نقیض وہ ضد ہے جو دوسری ضد کو اپنے مقابل نہ آنے دے جیسے دن کی نقیض رات ، موت کی نقیض زندگی ، یعنی یہ یک وقت ان میں سے ایک ہی چیز کا ظہور ہوگا تو دوسری چیز مفقود ہوگی دونوں کا بیک وقت واقع ہونا محال ہے ۔ (مترجم)

جنگل میں اندھیری رات میں درندگان وغیرہ کے خوف سے بہت بڑی آگ جلائی۔ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ۔ الاضاءۃ یعنی فرطُ الاِنَارَۃِ یعنی بہت زیادہ روشن ہونا یا کرنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا سے پتا چلتا ہے۔ یعنی ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو آگ جلائے۔ پھر جب روشن ہوجائے مَا حَوْلَهٗ آگ جلانے والے کے گرداگرد جو مکان واشیا ہیں۔ اگر اضاءت متعدی ہو لفظ ما اس کا مفعول ہوگا اور حَوْلَهٗ کی نصب علی الظرفیۃ ہوگی۔ اور اگر اسے لازم قرار دیا جائے تو فعل کا اسناد لفظ ما اور تانیث کی طرف ہوگا کیونکہ اس شخص کا گرداگرد امکنہ واشیاء کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ اور حول بمعنے دوران ہے۔ سال کو بھی اسی لیے حول کہتے ہیں کہ وہ چکّر لگاتا ہے۔ اور لمّا کا جواب ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ہے۔ یعنی اسے بالکلیہ لے جائے اور اس کی آگ بجھادے جو کہ ان کے نور کا دارومدار ہے۔

سوال : اذہاب کو نُور سے کیوں معلق کیا گیا ہے نار سے کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب : نار کے جلانے سے مقصود نُور ہی ہوتا ہے۔

سوال : اذہاب کا اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں کیا گیا ہے؟

جواب : (۱) ہر چیز کا خالق وہی ہے اس اعتبار سے اس کی طرف اسناد کیا گیا۔

(۲) آگ کا بجھنا سبب خفی سے ہوا یا کوئی امر سماوی پہنچا جیسے ہوا یا بارش۔

(۳) یا بطور مبالغہ کے ہے جیسا کہ اسے باؔ سے متعدی کرنے سے پتا چلتا ہے۔ کیونکہ باء میں مصاحبت وامساک کا معنیٰ ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:

ذهب السلطان بماله۔

یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ مال بادشاہ لے لے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ لے کر بند کرلے پھر اسے کون چھڑانے والا ہے، اسی لیے ضوء سے (اگرچہ بہ اقتضائے ظاہر یہی ہونا چاہیے تھا) سے عدول کرکے نور کو اختیار کیا۔ کیونکہ ضیاء کے ذہاب سے نور کا بقاء ہوسکتا ہے کیونکہ ضعیف کا نہ ہونا قوی کے نہ ہونے کو مستلزم نہیں ہے اور یہاں پر مراد اس نور کا بالکلیہ زائل کرنا مراد ہے جیسا کہ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ سے پتا چلتا ہے کیونکہ ظلمت بمعنے نور کا نہ ہونا بالخصوص اس وقت جبکہ دوہری (اس کی) تہ بر تہ ہو کہ اُس کا بعض اس کے بعض پر ہو جیسا کہ اسے جمع اور تنکیر تفخیمی سے معلوم ہوتا ہے اور اس کا مابعد لا یبصرون کا معنیٰ بھی نہیں متحقق ہوسکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو کہ نور کا نام ونشان نہ رہے۔

اور ترک دراصل طرح دخلی کے ہے اسے ایک مفعول چاہیے لیکن صیر کے معنے کو ضمن میں رکھ کر افعالِ قلوب سے ہوکر دو مفعول کا طالب ہوتا ہے۔ اب عبارت یوں ہوئی: صیّرهم فی ظلمٰتٍ لا یبصرون ما حولهم۔ اس

عبارت کے اعتبار سے فی ظلمٰت اور لا یبصرون، صیّر کے دو مفعول ہوں گے۔ اور اگر اسے اپنے اصلی معنیٰ پر لیا جائے یہ دونوں مفعول یعنی ضمیر ھُم سے حال ہوں گے۔ مترادفین یا متداخلین اور معنیٰ یُوں ہوگا کہ ان کا حال عجیب ہے کہ انہوں نے گمراہی کو خریدا جسے ظلمت کفر و نفاق کہا جاتا ہے کہ جیسے ظلمت غضبِ الٰہی اور ظلمت یومِ قیامت (کہ جس دن دیکھو گے کہ نُور ان کے دائیں بائیں دوڑتا ہوگا) اور ظلمت العقاب دائمی شامل ہے وہ ہدایت جو اُن کی فطری نوری تھی کہ جس سے دلائل حق مشاہدہ کر چکے دے کر ان کا حال اس شخص جیسا ہے جو ایک بہت بڑی آگ جلائے قریب تھا کہ وہ اس سے بہرہ یاب ہو کہ اللہ تعالیٰ اس آگ کو بجھا کر انہیں ان ظلمات میں چھوڑ دے جو ان کے لیے حائل ہوں اور جس سے آنکھوں کو کچھ نظر نہ آسکے۔

التیسیر والعیون میں ہے کہ منافقین نے کلمۂ ایمان زبان سے نکالا تو اس کی بدولت نوریاب ہوئے اور اس کی عزت کی وجہ سے عزت پائی اور اس کے سبب سے امن پایا۔ مسلمان عورتوں سے نکاح کیے۔ مسلمانوں کے وارث بنے اور ان کو غنیمتیں تقسیم کیں اور اپنی اولاد و اموال میں امن پایا۔ جب آخر العمر کو پہنچے تو اُن کی زبان گنگ ہو گئی اور ہمیشہ ہمیشہ تک ظلمتِ کفر میں رہے جس کی وجہ سے خوف و ظلمت کی طرف لوٹے۔

صُمٌّ یعنی وہ منافقین حق کو سننے سے بہرے ہیں یعنی حق کو قبول نہیں کرتے اور جب وہ حق کو قبول نہیں کرتے تو گویا وُہ سنتے ہی نہیں اور الصمّ دراصل سننے کے مواضع کے سوراخوں کا ایسا بند ہو جانا کہ وہاں تک ہوا کا گزر بھی نہ ہو سکے کہ اس تموج سے آواز حاصل ہوتی ہے۔ بُکْمٌ حق سے گنگ ہیں کہ اسے بیان نہیں کرتے جبکہ وہ چھپا رکھا ہے اُس کے خلاف بولتے ہیں گویا کہ وُہ بولتے بھی نہیں ہیں اور گنگ زبان کی ایسی آفت ہے جس کی وجہ سے مواضع الحروف پر اعتماد کرنے سے اُسے قدرت نہیں ہوتی۔ عُمْیٌ یعنی انہوں نے وہ آنکھیں گم کر دی ہیں کہ جن سے نظر کریں اور وُہ نظر انہیں عبرت دے کر ہدایت کی طرف کھینچ کر لے جائے بلکہ یہ لوگ بصیرت کی بینائی بھی گم کر چکے ہیں۔ کیونکہ جس کی بصیرت مٹ گئی گویا اس کی بصارت بھی مٹ گئی۔ بنا بریں یہاں پر عمی عدم البصیرۃ والبصر دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ اور یہ صفات اُن کے دنیا میں ہیں اسی لیے آخرت میں انہیں ایسی ہی سزا ملے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَنحشرھم یوم القیٰمۃ علیٰ وجوھھم بکماً وعمیاً۔ اور ہم انہیں قیامت میں چہروں پر گونگے اور اندھے بنا کر اٹھائیں گے۔

اس دن نہ تو وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سُن سکیں گے نہ اس سے کلام کر سکیں گے اور نہ ہی اس کے دیدار سے مشرف ہوں گے بخلاف اہلِ اسلام کے کہ وہ حق کے سننے والے اور حق کے دیکھنے والے ہیں۔ اسی لیے قیامت میں اللہ تعالیٰ کے خطاب اور دیدار اور سلام سے نوازے جائیں گے۔ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ یعنی بوجہ اوصاف مذکورہ کے وہ لوگ گمراہی سے ہدایت متروکہ کی طرف نہیں لوٹ سکتے۔ یہ آیت تمثیل کا خلاصہ و نتیجہ ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ سلامت آلات کی وجہ سے ہدایت کی طرف رجوع کر سکتے ہیں کیونکہ ہدایت کو ترک کرنے پر مذمت کے مستحق ہوئے

اور صُمٌّ و بُکمٌ و عُمیٌ سے آلاتِ حس کی نفی تو نہیں بلکہ ان کے استعمال نہ کرنے کی نفی ہے۔ شیخ سعدی قدس سرّہٗ فرماتے ہیں : ؎

۱ زباں آمد ز بہر سپاس
بغیبت مگر داندش حق شناس

۲ گزرگاہ قرآن و پنداست گوش
بہ بہتان باطل شنیدن مکوش

۳ دو چشم از پئے صنع باری نکوست
زعیب برادر فروگیر و دوست

ترجمہ : (۱) زبان صرف شکر کرنے کے لیے ہے لیکن تم اسے کسی کی غیبت میں ملوّث نہ کرو۔
(۲) کان قرآن پاک اور نصیحت سننے کے لیے ہیں لیکن تم انہیں گندی باتوں کے سننے میں مت لگاؤ۔
(۳) دو آنکھیں اللہ تعالیٰ کی صنعت کے نظاروں کو دیکھنے کے لیے ہیں۔ انھیں اور دونوں ہاتھوں کو غلطیوں سے محفوظ رکھیے۔

ف : اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو رجوع الی الائتمار بامرہ و انتہا بنہیہ کا اختیار دیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے :
وکذالك نفصل الآيات ولعلهم يرجعون۔ اور ایسے ہی ہم آیات تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ لوٹ آئیں۔
جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف بالاختیار راجع نہ ہُوا تو اسے اس کی طرف موت سے راجع کریں گے۔ کما قال :
كلّ نفسٍ ذائقة الموت ثم الينا ترجعون۔ ہر جی موت کا ذائقہ چکھے گا پھر وہ ہماری طرف لوٹ آئیں گے۔
اور جس نے اس کی طرف دُنیا میں بفضلہ رجوع کیا اور انّا لله و انّا اليه راجعون کے قول کو محقق کیا تو اس کا یہ رجوع بالکرامتہ ہوگا اور وہ يٰاَيها النفس المطمئنة ارجعي الى ربك راضية مرضية کے خطاب سے مشرف ہوگا۔

حکایت زمانہ سابقہ میں ایک جبار سرکش تھا جس نے ایک محل تیار کیا اور اسے بڑا پختہ بنوایا اور بہت سجایا، پھر قسم کھائی کہ جو شخص اس کے قریب جائے گا یا اس کی طرف بُری نظر سے دیکھے گا اُسے قتل کرا دے گا۔ اور بعدازاں کئی لوگوں کو اس جرم میں قتل کروا دیا گیا۔ ایک شخص اُس کے پڑوسیوں میں سے تھا اسے بڑی نصیحت کی مگر وہ نہ مانا۔ ایک مردِ صالح نے اس شہر سے باہر جاکر ایک جھونپڑی تیار کی جس کا کوئی دروازہ تھا نہ سوراخ۔ عبادت کی خاطر تنہائی اختیار کی۔ اُدھر وہ سرکش بادشاہ اس محل میں عیش سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک دن محل میں بیٹھا، اس کے ساتھی اس کی خدمت میں حاضر تھے۔ ادھر ملک الموت ایک حسین وجمیل نوجوان کی شکل میں تشریف لائے اور محل کے اردگرد گھوم رہے تھے اور بار بار اس کی چوٹیوں کو دیکھ رہے تھے کسی نے بادشاہ سے کہا کہ تیرے محل کو ایک نوجوان

دیکھ رہا ہے۔

دیکھا تو کہا کہ یہ پاگل معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ناواقف یا مسافر ہے۔ لیکن تم سے کوئی جاکر اسے بُلا لائے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص گیا اور سختی سے یوں پیش آیا کہ نیام سے تلوار نکال کر اسے مارنے کا ارادہ کیا تو ملک الموت نے اس کی روح قبض کرلی، جس سے وہ بیہوش ہوکر گر پڑا۔ بادشاہ کو کسی نے آکر کہا وُہ دیکھو آپ کے فرستادہ کو اُس نوجوان نے مار ڈالا ہے۔ بادشاہ نے غصّے میں آکر دوسرے آدمی کو تلوار دے کر حکم دیا کہ جاؤ اسے قتل کردو۔ اس نے دوسرے کا بھی وہی حال کیا۔ بادشاہ کو اُس دوسرے کے قتل ہوجانے کے غیظ و غضب نے محل سے نکلنے پر مجبور کردیا۔ تلوار پکڑ کر خود باہر آیا اور ملک الموت سے کہنے لگا: تجھے موت کا ڈر نہیں ایک تو تُو میرے محل کے قریب گھوم رہا ہے دُوسرے دو آدمیوں کو قتل بھی کر ڈالا۔ ملک الموت نے کہا: بادشاہ سلامت! ذرا سوچ کر بولیے آپ کو علم ہے کہ میں کون ہُوں! میں قابضِ ارواح عزرائیل ہُوں۔ بادشاہ یہ کلمہ سنتے ہی کانپنے لگا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور کہا: ہاں، میں نے آپ کو پہچان لیا۔ یہ کہہ کر واپس ہونے لگا۔ ملک الموت نے فرمایا: شاہ جی! کہاں جا رہے ہو میں تو آپ کے لیے کھڑا ہوں اب تو آپ نے قبر میں جانا ہے۔ بادشاہ نے کہا: صرف ایک منٹ کی مہلت چاہیے تاکہ میں اپنے اہل و عیال سے کچھ بات چیت کرلُوں اور انھیں کچھ وصیّت بھی کرلوں۔ ملک الموت نے فرمایا: اب تک آپ کہاں رہے، اب کوئی فرصت نہیں۔ یہ کہہ کر ملک الموت نے روح قبض کرلی اور چلتے بنے۔ مرنے کے بعد رونا کیسا!

ملک الموت اس فراغت کے بعد سیدھے اس مردِ صالح کے پاس پہنچے اور فرمایا: مبارک باد تمہارا وہ سرکش بادشاہ آج موت کے کڑوے گھونٹ پی کر مرگیا۔ تمام واقعہ سنایا۔ مردِ صالح کا ارادہ ہوا کہ واپس اپنے گھر جائے۔ ملک الموت کو اس کی موت کا حکم آ پہنچا۔ چنانچہ ملک الموت نے اس مردِ صالح سے کہا: آئیے، اب آپ کی باری بھی آگئی۔ مردِ صالح نے کہا: بسر و چشم، اگر مہلت عنایت ہو سکے تو میں گھر جاکر اُن سے کچھ باتیں اور وصیت کرلوں۔ حکم ایزدی ہوا کہ اسے مہلت دے دو۔ چنانچہ مہلت لے کر چند قدم چلے، سوچا اور نادم ہوکر ملک الموت سے کہا مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ اگر گھر جاؤں تو کہیں کسی بُرے فعل کا ارتکاب نہ کر بیٹھوں، اللہ تعالیٰ میرے اہل کا آپ مالک ہے وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے، آئیے میری رُوح قبض کرلیجے۔

سبق: بعض عارفین فرماتے ہیں کہ بہت تعجب ہے اس شخص پر جو اس اَمر سے بھاگتا ہے جو ضروری ہونے والا ہے وہ مالک ہے جس نے بندہ پر ہر بھلائی کی منت اور ہر نعمت عطا فرمائی، اور اپنے بندہ سے وہ چیز طلب کرتا ہے جو اس کے ساتھ باقی رہنے والی نہیں۔ یعنی خواہشات خواہ وہ دنیا سے متعلق ہیں یا آخرت سے، اس لیے کہ بات نہ آنکھیں دیکھ رہی ہیں نہ ہی دل جو سینوں میں پوشیدہ ہے۔

ف: بصیرت کا اندھا ہونے کے تین سبب ہیں:

(۱) اپنے اعضاء کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مطلق العنان کر دینا۔
(۲) اللہ تعالیٰ کی عبادت ریا کے طور کرنا۔
(۳) خلقِ خدا سے طمع بازی ، کیونکہ جب دل اندھا ہو جاتا ہے تو سالک اللہ تعالیٰ سے مُنہ موڑ کر غیر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

تفسیر صُوفیانہ یہ مثال اس سالک کی ہے جو ابھی راہِ حق میں گامزن ہوا ہے اور مدت تک آزمایش و تکالیف و مصائب کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ پھر وہ طلب کی آگ کو جلاتا ہے اور اپنے ارد گرد کو روشن پاتا ہے جس سے وہ اپنے سعادت و شقاوت کے اسباب دیکھ لیتا ہے تو پھر اسے کسی کامل کی صحبت بیسر ہو جاتی ہے اس کی خدمت کرتا ہے خلوت گزیں ہوتا ہے نفس کو دنیا سے دُور ہٹاتا ہے خواہشات کا قلع قمع کرتا ہے۔ جس سے اُس کا دل شوق کے انوار سے چمک اٹھتا ہے اور اس کی رُوح ذوق کی تجلیات سے اُجاگر ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مامون ہو جاتا ہے اور نفس کی فریب کاریوں سے بچ جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے شیطانی خطرات اور اس کے وساوس ا سے گھیر لیتے ہیں۔ اب قہقہہ کے ساتھ اُلٹے پاؤں لوٹتا ہے یعنی دنیا کی پست حالتوں کو پہنچ جاتا ہے اور دنیوی سوچ میں گم ہو جاتا ہے اور نفس کی اندھیریوں میں ڈوب جاتا ہے۔ مقصد تک پہنچنے سے پیشتر ہی وصال کی رسّی ٹوٹ جاتی ہے باوجودیکہ نعمتوں کی جنت میں رکھ پاتا ہے لیکن اس سے اُسے نکال لیا جاتا ہے۔ پھر بیچارہ ملال اور تنگدستی کے قدموں پر چل کر بُرے سے بُرے حال میں پہنچایا جاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ:

وبدا لهم من الله ما لم يكونوا يحتسبون۔ اور اس کے لیے وہ ظاہر ہوا جس کا انھیں گمان نہ تھا۔

صُمٌّ یعنی ان کے دل بہرے ہو چکے ہیں کہ جن سے یومِ میثاق کا خطاب سُنا تھا اور زبانیں بھی کہ جن سے بلیٰ کا لفظ عرض کیا تھا اور ان کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں کہ جن سے جمالِ حق کے دیدار سے مشرف ہوئے اور پھر انھیں اس کا عرفان نصیب ہُوا۔ اسی وجہ سے وُہ رجوع کرنے والے نہیں۔ حظائرِ قدس کی منازل کی طرف رجوع کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اُنس کے باغات کے رجوع سے بھی محروم ہو گئے کیونکہ اُن کے دل کا دریچہ جو یومِ میثاق کو کھولا گیا عالمِ قدس کی جانب کھلنے والا ہے اب انہوں نے اسے خود ہی بند کر دیا ہے اور تتبع شہوات اور لذّات کے درپئے ہو کر اور دھوکا سازی اور منافقت کاری کی وجہ سے اب اُن پر نہ تو جناب قدس کی ہوائیں چلتی ہیں اور نہ ہی نفحاتِ ارواح کی نسیم ان کو نصیب ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ان کے دل بیمار ہو گئے۔

پھر ان کے لیے ایسا طبیب بھیجا جو اپنے ساتھ بیماری کی شفا بھی لایا۔ کما قال تعالیٰ:

وننزّل القرآن ما هو شفاءٌ ورحمةٌ للعٰلمين۔ اور ہم قرآن نازل کرتے ہیں جو عالمین کے لیے شفا اور رحمت ہے۔

مومنین سے مراد وُہ ہیں جو اطبّاء کی تصدیق کرتے اور ان کی ادویات کو مانتے ہیں۔ اور وہ لوگ جنھوں نے نہ اطبّاء کو مانا،

نہ ہی ان کی ادویات کو، تو سمجھ لو کہ انھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اُن کے لیے دوا بیماری بن جائے گی اور شفا، وبا۔ کما قال تعالیٰ:

ولا یزید الظالمین الا خسارا۔ (اور ظالموں کا خسارہ بڑھاتا ہے)

جب یہ لوگ اہلِ رحمت نہ ہوئے تو ان کو لعنت نے گھیر لیا جو ان کے بہرے اور اندھے ہونے کا سبب بنی۔ کما قال:

اولئك الذین لعنھم اللہ فاصمّھم واعمٰی ابصارھم۔

تفسیر عالمانہ

اَوْ كَصَيِّبٍ یا منافقین کی کہاوت صَیِّبٌ کی طرح۔ یعنی اصحابِ صیّب کی طرح ہے۔

حلِ لغات: صَیِّبٌ اس بارش کو کہتے ہیں جو موسلا دھار ہو۔ اور اس کا ماخذ الصّوبُ ہے اور صَوْبٌ بمعنے نزول ہے۔ اور لفظ صَیِّبٌ دراصل صیوبٌ تھا اور کاف مرفوع المحل ہے جس کا عطف کمثل الذی کے کاف پر ہے۔

اَوْ تخییر و تساوی کے لیے ہے۔ یعنی منافقین کا حال ان دو قصوں کے مشابہ ہے اور چونکہ یہ دونوں قصے مستقل قصے ہیں اس لیے ہر ایک میں سے منافقین کے لیے مثال دی جائے تو بھی حق ہے اور اگر دونوں کو اُن منافقین کے لیے مثال دی جائے تب بھی درست ہے۔

مِّنَ السَّمَآءِ صیّبٌ کے متعلق ہے اور السماء بمعنے دنیا کی چھت۔ اور اسے معروف بالام لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ بارش کا آنا صرف ایک کنارہ سے نہیں ہوتا کیونکہ ہر ایک کنارہ اُن کے کناروں میں سے ہے۔ یعنی ہر اس چیز کو جسے آسمان کا ایک کنارہ احاطہ کرتا ہے اسی کا نام علیحدہ آسمان ہے۔ اب معنیٰ یوں ہوا کہ وہ عام بارش جو بھرے ہوئے بادل سے نازل ہوتی ہے وہ بادل آسمان کے کناروں کو پکڑے ہوئے ہے اور آسمان سے بادل گرتا اور پانی بھی اسی سے لیتا ہے۔ ایسا نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ بادل پانی دریا سے لیتا ہے۔

ف: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بارش ان بخارات سے حاصل ہوتی ہے جو کہ زمین سے نکل کر ہوا میں اُوپر کو جاتے ہیں پھر وہاں خلا کی ٹھنڈک کی سختی سے جم کر پانی بن کر گرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی اس غلط فہمی کا ابطال من السّماء سے فرمایا۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عرش کے نیچے ایک دریا ہے جس سے حیوانات کے رزق نازل ہوتے ہیں۔ اس کی طرف وحی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے حسبِ مشیت ایزد متعال اپنا پانی نیچے والے آسمان کی طرف گراتا ہے۔ پھر وہ نیچے والے کو، اسی طرح سب سے نیچے والے آسمان تک یہی سلسلہ رہتا ہے۔ پھر بادل کو حکم ہوتا ہے کہ تو چھلنی ہو جا۔ تو وہ چھلنی بن جاتا ہے جس سے وہی پانی قطرات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر کوئی ایسا قطرہ زمین پر نہیں گرتا جس کے ساتھ ایک فرشتہ نہ ہو۔ جہاں ضرورت ہو وہی فرشتہ اس قطرہ کو لے کر وہاں

پہنچاتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر قطرہ کیل معلوم و وزن معلوم کے ساتھ گرتا ہے بخلاف یوم طوفان کے کہ وہ بارش بلاکیل و وزن کے تھی۔ (کذافی تفسیر التیسیر)

فِيْهِ ظُلُمٰتٌ یعنی بارش میں تاریکیاں ہوتی ہیں۔ یعنی وہ تاریکیاں کئی قسم کی ہیں۔ ان میں سے ایک تاریکی وہ ہے جو بہت سخت گھاٹی ہے بوجہ بارش کے قطرات کے پےدرپے ہونے اور پھر بادل کے سایہ کرنے اور رات کی اندھیریوں کی شمولیت کی وجہ سے۔ اور آیت میں ایسی کوئی بات نہیں جو دلالت کرے کہ اس میں رات کی تاریکی مراد نہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ اس میں رات کی تاریکی بھی ہو۔ جیساکہ آنے والی آیت یکاد البرق یخطف ابصارھم اور اس کے بعد والی آیت و اذا اظلم علیھم قاموا کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ برق کا آنکھ کو چمک لینا عموماً اندھیری راتوں میں ہوتا ہے۔ اور اسی طرح چلنے والے کا چلنے سے ٹھہرنا اس وقت ہوتا ہے جبکہ رات کی ایسی تاریکی ہو کہ چلنے والے کی آنکھوں کو آگے کو دیکھنے سے روک لے، بخلاف بادل کا سیاہ ہونا اور پھر اس کا کثیف ہونا دن میں ایسی صورت نہیں پیدا کرتا کہ چلنے والے کو چلنے سے روک دے۔ (کذافی حواشی ابن التمجید)

سوال: بارش ظلمات کا محل کیوں قرار دیا گیا ہے حالانکہ ضروری نہیں کہ بارش میں اندھیریوں کا محل ہو، ہاں رات ہو تو پھر اس میں تاریکی کا وہم نہیں ہوتا ہے۔ اس میں رات کی تاریکی کو تابع اور بارش کی تاریکی کو متبوع مقرر کیا گیا ہے حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔

جواب: صرف مبالغہ مقصود ہے اور بارش سے ڈرانا مطلوب ہے، تنبیہ کرنا ہے کہ بارش کی تاریکی ایسی سخت ہوتی ہے کہ رات کی تاریکی اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے۔ ظلمات کا مرفوع ہونا ظرف کی وجہ سے ہے کیونکہ اس کا اعتماد موصوف پر ہے کیونکہ جملہ محل جر میں ہے اس لیے کہ ایک قول کے مطابق صیب کی صفت ہے۔

وَّرَعْدٌ وہ سخت آواز جو بادل سے سنائی دیتی ہے وَّبَرْقٌ وہ چمک جو بادل سے (جبکہ اس کے اجزاء ایک دوسرے سے ملیں) حاصل ہوتی ہے۔

سوال: رعد و برق کا محل بارش کو کیوں قرار دیا گیا حالانکہ اس کا محل تو بادل ہے۔

جواب: بادل سے یہ دونوں بارش کے واسطہ سے متعلق ہیں۔ اور اسی واسطہ کے لحاظ سے ان کا محل بارش کو بنایا گیا۔ اور حکماء میں یہ مشہور ہے کہ رعد کی وہ آواز ہے جو بادل کے اجرام کے آپس میں ٹکرانے سے نکلتی ہے یا وہ آواز ہے جو ہوا کے جھونکوں سے جب بعض اجزاء بعض سے خارج ہوتے ہیں تو پیدا ہوتی ہے وہی رعد ہے لیکن حقیقت وہی ہے جو حضرت امام ترمذیؒ نے روایت کی ہے۔

حدیث شریف حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہود نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ فرمائیے: رعد کیا شے ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ فرشتہ

جو بادل پر مقرر کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ آگ کا چابک ہے جس سے وہ اس بادل کو ہانکتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ پھر انہوں نے عرض کی: یہ آواز (جو سُنائی دیتی ہے) کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ اس کی زجر ہے جو بادل کو وہاں پہنچنے کا حکم دیتا ہے جہاں پر حکم دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ آیت میں رعدؔ سے مراد اس فرشتہ کی آواز ہے نہ کہ خود فرشتہ، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ رعدؔ ایک فرشتہ ہے جو بادل کے پھیرنے گھیرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے، جو اس بادل کو اُس جگہ لے جاتا ہے جس جگہ کا حکم ہوتا ہے اور اپنے انگوٹھے سے پانی جاری کراتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتا ہے۔ جب وہ تسبیح پڑھتا ہے تو آسمان میں کوئی ایسا فرشتہ نہیں ہوتا جو اس کے ساتھ مل کر تسبیح نہ پڑھے۔ تب اس وقت سے پانی کے قطرے گرنے شروع ہو جاتے ہیں۔

اور برق سے مراد چابک ہے جس سے فرشتہ بادل کو مارتا ہے۔ اور مخاریق ' مخراق کی جمع ہے۔ یہ دراصل اس کپڑے کو کہتے ہیں جس کو لڑکے لپیٹ کر ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔ اور یہاں پر وہ آلہ مراد ہے جس سے فرشتے بادل کو ہانکتے ہیں۔ ساکن جلوتیہ مرجع طریقت شیخ یعنی افتادہ آفندی فرماتے ہیں کہ ان دونوں اقوال میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان کی مطابقت یُوں ہونی چاہیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ابتداء کا اعتبار کیا اور حکماء نے انتہاء کا۔

يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ یہ تمام ضمائر مضاف محذوف کے لیے ہیں کیونکہ دراصل عبارت یُوں ہے:

او کاصحاب الصیّب۔ موسلا دھار بارش والوں کی طرح

جیسا کہ گزرا۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ جملہ مستانفہ ہو۔ کیونکہ جب رعد اور برق وغیرہ کا بیان کیا گیا تو گویا سائل نے پُوچھا کہ ایسی حالت میں اصحابِ صیّب کا کیا حال ہوگا؟ تو جواب میں فرمایا: یجعلون اصابعھم۔ اور اصابعھم بمعنے انا ملھم ہے۔ اور اس میں مبالغہ ہے جو انا ملھم کہنے سے مقصد ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا کہ وہ لوگ شدّتِ حیرت کی وجہ سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے۔ نہ صرف (انگلیاں) انامل جیسا کہ عادت ہے۔ یا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسی کمال حیرت اور سخت دہشت اور ایسے حال کو پہنچے ہوئے تھے کہ وہ اپنے اعضاء کو اصلی صورت پر استعمال کرنے سے عاجز تھے۔ یہی بات ہے کسی خاص انگلی مثلاً سبابہ کے ذکر نہ کرنے میں۔ لیکن یہ اس لیے ہو کہ ادب کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے کیونکہ وہ سبّ (گالی دینا) سے مشتق ہے۔ اور قرآن کے آداب میں یہی اولیٰ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ عرب اب اسے مسبحہ اور مہلکہ وغیرہما سے تعبیر کرتے ہیں اور اس جیسے الفاظ کو بھی ذکر نہ کیا۔ کیونکہ ایسے استعمالات جدیدہ ہیں کہ جس سے عوام بے خبر تھے۔

مِنَ الصَّوَاعِقِ یجعلون کے متعلق ہے یعنی صواعق کی وجہ سے۔ اور صواعق صاعقہ کی جمع ہے۔ رعد کی وہ گرج جس سے دل دھڑکتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ایک شعلہ بھی ہوتا ہے جہاں پھر وہ اپنی لطافت کی وجہ سے فوراً بجھ جاتا ہے۔

حکایت ایک کھجور پر بجلی گری تو وہ آدھی جل گئی پھر بجھ گئی۔ اس کے بعد لوگ کہتے ہیں کہ کھجور کی چوٹی اور آسمان کے مابین ایک آگ دکھائی دیتی۔ پھر کھجور کی چوٹی ٹکڑے ہونے لگ جاتی جس سے ہلکی سی آواز خارج ہوتی۔ (کذا فی روضۃ العلماء)

ف : بعض کہتے ہیں صاعقہ سے مراد آگ کی وہ چنگاریاں ہیں جو بادل کے ٹکڑوں کے آپس میں ٹکرانے سے خارج ہوتی ہیں۔ پھر وہ جب بھی کسی شے پر گریں تو اسے جلا کر رکھ دیتی ہیں۔ پھر زمین کے اندر گھس کر پانی پر پہنچ کر بجھ جاتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جب سورج زمین پر چمکتا ہے تو اس کی چمک سے خشک زمین کے چند اجزاء ناریہ خارج ہوتے ہیں جن کے کچھ ارضی اجزات بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے اختلاط کا نام دخان ہے۔ دونوں مل کر اوپر جاتے ہیں اور کُرۂ باردہ میں پہنچ کر بادل بن جاتے ہیں۔

ف : حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جو شخص رعد کی آواز سُن کر سبحان الذی یسبح الرعد بحمدہ والملٰئکۃ من خیفتہ وھو علیٰ کل شئ قدیر پڑھے۔ اگر اس کا نقصان ہو تو اس کا تاوان میرے ذمہ ہے۔

گرج کے وقت کی دُعا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رعد اور اس کی گرج سُنتے تو یہ دعا پڑھتے : اَللّٰھُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُھْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ۔ (کذا فی تفسیر الشیخ وشرح الشرعہ)

حَذَرَ الْمَوْتِ ط یَجْعَلُوْنَ کا مفعول لہ ہے اسی لیے منصوب ہے اور کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کی علت ہے۔ یعنی ہلاک ہونے کی وجہ سے۔

ف : موت حیات کی بنیاد کے فساد کا نام ہے۔

وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ[1] اَلْاِحَاطَةُ بمعنیٰ الاحداق بالشئ من جمیع جہاتہ۔ اور یہ معنیٰ اللہ تعالیٰ کے مجاز ہو گا۔ اب معنیٰ یوں ہُوا کہ : واللہ محدق بعلمہٖ وقدرتہٖ۔ **بِالْكٰفِرِيْنَ ٥** یعنی اللہ تعالیٰ سے کافرین نہیں چوک جائیں گے۔ جیسے محیط سے محاط نہیں چوکتا۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ انہیں جمع کر کے عذاب دے گا۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا وغیرہ۔ انھیں عذاب سے نہیں بچائے گا۔ کیونکہ تدر کو حذر نہیں ہٹاتا۔ اور نہ ہی حیلے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دفع کر سکتے ہیں اور ھُمْ ضمیر کی بجائے الکٰفرین لانے میں اشارہ ہے کہ اُن کو

---

[1] اور اللہ تعالیٰ اپنے علم و قدرت سے محیط ہے۔

یہ عذاب وغیرہ جو پہنچ رہا ہے اُن کے کفر کی وجہ سے ہے۔ یَکَادُ الْبَرْقُ یکاد بمعنے یقرب ۔ یہ دُوسرا جملہ مستانفہ ہے ایک سوال مقدر کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ گویا سائل نے پُوچھا کہ اس برق میں ان کا کیا حال ہوگا تو اس کے جواب میں فرمایا یَکَادُ..... الخ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ط یعنی اپنی شدّتِ ضَو کی وجہ سے اُن کی آنکھیں اُچک لے۔ کُلَّمَا ظرف ہے اس کا عامل اس کا کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ جواب ہے یعنی مَشَوا اور اَضَاءَ متعدی ہے بمعنے انار البرق الطریق فی اللیلۃ المظلمۃ یہ تیسرا جملہ مستانفہ ہے۔

گویا کسی نے پُوچھا کہ یہ لوگ بجلی کے ظاہر ہونے اور مٹنے پر کیا کرتے تھے۔ کیا یہاں بھی وہی حالت تھی جو کانوں میں کرتے تھے یا اُس کے خلاف، تو جواب میں فرمایا کہ بجلی کی روشنی میں ان کو راہ مل جاتی تھی تو مَّشَوْا فِیْهِ ق اس راہ پر چل پڑتے جہاں پر نُور کی شعاعیں پڑتیں تو چند قدم چلتے لیکن یہ خوف انہیں ہر وقت رہتا کہ شاید بجلی آنکھ کی بینائی اچک لے۔ مشیٌ کی بجائے سعیٌ اور رعدٌ نہ کہا۔ اس میں اشارہ ہے کہ ان پر اتنی دہشت طاری تھی کہ دوڑنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ یعنی جب بجلی گم ہو جاتی تو راستہ پر اندھیرا چھا جاتا قَامُوْا ط یعنی جہاں ہوتے متحیر ہو کر ٹھہر جاتے، دوسری گھڑی کا انتظار کرتے کہ شاید انھیں مقصود تک پہنچنے کی راہ مل جائے یا کوئی پناہ مل جائے کہ جس سے وہ اس تکلیف سے بچ جائیں۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اگر چاہے کہ ان کے کان جو سر میں ہیں اور بینائی جو آنکھ میں ہے چھین لے جیسے کہ اُن کے دل کی سمع وبصر چھین لی۔ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ط صوتِ رعد اور نورِ برق سے ان کی سمع وبصر چھین لے۔ انہیں سزا دینے کی بنا پر، کیونکہ اس سے وہ باری تعالیٰ عاجز نہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ جو بھی ممکنات میں سے موجودات ہیں سب پر قادر ہے اور خود باری تعالیٰ پر اگرچہ شئے کا اطلاق کیا جا سکتا ہے لیکن وُہ موجود بالوجوب ہے نہ بالامکان، اور عاقل پر مخفی نہیں کہ اس جیسی عبارت میں شے سے ماسوا باری تعالیٰ مراد ہے اور دلالت عقل سے آیت ہذا میں جن کو لفظ شے شامل ہے اللہ تعالیٰ کی ذات مستثنیٰ ہے۔ اب معنیٰ یوں ہُوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ماسوا پر قادر ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: فلانٌ امینٌ۔ یعنی وہ اپنے ماسوا تمام لوگوں میں سے امین ہے اس میں اس کا اپنا نفس داخل نہیں۔ اگرچہ یہ بھی منجملۃ الناس ہے۔ (کذا فی حواشی ابن التمجید)

ف : ہر شے کا فاعل اللہ تعالیٰ جس طرح اُس کی حکمت کا تقاضا ہے نہ حکمت کی اقتضاء سے کوئی شئے زاید ہو سکتی ہے اور نہ کم۔ اور یہ تمثیل کشف بعد کشف اور ایضاح بعد ایضاح کے پہلی تمثیل سے زیادہ بلیغ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حیرت اور ان کا گمراہی میں مخبوط العقل ہونا، اور پھر ان کے امر کی شدّت اور ان کی رُسوائی و فضیحت کو اس شخص سے تشبیہ دی کہ جیسے اندھیری رات میں بارش نے گھیرا ہو، پھر اس میں بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک اور صواعق کا خوف، پھر موت کا ڈر ہو۔ یہ اس وقت ہے جبکہ یہ مثال مرکب ہو۔ اسی وجہ سے قرآن پاک کو بلاغت کا اعلیٰ درجہ دیا جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے اور پھر اس ہیئت حاصلہ کو بھی کہ جس سے یہ صورت مرکب ہے تو اس میں عجیب قسم کی بلاغت حاصل ہوتی ہے

جو مفردات میں نہیں ہے۔ جیسا کہ مجموعۂ آیت سے پتا چلتا ہے کہ اس قسم کی بارش گھیر لیتی ہے کہ جس میں اندھیریاں ہوں اور بادلوں کی ظلمات ہوں۔ علاوہ ازیں گرج اور کڑک بھی اور بجلی کا گرنا بھی اور جن پر بارش واقع ہو رہی ہے اُن کا موت سے گھبرانا بھی تو ایک عجیب امر پیدا ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت اس وقت پیدا نہیں ہوتی جب کہ ایک ایک شئے سے علیحدہ علیحدہ کو واقع

ف : قرآن پاک کے معارف و حقایق کہ جن پر دائمی حیات کا دار و مدار ہے کہ بارش سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ بارش زمین کی زندگی کا باعث ہے پھر اس بارش کی تکالیف سے جو انسان کو غم و الم اور ملال پیش آتا ہے۔ قرآن کی وعیدوں سے تشبیہ دی گئی اور رعد سے یہ وہ وعیدیں ہیں کہ جن سے انسان وعیدوں کو سُن کر ڈرتا ہے۔ جس کی وجہ سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا ہے حالانکہ اُسے اس سے نجات نہیں ہے۔ اور خوش اس لیے ہوتے ہیں کہ اس میں ان کی خوشی کی باتیں ہیں۔ اور غم اس لیے کہ ان کی وعیدوں کا بیان ہے۔ بعینہٖ یہی منافقین کا حال ہے۔

سبق : دانا کے لیے ضروری ہے کہ شریعتِ مطہرہ پر ثابت قدم رہے اور اس کے خلاف باتوں سے کنارہ کرے تاکہ خاتمۂ ایمانی کی دولت سے نوازا جائے۔

حکایت حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ سے کسی نے پُوچھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ آپ ہنس کر فرمانے لگے، مت پُوچھیے۔ آپ نے فرمایا: ان لوگوں پر کیا گزرتی ہے جو دریا میں کشتی پر سوار ہوں لیکن کشتی راہ میں ٹوٹ جائے اور ہر ایک اپنے اپنے تختے پر لٹک جائے، اب بتائیے ان لوگوں کا کیا حال ہوگا! اس شخص نے کہا: وہ بڑی سخت پریشانی میں ہوں گے۔ آپ نے فرمایا: میرا اس سے بھی بُرا حال ہے کیونکہ موت میرا دریا اور حیات کشتی ہے اور گناہ تختے ہیں۔ اب تو بتا کہ جس کی یہ حالت ہو اس کا کیا حال ہونا چاہیے۔ فلہٰذا گناہ کو ترک کرتے ہوئے علام الغیوب کی طرف رجوع چاہیے۔

حدیث شریف جس کی ہجرت اللہ جل شانہٗ و رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف ہے۔ پس اس کی ہجرت واقعی الٰہی کی طرف ہے اور جس کی ہجرت دُنیا کے حصول یا عورت کے بیاہ کے لیے ہے پس جس مقصد کے لیے اس نے ہجرت کی وہی اسے ملے گا۔

دیکھیے اس میں ہر ارادہ والے کو اس کے ارادہ پر کیسے جزا دی گئی ہے۔ اور عبرت کا مقام ہے کہ دُنیا کا دوبارہ ذکر نہیں کیا تاکہ اس کے عدمِ اعتبار کا پتا چل سکے اور یہ بھی علم ہو جائے کہ دنیا صرف لہو و لعب کا نام ہے۔ گویا اس کا وجود ہی نہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

به مرد هشیار دُنیا خسیست
که هر مدتے جائے دیگر کسیست

ترجمہ : ہشیار مرد کے نزدیک کچھ نہیں کیونکہ ہر آن اس کی نئی جگہ ہے۔

ف : نبی علیہ السلام کا قولِ مقدس فھجرتہٗ الیٰ ما ھاجر الیہ اور اس کا مضمون قابلِ غور ہے کہ ما سوا کے ترک کا اشارہ ہے اور عورت اور دنیا کے ذکر میں ہر شے جو دنیا میں شہوانی ہے سب آ گئی۔ اور حدیث شریف کا مقصود یہ ہے کہ دنیا و مافیہا سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا چاہیے۔

حافظ شیرازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : ؎

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
زہر چہ تعلق پذیرد و آزاد ست

ترجمہ : یعنی ہر شے خواہ مال ہو یا اولاد اسباب ہے سب سے تعلق توڑ کر مالکِ لایزال کے ساتھ محبت ہو۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے : اوکصیبٍ من السماء ..... الخ دو آیتوں کے متعلق یہ اشارہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے تشبیہ دی۔ اس حدیث کے آرزومند اور ذکر میں مشغول ہونے اور ہدایت میں قرآن کے پیچھے لگنے والے۔ اور پھر اس کی طلب میں کوشش کرنے والے اور بعد ازاں جو اس پر عالم غیب کی جو بات ظاہر ہوتی ہے یہاں تک کہ نفس کا غلبہ ہوتا ہے اور پھر وہ فترۃ کی آفت میں جا پڑتا ہے اور وقفہ کو اس کے حال سے کہ اندھیری رات اور برسات میں چلنے والا ہو۔ اور ذکر و قرآن کو مینہ سے تشبیہ دی۔ کیونکہ یہ دل میں ایمان اور حکمت کو جنم دیتا ہے جیسے پانی انگوری کو۔ فیہ ظلمٰت یعنی ہم شکل اشیاء اور ملتی جلتی چیزیں جو سالک کو اثناءِ سلوک میں ظاہر ہوتی ہیں اور دقیق معانی کہ جن کا حل اور سمجھنا اور اس کے عہدۂ آفات سے خارج ہونا ناممکن ہو سوائے اُس کے کہ جس کی عقل تائیدِ رحمٰن سے ایمان کے ساتھ منور ہو۔ کما قال تعالیٰ :

الرحمٰن علم القرآن ۔ (رحمٰن نے قرآن سکھایا)

جیسے اندھیرے میں چلنا سوائے چراغ کے مشکل ہے۔ اسی طرح قرآن کے حقایق و دقایق کی سیر بھی ناممکن ہے۔ اسی طرح ظلمات بشریہ کی سیر کا حال ہے جب تک ہدایتِ ربوبیت کی روشنی نصیب نہ ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

کلما اضاء لھم مشوا فیہ۔ یعنی نورِ ہدایت سے چلتے ہیں۔ و اذا اظلم علیھم قاموا یعنی جب ظلماتِ بشریہ ان پر چھا جاتی ہیں۔

وَّ رَعۡدٌ یعنی خوف و خشیت و ہیبت جو ذکر اور قرآن کے جلال کی وجہ سے ہیبت دل میں پہنچتی ہے۔ کما قال عزّ و جلّ :

[1] ولو انزلنا ھٰذا القرآن علیٰ جبل لرأیتہٗ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ۔

---

[1] اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تم اسے ڈر لے پھٹنے والا دیکھتے اللہ کے ڈر سے ہے

وبرق یعنی قرآن وذکر کے انوار کا چمکنا جبکہ قلوب میں سرایت کرتا ہے کہ جس سے اُن کے جلود و قلوب ذکرِالٰہی کے لیے نرم ہوجاتی ہے۔ پھر اس میں قرآن اور دین کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے جسے قلوب پہچانتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

واذا سمعوا ما انزل الی الرسول۔ اور جب وہ سُنتے ہیں جو رسول کی طرف نازل کیا گیا۔

اور جب اُن پر سعادت کے انوار چمک اُٹھتے ہیں تو وہ طبیعت کی ظلمات سے نکل کر ارادہ کی حبل اللہ تھام لیتے ہیں تاکہ کامیاب لوگوں کے درجات کو پالیں۔ لیکن انگلیوں کو کانوں میں ٹھونسنے یعنی اپنے آمال فاسدہ کی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونستے۔ یعنی وُہ کان جو صواعق اور داعی حق سے ڈرنے والے تھے موت کے خوف سے یعنی نفس کی موت سے۔ کیونکہ نفس مچھلی کی طرح ہے اور دنیا اس کا دریا ہے اور خواہش اس کا پانی۔ اگر اسے اس سے نکالا جائے تو وُہ اسی وقت مرجائے گا۔ یہی مطلب ہے قولہ علیہ السلام: موتوا قبل ان تموتوا کا۔

واللہ محیطٌ بالکفرین اس میں اشارہ ہے کہ وہ کافر کہ جس کی حیات طبعیہ حیوانیہ ہے۔ اگر مالوفات سے بالارادہ مرجائے تو اسے اللہ تعالیٰ انوارِ شرعیہ سے زندہ کرے گا۔ کما قال تعالیٰ:

اومن کان میتاً فاحییناہ۔

اگر وہ بالارادہ نہ مرے تو اللہ کفار کو محیط ہے یعنی انہیں ہلاک کرنے والا ہے اور دُنیا میں انہیں صورت وقلب کی موت دینے والا ہے اور آخرت میں عذاب کی موت۔ پھر نہ مریں گے نہ جئیں گے۔

یکاد البرق یعنی ذکر اور قرآن کا نور یخطف ابصارھم یعنی ان کے نفسِ امّارہ کے ابصار کلما اضاء لھم یعنی ہدایت کا نور مشوا فیہ قدمِ صدق کے ساتھ راہِ حق پر چلتے ہیں و اذا اظلم علیھم یعنی نفس کی صفات کی ظلمات اور خواہشات ان پر غلبہ کرتے ہیں۔ اور دنیا کی طرف رغبت کرتے ہیں قاموا یعنی سیر سے ٹھہر جاتے اور متحیر و متردد ہوتے ہیں۔ اصل وجہ سے اُن پر آفات کی بھرمار ہوتی ہے اور فترات ان کو آ پہنچتے اور شیطان اُن پر قابو پالیتے ہیں اور نفس ان کو خواہشات کی طرف کھینچ لے جاتا ہے یہاں تک کہ وہ ہلاکت کے گڑھے میں جاگرتے ہیں ولو شاء اللہ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا ان کی ہدایت کا ارادہ ہوجائے لذھب بسمعھم تو ان کے کان لے جائے جو شیطان کے وساوس اور اس کے غرور کی طرف لُو لگاتے ہیں و ابصارھم یعنی ان کی وہ آنکھیں جن سے زینتِ دنیا کو دیکھتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

لوشئنا لاتینا کل نفس ھدھا۔ اگر ہم چاہیں تو ہر نفس کو ہدایت دیں۔

ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر یعنی اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ اُن کی شنوائی و بصارت کو سلب کرلے یہاں تک کہ نہ وہ وساوسِ شیطانی وخطراتِ شہوانی کو سن سکیں اور نہ منقشات دنیوی اور لذاتِ حیوانی کو دیکھ سکیں تاکہ اس سے دھوکا نہ کھائیں اور نہ دین بیچ کر دنیا خریدیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ سے جس طرح چاہے کرتا ہے اور اپنے غلبہ سے جس طرح چاہتا ہے حکم فرماتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ
جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى
عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا
مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ
فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا
بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ
بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ
بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ
كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ
مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ع

ترجمہ: اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری نصیب ہو وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے تمہارے کھانے کے کچھ پھل نکالے تو اللہ کے لیے جان بوجھ کر برابر کے شریک نہ ٹھہراؤ اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب مددگاروں کو بلا لو اگر تم سچے ہو پھر اگر نہ لا سکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لا سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں کافروں کے لیے ہی تیار کی گئی ہے اور خوشخبری دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کہ ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں جب انھیں ان باغات سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا ظاہری شکل دیکھ کر کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور وہ شکل میں ملتا جلتا انہیں دیا گیا اور ان کے لیے ان باغات میں پاکیزہ بیویاں ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے بے شک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمادے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر تو وہ جو ایمان لائے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے ہاں کافر کہتے ہیں ایسی کہاوت

میں خدا کا ایک مقصد ہے اللہ بہتوں کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت فرماتا ہے اور اس سے انہیں گمراہ کرتا ہے جو فاسق ہیں وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی گھاٹے میں ہیں بھلا تم کیونکر خدا کے منکر ہو گئے حالانکہ تم مُردہ تھے اس نے تمہیں جلایا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں جلائے گا پھر اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف استوا و قصد فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔

تفسیر عالمانہ یَاَیُّهَا النَّاسُ یہ آیت توحید و رسالت کے اثبات و تحقیق (جو کہ ایمان کی اصل ہیں) کے لیے بیان کی گئی ہے اور لفظ ناسؔ مومنین اور منافقین کا اسم ہے اور ندا، غافلین کی تنبیہ اور غائبین کے احضار اور ساکنین کی تحریک اور جاہلین کی تعریف اور مشغولین کی تفریغ اور معترضین کی توجیہ اور محبین کی برانگیختگی اور مریدین کی تشویق کے لیے ہے۔

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ اب خطاب اس لیے ہو رہا ہے تاکہ بندہ کو جو عبادت سے کلفت واقع ہوئی، وہ لذتِ خطاب سے دفع ہو جائے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ مونس نے میرے انس کو جو کہ قبلِ ولادت تھا نہ بھلایا یہ مطلب ہے کہ اے نسیان کے پتلے! تجھے متنبہ ہو جانا چاہیے اور اس وقت کو فراموش مت کر جبکہ تو ایک بھولا بھلایا تھا بلکہ ایک غیر مذکور شئے تھا۔ پھر میں نے تجھے پیدا کیا اور گارے میں تجھے ملایا گیا تو ایک نطفہ کے بعد خون بنا پھر گوشت کا ایک لوتھڑا ہوا، پھر ہڈیاں اور گوشت اور عروق اور چمڑا اور اعصاب ہو کر جنین کی صورت اختیار کرتے ہوئے طفل ہوا، پھر صبی ہوا، پھر نوجوان ہوا پھر تمام انتہائی بڑھاپے میں پہنچا۔ ان تمام حالتوں میں میری نعمتوں میں پلتا رہا۔ لیکن افسوس ہے کہ اب تو میرے غیر کی خدمت میں مصروف اور نفس و خواہش کی عبادت میں مشغول ہے۔ دین بیچ کر دنیا خرید رہا ہے۔ تجھے چاہیے کہ اسے فراموش نہ کر جس نے تجھے پیدا کیا اور شئ غیر مذکور کی حالت سے نکال کر تجھے کریم اور مشکور العمل بنایا، تجھے قوت دی، تجھے باعزت بنایا اور جو کچھ دینا تھا دیا۔ یہ خطاب نفس اور بدن دونوں کو ہے۔

ف: تفسیر تیسیر میں فرمایا کہ اگر انسان کا ماخذ نسیان ہو تو اس میں عتاب بھی ہے اور تلقین بھی۔ عتاب تو اس لیے کہ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے لوگو! تم نے میری نعمتوں کے عوض ناشکری کی یا یہ کہ میرے حکم کے عوض نافرمانی کا مظاہرہ کیا اور تلقین عذر کی یوں ہوگی کہ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ہمارے احکام کے مخالف (نسیان میں آکر نہ کہ عمداً و سہواً) ہم نے تیرے عذر کو تیرے نسیان کی وجہ سے قبول کر لیا اور تیرے ایمان کی وجہ سے گناہ معاف کر دیے۔

اُعْبُدُوْا رَبَّكُمُ کفار کو فرمایا جا رہا ہے اپنے رب کی توحید کا اقرار کرو اور عاصیوں کو فرمایا کہ اپنے رب کی

اطاعت کرو۔ اور منافقین کو فرمایا کہ رب تعالیٰ کی توحید اور اپنے رب کی معرفت میں مخلص ہو جاؤ اور مطیعین کو فرمایا اپنے رب کی معرفت میں ثابت قدم رہو اور یہ لفظ ان تمام معانی کا احتمال رکھتا ہے اور اس کا نام جوامع الکلم ہے۔ (کذا فی التفسیر لابی اللیث)

ف : عبادت کہتے ہیں طاقت کو طاعت کی تکمیل میں خرچ کرنا اور خشیت کے استشعار میں معصیت سے بُعد حاصل کرنا۔

الَّذِیْ خَلَقَکُمْ یہ صفت ہے، تعظیم و تعلیل کے لیے جاری ہوئی۔ یعنی تم اس اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا کہ تم نیست و نابود تھے اس نے تمہیں ہست کر دیا اور خلق بمعنے اختراع الشئ یعنی شے کا ایسا پیدا کرنا کہ جس کی پہلے کوئی نظیر نہ ہو۔ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے تھے۔ یعنی وہ اُمتیں جو تمہارے زمانے سے پہلے تھیں۔ مِنْ ابتدائیہ ہے اس کا متعلق محذوف ہے اور ربکم کو وصف سے موصوف کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس کی عبادت تم پر واجب ہے یعنی تمہارے اصول کو پیدا کرنا عبادت کے موجبات سے ہے اور اس میں شمول قدرت کی طرف دلالت بھی ہے اور غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کی تنبیہ بھی۔ یعنی وہ لوگ تھے آئے اور ختم ہوئے۔ پس تم مقامِ رجوع کو نہ بھلاؤ اور نہ اس میں کوتاہی کرو۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اعبدوا کی ضمیر سے حال ہے۔ یعنی اس امید میں رہو کہ شاید تم ان متقین سے ہو جاؤ جو ہدایت و فلاح سے کامیاب ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے جوار کے مستحق ہوئے۔

لفظ لَعَلَّ امید اور طمع دلانے کے لیے آتا ہے اور وجوب کے لیے بھی آتا ہے کیونکہ کریم کو کسی قسم کا طمع نہیں ہوتا۔

ف : پہلے اور پچھلے سب اس امر بالتقویٰ میں داخل ہیں اور مخاطبین کو ذکر میں خاص کر کے غائبین کو تغلیباً داخل کر لیا۔

ف : اس میں تنبیہ ہے کہ تقویٰ سالکین کا انتہائی درجہ ہے۔ اور تقویٰ بمعنے ماسویٰ سے بری ہو جانا۔

سبق : عابد کے لیے لائق ہے کہ وُہ اپنی عبادت پر مغرور نہ ہو بلکہ اسے خوف و رجا میں رہنا چاہیے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یدعون ربھم خوفاً و طمعاً و یرجون رحمتہٗ۔ وہ اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں خوف اور طمع سے اور اسکی رحمت کی امید کرتے ہوئے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ؎

اگر مردی از مردیٔ خود مگو
نہ ہر شہسوارے بدر برد گوی

ف : یعنی ہر عابد ایسا نہیں کہ وُہ اپنی عبادت میں مخلص ہو۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ یہ جملہ ربکم کی دوسری صفت ہے۔

عجائباتِ دُنیا : (۱) عالمِ دنیا (کہ جسے بحرِ محیط گھیرے ہوئے ہے) کی فراخی چوبیس ہزار فرسخ ہے۔ ہر

ہر فرسخ تین میل کا اور ہر میل بارہ ہزار ہاتھ کا اور ہر ہاتھ چھتیس انگلی کا ہوتا ہے اور ہر انگلی جَو کے چھ دانوں کی ہوتی ہے اس زمین کے بارہ ہزار فرسخ پر سودان آباد ہیں اور آٹھ ہزار پر بیضان اور تین ہزار پر اہلِ فارس اور ایک ہزار میل پر اہلِ عرب۔ یہ اہلِ لغت کی تحقیق ہے۔ (کذا فی کتاب الملکوت)

(۲) تمام آباد زمین کے وسط کی سمت کعبہ شریف ہے اور تمام آباد غیر آباد زمین کا وسط قبۃ الارض ہے۔ یعنی وہ جگہ جہاں سرما و گرما کا موسم معتدل ہے اور رات و دن برابر رہتے ہیں، ایک دوسرے سے گھٹتے بڑھتے نہیں۔ (کذا فی الملکوت)

ف : حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ ارض کو اس لیے ارض کہتے ہیں کہ جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے اُسے کھا جاتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ حوافر و اقدام سے روندی جاتی ہے اس لیے اسے زمین کہا جاتا ہے۔

فِرَاشًا اسے فراش بنانے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے بعض کو پانی سے ظاہر کر دیا حالانکہ اس کی طبیعت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ بھیگی ہو اور اسے سختی و نرمی میں بین بین بنایا۔ جس پر بیٹھنا اور سونا آرام سے ہو سکتا ہے جیسے بستر بچھا ہوا ہو اور اس کے لیے ضروری نہیں کہ اس کی سطح حقیقی ہو کیونکہ اُس کی کُروی شکل باوجود جسم کی موٹائی کے افراش کے لائق ہے۔

وَّالسَّمَآءَ سماء اُسے کہتے ہیں جو اُوپر اور سایہ کیے ہوئے ہو۔ بِنَآءً یعنی آسمان تمہارے اوپر قبہ کی طرح بنایا ہوا ہے اور ہر آسمان دُوسرے آسمان پر قبہ ہی کی طرح ہے اور جو زمین کے اوپر ہو وہ آسمان ہے۔ اُس کے اطراف زمین کی جانب لٹکے ہوئے ہیں۔ (کذا فی تفسیر ابی اللیث) وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً یعنی بارش جو کہ آسمان سے بادل پر پھر بادل سے زمین پر گرتی ہے۔ اس میں ان لوگوں کا ردّ ہے جو گمان کرتے ہیں کہ بادل پانی دریا سے لیتا ہے فَاَخْرَجَ بِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ انگوری اگاتا ہے اس پانی کے سبب سے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے مِنَ الثَّمَرٰتِ یہی جو ہم کھاتے ہیں اناج، میوہ جات وغیرہا، جو زمین اور درختوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ (کذا فی التیسیر) رِزْقًا لَّكُمْ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی میں قوتِ فاعلیت اور زمین میں قوتِ منفعلیت امانت رکھی ہے ان کے آپس میں ملنے سے پھل پھول وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ آسمان سے زمین پر پانی نازل ہونے کو عقدِ نکاح سے اور پھر اس پانی کے سبب سے اس زمین سے جو ثمر نکلتے ہیں، نسل سے تشبیہ دی جو کہ حیوانات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ انسان کے رزق کا سامان ہے۔ اور من الثمرات میں مِن بیانیہ ہے رزقاً یعنی تمہارے لیے طعام اور تمہارے جانوروں کے لیے گھاس ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر انعام کیا تاکہ تم اس کی خالقیت و رزاقیت کا اقرار کرتے ہوئے اس کی توحید پر کاربند ہو جاؤ۔ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا انداداً نِدٌّ کی جمع ہے بمعنے ہم مثل۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ہم مثل کسی کو نہ بناؤ تاکہ ان کی عبادت کرو۔

عقیدہ : حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: یُوں نہ کہو کہ فلاں نہ ہوتا تو مجھے مصیبت نہ آتی اور

اگر کتا میرے گھر نہ بھونکتا تو میری چوری ہو جاتی۔

حدیث شریف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: وَ لَوْ سے بچو (یعنی گزشتہ بات جس کی تلقین ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی) کیونکہ یہ منافقین کا کام ہے۔

کما قال تعالیٰ:

لَوْ کَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا۔ اگر وہ ہمارے ہاں ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے

شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اگر عز و جاہ ہست و اگر ذل و قید
من از حق شناسم نہ از عمرو زید

ترجمہ: یہ عز و جاہ اور قید و بند سب اللہ تعالیٰ سے ہیں نہ کہ زید و عمرو سے۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم جانتے ہو کہ تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو اور آسمان و زمین اور تمہاری روزی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی نہ کہ بتوں نے۔ وہ تو نہ نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان۔

نصیحت: آیت میں فرمایا: جَعَلَ لَکُمْ۔
اور فرمایا: رِزْقًا لَّکُمْ۔

اگر قیامت میں بندہ سے اللہ تعالیٰ فرمائے کہ یہ سب کچھ تو میں نے تیرے لیے پیدا فرمایا، بتا تو نے میرے لیے کیا کیا؟ اس وقت بندہ کیا جواب دے گا!

حکایت ایک دن شیخ شبلی وعظ فرما رہے تھے۔ لوگوں کو قیامت کے احوال و اہوال سے ڈرا رہے تھے۔ ادھر شیخ ابو الحسن نوری گزرے اور فرمایا: انھیں مت دھمکاؤ قیامت میں کوئی اتنا لمبا حساب نہیں ہوگا وہاں تو صرف یہ پوچھا جائے گا کہ:

من ترا بودم تو کرا بودی۔ (یعنی میں تو تیرا تھا، بتا اے بندے! تو کس کا تھا)

آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت میں خلوص چاہیے۔ اغیار کا خیال دل سے دور ہو اور مالک لایزال کا تصور منقوش ہو۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

گرت بیخ اخلاص در بوم نیست
دریں در کسی چوں تو محروم نیست

ترجمہ: اگر تیرے ملک میں اخلاص کی جڑ نہیں تو تیرے جیسا محروم اور کوئی نہیں۔

نبی اکرم کا حضرت معاذ کو ایک دلچسپ وعظ

(۱) اے معاذ (رضی اللہ عنہ)! میں تجھے ایک بات بتاتا ہوں اگر تو نے اُسے یاد رکھا تو تیرے لیے بڑا فائدہ ہوگا۔ اگر تُو نے اسے بُھلا دیا تو سمجھ لینا کہ پھر تیری حجت اللہ تعالیٰ سے ختم ہوگئی۔ اے معاذ (رضی اللہ عنہ)! اللہ تعالےٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے پہلے سات فرشتے پیدا فرمائے۔ اُن کو ہر ایک آسمان کے لیے علیحدہ علیحدہ نگران مقرر کیا۔ پھر جب نگہبانانِ عمل بندہ کے عمل جو کہ صبح سے شام تک ہوتے ہیں پہلے آسمان تک لے جاتے ہیں اور عمل کا نور سورج کے نور کی طرح ہوتا ہے۔ جب پہلے آسمان میں پہنچتا ہے تو زیادہ صاف ہوجاتا ہے اور اس کی نورانیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جب وُہ اُوپر کو جانے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہی فرشتہ کہتا ہے: ٹھہر جاؤ! اس عمل کو صاحبِ عمل کے منہ پر دے مارو، کیونکہ یہ گلہ گو ہے اور مجھے حکم ہے کہ جس بندہ کی عادت گلہ کی ہو اُس کے اعمال اوپر نہ جانے دُوں۔ اور یہ بندہ چونکہ گلہ گو ہے بنا بریں اس کے اعمال کو واپس زمین پر بھیج دو ؎

زبان آمد از بہر شکر و سپاس
بغیبت نگرداند حق شناس

ترجمہ: زبان صرف شکر اور تعریف کرنے کے لیے بنی ہے اس کو کسی کی غیبت کے ساتھ حق شناس یعنی خدا کو پہچاننے والی نہیں بنایا جاسکتا۔

(۲) پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس بندہ کے دیگر اعمال صالحہ حفظہ (فرشتے) لاتے ہیں، جس سے ان اعمال کو اوپر دوسرے آسمان کی جانب جانے کی اجازت ملتی ہے۔ لیکن دوسرے آسمان تک پہنچتے ہی ملک فرشتہ مقرر شدہ آجاتا ہے اور کہتا ہے: یہ عمل صاحبِ عمل کو لوٹا دو۔ کیونکہ یہ متفخر انسان ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ متفخر کے اعمال اُوپر نہ جانے دُوں۔ اور یہ بندہ اپنے اعمال سے اسبابِ دنیا کے حصول کا خواہشمند ہے ؎

چہ زنارِ مغ درمیانت چہ دلق
کہ در پوشی از بہر پندار خلق

ف: ہوشمند اور عقلمند انسان عاجزی کو اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے کیونکہ پھل سے بھری ہوئی شاخ اور ٹہنی زمین پر سر رکھے ہوئے ہوتی ہے یعنی جھکی ہوئی ہوتی ہے۔

(۳) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ پھر اس کے اعمال اوپر چڑھائے جاتے ہیں جنھیں صوم و صدقہ اور صلوٰۃ کی وجہ سے نرالی رونق ہوتی ہے جسے حفظہ (فرشتے) دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں لیکن جب تیسرے آسمان تک پہنچتے ہیں تو فرشتہ موکل کہتا ہے: ٹھہر جاؤ اس کے اعمال اوپر نہیں جاسکتے کیونکہ یہ شخص متکبّر ہے جہاں بیٹھتا ہے تکبّر کرتا ہے۔ اور مجھے حکم ہے کہ ایسے آدمی کے اعمال اُوپر نہ جانے دُوں۔ فلہٰذا اس کے اعمال اس کے منہ پر دے مارو۔

ؔ فروتن بود ہوشمند گزیں
نہد شاخِ پُر میوہ سر بر زمیں

ترجمہ: ہوشمند اور پسندیدہ انسان ہی تواضع والا ہے اس لیے کہ میوہ سے بھرپور ٹہنی ہی سر زمین پر رکھتی ہے۔

(۴) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ پھر اس کے اعمال اوپر چڑھائے جاتے ہیں۔ اس کی صلوٰۃ اور تسبیح و حج وعُمرہ کی وجہ سے ستارہ کی طرح اعمال میں رونق ہوتی ہے یہاں تک کہ چوتھے آسمان میں پہنچتے ہیں۔ وہاں پر مقرر شدہ فرشتہ کہتا ہے: ٹھہر جاؤ، اس کے اعمال اس کے منہ پر مار دو یہ تو خود بینی میں مبتلا ہے اور مجھے حکم ہے کہ خود بین کے اعمال اوپر کو نہ آنے دُوں ؔ

چوں روئے بخدمت نہی بر زمیں
خدا را ثنا گوئی خود را مبیں

ترجمہ: جب تم اپنا چہرہ خدمت کے طور پر زمین پر رکھ دو تو پھر خدا کی تعریف کرو اپنے آپ کو نہ دیکھو۔

(۵) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: جب اسے اوپر پانچویں آسمان کی جانب لے جاتے ہیں ایسے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ عمل نئی دُلھن ہے جو اپنے دُولھا کے ہاں بھیجی جا رہی ہے۔ یہاں بھی وہی موکل فرشتہ کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ، اس کے عمل کو اس کے مُنہ پر دے مارو۔ اس میں حسد کا مرض ہے اور مجھے حکم ہے کہ جس میں حسد کی بلا ہے اس کے اعمال اُوپر نہ جانے دُوں ؔ

عقبۂ زیں صعب تر در راہ نیست
ای خنک آنکس حسد ہمراہ نیست

ترجمہ: کوئی عقبۂ راہ سلوک میں اس سے سخت تر نہیں، وہ خوش قسمت سالک ہے جس کے اندر حسد نہیں۔

(۶) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ملائکہ عملِ صوم و صلوٰۃ و حج وعُمرہ کو چھٹے آسمان پر لے جاتے ہیں تو حسبِ دستور فرشتہ آجاتا ہے کہتا ہے: ٹھہر جاؤ، اس کے عمل اس کے منہ پر مارو۔ یہ تو کسی پر رحم نہ کرتا تھا بلکہ انہیں اگر کوئی تکلیف پہنچتی تھی تو ان کو گالیاں دیتا۔ اور مجھے حکم ہے کہ جو لوگوں پر رحم نہ کرے اُس کے عمل اُوپر نہ جانے دوں ؔ

اشک خواہی رحم کن بر اشکبار
رحم خواہی بر ضعیفاں رحم را

ترجمہ: اگر تجھے دائمی راحت مطلوب ہے تو آنسو بہانے پر رحم کر، رحم الٰہی کی طلب ہے تو ضعیفوں پر رحم کیجئے۔

(۷) حضور علیہ السلام نے فرمایا: بندہ کے اعمال کو ساتویں آسمان کی جانب لے جاتے ہیں جو کہ صوم وصلوٰۃ و فقہ و اجتہاد و ورع پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کی آواز شہد کی طرح ہوتی ہے اور اس کی روشنی سورج کی روشنی کی طرح ہوتی ہے اور اس کے ساتھ تین ہزار فرشتے ہوتے ہیں تو مقرر فرشتہ کہتا ہے: ٹھہر جاؤ، اس کے عمل کو اس کے منہ پر مارو کیونکہ یہ تو اس لیے عمل کرتا تھا کہ میرا فقہاء کے سامنے درجہ بلند ہو۔ علماء پر میرا سکّہ جما ہُوا ہو۔ شہروں میں میری شہرت ہو۔ بنا بریں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محروم ہے اور اس کے دل پر مُہر لگ چکی ہے اسے میں آگے نہیں جانے دُوں گا کیونکہ مجھے حکم ہے کہ جو ریاکار ہو اسے دربارِ خداوندی میں مت آنے دو۔ ؎

برقعۂ ریا خرقہ سہلست دوخت
گرش با خدا در توانی فروخت

ترجمہ: ریا کا خرقہ پہننا آسان ہے لیکن بارگاہِ حق میں ایسے خرقہ کی رسائی نہیں۔

(۸) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں بندہ کے اعمال ساتوں آسمانوں سے گزر کر کے حجابات کو طے کرتے ہوئے مالکِ لایزال کے حضور میں جا پہنچتے ہیں اور ملائکہ عرض کرتے ہیں: اے الٰہ العٰلمین! یہ عمل صرف تیرے لیے خالص مخلص ہو کر حاضر کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے فرشتو! تم اس کے ظاہر پر نگہبانی کرتے ہو۔ مجھے اس کے دل کے اسرار کا علم ہے یہ تو خالص میرے لیے عمل نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا میرے غیر کی طرف دھیان تھا، پس اس پر میری لعنت ہے۔ فرشتے کہتے ہیں: تیری لعنت ہے تو ہم سب کی بھی اس پر لعنت، بلکہ ساتوں آسمان و زمین اور جو ان میں ہے سب اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔

معاذؓ کی معروض حضرت معاذ رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں، حضور! اب تو نجات مشکل ہے کیونکہ ہم میں نہ تو خلوص ہے، اور نہ احسن عمل۔ آپ نے فرمایا: اے معاذؓ! میری اقتداء کو نہ چھوڑ، یقین پختہ رکھ، عمل میں کوتاہی ہوا ہی کرتی ہے، اپنی زبان کو اپنے بھائیوں کے گلہ سے بچا، اپنے آپ کو اچھا نہ سمجھ، اور دنیا کے عمل کو اُخروی امور میں داخل مت کر اور لوگوں میں تفریق نہ ڈال تاکہ تجھے دوزخ کے کُتّے پھاڑ نہ ڈالیں، اور اپنے اعمال میں ریاکاری مت کر۔

شیخ سعدی قدس سرّہٗ فرماتے ہیں: ؎

اے ہنرہا نہادہ بر کف دست — عیبہا برگرفتہ زیرِ بغل
تا چہ خواہی خریدن اے مغرور — روزِ درماندگی بسیم و دغل

ترجمہ: اے فلاں! تو ہنر تو ہاتھ کی ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہے لیکن اپنے عیوب بغلوں میں۔ اس سے تجھے کیا حاصل ہے جبکہ سودا خریدتے وقت تیرا سکہ ہی کھوٹا ہے۔

حکایت حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ تیس سال متواتر عبادت سے ایک روز میرا جی اُکتا رہا تھا کہ نیند میں کسی کا یہ فرمان سُنائی دیا کہ اے ابُویزید! اللہ تعالیٰ کے خزینے عبادت سے پُر ہیں اگر تُو اسے ملنا چاہتا ہے تو عجز اور زاری و ذلّت اختیار کر۔ اسی بنا پر ابو یزید قدس سرّہٗ نے عرض کی: ؎

چار چیز آوردہ ام شاہا کہ در گنج تو نیست
نیستی و حاجت و جُـرم و گناہ آوردہ ام

ترجمہ: اے شاہا! چار چیزیں تیرے خزانہ میں نہیں: (۱) نیستی (۲) حاجت (۳) جرم (۴) گناہ۔

یہ آپ نے اس وقت کہا جبکہ انہیں حقیقت کے بشارات نے طلوع کر کے کہا کہ ہمیں کچھ دیجئے۔ جب آپ نے یہی ہدیہ پیش کیا تو کہا گیا کہ واقعی تُو نے قابلِ تحسین ہدیہ پیش کیا اب دربار میں داخل ہونے کا مستحق ہے۔ فلھذا بڑی خوشی سے دربار میں حاضر ہو جا۔

تفسیرِ صُوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ یاایھا الناس میں وہ لوگ مخاطب ہیں جو روزِ ازل کے عہدِ الوہیت اور اقرارِ ربوبیت کو بھُول گئے اور ان سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ لا تعبدوا الا ایاہ لیکن یہ اس کے برعکس ہوئے اور عہد کو توڑ کر اصنامِ دنیا و خواہشِ نفسانی اور شیطان کے پیچھے پڑ گئے جس سے ان کے اقدام راہِ توحید سے بھٹک کر شرک و ہلاکت کے گڑھے میں جا پہنچے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف انبیاءٔ و رسل علیہم السلام کتابیں دے کر مبعوث فرمائے جو کہ انہوں نے آکر نسیان و شرک کی خبر دی اور توحید و عبادت کی دعوت دی اور فرمایا یاایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم یعنی تمہارے اور تم سے پہلے لوگوں کے ارواح پیدا کیے اور تم سے عہد و پیمان لیے فلھذا تم اپنے وعدوں کو پُورا کرو کہ زبان کو توحید سے تر اور دل کو تجرید سے مزیّن اور رُوح کو تفرید سے آراستہ اور ترکِ محظورات اور اقامتِ طاعات سے نفس کا تزکیہ کرو لعلکم تتقون تا کہ تم غیر اللہ کی عبادت کرنے سے شرک سے بچ جاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پُورا فرمائے گا کہ تمہیں دوزخ کے عذاب سے نجات اور جنت میں رفع درجات اور دنیا میں قربات کی کرم بخشی اور آخرت میں کرامات سے نوازش فرمائے گا جیسا تمہیں دنیا میں نوازا کہ الذی جعل لکم الارض فراشًا والسّماء بناءً اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کی تعریف اور بندوں پر منت اور انسان کو جمیع مخلوقات سے فضیلت کا بیان فرمایا۔ اپنی قدرتِ کاملہ کی تعریف الذی جعل میں اور بندوں پر منت پر بیان لکم الارض فراشاً والسماء بناء میں یعنی خاص طور پر یہ اشیاءُ تمہارے لیے پیدا فرمائیں۔ اور انسانوں کو جمیع مخلوقات پر فضیلت اس لحاظ سے ہے کہ یہ اشیاءٔ تمام اُن کے لیے پیدا فرما کر پھر ان کو مسخر فرما دیا۔ کما قال عزّ وجلّ، وسخّر لکم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض جمیعا منہ۔

مخلوق کا وجود انسان کے وجود کا تابع ہے اور جو شے کسی کی تابع ہو وہ مقصود لذاتہ نہیں ہوا کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اور آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر غیر اللہ کا سجدہ حرام کر دیا ملائکہ اگرچہ آدم علیہ السلام سے پہلے پیدا ہوئے اور تمام مخلوق سے افضل تھے لیکن جب آدم علیہ السلام پیدا ہوئے تو ملائکہ کے مسجود الیہ اور مخلوقات سے افضل واکرم قرار دیے گئے۔ آدم زادے تمام کے متبوع اور باقی ان کے تابع ہوئے۔

وانزلنا من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرٰت رزقًا لکم تحقیق یہ ہے کہ ماء سے مراد قرآن شریف ہے اور ثمرٰت سے ہدایت، تقویٰ، نور، رحمت، شفا، برکت ویمن، سعادت و قربت، حق الیقین، نجات و رفعت، صلاح فلاح، حکمت وحلم وعلم، آداب و اخلاق، عزت وغنیٰ، المتین عروۃ الوثقیٰ سے تمسک، حبل اللہ کا اعتصام، ہر بھلائی کو جمع کرنا، ہر سعادت پر خاتمہ اور باطل وجود انسانی کا اٹھنا جبکہ حقیقتِ صفاتِ ربانیہ کی تجلیات کا ورود مراد ہے۔ کما قال عزوجل:

قل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

اب معنیٰ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے سبب سے اپنے بندوں کے قلوب کی زمین میں مذکورہ ثمرات لگائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ثمرات (تمہارے رزق کے لیے) نکالنے پر بندوں پر منت لگائی۔ اگرچہ اس میں حیوانات کا رزق بھی ہے لیکن انسان کے تابع ہو کر۔ لیکن اس کا ادراک ان عقول کو ہو سکے گا جو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مؤید ہیں۔ اسی لحاظ سے فلا تجعلوا اللہ اندادًا اللہ تعالیٰ کے لیے شریک مت ٹھہراؤ۔

اس میں تین تقریریں ہیں:

(۱) یہ جو میں نے تمہاری پیدائش اور آسمان وزمین اور جو ان میں ہے صرف تمہارے لیے بنائے۔ لیکن یہ میرے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی لحاظ سے تمہیں چاہیے کہ میرے لیے شریک مت ٹھہراؤ۔ وَ انتم تعلمون ٥ اس کا تمہیں علم بھی ہے۔

(۲) یہ آسمان وزمین اور سورج وچاند سب تمہارے رزق کے اسباب ہیں اور روزی رساں صرف میں ہی ہوں۔ اب تمہیں چاہیے کہ وسائل کو مت پوجو۔ اس لحاظ سے نہ سورج عبادت کے لائق ہے نہ چاند۔

(۳) میں نے تمام موجودات کو پیدا کیا اور ہر موجود کے لیے شے دیگر خط مقرر فرمایا۔ اور انسان کا خط میری محبت و معرفت ہے اور قاعدہ ہے کہ جس سے خط منقطع ہو جائے وہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ اب تم بھی اپنے خطوط کو منقطع نہ کرو کہ میری محبت ومعرفت سے ہٹ کر بتوں کی محبت میں پھنس رہے ہو اور پھر شرک کے گڑھے میں ہلاک ہو رہے ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادًا یحبونھم کحبِّ اللہ۔[1]

---

[1] بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے ماسوا اللہ جیسے معبود بناتے ہیں اور ان سے اللہ جیسی محبت کرتے ہیں

اس معنے پر یہاں انداد بمعنی کسی محبوب جو اللہ تعالیٰ کا غیر ہو۔ پھر اس کے بعد ان کا ذکر کیا جو اللہ تعالیٰ کی محبت سے منقطع نہیں ہوتے۔ کما قال عزّ وجل :

الذین اٰمنوا اشدّ حبًّا للہ ۔ (وہ جو مومن ہیں وہ اللہ کی محبت میں سخت ہیں)

یعنی جو لوگ محبّت سے غیر اللہ کو معبود ٹھہراتے ہیں وہ حقیقۃً مومن نہیں اگرچہ دعویٰ کرتے ہوں کہ ہم مومن ہیں۔

تنبیہ : اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لے۔ ایمان تقلیدی جو تجھے وراثت میں ملا ہے اس پر مغرور نہ ہو۔

تفسیر عالمانہ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا ۔ یعنی وُہ قرآن جو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ہم نے نازل کیا ہے اگر تم اس میں شک کرتے ہو اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ سے وحی منزل ہے یا نہ۔

حلِ لغات : تنزیلٌ بمعنے علیٰ سبیل التدریج نازل ہونا۔ قرآن پاک کو پہلے یکبارگی آسمانِ دنیا میں بیت العزۃ کی طرف نازل کیا گیا۔ پھر اس سے تھوڑا تھوڑا حسبِ ضرورت تئیس سال کے عرصے میں نازل کیا گیا تاکہ وہ کریم صلی اللہ علیہ وسلم یاد کرلیں کیونکہ وہ اُمّی نبی تھے جو نہ لکھتے تھے اور نہ پڑھتے تھے۔ بنا بریں آہستہ آہستہ نازل کیا گیا تاکہ قرآن پاک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اچھی طرح محفوظ ہوجائے، بخلاف باقی انبیاء علیہم السلام کے کہ وہ لکھے پڑھے تھے۔ اُن پر کتاب کے تمام اجزاء یاد کرنا آسان تھا اسی لیے دیگر کتب کو یکبارگی نازل کیا گیا۔

فَاْتُوْا شرط کا جواب ہے اور یہ امر تعجیز کا ہے۔ بِسُوْرَةٍ تو لاؤ ایک سورت۔ سُورت قرآن کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جس کا اوّل و آخر معلوم ہو اور کم از کم تین آیتیں ہوں۔ اس کا مآخذ سورۃ الاسد و سورۃ الشراب ہے۔ بمعنے قوت ہے۔ اور چونکہ یہ آیت سے زیادہ قوی ہوتی ہے اس لیے اس نام سے موسوم ہوئی، لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ واؤ اصلی ہو۔ اگر ہمزہ سے منقلب ہو تو اس کا ماخذ سئور بمعنے بقیۃ من الشئ ہوگا اور سورۃ بھی قرآن پاک کا ایک ٹکڑا ہوتی ہے اور دیگر سورتوں سے جُدا ہو کر بمنزلہ بقیہ کے ہوتی ہے اس لیے اس نام سے موسوم ہوئی مِّنْ مِّثْلِهٖ یعنی وُہ سُورۃ قرآن کی طرح ہوگی۔ غریب بیان اور علو طبقہ اور حسنِ نظم میں مثلہ کی ضمیر ما انزلنا کی طرف راجع ہوگی یعنی تم اس کی طرح لے آؤ اگر تمہارے گمان میں یہی ہے کہ یہ کلام بشر کا ہے تم اور وُہ جو ہر خلقت و زبان میں برابر ہو وہ پیدائشی حیثیت سے تم سے اولیٰ نہیں ہے۔

مسئلہ : قرآن پاک چونکہ بے نظیر کلام ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت اور اس کا کلام اور وحی ہے اور اُس کے صفات کی اُس کی ذات کی طرح کوئی شئے مثل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے کفّار! تمہارے گمان کے مطابق اس کی کوئی مثل ہے تو لے آؤ۔ کیونکہ وہ لوگ کہتے تھے، لو نشاء لقلنا مثل ھذا۔ (کذا فی التیسیر) اگر ہم چاہیں تو ایسا کہہ دیں

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ شہداء شہید کی جمع ہے بمعنے حاضر یا قائم بالشہادۃ یا ناصر۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ یا تو اُدعوا کے متعلق ہے۔ اب معنیٰ یُوں ہوگا کہ تم انہیں بلاؤ جو اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمہارے پاس حاضر ہیں

جو بھی ہو قرآن کے معارضہ میں تمہاری مدد کریں یا وہ لوگ جو تمہارے ہے مثنا ہر محافل میں تمہارے رؤساء و شرفاء کہ جن کی طرف تم اپنی تکالیف میں گڑگڑاتے اور اپنے دُکھ درد میں ان پر بھروسا کرتے ہو یا وہ لوگ جو تمہاری شہادت (جو تمہارے مابین جاری ہے) پر قائم ہیں۔ یعنی تمہارے گمان کے مطابق انسان ہیں یا جن تاکہ تمہاری مدد کریں۔ یا یہ شہدائکم کے متعلق ہے۔ اب اس سے مراد اُن کے بُت ہیں۔

ف ؛ دُون بمعنے تجاوز ہے اور ظرف مستقر ہے جو مخاطبین کی ضمیر سے حال واقع ہوا ہے اور اس کا حال شہدائکم کا مدلول ہے۔ اب عبارت یُوں ہو گی ؛

اُدعوا اصنامکم الذین اتخذ تموھم اٰلھۃ و زعمتم انھم لیشھدون لکم یوم القیمٰۃ ..... الخ

یعنی اپنے ان بتوں کو بلاؤ جن کو تم اپنا معبود سمجھتے ہو اور تمہارا گمان ہے کہ وہ قیامت میں تمہارے لیے گواہی دیں گے کہ تم حق پر تھے تم اللہ تعالیٰ کے ماسوا ان کو اپنا معبود سمجھتے ہو۔

مسئلہ ؛ مخلوق سے مدد طلب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی وہ کسی تکلیف کو دفع کر سکیں گے فلھذا تمہیں چاہیے کہ اپنے حوائج صرف اس ذات کے سامنے پیش کرو جس پر ضرورت کا پورا کرنا مشکل نہ ہو۔ اور سوال اس سے کرو جس کے خزینے نہ مٹنے والے ہوں اور سہارا صرف اسی پر کرو جو کسی سے عاجز نہ ہو، کسی کی مدد کرنے میں کسی دیگر کی امداد نہ مانگے اور وہ ہر طرح کی حفاظت کرے۔ کسی ذریعہ کے بغیر اور مال کے بغیر غنی کر دے اور جب کسی کی مدد کرنا چاہے تو اعداد کثیر قلیل ہو جائیں اور جب کسی کی کفایت کرے تو تھوڑا سا مال کثیر ہو جائے۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ اگر تم سچے ہو کہ سیدِ عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس قرآن کو اپنی طرف سے بناتے ہیں اور تمہارے معبود بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ شرط ہے اُس کی جزا محذوف ہے یعنی فافعلو۔ یعنی تم اس جیسا لے آؤ اگر تم سچے ہو تو کرو۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا یعنی وہ جو تمہیں قرآن جیسی نظیر لانے کا حکم دیا گیا ہے اگر اپنی جد و جہد کرنے کے بعد بھی تم نہیں کر سکے۔ وَلَنْ تَفْعَلُوْا اور زمانہ مستقبل میں بھی تم ہرگز نہیں کر سکو گے۔ اس میں قرآن کا معجزہ ظاہر کرنا ہے جو دراصل نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے شرط و جزا کے مابین جملہ معترضہ لایا گیا ہے اور یہ ایسا روشن معجزہ جو ایسے غیب کی خبر دی گئی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا خاص تھا اور وُہ ہو کر رہا۔ کیوں نہ ہو اگر ان لوگوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معارضہ کیا ہوتا تو سلف سے خلف میں کوئی ناقل اسے نقل کرتا۔ لیکن نہ معارضہ ہوا نہ کسی نے نقل کیا۔ فَاتَّقُوا النَّارَ یعنی جب تم معارضہ قرآن سے عاجز ہو گئے اور اس کی مثال نہ لا سکے تو تم پر حجت لازم ہو گئی کہ اس بات کا اقرار کرو کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم میرے رسول برحق ہیں اور قرآن پاک میری ہی نازل کردہ کتاب ہے کیونکہ تم پر بوجہ لزوم حجت اُن کی تصدیق کرنا اور ان پر ایمان لانا لازم ہو گیا۔ اگر تم پھر بھی ایمان نہ لاؤ گے تو تم اہلِ نار ہو گئے۔ پس تم ڈرتے رہو۔

کشاف میں ہے کہ دوزخ سے بچنے کا سبب ترکِ عناد ہے۔ اس حیثیت سے کہ اس کے نتائج سے جو عناد کو

چھوڑے گا، وہ دوزخ سے بچ جائے گا۔ اسی بنا پر فاتقوا العناد کی بجائے فاتقوا النار کہا گیا۔ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا۔ وقود ہر وہ شے (کہ جس سے آگ جلائی جائے) کو کہا جاتا ہے۔ النَّاسُ یعنی مجرم لوگ وَ الْحِجَارَةُ یعنی کبریت کا پتھر۔ اسے اس لیے ایندھن بنایا گیا کہ اس میں آگ جلدی اثر کرتی ہے اور پھر بجھتا دیر سے ہے اور اس میں گرمی بڑی شدت کی اور بد بُو ہوتی ہے اور بدن پر جلد چمٹتا ہے۔ یا الحجارۃ سے مراد کفار کے بُت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے۔

سوال: بُتوں نے کون سا جُرم کیا کہ اُن کو بلا وجہ عذاب دیا جا رہا ہے۔

جواب: تاکہ یہ پتا چل جائے کہ یہ عبادت کے مستحق نہ تھے اور کفار دیکھ لیں کہ جنہیں وہ عزیز ترین سمجھتے تھے در اصل ذلیل ترین ہیں۔ اور کفار نے بتوں کی پرستش کی ان سے اس بات کی امید رکھ کر کہ اللہ تعالیٰ نے بتوں کو عذاب دیا تاکہ ان کی جہالت کا اظہار ہو اور اُن کی بُت سے امید منقطع ہو جیسے بڑے لوگوں کے نابعدار اُن سے فائدہ کی امید پر ان کی خدمت کرتے ہیں۔ پھر کفار اپنے بتوں سمیت دوزخ میں جائیں گے تاکہ ان پر عذاب کی شدت ہو اور اُن سے امیدیں منقطع ہوں۔

سوال: کیا تمام جہنم کا ایندھن آگ اور پتھر ہوں گے یا مختلف مقامات اور مخصوص طبقات۔

جواب: مخصوص طبقات کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے، جیسے کہ نارًا کی تنکیر بتاتی ہے۔ کما قال عزّوجل:

قُوْا انفسکم و اھلیکم نارًا۔ (خود کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچاؤ)

اور فرمایا:

فانذرتکم نارًا تلظّٰی۔ (میں نے ڈرایا ایسی آگ سے جو شعلہ مارتی ہے)

اور ہو سکتا ہے کہ جنات، کفار اور ان کے شیاطین کے لیے ایک قسم کی آگ ہو اور انس کی نسل اور شیاطین کے لیے دُوسری قسم کی آگ ہو وہ اس کے ایندھن اس لیے بنائے جائیں گے تاکہ انہیں اُن کے اعمال کی سزا ملے، کیونکہ ہر جنس کا عذاب اعمال کے موافق ہونا چاہیے۔

اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ ○ یعنی جہنم ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی جو قرآن کو نہیں مانتے۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ دوزخ مخلوق ہے اور اس وقت موجود ہے۔ معتزلہ فرقہ اس کا منکر ہے۔

مسئلہ: اس سے یہ معلوم ہُوا کہ قرآن کا پڑھنا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرنا دوزخ سے بچنے کا ثمر ہیں کہ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔

مسئلہ: قرآن اور قرآن خواں کی فضیلت کا بیان بھی ہو گیا۔ چنانچہ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فاتوا بسورۃ من مثلہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ سورۃ سے ایک بلند مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں یہاں تک کہ سورتوں کو ختم کرنے پر تمام مراتب طے کر لیتے ہیں۔

حکایت حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہر شام کو ہر شیطان اپنے سردار کی طرف واپس ہو کر اپنے کردار کا پتا دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے میں نے یُوں کیا، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں زاہد کو دھوکا دے کر برائی کرائی۔

یہاں تک کہ سب سے ذلیل ترین شیطان کہتا ہے کہ میں نے ایک لڑکے کو قرآن پڑھنے سے روک لیا ہے۔ اس بات پر شیطان اُٹھ کر اس کی تعظیم کرتا اور اسے اپنے ساتھ بٹھاتا ہے اور بہت خوش ہوتا ہے۔

مسئلہ: ماں باپ پر اولاد کے تین حقوق ہیں،

۱۔ نام اچھا رکھیں۔

۲۔ قرآن و ادب سکھائیں۔

۳۔ لڑکے کا ختنہ کرائیں۔

ف: قرآن سے اصلی غرض اس پر عمل کرنا اور اس کے آداب سے متادب ہونا ہے۔ مراد از نزول قرآن تحصیل سیرت خوب است نہ ترتیل سورۂ مکتوب۔ (ترجمہ: نزولِ قرآن کا مقصد اچھی سیرت بنانا ہے نہ کہ صرف اچھی ترتیل)

ف: قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، پھر اس کا باطن اور باطن کا باطن، یہاں تک کہ سات باطن۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ تو ز قرآں اے پسر ظاہر مبین
دیو آدم را نہ بیند جز کہ طین

۲ ظاہر قرآں چو شخص آدمیست
کہ جسمش ظاہر و جانش خفیست

ترجمہ: (۱) اے بیٹے! تو قرآن کے ظاہر کو دیکھ صرف ظاہر تو شیطان نے آدم کی مٹی کا گارا دیکھا۔
(۲) ظاہر قرآن کی مثال انسان کے ظاہری چمڑے کی ہے اور اس کے باطن کی مثال اس کی رُوح کی ہے جو انسان کے اندر پوشیدہ ہے۔

تفسیر صوفیانہ شیخ نجم دایہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قرآن کا ظاہر تو وہی ہے جس کی تفسیر علماٴ نے فرمائی۔ اور باطن وُہ ہے کہ جس کی حقیقت اہلِ حق نے بیان کی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ کتاب و سنّت کے موافق ہو اور قرآن و حدیث اس تفسیر کی شہادت دیں۔ ورنہ نرا الحاد و زندقہ ہے۔ کما قال عزوجل:

ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا۔

معترضین کے اعتراض کو اپنے حبیب علیہ السلام کے لیے اپنی غیرت کے نقاب کھڑے کر دیئے تاکہ اس حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ نہ کر سکیں اور معترضین کے اعتراض کو اپنے عزت کے پردے متعین کیے تاکہ اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب کے اسرار سے یہ لوگ محروم رہیں۔

سوال: اپنے صلی اللہ علیہ وسلم پر عبد مطلق کا اطلاق کیوں کیا حالانکہ دیگر عباد کو مقید کر کے یاد فرماتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: واذکر عبدنا ایوب۔ اور فرمایا: واذکر عبدنا داؤد وغیرھا۔ ہمارے عبد ایوب اور داؤد وغیرہما کو یاد کیجیے

جواب : کمالِ عبودیت کے لیے سوائے حبیب علیہ السلام کے اور کوئی دوسرا تیار نہیں ہوا اور کمال عبودیت ماسوی اللہ سے آزاد ہونے کا نام ہے اور یہ رتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے :

"ما زاغ البصر وما طغیٰ " فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداء کم من دون اللّٰہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو یومِ میثاق میں تمہارے ساتھ تھے کیونکہ تم اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم الستُ بربکم کا خطاب سننے والے تھے اور بلیٰ کہنے میں سب شریک تھے۔ پس اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے قرآن بنانے پر قادر ہیں تو تم بھی فطرتِ انسانی میں ان کے برابر ہو فلہٰذا تم بھی قرآن اپنے طور بنا کر لے آؤ۔ ان کنتم صٰدقین اگر تم سچے ہو فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار پس اگر نہیں کر سکتے اور ہرگز نہیں کر سکو گے، تو آگ سے ڈرو۔ یعنی قہر سے جو غضب حق کی صورت میں ظاہر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ سے فرمایا :

" تُو میرا عذاب ہے تیرے سبب سے جسے چاہوں عذاب دوں۔"

وقودھا الناس، وقود سے مراد انسان کی انانیت ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بُھلا دے والحجارۃ یعنی سونا کہ جس سے نفس کے شہوات و خواہشات اور اس کی طبعی اغراض حاصل ہوتی ہیں۔ انسان کی انانیت عبادت کرتی ہے اسے الحجارۃ سے اس لیے تعبیر کیا کہ کفار کے بُت اکثر پتھروں کے تھے۔ اور انسان کی انانیت کو الناس سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ وہ انانیت معاہدہ الست بربکم اور حق کو بھلا کر غیر کی پرستش کرتی اور غیر کی طالب رہتی ہے اسی لیے اسے نار کا ایندھن بنایا۔ قال عزوجل :

انکم وما تعبدون حصب جھنم۔ (بیشک تم اور تمہارے بُت جہنم کا ایندھن ہیں)

اعدّت للکفرین خصوصاً وہ آگ صرف کفّار کے لیے تیار کی گئی ہے لیکن مجرم مومنوں کو کفار کی تابعداری میں انھیں پاک کرنے کی خاطر دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔

جیسا کہ بہشت پیدا تو متقین کے لیے کی گئی ہے لیکن گنہگار مومن کو دوزخ میں داخل کر کے طاہر و مطہر کر کے داخل کیے جائیں گے۔ متقین کی تابعداری کے لحاظ سے جیسے کہ حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ :

"میں نے بہشت پیدا کی اور پھر اس کے اہل بھی پیدا کیے جو بہشت والے عمل کر کے بہشت میں داخل ہوتے ہیں اور دوزخ پیدا کی اور اس کے اہل بھی پیدا کیے جو دوزخ والے عمل کر کے دوزخ میں داخل ہوں گے۔"

تفسیر عالمانہ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (حلِ لغات :) بشارۃ ہر اس خبر کو کہتے ہیں کہ جسے سُن کر سرور و فرحت حاصل ہو۔

اب معنیٰ یہ ہوا کہ اے سیّد محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے ان کے دلوں کو خوش فرمائیے۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگا۔

(بعض مفسرین) فرماتے ہیں کہ یہ خطاب ہر اس کے لیے ہے جسے یہ خوشخبری ملے گی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے،
بشر المشّامین الی المساجد الخ (مساجد کو جانے والوں کو خوشخبری دو)
یعنی مساجد کی طرف اندھیری راتوں میں جانے والوں کو قیامت میں نورِ تام کی خوشخبری ہو۔
یہ خطاب ہر اس شخص کو ہے جسے یہ خوشخبری حاصل ہوگی، یہ کسی ایک فردِ مخصوص کو خطاب ہے۔
وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور نیک عمل کرتے ہیں۔ اور صالح عمل وہ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔

مسئلہ: عمل کے ایمان پر عطف لانے میں اشارہ ہے کہ ایمان و عمل ایک دوسرے کے غیر نہیں۔ اور بتایا جارہا ہے کہ بہشت کے داخلہ کا دار و مدار دونوں پر ہے، کیونکہ ایمان بمنزلہ اساس کے ہے اور عمل صالح بمنزلہ تعمیر کے۔ جس اساس پر تعمیر نہ ہو وہ اساس بھی بیکار، اور عمل صالح کے بغیر بہشت کی طلب سفہاء کا کام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بہشت کے داخلہ کا سبب عمل صالح قرار دیا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو صرف ایمان کی وجہ سے بہشت میں داخل کر دے لیکن عمل صالح ایمان کی نورانیت کو بڑھاتا ہے اور اسی سے انسان کا دل روشن ہوتا ہے۔ ان میں سب سے پہلا عقبہ ایمان کا ہے اس میں دیکھا جاتا ہے کہ اس عقبہ سے اس کا ایمان بچ گیا یا نہ۔ اس لحاظ سے عمل صالح لازم ہوا تاکہ باقی عقبات سہولت سے طے ہوں۔

اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ ان کے لیے باغات ہیں جن میں پھلدار درخت ہیں۔ اور جنّت اسے کہتے ہیں جس میں کھجور کے درخت ہوں۔ اور فردوس وُہ ہے جس میں انگور ہُوں۔ کذا قال الفرا۔ اور جنت کو جنت اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسری سے لپٹی ہوتی ہیں اور پھر وہ مقام درختوں سے ڈھکا چھپا ہوتا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایک پردہ ہے اور جنّة بروزن فعلة یکبار کرنے کے معنیٰ میں ہے۔

سوال: دار الثواب کو دار الثواب کیوں کہتے ہیں؟ حالانکہ وہ تو ایسی جگہ ہے کہ نہ تو اس کے محلات گنے جا سکتے ہیں اور نہ ہی دریچے۔

جواب: اس لیے کہ یہ نعمتوں کا بہت بڑا ماویٰ و ملاذ ہے۔

سوال: جنّات کو جمع اور پھر نکرہ کرکے کیوں لایا گیا؟

جواب: دراصل جنّت دار الثواب کے مجموعہ کا نام ہے اور اس میں کئی جنّتیں ہیں اور عابدین کے مراتب کے مطابق ہر ایک کے درجات مقرر ہیں پھر ان کے ہر الگ الگ طبقہ کا نام جنّت ہے اور وُہ کل آٹھ ہیں:

(۱) دار الجلال: یہ تمام نور ہی نور ہے۔ شہر، گھر، محلات، برتن، دروازے، کھڑکیاں، بالاخانے، اوپر نیچے، پردے اور زیورات غرضیکہ جو شے بھی اس میں ہے تمام نور کی ہے۔

(۲) دار القرار: اس میں تمام اشیاء مرجان کی ہیں۔

(۳) دارالسلام : اس میں تمام چیزیں یاقوت احمر کی ہیں۔
(۴) جنۃ عدن : اس کی تمام اشیاء زبرجد کی ہیں۔
(۵) جنۃ الماوٰی : یہ خالص سونے کی ہے۔
(۶) جنۃ الخلد : یہ خالص چاندی کی ہے۔
(۷) جنۃ الفردوس : یہ لؤلؤ (موتی) کی ہے اور اس کی دیوار کی اینٹیں ایک سونے کی اور ایک چاندی کی اور ایک یاقوت اور ایک زبرجد کی، اور اس کا گارا مشکِ خالص کا ہے۔ اور اس کے محلات یاقوت اور بالاخانے لؤلؤ کے۔ اس کا میدان سونے کا اور زمین چاندی کی اور روڑے مرجان کے اور مٹی مشک کی اور انگوری زعفران و عنبر کی۔
(۸) جنۃ النعیم : یہ زبرجد کی ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب مومن بہشت میں داخل ہوگا ستر ہزار باغ دیکھے گا، اس باغ میں ستر ہزار درخت ہوں گے اور ہر درخت پر ستر ہزار پتے ہوں گے اور ہر پتے پر لکھا ہوگا لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) اُمّۃٌ مذنبۃٌ و ربٌّ غفورٌ۔ اور ہر پتے کی چوڑائی کی مسافت مشرق و مغرب کے مابین فاصلہ ہے۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ ط یہ جملہ جنّات کی صفت ہے اور انہٰر، نہر بفتح الہاء و سکونہا کی جمع ہے۔ یہ جدول سے بڑی اور دریا سے چھوٹی اور پانی کے جاری ہونے کا نام ہے۔ جیسے نیل جو مصر کی نہر ہے اس سے اس کا پانی مراد ہے۔

سوال : باغات کے نیچے نہریں کیسے جاری ہوں گی؟

جواب : آپ نے دیکھا ہوگا کہ نہروں کے کنارے درخت ہوتے ہیں اور پھر ان کے نیچے پانی جاری ہوتا ہے، اسی طرح بہشت کے باغات ہوں گے۔

ف : مسروق فرماتے ہیں کہ بہشت کی نہریں بغیر گڑھے کے جاری ہوں گی۔

ف : سب سے زیادہ پاکیزہ اور اچھا باغ وہ ہوتا ہے کہ جس کے درخت گھنے اور ان میں نہریں جاری ہوں۔ اس کے بغیر باغ میں حُسن و کمال اور راحت و سرور پیدا نہیں ہوتا۔ پھر وہ باغ تصویر کی مانند ہوگا جس میں روح نہ ہو یا مثل اس جسم کے کہ جس میں جان نہ ہو، اس لیے اللّٰہ تعالیٰ نے جہاں بہشت کا ذکر فرمایا ہے وہاں نہر جاری کا بیان بھی فرمایا۔

ف : نہریں چار قسم کی ہوں گی :

(۱) شراب کی
(۲) دُودھ کی
(۳) شہد کی
(۴) پانی کی

جب پانی کی نہر سے کچھ پئیں گے تو ان کے بدنوں میں زیست آجائے گی کہ اس کے بعد پھر کم نہیں ہوں گے۔ جب شہد سے کچھ پئیں گے تو شفاء و تندرستی پائیں گے اس کے بعد پھر بیمار نہیں ہوں گے۔ جب شراب کی نہر سے پئیں گے تو سرور و راحت پائیں گے۔ پھر اس کے بعد غمگین نہیں ہوں گے۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

۱ آبِ صبرت جوئے آب خلد تست
جوئے شیر خلد مہر تُست

۲ ذوق طاعت گشت جوئے انگبیں
مستی و شوخی تو جوئے خمر بیں

۳ ایں سبہا چوں بفرمان تو بود
چار جو ہم مر ترا فرمان بود

ترجمہ : (۱) تیرے صبر کا بدلہ خلد بریں ہے خلق پر مہر محبت کا بدلہ بہشت کا دودھ،
(۲) طاعت کی چاشنی کا بدلہ شہد جنت ہے عبادت کی شوخی اور مستی شراباً طہورا ہے۔
(۳) فرامینِ الٰہی کی بجا آوری اس کا سبب ہیں کہ یہ چار نہریں تیرے زیر فرمان ہوں۔

ف : عرش کے پائیں پر چوڑا کر کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو لکھا گیا ہے۔ بسم کی میم سے پانی کا چشمہ اور اللہ کی ہٰ سے دُودھ کا چشمہ اور الرحمٰن کی میم سے شراب کا چشمہ اور الرحیم کی میم سے شہد کا چشمہ جاری ہے۔ یہ ان نہروں کا منبع ہے۔ پھر یہ سب کی سب کوثر میں جاتی ہیں جسے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حوض کہتے ہیں۔ وُہ ابھی بہشت میں موجود ہے اور قیامت کے میدان میں صرف مومنین کی پیاس بجھانے کے لیے اسے منتقل کیا جائے گا پھر وہاں سے اسے بہشت میں پہنچایا جائے گا۔

ف : بہشت میں ایک چشمہ کافور کا ہے دُوسرا زنجبیل کا، تیسرا سلسبیل کا اور چوتھا رحیق کا کہ جس کا مزا تسنیم سا ہے ملائکہ کے واسطہ سے اہلِ جنت کو پلایا جائے گا۔ لیکن مومنین کو اللہ تعالیٰ بلا واسطہ شراب طہور خود پلائے گا۔

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا جبکہ دیے جائیں گے بہشت سے روزی یعنی جب کھلائے جائیں گے ثمر میں سے۔ ثمرہ سے سیب یا انار خاص ہی مراد نہیں ہیں بلکہ انواع اثمار میں سے ایک نوع مراد ہے اور لفظ مِنْ پہلا اور دوسرا

دونوں ابتدائے غایت کے لیے ہیں۔ کیونکہ رزق کی ابتدا جنّت سے اور جنّت کے رزق کی ابتدا ثمرہ سے ہوگی مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ رزقاً ، رزقوا کا مفعول ہے۔ اور جس طعام سے حیوان نفع اٹھائے، اسے رزق کہتے ہیں۔ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ یعنی یہ تو اسی کی مثل ہے جو ہم کو اس سے قبل دنیا میں دیا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ ان میں مکمل مشابہت ہوگی۔ بنا بریں اسے ایک ہی کہا گیا۔ بہشت کے میووں کو دنیا کے میوہ جات کی مثل اس لیے بنایا گیا تاکہ نفس انہیں دیکھ کر میلان کرے۔ کیونکہ دیکھی ہوئی چیز کی طرف طبائع میل اور غیر معروف شئے سے نفرت کرتی ہیں اور یہ بھی ہے کہ بہشت کے ثمرات کی فضیلت ظاہر ہو۔ کیونکہ اگر غیر معہود جنس ہوتی تو گمان ہو سکتا تھا کہ یہ اسی طرح ہی ہوں گے۔ اگرچہ اس سے اچھے ہوں۔ پس جب دُنیا کے کسی انار کو دیکھیں گے اور اس کے حجم وغیرہ پر غور کریں گے تو دنیا کا بڑے سے بڑا انار چھوٹے تربوز کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے برعکس جب بہشتی انار کو ایسا بڑا اور موٹا دیکھیں گے تو وہ تمام اہلِ دار کو سیر کر دے گا۔ بنا بریں اُس کی فضیلت ظاہر اور سرور و مستی حاصل ہوگی تعجب بھی بڑھے گا کہ موسم نہ ہونے کے باوجود بھی بہشت میں موجود ہے۔ کُلَّمَا کا عموم دلالت کرتا ہے کہ ان کا یہ قول بار بار ہوگا کہ پہلے قول کے بعد مرۃ بعد مرۃ اس سرور و مستی اور فرطِ تعجب کو ظاہر کرتے ہوں گے جو ان کے مابین فرق ہوگا کہ لذّت تو بہت بڑی ہے اور شکل و صورت بھی ایک ہے۔ گویا کہیں گے کہ یہ بعینہ وہی میوہ جات ہیں جو ہم نے دنیا میں کھائے تھے۔ لیکن یہ رتبہ لذّت و خوشبو کا اُنہیں کہاں سے ملا۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے:

اِنَّهٗ لَیْسَ فِی الْجَنَّةِ مِنْ اَطْعَمَةِ الدُّنْیَا اِلَّا الْاِسْمُ۔

یعنی بہشتی میوے صرف نام سے ہمارے میووں کے مطابق ہوں گے ورنہ این کجا آں کجا۔ بہشت کا میوہ نقصان نہیں دے گا تاکہ معلوم ہو کہ دنیاوی میوہ جات کے مقابلہ میں بہشت کے میوہ جات کتنے نرم، خوشنما اور لذیذ ہیں۔ اس سے وہم نہ ہو کہ دُنیا اور بہشت کے میوہ جات کے مابین مشابہت ہی نہیں ہوگی۔ یہ عقلاً بھی محال ہے اس لیے کہ قاعدہ ہے کہ اسماء کا اطلاق اتحاد نوعی کے ساتھ ہوتا ہے۔

وَاُتُوْا بِهٖ وہ رزق یا مرزوق دنیوی اور اُخروی دئے جائیں گے۔ ضمیر کا مرجع فحوائے کلام ہے جو دارین میں دئے گئے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: ان یکن غنیًّا او فقیراً فاللّٰہ اَولیٰ بھما ای بجنس الغنی و الفقیر۔ مُتَشَابِهًا ؕ یعنی رنگ اور جوت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے۔ پس جب اہلِ بہشت بہشت کے میوہ جات کھائیں گے تو اس کا مزا غیر پائیں گے کہ بہشتی میوے بہتر اور لذیذ تر ہوں گے یعنی ان کی کوئی شے ردّی نہیں ہوگی۔

ف: حضرت مسروق سے مروی ہے کہ بہشت کی کھجوریں جڑ سے لے کر ٹہنیوں تک تہ بہ تہ ہوں گی۔ یعنی ان کے بعض بعض پر منضود ہوں گے یعنی متراکب و مجتمع ہوں گے۔ یعنی دنیا کے اشجار کی طرح نہیں ہوں گے کہ ان کی ٹہنیاں اور

اثمار متفرق ہوتے ہیں۔ جب اس کے ثمر توڑے جائیں گے تو پھر اس جگہ اور تیار ہوں گے اور ان کے گچھے بارہ ہاتھ کے ہوں گے۔ اگر تمام مخلوق اس کے ایک گچھے پر جمع ہو جائے تو سیر ہو جائے۔

حکایت ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اے ابوالقاسم! آپ کا گمان ہے کہ اہلِ جنّت کھائیں گے بھی اور پئیں گے بھی۔ آپ نے فرمایا: ہاں! اللہ کی قسم، جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے، بیشک ایک بہشتی کو کھانے پینے اور جماع میں دُنیا کے ستر آدمیوں کی طاقت دی جائے گی۔ میں نے کہا جو کھاتا ہے تو قضائے حاجت کی بھی ضرورت ہوتی ہے حالانکہ بہشت اس سے پاک ہے۔ آپ نے فرمایا: وہاں کی قضائے حاجت پسینہ ہے جو کہ مشک سے بھی زیادہ خوشبو ناک ہوگا۔

وَلَهُمْ فِيهَا اُن کے لیے بہشت میں اَزْوَاجٌ یعنی عورتیں اور حُوریں ہوں گی مُّطَهَّرَةٌ پاک احوال یعنے حیض و نفاس اور بول و غائط اور منی اور مخاط، بلغم و ریم، میل و کچیل اور سر کا درد اور دیگر درد اور ولادت اور طبع کی کراہت اور بدخلقی اور طبع کا میلان الی الغیر وغیرہ وغیرہ سے صاف ستھری ہوں گی اور مطھرۃٌ متطہرہ و طاہرۃ سے زیادہ بلیغ ہے اور خبر دے رہا ہے کہ انہیں کسی مطہر نے طاہر کیا ہے اور مطہر سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔

ف: حضرت حسنؓ فرماتے ہیں: دراصل حُوریں یہی عورتیں ہوں گی جو دنیا میں تھیں اب انھیں صاف ستھرا کر کے بہشت میں بھیجا جائے گا۔

ف: حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں: حُورِعین پاؤں کی انگلیوں سے لے کر گھٹنوں تک زعفران سے پیدا کی گئی ہے اور پھر گھٹنوں سے پستان تک خالص مشک سے، پھر پستانوں سے گردن تک عنبر اشہب یعنی ابیض سے پھر گردن سے سر تک کافور سے۔ جب متوجہ ہوتی ہے تو اس کے منہ کے نور کی چمک ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے اہلِ دنیا کے لیے سُورج کے نور کی چمک۔

وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ○ ہمیشہ زندہ رہیں گے، مریں گے نہیں اور نہ ہی بہشت سے نکلیں گے۔

ف: حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں: اہلِ جنّت تیس سال کے جوان معلوم ہوں گے۔ مرد عورتیں ایک ہی سن کے ہوں گے۔ ان کے قد اپنے باپ حضرت آدم علیہ السّلام کی طرح ستّر گز قد کے ہوں گے۔ نوجوان اور بے عیب ہوں گے۔ ان پر ستّر پوشاکیں ہوں گی۔ پھر ہر پوشاک ہر لحظہ ستّر رنگ بدلے گی، نہ تھوکیں گے نہ کھنکاریں گے اور نہ ہی کوئی بُری اور مکروہ شَے اُن میں پائی جائے گی۔ ہر دن جمال وحُسن میں بڑھتے رہیں گے۔ جیسے اہلِ دنیا ہر دن بڑھاپے و کمزوری میں بڑھتے رہتے ہیں نہ اُن کا شباب ختم ہوگا نہ اُن کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے۔

ف: جان اے جانِ من! لذات میں سب سے بڑی لذتیں مکان، طعام اور نکاح ہیں، جیسے کہ استقراء کا تقاضا ہے اور ان سب کی اعلیٰ لذتِ دوام وثبات ہے کیونکہ ہر وُہ نعمت خواہ وُہ کتنی ہی بڑی ہو، لیکن وہ اگر زوال پذیر ہو تو وہ انسان کے

ذوق کو منغّض کرنے والی ہوتی ہے۔ اب مومن کو ان نعمتوں کی خوشخبری سُنائی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ فرمایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں ہمیشہ رہیں گی تاکہ ان کی خوشی و رونق میں اضافہ ہو۔

تفسیر صوفیانہ وبشّر الذین اٰمنوا انّ لھم جنّٰت تجری من تحتھا الا نھٰر یعنی انہیں حقیقی ایمان کے بیج اور ان کے اعمال صالحہ قلبیہ اور روحیہ و سریہ جن میں توحید و تجرید و تفرید حقیقی ہے۔ توکل و یقین و زہد و ورع و تقویٰ و صدق و اخلاص و ہدایت و قناعت اور عفت و مروت و فتوت و مجاہدہ و مکاہدہ و رغبت و رہبت اور خوف و خشیت اور رجاً و صفاً و وفاً و طلب و ارادہ اور محبت و حیاً اور کرم و سخاوت و شجاعت و علم و معرفت و عزت و رفعت و قدرت و علم و عفو و رحمت ہمت عالیہ وغیرہ جو مقامات و اخلاق ہیں کے اشجار سے قربت کی بہشتیں حاصل ہوتی ہیں جن کے نیچے عنایت و توفیق اور راحت و عظمت و نقل کی نہریں جاری ہیں۔ کلّما رزقوا منھا جب اُن کو اشجار کے ثمرات مشاہدات و مکاشفات معائنات سے عنایات ہوتے ہیں۔

من ثمرۃً یعنی مہربانی و صحت و عطیہ حاصل ہوتا ہے تو قالوا ھٰذا الّذی رزقنا من قبل کہیں گے۔ یہ تو وہی ہے جو ہم کو اس سے قبل دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اصحاب مشاہدات و مجاہدات کے ثمرات کی وجہ سے ایک صورت میں مختلف احوال دیکھتے ہیں۔ تو جو ان میں متوسط ہیں وہی کہتے ہیں کہ یہ مشاہدہ تو وہی ہے جو پہلے دکھائی دیا۔ حالانکہ اس کی صورت ایک ہوتی ہے اور حقیقت دیگر اس کی نظیر یہ ہے کہ سالک نور کو نار دیکھتا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نور ہدایت کو نار محسوس کیا قال انّی اٰنست نارًا۔ پھر کبھی وہی نار بصورت غضب ناک نمودار ہوتی ہے۔ جیسا کہ موسےٰ علیہ السلام کے متعلق مشہور ہے کہ آپ جب غصہ میں آتے تو آپ کی ٹوپی مبارک سے آگے کے شعلے نظر آتے تھے اور کبھی آگ محسوس ہوتی تھی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبت کی نار نفس کی محبوب اشیاً میں پہنچ کر انھیں جلا دیتی ہے۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آگ جلانیوالی دلوں پر پہنچ کر ان کے وجود کو راکھ کر دیتی ہے۔ پس ان کی شکلیں ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا و اُتوا بہٖ متشابھًا لیکن سالک تو ہر نار سے نرالا ذوق اور نئی لذت پاتا ہے ولھم فیھا ازواجٌ یعنی ارباب کے لیے قربات کی جنت میں عورتیں ہیں جو ابکار غیب سے صاف و ستھری، جن کو اغیار کی ملاوٹ تو کیا اغیار کی ہوا تک نہ لگی ہو گی، وہ ان باکرہ عورتوں کی بکارت میں ہمیشہ رہیں گے۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ بیشک بعض علوم خالص موتی کی طرح ہوتے ہیں انھیں عارفین باللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جب وہ ان علوم کو ظاہر کرتے ہیں تو ان کا انکار سوائے جاہلین کے اور کوئی نہیں کرتا۔

ف : ہر وہ شے جس کا عالم شہادۃ میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جیسے اُس کی صورت دنیا میں ہوتی ہے۔ اس کا معنےٰ غیب کے عالم میں بھی ہونا ہے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں پڑھتے: اللھم ارنا الاشیاء کما ھی قیامت میں اشیا کی صورتیں و حقیقتیں حاصل ہوں گی۔ لیکن اس وقت صورت پر معنی و حقیقت غالب ہوگی۔ اس لیے شے کی

صورت بعینہٖ نظر آئے گی۔ اسے دیکھ کر کہے گا ؛

ھذا الذی رزقنا من قبل ۔ پھر اس وقت صورت اور معنی ایک شے ہوں گی جیسے کہ پہلے تھی۔ لیکن ذوق پہلی صورت کا غیر معلوم ہوگا۔ اسی لیے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ! بہشت میں دنیوی اشیا کے اسماء کا غیر ہوگا جیسا کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ بندہ جو کلمہ بھی اللہ کی راہ میں بولتا ہے قیامت کے بعد اس کی حالت ایسے ہوگی جیسے کہ کسی کو جسم میں تیر لگے اور اس سے خون جاری ہو۔ اس روز اس کا رنگ تو خون جیسا ہوگا لیکن اس کی خوشبو مشک جیسی۔ آج تو صرف خون کے رنگ کی شکل معلوم ہوتی ہے ، لیکن اس کی خوشبو کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن قیامت میں اس کی دنیوی شکل بھی نظر آئے گی اور خوشبو بھی سونگھی جائے گی۔

تفسیر عالمانہ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِىٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً (شانِ نزول :) حضرت حسن و قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مکھی اور عنکبوت کا ذکر کتاب مجید میں فرمایا اور اس کے ساتھ کفار و مشرکین کے لیے کہاوت بیان فرمائی تو یہود ہنس پڑے ، کہنے لگے کہ اسے اللہ کے کلام الٰہی سے کون سی مشابہت ہے۔

حیاءُ اس تغیر و انکسار کو کہتے ہیں جو انسان کو (بوجہ اس خوف کے جو اُسے عیب دار کرے یا اسے مذمّت کا نشان بنائے) اسے عارض ہوتا ہے۔ یہ بطریقِ تمثیل کے ہے۔ مچھر کی مثال دینے کو ترک نہیں کیا جاتا اس شخص کی طرح نہیں کہ حقارت بھری چیزوں سے اسکی تمثیل رک جاتی ہے ۔ان یضرب کا محل نصب ہے۔ یعنی یہ بنائے مفعولیت منصوب ہے اور ما اسمیہ ابہامیہ ہے۔ اپنے قریب والے اسم کو ابہام میں بڑھاتا ہے۔ گویا کہا گیا ہے کہ امثلہ میں سے کوئی مثال جس طرح بھی ہو لیں یہ اپنے ماقبل کی صفت ہوگی اور بعوضۃ ، مثلاً سے بدل ہے بعوضۃ چھوٹے مچھر کو کہتے ہیں ، اور اس نام سے بھی اسی لیے موسوم ہے گویا یہ بڑے مچھر کا بعض ہے۔

فَمَا فَوْقَهَا یعنی خواہ اس سے بڑے کی تمثیل ہو۔ جیسے مکھی اور عنکبوت یا اس سے صغر میں کم ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اضداد میں سے ہے کہ چھوٹے اور بڑے دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور وہ ایسا جانور ہے کہ وہ ٹھہرنے میں چھپ جاتا ہے اور تحرک میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یعنی ظاہر نہیں ہو سکتا جب تک اُسے تحرک نہ ہو۔

سوال : اللہ تعالیٰ نے ان کے معبودانِ باطلہ کی تمثیل عنکبوت کے گھر اور مکھی سے تو دی ہے لیکن مچھر کا ذکر کہیں نہیں آیا۔

جواب : اس آیت میں یوں فرمایا گیا : اللہ تعالیٰ حیا نہیں فرماتا تمہارے معبودانِ باطلہ کی تمثیل میں خواہ مچھر سے بھی مثال دے یا اس سے کم کے ساتھ ، پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر ان کی تمثیل عنکبوت اور مکھی سے ہو۔

ف : ربیع بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مچھر سے تمثیل اہلِ دنیا کے لیے عبرت ہے کیونکہ وہ جب تک بھوکا رہتا ہے

زندہ رہتا ہے اور جب سیر ہو جاتا ہے مرجاتا ہے۔ اسی طرح انسان جب غنی ہو جاتا ہے تو سرکش ہو جاتا ہے اور اسے ردی خیالات حائل ہوتے ہیں۔

ف: امام ابو منصور رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ ایک اعجوبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایک صغیر الجثہ دلالت کر رہا ہے اور کبیر الجسم تو بطریق اولیٰ، کیونکہ اگر تمام مخلوق جمع ہو کر مچھر یا مکھی کی شکل کی صورت بنائیں۔ اور وہ ترکیب جس کی اسے ضرورت ہے جیسے منہ، ناک، آنکھ، پاؤں اور ہاتھ اور مدخل و مخرج تو قادر نہیں ہوسکیں گے چہ جائیکہ وہ بہت بڑے اجسام کو تیار کرسکیں۔ علاوہ ازیں مچھر باوجودیکہ حقیر اور صغیر جانور ہے لیکن اسے ہاتھی (جو کہ کثیر الجثہ اور قوی القدرۃ ہے) کی طرح تمام آلات رکھتا ہے۔

ت: اس میں انسان کے حال اور اس کے کمال استعداد کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

انّ اللّٰہ خلق اٰدم علیٰ صُورتہٖ ای علیٰ صفتہٖ۔ (بیشک اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت یعنی صفت پر پیدا فرمایا)

پس باوجودیکہ انسان ضعیف القدر ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے جمال و جلال کے اوصاف کا ایک نمونہ اور عکس بنایا ہے تاکہ اپنے صفات کے شیشہ میں اللہ تعالیٰ کے صفات کا مشاہدہ کرے۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ (جس نے خود کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا)

اور یہ مخصوصہ صفت سوائے انسان کے کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ولقد کرّمنا بنی اٰدم الخ

مثنوی شریف میں ہے:

۱ آدمِ خاکی ز حق آموخت علم
تا بہفتم آسمان افروخت علم

۲ نام و ناموس ملک را در شکست
کوریٔ آنکس کہ در حق در شکست

۳ قطرۂ دل را یکے گوہر فتاد
کان بدریاہا دگر دوتہا نداد

۴ چند صورت آخر ای صورت پرست
جان بے معنیت از صورت نرست

۵ گر بصورت آدمی انساں بُدے

احمد و بُوجہل خود یکساں بُدے

ترجمہ : ۱۔ آدم خاکی نے اللہ تعالیٰ سے علم سیکھا اسی لیے تو اس نے ساتویں آسمان پر اپنا جھنڈا گاڑا۔
۲۔ جس نے فرشتے کے نام و ناموس کو توڑ دیا وہ بڑا بدبخت ہے اور حق تک نہ پہنچ سکا۔
۳۔ قطرۂ دل میں ایک گوہر پہنچا تو اس نے دریا کو کچھ نہ سمجھا۔
۴۔ اے صورت پرست! کب تک صورت پرستی میں رہو گے جان بے معنی ہو تو وہ صورت پرستی سے نجات نہ پاسکے گا۔
۵۔ اگر صرف انسانی شکل کا نام انسان ہوتا تو حضرت احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابوجہل ایک شئے ہوتے۔

ف : بعض فرماتے ہیں کہ ضعیف کے ذکر سے ضعیف قلوب کو قوت بخشی گئی ہے اور مخلوق کو اپنی قوت دکھائی ہے کہ ضعیف جانوروں کو قوی جانوروں کی شکل وہیئت میں پیدا فرمایا گیا ہے کیونکہ مچھر صغیر ہے اور ہاتھی کبیر ہے۔ لیکن اُن کی ہیئت ایک ہے بلکہ مچھر میں اُلٹا دو پر زاید ہیں۔ پس اس کے کرم سے کچھ بعید نہیں کہ قلیل العمل کو وہ عنایت فرمائے جو کثیر العمل کو عطا فرمائے گا۔ جیسا کہ صغیر الجثہ کو وُہ کچھ عطا فرمایا جو کثیر الجثہ کو عنایت ہوا۔

ف : عجیب تر بات یہ ہے کہ یہ صغیر الجثہ کبیر الجثہ کو ایذا پہنچاتا ہے۔ پھر اس کریم کے کرم سے کیا بعید ہے کہ اس نے شیر کو بڑی قوت کے ساتھ پیدا فرمایا اور مچھر نہایت کمزور ہیں۔ لیکن مچھر اور مکھی میں اڑنے کی ہمت کے ساتھ وُہ جرأت عنایت فرمائی کہ لوگوں کے سامنے اُڑتے پھرتے ہیں۔ باوجودیکہ لوگ ان کے ایذا دینے اور ہٹانے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔ لیکن شیر میں کتنی بُزدلی ہے کہ وُہ انسانوں سے دُور رہتا ہے بلکہ ان کی راہوں کو بھی چھوڑ جاتا ہے۔ اور اگر یہ بھی مچھر اور مکھی کی طرح جرأت دار ہوتا تو لوگ اُس کی دلیری سے ہلاک ہوجاتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ ضعیف میں دلیری پیدا کردی اور قوی میں بُزدلی اور پھر ضعیف یہ انسان کو عاجز بنا دیا لیکن قوی پر طاقت پیدا کردی لا تثیروا الزنا بیر الخ یعنی بھڑوں کو مت چھیڑو ایسا نہ ہو کہ تمہیں ڈس دیں۔ اسی طرح جاہلوں کو مت چھیڑو کہ کہیں گالیاں نہ دیں۔ اور انجیل میں ہے : لا تدخروا ذخائر کم الخ یعنی اپنے ذخائر جمع نہ کرو کہ کہیں انھیں دیمک نہ چٹ کر جائے۔ اور نہ کہیں جنگلوں میں رکھو کہ چور یا زہریلے جانور نہ ضائع کریں۔ اور انجیل میں یہ بھی ہے کہ ملکوت السماء کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسان اپنے گاؤں میں شاندار گندم بوئے لیکن جب لوگ سو جائیں تو اس کا دشمن آکر اس میں کڑوا بیج بو دے۔ جب کھیتی بڑی ہو تو اس میں اس کڑوے بیج کے پودے بھی ہوں۔ مالک کو کہا جاوے کہ یہ کیا ہوا تم نے تو اس میں گندم کا بیج بویا تھا وُہ جواب دے کہ جب گندم کاٹنے کا وقت آئے تو گندم کو کاٹتے جاؤ اور اور کڑوے بیج کے پودوں کو جلا دو۔ اس تمثیل سے مقصد یہ ہے کہ کسان سے مراد ابوالبشر ہیں اور قریہ سے مراد عالمِ دُنیا ہے۔ اور گندم سے مراد طاعت ہے۔ اور کڑوے بیج بونے والا شیطان ہے اور کڑوا بیج نافرمانی ہے۔

اور گندم کا کھیت کاٹنے والے ملائکہ ہیں جو بنی آدم پر موت طاری کرتے ہیں۔

حکایت مامون بادشاہ خطبہ دے رہے تھے کہ مکھی اس کی آنکھ میں آ پڑی۔ کئی دفعہ اسے ہٹایا گیا پھر آ گئی۔ یہاں تک کہ خطبہ بند کرنا پڑا۔ جب نماز سے فارغ ہوا تو ابو ہذیل معتزلی کو بلایا، اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے مکھیوں کو کیوں پیدا کیا؟ اس نے کہا اس لیے کہ سرکش بادشاہوں کو ذلیل کرے۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ (کذا فی روضۃ الاصفیاء)

ف: مکھی جیسی شے پیدا کرنے میں لاکھوں حکمتیں و مصلحتیں ہیں۔ حضرت وکیع فرماتے ہیں کہ اگر مکھیاں اور ہوا نہ ہوتیں تو دنیا بدبو سے بھر جاتی۔ اس کے عجائبات سے ایک عجوبہ یہ بھی ہے کہ جب انسان کے منہ پر بیٹھتی ہے تو اس کا دل تنگ ہو جاتا ہے اور عیش فاسد اور باغ باغیچے بے لذت معلوم ہوتے ہیں۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ باوجودیکہ یہ ضعیف ہے لیکن انسان کو عاجز کر دیتی ہے اور اس کے منہ پر بیٹھنے سے انسان کو عار ہوتی ہے۔ اب انسان سوچے کہ مکھی کے ہٹانے میں انسان کتنی جدوجہد کرتا ہے مگر اسے خیال نہیں کہ قبر میں بڑے بڑے سانپ اور بچھو ہوں گے انہیں کیسے ہٹائے گا۔

عقیدہ امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے ہر شے کا پیدا کرنا ہوا میں اڑتی ہوئی غبار سے بھی آسان تر ہے۔ بلکہ اس کی قدرت کے آگے مکھی اور عرش کا پیدا کرنا برابر ہے۔ نہ اس پر عرش کا پیدا کرنا مشکل ہے نہ مکھی کا۔ اس کی ذات عُسر و یُسر کے لحوق سے مقدس ہے۔

ف: حقیر کی حقیر سے مثال دی جاتی ہے، جیسے اعلیٰ کی اعلیٰ سے مثال دی جاتی ہے اگرچہ تمثیل دینے والا بڑی اونچی شان والا ہو۔ جیسا کہ انجیل میں سینے کے کھوٹ کو آٹے کے چھان سے تمثیل دی۔ کما قال:

لا تکونوا منخل یخرج منہ الدقیق الخ

یعنی چھلنی کی طرح نہ ہونا کہ اس میں سے اچھا آٹا نکل آتا ہے اور چھان اسی میں رہ جاتا ہے۔ اسی طرح تمہارے منہ سے حکمت کی باتیں نکل آتی ہیں لیکن چھان کی طرح کھوٹ اندر رہ جاتا ہے۔ اور بیوقوفوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کو بھڑوں کی چھیڑ چھاڑ سے تشبیہ دی۔

ویسے بھی اہلِ عرب کہاوتیں بیان کرتے ہیں۔ کما قالُوا:

هُوَ جَمْعُ مِنْ ذَرَّة۔ (وہ ذرہ کا مجموعہ ہے)

ان کا یہ خیال ہے کہ ذرّہ میں سات سال کی قوّت ہے۔ اور کہتے ہیں:

اَجْرَأُ مِنَ الذُّبَابِ۔ (وہ مکھی سے زیادہ جرأت مند ہے)

کیونکہ مکھی شاہوں کی ناک پر بیٹھنے سے نہیں ڈرتی۔ اور کہتے ہیں:

وَجَفْنُ الْاَسَدِ فَاِذَا ذَبَّ آبَ اَیْ اِذَا مُنِعَ رَجَعَ ۔(شیر کا چلیہ ہے کہ اسے ہٹاؤ تو واپس آ
اور کہتے ہیں :
اَسْمَعُ مِن قُرادٍ ۔
اُن کا خیال ہے کہ یہ اُونٹ کی ہلکی سی آواز سات راتوں کے سفر یا سات میل کے سفر سے سُن لیتی ہے ۔اور
کہتے ہیں :
فُلَانٌ اَعْمَرُ مِنْ قُرَادٍ ۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سات سو سال تک عمر ہوتی ہے ۔ اور کہتے ہیں :
اَعْمَرُ مِنَ النَّسْرِ ۔ (وہ گدھ سے زیادہ عمر والا ہے)
کیونکہ اس کی عمر تین سو سال تک ہوتی ہے ۔ اور کہتے ہیں :
فلانٌ اَصْرَدُ مِنْ جَرَادَةٍ ۔ کیونکہ ٹڈی سردیوں میں باہر نہیں نکلتی ۔ اور اصرد بمعنے ابرو ہے ۔
اور کہتے ہیں :
اَطْيَشُ مِنْ فَرَاشَةٍ ۔ کیونکہ وہ گرم مزاج ہے ۔
اور کہتے ہیں :
اَعَزُّ مِنْ مُخِّ الْبُعُوضِ ۔ کیونکہ مچھر کی چربی ہوتی ہے ۔ اسے نادر الوجود شے کے لیے
ہی بولا جاتا ہے ۔
اور کہتے ہیں :
كَلَّفَنِی مخ البعوض ۔ اس وقت کہتے ہیں جسے مالایطاق تکلیف دی جائے ۔
اور کہتے ہیں :
اَضْعَفُ مِنْ بُعُوضَةٍ ۔ (مچھر سے زیادہ کمزور ہے)
اسی طرح کہتے ہیں :
آكَلُ مِنَ السُّوسِ ۔ سُوس وہ کیڑا ہے جو گندم اور جَو کھاتا ہے ۔ اور اس کیڑے کو بھی کہتے ہیں جو
اُون وغیرہ کو خراب کرتا ہے ۔
مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے سمجھانے کے لیے مثالیں دیتا ہے اور حق سے حیا نہیں فرماتا ۔ اور اس کی مثالوں میں
ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں ۔ لیکن عقل والوں کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں ہوتی ہیں ۔ حضرت جلال الدین رومی
قدس سرہٗ فرماتے ہیں : ؎

بیت من بیت نیست اقلیمست

ہزل من ہزل نیست تعلیمست

ترجمہ: میرے اشعار نہیں بلکہ مستقل اقلیم ہیں میرا مذاق بھی تعلیم ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی جو لوگ قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔ فأ دلالت کر رہی ہے کہ مابعد ماقبل کے مدلول پر مرتب ہے۔ گویا کہا گیا ہے کہ پس یہ مثال بیان کی گئی تو مومن فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ جانتے ہیں کہ یہ مثال جو مچھر مکھی کے ساتھ دی گئی ہے الْحَقُّ حق ہے، یعنی ثابت ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مِنْ رَّبِّهِمْ ج یہ جملہ جو ضمیر حق کی ضد ہے یا وہ ضمیر (جو مثل کی طرف عائد ہے) سے حال ہے۔ یعنی یہ کہاوت اللہ تعالیٰ سے ہے۔ پس مومن اس حق مثال میں تفکر کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر صغیر و کبیر کو پیدا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کی قدرت کے آگے برابر ہے، اس لیے ان کا ایمان ہے وَ اَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یعنی یہود اور مشرک فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَآ کہتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے یا اس سے کیا شے اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا اس خسیس تمثیل سے اللہ تعالیٰ نے مراد لی ہے اور اس سے مشارٌ الیہ کی تحقیر مقصود ہے۔ مثلاً یہ مثال دے کر جب اس سے الف و لام محذوف کیا گیا تو یہ حال واقع ہوا بمعنے مثلاً یا تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ اُن کے جواب میں ارشاد ہوا یُضِلُّ بِهٖ یعنی اس مثال کے سبب سے رُسوا کرتا ہے اور اضلال بمعنے حق سے باطل کی طرف پھیرنا اور اضلال کی نسبت بمعنے خلق الضلال اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں اشارہ ہے کہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اگرچہ کسب کے لحاظ سے افعال بندوں کی طرف مسند ہوتے ہیں کَثِیْرًا یعنی بہت سے کفار، اس لیے کہ وہ ان مثالوں کا انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں بڑھ جاتے ہیں وَّیَهْدِیْ بِهٖ اس کی بدولت توفیق دیتا ہے کَثِیْرًا ط بہت سے مومنوں کو کہ وہ اس کی تصدیق کرنے سے ہدایت میں بڑھ جاتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ لوگ گمراہی کو اختیار کریں گے انہیں گمراہ کرتا ہے۔ اور جن کے لیے جانتا تھا کہ ہدایت کو پسند کریں گے انہیں ہدایت دیتا ہے

سوال: ہدایت یافتہ لوگوں کو کثرت کا حکم کیوں لگایا، حالانکہ وہ تو قلیل تھے۔

جواب: درحقیقت اہل ہدایت کثیر ہیں اگرچہ وہ قلت سے موصوف ہوتے ہیں اور ان کی قلت اس لیے بیان ہوتی ہے کہ وہ بہ نسبت اہل ضلال کے قلیل ہوتے ہیں۔

عقیدہ ہدایت یافتہ لوگ اگرچہ بظاہر قلیل ہوں درحقیقت کثیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ حق پر ہوتے ہیں اور (گمراہ) باطل پر۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سوادِ اعظم وُہ ہے جو حق پر ہو اگرچہ ایک ہو۔

وَمَا یُضِلُّ بِهٖٓ اس مثال کی تکذیب سے رُسوا نہیں کرتا اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۙ مگر ان کافروں کو جو اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتے اور اس کے فرمان سے باہر ہیں۔ فسق لغت میں بمعنے خروج ہے اور عرف شرع میں کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے

اللہ تعالیٰ کی طاعت سے خارج ہو جانا۔

مسئلہ: گناہِ صغیرہ بار بار کرنے سے کبیرہ ہو جاتا ہے۔

قاعدہ: فسق کی تین اقسام ہیں:

(۱) تغابی یعنی کسی گناہ کو قبیح سمجھ کر عمل میں لانا۔

(۲) اس گناہ کے ارتکاب میں منہمک ہونا۔

(۳) گناہ کا ارتکاب کرنا اس کے قبح کا منکر ہو کر۔

عقیدہ یہ تیسرا طبقہ کفر کے مراتب سے ہے۔ جب تک فاسق اس تیسرے درجے تک نہ پہنچے اس کا ایمان سلب نہیں ہوتا کیونکہ اس میں تصدیق تو موجود ہے کہ جس پر ایمان کا دارو مدار ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت کرتے اور اس کے امر کو چھوڑتے ہیں نقض بمعنے فسخ اور ترکیب کا توڑنا۔

سوال: ابطالِ عہد میں نقض کو کیوں استعمال کیا گیا؟

جواب: استعارہ کرکے عہد کو حبل (رسّی) کے معنے میں لیا گیا۔ اس لیے کہ وہ عہد کرنے والوں کے مابین اتصال (دھاگے) کی طرح ہوتا ہے۔

عقیدہ اللہ تعالیٰ کے عہد تین ہیں:

(۱) ذُرّیتِ آدم علیہ السلام سے یہ وعدہ لیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرنا۔

(۲) سادات انبیاء علیہم السلام سے وعدہ لیا گیا کہ اس کے دین کو قائم کریں اور اس میں تفرقہ پیدا نہ ہو۔

(۳) علماءِ کرام سے وعدہ لیا گیا کہ حق ظاہر کریں اور اُسے ہرگز نہ چھپائیں۔

مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ یعنی وعدہ کی توثیق اور اُسے قبول کرنے کے بعد۔ اس معنے پر ضمیر کا مرجع عہد ہے یا اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے کتابوں کو نازل کرکے اور انبیاء علیہم السلام کو بھیج کر اس وعدہ کو پختہ کیا۔ اس معنے پر ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہوگا اور یہاں پر میثاق اپنے مصدری معنے میں ہے نہ کر بمعنے عہد۔

حکایت حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا چچا زاد بادشاہِ زمانہ کا ملازم تھا۔ لوگوں کو ستاتا اور ظلم کرتا تھا۔ وُہ ایک دفعہ بیمار ہو گیا۔ اس حالت میں منت مانی اور اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ اگر مجھے آرام آ گیا تو ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شفا دے دی۔ لیکن عہد بھلا کر ملازمت اختیار کر لی اور پہلے سے زیادہ ظلم شروع کر دیا۔ پھر بیمار ہوا اور وہی نذر مانی، آرام آ گیا۔ پھر پہلے سے بھی زیادہ ظلم ڈھانے لگا۔ اب بہت زیادہ بیمار ہوا۔ حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ عیادت کے لیے تشریف لائے اور فرمایا: بھائی! کچھ نذر معین مانو اور اللہ تعالیٰ سے

پختہ وعدہ کرو کہ آیندہ ہرگز ظلم نہیں کروں گا، امید ہے تجھے شفا نصیب ہوگی۔ بیمار نے کہا کہ آج سے میرا پختہ وعدہ ہے کہ مجھ بیماری سے تندرستی نصیب ہو جائے تو میں ہرگز بادشاہ کی ملازمت اختیار نہیں کروں گا۔ اس حالت میں ہاتف نے ندا دی کہ اے مالک! ہم نے اسے بارہا آزمایا ہے اب اسے نذر کوئی فائدہ نہ دے گی یہ بہت جھوٹا ہے۔ چنانچہ وہ نوجوان اسی حال میں مرگیا۔ (کذا فی روضۃ العلماء)

مثنوی شریف میں ہے ؎

نقضِ میثاق[1] و شکستِ توبہا
موجبِ لعنت شود در انتہا

وَيَقْطَعُونَ مَآ أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ أَنْ يُّوصَلَ ۔ ان یوصل کا محل نصب ہے۔ کیونکہ یہ موصول کی ضمیر سے بدل ہے یہ ای ما امراللہ بہ ان یوصل ہے۔ اس سے ہر وہ قطع مراد ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں۔ مثلاً قطع رحمی اور مومنوں کی دوستی سے قطع اور انبیاء علیہم السلام اور کتب سماویہ کے مابین تفرقہ اور فرض جماعات کا ترک اور اسی طرح ہر بھلائی کو چھوڑنا اور ہر برائی کا عمل کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے بندہ کے مابین قطع پیدا کر دینا ہے۔

احادیث

(۱) جب لوگ اپنا علم ظاہر اور عمل ضائع کریں اور زبان سے اُلفت کا اظہار اور دل میں بغض و عداوت اور قطع رحمی کریں تو اللہ تعالیٰ اُن پر لعنت بھیجتا ہے۔ خدا کرے وہ کانوں سے بہرے ہوں اور آنکھوں سے اندھے۔

(۲) تین انسان ایسے ہیں کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ تلے ہوں گے:

(i) وہ عورت جس کا شوہر مرجائے اور اس کے ہاں چھوٹے چھوٹے یتیم ہوں اُسے نکاح کے لیے کہا جائے تو وہ یہ کہہ کر انکار کر دے کہ میں اپنے بچوں کی پرورش کروں گی یہاں تک کہ وہ نوجوان ہوں یا وہ یتیم مرجائے یا وہ عورت۔

(ii) وہ جس نے اپنے مال سے اچھا طعام تیار کیا اور یتامیٰ و مساکین کو کھلا دیا۔

(iii) وہ انسان جو صلہ رحمی کرے اس کے رزق میں وسعت کی جائے گی اور اجل میں بھی فراخی دی جائے گی اور قیامت میں عرش کے سایہ میں ہوگا۔

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۭ ایمان سے منع کرکے اور حق کے ساتھ استہزاء کرکے اور اس وصل کا قطع کرکے جس پر نظامِ عالم اور اس کے صلاح کا دارومدار ہے۔ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ۝ یہی لوگ آخرت میں بہشت میں پہنچنے کی بجائے عذاب میں مبتلا ہوں گے کیونکہ انہوں نے وفا کی بجائے نقض اور وصل کی بجائے قطع اور اصلاح

---

[1] میثاق کے خلاف کرنا اور توبہ توڑنا بالآخر لعنت کا سبب بنتا ہے ۱۲۔

کی بجائے فساد اور ثواب کی بجائے عتاب کو پسند کیا۔

مسئلہ: ہر مومن و کافر کی بہشت میں ایک منزل ہوتی ہے اور اس میں اس کے اہل و خدام ہوتے ہیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ سب کچھ اسے دیا جاتا ہے ورنہ ان اشیاء کا مومن کو وارث بنایا جاتا ہے جس سے اس کافر کو رشک آتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلاتِ نجمیہ میں ہے: انّ اللہ لایستحی ان یضرب مثلاً ما بعوضۃً فما فوقھا فامّا الّذین اٰمنوا۔ یعنی جنہیں نورِ ایمانی نصیب ہے وہ معانی وحقائق کا صور و امثلہ میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ وُہ حق اور اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اور جو لوگ کافر ہیں وُہ تو حق کا انکار کرتے ہیں۔ پھر ان کے افکار کی ظلمت کے پردے میں ان کی آنکھوں میں لٹکائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ حقایق کا مشاہدہ امثلہ کی کسوت میں نہیں کر سکتے۔ جیسے عجمی آدمی لغت عربیہ کے حقایق سے ناواقف ہوتا ہے۔ اسی طرح کفّار اور جہال حقائق امثال کے ادراک میں متحیر ہو کر کہتے ہیں:

ماذا اراد اللہ بھذا مثلاً۔ پھر اپنے جہل کی وجہ سے انکار میں پڑ جاتے ہیں یہاں تک کہ جہالت کے قدموں کے ساتھ گمراہی کی وادی میں جا گرتے ہیں یضلّ بہٖ کثیراً گمراہ کرتا ہے ان لوگوں کو جو اس نور سے چوک گئے جو روزِ ازل ہر ایک کو عنایت ہوا۔

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ظلمت میں مخلوق کو پیدا کیا، پھر اُن پر اپنے نور سے قطرات نازل کیے جنھیں اس نور سے کچھ پہنچا وہ ہدایت یاب ہوئے اور جو اس نور سے محروم رہے وہ گمراہ ہوگئے۔ اور جو عالمِ ارواح میں اس نور سے محروم رہا اسے دولتِ ایمان نصیب نہ ہُوئی اور جو دولتِ ایمان سے محروم رہے انہیں نورِ قرآن سے محروم رکھا گیا۔ اور جو نورِ قرآن سے دُور رہے انہیں ہدایت نہ ملی اور جن کو عالمِ ارواح میں وہ نور پہنچا ان کو نورِ ایمان ملا اور جو نورِ ایمان سے بہرہ یاب ہوئے انہیں نورِ ایمان سے نوازا گیا، اور جنہیں نورِ قرآن سے نوازا گیا وہ یہی ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے: ویھدی بہٖ کثیراً۔ اسی لیے قرآن بعض لوگوں کے لیے شفا اور بعض لوگوں کے لیے شقاوت و عذاب ہے۔ کیونکہ یہ اس کا کلام اور اس کی صفت ہے جو لطف اور قہر دونوں پر مشتمل ہے۔ لطف سے صادقین کو ہدایت نصیب ہوتی ہے اور قہر سے فاسقین گمراہ ہوتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالےٰ وما یضلّ بہٖ الّا الفٰسقین یعنی فاسق وہ جو اس نورِ ازل سے محروم رہے اب ان لوگوں کے نتائج کا پتا دیتے ہیں جو اس نور سے خارج ہوئے اور عہدِ ازلی کا ایفاء نہ کر سکے کما قال عزوجل: الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہٖ یعنی اس کو توڑتے ہیں جو روزِ میثاق وعدہ کر آئے کہ ہم خلوص سے عبادت و اطاعت کریں گے ویقطعون ما امر اللہ بہٖ ان یّوصل یعنی اس راہِ سلوک پر پُورے نہیں اُترتے۔ جن کا حکم ہے کہ یہ راہ

اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہے اور خلقِ خدا سے دُور رہنے کا عمل بجا نہیں لاتے۔ جیسا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ؛
وتبتّل الیہ تبتیلا۔ یعنی غیر اللہ سے بالکلیہ دُور ہو جا۔

ویفسدون فی الارض یعنی اپنی عادات کی زمین میں توحید کے فطری بیج کے ساتھ شرک اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے اور اس توحید کے بیج ایمان و عمل صالح کے پانی سے اعراض کی ملاوٹ کرتے ہیں اولٰئک ھم الخسرون یعنی کمال انسان (جو ان میں فطرۃً موجود ہے) سے خسارہ پالیا۔ جیسے وہ گٹھلی کہ جس میں کھجور کے پیدا ہونے کی استعداد تھی زمین میں پہنچ کر پانی نہ ملنے کے سبب خسارہ میں آجاتی ہے۔ کما قال عزوجل؛
والعصر انّ الانسان لفی خسر اِلّا الّذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت۔

تفسیر عالمانہ كَيْفَ تَكْفُرُونَ لفظ کیف منصوب ہے تکفرون کی ضمیر سے حال ہے یعنی تم سرکش ہو، کفر کرتے ہو، یعنی انکار کرتے ہو بِاللّٰهِ اس کی وحدانیت کا، باوجودیکہ تمہارے پاس دلائل انفسیہ و آفاقیہ بھی موجود ہیں جو تمہیں کفر سے ایمان کی طرف لے جانے والے ہیں اور استفہام انکاری ہے نہ بمعنے انکار الوقوع بلکہ بمعنے انکار الواقع ہے۔ یہ استفہام بات کو بعید بتانے اور تعجب میں ڈالنے کے لیے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تعجب یونہی ہوتا ہے کہ بندے کو تعجب میں ڈالے اور اُس کا یہی طریقہ ہے کہ بندے کو تعجب کی طرف بلائے۔ گویا فرماتا ہے کہ تم تعجب نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کُفر کرتے ہو۔ (کذا فی تفسیر ابی اللیث)

اور قاضی صاحب فرماتے ہیں یہ استفہام استخباری ہے، گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے خبر دو کہ تم کس حال میں کُفر کرتے ہو۔

وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا۔ اموات ٌ میّتٌ کی جمع ہے۔ جیسے اقوالٌ قیلٌ کی جمع ہے۔ یعنی حالانکہ تم مردہ تھے یعنی ایسے جسم تھے کہ اُن میں حیات نہ تھی صرف عناصر تھے اغذیہ اور نطفے اور بوٹیاں، نقشہ نہ بنے ہوئے تھے۔

سوال: انھیں مُردہ کیسے کہا گیا حالانکہ وُہ تو جماد تھے۔ میّت تو اسے کہا جاتا ہے کہ جس میں پہلے حیات ہو۔

جواب: یہ غلط ہے بلکہ حیوٰۃ نہ بھی ملی ہو اسے بھی میّت کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛
بلدًا میّتًا۔ (شہرِ ویران)

فَاَحْيَاكُمْ ارواح پیدا کر کے تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تمہاری ارواح پھُونکیں۔ پھر دنیا میں بھیجا۔ یہ الزام صرف قیامت میں اُٹھنے کے لیے ہے۔ اور فاؔ دلالت کر رہی ہے کہ یہ امور متعاقباً ہوئے کیونکہ زندہ کرنے کا مفہوم تب ہوگا جب ان کو پہلے میّت تصور کیا جائے اگرچہ اس حالت میں اُن پر مختلف حالات وارد ہوں گے جو یکے بعد دیگرے ہوں گے جیسا کہ ابھی گزرا۔ اور چونکہ دنیا میں کچھ مدّت گزرے گی اس لیے ثُمَّ تراخی کا لایا گیا۔ کما قال اللہ تعالیٰ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ یعنی جب تمہارے اجل ختم ہوں گے تو تم پر موت طاری کر دے گا۔

سوال : اِمَاتَت کا قادر کی قدرت پر دال ہونا تو ظاہر ہے۔ لیکن اُسے نعمتوں سے کیسے شمار کیا جا سکتا ہے اور یہاں پر نعمتوں کا بیان ہو رہا ہے۔

جواب : چونکہ یہ موت حیات ابدی کا وسیلہ ہے اسی لیے یہ بھی ایک نعمت ہے۔

ثُمَّ يُحْيِيكُمْ پھر تمہیں قبروں میں سوال وجواب کے لیے زندہ کریں گے اس وقت بندہ زندہ ہوتا ہے یہاں تک کہ آنے جانے والوں کے لیے جوتوں کی آہٹ اور من ربّك و من نبيّك وما دينُك کا سوال سنتا ہے اور ثُمّ تعقیب (جو علی التراخی کے لیے ہے) اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں پر احیاً سے بَعثؒ مراد نہیں کیونکہ وہ احیاً تو رجوع الی اللہ اور حساب کے لیے ایسے فوراً ہوگا کہ جس میں تراخی کا احتمال بھی نہیں ہے۔

عقیدہ آیت سے عذاب وراحتِ قبر کا ثبوت ملتا ہے۔ (کذا فی التیسیر)

ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○ پھر اسی مالک کی طرف تم کو لوٹنا ہوگا، نہ کسی غیر کی طرف۔ پھر وہ تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں جزا و سزا دے گا۔ اگر نیکی ہوگی تو بھلائی نصیب ہوگی اگر برائی ہوگی تو سزا پاؤ گے، انہی کی طرف قبروں سے اُٹھو گے۔ اب بڑا تعجب ہے کہ تم اس حال کو جان کر کفر کر رہے ہو۔

سوال : کفار اس بات کو مانتے تھے کہ ہم پہلے لا شے تھے، پھر پیدا کیے گئے اور پھر مرجائیں گے۔ لیکن یہ نہیں مانتے تھے کہ مرنے کے بعد اُٹھنا اور اللہ تعالیٰ کی حاضری بھی دینی ہے۔ جب وہ اس بات کو مانتے ہی نہیں تھے تو اب انہیں تعجب دلانے کا کیا معنیٰ۔

جواب : انھیں یہ تو قدرت حاصل تھی کہ دلائل کو سن سمجھ کر یہ بات مان لیں اب اُن کی اس قدرت کو بمنزلہ علم کے قرار دیا گیا۔ اس بنا پر ان کے عذر کے ازالہ کے لیے اتنی بات کافی ہے۔

مسئلہ : آیت میں دلیل ہے کہ جو ذات پہلی بار پیدا کرنے پر قدرت رکھتی ہے وہ بارِ دیگر بھی پیدا کرنے پر قادر ہے کیونکہ اس کے لیے بارِ دیگر پہلی بار کی پیدائش سے مشکل نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ (ربط :) یہ دیگر نعمت کا بیان ہے یعنی ان تمام اشیاء کو تمہارے دینی و دنیوی فوائد کے لیے مقدر فرمایا خَلَقَ بمعنے تقدیر اس لیے ہے کہ اس وقت تمام اشیاء پیدا نہیں ہوئی تھیں مَّا فِي الْأَرْضِ یعنی جو کچھ اس میں ہے جَمِيعًا منصوب ہے موصول ثانی سے حال ہے۔

قاعدہ : اس آیت سے إِنَّ الْأَصْلَ فِي الْأَشْيَاءِ الْإِبَاحَةُ (یعنی اشیاء میں دراصل اباحت ہے) والا قاعدہ حاصل ہوا۔ (کذا فی الکواشی)

ف : بعض متصوفین جُہلاء یہاں سے اباحۃ علی الاطلاق کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ نہ کوئی خطرہ ہے

اور نہ نہی اور نہ امر۔ جب معرفت حاصل ہوگئی اور محبت کا حصول ہوچکا تو اب خدمت کا کیا معنیٰ، اور محبوب کو محب تکلیف نہیں دیتا اور نہ ہی اسے کسی بات سے روکتا ہے۔ ان کی یہ بات صریح کفر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے امور سے نہی فرمائی ہے اور بہت سے احکام کا امر فرمایا ہے اور اس کے اوامر میں خطر بھی ہے اور وعد بھی اور وعید بھی۔ بشارتیں بھی ہیں اور تہدیدات بھی۔ جس پر نصوص ظاہر ہیں اور بے پناہ دلائل موجود ہیں۔ بنا بریں جو شخص بھی اس آیت سے مطلق اباحت کا ثبوت دیتا ہے وہ دین سے خارج ہے۔ (کذا فی التیسیر)

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ پھر آسمانوں کے پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا اور وہ ارادہ مقدسہ ایسا مضبوط کہ جو نہ کسی پھیرنے والے سے پھرے اور نہ کسی روکنے والے سے رُکے اور جیسے اشیاء کو پیدا فرمایا نہ کسی کے کہنے سے بڑھے اور نہ کم۔

سوال : یہاں پر آسمانوں کی پیدائش کا بیان زمین کی پیدائش کے بعد ہے اور دوسری جگہ فرمایا :

والارض بعد ذٰلك دحاها[1]

اس سے معلوم ہُوا کہ زمین کو بعد میں پیدا کیا گیا۔ آیات میں تناقض آگیا۔

جواب : یہ تناقض نہیں کیونکہ دحاها ' دَحْوٌ ' سے ماخوذ ہے بمعنے بچھانا۔ اور خَلْقٌ اور دَحْوٌ میں بہت بڑا فرق ہے۔

ف : حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

اللہ تعالیٰ نے (جہاں اب بیت المقدس ہے) زمین کو ایک پتھر کی شکل میں پیدا فرمایا جو صرف ایک کفِ دست کے برابر تھا۔ اس پر ایک دُھواں چمٹا ہُوا تھا۔ اُس دُھوئیں کو اُوپر اڑایا جس سے آسمان پیدا کیے اور اس پتھر والی شکل سے زمین بچھائی۔ (کذا فی الکواشی)

ف : حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک جوہر پیدا فرمایا جس کا طول و عرض ہزار در دہ ہزار سال کی مسافت کا تھا۔ پھر اس کی طرف ہیبت کی نگاہ فرمائی جس سے وہ جوہر پگھلا اور متحرک ہُوا جس سے ایک دُھواں اُڑا اور باقی ماندہ شے (جوہر) جمع ہوکر جھاگ کی طرح ہوگیا، جو پانی پر ٹھہر گیا۔ باری تعالیٰ نے اس جھاگ سے زمین پیدا فرمائی اور اس اڑتے ہوئے دھوئیں سے آسمان بنائے۔ اسی لیے عربی کہتے ہیں :

اَلسَّمَآءُ مِنْ دُخَانٍ خُلِقَتْ الخ

یعنی آسمان دُھوئیں سے پیدا اور ہوا سے اونچے، پھر اشارہ سے متفرق ہوئے۔ اور ستون کے بغیر قائم ہیں۔ اور ایک پھونک سے ٹوٹ جائیں گے۔

---

[1] اس کے بعد یعنی آسمان کی پیدائش کے بعد زمین کو بچھایا۔

فَسَوّٰىهُنَّ یعنی انھیں مکمل یعنی ابتداءً ہی ٹیڑھے پن سے محفوظ کر کے سیدھا پیدا فرمایا۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ پہلے ٹیڑھے تھے اب انہیں سیدھا کیا گیا۔ اس میں ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر سَبْعَ سَمٰوٰتٍ [۱] ہے اور منصوب علی التمیز ہے۔ جیسے رَجُلاً کا منصوب ہونا علی التمیز ہے۔

ف : حضرت سلمان فرماتے ہیں کہ آسمان سات ہیں :

— پہلے آسمان کا نام رقیع ہے جو سبز زمرد کا ہے۔
— دوسرے کا نام ارقلون ہے جو سفید چاندی کا ہے۔
— تیسرے کا نام قیدوم ہے جو سرخ یاقوت کا ہے۔
— چوتھے کا نام ماعون ہے جو سفید موتیوں کا ہے۔
— پانچویں کا نام وبقاء ہے جو سرخ سونے کا ہے۔
— چھٹے کا نام وفنا ہے جو زرد یاقوت کا ہے۔
— ساتویں کا نام عروبا ہے جو نور سے چمک رہا ہے۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ اس میں علت بیان کی گئی ہے۔ گویا کہا گیا کہ چونکہ وہ اشیا کی کُنہ کو جانتا ہے۔ اسی لیے انھیں پیدا کیا، جیسے کہ اُن کے لائق اور ان میں نفع تھا۔ اس میں دلیل ہے کہ جس نے ان اشیاء کو بنایا وہ ان کو جانتا بھی ہے کیونکہ افعال کا اتقان و احکام اور احسن و انفع وجہ کے ساتھ خاص وہی کرتا ہے جو علیم و حکیم و رحیم ہو اور اس میں کفار کے وہم کا ازالہ بھی ہے کہ ان کا خیال تھا کہ جب اجسام ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین میں مل جائیں گے بلکہ مٹی میں مٹی ہو جائیں گے۔ پھر کس طرح دوبارہ ان اجزا کو جمع کیا جائے گا حالانکہ اس کی کوئی شئے باقی نہیں رہے گی اور نہ اس کے ساتھ کسی شئے کو ملایا جا سکتا ہے کہ جس سے وہ پہلی حالت میں عود کر آئے۔

تفسیر صوفیانہ اس آیت میں مراتب روحانیت کی طرف اشارہ ہے۔ پہلا عالم ملکوت ارضیہ اور قوائے نفسانیہ کا ہے۔ دوسرا عالم نفس کا، تیسرا عالم قلب کا ہے۔ چوتھا عالم عقل کا، پانچواں عالم سِرّ کا، چھٹا عالم رُوح کا، ساتواں عالم خفا کا ہے جسے سِرِّ روحی کہتے ہیں۔ اسی طرف سیدنا شیرِ خدا رضی اللہ عنہ اشارہ فرماتے ہیں کہ "مجھ سے طرقِ سماء کے متعلق پوچھو کیونکہ میں انہیں طرقِ ارض کے ذریعہ سے جانتا ہوں اور اس کے طرقِ احوال و مقامات ہیں جیسے زہد، تقویٰ، توکل، رضا وغیرہا۔"

ف : حضرت شیخ المعروف بافتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ "توحید کے بارہ باب ہیں جنہیں صوفیہ جلوتیہ توحید کے ذریعہ طے کرتے ہیں کیونکہ ان کا سِرّ یقین میں ہے اور وہ باب خلوتیہ اسمائے کے ذریعہ بھی طے کیے جا سکتے ہیں کیونکہ ان کا سِر برزخ میں ہے کہ جنت تین قسم کی ہے :

۱ - جنۃ الافعال

۲ - جنۃ الصفات

۳ - جنۃ الذات

کیونکہ بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما جنتیں سات ہیں - ان میں سے چار اہلِ یقین کے لیے یعنی جلوتیہ کے لیے اور تین اہلِ برزخ کے لیے یعنی خلوتیہ کے لیے وہ یہی تین ہیں - یعنی جنۃ الافعال والصفات والذات -

ف : تاویلات نجمیہ میں ہے کہ **کیف تکفرون باللہ** یا یہ خطاب توحید کا ہے جو مومنین کو ہو رہا ہے - یعنی تم اللہ اور اس کے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم روحانی طور پر آدم علیہ السلام کی پشت میں تھے پھر تمہیں زندہ کیا - یعنی تمہیں پشتِ آدم سے نکالا اور الستُ بربکم جیسا لذیذ خطاب چکھایا - اور اس خطاب کی لذت کے ساتھ تمہیں جواب باصواب کی توفیق بخشی کہ تم نے بلیٰ کہہ دیا طوعاً نہ کرہاً - پھر تمہیں موت بخشی یعنی صلب آدم سے اصلابِ آباً میں پہنچا کر عالمِ طبعیہ انسانیہ کی طرف راجع کیا - پھر انبیا علیہم السلام کی تشریف آوری سے ان کی دعوت قبول کرنے سے پھر تمہیں زندہ کیا اور انبیاء علیہم السلام کی رہبری سے میری طرف ہی لوٹ آؤ گے -

یا یہ خطاب تشریف کا ہے جو اولیاء و انبیاء کو ہو رہا ہے یعنی تم کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم اموات یعنی کتمِ عدم میں تھے پھر تمہیں عالمِ ارواح میں زندہ کیا پھر تمہارے ارواح کے گارے کو نورِ عنایت کے پانی سے بنایا جسے محبت کے ہاتھ نے وصال کی چالیس صبح سے تخمیر کیا - پھر تمہارے شہود و جمال سے جدا کر کے مقبرۂ حُسن و خیال کی طرف موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا، انبیاء علیہم السلام کو نورِ وحی سے اور اولیاء کرام کو نورِ ایمان کی روح سے، پھر تم میری طرف لوٹ آؤ گے انبیاء علیہم السلام تو عروج سے اور اولیاءِ کرام جذباتِ حق کی طرف رجوع کرنے سے - کما قال تعالیٰ :

ارجعی الیٰ ربك - (اپنے رب کی طرف لوٹ)

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اُس کی طرف رجوع ضروری ہے یا تو اپنے اختیار سے، جیسے کہ یعقوب کی قراۃ (بفتح التاء و کسر الجیم) دلالت کرتی ہے - یا اضطرار سے جیسے باقی قراء کی قرأۃ سے معلوم ہوتا ہے -

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا - یعنی تمام اشیاء کو تمہارے لیے اور تمہیں صرف اپنی ذات کے لیے پیدا کیا - قال تعالیٰ :

واصطنعتك لنفسی - (میں نے تمہیں اپنے لیے چن لیا)

اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تو کسی اور کے لیے نہ ہو جب میں سوائے تیرے اور کسی کے لیے نہیں ہوں - میں اپنی شان کے ساتھ صرف اور صرف تیرا ہوں - جیسے کہ حدیث شریف میں ہے :

" جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے "

(باقی بر صفحہ ۲۱۵)

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ
فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا
تَعْلَمُونَ ○ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ أَنۢبِـُٔونِي بِأَسْمَآءِ
هٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ ○ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝
قَالَ يٰٓـَٔادَمُ أَنۢبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ ۖ فَلَمَّآ أَنۢبَأَهُم بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّيٓ أَعْلَمُ غَيْبَ
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ○ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا
لِأٰدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ ۖ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ ۚ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ○ وَقُلْنَا يٰٓـَٔادَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَ
زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ
الظّٰلِمِينَ ○ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتٰعٌ إِلَىٰ حِينٍ ○ فَتَلَقَّىٰٓ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمٰتٍ فَتَابَ
عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ○ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى
فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِأٰيٰتِنَآ أُولٰٓئِكَ
أَصْحٰبُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ○

ترجمہ : اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں ، فرشتوں نے کہا ایسے کو نائب کرے گا جو ان میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا اور ہم تیری حمد کرتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ فرمایا مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے پھر تمام چیزیں ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے فرمایا اے آدم بتا دے انہیں تمام چیزوں کے نام جب آدم نے انہیں سب کے نام بتا دئے فرمایا میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے منکر ہوا اور تکبر کیا اور کافر ہو گیا اور ہم نے

فرمایا اے آدم تُو اور تیری بیوی اس جنّت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے مگر اس درخت کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے تو شیطان نے جنّت سے انہیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انھیں علیحدہ کر دیا اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک تمہارا دُوسرے کا دشمن ہے اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہم نے فرمایا تم سب جنت میں اُتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا اسے نہ کوئی اندیشہ ہے نہ کچھ غم ہے اور وُہ جو کفر کریں اور میری آیتیں جھٹلائیں گے تو وہ دوزخ والے ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔

(بقیہ ص ۲۱۳)

سبق موجودات میں کوئی ایسا نہیں جس کا یہ رتبہ ہو کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کا اور اللہ تعالیٰ اس کا ہو۔ اس میں راز ہے اور راز کا اظہار کفر ہے۔ اے سالک! تیرے لیے لایق ہے کہ اس کے سوا (کہ جس کے لیے تُو ہے) مشغول نہ ہو ورنہ اس کے سوا باقی رہ جائے گا (اور یہ خسارہ ہے)

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اس سے معلوم ہُوا کہ ساتوں آسمانوں کا وجود انسان کے تابع ہے وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ یعنی تمام کی پیدائش جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ انھیں کس لیے پیدا کیا اور مخلوق کا کوئی ذرّہ ایسا نہیں جو اس کی ذات اور صفات کی حمد نہ کرتا ہو اور اس کی احدیت و صمدیت کی گواہی نہ دیتا ہو ہر شے گواہی دے کر کہتی ہے: ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحانك۔ (اے ہمارے رب! تُو نے اسے عبث پیدا نہیں کیا تو پاک ہے)

مولانا جامی قدس سرّہٗ فرماتے ہیں: ؎

در جہاں جلوہ گاہ وحدتِ تو
شہد اللہ گواہ وحدتِ تو

ترجمہ: جہان کی جلوہ گاہ میں تیری وحدت ہے شہد اللہ تیری وحدت کا گواہ ہے۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرمایا۔

سوال: وقت کے ذکر کا حکم کیوں دیا گیا ہے حالانکہ مقصود تو ان حوادث کو یاد کرنا ہے جو ان میں واقع ہوئے۔

جواب: محض مبالغہ ہے کیونکہ جو اس وقت کو یاد کرے گا لامحالہ واقعات بھی اس کے سامنے آجائیں گے۔

لِلْمَلٰٓئِکَۃِ فرشتوں سے ۔ لام تبلیغ کے لیے اور جار مجرور کی تقدیم اہتمام کے لیے ہے جیسے مطول میں تفصیلاً مذکور ہے اور مابعد کا شوق دلانا بھی ہے ۔اور ملائکۃ ملائکؑ کی جمع اور تاء جماعت کی تانیث کی تاکید کے لیے ہے ۔ اور وہ اس نام سے اس لیے موسوم ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے مابین پیغام کے لیے مقرر ہیں کیونکہ مَلَکٌ دراصل ملاکٌ مالکٌ کا مقلوب ہے ۔ اُلُوکٌ (بمعنے رسالۃٌ) سے مشتق ہے اور ملائکہ اکثر مسلمانوں کے نزدیک اجسامِ لطیفہ ہیں ۔ یعنی وہ لطیف اجسام جو مختلف شکلوں میں متشکل ہوتے ہیں ۔ دلیل یہ ہے کہ انبیاء کرام علیٰ نبیّنا وعلیہم السلام انہیں دیکھا کرتے تھے ۔ چنانچہ مروی ہے کہ جب حضور علیہ السّلام کو معراج ہُوئی تو فرشتوں کی ایک جماعت کو دیکھا کہ اوپر کو چڑھ رہے ہیں اور ایک دُوسرے کے سامنے چل رہے ہیں ۔ حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کہاں جا رہے ہیں؛ اُنہوں نے کہا : مجھے اس کا کوئی علم نہیں ۔ اتنا جانتا ہُوں کہ جب میں پیدا ہوا تو سب سے پہلے انہیں آتے جاتے دیکھا ، واللہ اعلم یہ کب سے آجا رہے ہیں ۔ ان میں سے ایک فرشتے سے پوچھا: تم کب پیدا ہُوئے ؛ انہوں نے کہا : ہمیں بھی کوئی خبر نہیں ، صرف اتنا جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چار ہزار سال کے بعد ایک ستارہ پیدا کرتا ہے اور جب سے میں پیدا ہُوا ہُوں میرے بعد چار ہزار ستارے پیدا کر چکا ہے ۔ پاکی ہے اس ذات کے لیے جس کی اتنی بڑی شان اور اس کا اتنا وسیع ملک ہے ۔

ف : جن ملائکہ سے مشورہ لیا گیا وُہ زمین کے تھے ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا تو ملائکہ اور جنّات بھی پیدا ہوئے ۔ ملائکہ کو آسمان میں ٹھہرایا ، جنّات کو زمین میں ۔ جنّات کا بابا جانّ تھا جس طرح انسانوں کا بابا آدم (علیہ السلام) ہے ۔ اور جان صاحب کو ایسی آگ کے شعلہ سے پیدا کیا گیا کہ جس میں دُھواں نہیں تھا اُسے زمین پر ٹھہرنے کا حکم ہُوا جب پھر اُس کی نسل بڑھی ۔

ف : معلوم ہوا کہ یہ معاملہ حضرت آدم علیہ السّلام سے پہلے ساٹھ ہزار سال کا ہے اور وُہ زمین پر بہت طویل عرصہ تک ٹھہرے رہے ، تقریباً ستر ہزار سال ۔ پھر اُن میں حسد اور بغاوت پھیلی اور لڑے مرے ۔ اُن کی طرف فرشتوں کو بھیجا ، جن کا امیرِ قوم ابلیس تھا اس کا نام عزازیل تھا ، اُن سے علم میں زاہد تھا ۔ زمین پر اُترتے ہی جنّات کو شکست دی اور انھیں زمین سے نکال کر دریاؤں اور پہاڑوں کی غاروں میں بھگا دیا اور خود وہیں رہنے سہنے لگے ۔ اب ان پر عبادت آسان ہو گئی ۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ ملائکہ جو آسمانوں پر بلند ہیں زیادہ خوف زدہ ہیں اور جو ملائکہ آسمانِ دنیا پر ہیں وہ بہ نسبت دوسروں کے آسانی میں ہیں اس کے بعد ابلیس کو زمین و آسمانِ دنیا کی سلطنت دی گئی اور بہشت کا خزانہ بھی سپرد ہُوا ۔ اس کے دو زمرد کے پر تھے ۔ بنا بریں کبھی زمین پر عبادت کرتا کبھی آسمان پر اور کبھی جنت میں ، اسی وجہ سے اُسے عُجب لاحق ہُوا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہی شاہی اس لیے دی کہ مجھ سے زیادہ مکرم ملائکہ میں کوئی ہے نہیں ۔ اور قاعدہ ہے کہ جو بھی دنیا میں آکر بستا ہے اس کو ایک وقت ضرور دُنیا سے برطرف ہونا پڑتا ہے بنا بریں اللہ تعالیٰ نے ابلیس اور اس کے لشکر کو فرمایا

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ ۔ اِنِّی جاعِلٌ میں بنانے والا ہوں فِی الْاَرْضِ زمین میں، کیونکہ بغاوت اور ظلم زمین پر ہی تھا خَلِیْفَۃً ط یعنی آدم علیہ السلام کو، کیونکہ جنات کے خلف ہو کر اور ان کے بعد تشریف لانے والے یہی تھے۔ علاوہ ازیں زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ بھی یہی تھے۔ یعنی میرا ارادہ ہے کہ زمین میں تمہارے عوض ایک دوسرا پیدا کروں۔ وہ تم سے ہوگا بھی بلند قدر۔ یہ بات اِن ملائکہ کو شاق گزری، کیونکہ یہ دیگر ملائکہ سے عبادت میں آسانی سے تھے۔

ف: اللہ تعالیٰ عالمِ دُنیا کو خلیفہ کی بدولت محفوظ فرماتا ہے جیسا کہ خزائن کو مُہر سے محفوظ کیا جاتا ہے اور عالمِ دنیا میں ہر زمانہ میں خلیفہ صرف ایک ہوتا ہے جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی ہے اور اس کی انتہا حضرت عیسیٰ پر ہوگی۔ خلیفہ بھیجنے میں ایک حکمت یہ ہوتی ہے کہ مخلوق میں فیض لینے کی استعداد کم ہوتی ہے اور بلا واسطہ برکات لینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ فیض دینے والا تنزہ و تقدس میں ہے اور فیض لینے والے علائق دُنیہ میں پھنسے ہوئے ہیں مثلاً اکل و شرب کا نشہ اور عوائق طبیعہ میں سرگرم اخلاقِ ذمیمہ میں مصروف، اور اس سے فیض کا پہنچانا ذُو جہتین کے واسطہ سے ہوسکتا ہے جو تجرد میں بھی یکتا ہو اور تعلقِ دنیا سے بھی وابستہ ہو۔ اور یہ صفات خلیفہ کی ہونی چاہئیں جو کسی بھی زمانہ میں ہو، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی ملائکہ سے نہیں بھیجے کیونکہ عام انسان ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، کیونکہ وہ اس کی جنس سے نہیں ہیں۔

اس کی مثال یُوں سمجھو کہ ہڈیاں گوشت سے غذا لینے میں عاجز ہیں کیونکہ انکو آپس میں تباعد ہے تو درمیان میں غضروف (حلق) کو پیدا فرمایا تاکہ گوشت سے طعام لے کر ہڈیوں تک پہنچائے۔ اسی طرح بادشاہ اور رعایا کے مابین وزیر ہوتا ہے کیونکہ رعایا وزیر سے زیادہ قرب میں ہیں۔ اس سے جلد مستفید ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح لکڑی اور آگ کے درمیان توا وسیلہ بنایا جاتا ہے وغیرہ۔

مسائل اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے مشورہ چار وجہوں سے لیا:

(۱) مشورہ لینے کی تعلیم ہوجاوے کہ اپنے تمام امور میں مشورہ لینا سنّتِ الٰہیہ ہے اور مشورہ معتمد علیہ اور خیر خواہی سے لیا جائے اگرچہ باری تعالیٰ اپنے علم وسیع اور حکمتِ بالغہ کے لحاظ سے مشورہ لینے سے پاک ہے۔ مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔

۱ مشورت ادراک و ہشیاری دہد
عقل ہا مر عقل را یاری دہد

۲ گفت پیغمبر بکن رائے زن
مشورت کالمستشار مؤتمن

ترجمہ: (۱) مشورہ تمہیں ادراک اور ہشیاری دے گا عقل عقل کی مدد کرتی ہے۔

(۲) پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا رائے لے اس لیے کہ مشورہ مفید ہوتا ہے اور جس سے مشورہ لیا جائے وہ زمین ہوتا ہے۔

(۲) سکانِ ملکوت کے سامنے آدم علیہ السلام کے عظیم شان کا اظہار مقصود ہے کہ وُہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے، اور خلیفہ کے لقب سے نوازے جا رہے ہیں۔

(۳) اس کے اپنے فضل راجح اور ان کے مفاسد سیئہ مرجوعہ کا اظہار کہ جبکہ انہوں نے کہا:

اَتَجْعَلُ فِیْهَا۔

تو اس کے جواب میں فرمایا:

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ الخ...

(۴) جس میں خیر کا غلبہ ہو وہاں حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ شرِ قلیل کے خطرے سے خیرِ کثیر کو نہ چھوڑا جائے، جیسا کہ مرض آکلہ کے ماؤف عضو کو کاٹنا ایک قلیل شر ہے اور تمام بدن کی سلامتی خیرِ کثیر ہے۔ کیونکہ اگر اس عضو کو نہ کاٹا جائے تو اس مرض کا اثر تمام بدن میں پھیل جائے گا جو کہ موجبِ ہلاکت اور شرِ کثیر ہے۔

قَالُوْٓا یہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا کہا گیا کہ ملائکہ نے کیا جواب دیا۔ انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْهَا یعنی تو زمین میں اسے پیدا کرتا ہے جو مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا فساد برپا کرے گا جیسا کہ جنّات نے فساد برپا کیا۔ ظرف کے تکرار سے استبعاد کی تاکید کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ج ظلماً خون ریزی کرے گا۔ جیسا کہ جنات نے کیا تھا۔ اور قتل کے بجائے یسفك الدماء اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ قتل کے انواع میں یہ سب سے زیادہ قبیح فعل ہے۔

ف: بعض عارفین فرماتے ہیں کہ آدم کے حق میں جھگڑنے والے ملائکہ نہ جبروتی تھے اور نہ ملکوتی سماوی۔ کیونکہ وہ تو اپنے نوری غلبہ اور مراقبہ عُلیا کے احاطہ سے انسان کی شرافتِ کاملہ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے بلند مراتب کو جانتے تھے (اگرچہ وہ بھی اس کی اصل حقیقت سے عاجز تھے) بلکہ جھگڑنے والے زمین کے ملائکہ اور وہ جن و شیاطین تھے جن پر ظلمت غالب تھی۔

ف: انی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ میں صرف لفظی تخصیص بذکر الارض ہے، ورنہ وہ تو درحقیقت تمام عالم کا خلیفہ تھا۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ طاعنین زمینی ملائکہ تھے کیونکہ یہ گمان وہاں صادر ہوتا ہے جو اس منصب کے معرض میں ہو۔ اور اہلِ سماوات تو اس سے بری ہیں اور بلند منزہ۔ اور ملائکہ ارضیہ نے جو کچھ کہا یہ اس کے مطابق تھا۔ جس پر اُن کی فطرت تھی کہ منصبِ خلافت فی الارض میں رشک اور اس ملک کے مرتبہ لینے کی غیرت اور اپنی اس عبادت کی وجہ سے تھا جو تسبیح و تقدیس کیا کرتے تھے۔ برتن سے وہی چیز اچھلتی ہے جو اس میں ہوتی ہے۔

ف: حکیم مطلق کے فعل پر اعتراض کرنا اور اس کی صنعت میں جھگڑنا محض اس کی کمال حکمت اور پختہ صنعت کی وجہ سے

اُس کے حضور میں معاف ہو جاتا ہے۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں، ؎

۱ زانکہ ایں دمہا اگرچہ نالائقست
رحمت من بر غضب سابقست

۲ از پئے اظہار ایں سبق اے ملک
در تو بنہم داعیہ اشکال وشک

۳ تا بہ گوئی در نگیرم بر تو من
منکر حلم نیارد دم زدن

۴ صد پدر صد مادر حلم ما
ہر نفس زاید در افتد در فنا

۵ حلمِ ایشاں کف غیر حلم ماست
کف رود آید و لے دریا بجاست

ترجمہ: (۱) اس وقت وہ اگرچہ نالائق ہے لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

(۲) اسی وجہ سے اے میرے بندے! تیرے اندر غلطیاں پیدا کرتا ہوں،

(۳) تاکہ تجھے معلوم ہو کہ میں مجرم کی گرفت کر سکتا ہوں لیکن منکر کو یقین ہو کہ میں کتنا بُردبار ہوں۔

(۴) میرے حوصلہ کے ہزاروں حوادث پیدا ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔

(۵) عوام کے حوصلے تو میرے حوصلہ کے بالمقابل ایسے ہیں جیسے جھاگ کو دریا سے نسبت ہوتی ہے۔

ف: فتوحات شریف میں ہے: آدم کے بارہ میں ہاروت و ماروت نے جھگڑا کیا۔ اسی بنا پر ان پر فساد و خونریزی ظاہر کر کے مبتلا فرمایا۔ یہی راز ہے حضور علیہ السلام کے اس قول میں کہ اپنے بھائی کو گالی مت دو، ورنہ اللہ تعالیٰ اسے تو معاف کر دے گا اور تمہیں کسی مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔ طعنہ بازوں میں وہ ملائکہ تھے جو مجاہدین کی نصرت و امداد کے لیے آئے تھے کہ انھیں پتا چلے کہ انسان کی خونریزی اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی غیرت کے لیے ہے۔ (کذا فی حل الرموز والکنوز)

وَنَحْنُ حالانکہ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ تیری تسبیح پڑھتے ہیں یعنی اس چیز سے تیری تنزیہ کرتے ہیں جو تیری شان کے لائق نہیں۔ یعنی وہ تسبیح جو تیری حمد سے ملتبس ہے اور حمد بھی اس لیے کہ تُو نے ہمیں قسما قسم کی نعمتوں سے

نوازا ۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ تُو نے ہمیں اپنی عبادت کی توفیق بخشی ۔ پس تسبیح صفات جلالیہ کے اظہار کے لیے اور حمد صفات انعام کی تذکیر کے لیے ہوتی ہے ۔ وَنُقَدِّسُ تیری بہت تقدیس کرتے ہیں لَكَ ۱۰ یعنی تیری وہ صفت کرتے ہیں جو تیری بلند شان اور عزت کے لائق ہے ۔ لام بیان کے لیے ہے جیسے سقینا لك میں ہے اور یہ مصدر محذوف کے متعلق ہے اور ہو سکتا ہے زاید ہو یعنی نُقَدِّسُكَ ۔

قاعدہ : تیسیر میں فرماتے ہیں کہ جو شئے شان کے لائق نہیں اس کی نفی کا نام تسبیح اور جو شئے شان کے لائق ہے اس کے اثبات کا نام تقدیس ہے ۔

ف : شیخ داؤد قیصری فرماتے ہیں کہ تسبیح تقدیس سے عام ہے کیونکہ تسبیح کہتے ہیں حدوث و امکان کے نقائص سے حق کو منزہ جاننے کو ۔ اور تقدیس کہتے ہیں حدوث و امکان کے نقائص سے بھی اور اکوان کے لوازمات سے بھی اسے منزہ ماننا ۔ کیونکہ وہ لوازمات کا اکوان کی جانب منسوب کرنے میں سے اطلاق سے خارج ہو کر تقیید کے واقع ہو جائیں گے ۔ ملائکہ نے کہا کہ خلیفہ اسے بنایا جا رہا ہے جس کی اولاد سے فساد صادر ہو گا ۔ حالانکہ خلیفہ سے اس کا صدور نہیں ہونا چاہیے ۔ اس سے ان کا مقصود اپنے احق ہونے کا اظہار اور یہ بھی پوچھنا مقصود تھا کہ بنی آدم کو کیوں ترجیح دی جا رہی ہے حالانکہ اُس سے تو فساد کی توقع ہے ، پھر گویا کہا گیا کہ ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا تو جواب دیا گیا ۔

قَالَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ یعنی آدم علیہ السلام کے خلیفہ بنانے کی مصلحت و حکمت جو میں جانتا ہوں تمہیں اس کا علم نہیں ۔ آدم علیہ السلام کی اولاد میں فرمانبردار بھی ہوں گے اور عاصی بھی ۔ پھر عدل و فضل کا مظاہرہ ہو گا ۔ تم میری حکمت و تقدیر کے پیچھے نہ پڑو اور نہ ہی میری پوشیدہ تدبیر کا انکشاف کراؤ ۔ ہر مخلوق کا کام نہیں کہ خالق کے غیبی راز پر مطلع ہو ۔ نہ ہی تمام رعیت بادشاہ کے راز سے واقف ہوتی ہے ۔

مسئلہ : آیت میں سالک کے لیے تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے خلفاء و مشائخ و علماء کے حضور میں باادب رہے تاکہ ان کے سامنے انانیت اور علم کا اظہار نہ ہو جائے کیونکہ وہ طریقِ فنا کا سالک ہے ۔ اور فانی کو طاؤس کی طرح نہ ہونا چاہیے کہ اپنے آپ پر ہی عاشق ہوتا ہے اور اپنی ذات پر ہی نازاں ہوتا ہے ۔ بلکہ اُسے چاہیے کہ اپنے وجود سے بھی بے خبر ہو ۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو اِنّی اعلم الخ زجر فرما کر نصیحت فرمائی ہے ۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں : ؎

نرود مرغ سوئے دانہ فراز چوں دگر مرغ بیند اندر بند

پند گیر از مصائب دیگراں تا نہ گیرند دیگر از تو پند

تفسیر صوفیانہ

واذ قال ربك للملئكة انی جاعلٌ فی الارض خلیفة ۔ تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ آیت میں خالقٌ کے بجائے جاعلٌ فرمانے کی دو وجہیں ہیں :

(۱) جاعلیت خالقیت سے اعم ہے اس لیے کہ جاعلیت میں خالقیت کے معنے کے علاوہ ایک اور معنی بھی ہے

وہ یہ کہ جسے پیدا کیا جائے۔ اس میں صفت خلافت بھی ہو کیونکہ یہ اختصاص ہر ایک میں نہیں ہوتا۔ جیسا کہ داؤد علیہ السلام کے لیے فرمایا:

یا داؤد انا جعلنٰك خلیفۃ فی الارض۔ یعنی اے داؤد! ہم نے تجھے خلافت کا مستعد بنا کر پیدا کیا پھر تمہیں خلافت عنایت فرمائی۔

(۲) جاعلیت کو عالم امور یعنی عالم ملکوت سے خصوصی تعلق ہے اور یہ عالم خلق کی ضد ہے کیونکہ عالم اجسام و عالم محسوسات کا نام ہے۔ کما قال تعالیٰ:

الا لہ الخلق والامر۔ یعنی ملک اور ملکوت اسی کے ہیں۔

قاعدہ ۱: جہاں پر عالم امر کا تعلق ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے جاعلیت کو استعمال فرمایا ہے کیونکہ عالم امر عالم خلق سے ممتاز ہے۔ کما قال:

الحمد للہ الذی خلق السمٰوٰت والارض وجعل الظلمٰت والنور۔

آسمان و زمین چونکہ عالم اجسام و محسوسات سے ہیں اس لیے انہیں خلقیۃ سے اور ظلمات و نور عالم ملکوت غیر محسوس سے ہیں اس لیے انہیں جاعلیت سے تعبیر فرمایا۔

سوال: ظلمات و نور ملکوتیات سے کیسے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ ظلمات اور نور ملکوتیات سے ہیں۔ ہاں وہ نور اور ظلمات جو محسوسات سے ہیں وہ آسمان و زمین کے حکم میں ہیں۔

قاعدہ ۲: جہاں پر صرف آدم علیہ السلام کی جسمانیت کا تعلق ہے وہاں لفظ خلق کو استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنّی خالقٌ بشراً من صلصال من حمإٍ مسنون۔

قاعدہ ۳: جہاں پر آدم علیہ السلام کی روحانیت کا ذکر ہے وہاں جعل کو لایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

جاعلٌ فی الارض۔ الخ

ف: اِنی جاعلٌ میں ایک اور اشارہ بھی ہے وہ یہ کہ ملائکہ پر آدم علیہ السلام کی عزت ظاہر ہو جائے تاکہ اسے بنظرِ تعظیم دیکھیں۔ اور جو اس سے یا اس کی اولاد سے اوصافِ بشریت ظاہر ہوتے ہیں دیکھ کر انکار نہ کریں۔ کیوں کہ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا۔

نکات (۱) آدم علیہ السلام کو خلیفہ سے موسوم فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں ایسی کرامت کا شرف سوائے آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کے کسی کو نہیں بخشا۔

(۲) اسے خلیفہ سے موسوم کرنے میں دو وجہیں ہیں: (۱) تمام مخلوق سے بعد میں تشریف لایا۔ (۲) اس کے بعد اور کوئی نہیں ہوا۔ اس میں عالم کی پیدا کردہ روحانیات ہوں یا جسمانیات سماویات ہوں یا ارضیات دنیویات ہوں یا اُخرویات یا جمادات ہوں۔ ملکوتیات کی ہر شئے موجود ہے۔ یہ درحقیقت ہر شئے کا خلیفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس پر خصوصی کرم ہے کہ اس میں اپنی روح بخشی۔ عالم کی کوئی شے اُس سے مکرم تر نہیں۔ بایں معنیٰ و لقد کرّمنا بنی اٰدم میں اشارہ ہے اسی اختصاص کی بنا پر عالم کا کوئی فرد صلاحیت نہیں رکھتا کہ سوائے آدم کے باری تعالیٰ کا خلیفہ بنے۔

(۳) آدم علیہ السلام باری تعالیٰ کے صورۃً و معناً خلیفہ اور نائب ہیں۔ صورۃً اس لیے کہ ظاہر انسان کا وجود درحقیقت حق کے وجود (موجود ہونا) کا خلیفہ ہے کیونکہ انسان کا وجود (موجود ہونا) اپنے موجد کے وجود (موجود ہونا) پر دلالت کرتا ہے، جیسے بنا کی دلالت بانی پر ہوتی ہے اور انسان کی وحدانیت حق کی وحدانیت اور اس کی ذات حق کی ذات اور اس کی صفات کا خلیفہ ہیں۔ اسی طرح اس کی حیات حق کی حیات اور اس کی قدرت حق کی قدرت اور اس کا ارادہ حق کا ارادہ اور اس کی سمع حق کی سمع اور اس کی بصر حق کی بصر اور اسکا کلام حق کا کلام اُس کا علم حق کا علم اور اس کی روح کی لامکانیت اور اس کی لاجہتیت حق کی لاجہتیت کی خلیفہ ہے۔

ف: مخلوقات کا کوئی نوع حق کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے آدم اس کا خلیفہ ہے۔ اگرچہ ان کے بعض میں یہ صفات موجود ہیں لیکن صفات کا حق کا اجتماع سوائے انسان کے کسی اور میں نہیں اور نہ ہی اس کی صفت کا تجلّی سوائے انسان کے قلب کے شیشہ کے کسی پر پڑتا ہے۔ اور حیوانات میں اگرچہ بعض صفات موجود ہیں لیکن اپنے موجد کے وجود (وجود ہونا) کا علم نہیں اور ملائکہ کو گو اپنے موجد کے وجود کا علم ہے لیکن ان کے علم کا مبلغ اس مقام کو نہیں پہنچا کہ وہ اپنے نفوس کو اپنے جمیع صفات کے ساتھ پہچانیں۔ وہ حق کو بجمیع صفاتہٖ نہیں جانتے۔ اسی لیے تو وہ کہہ بیٹھے:

سبحانك لاعلم لنا الا ما علمتنا۔ تو پاک ہے ہمیں صرف وہی علم ہے جو تُو نے ہمیں سکھایا۔

اور یہ انسان کا خاصہ ہے کہ اسے اپنے نفس کے لیے خلافت کے استحقاق کا بھی عرفان ہے اور اسمائے حق تعالیٰ کا بھی۔

اور آدم حق تعالیٰ کا معناً خلیفہ اور نائب اس لیے ہے کہ عالم میں سوائے انسان کے کوئی ایسا چراغ نہیں کہ نور اللہ کی روشنی سے روشن ہو کر بطور خلافت زمین پر اس کی صفات کے انوار کو ظاہر کرے کیونکہ انسان میں اللہ تعالیٰ کے نور سے فیض قبول کرنے کی استعداد ہے کیونکہ اس کے قلب کے فانوس میں راز حقانی کا چراغ رکھا گیا ہے اور وہ فانوس جسد کے طاق میں ہے اور قلب کے فانوس میں رُوح کا تیل (زیتون) ہے۔ قریب ہے کہ اس کا تیل صفاتِ عقل سے بھڑک اٹھے اگرچہ اسے نور کی آگ نہ چھوئے اور رازِ حقانی کے چراغ فتیلۂ خفا ہیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ زمین میں

کسی کو خلیفہ بنائے تو سرِّ انسانی کے چراغ کو اپنے جمال کے نور سے جلوہ دیتا ہے۔ پھر اپنے نور سے جس فتیلۂ خفاء کو چاہتا ہے راہ بتاتا ہے پھر وہ نورِ الٰہی کی آگ سے روشن ہوتا ہے۔ پس وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔ اسی وجہ سے وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ اس کے صفات کے انوار عالم میں ظاہر کرتا ہے۔ عدل و احسان اور رافت و رحمت کے ساتھ ان کے مستحقین کے لیے اور قہر و غضب و انتقام ان کے مستحقین پر۔ چنانچہ فرمایا:

یا داؤد انا جعلناك خلیفۃً فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوٰی فیضلك عن سبیل اللہ۔

اور اپنے حبیب علیہ السلام کے لیے فرمایا:

و بالمؤمنین رءوفٌ رحیم۔

اور پھر اپنے محبوب علیہ السلام اور مومنین کے حق میں فرمایا:

محمدٌ رسول اللہ والذین معہٗ اشدّاء علی الکفار رحماء بینھم۔

ایسے صفات کا ظہور نہ حیوانات پر ہوا اور نہ ملائکہ پر۔

اس تقریر کی دلیل کے لیے ہاروت و ماروت کا واقعہ ہی کافی ہے کہ جب انھوں نے اولادِ آدم علیہ السلام پر اتباعِ ہوٰی اور قتل و ظلم و فساد کے متعلق اعتراض کیا اور کہا کہ اگر ہم ان کے بجائے زمین پر خلیفے ہوتے تو جس طرح یہ کر رہے ہیں ہم ہرگز نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں لباسِ بشریت پہنا کر زمین پر بھیجا اور فرمایا کہ لوگوں کے مابین حق کا فیصلہ کرنا اور شرک نہ کرنا اور نہ ہی ناحق قتل کرنا اور نہ زناء کا ارتکاب کرنا اور نہ شراب پینا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اُن پر ایک ماہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ منہیات کے مرتکب ہو گئے۔ شراب بھی پی لی، خون بھی بہایا، زناء بھی کیا اور ناحق قتل بھی۔ اور بُت کو سجدہ بھی کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ خلافت انسان کا خاصہ ہے اور نورِ الٰہی کے فیضان کو قبول کرنا بھی اسی سے مخصوص ہے۔ اگر ملائکہ اس کے اہل ہوتے تو وہ ان اوصافِ مذمومہ بہیمیہ میں مبتلا نہ ہو جاتے۔ دیکھیے انبیاء علیہم السلام ایسے رذیل صفات و خسیس اخلاق سے منزّہ و معصوم ہیں۔ اگرچہ ان کے صفاتِ بشریہ کو یہ اوصاف لازم تھے لیکن تجلیٔ حق کے نور سے اُن کے دل کے چراغ روشن ہو چکے اور اُن کے قلوب کے نور سے ان کے اجسام کے فانوس نوریاب ہوئے ظاہراً بھی اور باطناً بھی۔ اور ان کی زمین (اجسام و ارواح) اپنے رب کے نُور سے جگمگا رہی ہے۔ بناءً بریں ان صفاتِ رذیلہ کے ظلمات کو ظہور کی مجال بھی نہیں کیونکہ ان پر انوارِ حق کا غلبہ ہے۔

پس ملائکہ نے جب آدم علیہ السلام کے جسمِ اطہر کو ابتداءً دیکھا تو بنظرِ ملکوتی الملکی ان کو ملکوت جسد پر ظلمات بشریہ و حیوانیہ و سبعیہ سامنے آ گئیں اور یہ صفات ان سے غائب بھی نہیں تھیں بنا بریں کہہ بیٹھے قالوا اتجعل فیھا

من یفسد فیها و یسفك الدماء ۔ ملائکہ کے اس قول میں چند نکتے ہیں ؛

(۱) یہ قول دراصل اللہ تعالیٰ نے ہی ملائکہ سے کہلوایا تاکہ ہمارے لیے متحقق ہوجائے کہ یہ مذموم صفات ہماری طینت میں مُودع ہیں اور ہماری جبلت کی ترکیب انہی سے ہے ہمیں اپنے نفسِ امّارہ کے مکر سے بے خوف نہ رہنا چاہیئے اور نہ ہی اسے بے قصور سمجھیں جیسا کہ یُوسف علیہ السلام نے فرمایا ؛

وما ابرّیٔ نفسی ان النفس لامّارۃ بالسّوء الّا ما رحم ربّی ۔

(۲) تاکہ ہمیں پتا چل جائے کہ ہر وہ عمل صالح جو ہم بجا لاتے ہیں یہ صرف اس کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں نیک عمل کرنے کی توفیق بخشی اور وُہ فساد و ظلم جو ہم سے سرزد ہوا سے اپنی طبعی شامت اور خاصۂ فطرت سمجھیں ۔ کما قال تعالیٰ :

فما اصابك من حسنةٍ فمن الله و ما اصابك من سیّئة فمن نفسك ۔

اور ہر وُہ فساد و ظلم جس سے ہم بچ جاتے ہیں یا ہم اُس کے مرتکب نہیں یہ اُس کی حفاظت و کرم کا نتیجہ ہے ۔ کما قال :

اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ۔

(۳) تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ اس کریم نے اپنے فضل و کرم سے اپنی عبودیت و خلافت کے لیے چُن لیا (ورنہ ہم اس کے اہل کب تھے) اور پھر اپنے حسنِ کرم سے ہمارے لیے ملائکہ کو فرمایا :

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ (ورنہ ہم اس کے لائق کب تھے) تاکہ ہم اس کی رحمت سے ناامید نہ ہو جائیں ۔ اور نہ اُس کی خدمت (عبادت) سے دُور نہ جا پڑیں ۔

(۴) تاکہ معلوم ہو کہ استعداد کا فاسد ہونا ایک عظیم امر ہے اور خلافت کی بنا بھی استعداد و قابلیت پر ہے ۔ اور ملائکہ کو بھی یہ استعداد و قابلیت نصیب نہ ہُوئی ۔ پھر ہمیں اس سعادتِ عظمیٰ سے غفلت نہ کرنی چاہیے بلکہ اس کے حصول کے لیے سر توڑ کوشش کرنی چاہیے ۔

(۵) ملائکہ نے اَتَجْعَلُ فِیْهَا الخ اس لیے کہا کہ انہوں نے جسدِ آدم کو قبل از نفخ رُوح دیکھا اور بنظر ملکی اُس کے جسد کے ملکوت میں جو کہ عناصر اربعہ متضادہ سے پیدا ہے صفاتِ البشریہ، بہیمیہ اور سبعیہ (جو کہ اضداد عناصر کی ترکیب میں متولد ہوتی ہیں) کو ملاحظہ فرمایا ۔ جیسے کہ وہ حیوانات اور درندگان (پھاڑ کھانے والوں) کے اجساد کو ملاحظہ کرتے تھے بلکہ ان سب کا آدم علیہ السلام کی پیدائش سے قبل معائنہ کر چکے تو آدم علیہ السلام کا اُن پر قیاس کر لیا جبکہ آدم علیہ السلام ان احوال کا مشاہدہ محققانہ طور پر کر چکے اور یہ احوال ان سے غیب میں نہیں تھے بلکہ یہ احوال ہم سے غیب ہیں کیونکہ ہم تو بذریعہ حواس معلوم کرتے ہیں اور حس والوں کے لیے ملکوت غیب ہوتا ہے ۔ اور بعض ہم میں وُہ بھی ہیں جو بنظر ملکوتی دیکھا کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ملائکہ اور رُوحانی ملکوتیات کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔ کما قال تعالیٰ :

وکذٰلك نری ابراهیم ملکوت السمٰوٰت والارض ۔

اور فرمایا :

او لم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض ۔

اس لحاظ سے اشیاء غیب نہیں ہوں گی، کیونکہ غیب وہ ہے جو ہم سے پوشیدہ ہو۔ اور جس کا مشاہدہ کرلیں تو وہ غائب نہیں ہوگی بلکہ شہادت (حاضر) ہوگی۔ پس ملکوت ملائکہ کے لیے شہادت ہوگی اور " الحضرة الالٰهية " اُن کے لیے غیب ہے کیونکہ حضرت الٰہیہ تک ملائکہ کی رسائی نہیں، اور انسان کو عالمِ شہادتِ محسوسہ سے صورت حاصل ہوئی اور عالمِ غیب ملکوتی غیر محسوس سے روح ملی اور ایک رازِ حقانیہ نصیب ہوا۔ جس کی بدولت اسے نورِ الٰہیہ کے فیضان کے قبول کرنے کی استعداد ہے۔ پھر تربیتِ شیخ سے عالمِ شہادت سے ترقی کرکے عالمِ غیب (جس کا نام عالمِ ملکوت ہے) تک پہنچتا ہے۔ پھر رازِ حقانی کی متابعت اور خصوصیتِ حقّہ سے عالمِ ملکوت سے ترقی کرکے عالمِ جبروت و عظموت جس کا نام غیب الغیب ہے تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر نورِ ربّانی (جو اُسے رازِ حقّانی کی متابعت کے ذریعہ نصیب ہوا) سے انوارِ جمال و جلال کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس موقعہ پر خلافتِ حق میں غیب و شہادت کا جاننے والا ہو جاتا ہے۔ کما قال :

عَالِمُ الغیب فلا یظہر علیٰ غیبہٖ ۔

یعنی مخصوص غیب۔ اپنی غیب الغیب پر اَحدًا (کسی ایک) یعنی ملائکہ کو مسلّط نہیں کرتا اِلّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ مگر جس کسی ایک رسول یعنی انسانِ کامل سے راضی ہو۔ پس یہی رازِ مخفی ہے جو اس انسان میں مرکوز (جو اللہ تعالےٰ کے علم میں تھا اور ملائکہ سے یہ راز پوشیدہ تھا۔ کما قال تعالیٰ :

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

(۶) جب ملائکہ نے اپنی عبادات اور استعدادِ عصمت اور آدم علیہ السلام کی صفاتِ نفسانیہ کو دیکھا تو اپنے آپ کو اعلیٰ شان اور آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کو حقیر سمجھ کر کہا :

اَتَجْعَلُ فِیْهَا ۔

یعنی اُن کو زمین کا خلیفہ بنا کر بھیج رہا ہے باوجودیکہ اس سے زمین میں فساد پھیلانے اور خونریزی کا امکان ہے، حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس میں مصروف ہیں۔ بنا بریں اِن اوصاف کی وجہ سے خلافت کے حقدار تو ہم ہیں۔ ان کا اعتراض بنی اسرائیل کی طرح ہے جبکہ ان پر اللہ تعالیٰ نے طالُوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا تو کہنے لگے : یہ ہم پر بادشاہ کیسے بن گیا، بادشاہی کے حقدار تو ہم ہیں کیونکہ اُس کے پاس تو اتنا وسیع مال نہیں ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ بادشاہی کا استحقاق مال پر موقوف نہیں بلکہ یہ تو میرا اپنا انتخاب ہے بلحاظ بسطةً فی العلم والجسم کے۔ اسی لیے فرمایا :

انّ اللہ اصطفاہ علیکم وزادہ بسطةً فی العلم والجسم واللہ یؤتی مُلکہ من یشاء ۔

اسی طرح یہاں بھی اجمالاً ملائکہ کو یونہی فرمایا کہ :

انی اعلم مالا تعلمون ۔ بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

پھر تفصیل فرمائی کہ :

انّ اللّٰہ اصطفیٰ اٰدم ۔ بے شک آدم کو اللہ تعالیٰ نے چُن لیا۔

اور فرمایا :

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا ۔ آدم علیہ السلام کو کل اسماء سکھائے۔

اور فرمایا :

مَا مَنَعَکَ ان تسجد لما خلقت بیدی ۔ اس شے نے تجھے روکا کہ تو اسے سجدہ کرتا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا۔ تاکہ ملائکہ کو پتا چل جائے کہ ملک خلافت کی استعداد و استحقاق کثرتِ طاعات کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ مالک الملک اپنا ملک جسے چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے ۔ اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے ۔ اور چونکہ ملائکہ نے اپنی طاعات کی وجہ سے آدم علیہ السلام پر فخر کیا ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو علمِ اسماء سے نوازا تاکہ فرشتگان کو معلوم ہو جائے کہ اگر ہم اہلِ طاعت و خدمت ہیں تو وہ آدم علیہ السلام اہلِ عقل و منّت ہے ۔ اہلِ طاعت و خدمت اور اہلِ عقل و منّت میں بہت بڑا فرق ہے ۔ پس فخر کرنے پر انہیں حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں تاکہ انھیں پتا چلے کہ اللہ تعالیٰ ان کی عبادت سے مستغنی ہے ، اور آدم علیہ السّلام پر احسان کی بنا پر ملائکہ کا مسجود بنایا تاکہ انھیں خبر ہو جائے کہ فضل اسی کے ہاتھ میں ہے جسے چاہے دے ۔

ف : اِنّی اعلم مالا تعلمون میں ایک اور اشارہ بھی ہے ، وُہ یہ کہ جس طرح آدم علیہ السّلام کے ایسے فضائل ہیں جن کی ملائکہ کو خبر نہیں ۔ اسی طرح ان کے رذائل اور اوصاف ہیں کہ جن کا ان کو علم نہیں ۔ کیونکہ ان کو پتا نہیں کہ آدم علیہ السلام کے ان اوصافِ مذمومہ کا جو اُن کے جسم کا نتیجہ ہیں جو دیگر حیوانات میں مشترک ہیں ، جو اس کے ملکوت میں مُودع ہیں ۔ اور یہ ان اوصافِ مذمومہ کے غیر ہیں جو نفس امّارہ کے نتائج سے ہیں جو کہ شرع کو استعمال نہ کرتے ہُوئے رُوح کی نظر نفس کے تابع ہوتی ہے جیسے عُجب ، ریاء ، سمعۃ ، حسد ، حیوٰۃِ دنیا کو آخرت سے پسند کرنا ، بدعۃ ، دل کا کھوٹ اور بُرا اعتقاد اور دیگر وُہ معاملات جس میں دیگر حیوانات اس کے شریک ہیں ۔

تفسیر عالمانہ

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا ۔ حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو مٹی کو وحی الہام ہوا کہ تجھ سے اللہ تعالیٰ کے خلیفہ پیدا ہونے والے ہیں ۔ اُن میں بعض تو فرمانبردار ہوں گے جو بہشت میں داخل ہوں گے اور بعض نافرمان ، جو دوزخ کا ایندھن ہوں گے ۔ زمین نے عرض کی : کیا مجھ سے بھی نافرمان پیدا ہوں گے اور وُہ دوزخ کے

بھی مستحق ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے حکم ہوا، ہاں ایسے ہی ہوگا۔ یہ حکم سُن کر زمین روئی جس سے چشمے بہ نکلے جو قیامت تک جاری رہیں گے۔

آدم علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ

اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ جا کر زمین کے چار گوشوں سے سیاہ، سُرخ، سفید، اطیب، اخبث، نرم، سخت پہاڑی ہر قسم کی مٹی لے آؤ۔
جبریل علیہ السلام زمین سے مٹی اٹھانے لگے تو زمین نے کہا؛ تجھے اس ذات کی قسم ہے جس نے تجھے میرے ہاں بھیجا، مجھ سے ذرہ برابر بھی مٹی نہ اٹھانا کیونکہ بادشاہ کے قرب میں اگرچہ بے شمار منافع ہیں لیکن اُس سے خطرات بھی بہت ہیں۔ جیسے کہ کہا گیا ہے؛

بدریا در منافع بے شمار است
اگر خواہی سلامت بر کنار است

ترجمہ: اگر دریا میں بے شمار منافع ہیں، اگر سلامتی چاہتے ہو تو کنارے پر رہو۔
جبریل علیہ السلام خالی لوٹے اور بارگاہِ لایزال میں عرض کی کہ مجھے زمین نے تیری ذات کی قسم دی ہے اس لیے مٹی اٹھاتے مجھے شرم محسوس ہوئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میکائیل علیہ السلام کو بھیجا اُس کے ساتھ بھی زمین نے وہی کیا جو جبریل علیہ السلام سے کیا تھا۔ وہ بھی خالی واپس آ گئے اور جبریل علیہ السلام کی طرح معذرت کی۔ پھر اسرافیل علیہ السلام کو روانہ کیا گیا۔ اُس سے بھی زمین نے وہی التجا کی، وہ بھی خالی واپس آئے۔ اور جبرائیل اور میکائیل کی طرح معذرت ظاہر کی۔ پھر اللہ تعالےٰ نے ملک الموت علیہ السلام کو حکم فرمایا۔ وہ جب مٹی اٹھانے لگے تو زمین نے کہا: میں تجھے اس ذات کا واسطہ دیتی ہوں جس نے تجھے مجھ سے مٹی اٹھانے کے لیے بھیجا، مجھ سے مٹی نہ لے جا کر اس سے ایسی مخلوق پیدا ہوگی جو اپنے مالک کی نافرمان ہو کر دوزخ کا ایندھن بنے گی۔ عزرائیلؑ نے کہا میں بھی تجھے اس ذات کا واسطہ دیتا ہوں کہ میں تجھ سے مٹی ضرور اٹھاؤں گا تاکہ مجھے نافرمانوں میں شمار نہ کیا جائے۔ عزرائیلؑ نے یہ کہہ کر زمین کے چار گوشوں سے چالیس گز برابر مٹی اٹھالی۔ زمین کے مختلف رنگوں کی وجہ سے بنی آدم کے بھی مختلف رنگ ہیں کہ ان میں بعض سفید ہیں بعض سیاہ، بعض سرخ، بعض نرم، بعض سخت۔

ف: اُس مٹی کا ہر ذرّہ ہر انسان کا اصل بدن ہو گیا۔ جس جگہ سے جس انسان کی مٹی کا ذرہ لیا گیا وہاں ہی وہ مدفون ہوگا۔ مٹی لے کر حضرت عزرائیلؑ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عزرائیل! کیا تمہیں زمین کی فریاد سے رحم نہ آیا۔ عرض کی، الٰہی! تیرے فرمان کے آگے اس کی زاری کا کیا حق تھا؛ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب آدم کی اولاد کی ارواح قبض کرنے پر تجھے مامور کرتا ہوں۔

میت کو خوشبو لگانے میں حکمت

روضۃ العلماءؒ میں ہے کہ زمین نے شکایت کی؛ یا اللہ! مٹی اٹھانے سے تو مجھ میں کمی آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛ گھبراؤ مت، تجھ میں جب واپس آئے گا تو پہلے سے زیادہ حسین و خوشبودار ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مُردے کو عطر و مشک سے معطر کیا جاتا ہے۔

پھر عزرائیل کو حکم ہُوا کہ اس کے نصف کو دوزخ اور نصف کو جنت میں ڈبو کر وادی نعمان جو مکہ و طائف کے درمیان ہے جاکر رکھ دو ۔ اللہ تعالیٰ نے حسبِ منشاء اس مٹی کو وہاں رکھا ۔ بعدازاں اسے وہاں سے نکال کر اس پر ابرِ کرم کی بارش برسائی جس سے اس مٹی کا لیسدار گارا بن گیا ۔ اس سے آدم علیہ السلام کا جسم تیار کیا گیا ۔

ف : آدم علیہ السلام کی پیدائش میں علماء کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ آسمانِ دنیا میں پیدا ہوئے ۔ بعض کہتے ہیں زمین کے باغات میں سے ایک باغ میں جو ایک عزت والا مکان ہے جس سے دریائے نیل جاری ہوتا ہے ۔ اسی طرح دیگر نہریں ۔ لیکن اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ جنّتِ عدن میں پیدا کئے گئے، پھر وہاں سے نکالے گئے ۔ (کذا فی کشف الکنوز)

حدیث قدسی میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے آدم علیہ السلام کو مٹی کو اپنے ہاتھ سے خمیر کیا اور پھر اسے چالیس سال تک چھوڑے رکھا ۔ (یاد رہے) کہ اس عرصہ کا ایک دن دنیوی سالوں کے ایک ہزار سال کا تھا ۔ یہاں تک کہ وُہ خشک ہو کر صلصال ہو گیا صَلصَال اس مٹی کو کہتے ہیں جو نہایت خشک ہو کر ٹھیکری کی طرح بجے ۔ پھر اس پر انتالیس سال غم کا مینہ برسایا، بعدازاں صرف ایک سال راحت و سرور کی بارش ہوئی ۔ یہی وجہ ہے کہ بنی آدم کو غم و الم کو گھیرے ہُوئے ہوتے ہیں ۔ لیکن ان کا انجام سرور پر ہوتا ہے ۔ جیسا کہ مقولہ مشہور ہے :

آغاز کا انجام ہوتا ہے اور ہر دُکھ کے بعد آرام ہوتا ہے ؎

اِنَّ مع العُسرِ یُسر کش قفاست

شاد برانم کہ سلامِ خداست

ف : ملائکہ ان کے پاس سے گزرتے، اُن کی اچھی صورت اور بلند قامت دیکھ کر تعجب کرتے کیونکہ ان کا قد پانچسو گز کا تھا (واللہ اعلم) گز کتنا لمبا تھا کہ آدم کا سر آسمان کو مَس کرتا تھا اور اس سے قبل اُس جیسی شکل انھوں نے دیکھی نہیں تھی ۔

ایک روز ابلیس کا بھی گزر ہُوا، دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ کس وجہ سے پیدا ہوا ہے اپنا ہاتھ ان کے جسم پر مارا تو کھوکھلا معلوم ہُوا، اس کے اندر گھُس گیا اور پیچھے سے نکل آیا اور اپنی جماعت (وہ ملائکہ جو اس وقت اس کے ساتھ تھے) سے کہنے لگا، یہ (آدم) کھوکھلا پیدا کیا گیا ہے فلہٰذا یہ کسی بات پر ثابت قدم نہ رہ سکے گا ۔ اب مجھے بتاؤ اگر اسے تم سے افضل بنایا گیا تو تم کیا کرو گے ؟ انھوں نے کہا: ہم اپنے مالک کا فرمان مانیں گے ۔ ابلیس ملعون نے اپنے دل میں کہا اگر اسے مجھ سے افضل بنایا گیا تو میں اس کے تابع نہیں رہوں گا ۔ اگر اسے میری فرمانبرداری میں دیا گیا تو ذلیل کروں گا ۔

؎ عاقبت گرگ زادہ گرگ شود ۔۔۔ گرچہ با آدمی بزرگ شود

پھر اپنی تھوک جمع کر کے مقامِ ناف (آدم علیہ السلام) پر ڈال دی ۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ

اس تھوک کو ناف سے کریدلیں۔

انسان کی ناف سے کُتّے کی پیدائش ناف کی گہرائی جبرائیل علیہ السلام کے مقامِ ناف (آدم) سے مٹی کریدنے کی وجہ سے ہے۔ پھر اس کریدی ہوئی مٹی سے کُتّے کو پیدا کیا گیا۔ اسی لیے کُتّے میں تین عادتیں پائی جاتی ہیں:

(۱) آدمی سے مانوس اس لیے ہے کہ آدم علیہ السلام کی مٹی سے اس کی پیدائش ہوئی۔ (۲) رات بھر اس لیے بیدار رہتا ہے کہ مٹی کو جبرائیل نے چھوا۔ (۳) اس کا انسان وغیرہ کو کاٹنا اور دیگر شرارتیں کرنا شیطان کی تھوک کا اثر ہے۔

ف: حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کی عصر کے بعد پیدا کیا گیا۔

آدم کی وجہ تسمیہ اور روح کا داخلہ آدم علیہ السلام کو اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ ان کی ترکیب ادیم الارض یعنی زمین کے مختلف رنگوں سے ہے۔

جب آدم علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے نفخِ رُوح کا ارادہ فرمایا تو روح کو حکم فرمایا کہ آدم علیہ السلام کے اندر داخل ہوجا۔ روح نے عرض کی: الٰہی! یہ جگہ نہایت گہری اور بہت تاریک مکان ہے۔ دوسری بار حکم ہُوا تو اس نے پھر وہی معذرت کی۔ تیسری بار حکم ہوا تب بھی وہی کہا۔ اس کے بعد رُوح آدم علیہ السلام کے اندر خود بخود داخل ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

بلا رضا (مجبوراً) داخل ہورہی ہے تو پھر نکلنے میں سخت دشواری ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ جب رُوح نکلتی ہے تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ جب نفخ روح کیا گیا تو پہلے پہل سر اور پیشانی اور دونوں کانوں اور زبان میں پہنچی پھر تمام جسم میں پھیلنے لگی یہاں تک کہ قدموں تک پہنچی تو آگے کوئی راہ نہ تھی واپس ناک کے سوراخوں سے نکلی تو آدم علیہ السلام کو چھینک آگئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا، کہو:

الحمد للہ ربّ العٰلمین۔

آدم علیہ السلام نے الحمد کہی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یرحمك اللہ (اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے)

جب رُوح گھٹنوں کے اندر داخل ہوئی تو آدم علیہ السلام نے چلنے کو چاہا۔ لیکن چل نہ سکے۔ جب روح قدموں میں پہنچی تو چلنے لگے۔ (آدمؑ کی عجلت کو دیکھ کر) باری تعالیٰ نے فرمایا:

خُلِقَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلاً۔ (انسان جلد باز پیدا کیا گیا)

اسی سے پورا البشر ہوا، جس میں گوشت، خُون، ہڈیاں، عصب، آنتیں وغیرہ جمع کیے گئے۔ پھر ان کو ناخنوں کی طرح کا ایک لباس پہنایا، جس سے آدم علیہ السلام کے حسن میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اسی سے ملبوس تھے اور اسی سے ان کا تاج تھا۔

آدمؑ کے جسم میں نو دروازے اُن میں سات دروازے تو ان کے سر میں رکھے گئے (۱-۲) دو کان جن سے کلام سنیں۔ (۳-۴) دو آنکھیں جن سے اشیاء کو دیکھیں۔ (۵-۶) ناک کے دو سوراخ جن سے ہر بُودار شئے کو سونگھیں۔ منہ میں زبان ہے جس سے بولیں (۷) حلق کا باب ہے کہ جس سے ہر شئے کا ذائقہ محسوس ہو (۸-۹) دروازے دیگر جسد میں ہیں یعنی قبل دُبر کہ جس سے طعام کا فضلہ خارج ہو۔ عقل کو دماغ میں اور حرص کو رانوں میں اور غضب کو جگر میں اور شجاعت کو قلب میں اور رغبت کو حلق میں اور ضحک کو طحال میں، خوشی وغم کو منہ میں رکھا گیا۔ پاک ہے وہ ذات جس نے ہڈی کو سننے کی اور چربی کو دیکھنے کی اور گوشت کو بولنے کی اور خون میں پہچاننے کی طاقت بخشی۔

آدم علیہ السلام کا علم جب آدم علیہ السلام کے جسم مبارک کی تکمیل ہو گئی تو انھیں تمام اشیاء کے اسماء کا علم دیا۔ یعنی اسمٰ کا علم اُن کے دل پر الہام کیا۔ پھر بات بھی زبان پر ظاہر ہوئی۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو جمیع لغات کے تمام مسمیات کے اسما سکھا دیے۔ بایں معنیٰ کہ جس جنس کو جس طرح پیدا فرمایا اس کو سامنے لا کر فرمایا کہ اس کا نام گھوڑا ہے، اس کا نام اونٹ وغیرہ۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا کہ ان کو فلاں منافع دینیہ و دنیویہ کے لیے پیدا فرمایا گیا ہے۔ اور تمام ملائکہ کے اسمٰ بتائے اور تمام اولادِ آدم) کے اسمٰ اور اسی طرح جمیع حیوانات و جمادات کے اسمٰ بتائے اور ہر کاریگری، تمام شہروں اور بستیوں کے نام اور تمام پرندوں اور درختوں کے نام، اور ان سے جو ضروریات پوری ہوں گی وغیرہ، اور ہر ذی روح شے جو بھی قیامت تک پیدا ہو گی، ہر ماکول اور ہر مشروب کے اسماء اور بہشت کی ہر نعمت کا نام، یہاں تک کہ پیالہ اور پیالی اور تھال اور ٹب کے اسمٰ بتائے۔

مسئلہ: کشف الکنوز میں فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کے جمِ غفیر نے اجماع کیا ہے کہ تمام اسماء توقیفیہ ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام میں علم ضروری پیدا فرمایا کہ جس سے انھیں الفاظ و معانی کی معرفت ہو جاتی اور انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ الفاظ فلاں فلاں معانی کے لیے موزوں ہیں۔

حدیث شریف ۱ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو اس میں حروف کے اسرار کو پھیلا دیا جبکہ فرشتگان اس بات سے محروم رہے۔ پھر حروف آدم علیہ السلام کی زبان سے فنون لغات خارج ہوتے۔ پھر اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کے لیے ان حروف کی صورتیں بنا دیتا جو مختلف اشکال میں متشکل ہو کر ان کے سامنے آجاتے۔

حدیث شریف ۲ آدم علیہ السلام کو سات لاکھ لغت سکھائی گئی۔ جب شجرِ ممنوعہ دکھایا تو لغت عربیہ کے سوا باقی تمام لغتیں سلب ہو گئیں۔ پھر جب انہیں نبوت عطا ہوئی تو تمام لغات لوٹا دی گئیں۔ یہ ان کا معجزہ تھا کہ قیامت تک ان کی اولاد جتنی لغات بولے گی سب کو آدم علیہ السلام جانتے اور بولتے بھی تھے۔ مثلاً عربی، فارسی،

رومی، سریانی، یونانی، عبرانی، زنجی وغیرہ۔

ف: بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کاروبار کی ہزار صنعتیں سکھائیں اور فرمایا کہ اپنی اولاد سے کہہ دو کہ ان صنعتوں سے دنیوی فوائد جس قدر چاہیں حاصل کریں لیکن دین اور احکام شرع کو اپنا ذریعہ معاش نہ بنائیں۔

ف: آدم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے[1] نوح علیہ السلام بڑھئی تھے۔ ادریس علیہ السلام درزی، صالح علیہ السلام تاجر، داؤد علیہ السلام زرہ باف تھے۔ سلیمان علیہ السلام اپنی سلطنت میں زنبیل بُنتے اور بیچ کر گزارہ کرتے۔ بیت المال سے ہرگز نہ کھاتے۔ موسیٰ، شعیب اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم راعی تھے۔ اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں اکثر خیاطت کا کام کرتے۔

مسئلہ: حدیث شریف میں ہے کہ مردوں میں ابرار کا کام خیاطت ہے اور عورتوں کا کام چرخہ کاتنا۔ (کذا فی روضۃ الاخیار)

ف: علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قول علّم آدم الاسماء۔ الاسماء استغراق کا تقاضا کرتا ہے۔ اور کُلَّهَا شمول کو واجب کرتا ہے۔ اب جس طرح انہیں مخلوق کے اسماء بتائے اسمائے حق بھی ضرور بتائے ہوں گے۔ اب وہ مخلوق کے اسماء جاننے سے مخصوص ہو کر مسجود ملائکہ ٹھہرے۔ نہ معلوم اسمائے حق جاننے سے انہیں کیا رتبہ ملا ہوگا۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ یعنی مسمیات کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا۔

سوال: عرضهم میں ضمیر مذکر کیوں لائی گئی؟

جواب: مسمیات میں عُقلاء بھی شامل ہیں ان کی وجہ سے تغلیباً ضمیر مذکر لائی گئی۔ العرض بمعنے اظہار الشیٔ للغیر، تاکہ شے کا حال معلوم ہو۔

حدیث شریف میں ہے: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سب چیزوں کے نمونے آدم علیہ السلام کے سامنے چھوٹی چھوٹی کیڑیوں کی طرح پیش کیے گئے۔"

ف: ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کے افراد بطور نمونہ پیش فرمائے ہوں تاکہ اس سے باقیوں کے احوال و احکام معلوم ہوں۔

نکتہ آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم پھر ملائکہ کے سامنے پیش کرنے میں آدم علیہ السلام کی بلند قدری اور اُن کا جتاؤ مقصود تھا اور اپنے اسرار اور علوم مکنونہ (جو اُس کے مخصوص غیب سے ہیں) جس کی زبان پر جاری ہے

---

[1] تفسیر "فتح العزیز" میں ہے کہ اَوَّلُ مَنْ حَاكَ اٰدَمُ عَلَيْهِ السَّلَام۔ (سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے کپڑا بُنا) اور شیث علیہ السلام بھی کپڑا بُنتے تھے۔ (مترجم)

ظاہر کرے وہ باری تعالیٰ آدم صفی علیہ السلام کو اسمأ سکھائے اور مکرم بنایا تاکہ اپنے علم و معرفت میں کسی فرشتہ وغیرہ کا محتاج نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ رحمت ہے جو ہر شے کو واسع ہے۔

فَقَالَ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو تعجیزاً و تبکیتاً فرمایا۔

مسئلہ : تعجیز کا خطاب جائز ہے۔

قاعدہ : خطاب تعجیز وہ ہے جو کسی شے کے لانے کا حکم کیا جائے۔ لیکن اس شے کا لانا مطلوب نہ ہو تاکہ مخاطب کا عجز ظاہر ہو جائے۔ اگرچہ وہ شے فی نفسہ محال ہو، جیسے قیامت میں مصورین کو اس صورت کے احیاء کا حکم ہوگا کہ بناؤ وہ صورتیں جسے وہ دنیا میں بناتے تھے تاکہ ان کا عجز ظاہر ہو جائے اور انہیں ندامت ہو۔ اگرچہ اس وقت ندامت کام نہیں آئے گی۔

اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ مجھے خبر دو بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ ان موجودات کی اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝ اگر تم اپنے گمان میں سچے ہو کہ خلافت کے حقدار ہم ہیں۔ جیسے آدم علیہ السلام تمام حالات بتا رہے ہیں تم بھی بتاؤ۔

مسئلہ : علمِ توحید کے بعد علمِ لغت کا سیکھنا اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو آدم علیہ السلام کی فضیلت اسی کی وجہ سے ظاہر فرمائی۔

مسئلہ : مدعی سے دعویٰ پر حجت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جیسے ملائکہ نے اپنی فضیلت کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے دلیل کا ارشاد فرمایا۔ انہوں نے غیب کی بحث چھیڑی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مشاہدہ کی بات سے عاجز کیا یعنی جس شے کو دیکھ کر بھی تم معلوم نہیں کر سکتے، پھر جن کو تم نے دیکھا بھی نہیں ان کے لیے فساد کا دعویٰ کیسے کر رہے ہو!

تنبیہ : اے لفظی مدعیو! حقیقت کی تلاش کرو، اور اے معرفت کے دعویدارو! محبت کا ہونا تمہارے لیے ضروری ہے اور محبت کا دم بھرنے والو! تمہارے لیے طاعت لازمی ہے۔

نکتہ : حضرت ابوبکر واسطی فرماتے ہیں محال ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچان لے اس سے محبت نہ کرے۔ اور پھر محال ہے کہ اس سے محبت تو ہو لیکن اسے یاد نہ کرے۔ اور یہ بھی محال ہے کہ اسے یاد کرے لیکن اسے یاد کرنے میں اس کے ذکر کی حلاوت نہ پائے۔ اور محالات سے ہے کہ اس کے ذکر کی حلاوت پا کر غیر سے مشغول ہو۔

قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا جملہ مستانفہ ہے۔ سوال کا جواب ہے۔ گویا سوال کیا گیا کہ جب انہیں حکم ہوا تو کیا وہ اس حکم سے عہدہ برآ ہوئے یا نہ؟ جواب میں فرمایا : سبحٰنك۔ ہم تیری ذات کی تنزیہ بیان کرتے ہیں ان امور سے جو تیری شانِ اقدس کے لائق نہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ تیرے افعال مصلحتوں اور حکمتوں سے خالی نہیں ہوتے۔

قاعدہ : دراصل یہ کلمہ توبہ سے پہلے لایا جاتا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا :
سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ۔ تو پاک ہے میں نے تیرے ہاں توبہ کی۔

اور یونس علیہ السلام نے کہا :

سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۔ پاک ہے تُو بیشک میں ظالموں میں سے ہوں ۔

قاعدہ : سُبحان مصدر کا قائم مقام ہو کر آتا ہے اور اضافت کے بغیر نہیں ہوتا ۔ جب اضافت کے بغیر ہو تو اس وقت تسبیح کا علم ہو کر غیر منصرف پڑھا جائے گا بسبب علمیت اور الف و نون زائدتان کے لاعلم لنا الّا ما علمتنا ۔ ملائکہ کو جس کا حکم کیا گیا اس کے لانے سے عجز کا اعتراف کر رہے ہیں کہ ہمیں صرف اتنا علم ہے جتنا تُو نے ہمیں عطا فرمایا ۔

مسئلہ : اس سے معلوم ہُوا کہ اُن کا سوال استفساراً تھا اعتراض کے طور پر نہ تھا ۔ کیونکہ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ ہمیں علم نہیں ۔ مگر وہ جو ہمارے لیے مناسب تھا ۔ ہماری قابلیت کے مطابق ہمیں سکھایا ۔ اور جو شَے ہماری استعداد کے دائرہ سے خارج ہے ہماری قدرت میں نہیں ۔ اگر ہم اس کے اہل ہوتے تو ہمیں عنایت فرما دیتا ۔ ما مصدریہ ہے ۔ اب عبارت یُوں ہوگی :

ای لا علماً علّمتناہ ۔ مگر اتنا کہ تُو نے ہمیں سکھایا ۔

اس کا محل رفع ہے ترکیب میں لا ، علم کے موضع سے بدل ہے جیسے لا اله الا الله میں ۔

اِنَّكَ اَنْتَ ، انت ضمیر فصل کی ہے اس پر اعراب کا کوئی محل نہیں الْعَلِیْمُ وُہ ذات کہ جس پر کوئی شے مخفی نہیں ۔ ملائکہ " انك انت العلیم " کہہ کر " اِنّی اعلمُ مالا تعلمون " کی تحقیق و توثیق کر رہے ہیں ۔ الْحَكِیْمُ اپنی مصنوعات کی حکمتوں کو پختہ کرنے والا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا مگر اس میں بڑی حکمت مضمر ہوتی ہے ۔

تنبیہ بندہ کو چاہیے کہ اپنے نقصان اور اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے غافل نہ ہو اور نہ ہی جس کا اسے علم نہیں اس سے لاعلمی کے اظہار میں عار کرے اور جس کا اُسے علم ہے نہ چھپائے اسی لیے علماً فرماتے ہیں : لا ادری (میں نہیں جانتا) کہنا نصف علم ہے ۔

حکایت ۱ قاضی ابو یُوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک مسئلہ پُوچھا گیا تو آپ نے فرمایا : لا ادری ۔ لوگوں نے کہا بیت المال سے اتنا اتنا مال کھاتا ہے اور پھر کہتا ہے : لا ادری ۔ آپ نے فرمایا : میں تو یہ اپنے علم کے اندازہ کے مطابق کھاتا ہُوں ۔ اگر جہالت کی وجہ سے مجھے کچھ ملے تو پھر دنیا میرے پاس ان گنت ہوتی ۔

حکایت ۲ ایک عالم سے منبر پر ایک مسئلہ پوچھا گیا ۔ انہوں نے فرمایا : لا ادری ۔ لوگوں نے کہا : یہ منبر جاہلوں کے لیے نہیں ۔ انہوں نے فرمایا : منبر پر بیٹھنے کا شرف مجھے علم کی وجہ سے ملا ہے ۔ اگر مجھے جہالت کی وجہ سے بلندی ملتی تو اب تک میں آسمان پر پہنچ جاتا ۔

قَالَ یہ جملہ بھی مستانفہ ہے ۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے یٰاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ اے آدم ان کو خبر دے دو بِاَسْمَآئِهِمْ ج یعنی وہ اسماء کہ جن کے علم سے فرشتگان نے عاجز آ کر اسماء کے مراتب تک پہنچنے تک اپنی ہمت کے قصور کا

اعتراف کرلیا فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ مروی ہے کہ آدم علیہ السلام کو منبر پر بٹھا کر حکم دیا گیا کہ اسماء کی خبر ملائکہ کو دیں۔ جب وہ منبر پر بیٹھے اور ملائکہ ان کے سامنے بیٹھے تھے، آدم علیہ السلام انھیں ہر اسم کا نفع بتا رہے تھے قَالَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّيۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ یہ استفہام تقریری ہے یعنی بیشک میں نے تمہیں فرمایا تھا کہ جو کچھ زمین و آسمان میں پوشیدہ ہے میں جانتا ہوں، اس غیب پر نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی راہ۔ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ جو تم ظاہر کر رہے تھے کہ اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا ۔ اسے میں بھی جانتا ہوں وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۝ وہ تم اپنے دل میں کہہ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے زیادہ برگزیدہ اور کسی کو پیدا نہیں کرے گا اُس کا بھی علم ہے۔ یہ قول انی اعلمُ مالا تعلمون کی طرح ہے یہ صرف اس سے زیادہ بسیط ہے تاکہ ان پر حجت قایم ہو سکے کیونکہ وہ کریم آسمان و زمین کے جمیع امور و احوال ظواہر و بواطن کو جانتا ہے۔ اور جو کچھ ملائکہ کے علم میں نہیں اسے بھی جانتا ہے۔

ف : اس آیت میں ملائکہ کو ترکِ اولیٰ پر عتاب ہے اُن کے لیے اولیٰ یہ تھا کہ فرمان کے منتظر رہتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بات ظاہر کی جاتی۔

مسئلہ : یہ آیات انسان کی شرافت اور اس کے علم کی زیادتی اور عبادت کی افضلیت پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ ملائکہ آدم سے فضیلت میں زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود خلافت کے مستحق نہ ٹھہرے کیونکہ آدم علیہ السلام ان سے اعلم تھے اور اعلم افضل ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ : قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔

تنبیہ علم ایک اعلیٰ جوہر ہے لیکن بندوں کے لیے ضروری ہے کہ علم کے ہوتے عبادت میں مصروف رہیں کیونکہ علم بمنزلہ شجر کے ہے اور عبادت بمنزلہ ثمر کے۔ اگرچہ بلحاظ اصالت کے شجر کو فضیلت ہے لیکن درخت سے نفع لینا ثمر کی وجہ سے ہوتا ہے۔

حدیث شریف ۱ والد، کعبہ مکرمہ اور قرآن پاک اور عالمِ دین کی زیارت عبادت ہے۔ جس نے عالم (دین) کی زیارت کی گویا اس نے میری (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) زیارت کی۔ اور جس نے عالم سے مصافحہ کیا گویا اس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ جو عالم کی مجلس میں بیٹھا وہ گویا دنیا میں میری مجلس میں بیٹھا۔ اسے قیامت میں اللہ تعالیٰ میرے ساتھ بٹھائے گا۔

حدیث شریف ۲ ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کی مجلس میں حاضر ہونا ہزار رکعت پڑھنے اور ہزار مریض کی طبع پرسی اور ہزار جنازہ کی حاضری سے افضل ہے۔ عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا تلاوتِ قرآن سے بھی؟ آپؐ نے فرمایا: قرآن علم کے بغیر نفع نہیں دیتا۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

خاتمِ مُلکِ سلیمانست علم
جملہ عالم صورت و جانست علم

ترجمہ: ملک سلیمان کی مہر علم ہے تمام جہان جسم اور علم جان ہے۔

حدیث شریف ۳ جو چاہے کہ میں دوزخ سے آزاد شدہ لوگوں کو دیکھوں تو وہ دین کے طالب علموں کی زیارت کرے مجھے (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) اُس ذات کی قسم ہے کہ جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے ہر وہ طالب علم جو علم کے دروازہ پر جاتا ہے اس کے ہر قدم پر سال کی عبادت لکھی جاتی ہے، اور ہر قدم پر بہشت میں پورا شہر بنایا جاتا ہے۔ طالب علم زمین پر چلتا ہے زمین اس کے لیے بخشش کی دعا مانگتی ہے اور ہر صبح و شام اسے مغفورین میں شمار کیا جاتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے علم الاسماء کلھا۔ اسمائے تین قسم ہیں ؛

(۱) اسماء الروحانیات و الملکوتیات۔

(۲) اسماء الجسمانیات

(۳) اسماء الالٰہیات

(۱) اسماء الروحانیات و الملکوتیات : یہ ملائکہ کا مقام اور مرتبہ ہے ان کو ان کے بعض کا علم ہوتا ہے اور جن کا انہیں علم نہیں ہوتا ان کی خبر دینے کی انہیں استعداد ہے کیونکہ روحانیت اور ملکونیات اُن کے لیے ایسے ہیں جیسے ہمارے لیے جسمانیات۔

(۲) اسماء الجسمانیات : یہ پہلے مرتبہ سے کم درجہ ہے۔ ان کی خبر دینا ملائکہ کے امکان میں ہے کیونکہ جسمانیات ان کے لیے ایسے ہیں جیسے حیوانیات ہمارے لیے اس لیے کہ یہ مرتبہ انسان کے مرتبہ سے کم ہے اور انسان کے لیے اس کی خبر دینا ممکن ہے۔

(۳) اسماء الالٰہیات : یہ ملائکہ کے مرتبہ سے فوق الدرجہ ہے۔ کما قال تعالیٰ :

یخافون ربھم من فوقھم۔ اپنے رب سے اوپر سے ڈرتے ہیں۔

انسان کو ممکن نہیں کہ ان کی خبر دے سکے۔ اور نہ ہی ملائکہ کو، جتنا کہ اللہ تعالیٰ نے علم دیا اس سے آگے کچھ بتا سکیں۔ کیونکہ یہ غیب ہے اور انہیں عالمِ غیب کی جانب ترقی نہیں ملتی اس لیے کہ یہ عالمِ جبروت ہے اور ملائکہ اہلِ ملکوت ہیں۔ ان کا مقام محدود و معلوم ہے اس سے متجاوز نہیں ہوتے۔ جیسا کہ جبریل علیہ السلام نے شبِ معراج سدرۃ المنتہیٰ پر ٹھہر کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی : اگر میں انگلی کی مقدار آگے بڑھوں تو جل جاؤں گا۔

نکتہ ۱ اس علم سے صرف آدم علیہ السلام کو مخصوص کیا گیا کیونکہ آپ عالم کے خلاصہ میں آدم علیہ السلام کی روح شجر عالم کا بیج ہے اور آپ کا جسم شجرۂ عالم کا ثمر۔ اسی لیے تمام عالم کی پیدائش کے بعد آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا۔ جیسے ثمر، درخت کی تکمیل کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

نکتہ ۲ جیسے ثمر تمام درخت کے اجزاء کو عبور کرتا ہوا درخت کے اوپر نمودار ہوتا ہے۔ ایسے ہی آدم علیہ السلام نے

موجودات کے درخت کے اجزاء کو عبور فرمایا، خواہ علوی دنیا تھی خواہ سفلی۔ اور موجودات کے ہر جز میں نفع بھی تھا اور مضرت بھی۔ اور مصلحت بھی اور فساد بھی۔ پھر ہر شئے کا نام بمطابق نفع و نقصان رکھا گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا آدم علیہ السلام کو سکھایا گیا۔ یہ وہ علم تھا جو آدم علیہ السلام کو دیا گیا، جس سے ملائکہ لاعلم تھے۔ یہ آدم علیہ السلام کے کمال سے تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کو بمطابق نفع و نقصان معلوم کر لیا۔ پھر غیر کے اسماء کا علم تو ادنیٰ درجہ تھا۔ اسماءِ الٰہی کے علم کا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام مخلوق ہیں تو اللہ تعالیٰ خالق ہے۔ اور آدم علیہ السلام مرزوق ہیں تو وہ رازق ہے۔ آدم علیہ السلام عبد ہیں تو وہ معبود ہے۔ آدم معیوب ہیں تو اللہ تعالیٰ ستار ہے۔ آدم مذنب ہیں تو وہ غفار ہے۔ آدم تائب ہیں تو وہ تواب ہے۔ آدم نفع لینے والے ہیں تو اللہ نافع ہے۔ آدم ضرر پانے والے ہیں تو اللہ ضار ہے۔ آدم ظالم ہیں تو وہ عادل ہے۔ آدم مظلوم ہیں تو اللہ تعالیٰ منتقم وغیرہ۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قُلْنَا یعنی یاد کیجئے اے محمد! جبکہ ہم نے لِلْمَلٰٓئِكَةِ تمام ملائکہ کو، جیسا کہ دوسری جگہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کما قال: فسجد الملئکۃ کلھم اجمعون۔ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ آدم علیہ السلام کے لیے سجدہ میں گر جاؤ۔

حلِ لغات: السجود دراصل تذلل مع طمانیت کو کہتے ہیں۔ اور شرع میں وضع الجبھۃ علیٰ قصد العبادۃ والمامور بہ۔ یہاں پر اگر شرعی معنیٰ لیا جائے تو ملائکہ دراصل سجدہ تو اللہ تعالیٰ کو کر رہے تھے اور آدم علیہ السلام کی شان بڑھانے کے لیے اُن کو ملائکہ کا قبلہ قرار دیا گیا۔ اگر لغوی معنیٰ مراد ہو تو یہ تواضع پر محمول ہوگا۔ جو ملائکہ آدم علیہ السلام کی تعظیم میں سجدہ کر رہے تھے وہ ایسے تھے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے سجدۂ تحیۃ کیا۔

مسئلہ: سجدۂ تحیہ پہلی اُمتوں میں جائز تھا پھر ہمارے لیے منسوخ ہوا، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا جب انہوں نے آپ کو سجدہ کرنے کا ارادہ کیا "سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو سجدہ کرنا روا نہیں، اگر میں کسی کے سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے"۔

مسئلہ: اس اُمت کا تحیہ السلام علیکم کہنا ہے۔ لیکن سر جھکانا مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے یہود سے تشبیہ ہوتی ہے۔ (کذا فی الدار)

ف: یہ ارشادِ گرامی (سجدہ کا حکم) اسماء کے انباء کے بعد تھا۔

ف: بعض مفسرین فرماتے ہیں: جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو ملائکہ کو وہم تھا کہ کیا ہم اعلم ہیں یا آدم (علیہ السلام) پھر جب اُن سے اسماء کے متعلق پوچھا گیا اور وہ نہ بتا سکے اور حضرت آدم علیہ السلام نے بتا دیا اب انہیں پتا چلا کہ آدم علیہ السلام اعلم ہیں۔ پھر ان کو اشکال ہوا کہ ہم افضل ہیں یا آدم۔ جب ان کو سجدہ کا حکم ہوا تو انہیں معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام افضل ہیں۔

نکتہ ہمارے باپ کو سجدہ کرایا جا رہا ہے لیکن یہاں ارشاد ہوتا ہے:
لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا اللہ الذی خلقھن۔
یہ اس کا خاص کرم ہے جو صرف ہمارے لیے ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اسجدوا کے تین معانی ہیں:
(۱) ملائکہ! تم اللہ تعالیٰ کو تو سجدہ با عتبار طبیعت ملکیہ و روحانیہ کرتے ہو اب آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو اگرچہ یہ تمہاری طبیعت کے خلاف ہے۔ یہ بھی انقیاد للامر اور امتثال للحکم ہے۔
(۲) آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو اس کی شانِ خلافت کی تعظیم اور مخصوص فضیلت کی تکریم کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ پایا جاتا ہے۔ جس نے اسے سجدہ کیا گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرمایا:
انّ الّذین یبایعونک انّما یبایعون اللہ۔ بیشک وہ جو آپ سے بیعت کرتے ہیں بیشک وہ میری بیعت کرتے ہیں۔
(۳) اُسجدوا لِآدم یعنی آدم علیہ السلام کی خاطر سجدہ کرو۔ کیونکہ اُس کی طاعت وعبادت اُن کے لیے ثواب و ترقیِ درجات کا موجب نہیں بلکہ اس کا فائدہ انسان کی طرف راجع ہوگا۔ اس کی دو وجہیں ہیں:
اول تو یہ کہ انسان طاعت میں ملائکہ کی اقتداء کرے گا اور امتثال امر میں ان کی عادت سیکھے گا اور طاعت سے اِباء و استکبار سے ملائکہ کو دیکھ کر بچ جائے گا تاکہ لعن وطعن کا مستحق نہ ہو۔ جیسے ابلیس ہوا۔ اور ملائکہ کی طرح اللہ تعالیٰ کا ممدوح و مکرم ومقبول ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے لیے فرمایا:
لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون۔
(۲) اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت سے ملائکہ کی طاعت اور تسبیح وتحمید کو انسان کی مغفرت کے لیے متعین فرمایا۔ کما قال عزّوجل:
والملٰئکۃ یسبّحون بحمد ربھم ویستغفرون لمن فی الارض۔
اسی لیے ملائکہ کو سجدہ کا حکم دیا تاکہ انسان عبادت کا طریقہ سیکھے اور پھر ملائکہ کی عبادت انسان کی مغفرت کا سامان بنے۔

تفسیر عالمانہ فَسَجَدُوْٓا یعنی ملائکہ نے سجدہ کیا اس لیے کہ وہ نور سے پیدا کیے گئے کما قال علیہ السلام: فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں اور نور کی شان انقیاد وطاعت ہے۔

ف: سب سے پہلے جبریل علیہ السلام نے سجدہ کیا اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں انبیاء علیہم السلام خصوصاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیام رسانی کا شرف بخشا۔ پھر میکائیل پھر اسرافیل پھر عزرائیل پھر تمام ملائکہ نے سجدہ کیا۔
ف: بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے سجدہ کرنے والے اسرافیل ہیں۔ جب انہوں نے سجدہ سے سر اُٹھایا تو ان کی پیشانی پر

قرآن لکھا ہوا تھا۔ یہ صرف اس سجدہ کی برکت تھی۔

ف : فسجدوا میں فا اُن کے امتثال میں عجلت اور عدمِ غفلت کے اظہار کے لیے ہے کہ سجدہ کا حکم سنتے ہی فوراً سجدہ میں گر گئے۔

اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ ط یعنی ابلیس نے سجدہ نہ کیا اس لیے کہ اس کی پیدائش نار سے تھی۔ نار کا کام استکبار اور علو کی طلب ہے۔ اس استثنا کے بارہ میں علمائے کرام کے دو قول ہیں :

(۱) استثنا متصل ہے کیونکہ ابلیس اگرچہ جن تھا لیکن ملائکہ کی کروڑوں کی تعداد میں ایک گیا شمار اور ان کے اوصاف سے بھی متصف تھا۔ پھر تغلیباً فسجدوا سے استثنا کیا گیا۔

ف : اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا کیونکہ سجدہ کا خطاب ملائکہ کو ہی تھا۔ بغوی فرماتے ہیں یہی اصح ہے۔

مسئلہ : تیسیر میں فرماتے ہیں کہ ملائکہ کو عدمِ عصیان و عدمِ استکبار کے ساتھ موصوف کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان سے بھی گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان سے عصیان کا تصور نہ ہوتا تو ان کو عدمِ عصیان سے موصوف کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ طاعت ان کی فطرت ہے اور عصیان ان سے تکلفاً ہوگا۔ جیسے بشر سے عصیان کا ہونا فطرت ہے اور اطاعت تکلف۔ ملائکہ سے عصیان کا امکان کیوں نہیں جبکہ ہاروت و ماروت کا واقعہ ہمارے سامنے ہے۔ مثنوی میں ہے : ؎

امتحان میکرد شان زیر و زبر
کے بود سرمست را زینہا خبر

ترجمہ : ان کا زیر و زبر میں امتحان لیتا ہے سرمست کو اس کی کیا خبر!

(۲) استثنا منقطع ہے کیونکہ وہ ملائکہ سے تو تھا نہیں بلکہ وہ جن تھا۔ کما قال عزوجل :

كَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهٖ ۔ وہ جن تھا کہ اس کے حکم سے پھر گیا۔

ف : حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن اور ملک ایک جنس ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو طاہر رہتا ہے وہ ملک ہوجاتا ہے اور جو خبیث رہتا ہے وہ شیطان اور جو بین بین ہو وہ جن۔

اَبٰى یعنی جس کا اسے حکم دیا گیا اس سے رُک گیا۔ اور اِباء اس انکار کو کہتے ہیں جو اختیار سے کیا جائے۔

وَاسۡتَكۡبَرَ قف اور اس نے اپنے آپ کو عظیم الشان سمجھ کر اپنی بڑائی ظاہر کی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت و تعظیم و تحیہ کو باطل سے مزین کر کے تکبر کی طلب کی۔

سوال : اِباء کی تقدیم درست نہیں کیونکہ استکبار اِباء کا سبب ہے اور ہمیشہ سبب مقدم ہوتا ہے نہ کہ مسبب۔

جواب : اِباء استکبار سے ظاہر ہے اور اس کا اثر واضح ہے بخلاف استکبار کے۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

۱ این تکبّر چیست غفلت از لباب
منجمد چوں غفلت یخ ز آفتاب

۲ چو خبر شد ز آفتابش یخ بماند
نرم گشت و گرم گشت تیز راند

ترجمہ : (۱) تکبّر کیا ہے؟ عقل سے بے خبری۔ منجمد ہے غفلت کی طرح کہ پھر وہ یخ سورج کی گرمی سے پگھلتی ہے۔
(۲) جب خبر ہوئی کہ سورج کی گرمی ہے تو یخ کی حالت ہوتی ہے کہ وہ نرم و گرم ہو کر تیز دوڑتی ہے۔

سجدہ میں ملائکہ کا قصّہ جب ملائکہ سجدہ میں گرے تو ابلیس نے آدم علیہ السلام سے منہ پھیر کر پیٹھ کر لی یہاں تک کہ وہ سجدہ سے فارغ ہوئے اور سجدہ میں ایک سو سال تک پڑے رہے۔ بعض روایات میں پانچسو سال آیا ہے۔ جب انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ابلیس کھڑا ہوا ہے بلکہ اُلٹا آدم علیہ السلام سے منہ پھیرے ہوئے ہے اور اس فعل سے نادم بھی نہیں ہوتا بلکہ الٹا عزم بالجزم میں ہے۔ تو اس کے امتناع اور اپنی فرمانبرداری کی توفیق کی وجہ سے دوبارہ سجدہ میں گرے۔ اُن کے لیے دو سجدے ہو گئے۔ ایک آدم علیہ السلام کے لیے، دوسرا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ جب یہ سجدہ کر رہے تھے ابلیس دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُس کی صفت، حالت، صورت، ہیئت، نعمت، سب کو متغیر فرمایا۔ کما قال تعالیٰ :

انّ اللّٰہ لا یغیّر بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔

ف : بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا جسم خنزیر کی شکل اور منہ بندر کی طرح مسخ ہو گیا۔ شیطان کی اولاد بھی ہے۔

سوال : جو مسخ ہو جائے اس کی تو اولاد نہیں ہُوا کرتی۔

جواب : چونکہ اس نے انظرنی کہہ کر مہلت طلب کر لی۔ بنا بریں اس کے لیے نسل کا سلسلہ بھی باقی رکھا۔

حکایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعد میں شیطان کو حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کر، میں تیری توبہ قبول کر کے تیرے گناہ معاف کر دوں گا۔ شیطان نے عرض کی، جب میں اس کے جسم کو ساجد نہ ہُوا تو پھر اس کی قبر اور میّت کو کیسے سجدہ کروں!

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ شیطان کو قیامت میں ہزار سال دوزخ میں رکھنے کے بعد نکال کر آدم علیہ السلام کے سامنے کھڑا کر کے سجدہ کا حکم دے گا تب بھی وہ سجدہ سے انکار کرے گا۔ پھر اسے دوزخ میں ہمیشہ کے لیے داخل کیا جائے گا۔

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وہ ابلیس اللہ تعالیٰ کے علم میں کافرین میں سے تھا، یا اس وقت کافر ہوا جبکہ یہ اعتقاد رکھ کر کہ میں افضل ہوں اور افضل مفضول کے سامنے نہیں جھکتا اس لیے اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا جبکہ اللہ تعالیٰ کا اسے حکم تھا۔ اس نے امرِ الٰہی کی اہانت کی جیسا کہ اس کا انا خیرٌ منه کا جواب بتاتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا:

مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ۔

صرف ترکِ واجب سے کافر نہیں ہوا۔

عقیدہ اہلِ سنّت کا مذہب یہ ہے کہ "سعید شقی ہو سکتا ہے" کافر جب اسلام لائے گا تو وقتِ اسلام تک اسے کافر سمجھا جائے گا، اسلام لانے پر اسے مسلمان کہیں گے۔ اب اس کی سرگزشت کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اور (معاذاللہ) جو مسلم کافر ہو جائے اُسے بھی وقتِ کفر تک مسلمان کہیں گے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کے گزشتہ اعمال حبط ہو جائیں گے۔

سوال: كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ کیوں فرمایا حالانکہ اس وقت سوائے اس مردود کے اور کوئی کافر تھا نہیں۔

جواب: اللہ کے علم میں تھا کہ آنے والی مخلوق میں بہت سے بندے کافر ہوں گے۔ یعنی یہ ابلیس ان لوگوں میں سے ہو گیا جو آیندہ آکر کفر کریں گے۔ جیسے فتكونا من الظّٰلمين میں فرمایا حالانکہ اس وقت کوئی ظالم تھا ہی نہیں۔ اس کی بھی یہی تقریر ہے۔

آیت کے فوائد و مسائل

(۱) تکبّر قبیح ترین عمل ہے کیونکہ یہ عمل بندہ کو کفر کی جانب کھینچ کر لے جاتا ہے۔

(۲) آیت میں سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری لازمی ہے اس کے راز میں غور و خوض نہ کیا جائے۔

(۳) امر وجوب کے لیے ہے۔

(۴) جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ یہ کفر پر مرے گا وہ ضرور کافر ہوگا۔ کیونکہ دار و مدار خاتمہ پر ہے اگرچہ اس کا ظاہر حال اہلِ ایمان جیسا ہو۔ اسے مسئلۃ الموافاۃ کہتے ہیں۔ یعنی تمام عمر کا اعتبار وفات کے وقت کا ہے۔ اب جبکہ اعتبار خاتمہ کا ہے انسان کو چاہیے کہ طاعاتِ الٰہی بجا لانے کی سعی کرے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کے لیے جنّت یا دوزخ پیدا کیا گیا اس کے اعمال بھی اس سے سرزد ہوتے ہیں خصوصاً عمر کے آخری سال اور خاتمہ کے وقت، اب نیک عمل کرے، تاکہ اس کا خاتمہ نیک اعمال پر ہو۔

حکایت حضرت رابعہ عدویہ نے سفیان ثوری رحمہا اللہ نے فرمایا، دُنیا میں تُو نے چند روز رہنا ہے۔ جب زندگی کا ایک یوم گزر جائے تو سمجھ لو کہ عمر کا بعض حصّہ گزر گیا۔ جب عمر کا بعض حصہ گزرا تو اسی طرح تمام

عمر گزر جائے گی۔ اس کا سب کو علم ہے۔ جب یہ کیفیت ہے تو ہمیں نیک عمل کرنے چاہییں۔ اس کا تو ہرگز افسوس نہ کرنا چاہیے کہ میرے پاس مال وجاہ، درہم و دینار نہیں۔ بلکہ اس کا افسوس کرنا چاہیے کہ جو دن گزر گیا اس میں میں نے کون سا عمل کیا ہے۔ کیونکہ دن گزرنے سے عمر بسر ہوتی ہے۔

حکایت ایک عابد پر حالتِ نزع تھی اور کہہ رہے تھے کہ مجھے موت سے تو کوئی خطرہ نہیں البتہ اس کا مجھے سخت افسوس ہے کہ جو رات نیند میں گزری اور جو دن روزہ کے بغیر بسر ہوا اور جو گھڑی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر عظمت میں گزار دی۔

سبق حضرت علاؑ بن زیاد نے فرمایا: دنیا کا کوئی دن نہیں جو آتے ہی نہ کہتا ہو: "اے لوگو! میں نیا دن ہوں مجھ میں جو عمل بھی کرو گے قیامت میں اس کی گواہی دوں گا۔ اور جب میرا سورج غروب ہو گا میں تمہارے پاس قیامت تک نہیں لوٹ کر آسکوں گا۔"

حدیث شریف میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کی، "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے؟" فرمایا: "جس کی عمر لمبی ہو اور اس کے عمل اچھے ہوں۔" پھر عرض کیا گیا: "لوگوں میں بدبخت کون ہے؟" آپ نے فرمایا: "جس کی عمر لمبی ہو لیکن عمل اچھے نہ ہوں۔" پھر عرض کیا گیا: "لوگوں میں بدبخت کون ہے؟" آپ نے فرمایا: "جس کی عمر لمبی ہو لیکن اس کے عمل برے ہوں، اس کے شر سے لوگوں کو خطرہ ہو اور اس سے خیر کی کسی کو امید نہ ہو۔"

حکایت حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی مجلس والوں سے فرماتے کہ اے بوڑھے لوگو! بتاؤ جب کھیتی کے پکنے کا وقت آجائے تو اس سے کس بات کی امید کی جاسکتی ہے؟ انہوں نے کہا: کاٹنے کی۔ پھر نوجوانوں سے فرمایا کہ اے نوجوانو! خوب سمجھ لو کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھیتی کو پکنے سے پہلے آفت اور بلا دبوچ لیتی ہے جس سے وہ کھیتی برباد ہو جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب فرمایا: ؎

۱ اَلَا مَهِّدْ لِنَفْسِكَ قَبْلَ مَوْتٍ
فَاِنَّ الشَّيْبَ تَمْهِيْدُ الْحِمَامِ

۲ وَقَدْ جَدَّ الرَّحِيْلَ فَكُنْ مُجِدًّا
لِحَطِّ الرَّحْلِ فِيْ دَارِ الْمُقَامِ

ترجمہ: (۱) خبردار! موت سے پہلے تیار ہو جا اس لیے کہ بڑھاپا موت کا ہی پیغام ہے۔
(۲) اور کوچ کا وقت ہر روز تازہ ہوتا ہے تمہیں بھی دار مقام میں اپنا سامان جا کر رکھنا ہے۔

سبق: حضرت حسن سے مروی ہے آپ نے فرمایا کہ اے ابنِ آدم! سارے سال کا غم مت کھا، اور

نہ ہی اس کے لیے سامان جمع کرنے کی تکلیف اٹھا۔ جس دن کو تُو طے کر رہا ہے اس کی کفایت تیرے مالک سے ہوگی۔ اگر سال تمام تیری زندگی کا باقی ہے تو اس کا رزق بھی اللہ تعالیٰ تجھے عنایت فرمائے گا۔ اگر تیری عمر ختم ہے تو پھر تو اس کے لیے کیوں دکھ اٹھا رہا ہے۔ جو تیرے لیے نہیں تُو اسے ہرگز نہیں کھا سکے گا، بلکہ بسا اوقات وہ تیرے دشمن کا لقمہ بنے گا۔

حکایت حضرت ابی درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہر آئے دن میں سورج کے کنارے دو فرشتے ہوتے ہیں اور وہ پکار کر کہتے ہیں (جسے جن و انس کے سوا زمین کے رہنے والے سب سنتے ہیں)، "اے لوگو! اپنے رب کی طرف دوڑو۔ جو رزق تھوڑے پر کفایت کرے، اس سے بہتر ہے کہ زیادہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے"۔ پھر جب سورج غروب ہوتا ہے تو بھی اس کے کنارے پر دو فرشتے پکار کر کہتے ہیں (جسے جن و انس کے سوا تمام زمین والے سنتے ہیں) "اے اللہ! جو تیری راہ میں خرچ کرتا ہے تُو اسے اس کا نعم البدل عنایت فرما۔ اور جو تیری راہ سے روکتا ہے تو اُس کا مال جلد ضائع فرما"۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

نان دہی از بہر حق نانت دہند
جان دہی از بہر حق جانت دہند

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے نام پر روٹی دو گے تو تجھے روٹی دیں گے حق کے لیے جان دو گے تو تمہیں جان دیں گے۔

وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کفر کے بعد بہشت سے نکال دیا اور اس سے بالکل دُور کر دیا بعد ازاں آدم علیہ السلام کو فرمایا کہ اے آدم! بہشت میں اقامت پذیر ہو جاؤ اور اسے اپنا مسکن بنا لو۔

اُسْكُنْ سے سکون کا محل مراد ہے نہ کہ حرکت کی ضد بلکہ معنیٰ یہ ہے کہ بہشت کو لبث و استقرار گاہ بنا لو۔

وَزَوْجُكَ یعنی بی بی حوّا علیٰ نبینا و علیہا السلام۔ عورت کے لیے زوج اور زوجہ دونوں جائز ہیں۔ لیکن زوج زیادہ فصیح ہے۔ کما قال فی تفسیر ابی اللیث۔

سوال: اوّلاً دونوں کو کیوں نہیں مخاطب کیا؟

جواب: تاکہ پتا چل جائے کہ اس خطاب سے مقصود آدم علیہ السلام ہیں اور معطوف علیہ اس کا تابع ہے۔

اَلْجَنَّةَ مفسرین کا اجماع ہے کہ جنت سے مراد دار الثواب ہے۔ معتزلہ اور قدریہ اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنت سے مراد ایک باغ ہے جو فلسطین میں یا فارس اور کرمان کے مابین واقع ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے امتحان کے لیے پیدا فرمایا، اور ھُبُوْطٌ جو کہ اِھْبِطُوْا مِنْهَا کی تاویل کرتے ہیں کہ انھیں اس باغ سے زمینِ ہند کی طرف چلے جانے کا حکم فرمایا۔ جیسے اھبطوا مصراً میں ھبوطٌ بمعنے انتقال ہے۔ معتزلہ کی تاویل بیکار ہے۔ کیوں کہ

ھُبوط بمعنے انتقال اس وقت ہوتا ہے جبکہ حقیقی معنے ممتنع ہوں۔ یہاں پر حقیقی معنے میں کسی قسم کا امتناع نہیں۔

ف : بی بی حوّا کی پیدائش میں اختلاف ہے کہ وہ بہشت کے داخلہ سے قبل ہُوئی یا بعد۔ پہلے قول کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی ایک جماعت کو بھیجا کہ آدم و حوا علیہما السلام کو سونے کے تخت (جس کا جڑاؤ یاقوت، لؤلؤ اور زمرد سے تھا) پر بٹھا کر لے آئیں (اس وقت آدم علیہ السلام کے سر پر پٹکا تھا جس میں موتیوں اور یاقوت کا جڑاؤ تھا۔ ان دونوں کو بہشت میں لایا گیا۔

دوسرے قول کی تائید حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد سے ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے بہشت کو پیدا فرمایا اور آدم علیہ السلام اس میں رہنے سہنے لگے تو اس وقت اکیلے تھے، اُن پر نیند طاری کی گئی۔ ان کی بائیں پسلی سے ایک ٹکڑا لیا گیا، اس کے بجائے گوشت بھر دیا اس سے بی بی حوّا علیہا السلام پیدا کی گئیں۔

سوال : اگر کوئی اعتراض کرے کہ یُوں کہنا کہ آدم علیہ السلام کے ایک ٹکڑے کو کاٹ کر بی بی حوّا علیہا السلام پیدا کی گئیں۔ یہ ایک نقص ہے اور انبیاء علیہم السلام ہر نقص سے پاک ہوتے ہیں۔

جواب : بظاہر آدم علیہ السلام کے لیے یہ نقص ہے۔ لیکن درحقیقت ان کی ایک تکمیل ہے کہ بی بی حوا علیہا السلام سے انہیں سکون ملا، وحشت دُور ہوئی۔ جب آدم علیہ السلام بیدار ہوئے تو بی بی علیہا السلام کو اپنے سرہانے بیٹھا پایا۔ اُن سے پُوچھا: تُو کون ہے؟ بی بی نے کہا: میں عورت ہُوں۔ اُنھوں نے فرمایا: تُو کس لیے پیدا ہوئی؟ بی بی نے کہا: تیرے لیے، تاکہ تو مجھ سے قرار حاصل کرے اور میں تجھ سے سکون پاؤں۔

فرشتوں نے پُوچھا: اے آدم! اس کا نام کیا ہو؟ آپ نے فرمایا: حوّا (علیہا السلام)۔ فرشتوں نے حوّا کی وجہ تسمیہ پُوچھی۔ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ زندہ انسان سے پیدا کی گئی ہے۔ یا اس لیے کہ یہ ہر حیّ کی اصل ہے۔ یا اس لیے کہ ان کی ذقن میں ایک مائل بسیاہی سرخ رنگ کا نشان تھا۔ بعض کہتے ہیں یہ نشان لب پر تھا۔

ف : عورت کو امراۃ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ امرء سے پیدا کی گئی ہے۔ جیسے آدمؑ کو اس لیے آدم کہا گیا کہ انھیں ادیم الارض سے پیدا کیا گیا۔ بی بی حوّا آدم علیہ السلام کی وفات کے بعد سات سال سات ماہ زندہ رہیں۔ اُن کی عمر نوسو ستانوے سال تھی۔

اعجوبہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو بغیر ماں باپ کے پیدا فرمایا۔ جیسے آدم علیہ السلام۔ اور دوسرے کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام۔ اور باقی وُہ جنہیں ماں اور باپ دونوں کے ذریعے سے پیدا فرمایا۔ جیسے تمام اولادِ آدم۔

فسبحان من اظہر من عجائب صنعہ ما یتحیّرا فیہ العقول۔

حکمتیں اللہ تعالیٰ نے بی بی حوا کو پیدا فرمایا، اس میں چند حکمتیں ہیں؛
(۱) تاکہ آدم علیہ السلام ان سے قرار پائیں اور ان سے وحشت دُور ہو۔ کیونکہ بی بی انہی کی جنس سے تھیں۔
(۲) تاکہ اولادِ آدم تا قیامت باقی رہے۔ کیونکہ اُن کی بقاء انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور تشریع احکام شرعیہ کا سبب ہے اور یہی اولاد امر معرفۃ الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا فرمایا۔

نکاح کرنے کے فضائل وفوائد نکاح کرنے کے دنیوی و اُخروی بڑے فائدے ہیں؛
(۱) اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کسی ایک نبی کا ذکر نہیں فرمایا جس نے نکاح نہ کیا ہو۔ یحییٰ علیہ السلام کے لیے بھی منقول ہے کہ انہوں نے نکاح تو کیا تاکہ یہی فضیلت حاصل ہو لیکن جماع نہ کیا۔ کیوں کہ ان کی شریعت میں جماع نہ کرنا عزیمت تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح میں حَصُوْرًا ارشاد فرمایا۔
(۲) اشباہ میں ہے کہ کوئی ایسی عبادت نہیں جو آدم علیہ السلام سے لے کر ہم تک پہنچی ہو اور وہ قیامت تک ہمیشہ رہی ہو۔ صرف نکاح اور ایمان ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔

مسئلہ : شادی شدہ کی غیر شادی شدہ پر ایسے فضیلت ہے جیسے مجاہد کی غیر مجاہد پر۔

مسئلہ : شادی شدہ کی ایک رکعت غیر شادی شدہ کی ستّر رکعت سے بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شادی (نکاح) بقائے نسل کا سبب اور زنا سے بچنے کا موجب ہے۔

ف : لیکن نکاح کرنے کی ترغیب گیارہ سو سال تک ہے۔ اس کے بعد نکاح نہ کرنا بہتر ہے۔ کما قال علیہ السلام؛
جب میری اُمت پر ایک ہزار ایک سو اسّی سال گزرے تو ان کے لیے نکاح نہ کرنا اور تنہا رہنا اور چوٹی پہاڑوں پر رہنا بہتر ہوگا کیونکہ (ایک ہزار کے بعد) دو سو سال کی مخلوق اہلِ حرب وقتل ہوگی۔ اس وقت بکری کا بچہ آدمی کے بچے کے پالنے سے بہتر ہے اور اگر اس وقت عورت بجائے انسان کے سانپ جنے تو کئی حصّے افضل ہے۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

زناں باردار اے مرد ہشیار
اگر وقتِ ولادت مار زانید
ازاں بہ نزدیک خرد مند
کہ فرزند ناہموار زانید

ترجمہ : اے مردِ ہشیار! اگر حاملہ عورت سانپ جنے تو بہتر ہے اس لڑکے سے جو نالائق ہو۔

وَكُلَا مِنْهَا یعنی بہشت سے کھاؤ۔ دونوں کو خطاب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مامور بہ کو عمل میں لانے میں دونوں

برابر ہیں۔ بی بی حوّا آدم علیہا السلام کے کھانے میں برابر کی شریک تھیں بخلاف سکونت کے کہ اس میں آدم علیہ السلام کے وہ تابع تھیں پھر کھانے اور اس میں مشغول ہونے کا حکم دینے کی حکمت یہ تھی (اگرچہ ان کو خلافت کے لیے چنا اور مونہہ بس کیا) تا کہ پتا چل جائے کہ آدم علیہ السلام بھی ایک مخلوق ہیں اور مخلوق کے لیے سکونت اور اشیائے خوردنی لازم ہوتے ہیں۔ رَغَدًا یعنی وسیع طور بغیر رکاوٹ اور اندازہ کے۔ حَيْثُ شِئْتُمَا بہشت میں جہاں سے چاہو ان کو بہشت کی ہر جگہ سے کھانے کی وسعت اس لیے دی جا رہی ہے تاکہ منہی عنہ شجرہ کے کھانے کے بعد کوئی عذر نہ پیش کر سکیں اور نہ ہی کوئی علت ثابت ہو سکے۔ وَلَا تَقْرَبَا اور اس درخت کے کھانے کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اگر صرف درخت کے قرب سے رکاوٹ ہوتی تو را کو مضموم پڑھا جاتا۔ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ شَجَرَةَ منصوب ہے۔ یا تو هٰذِهِ اسم اشارہ سے بدل ہے یا هٰذِهِ بتاویل اسم مشتق کی صفت ہے۔ یعنی عبارت یوں سمجھی جائے:

هٰذه الحاضرة من الشجرة - یہ موجود سامنے والا درخت۔

یعنی اس درخت سے مت کھانا۔ اس کے قریب نہ جانے سے کھانے کی نہی میں مبالغہ کیا گیا۔

شَجَرَةً سے مراد گندم دانہ ہے۔ اور یہی زیادہ مشہور ہے اور صوفیہ کرام کے نزدیک بھی یہی معنیٰ زیادہ موزوں اور جامع ہے کیونکہ نوع انسانی کو گندم دانہ سے زیادہ مناسبت ہے اور اس میں ہر قسم کا رنگ موجود ہے۔ اور اس کا ثمر شہد سے زیادہ میٹھا اور مکھن سے زیادہ نرم اور برف سے زیادہ سفید ہے۔ اس کا ہر دانہ کلیہ بقرہ (گائے کا گردہ) کی طرح ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں اسے اولادِ آدم کا رزق بنایا۔ اسی لیے مشہور ہے کہ آدم علیہ السلام نے گندم دانہ کھایا۔ اب ان کی اولاد اس کی کھیتی باڑی میں مبتلا ہے یا شجرہ سے مراد انگور ہے۔ اسی لیے اب (اس کا نچوڑ جب شراب بن جائے) حرام ہے یا شجرہ سے مراد زیتون ہے۔ اسی لیے اس کے پتوں کے لباس میں آدم علیہ السلام مُبتلا ہُوئے۔ اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں لیکن اس کا تعیّن نہ چاہیے کیونکہ اس کے لیے نص قطعی میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ لاتقربا پر عطف کی وجہ سے مجزوم ہے۔ یا اس نہی کا جواب ہے۔ بنا بریں منصوب ہے۔ پہلی تقریر کے مطابق یوں ہوگا:

لما لا یکن منکما قربان الشجرة وکونکما من الظالمین۔ اور بمطابق دوسری تقریر معنیٰ یوں ہوگا: ان تقربا هٰذه الشجرة تکون من الظالمین۔ بہرحال جو بھی ہو مطلب یہ ہے کہ اکل شجرہ کے سبب سے تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے۔

الظالمین بمعنے وہ لوگ جو نفسوں پر ظلم کریں معصیت کے ارتکاب سے جو عمل ان کی کرامت و نعمت میں خلل انداز ہو اسے عمل میں لا کر اپنے حظوظ میں کمی یا حدود اللہ سے تجاوز کریں۔

ف: امام قرطبی فرماتے ہیں: اربابِ معرفت کا مسلک یہ ہے کہ ولا تقربا سے اشارہ ہو رہا ہے کہ آدم علیہ السلام سے اس امر کا وقوع ضرور ہوگا اور وُہ بہشت سے ضرور نکالے جائیں گے اور اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے کیونکہ

جو اس میں ہمیشہ قیام پذیر ہوگا۔ اس پر امر و نہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر دلیل باری تعالیٰ کا یہ قول ہے۔ انّی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ۔ خلافت کا وقوع زمین پر ہونا تھا۔ اس لیے انہیں بہشت سے باہر تشریف لانی پڑی۔

تفسیر صوفیانہ شیخ نجم الدین قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو آزمائشی خطاب سے مخاطب کیا اور عشوہ و ناز کی نہی سے نوازا۔ گویا یُوں فرمایا کہ اے آدم! میں تجھے شجرۃ کے سوا تمام بہشت عنایت کرتا ہوں۔ یہ درخت چونکہ محبت و معرفت کا ہے اور محبت کے لیے محنت کی سواری لازمی ہے۔

اور اس شجرہ سے رکاوٹ الٹا اس کے کھانے کی تحریص ہے کیونکہ انسان کو جس فعل سے روکا جاتا ہے الٹا اس کے ارتکاب پر حرص کرتا ہے۔ آدم علیہ السلام کا نفس حوّا علیہا السلام اور بہشت سے سکون و قرار پذیر ہوا۔ لیکن شجرۂ معرفت کا شوق دل میں جاگزین رہا۔ کیونکہ یہ قلب کی غذا تھا اور اس میں من وجہ نفس کا حظ بھی تھا۔ بنا بریں اس کا شوق بڑھتا رہا اور اس کے خیال میں رہا، یہاں تک کہ اُسے چند روز بعد حاصل کر لیا۔ اس سے خلافت، محبت، محنت، راز کھلا، مظاہر جلال و جمال۔ جیسے توّاب، غفور، عفوٌ، قہار، ستّار ظہور پذیر ہوئے۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آدم علیہ السلام اس شجرہ کو ضرور کھائیں گے۔ اس پر انھیں اس سے روک دیا گیا تاکہ ان کا کھانا عصیان کا ذریعہ بن جائے۔ جس سے توبہ، محبت، طہارت از تلوث ذنوب ظاہر ہوں گے۔ کما قال عز وجل:

انّ اللہ یحبّ التوابین ویحبّ المتطہّرین۔

اور اکل شجرہ سے بسبب نسیان عصیان کے مرتکب ہُوئے۔ پھر توبہ عصیان کے ذریعہ وراثت میں دی گئی۔ پھر توبہ سے محبت نصیب میں آئی۔ محبت سے طہارت کا شرف ملا۔

حدیث شریف میں ہے: "جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبّت کرتا ہے تو اس کو گناہ نہیں دیتا۔ یعنی اسے گناہ سے محفوظ کر لیتا ہے۔ اگر اس سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو اسے توبہ و ندامت کی توفیق مل جاتی ہے۔

اور ہر وہ لغزش کہ جس کا انجام توبہ، تشریف، اجتبأ ہو اسے زلۃ تنزیہیہ کہتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کو نہی کے بعد ملامت کی گئی۔ یہ نہی تنزیہی اور حسنات الابرار سیئات المقربین سے ہے۔

ف: شیخ نے فرمایا کہ ہمارے طریقہ جلوتیہ جو شیخ ہدائی کی طرف منسوب ہے یہ ہے کہ دعوت الی الجنۃ سے مراد بنی آدم کے وجود دعوت الی مقام الروح ہے گویا قلب انسان کو فرمایا: "اے انسان کے قلب! تُو اور تیری زوج یعنی نفس انسانیہ روح میں طاعات و عبادات میں مصروف رہو اور کھاؤ بلا رکاوٹ اس سے یعنی معرفتِ الٰہیہ سے۔ کیونکہ روح مقامِ معرفت ہے جو طاعات و عبادات سے حاصل ہوتی ہے۔

حیث شئتما یعنی وہ عمل جو تمہیں محبوب ہو۔ خیرات و صالحات سے۔ ولا تقربا ھذہ الشجرۃ،

یعنی مخالفت کے شجرہ کے قریب مت جاؤ۔

مسئلہ: یہ خطاب چونکہ قیامت تک آنے والے تمام بندوں کو ہے (صرف آدم و حوا علیہما السلام پر منحصر نہیں) بنابریں مومن کے لیے ضروری ہے کہ طاعات و عبادات سے اللہ تعالیٰ کی طرف ترقی کرے اور مخالفات سے اجتناب کرے تاکہ مہالک و تکالیف میں نہ پڑے۔

حضرت مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

۱ داروئی مری بخور اندر عمل
تا شوی خورشیدِ گرم اندر حمل

۲ جُہد کن تا نور تو رخشاں شود
تا سلوک و خدمتت آساں شود

۳ تا جلاء باشد مریں آئینہ را
کہ صفا آید ز طاعت سینہ را

ترجمہ: (۱) عمل میں خوشگوار دوائی کھا تاکہ تو حمل میں خورشیدِ گرم ہو۔
(۲) کوشش کیجئے تاکہ نور چمک اُٹھے اور سلوک و خدمت کی راہ آسان ہو۔
(۳) تاکہ اس شیشہ میں روشنی تیز ہو اس لیے کہ طاعات سے ہی سینہ میں صفائی نصیب ہوتی ہے۔

تفسیر عالمانہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا یعنی آدم اور حوا علیہما السلام کو لے گیا اور بہشت سے دُور کیا، جیسے کہا جاتا ہے: زَلَّ عَنِّیْ کَذَا اِذَا ذَھَبَ - اِزْلَال بمعنے اِزلاق اور زَلَّۃٌ بالفتح بمعنے الخطأ یعنی قصد کے بغیر راہِ صواب سے ہٹ جانا۔ مقصد یہ ہے کہ شیطان نے انہیں وسوسہ و دھوکا اور دغا سے خطا پر اکسایا۔

سوال: شیطان کافر ہے اور کافر کا بہشت میں داخلہ ممنوع ہے۔

جواب: بہشت میں اس کا داخلہ علیٰ وجہ التکریم (جیسے ملائکہ داخل ہوتے ہیں) ممنوع ہے نہ کہ آدم و حوا علیہما السلام کے امتحان کی خاطر وسوسہ ڈالنے سے۔

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ جن نعمتوں اور کرامات میں آدم و حوا علیہما السلام تھے ان کو ان سے خارج کرالیا۔ اور ابلیس کا مقصد اُن کو بہشت سے نکالنا نہیں بلکہ اُن کو مرتبہ علیا سے گرانا مقصود تھا، پُورا نہ ہُوا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کرکے راہِ ہدایت بخشی۔

شیخ صدر الدین قدس سرہٗ فرماتے ہیں: جب آدم علیہ السلام نے ابلیس کو کہتے سنا مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ

هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخَالِدِيْنَ۔ تو آدم اور حوّا علیہما السلام نے اس کے اس قول کی تصدیق کی۔

صاحب الفکوک کو دو اشکال صاحب الفکوک فرماتے ہیں کہ دو اشکال ایسے ہیں جن سے نہ ہاں متنبہ ہو سکا اور نہ ہی کسی اہلِ علم ظواہر و بواطن سے ان کا حل مل سکا۔

(۱) جب آدم علیہ السّلام کو ملائکہ سجدہ کر رہے تھے اور وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان کو ملائکہ پر ترجیح دی جا رہی ہے، اور انہیں تمام اسماء کا علم بھی نصیب ہوا اور خلافت سے بھی نوازے گئے اور وصیّت حق کا شرف بھی ملا پھر کیسے ان سے مخالفت وقوع میں آئی اور ابلیس کے قول اِلّا ان تکونا سے کیوں دھوکا کھا گئے۔

(۲) انھیں کیوں نہ معلوم ہو سکا کہ جس بہشت کی شریعت نے تعریف فرمائی ہے۔ اُس میں جو داخل ہوتا ہے اس سے بھی وہ نہیں نکالا جاتا۔ نیز بہشت کا عالم کون وفساد کو قبول نہیں کرتا کیونکہ اس کی لذّات خلود کی مقتضی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہشت وہ بہشت نہیں کہ جس کی چوڑائی ہفت سمٰوٰت و ارضین ہیں اور جس کی زمین کرسی ہے۔ جو آٹھواں آسمان ہے۔ اور جس کی چھت عرشِ رحمٰن ہے۔ اس بہشت میں جو بھی داخل ہو وہ کون وفساد سے محفوظ ہو جاتا ہے کما لایخفیٰ۔ اور نہ ہی اس کی نعمتیں مقرر وقت تک اور ممکن الانقطاع ہیں۔ کیونکہ وُہ ایسا مقام ہے کہ جس میں ایسی معرفت نصیب ہوتی ہے جو حقیقت کو مقتضی ہوتی ہے یعنی ان کی نعمتیں غیر منقطع ہوں، خواہ موت سے یا کسی اور شے سے۔ کما قال تعالیٰ عطاءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ یعنی ایسی نعمتیں جو غیر منقطع اور غیر متناہی ہیں۔

نکتہ بی بی حوّا اور حضرت آدم علیہما السّلام کا حال بنی اسرائیل جیسا ہے کہ ان کے حق میں فرمایا: اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ الآیۃ اسی مناسبت ومشارکت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں آدم علیہ السلام کے قصّہ کے بعد موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا۔ اگرچہ ان کے مابین بہت طویل مدّت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حال اور فعل کی مناسبت کی رعایت فرمائی اور زمانے کا کوئی اعتبار نہ فرمایا۔ قرآن مجید کے اسرار میں سے ایک یہ بھی ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے انسان کو ابتداءً بہشت میں کیوں نہ پیدا فرمایا اور پھر اس کی آزمائش بعد خروج از بہشت کیوں ہوئی۔

جواب: (۱) نعمتوں کی تعظیم بندوں پر واجب ہے۔ اگر دنیا میں ابتداءً نہ پیدا کیے جاتے تو بہشت سے ناواقف رہتے۔

(۲) تاکہ انھیں معلوم ہو کہ بہشت میں ان کا داخلہ جزاً سے ہو نہ کہ ابتداءً۔

(۳) تاکہ ہم بعد داخلہ زوال سے بچ جائیں۔

(۴) ہم دنیا میں اسی لیے پیدا کیے گئے تاکہ طیّب وخبیث اور مطیع ومخالف کی تمیز ہو۔

صفات جلالیہ کا تقاضا یوں نہ تھا کیونکہ بہشت مظاہرِ جلال کا مقام نہیں۔ اگر ہم بہشت میں پیدا ہو کر بہشت میں رہ جاتے تو صفاتِ جلالیہ کا ظہور نہ ہوتا۔ جیسا کہ ملائکہ میں ظاہر نہیں ہوا۔ اسی لیے حکمتِ الٰہی کا تقاضا یوں ہی ہوا کہ انسان کی پیدائش دُنیا میں ہو تاکہ اس میں رحمت و غفران کا ظہور ہو۔ اگر آدم علیہ السلام بہشت میں رہ جاتے تو نصف کمال کا یعنی تجلیاتِ قہریہ ظاہر نہ ہوتیں۔ انسان دُنیا میں آیا تاکہ اس سے اسمائے جلال و جمال کے مظاہر کا تحقق ہو۔ پھر اسے عالمِ جنان میں فضائل و کمالات سے کامل و مکمل کر کے لوٹایا جاوے۔ اس سے مقصود صرف یہی تھا کہ خبیث و طیب کی تمیز ہو جائے۔

نکتہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی پشت میں مقدر کر چکا تھا کہ سردارِ انبیا صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیا علیہم السلام اور اولیائے کرام اور دیگر مومنین پیدا ہوں گے اور پھر ان کی مٹی کے ساتھ ہر مومن و کافر کا بھی خمیر ہوا۔ اب انھیں زمین پر بھیجا تاکہ ان سے وہ خارج ہو جائیں جنہیں بہشت میں داخل نہیں ہونا ہے۔

حکایت شیخ کامل علی ردّہ کشف الکنوز و حل الرموز کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ سیّدی ابن نور الدین کرسی پر جامع مسجد میں وعظ فرما رہے تھے کہ ایک ملحد نے حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھ کر ضمناً اعتراض کیا اور جواب کا منتظر تھا۔

من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود
آدم آورد دریں دیرِ خراب آبادم

ترجمہ: میں فرشتہ تھا اور فردوسِ بریں میرا قیام تھا آدم مجھے اس ویران دنیا میں لے آئے۔

شیخ صاحب فوراً اس کی مراد کو پہنچ گئے اور بلا تامل جواب میں فرمایا: "تُو نے آدم علیہ السلام کو بہشت سے نکلوایا اس لیے کہ تُو نے فساد و الحاد کو ظاہر کرنے کے لیے ان کی پشت مبارک میں ہیجان پیدا کیا۔ پھر اگر وہ بہشت سے نہ نکلتے تو تجھ جیسے فاجر و ملحد بہشت میں رہ جاتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی غیرت کا تقاضا ہوا کہ تجھ جیسوں کو بہشت سے خارج کرنے کے لیے چند ایام آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیج دیا۔

سوال: شیخ بومدین قدس سرہٗ سے پوچھا گیا کہ آدم علیہ السلام بہشت سے کیوں نکالے گئے، جب وُہ جانتے تھے کہ اکل شجرہ سے روکا گیا ہُوں پھر اس کا ارتکاب کیوں کیا؟

جواب: اگر آدم علیہ السلام جانتے کہ مجھ سے سیّدالانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں گے تو وہ درخت کا ثمر کیا اس کی جڑیں تک کھا جاتے تاکہ زمین میں جلد تر کمالِ محمدی اور جمالِ احمدی کا ظہور ہو۔

سوالِ خلیل اللہؑ: الٰہی! تُو نے آدم علیہ السلام کو بہشت سے کیوں نکالا؟

جوابِ باری تعالیٰ: اے خلیلؑ! تو حبیب کا شدید جفا نہیں جانتا۔

نکتہ سلسلۂ جلوتیہ کے مرجع طریقت شیخ بافتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ کہ آدم علیہ السلام کا دنیا میں تشریف لانے میں راز یہ ہے کہ آدم علیہ السلام جس مرتبہ میں تھے اس سے توحیدی

مرتبہ کا شانِ بلند پایا۔ عرض کی : الٰہی ! یہی مرتبہ عطا کر دے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : یہ مرتبہ آہ و فغان سے ملے گا۔ عرض کی : آہ و فغان مجھے منظور ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : بہشت گریہ کا مقام نہیں بلکہ یہ تو سرور و مستی کا مرکز ہے۔ عرض کی : تو پھر مجھے دنیا میں ہی بھیج دے۔ اُن سے اس مرتبۂ اعلیٰ کی وجہ سے بطریق حسنات الابرار سیئات المقربین فعل سرزد ہوا جس سے دنیا میں تشریف لائے۔ (کذا فی واقعات الهداتی)

تفسیر صوفیانہ شیخ نجم الدین قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام جب محمول العنایۃ اور مسجود الملائکۃ قرار پائے اور ان کے سرِ مبارک پر کرامت کا تاج اور لباسِ سعادت سے ملبوس اور کمر بند قربت اور گردن میں نزدیکی کا طوق ڈالا گیا تو اس سے فوق کوئی مرتبہ اور آپ جیسا ہم مرتبہ کسی کو نہ پایا تو ہر لحظہ ندا آ رہی تھی : "جب قضا آتی ہے تو تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔"

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں : ؎

چوں قضا آید رود دانش بخواب
مہ سیہ گردد بگیرد آفتاب

ترجمہ : جب تقدیر آتی ہے تو عقل نیند میں چلی جاتی ہے چاند سیہ ہو جاتا ہے اور سورج گرفت میں آ جاتا ہے۔

ابھی اسی درد میں تھے کہ اُن سے لباس اتار کے اُن سے اُنس چھینا جا رہا ہے ۔ ملائکہ نہایت سختی سے کہہ رہے ہیں کہ " ابھی بہشت سے نکل جاؤ ، دیر کی ضرورت نہیں ۔ نہ ہی بحث کا وقت ہے۔" اپنی تدبیر سے تقدیر کے ہاتھ ان دونوں کو عزت و قرابت سے نکال رہے تھے اور شیطان مسکین اس امر میں یوسفی بھیڑیئے کی طرح تھا کہ اسے یوسف علیہ السلام کا قاتل قرار دے کر اس کے منہ کو جھوٹے خون سے خون آلود کیا گیا حالانکہ بھائیوں نے انہیں کنوئیں میں گرا دیا ۔ اسی طرح شیطان کی عدمِ عنایت کی وجہ سے گرفت ہوئی اور اس کی سونڈ کو جھوٹی نصیحت سے خون آلود کیا گیا کہ شیطان نے ان دونوں کو سلامت سے نکال کر ملامت میں ، خوشی سے نکال کر غم میں اور نعمت سے نکال کر عذاب میں اور محبت سے نکال کر محنت میں اور قربت سے نکال کر غربت میں اور الفت سے نکال کر کلفت میں اور وصال سے نکال کر فراق میں پہنچا دیا۔

اس سے قبل حضرت آدم علیہ السلام ہر شئے سے مانوس تھے اور ہر ایک سے دوستی تھی۔ اسی لیے ان کا نام انسان ہے لیکن جب شجرۂ محبت کا مزا لیا تو ہر شئے سے غیر مانوس تھے بلکہ ہر ایک کو اپنا دشمن بنا لیا ۔

مسئلہ : صحیح محبت میں بھی یہی شرط ہے کہ محبوب کے ماسوا کو دشمن بنا لے ۔

نکتہ جیسے محبوب حقیقی اپنی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرنا نہیں چاہتا اسی طرح محبت میں بھی کسی کی شرکت نہیں چاہتا۔ اسی لیے فرمادیا :

تفسیر عالمانہ اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ابتداءً حضرت خلیل علیہ السلام کا یہی حال تھا کہ چاند ،

ستارہ اور سورج کو دیکھ کر فرماتے:

هٰذَا رَبِّي۔ یہ میرا رب ہے۔

لیکن جب شجرۂ خلت کا مزہ چکھا تو فرمایا:

لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ۔ میں گم ہونے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

اور فرمایا:

إِنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوا یہ خطاب حضرت آدم اور بی بی حوا علیہما السلام کو ہے۔ اور جمع کی ضمیر اس لیے کہ وہ تمام جنس کے اصل ہیں۔ گویا وہ دونوں تمام جنس ہیں۔ یا پانچوں کو خطاب ہے، پانچواں مور ہو۔ یہ امر اگرچہ ایک کلمہ سے تمام کو شامل ہے لیکن ان سب کا اترنا یکبارگی نہیں تھا۔ بلکہ ابلیس تب اترا جب اسے لعنت کا طوق پہنایا گیا۔ اور آدم و حوا علیہما السلام بعد کو اترے۔ ہاں یوں کہا جائے کہ ابلیس کو دوبارہ نکالا گیا جب وہ وسوسہ کے لیے داخل ہوا۔

ف: اهبطوا سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام جنت الخلد میں تھے۔ جیسا کہ انحدار کے حکم سے ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ انحدار اوپر سے نیچے اترنے کو کہتے ہیں۔ اس کے متعلق سابقہ آیات میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔

آدم علیہ السلام کی زمین پر رہائش میں کیا حکمت تھی

امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا زمین پر اترنے اور پھر اس پر قیام فرمانے میں حکمت ازلیہ کا تقاضا صرف یہ تھا کہ آپ کی اولاد زمین پر پھیلے اور پھر ان کو مکلف بنا کر اُن سے آزمائش کر کے اُن پر اُخروی سزا و جزا مرتب کی جائے کیونکہ دوزخ اور بہشت دار التکلیف نہیں۔ یہی اصل موجب ہے آدم علیہ السلام کا اکل شجرہ کا پھر بہشت سے نکالے گئے اور زمین پر اتارے گئے۔ کیونکہ ان کی پیدائش زمین سے تھی اور وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفے بننے والے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس سے کون ہے پُوچھنے والا! خود بھی فرمایا:

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ بیشک میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہی ان کی بڑی منقبت اور فضیلت و بزرگی ہے۔

مختصر یہ کہ آدم علیہ السلام کا بہشت سے زمین پر تشریف لانا اُلٹا ان کی بزرگی و فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔ اور اولاد کے امتحان کے لیے بھی تھا تاکہ سعید و شقی کے مابین فرق ہو جائے۔ جیسا کہ خلافتِ الٰہیہ کا تقاضا ہے۔ اسی طرح کشف الکنوز میں ہے اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اِهْبِطُوا بمعنے اِنْزِلُوا اِسْتِخْفَافًا بِكُمْ زمین پر اُترو یہ تمہاری خفت ہے۔ لیکن بات وہی صحیح ہے جو خدا م نے کہی۔

مولانا ابن الکمال رسالہ قضا و قدر میں فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ واقل لکما ان الشّیطٰن لکما عدوٌّ مبین میں عتاب دوستانہ ہے نہ کہ رنج و غصہ کا۔ اور بہشت سے زمین پر اتارنا اھبطوا منہا جمیعًا کے قبیل سے ہے۔ یہ بھی تکمیل ہے۔ کیونکہ بسا اوقات بُعد بھی قرب ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر کے قول سے مراد ہے ؎

سَاَطْلُبُ بُعْدَ الدَّارِ عَنْكُمْ لِتَقْرَبُوْا

(ہم تجھ سے دُوری اس لیے اختیار کر رہے ہیں تاکہ تم میرے قریب ہوجاؤ)

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج یہ جملہ حال ہے لیکن ضمیر کی وجہ سے واؤ سے مستغنی ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے مخالف ہوجاؤ گے اور ایک دوسرے کو گمراہ کرنے کی کوشش کروگے۔ عَدُوٌّ واحد و جمع ہر دو طرح مستعمل ہے اس لیے اعداء نہیں فرمایا جس طرح ابلیس ان دونوں کا دشمن ہے۔ اسی طرح وہ اس کے دشمن ہیں اور سانپ بنی آدم کا دشمن ہے تو بنی آدم اس کے دشمن ہیں۔ وہ بنی آدم کو ڈستا ہے تو وہ بھی اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ اور اگر ابلیس بنی آدم کو گمراہ کرنے سے باز نہیں آتا تو وہ بھی ہمیشہ لعنتی سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح بنی آدم کی آپس میں عداوت کا حال ہے۔ مثلاً دنیوی حسد اور دینی اختلاف۔ ابلیس و بنی آدم کا اختلاف، چونکہ دینی ہے اس لیے جب تک دین قائم ہے ان کا اختلاف مٹنے والا نہیں۔ اور سانپ کے ساتھ طبعی دشمنی ہے۔ اسی طرح جب تک طبیعت قائم ہے دشمنی قائم ہے۔ پھر ہماری اور ان کی مخالفت مؤکد ہو چکی ہے۔ لیکن فتح و نصرت اس گروہ کو ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہے (یعنی انسان کے ساتھ)۔

مسئلہ: بعضکم لبعض عدوٌّ جملہ خبریہ ہے امر نہیں کہ جس کے حصول میں کوشش کی جائے۔

نکتہ جب باری تعالیٰ نے بعضکم لبعض عدوٌّ فرمایا تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَنَا لَكُمْ عَدُوٌّ۔ شکرِ خدا کہ میں تمہارا دشمن ہوا۔

عدوٌّ اس دشمن کو کہتے ہیں جو اپنے مخالف کی ایذاء میں حد سے تجاوز کر کے دکھ پہنچائے۔

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ یعنی زمین پر قرارگاہ یا قبریں۔

ف: انسان کی قرارگاہیں تین ہیں:

(۱) ماں کا پیٹ۔ قال تعالیٰ: فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ یعنی باپ کی پشت میں امانت رکھا گیا۔ البتہ اس کی قرارگاہ ماں کا پیٹ ہے۔

(۲) دُنیا۔ قال تعالیٰ: وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ۔ تمہارے لیے زمین پر قرارگاہ۔

(۳) عُقبیٰ یا بہشت میں۔ قال تعالیٰ: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا دوزخ کس طرح قرارگاہ ہے قال تعالیٰ: اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا الاٰیۃ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔ بیشک وہ دوزخ تمہاری ٹھہرنے اور رہنے کی جگہ ہے۔

یعنی اسباب جس سے فائدہ اٹھائے اور اس کا نفع اٹھانا زندگی کے خاتمہ تک ہے۔ یعنی موت تک یا قیامت تک۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ الیٰ حینٍ فرما کر آدم علیہ السلام کو خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ اس دنیا میں آپ چند روزہ کر پھر بہشت میں تشریف لائیں گے۔

آدمؑ، حوّاؑ، مور، سانپ اور شیطان کے زمین پر اترنے کا واقعہ

جب ان سب کو بہشت سے نکال کر دنیا میں اتارا گیا تو آدم علیہ السلام ہند میں سراندیپ کے پہاڑ پر اترے۔ ان کی وجہ سے وہاں کے درخت خوشبوناک ہو گئے کیونکہ آدم علیہ السلام بہشت کی خوشبو ساتھ لائے تھے اور اس وقت بادل آپ کے سر مبارک کو مس کرتا تھا تو اس سے آپ کے بال گر گئے۔ آپ کی اولاد کو اسی سے گنجا پن کی بیماری میں مبتلا کیا گیا اور بی بی حوّا علیٰ نبینا علیہا السلام جدہ میں آئیں ان کے مابین سات سو فرسخ کا فاصلہ تھا اور مور کو ہند کے کھیتوں میں اور سانپ کو سجستان یا اصفہان کے علاقے میں اور شیطان کو یاجوج و ماجوج کی دیوار کے قریب اتارا گیا۔ اگر سجستان میں عربدنہ ہوتا تو سانپ کو فنا کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ سجستان میں سانپ بہت زیادہ ہیں۔

ف : آدم علیہ السلام کو ہند میں کھیتی باڑی اور دیگر کاروبار میں لگایا گیا اور بی بی حوّا حیض اور حمل اور طلاق اور نقصانِ عقل میں مبتلا کی گئیں اور سانپ کے پاؤں کو اس کے پیٹ سے چمٹایا گیا اور اس کی خوراک مٹی مقرر کی گئی۔ اور مور کے پاؤں کو قبیح تر بنایا گیا اور ابلیس کی صورت بھدی بنائی گئی اور اس کو نہایت ذلیل حالت میں رکھا گیا۔

ف : آدم اور حوّا علیہما السلام بہشت میں یومِ آخرت کے ایام میں صرف ظہر اور عصر کے مابین کے وقت ٹھہرے۔ اور اس کے ہر یوم کی مقدار دُنیا کے ہزار برس کے برابر ہے۔

ف : بہشت میں سانپ آدم علیہ السلام کا خادم تھا لیکن اس نے خیانت کرتے ہوئے شیطان کو پیٹھ پر بٹھلا کر بہشت میں پہنچا کر اپنی دشمنی کا ثبوت دیا۔ اور جب دُنیا میں اترے تو اب دشمنی اور بڑھ گئی۔ اسی لیے اتارتے وقت کہا گیا تھا کہ تو بنی آدم کا دشمن ہے اور وہ تیرے دشمن ہوں گے، جہاں تجھے پائیں گے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

حدیث شریف : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے :

اقتلوا الحیات واقتلوا ذات الطفیتین والابتر فانہما یخطفان البصر ویسقطان الحمل۔ (سانپوں کو قتل کرو خصوصاً ابتر اور ذوالطفیتین کو کہ وُہ آنکھ کو چھین لیتے اور حمل گرا دیتے ہیں)

اگرچہ وہ الحیات کے عموم میں داخل تھے اس لیے ان کا خاص ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس کے بہت بڑے ضرر پر تنبیہ ہو جائے۔

مسئلہ : جو سانپ گھروں کے سوا جہاں بھی مل جائے مار دیا جائے کیونکہ امر کے عموم اور ظاہری الفاظ سے ایسے معلوم

ہوتا ہے ۔

مسئلہ : اور سانپ گھروں میں ہوں انھیں مارنا نہیں چاہیے جب تک تین دن نہ گزریں اور اسے گھر سے نکل جانے کے لیے روزانہ کہہ بھی دیا جائے کہ (اے سانپ جی! نکل جاؤ) ۔

حدیث شریف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ شریف میں بعض ایسے جن بھی ہیں جو مسلمان ہو چکے ہیں ۔ انھیں دیکھو تو مارنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اُن کو تین روز کی مہلت دو ۔

ف : ابن الملک شرح المشارق میں فرماتے ہیں کہ جن چونکہ لطیف جسم والے ہوتے ہیں اسی لیے وہ سانپوں کی شکل میں بھی آجایا کرتے ہیں ۔ اور جو جن سانپوں کی شکل میں آتے ہیں اُن کو قتل کرنے سے روکا گیا ہے ۔ اور جو جن سانپ بن کر آتا ہے وہ سفید، چھوٹا ہوتا ہے اور جب چلتا ہے تو پیچھے نہیں مڑتا ۔

مسئلہ : اور صحیح یہی ہے کہ سانپ کو گھروں میں مارنے کی ممانعت صرف مدینہ شریف میں ہی مخصوص نہیں بلکہ تمام بلاد میں ہے جس گھر میں ہوں یہی حکم ہے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

وَ اِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔

مسئلہ : جب کوئی گھر میں سانپ دیکھے تو اسے یہ سنوائے :

اُنْشِدُكُمْ بِالْعَهْدِ الَّذِىْ اَخَذَهٗ عَلَيْكُمْ نُوْحٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ اُنْشِدُكُمْ بِالْعَهْدِ الَّذِىْ اَخَذَهٗ عَلَيْكُمْ سُلَيْمٰنُ عليه السلام اَنْ لَا تُؤْذُوْنَا ۔

اس دعا کے بعد بھی اگر سانپ گھر کو نہ چھوڑیں تو مار دینا جائز ہے ۔ سانپ اور بچھو سے بچنے کے لیے پڑھیے :

سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۔

اِن شاءَ اللہ اس دعا کی برکت سے حفاظت ہوگی ۔

مسئلہ : ہر جانور کی فطرت یہ ہے کہ وہ ایذا دے ۔ پس موذی کو قبل از ایذا قتل کر دینا جائز ہے ۔ جیسے سانپ، بچھو اور چوہا اور چھپکلی وغیرہ ۔ (اس پر تمام امت کا اتفاق ہے)

مسئلہ : حواشی الجنات علی الهدایہ میں ہے کہ حیوان کا قتل کرنا دو طرح سے ہے :

۱ ۔ ضرر دفع کرنے کے لیے ۔

۲ ۔ نفع حاصل کرنے کے لیے ۔

مسئلہ : مذکورہ علت کی بنا پر شہد کی مکھی اور ریشم کے کیڑے وغیرہما کو اگر قتل کیے بغیر ان سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو ان کو قتل کرنا جائز ہے ۔

ف : سانپ کی جبلی فطرت خیانت ہے کہ اُس نے آدم علیہ السلام کی خیانت کرتے ہوئے اس کے دشمن ابلیس کو

اپنے جبڑوں کے اندر چھپاکر بہشت میں لایا۔ اگر وہ آدم علیہ السلام سے ڈر کر ابلیس کا ساتھ نہ دیتا تو وہ کبھی بہشت میں نہ آتا۔ اور ابلیس نے سانپ کو کہا تھا کہ تُو کوئی فکر نہ کر تیری ذمہ داری میرے اوپر رہے گی۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سانپ کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔

حدیث شریف : اُقْتُلُوْهَا وَاِنْ كُنْتُمْ فِی الصَّلٰوۃِ۔ یعنی سانپ اور بچھو کو جہاں پاؤ قتل کر دو اگرچہ نماز کی حالت میں ہو۔

ف : چھپکلی دیگر جانوروں کے مابین ابراہیم علیہ السلام کی آگ پر پھونک مارتی تھی اس لیے وہ ملعون ٹھہری۔

حدیث شریف میں ہے، جس نے چھپکلی کو قتل کیا گویا اُس نے کافر کو قتل کیا۔

ف : چھپکلی زہردار جانوروں سے ہے۔ اسی لیے طعام اس کے منہ لگانے سے خراب ہوجاتا ہے ورنہ نمکین تو ضرور ہوجاتا ہے۔ اگر طعام کو خراب کرنے کا اسے موقعہ نہیں ملتا تو چھتوں پر چڑھ کر طعام کے بالمقابل گندگی ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ بسا اوقات اس طریق سے کامیاب بھی ہوجاتی ہے۔

ف : اشیاء کو کاٹنا چوہے کی فطرت ہے۔ چنانچہ جب نوح علیہ السلام کی کشتی میں اسے بیٹھنے کا موقعہ ملا تو اُس میں سوراخ کر ڈالا۔

ف : کوّے کی فطرت خباثت ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السّلام کی کشتی میں سے دُنیا کی خبر لانے کے لیے بھیجا تو وہ مردار پر ٹوٹ پڑا اور وہاں مست ہوگیا۔

مسئلہ : گدھ اور تمام درندے (پھاڑ کھانے والے) اور باؤلا کتّا۔ تمام کا حکم سانپ کی طرح ہے۔

مسئلہ : اُقتلوا کا امر ارشادی ہے۔ یعنی اُن کے ضرر کو دفع کرنے کے لیے انہیں قتل کیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : ؎

سنگ بر دست و مار بر سنگ
خیرہ رائے بود قیاس و درنگ

ترجمہ : سانپ کو فوراً پتھر مار کر مار ڈالو اس میں دیر کرنا بیوقوفی ہے۔

اور فرماتے ہیں : ؎

ترحم بر پلنگ تیز دنداں
ستمگاری بود بر گوسفنداں

ترجمہ : تیز دانتوں والے چیتے پر رحم کرنا بکریوں پر ظلم کرنا ہے۔

تفسیر صُوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ محبت کا سانپ آدم علیہ السلام کے دل بیابان میں بیج کی طرح مستقر ہوا تو اس کی ذات کی قرارگاہ قلب کو اور زبان کو اُس کے جسم کی جائے قیام قرار دی گئی۔ اس لیے فرمایا:

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔

یعنی محبت کے بیج کو طاعات اور عبودیت کے پانی سے ملا کر ثمرۂ معرفت کے حصول تک نفع اٹھاتے رہو۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے دُوسرے مقام پر فرمایا:

تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔

اور تحقیقی بات یہ ہے کہ مخلوق کا ثمر صرف معرفتِ الٰہی ہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔

یعنی جن و انس کو صرف معرفت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

معرفت کا ثمر اگرچہ عبادت کی ٹہنیوں پر ظاہر ہوجاتا ہے لیکن اس کی جڑ دراصل محبت کے بیج سے ہی ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ یا اللہ! تُو نے مخلوق کو کس لیے پیدا کیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: میں ایک مخفی خزانہ ہُوں، میں نے اپنی معرفت کے لیے مخلوق کو پیدا کیا۔

مولانا روم رحمہ اللہ تعالیٰ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں: ؎

آفتابِ معرفت را نقل نیست
مشرق او غیر جان و عقل نیست

ترجمہ: معرفت کے آفتاب کی نقل نہیں اس کا مشرق سوائے جان و عقل کے نہیں۔

تفسیر عالمانہ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فاؔ دلالت کر رہی ہے کہ توبہ مامور بہ کے تحقق سے پہلے اور ہبوط کے امر کے بعد قبول ہُوئی۔ اسی لیے قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"آدم علیہ السلام کی توبہ پہلے قبول ہوئی۔ پھر بعد کو زمین پر اُترے۔

اھبطوا کو دوبارہ لانے میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ھبوط کا امر حقارت یا کسی رنج و غصہ کی وجہ سے نہیں تھا۔ کیونکہ توبہ قبول ہونے کے بعد رنج و غصہ کا ہے کا؟"

خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام زمین پر بعد میں اُترے اُن کی توبہ پہلے قبول ہوئی۔

تلقی الکلمات کا معنیٰ ہے ان کو حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہُوئے اور قبول ہو گئے۔ اور جب انہیں جان لیا تو ان پر عمل کرنے کی توفیق مل گئی۔

سوال: وہ کلمات کون سے تھے؟

جواب : وہ کلمات وہی تھے جو اللہ نے خود بیان فرمائے یعنی رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا .... الآیۃ۔

حضرت حافظ شیرازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : ؎

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ
باناز رہِ نیاز بدارالسلام رفت

ترجمہ : زاہد کو غرور تھا اس لیے سلامت نہ جا سکا۔ ہاں راہِ نیاز اختیار کرنے سے دارالسلام نصیب ہوتا ہے۔

حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ محبوب وہ کلام ہے جو بابا آدم علیہ السلام نے پڑھا۔ یعنی : سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰی جَدُّكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ ۔

وسیلہ نبوی علیٰ صاحبہا السلام

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے کہا : بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اَنْ تَغْفِرَ لِي ۔ (اے اللہ ! مجھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل بخش دے)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَكَيْفَ عَرَفْتَ مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وسلم ۔ (اے آدم ! تو نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پہچانا)

آدم علیہ السلام نے کہا :

لَمَّا خَلَقْتَنِي وَنَفَخْتَ فِي الرُّوحِ فَتَحْتُ عَيْنِي فَرَأَيْتُ عَلٰى سَاقِ الْعَرْشِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ فَعَلِمْتُ أَنَّهُ أَكْرَمُ الْخَلْقِ عَلَيْكَ حَتّٰی قَرَنْتَ اِسْمَهُ بِاسْمِكَ ۔ (اے اللہ ! جب تو نے مجھے پیدا کر کے میرے اندر روح پھونکی تو میں نے آنکھ کھول کر عرش پر لکھا دیکھا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ تیرے ہاں تمام مخلوق سے برگزیدہ ہیں کہ ان کے اسم گرامی کے ساتھ تیرا نام لکھا ہوا ہے)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

نَعَمْ ۔ (ہاں ۔ ایسے ہی ہے)

ف : آدم علیہ السلام کی توبہ حضور علیہ السلام کے اسم گرامی کی طفیل قبول ہوئی۔

ف : بعض کے نزدیک کلمات سے وہ کلمات مراد ہیں کہ جب آدم علیہ السلام بہشت سے نکلے تو اللہ تعالیٰ سے کہا :

يَا رَبِّ أَلَمْ تَخْلُقْنِي بِيَدِكَ مِنْ غَيْرِ وَاسِطَةٍ (اے اللہ ! کیا تو نے مجھے بلاواسطہ پیدا نہیں فرمایا)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ہاں ایسے ہی ہے۔

پھر کہا : يَا رَبِّ أَلَمْ تُسْكِنِّي جَنَّتَكَ ۔ (اے اللہ ! کیا تو نے مجھے اپنے بہشت میں نہیں ٹھہرایا)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ہاں ایسے ہی ہے۔

پھر کہا : یَا رَبِّ اَلَمْ تَسْبِقْ رَحْمَتُكَ غَضَبَكَ ۔ (اے اللہ ! کیا تیرے غضب سے تیری رحمت سبقت نہیں کر گئی)
اللہ تعالیٰ نے فرمایا ، ہاں ۔ ایسے ہی ہے ۔
پھر کہا : یَا رَبِّ اَرَأَیْتَ اِنْ اَصْلَحْتُ وَرَجَعْتُ وَتُبْتُ اَرَاجِعُ اَنْتَ اِلَی الْجَنَّةِ ۔ (اے اللہ ! کیا ہو سکتا ہے اگر اپنی اصلاح کر کے تیری طرف رجوع کر لوں اور اپنے کیے کی معافی مانگ لوں پھر تو مجھے بہشت میں جانے دے گا)
اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ضرور ، ایسے ہی ہو گا ۔

خلاصہ یہ کہ کلمات سے عہود انسانیہ اور مواثیق آدمیہ اور وہ مناجات جو بندہ رب سے کرتا ہے ۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام نے معصیت سے توبہ کر کے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی خطا و سہو کا عذر پیش کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا ۔

فَتَابَ عَلَيْهِ یعنی آدم علیہ السلام کی توبہ اپنی رحمت سے قبول فرمائی ۔

توبۃٌ دراصل رجوع کو کہتے ہیں ، جب وہ بندہ کی طرف منسوب ہو تو بمعنے گناہوں سے طاعت کی طرف رجوع کرنا ۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو بمعنے عقوبت سے مغفرت کی طرف رجوع فرمانا ۔

ف : فاء میں اس طرف اشارہ ہے کہ کلمات کے حصول میں ہی توبہ کی قبولیت مضمر تھی ۔

توبہ کی شرائط

(۱) گناہ سے توبہ کے وقت سخت ندامت ظاہر کرے ۔
(۲) گناہ کو اب اور آئندہ بھی تا دمِ زندگی چھوڑنے کا پختہ عزم کرے ۔
(۳) حقوقِ عباد واپس کرے ۔
(۴) اپنے خصم کو راضی کرے ۔ زبان سے دکھ پہنچایا ہے یا ہاتھ سے ، ہر طرح سے معافی مانگے ۔

ف : بی بی حوا کا ذکر آدم علیہ السلام کے ذکر میں تبعاً آ گیا ۔ کیونکہ بی بی حوا بابا آدم علیہ السلام کی تابع تھیں ۔ اسی لیے قرآن و حدیث میں اکثر جگہ عورتوں کا ذکر نہیں آیا ۔ وہاں بھی تبعاً مردوں کے حکم میں ہیں ۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ بندوں کی مغفرت کی طرف بہت رجوع کرنے والا یا بندوں کی توبہ پر زیادہ مدد دینے والا ۔
الرَّحِیْمُ بہت رحم کرنے والا ۔ ان دو وصفوں کو یکجا بیان کرنے میں تائب کو عفو و غفران کے بہت بڑے وعدے سے نوازا جا رہا ہے ۔ یہ جملہ فتاب علیہ کے لیے تعلیل ہے ۔ مولانا روم مثنوی شریف میں فرماتے ہیں : ؎

۱ مرکب توبہ عجائب مرکبست
بر فلک تازد بیک لحظہ ز پست

۲ چوں بر آرند از پشیمانی انیں
عرش لرزد از انیں المذنبیں

ترجمہ : (۱) تیرا گھوڑا عجائبات سے مرکب ہے ایک ہی منٹ میں آسمان تک پہنچ جاتا ہے ۔

(۲) جب وہ پریشانی سے روتے ہیں تو گنہگاروں کے رونے سے عرش لرز جاتا ہے۔

ف : حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت حوّا و حضرت آدم علیہما السلام بہشت کی نعمتوں کے چھین جانے سے دوسو سال روتے رہے۔ چالیس روز نہ کچھ کھایا نہ پیا اور سو سال آدمؑ بی بی حوّاؑ کے قریب نہ گئے۔

ف : شہر بن حوشب فرماتے ہیں کہ مجھے ایک روایت ملی ہے کہ جب آدم علیہ السلام زمین پر اُترے تو اللہ تعالیٰ کے حیا سے تین سو سال اوپر سر نہ اٹھایا۔ اگر تمام زمین کے آنسو جمع کیے جائیں تو داؤد نبی علیہ السلام کے آنسوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ پھر داؤد علیہ السلام اور تمام روئے زمین کے آنسو ملائے جائیں تو آدم علیہ السلام کے آنسوؤں کے سامنے کچھ نہیں ہوں گے۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں : ؎

۱	چوں خدا خواہد کہ با یاری کند	میل ما را جانب زاری کند
۲	اے خنک چشمے کہ آں گریان اوست	اے ہمایوں دل کہ آں بریان اوست
۳	آخر ہر گز بہ آخر خندہ ایست	مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست
۴	باش چوں دولاب نالاں چشم تر	تا ز صحن جاں بر روید خضر

ترجمہ : (۱) جب اللہ کسی سے یاری کا ارادہ کرتا ہے تو ہماری طبیعت میں زاری کا میلان پیدا فرما دیتا ہے۔

(۲) وہ آنکھ خوش قسمت ہے جو گریہ کرتی ہے، وہ دل مبارک ہے جو اس کے دل میں ہے۔

(۳) انجام بکار خوشی حاصل ہونی ہی ہے۔ بخیر انجام پر نظر رکھنے والا شخص مبارک ہے۔

(۴) دولاب کی طرح رو تارہ تاکہ دل کے صحن میں روحانی سبزی پیدا ہو۔

تنبیہ

(۱) جب یہ معمولی خطا والے کا کام ہے تو جو گناہوں میں غرق ہو اسے کیسے کرنا چاہیے۔

(۲) توبہ صابن کی طرح ہے۔ جیسے صابن ظاہری میل کچیل دُور کرتا ہے اسی طرح توبہ باطنی خرابیوں کو صاف کر دیتی ہے۔

(۳) جب بندہ گناہوں سے رجوع کر کے اپنا حال درست بنائے تو اللہ تعالیٰ بھی اس بندے کا حال اچھا کر دیتا ہے اور چھینی ہوئی نعمت لوٹا دیتا ہے۔

حکایت

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ایک مرد نے بکرے کے سامنے اس کا بچہ ذبح کیا تو فوراً ہی اس کا ہاتھ سوکھ گیا۔ ابھی اس حال میں بیٹھا ہی تھا کہ چڑیا کا بچہ گھونسلے سے گر کر نیچے آ پڑا، بچے کی ماں بچے کے اردگرد گھومتی پھر رہی تھی اس مرد نے اُٹھ کر بچے کے گھونسلے میں اسے رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ کو تندرست کر دیا۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ نیکی کرنے سے خطائیں معاف ہو جاتی ہیں۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ وہ پہلی انگوری جو محبت کے دانے سے الہامات ربانیہ کی بارش نے قلب آدم میں بوئی گئی وہ ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین تھی کیونکہ آدم علیہ السلام اپنے نورِ ایمان سے بہت زیادہ باخبر تھے کہ وہ ظالم لنفسہ ہیں جب انہوں نے محبت کا دانہ کھایا اور محنت و مذمت کے جال میں پھنسے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کی کوئی امداد نہ کی جس کی وجہ سے بشریت کی پستی میں جا گرے اور وہ سعادت ازلیہ کہ جس کی استعداد رکھتے تھے وہ بھی چھین لی گئی اس کے بعد اصلی مقام تک نہ پہنچ سکے۔ آخر اللہ تعالیٰ سے فریاد کی اور کہا: ربنا ظلمنا ..... الخ اور اس کے ہبوط میں بھی یہی حکمت تھی کہ وہ مضطر ہو کر اپنے مالک کو یاد کریں۔ پھر وہ اسے مضطرب دیکھ کر جواب دے اور سابقہ عنایات کی اصیل لطف فرمائے اور اپنی رحمت کی بارش برسانے یعنی توبہ قبول فرمائے اس لیے کہ وہ تواب رحیم ہے۔ کلمات کی انگوری سے اجتباء کا درخت پیدا فرمایا اور اس درخت پر توبہ کے شگوفے اگنے اور ہدایت کے ثمر سے اسے ثمردار کیا۔ یعنی اپنی معرفت عنایت فرمائی جیسے کہ خود فرماتا ہے: ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى۔

تفسیر عالمانہ قُلْنَا یہ نیا جملہ ہے ایک سوال کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ گویا کسی نے پوچھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کے بعد کیا حکم ہوا تو فرمایا ہم نے اِهْبِطُوْا مِنْهَا اتر جاؤ بہشت سے جَمِیْعًا سب کے سب۔ جمع کی ضمیر سے حال ہے۔ جماعت (یعنی آدم و حوا علیہما السلام اور سانپ و مور) کے معنی کے لیے تاکید ہے۔ گویا کہا گیا ہے کہ تم سب اتر جاؤ۔ اس سے بیک وقت ان سب کا یکبارگی اترنا ثابت نہیں ہوتا۔ اهبطوا کے تکرار نے بتایا ہے کہ جو اس کا مقتضی ہے وہ ضرور وقوع پذیر ہوا۔

تنبیہ ہے کہ آدم علیہ السلام عنقریب توبہ کے پیچھے پڑیں گے اور ان کو معافی بھی مل جائے گی۔ یا اس لیے کہ اهبطوا کے حکم سے ان کو زمین پر چلے جانے کے لیے ہے کہ وہاں جا کر بسیں گے لیکن اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ دوسرے اهبطوا سے اشارہ ہے کہ ان کو دنیا میں مکلف بنا کر ٹھہرانا ہے۔ مختصر یہ کہ ان دونوں سے مقصود علیحدہ علیحدہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ان کو قریب قریب ذکر کیا جاتا۔ لیکن درمیان میں جملہ معترضہ تلقی الکلمات اور قبول توبہ کا ذکر فرمایا۔ پھر جب اهبطوا کا تکرار ہوا تو سابقہ مضمون کا ربط نہ ٹوٹا۔ یعنی عبادات کا مکلف بنانا اور نیکی سے نجات دینا اور گناہوں پر سزا۔ ارشاد میں ہے کہ دوسرا اهبطوا اِیتاءُ هُدًی کے وعدہ سے مقرون ہے جو کہ نجاتِ ابدی کی طرف پہنچانے والا ہے اور جو اس میں وعید عقاب ہے وہ ذاتی طور مقصود نہیں بلکہ وہ تو بندے کے برے اختیار کی وجہ سے لازم ہو جاتا ہے۔

تنبیہ: آیت سے ثابت ہوا کہ برے عمل سے نعمت چھین لی جاتی ہے کیونکہ بابا آدم علیہ السلام کی ایک خطا سے ان کو بہشت سے باہر بھیجا گیا۔ اس لیے شاعر نے فرمایا: ؎

اِذَا تَمَّ اَمْرًا فانقضہ توقع زوالا اذا قیل تم — اذا کنت فی نعمۃ فارعھا فان المعاصی تنزیل النعم

ترجمہ : جب کوئی کام مکمل ہوجاتا ہے تو اس کا نقص بھی قریب ہو جاتا ہے۔ جب کہا جائے کہ کام مکمل ہوگیا تو اس کے زوال کا انتظار کرو۔ جب تجھے کوئی نعمت نصیب ہوجائے تو اس کی حفاظت کر، کیونکہ معاصی نعمتوں کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ان اللہ لا یغیر بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم۔

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ اگر تمہارے پاس آئے۔ فا ترتیب کے لیے ہے جو اپنے مابعد کو اھبطوا کے امر سے مرتبط کر رہی ہے ھُدًی نبی علیہ السلام اور کتاب کے ذریعے رشد وہدایت اور شریعت کا بیان تمہیں نصیب ہوگا۔ اور یہ خطاب آدم علیہ السلام اور شیطان کو ہے۔ ضمناً ان کی اولاد مراد ہے۔ شرط کا جواب شرط ثانی مع جوابہ شرط اول کا جواب ہے اور نیز قولہ تعالیٰ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ پس جس نے میری شریعت کی اقتدا کی۔

سوال : ھُدًی کا تکرار نہ ہونا چاہیے تھا بلکہ اس کے لیے ضمیر لائی جاتی۔

جواب : دوسری ہدایت عام ہے۔ یعنی وہ احکام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ اقتصادیات وعملیات یا وہ احکام جن کے لیے عقل متقضی ہو۔ یعنی جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکام کی تابعداری کی وہ احکام جو دلائل آفاقیہ وانفسیہ کے علاوہ عقل کے تقاضا کے مطابق ہیں۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ یعنی دونوں جہانوں میں ان کو مکروہ امر سے کوئی خوف نہیں وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ اور نہ ان سے ان کو کوئی یہ خطرہ ہے کہ جو مطلوب فوت ہوگیا۔

ف : خوف کا اطلاق متوقع امر پر ہوتا ہے اور حزن کا واقعہ پر۔ یعنی ان پر ایسے عوارض وارد نہیں ہوں گے جو خوف و حزن کے موجب ہوں۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ خوف وحزن کے اسباب اُن پر وارد تو ہوتے ہیں لیکن وہ خائف ومحزون نہیں ہوتے۔ اور یہ معنی بھی نہیں کہ اُن پر کبھی خوف وحزن وارد ہوتا ہے بلکہ وُہ ہمیشہ مسرور ومفروح رہتے ہیں۔ یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے جبکہ اُن پر اللہ تعالیٰ کے جلال کا خوف ہر وقت طاری ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ حقوقِ عبودیت میں سرگرم رہتے ہیں اور یہ کام خواص ومقربین کا ہے۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا مَنْ تَبِعَ پر عطف ہے۔ گویا معنی یہ ہیں کہ فمن تبع ھدای الخ ومن لم یتبع الخ۔

سوال : ومن لم یتبع کو چھوڑ کر والذین کفروا الخ کیوں فرمایا؟

جواب : تاکہ ضلالت کے حال کی تسجیع ہوجائے اور اس کے کمال قبح کا اظہار ہوجائے۔ اسم موصول جمع لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ کفار بکثرت ہیں۔ یعنی وہ کفار جنھوں نے ہمارے رسولوں کے ساتھ کفر کیا۔

وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ یعنی جو کتابیں ہم نے ان کی طرف بھیجیں اُن کو جھٹلایا۔ اُولٰٓىٕكَ اس کا اشارہ الذین موصول کی طرف ہے باعتبار اُس کے کہ وُہ کفر وتکذیب سے موصوف ہے کہ کفروا اکذبوا اس کا صلہ واقع ہوئے ہیں۔

اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ یعنی دوزخ سے ایسی ملازمت وملابست کرنے والے کہ کبھی بھی اُن سے جدا نہیں ہوتے۔ چونکہ صحبت میں میل جول ہوتی ہے۔ ان پر وہی اطلاق کیا گیا کہ یہ لوگ اس میں ہمیشہ گزریں گے گویا کہ اس کے مالک ہوکر اس میں ہمیشہ کی زندگی بسر کریں گے هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝ وہ کفار اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جملہ نصب کے سابقہ جملہ کا حال ہے۔

مسئلہ : ان دو آیتوں سے معلوم ہُوا کہ بہشت اُوپر کی جانب ہے۔ جیسے اهبطوا منها سے ثابت ہو رہا ہے۔

مسئلہ : جو ہدایت کے متبع ہیں۔ اُن پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

مسئلہ : دوزخ کا عذاب دائمی ہے اور کفار اس میں ہمیشہ رہیں گے اور کافر کے بغیر اور کوئی اس میں ہمیشہ نہیں ٹھہرے گا۔ جیسے هُمۡ فیها خٰلدون سے پتا چلا کیونکہ یہ جملہ حصّہ کا فائدہ دیتا ہے۔

مسئلہ : شرف و بزرگی اتباعِ ہدایت میں ہے۔ جیسا کہ شیخ سعدی قدس سرّہٗ نے فرمایا : ؎

سگ اصحاب کہف روزے چند
پئے نیکاں گرفت مردم شد

ترجمہ : اصحابِ کہف کے لیے نیکیوں کا دامن پکڑا، ان کی صحبت میں رہا تو مرد بن گیا۔

تنبیہ : مومن اگر اطاعت کرے گا تو بہشت میں داخل ہوگا۔ اگر نافرمانی کرے گا تو دوزخ میں جائے گا۔ تعجب ہے کہ جمادات اور دیگر غیر مکلّف چیزیں تو اللہ تعالےٰ کے خوف سے خائف رہتی ہیں اور ان کے حقوق کی پابندی کرتی ہیں۔ لیکن مکلّف بندے عموماً غفلت میں رہتے ہیں۔

حکایت حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک روز میرا ایک لڑکے کے پاس سے گزر ہوا جو مٹی سے کھیل رہا تھا کبھی ہنستا اور کبھی روتا تھا۔ میرا ارادہ ہُوا کہ اسے اَلسَّلَامُ عَلَیۡکُمۡ کہوں لیکن نفس نے تکبر دلا کر روکا کہ تُو اتنا بڑا، تیرے لیے اس چھوٹے سے بچّے کو سلام کرنا درست نہیں۔ میں نے کہا : اے نفس ! تجھے معلوم نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر چھوٹے بڑے کو "السّلام علیکم" فرماتے تھے۔ میں نے لڑکے کو کہا : السّلامُ علیکم۔ لڑکے نے کہا : وعلیك السّلام ورحمة الله وبركاتهٗ یا مالك بن دینار۔ میں نے اسے کہا کہ تُو نے مجھے کیسے پہچان لیا، حالانکہ اس سے قبل تُو نے مجھے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ کی اور میری رُوح کی روزِ میثاق ملاقات ہُوئی تو میرا اور آپ کا ایک دوسرے سے اللہ تعالیٰ نے تعارف کرایا۔ میں نے کہا : بیٹے ! بتائیے، عقل اور نفس میں کیا فرق ہے؟ اس نے کہا : تیرے نفس نے تو السلامُ علیکم سے روکا۔ لیکن تیری عقل نے تجھے اس عنایت سے سرفرازی بخشی۔

میں نے کہا : پھر مٹّی سے کیوں کھیل رہا ہے؟ جواب دیا، اس لیے کہ ہم اس سے پیدا ہُوئے اور اسی میں دفن ہوں گے۔

میں نے کہا : کبھی روتے اور کبھی ہنستے ہو، اس کی کیا وجہ ہے؟

اس نے کہا، جب اللہ تعالیٰ کا عذاب یاد کرتا ہُوں تو رونے لگ جاتا ہُوں اور جب مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت یاد آجاتی ہے تو ہنسنے لگ جاتا ہُوں۔

میں نے کہا، بچّے! تُو تو گناہوں سے پاک ہے پھر رونے کا کیا معنیٰ؟

اُس نے کہا، میں نے اپنی امّی جان کو آگ جلاتے دیکھا کہ وہ آگ میں پہلے چھوٹی لکڑیاں ڈالتی تھی بعد میں بڑی۔

مولانا روم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ؎

۱ طفل یک روزہ ہمیں داند طریق
که بگیریم تارسد دایہ شفیق

۲ تو نمے دانی کہ دانہ رائیگاں
کم دہد بے گریہ شیر او رائیگاں

۳ گفت فلیبکوا کثیراً گوش دار
تا بریزد شیر فضل کردگار

ترجمہ: (۱) چھوٹا بچہ یہ جانتا ہے کہ روؤں گا تو ماں دُودھ دے گی۔

(۲) تُو نہیں جانتا کہ دانہ ضائع ہو رہا ہے اور بچہ جانتا ہے کہ رونے سے دودھ ملے گا۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے فرمایا زیادہ روؤ تاکہ فضلِ الٰہی کی بارش ہو۔

تفسیرِ صُوفیانہ جب آدم علیہ السلام کو زمین پر اترنے کا حکم ملا تو ساتھ ہی خوشخبری سنائی کہ میرے اور آپ کے مابین رابطہ الہام اور وحی کے ذریعے قایم رہے گا۔ اور تیری اولاد سے ہدایت منقطع نہیں ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام اور کتابیں بھیج کر ان کی رہبری کرتا رہوں گا۔ اس کے بعد جب میری ہدایت انھیں پہنچے تو انہوں نے اگر میری ہدایت قبول کر کے تابعداری کی جیسے آدم علیہ السلام نے توبہ سے اور نوح علیہ السلام نے بکار و استغفار سے تابعداری کی اور جس نے محبت کے بیج بو کر اطاعت اور بندگی سے تربیت کی یہاں تک کہ توحید اور معرفت کا ثمر نکل آئے تو مستقبل میں ان پر کوئی خوف نہیں کہ محبت کے بیج بہں صفاتِ حیوانیہ وسبعیہ افساد کا وبال آجائے یا استعداد، سعادت ابدیہ، تمتعاتِ دنیویہ کی وجہ سے باطل ہو جاتے اور نہ ان کو کوئی غم اور نہ حُزن نیچے اترنے میں ہے کیونکہ ان کے محبت کے بیج تربیت یافتہ ہیں کیونکہ یہ لوگ تو جذباتِ عنایت اور ہدایت کے تابع ہو کر حظائر قدس کے اعلیٰ مرتبہ کو پہنچے ہُوئے ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔

پھر ان لوگوں کا ذکر کیا گیا جنھوں نے ان کی ہدایت سے کفر کیا اور اپنا ٹھکانا جہنم کو بنایا وہ یہ ہیں والذین کفروا،

(باقی بر صفحہ ۲۶۴)

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ
اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ○ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠
وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ○ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا
الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○
اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ وَ
اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ
اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○ ع

ترجمہ : اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور خاص میرا ہی ڈر رکھو اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے اور سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کے عوض میں تھوڑے دام نہ لو اور مجھی سے ڈرو اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور دیدہ دانستہ حق کو نہ چھپاؤ اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں اور صبر اور نماز سے مدد چاہو اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے مگر ان پر جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا ہے۔

(بقیہ تفسیر صفحہ گزشتہ)

یعنی جنہوں نے تعلقات شہوات نفسانیہ سے محبت کے بیج کو چھپایا اور جہالتِ انسانیہ کی وجہ سے آیات بیّنات کی تکذیب کر کے استعداد فطری کو ضایع کر دیا وَکَذَّبُوا بِاٰیٰتِنَا یعنی انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور کتابوں کی تکذیب اور انبیاء علیہم السلام وحی، الہام اور اُس رشد کی تکذیب کی حالانکہ اُن سے محبت کے بیج کی تربیت ہوتی ہے اور توحید و معرفت اور بلند درجات کو پہنچنا اور نعیم جنّات اور عرفات کو حاصل کرنے سے شجرِ انسانیہ باثمر ہوتا۔ اولٰئك اصحٰب النّار ھم فیھا یعنی نارِ جہنم اور نارِ ہجر میں خٰلدون ہمیشہ رہیں گے کیونکہ وُہ خود دُنیا میں شہواتِ نفسانیہ کے پیچھے پڑے رہے۔ شریعت کے پانی سے ان کی محبت کا بیج انگوری نہ دے سکا جس کی وجہ سے درجات جحیم اور خسرانِ عظیم میں ہمیشہ ہمیشہ رہے۔

(تفسیر آیات صفحۂ گزشتہ)

تفسیر عالمانہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ بنون کا لفظ مرد و زن دونوں کے لیے مستعمل ہے جب وہ کہیں یکجا واقع ہوں۔ اسرائیل لیعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ اسرائیل کا معنٰی ہے عبد اللہ۔ کیونکہ اسرا لغت عبرانیہ میں (اور یہی یہودیوں کی لغت ہے) بمعنے عبد، اور ایل بمعنے اللہ۔ یعنی اسے لیعقوب علیہ السلام کی اولاد۔

یہ خطاب ان یہودیوں کو ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں موجود تھے جو مدینہ طیبہ کے اردگرد بنو قریظہ اور بنو نضیر وغیرہ تھے اور حضرت لیعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔

سوال: صرف ان کے ذکر کرنے کی کیا تخصیص ہے؟

جواب: وہ لوگ اس وقت نعمتوں سے مالا مال تھے اور نعمت کا کفران بھی ان میں زیادہ تھا۔

اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ ذُکْرٌ بضم الذال، دل کے یاد کرنے سے مختص ہے۔ یعنی وہ حفظ جو نسیان کی ضد ہے اور ذِکْرٌ بالکسر عام ہے خواہ دل سے ہو یا زبان سے۔ اس میں حکم ہو رہا ہے کہ نعمت کا شکریہ دل سے بھی کرو اور زبان سے بھی۔ اُذْکُرُوْا بمعنے اِحْفَظُوْا وَاشْکُرُوْا بِاللِّسَانِ نِعْمَتِیَ (یعنی میری نعمت کو دل میں محفوظ رکھو اور زبان سے شکریہ ادا کرو) کیونکہ نعمت اسمِ جنس بمعنے جمع ہے۔ ہر قسم کی نعمت پر اس کا اطلاق ہوگا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔

الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے نعمتوں کو ایسا بھلا دیا تھا کہ کبھی بھی اُن کے دل پر اس کا خیال نہیں گزرتا تھا۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ ادائیگیِ شکر میں تساہل کرتے تھے۔ نِعْمَةَ کو عَلَیْکُمْ سے اس لیے مقید کیا کہ انسان فطرۃً غیر تمند اور حاسد ہے جب کسی دوسرے کو نعمت سے مالا مال دیکھتا ہے تو اُسے غیرت اور حسد کفرانِ نعمت اور رنج و غصہ پر اُبھارتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے، اپنے سے زائد نعمت والے کو نہ دیکھو تاکہ تمہیں پریشانی نہ ہو اور نعمتِ الٰہی سے روحانی نسخے کی ناقدری نہ ہو کیونکہ جس نے اپنے اوپر نعمت کی وجہ سے دیکھا تو اُسے نعمت کی محبت رضامندی اور شکر کی ادائیگی پر اُبھارے گی۔

نکتہ ارباب معانی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نعمت کے ذکر کا حکم دیا اور اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کو ذکر نعمت سے علیحدہ کر کے صرف اپنے ذکر کا حکم دیا۔ کما قال:

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ۔ (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں)

اس میں نکتہ یہ ہے کہ دیگر اُمّتیں نعمت کو یاد کر کے منعم تک پہنچیں اور اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام خود ذات کو بلا واسطہ یاد کریں نعمت خود بخود حاضر ہوگی کیونکہ جب منعم ملا تو نعمت کہاں محجوب رہ سکے گی۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ یعنی میری نعمت کو پورا کرو اور اس عہد کا ایفاء کرو جو تم نے روزِ میثاق قبول کیا تھا۔

اور عہد عام ہے۔ تمام اوامر ایمان وطاعت اور نواہی ووصایا مراد ہیں۔ اس میں وہ عہد بھی شامل ہے جو یہود سے تورات میں حضرت سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے لیے لیا گیا۔

عہد بمعنے ہر گھڑی شے کی حفاظت ونگرانی کرنا۔ اس سے جمیع وعدے اور وصیتیں مراد ہیں۔ عَھْدِیْ مصدر ہے اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔

اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ میں تمہاری جزا کو مکمل کروں گا بہتر ثواب دے کر، اور اسے قبول کرکے تمہیں بہشت میں داخل کروں گا۔ عہد ـــ معاہد اور معاہَد دونوں کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر مفعول کی طرف مضاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دلائل قایم کرکے اور رسولوں کو بھیج کر اور کتابیں نازل کرکے ان سے ایمان وعمل صالح کا عہد لیا اور پھر ان سے ان کی نیکیوں پر ثواب دینے کا وعدہ کیا۔

مسئلہ: انسان سے اس وعدہ کا پہلا ایفا کلمۂ شہادت اور اس پر ایمان لانا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے تکمیل عہد یہ ہے کہ وہ ہمارے اموال اور جان کو محفوظ رکھے۔ اور ہمارا آخری عہد یہ ہے کہ ہم توحید میں ایسے مستغرق ہو جائیں کہ غیروں کی خبر تو بجائے مانند اپنے آپ کو بھی بھول جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے ایفائے عہد یہ ہے کہ وہ ہمیں دائمی لقا سے باریاب فرمائے۔ چنانچہ رسالہ قشیریہ میں ہے کہ:

اَوْفُوْا بِعَھْدِیْ فِیْ دَارِ الْحُجَّةِ، اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ فِیْ دَارِ الْقُرْبَةِ الخ

یعنی تم دارِ حجت میں میرے عہد کی پاسبانی کرو میں دار القربۃ میں تمہارے ساتھ ایفاءِ عہد کروں گا۔ یعنی وصال کے فرش پر کھڑا کرکے دائمی انس اور رؤیت سے مالا مال کروں گا اور زمانِ دنیا سے رب رب کہہ کر تم میرے عہد کی پاسداری کرو اور میں تمہیں عبد کہہ کر ایفاءِ عہد کروں گا۔

وَاِیَّایَ محذوف فعل کی وجہ سے منصوب ہے دراصل یوں تھا: وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْا۔ فَارْھَبُوْنِ اگر تم کسی سے ڈرتے ہو تو صرف مجھ سے ڈرو۔

الرھبۃ بمعنے خوف سے تحرز۔

مسئلہ: آیت میں وعدہ بھی ہے کما قال: اُوْفِ۔ اور وعید بھی، کما قال: وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ ج اور حکم بھی ہے کہ شکر کی ادائیگی اور ایفائے عہد واجب کیا گیا ہے۔

تنبیہ مومن کے لیے ضروری ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی سے نہ ڈرے۔ کیونکہ اِیَّایَ کی تقدیم از فعل حصر کا معنیٰ ثابت ہو رہا ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ جسے میں نے نازل کیا اے بنی اسرائیل! تم اس پر ایمان لاؤ۔

سوال: جب اَوْفُوْا میں ہر شے مندرج تھی تو اب قرآن کو علیحدہ ذکر کرکے ایمان لانے کا حکم کیوں دے رہے ہیں؟

جواب : ایفائے عہد میں یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ یعنی ایمان لاؤ اس قرآن پر جسے میں نے سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ قرآن پاک کی یہ شان ہے کہ وہ تمہاری توراۃ کی بھی تصدیق کرتا ہے۔ کیونکہ یہ اسی کے موافق نازل ہوا ہے کہ جس طرح تمہاری کتاب میں اس کا ذکر ہے۔ انزلت علیکم مصدقا لما معکم اسی لیے مقید کیا گیا تاکہ حکم کی فرمانبرداری کے وجوب کی تاکید ہو جائے کیونکہ جس پر ان کا ایمان ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو شے اس کی تصدیق کرے اس پر بھی ایمان لانا واجب ہے وَلَا تَكُونُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ یعنی سب سے پہلے قرآن کے ساتھ تم کافر نہ بنو کیونکہ مقتدی کا گناہ پہلے اس پر ہوتا ہے جس نے اس عمل کی بنیا د رکھی۔ مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

ہر کہ بنہد سنتِ بد اے فتا
تا در افتد او خلق از عما
جمع گردد برُوے آں جملہ بزہ
کاہ سرے بود ست و ایشاں دم غزہ

ترجمہ : اے عزیز! جو بُرے طریقے کی بنیا د رکھتا ہے اس خیال پر کہ لوگ بھولے سے بھٹکیں، تو تمام گناہ پہلے اس کے نامۂ اعمال میں لکھے جائیں گے کیوں کہ یہ ان کی اصل ہے اور دوسرے اس کی شاخیں۔

یعنی تم کفر کرنے میں سبقت نہ کرو۔ کیونکہ تمہارا عمل تو یوں ہونا چاہیے کہ تم اس کے سب سے پہلے ایمان لانے والے ہو، کیونکہ تم اس کی حقیقت اور اس کی شان اپنی کتابوں سے پڑھ سُن کر خوب جانتے ہو۔ جیسے تم اپنی اولاد کو جانتے ہو۔ اس سے قبل اس کی بدولت تم فتح طلب کرتے رہے اور اس کی آمد کے منتظر تھے۔ پس اب اپنی متوقع امید کو ضائع نہ کرو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو سب سے پہلے ان کی تکذیب کرنے والے مدینہ کے یہودی تھے، پھر بنو قریظہ اور بنو نضیر، پھر خیبر والے۔ پھر ان کے تابع ہو کر تمام یہود نے تکذیب کی۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ اپنے نفسوں کے لیے میری آیات کے بدلے ثَمَنًا قَلِيْلًا تھوڑا ثمن نہ لو۔ ثمن قلیل سے دنیوی لذتیں مراد ہیں کیونکہ اگرچہ یہ کتنی ہی بڑی ہوں لیکن وہ نعمتیں جو ایمان کی بدولت انھیں ملیں گی اور یہ چھوڑ بیٹھے۔ ان کی نسبت دنیوی نعمتیں نہایت قلیل اور بالکل لاشئے ہیں۔

ف : عام یہود اپنے احبار علماء کو کھیتوں کے پھلوں سے کچھ دیتے تھے اور انہیں ہدایا بھیجتے اور رشوتیں دیتے تاکہ وہ کتاب کے معانی کی تحریف کریں اور ایسے آسان مسائل تیار کریں جو بالکل نرم نرم ہوں۔ اسی طرح شاہانِ وقت بھی انھیں بہت کچھ دیتے تاکہ وہ حق کو چھپائیں اور کلمات کی تحریف کر ڈالیں۔ احبار کی معاش کا چونکہ صرف یہی ایک ذریعہ تھا انہیں

خطرہ لاحق ہُوا کہ ہم حق ظاہر کردیں گے۔ یعنی سیدنا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لا کر اُن کی تابعداری قبول کریں تو ہماری شان و شوکت اور دنیا و دولت ہاتھ سے نکل جائے گی اگرچہ توراۃ میں آپ کی صفت اور صدق کا ذکر بھی تھا لیکن محروم رہے اور ہمیشہ کتاب توراۃ میں تبدیلیاں کرتے رہے۔

شانِ نزول کعب بن اشرف نے ایک دن احبار یہود کو کہا کہ تم لوگ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کیا جانتے ہو؟ انہوں نے کہا: وہ تو نبی ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ کعب بن اشرف نے کہا: تمہارا وہ انعام اور صلہ جو مجھ سے ملتا تھا آج سے ختم۔ اگر اس کے خلاف ثابت کر دو تو پھر تمہارا انعام وصلہ بدستور جاری رہے گا۔ بعض اہلِ کتاب عذر کرتے ہوئے جواب دیتے کہ چونکہ انہوں نے ہمیں بلا سوچے سمجھے جواب دیا ہے ہمیں تھوڑی سی مہلت دے دو ہم تورات کو دیکھ کر جواب دیں گے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کعب بن اشرف کو تورات دکھائی جہاں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت شریف لکھی تھی وہاں دجال کی تعریف لکھ دی پھر کعب بن اشرف کو سُنائی۔ کعب بن اشرف نے ہر ایک کو ایک صاع جَو اور چار گز کپڑا عطیہ دیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثمناً قلیلاً۔

مولانا رُوم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، ؎

بود در انجیل نامِ مصطفٰے
آں سرِ پیغمبراں بحرِ صفا
بود ذکر حلیہا و شکل او
بود ذکر غز و صوم و اکل او

ترجمہ: انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی تھا وہ بحرِ صفا اور سرتاجِ رسل ہیں۔ آپ کا حلیہ اور شکل مذکور تھی آپ کا کھانا پینا اور روزہ وغیرہ مندرج تھا۔

وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنَ ۝ مجھ سے ڈرو ایمان لا کر اور حق کی تابعداری کرکے اور دُنیوی طمع سے روگردانی کرکے۔

سوال: فارھبون اور فاتقون دونوں تقریباً ہم معنیٰ ہیں پھر تکرار کا کیا فائدہ؟

جواب: فارھبون کا معنیٰ ہے مجھ سے ڈرو ایفائے عہد کے بارے میں۔ اور فاتقون کا معنیٰ ہے کہ مجھ سے ڈرو نعتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چھپانے کی وجہ سے۔ یا پہلے کا حکم عام تھا۔ ہر ایک مقلد اور عالم کو وہاں رھبت کا حکم دیا گیا کہ سلوک کی یہ پہلی منزل ہے اور دوسرے میں صرف علماء مطلوب ہیں کہ ان کو تقویٰ کا حکم ہوا جو آخری مرحلہ ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ اس کا ماقبل پر عطف ہے۔ اللّبس بالفتح، بمعنے ملانا۔ یعنی وہ حق جو منزل من اللہ ہے اس کو باطل سے غلط ملط نہ کرو، جو تم خود بناتے ہو۔ یہاں تک کہ ان میں ایک دوسرے کی تمیز بھی نہ ہو سکے۔ یا یہ معنیٰ ہے کہ حق میں التباس نہ کرو۔ اس باطل کے خلط سے جسے تم حق کے درمیان لکھتے ہو یا تاویل کرکے اسے بیان کرتے ہو

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ یہاں پر لا مقدر ہے یا اَن مقدر کی وجہ سے منصوب ہے اور واؤ بمعنے جمع کے ہے۔ اب معنیٰ یُوں ہوا کہ لَا تجتمعوا لبس الحق بالباطل وکتمانہ۔ (حق کو باطل سے مِلا چُھپا کر جمع نہ کرو)

لا تلبسوا تغیّر سے نہی کی گئی ہے اور تکتموا الحق میں کتمانِ حق سے نہی کی گئی۔ کیونکہ وُہ کہتے تھے کہ تورات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت ہمیں نہیں ملی۔ اس سے معلوم ہوا کہ لبس اور ہے اور کتمان اور۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ یعنی تمہارا حال یہ ہے کہ تم جانتے بھی ہو کہ تم حق میں ملاوٹ کر رہے ہو اور اسے چھپا رہے ہو یا یہ کہ تم جانتے بھی ہو کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم برحق نبی ہیں۔ حال کا لانا منتہیٰ کی تقیید کے لیے ہے بلکہ ان کے حال کی قباحت میں اضافہ مطلوب ہے کیونکہ جاہل کبھی معذور ہوتا ہے۔

ف: تیسیر میں ہے کہ یہ خطاب تمام مسلمانوں اور ان کی ہر صنف کو ہے۔ گویا یُوں حکم ہے کہ اے شاہانِ وقت! عدل کو جور سے، اور اے قاضیان! حکم کو رشوت سے نہ ملاؤ۔ اسی طرح ہر فریق کو سمجھتے جاؤ۔ اور اگر یہ خطاب صرف بنی اسرائیل کو ہو تو یہ حکم اس کو بھی شامل ہو گا جو ان جیسا عمل کرتے ہوں۔ مثلاً جو حق کی تغییر اور ابطال کے لیے رقم لیتا ہے یا جو کچھ اس پر علم سکھانا واجب ہے، پڑھانے سے رک جاتا ہے یا علم کے باوجود عمل نہیں کرتا۔ سب پر یہی حکم صادر ہوگا۔

حدیث شریف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا لَا یَبْتَغِیْ بِہٖ وَجْہَ اللّٰہِ لَا یَتَعَلَّمُہٗ اِلَّا یُصِیْبَ بِہٖ غَرَضًا مِّنَ الدُّنْیَا لَمْ یَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّۃِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔

(جو شخص علم حاصل کرتا ہے اس میں رضائے الٰہی مقصود نہیں محض دنیا مطلوب ہے تو قیامت میں اسے بہشت کے بالاخانے نصیب نہیں ہوں گے)

تنبیہ جس نے اللہ تعالیٰ سے ڈر کر تقویٰ کرتے ہوئے اپنے علم کا عوض نہ لیا اور نہ ہی وصیت و نصیحت سے کچھ طمع رکھی بلکہ حق کو ظاہر کرنے میں اُسے دکھ و تکلیف بھی آئی تو صبر سے برداشت کی تو وہ اس زمرہ میں داخل ہوگا جن کو نہ خوف ہے نہ غم یعنی اولیاء کے گروہ میں۔

حدیث شریف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یَمْنَعَنَّ اَحَدُکُمْ ھَیْبَۃُ اَحَدٍ اَنْ یَّقُوْلَ اَوْ یَقُوْمَ بِالْحَقِّ حَیْثُ کَانَ۔

(مجھے کسی کی ہیبت حق بات کہنے سے نہیں روکتی خواہ وہ کیسے ہی ہوں)

قرآن پاک میں ہے:

یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ۔

اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور وہ ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتے

ابُوحازم کی حق گوئی

سلیمان بن عبد الملک مکہ مکرمہ جا رہا تھا۔ راستہ میں مدینہ طیبہ چند روز قیام پذیر ہوا تو لوگوں سے پُوچھا: کوئی ایسا آدمی بھی زندہ ہے جسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل ہو۔ لوگوں نے کہا، حضرت ابوحازم رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن کی خدمت میں کسی کو بھیج کر اپنے ہاں بلایا۔ حضرت ابُو حازم تشریف لائے تو خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نے اُن سے کہا کہ اہلِ مدینہ کے بڑے بڑے لوگ میرے ملنے کے لیے آئے آپ کیوں تشریف نہ لائے۔ آپ نے فرمایا: اس سے قبل نہ آپ مجھ سے متعارف ہیں اور نہ ہی میں آپ کو جانتا ہُوں۔ سلیمان نے ساتھ بیٹھے ہوئے محمد بن شہاب زہری کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا: واقعی یہ شیخ سچ فرماتے ہیں۔ اب سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوگیا:

سلیمان: اے ابوحازم! کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو مکروہ سمجھتے ہیں؟

ابُوحازم: اس لیے کہ تم نے آخرت کو خراب کر ڈالا اور دنیا کی تعمیر میں لگے رہے۔ اب تمہیں یہ بات شاق گزرتی ہے کہ آبادی کو چھوڑ کر ویران جگہ چلے جاؤ۔

سلیمان: اے ابوحازم! تُو نے ٹھیک فرمایا اب بتائیے کل اللہ تعالیٰ سے کیسے ملاقات ہوگی۔

ابُوحازم: اگر نیک ہے تو ایسے آئے گا جیسے کوئی گھر سے باہر چلا جائے۔ پھر جب واپسی ہوتی ہے تو اہل وعیال میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اگر بُرا ہے تو ایسے ہوگا جیسے بھاگا ہُوا نوکر اپنے آقا کے ہاں لوٹ آئے۔

سلیمان رو پڑا اور کہا نامعلوم ہمارا اللہ تعالیٰ کے ہاں کیسے معاملہ ہوگا؟

ابوحازم: اپنے اعمال کتاب اللہ کے موافق بنانے کی کوشش کرو۔

سلیمان: آخرت میں مجھ سے کون اچھا ہے؟

ابوحازم: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ سِجِّیْنٍ (ابرار بہشت کی نعمتوں میں ہوں گے اور فجار سجّین میں)

سلیمان: اے ابوحازم! اللہ تعالیٰ کی رحمت کہاں؟

ابوحازم: اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (اللہ تعالیٰ کی رحمت محسنین کے قریب ہے)

سلیمان: اے ابوحازم! اللہ تعالیٰ کے ہاں کون سا بندہ مکرم ترین ہے؟

ابوحازم: مروّہ اور عقل والے۔

سلیمان: کون سا عمل افضل ہے؟

ابوحازم: فرائض کی ادائیگی اور محارم سے اجتناب۔

سلیمان، کون سی دُعا زیادہ مستجاب ہے؟

ابوحازم: محسن الیہ کی دعا محسن کے لیے۔

سلیمان : کون سا صدقہ افضل ہے ؟
ابوحازم : تنگدست فقیر اور بڑی سخت تنگی والے کو صدقہ دے کر منت اور احسان نہ جتانا اور نہ ہی اسے ایذا دینا۔
سلیمان : کون سا قول اچھا ہے ؟
ابوحازم : جس سے تُو ڈرتا ہے یا جس سے کوئی امید وابستہ ہے۔
سلیمان : اللہ تعالیٰ کے ہاں کون سا مومن اعلیٰ مرتبے والا ہے ؟
ابوحازم : وُہ مرد جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دے۔
سلیمان : کون سا مومن احمق ہے ؟
ابوحازم : وُہ شخص جو خواہشاتِ نفسانیہ پر ٹوٹ پڑے حالانکہ وہ ظالم ہے یہ ایسا احمق ہے کہ غیر کی خاطر اپنی آخرت کو دنیا کے عوض بیچ رہا ہے۔
سلیمان : بہت خوب ! لیکن یہ فرمائیے ہم کیسے ہیں ؟
ابوحازم : اے امیرالمومنین ! مجھے اس کے متعلق معاف فرمائیے۔
سلیمان : نہیں، ضرور بتانا پڑے گا۔ یہ ایک نصیحت ہوگی جو مجھے آپ کی طرف سے حاصل ہوگی۔
ابوحازم : اے امیرالمومنین ! تمہارے آبأ نے لوگوں پر تلوار کے ساتھ جبر و تشدد کیا اور لوگوں کے مشورے کے بغیر ظلماً یہ ملک چھینا یہاں تک کہ بہت بڑی خُوں ریزیاں ہُوئیں اور آخر کار لوگ اپنا ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش ! تجھے وہ کلمات معلوم ہوتے جو لوگوں نے تیرے آبأ کے متعلق کہے۔
ایک ہم نشین نے کہا : اے ابوحازم ! تُو نے غلط بیانی کی۔
ابوحازم نے فرمایا : کیوں جھُوٹ بول رہے ہو، علماٗ سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ لیا کہ وہ لوگوں کو حق کی بات بتائیں اور حق ہرگز نہ چھپائیں۔
سلیمان : اب ہم اپنی اصلاح کس طرح کریں ؟
ابوحازم : لوگوں کو بلا کر مروۃ سے کام لو اور ہر ایک کا حصہ برابر تقسیم کردو۔
سلیمان : ہم مال کہاں سے حاصل کریں ؟
ابوحازم : حلال مال کما کر اس کے اہل کو دو۔
سلیمان : اے ابوحازم ! چند روز ہمارے ہاں قیام فرمائیے تاکہ ہم آپ سے نصیحت حاصل کریں۔
ابوحازم : پناہ بخدا ! یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں ڈرتا ہُوں کہ مجھ سے کوئی ایسا عمل ہوجائے کہ جس سے مجھے دنیا و آخرت کی رسوائی اٹھانی پڑے۔

سلیمان : کم ازکم اپنی ضروریات تو بتا دیجئے تاکہ ہم آپ کی امداد کریں ۔
ابوحازم : مجھے جہنم سے نجات دلاکر بہشت میں داخل کرا دیجئے ۔
سلیمان : سُبحان اللہ ! مجھ سا اس کام کو کب کرسکتا ہے !
ابوحازم : میری تو یہی حاجت ہے ۔
سلیمان : اچھا، میرے لیے کوئی دعا فرمایئے ۔
ابوحازم : یا اللہ ! اگر سلیمان تیرا دوست ہے تو اس کی دنیا و آخرت کی بھلائی میں آسانی فرما۔ اگر تیرا دشمن ہے تو اسے تو پکڑ جیسا تو چاہے ۔
سلیمان : کچھ نصیحت بھی فرمایئے ۔
ابوحازم : اگر تو اہل ہے تو میں تجھے بہت کچھ کہہ چکا اور اگر تُو نا اہل ہے تو پھر اب میری کمان میں تیر نہیں ۔ یعنی اتنا ہی کافی ہے ۔
سلیمان : مجھے کچھ نصیحت فرمایئے ۔
ابوحازم : میں تجھے یہ وصیت کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ کو بہت بڑی ذات سمجھنا اور جس عمل کا اس نے تجھے حکم دیا ہے اُس کی ادائیگی میں کوشش کرنا اور جس سے تجھے روکا ہے اس سے بچتے رہنا۔ جب ابوحازم گھر جانے لگے تو سلیمان نے سو دینار روانہ کرکے لکھا کہ اسے خرچ کرو، اور اتنا اور بھی آپ کا میرے پاس باقی ہے ۔

ابوحازم نے وہ رقم لوٹا کر لکھا کہ اے امیرالمومنین ! میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں ۔ کیا تیرے وہ سوالات مسخری کے طور پر تھے اور یہ رقم واپس ہے میں اسے نہیں لینا چاہتا ۔ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنّت ادا کی ہے ۔

شعیبؑ و موسیٰؑ کی ملاقات کا ایک واقعہ

جب موسیٰ علیہ السلام مدین میں تشریف لے گئے تو وہاں چرواہوں کو پانی کھینچتا ہُوا پایا۔ ادھر دیکھا تو دو لڑکیاں بھی پانی کھینچنا چاہتی تھیں تو آپ نے ان کو کنوئیں سے پانی نکال دیا۔ آپ نے ان سے پوچھا : تم نے پانی پہلے کیوں نہیں لیا۔ انہوں نے کہا : جب تک یہ لوگ فارغ نہ ہوتے ہم پانی نہیں نکال سکتیں ۔ ہمارا باپ (شعیب) بوڑھا ہے ۔
موسیٰ علیہ السلام نے پانی بھر کر سایہ کے نیچے بیٹھ کر کہا : "یا اللہ ! تُو نے مجھے فقر و فقیری میں ہی رکھا ۔" آپ نے یہ اس لیے کہا کہ آپ بھُوکے تھے اور خوف زدہ بھی ۔ اور اطمینان بھی نہیں تھا۔ اسی لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا اور لوگوں سے کچھ نہ مانگا ۔ چرواہوں نے تو کچھ نہ سمجھا لیکن وُہ لڑکیاں بھانپ گئیں ۔ باپ کے پاس جاکر سارا ماجرا سنایا اور وہ الفاظ بھی سنائے ۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا : تم میں سے ایک جائے اور اسے بلا لائے ۔ جب وُہ لڑکی موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچی تو منہ چھپائے ہوئے کہا کہ میرا باپ آپ کو بلا رہا ہے تاکہ آپ کو وُہ مزدوری دیں

جو آپ نے ہمیں پانی بھر کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات ناگوار گزری۔ لیکن جانے کے سوا کوئی چارہ بھی تھا۔ کیونکہ وہ پہاڑی علاقہ تھا اور ویسے بھی آپ خوف زدہ تھے۔ جب چل پڑے تو تیز ہوا چلنے لگی۔ راستہ بتانے کے لیے وہ لڑکی آگے آگے چل دی، ہوا کے جھونکوں سے لڑکی کا کپڑا ادھر ادھر ہوتا تو اس کی رانیں دکھائی دینے لگتیں (اس لڑکی کی رانیں بھی کچھ موٹی تھیں) موسیٰ علیہ السلام نامحرم عورت کو دیکھنا گوارا نہ کرتے اس لیے کبھی اپنا منہ چھپا لیتے اور کبھی کھول لیتے۔ آخر رہا نہ گیا آپ نے کہا، اے اللہ کی بندی! مجھے آگے چلنے دے اور تُو مجھے راستہ بتاتی چل۔ بالآخر حضرت شعیبؑ کی خدمت میں وہ دونوں پہنچ گئے۔ حضرت شعیب اس وقت شام کا کھانا کھانے کے لیے تیار بیٹھے تھے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر فرمایا: اے بیٹے! بیٹھئے اور طعام کھائیے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں آپ کا طعام نہیں کھاؤں گا۔ شعیب علیہ السلام نے فرمایا، آپ بھوکے تو ہیں ہی، پھر کھاتے کیوں نہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "مجھے خطرہ ہے کہ جو کام میں نے فی سبیل اللہ کیا، کہیں یہ کھانا اس کا عوض نہ ہو جائے، کیونکہ میں اس قبیلہ سے ہوں کہ اپنے دین کے کسی عمل کو بیچتے نہیں اگرچہ اس کے عوض دنیا کے برابر سونا ملے۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا کہ میں بھی تمہیں اس کا عوض نہیں دے رہا، بلکہ میری اور میرے آباء کی عادت ہے کہ ہم مہمان نوازی کرتے ہیں اور بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے بیٹھ کر طعام تناول فرمایا۔

ف: اس حکایت کے بعد ابوحازمؓ نے فرمایا کہ اگر یہ سَو دینار میرے اس کلام اور نصیحت کی بدولت ہیں تو مجبوری کے وقت خنزیر اور مردار اور دم مسفوح کھا پی لینا اس سے زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر بیت المال سے مجھے یہ حق مل رہا ہے تو میرے جیسے اور بہت آپ کو مل جائیں گے انھیں دے دیجئے۔ لیکن یاد رکھیے مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

سبق: امام قرطبی نے اس حکایت کو نقل کر کے فرمایا اسی کا نام ہے اقتدا بالکتاب والسنۃ۔

مسئلہ: علماء کا اختلاف ہے کہ کیا تعلیم قرآن اور علم پر اُجرت لینا اس آیت کی رُو سے جرم و گناہ ہے یا نہیں۔ آج کل کے زمانے میں تعلیم قرآن اور فقہ پر اُجرت لینا جائز ہے تاکہ تعلیم و دیگر امورِ خیر ضائع نہ ہو جائیں۔

حدیث شریف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللهِ۔

یعنی جس عمل کی تم مزدوری لیتے ہو ان میں سب سے زیادہ حق قرآن کریم کی تعلیم پر ہے۔

مسئلہ: آیت کی وعید اس شخص کے لیے ہے جو اس پر تعین کرے یہاں تک کہ جب تک اسے کچھ نہ ملے تو وہ تعلیم دینا چھوڑ دے۔ اور وہ شخص جو اس پر تعین نہیں کرتا اس کے لیے اُجرت لینا اس مذکور حدیث کے مطابق جائز ہے جیسے غسال (مردہ نہلانے والا) کہ وہاں پر سوائے اس کے غسل نہیں دے سکتا۔ جیسے گاؤں اور دُور افتادہ علاقوں میں ہوتا ہے تو اس کے لیے اُجرت لینا جائز ہے کیونکہ وہاں پر سوائے اس کے اور کوئی نہیں۔ اگر اس کے سوا اور بھی موجود ہوں، جیسے عام شہروں میں ہوتا ہے تو پھر بھی اسے اُجرت لینا جائز ہے لیکن تعین نہ کرے۔ اس وقت اگر

غسل نہ دے تب بھی گنہگار ہوگا۔

مسئلہ: اگر اس کی وجہِ معاش سوائے اس عمل کے اور کوئی نہیں تو اُسے تعلیم پر اُجرت مقرر نہیں کرنی چاہئے بلکہ کسی اور صنعت و حرفت کو اجرت کے لیے متعین کرے، اور امام (حاکمِ وقت) کے لیے لازم ہے کہ اس کا کوئی وظیفہ مقرر کرے ورنہ عام مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کا وظیفہ مقرر کریں۔ کیونکہ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت سپرد ہوئی تو آپ کے لیے وجہِ معاش کے لیے کچھ بھی نہ تھا کہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کریں تو آپ اپنا کپڑا بازار میں بیچنے کے لیے جا رہے تھے۔ لوگوں نے کہا: اس طرح کیوں؟ آپ نے فرمایا: تو پھر میں کہاں سے خرچ کروں؟ لوگوں نے کہا: واپس جائیے ہم اس کا انتظام کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے مِل جُل کر آپ کی معاش متعین کر دی۔

مسئلہ: اسی طرح امام اور مؤذن وغیرہما کا حکم ہے کہ وہ اُجرت اسی طور سے لے سکتے ہیں۔

مسئلہ: قرآن پاک کی بیع و فروخت جائز ہے اس لیے کہ یہ بیع اوراق اور کتابت کی اُجرت ہے نہ کہ اصل قرآن کی۔

مسئلہ: ہمارے زمانہ میں بعض مسائل کے لیے جواز کی صورت پیدا کرنی پڑی، کیونکہ زمان کے تغیر سے مسائل بھی متغیر ہو جاتے ہیں تاکہ علم اور دین نہ مٹ جائے۔ اُن مسائل میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ علماء کا سلاطین کی ملازمت اختیار کرنا۔

۲۔ گاؤں میں جا کر اپنی معاش کا سبب تلاش کرنا۔

۳۔ تعلیمِ قرآن اور اذان و امامت کی اُجرت لینا۔

۴۔ عزل حرۃ اس کے اذن کے بغیر۔

۵۔ شرابیوں وغیرہ کو السلام علیکم کہنا۔

ف: ان کے لیے جواز کا فتویٰ دیا گیا تاکہ ضرر و نقصان کے وقوع سے حفاظت ہو جائے (کذا فی نصاب الاحتساب)۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں، ؎

۱ عاشقاں را شادمانی و غم اوست
دست مزد و اجرت خدمت ہم اوست

۲ غیر معشوق از تماشائی بود
عشق نبود ہرزہ سرائی بود

۳ عشق آں شعلہ است کہ چوں بر فروخت
ہر کہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے۔ یعنی اسے قبول کرو اور اس کی فرضیت کا اعتقاد رکھتے ہوئے اس کو شرائط و حدود کے ساتھ مسلمانوں کی طرح ادا کرو۔ کیونکہ اس کے سوا نماز نامقبول ہے۔ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ مسلمانوں کی طرح زکٰوۃ ادا کرو۔ کیونکہ اس کے سوا زکٰوۃ ناقابلِ قبول ہے۔

ف: نفس کو کرم کے ثمرہ سے حصہ مل جائے یا زکٰوۃ بمعنی طہارت ہے، کیونکہ یہ مال کو خبث سے اور نفس کو بخل سے پاک کرتی ہے۔

مسئلہ: کفار ان اوامر کے مخاطب نہیں جو سقوط کا احتمال رکھتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ وغیرہ اور عند الاحناف ان کے ترک سے ان کو سزا نہیں ملے گی۔ ان پر ان کا مکلف ہونا عند الحنفیہ اعتقاد اور قبول کی وجہ سے ہے۔

وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ○ نماز با جماعت ادا کرو۔

مسئلہ: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے ستائیس درجے زیادہ ثواب رکھتا ہے۔

نکتہ: کیونکہ جماعت میں نفوس قدسیہ کا تعاون ہوتا ہے۔

نکتہ: نماز جنگ کی طرح ہے اسی لیے اس کے لیے محراب ہوتا ہے۔ بمعنے محل حرب۔ اور جنگ میں ضروری ہوتا ہے کہ وہاں جماعت کی صفیں ہوں۔

نکتہ: جماعت میں قوت ہے۔

حدیث شریف میں ہے: حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
مَا اجْتَمَعَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ فِیْ جَمَاعَۃٍ اَرْبَعُوْنَ رَجُلًا اِلَّا وَفِیْھِمْ رَجُلٌ مَّغْفُوْرٌ لَہٗ فَاللّٰہُ تَعَالٰی اَکْرَمُ مِنْ اَنْ یَّغْفِرَ لَہٗ۔

(جہاں بھی مسلمانوں کی جماعت کے چالیس آدمی جمع ہوں گے وہاں اُن میں سے ایک ضرور بخشا ہوا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے شان میں نہیں ہے کہ اُسے تو بخش دے اور باقیوں کو محروم و خاسر لوٹا دے۔

نکتہ: نماز با جماعت کو تنہا پڑھنے سے ستائیس درجے اس لیے فضیلت دی گئی کہ جماعت جمع سے ماخوذ ہے اور جمع کو کم از کم تین پر اطلاق ضرور ہوتا ہے۔ تنہا نماز پڑھنے سے دس نیکیاں ضرور ملتی ہیں۔ ان دسوں میں ایک اصل نیکی اور باقی نو (۹) فضل کریم سے عطا ہوئیں۔ جب یہ تضعیفات آپس میں جمع ہوں گے تو ستائیس ہو جائیں گے۔

مسئلہ: امام قرطبی فرماتے ہیں کہ جو شخص با جماعت نماز کے ترک کی ہمیشگی اختیار کرے اور عذر بھی نہ ہو تو اسے سزا دینی چاہیے۔

حکایت حضرت ابو سلیمان درانی فرماتے ہیں: مجھے چالیس سال گزر گئے مجھے کبھی احتلام نہ ہوا۔ ایک روز میں مکہ مکرمہ میں پہنچا تو وہاں مجھ سے حدث واقع ہوئی۔ اب تو یوں ہوا کہ ہر شب احتلام میں مبتلا ہو جاتا۔ اور حدث کا

موجب یہ ہُوا کہ اُن سے عشاء کی نماز باجماعت ادا نہ ہو سکی۔

حدیث شریف میں ہے کہ:

مَا افْتَرَضَ اللّٰہُ عَلٰی خَلْقِہٖ بَعْدَ التَّوْحِیْدِ فَرْضاً اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنَ الصَّلٰوۃِ وَلَوْ کَانَ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنَ الصَّلٰوۃِ لِتَعَبَّدُ بِہٖ مَلٰئِکَتُہٗ فَمِنْھُمْ رَاکِعٌ وَسَاجِدٌ وَقَائِمٌ۔

(اللہ تعالیٰ نے توحید کی سب سے زیادہ محبوب عبادت اپنے بندوں کو نماز عنایت فرمائی۔ اور اگر کوئی اور عبادت زیادہ محبوب ہوتی تو ملائکہ کو اسی عبادت کا حکم ہوتا۔ لیکن فرشتے بعض رکوع میں تھے اور بعض سجدہ میں اور بعض قیام میں)۔

تنبیہ نمازیوں کے لیے ضروری ہے کہ نماز کو حضورِ قلب سے ادا کریں۔ سلف صالحین کا طریقہ یہ تھا کہ نماز میں اگر مال کا خیال آجاتا تو اس مال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیتے تاکہ حضورِ قلب کی فوتیدگی کا کفارہ ہو جائے۔ کیونکہ اصلی عبادت عمل باطن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی۔[1]

(یعنی جب تم (حبِ دنیا کے) نشہ میں یا کسی خیال میں مبتلا ہو جاؤ تو نماز کے قریب[2] نہ جاؤ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف اس نمازی کو دیکھتا ہے جو حضورِ قلب سے نماز ادا کر رہا ہو۔ اسی لیے ضروری ہے کہ نماز میں کوئی خطرہ نہ آئے۔

حضرت مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

اوّل اے جان دفع شرِ موش کن
وانگہ در جمع گندم کوشش کن

بشنو از اخبار آں صدر الصدور
لَاصَلٰوۃَ تَمَّ اِلَّا بِالْحُضُوْرِ

---

[1] یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی ..... کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ (پ۵ ۔ المحصنٰت النساء ۴۳)
(ایمان والو! نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ جب تک اتنی ہوش نہ ہو کہ جو کہو اسے سمجھو اور ناپاکی کی حالت میں نہائے مگر مسافری میں اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا یا تم نے عورتوں کو چھوا اور پانی نہ پایا تو پاک مٹی سے تیمم کرو تو اپنے منہ اور ہاتھوں کو مسح کرو بے شک اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے)

[2] قارئین حضرات اس کو ترجمہ قرآن کی تحریف خیال نہ فرماویں حب دنیا بھی نشہ آور چیز ہے۔ یہ ترجمہ صوفیانہ ہے۔ (مترجم)

ترجمہ: اے عزیز! پہلے اپنے آپ سے چوہے کے شر کو دفع کر، پھر گندم جمع کرنے کی کوشش کر۔ حضور علیہ السلام کی حدیث سن۔ آپ نے فرمایا کہ نماز حضورِ قلب کے بغیر نہیں ہوتی۔

نصیحت حضرت الشیخ الشہیر بافتادہ آفندی اپنے وصایا شریف میں عارف ھدائی قدس سرہما کو فرماتے ہیں کہ جب تم نماز میں شاغل ہو تو اس میں تمہیں اظہارِ عبودیت و تتمیم کے سوا کوئی فکر نہ آئے کیونکہ جب عبودیت مکمل ہوتی ہے تو مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ نماز کے بعد اس ملاحظہ و مراقبہ میں گزارو کہ میں نہیں ہوں بلکہ وہ ذاتِ حق موجود ہے اور بس۔ توحید سے بھی یہی مقصود ہے اور توحید سے کوئی اور عبادت اعلیٰ نہیں۔ اسی لیے بندے کو اولاً اسی کا مکلف بنایا گیا۔ اس کے بعد نماز پھر روزہ، کیونکہ ان دونوں میں نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ ان کے بعد زکوٰۃ کا حکم دیا۔ اس سے بخل کو دور کرنے پر نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس کے بعد حج پر مامور ہوا۔ اس میں من وجہ مال خرچ کرنا ہے۔ پہلی تین عبادتوں کو اس لیے مقدم کیا گیا کہ ان میں اغنیاء و فقراء سب برابر ہیں۔ اور باقی دو عبادتوں سے فقراء مستثنیٰ ہیں۔ اگرچہ اغنیاء کے گھر جواہر سے پر ہوتے ہیں تو فقراء کے بطون بھی نور سے معمور ہیں۔ یہاں تک کہ یوم آخرت اغنیاء تمنا کریں گے کہ کاش! ہم بھی فقراء ہوتے۔

مثنوی شریف میں ہے ؎

۱۔ مکرہا در کسب دنیا بارد است
مکرہا در ترک دنیا وارد است

۲۔ چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش نقرہ و فرزند و زن

۳۔ کوزۂ سربستہ اندر آب رفت
از دل پرباد فوق آب رفت

۴۔ باد درویشی چوں در باطن بود!
بر سرِ آبِ جہاں ساکن بود

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ یعنے نماز قائم کرو۔ مراقبہ قلوب و ملازمت خشوع و خضوع کے ساتھ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ ادا کرو یعنے نفس کو حرص امور دنیویہ اور اخلاق ذمیمہ سے پورے طور پاک و صاف کرو۔ اور دل کو اعمالِ سیئہ اور مطالبۂ ماسوی اللہ سے پاک کرو، کیونکہ حق کی طلب میں تعدی ہے اور تعدی کمال کے لیے نقصان دہ ہے۔ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ یعنے انکسار اور نفی وجود میں ان لوگوں کی اقتدا کرو جو منکسر حال اور موجود کی طلب میں اپنے وجود کو نیست و نابود

ترجمہ: (۱) دنیوی کاروبار میں دھوکہ نقصان ہے۔ ترک دنیا کے لیے ہی احکام وارد ہیں (۲) دنیا کیا ہے خدا سے غافل ہونا نہ مشاغل ہیں نہ دولت ہیں نہ فرزندوں کی مشغولی میں۔ (۳) کوزہ سربستہ پانی یعنے گیا دل برباد کر کے پانی کے اوپر خالی ہاتھ تیرتا نظر آیا۔ (۴) درویشی کی ہوا باطن میں ہے پانی کے اوپر ہی جہاں ساکن ہے۔

کرنے والے ہیں۔

تفسیر عالمانہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ، یہ خطاب یہودیوں کو ہے۔ الامر بمعنے آپ سے کم درجہ والے کہنا (افعل) یہ کام کرو۔ الناس سے یہودیوں کے کم طبقہ کے لوگ مراد ہیں۔ بِالْبِرِّ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا اعتراف اور اولہ نبوت کی پیروی بِرٌّ بمعنے خیر میں توسیع اور دراصل برّ واسع فضا کو کہتے ہیں۔ ہمزہ استفہامیہ تقریر مع توبیخ و تعجیب کے لیے ہے۔ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ یعنے اپنے نفسوں کو نیکی سے دور رکھتے ہو، گویا تمھیں یاد بھی نہیں۔

سہو و نسیان میں فرق نسیان اور سہو ہر دونوں بمعنے ترک مستعمل ہوتے ہیں لیکن جو چیز پہلے معلوم ہو پھر کسی عارضہ سے اس کی طرف توجہ نہ ہو اسے سہو کہتے ہیں۔ اور نسیان وہ ہے کہ اسے ذہن میں لائے لیکن بوجہ ضعف حافظہ ذہن میں اتر نہ سکے۔

شانِ نزول احبار ان فقراء کو کہا کرتے کہ جن سے انھیں نفع کی قطعاً امید نہ تھی کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایمان لاؤ، کیونکہ یہ وہی برحق نبی ہیں اور دولت مندوں کو کہتے کہ ان میں آخر الزمان نبی کی علامات تو پائی جاتی ہیں۔ اور بعض نہیں ہیں۔ فلہٰذا ان بعض کا انتظار کرلو اور خود بالکل دور رہتے، حالانکہ ان کو عزم بھی تھا کہ ان کی تابعداری کرلیں۔

مسئلہ: اسی طرح اس عاصی کا حال ہے جو کہتا ہے کہ بڑھاپے میں گناہوں سے توبہ کریں گے لیکن جب موت کا شکار ہوگیا تو حسرت کا ہاتھ ملتا ہے۔

حضرت حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

آں قہقہہ کبک خراماں حافظ[1]
کز سرپنجۂ شاہین قضا غافل بود

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ حالانکہ تم تورات پڑھتے بھی ہو۔ اس میں حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت واضح طور پر موجود ہے اور اس میں ان کے ساتھ ایمان لانے کا حکم بھی درج ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ کیا تم میں عقل نہیں ہے کہ سمجھو کہ بات بہت قبیح ہے کہ اپنی اصلاح تو کرتے نہیں ہو، لیکن دوسروں کو سمجھانے میں مشغول ہو۔ (اَلْعَقْلُ) اصل میں بمعنے منع و امساک ہے۔ اسی سے عقال ماخوذ ہے۔ یعنے وہ رسی کہ جس سے اونٹ کے پاؤں کو کہنیوں تک باندھا جاتا ہے۔ تاکہ حرکت کرنے سے باز رہے۔ نیز نورِ روحانی کہ جس سے کو نفس علوم ضروریہ و نظریہ کا ادراک ہوتا ہے؟ کو بھی عقل اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ قبیح عمل سے روکتا اور اچھے عمل کو معلوم کرتا ہے۔ اس کا محل دماغ ہے، کیونکہ دماغ حس کا محل ہے اور بعض کے نزدیک اس کا محل قلب ہے کیونکہ قلب معدن حیوٰۃ اور مادہ

---

[1] اے حافظ اس کبک ٹہلنے والی (متکبر) کو دیکھ کر تعجب کیجیے کہ وہ فضا میں اڑنے والی شاہین کے حملہ سے غافل ہے۔

حواس ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک نور ہے جو آدمی کے بدن میں ہوتا ہے۔

ف : یہ توبیخ لوگوں کو نیکی کے امر کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس سے بُرے عمل سے ترک کے لیے ہے۔ انکار و توبیخ کا دارو مدار جملہ معطوف یعنے وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ پر ہے۔ نہ وہ کہ جس پر اس جملہ کا عطف ہے یعنے اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ۔

ف : اس آیت سے وہ شخص استدلال نہیں کرسکتا جو قائل ہے کہ جو شخص خود عمل کا پابند نہ ہو وہ دوسرے کو امر بالمعروف نہیں کرسکتا۔ بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ نیک عمل پر پابندی کرے اور امر بالمعروف کو بھی نہ چھوڑے۔

حدیث شریف نبی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں :

مُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَاِنْ لَّمْ تَعْمَلُوْا بِہٖ وَانْہَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَاِنْ لَّمْ تَنْتَہَوْا عَنْہُ۔ نیکی کا حکم دو اگرچہ تم خود اس کے کاربند نہ ہو۔ اور برائی سے روکو اگرچہ تم خود اس میں مبتلا ہو۔

مسئلہ جس نے کسی دوسرے کو امر بالمعروف کیا اور خود اس کا عامل نہیں تو اس نے صرف ایک واجب کا ترک کیا۔ اور اگر خود امر بالمعروف بھی ترک کر بیٹھے تو اس نے دو واجبوں کو چھوڑا۔ اور خود امر بالمعروف بھی ایک نیکی ہے اگرچہ اس امر کے مطابق عمل نہیں کرسکتا۔

نصیحت : ہاں یہ ضرور ہے کہ بے عمل واعظ کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔

مسئلہ : جو شخص امر بالمعروف کرتا ہے اسے سب سے پہلے خود اس کا پابند بنے۔ اسی طرح جو کسی کو برائی سے روکتا ہے، اسے چاہیئے کہ اس برائی سے پہلے خود باز آئے۔

ف : یہ آیت واعظ بے عمل کی مذمت کر رہی ہے کہ وہ دوسروں کو برائی سے روکتا ہے لیکن خود اس میں مبتلا رہتا ہے اور اس کے کردار بتاتے ہیں کہ وہ پکا جاہل اور نرا احمق ہے۔

سبق معلوم ہاد کہ اس سے مراد یہ ہے کہ واعظ کو چاہیئے کہ تزکیۂ نفس میں جدوجہد کرے۔ اور اپنی تکمیل کے لیے کوئی کسر باقی نہ رکھے تاکہ حق قائم ہو اور اس کے قدسی نفس کے طفیل دوسروں کو جلیل مرتبہ نصیب ہو لیکن اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ واعظ فاسق سرے سے وعظ کرنا بھی چھوڑ دے، کیونکہ دو مامور بہا میں سے ایک کی کمی دوسرے کے لیے خلل انداز نہیں۔

حکایت ایک عالم دین بڑے موثر الکلام اور قلوب پر تصرف ڈالنے والے تھے۔ ان کے وعظ کی کوئی ایک مجلس خالی نہیں ہوگی کہ ایک یا دو تین اس کے وعظ کی تاثیر سے نہ مرے ہوں۔ اور اس کے شہر کی ایک بڑھیا تھی۔ اس کا ایک نیک لڑکا تھا۔ وہ رقیق القلب اور سریع الانفعال ہمیشہ اپنے بیٹے کو اس عالم کی مجلس میں جانے سے روکتی رہتی تھی۔ ایک روز وہ اپنی ماں سے چوری مجلس وعظ میں جا بیٹھا تو تقدیر الٰہی غالب آگئی۔ آخر وہ مرگیا۔

ایک روز وہی بڑھیا اسی واعظ کو راستہ میں ملی اور یہ شعر پڑھ کر سنائے ؎

أتهدی الانام و لا تهتدی
الا ان ذالك لا ينفع
فياحجر الشحذ حتّٰى متٰى
تسن الحديد و لا تقطع

ترجمہ : دوسروں کو تو ہدایت دیتا ہے، لیکن خود ہدایت سے محروم ہے خبردار! یہ بات نفع مند نہیں۔ اے پتھر! کب تک تیز تر رہے گا کہ لوہے کو تو تیز کرتا ہے لیکن خود کاٹ نہیں سکتا یعنے بیکار ہے۔

جب اُس واعظ نے یہ اشعار سنے تو ایک چیخ مار کر گھوڑے سے بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑا اسے اٹھا کر گھر لے گئے، اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ حضرت حافظ شیرازی رحمہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں ؎

(۱) واعظاں کیں جلوہ در محراب و منبر کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

(۲) مشکلے دارم ز دانش مند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

عالم بے عمل کی سزا (حدیث) نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ معراج میرا ایک قوم پر گذر ہوا، تو ان کے ہونٹ آگ کی مقراضوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے کہا: اے جبرئیل! (علیہ السلام) یہ کون لوگ ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ یہ آپ کی امت کے وہ خطبا ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے لیکن خود اس کے کاربند نہیں ہوتے تھے۔ اسی لیے ان کا حصہ جہنم میں ایسے ہی مقرر ہوا۔ پھر ان سے پوچھا گیا کہ تم کون ہو؟ انھوں نے کہا: ہم وہ ہیں کہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے، لیکن خود کو کبھی نصیحت نہ کرتے۔

حضرت اوزاعی نے فرمایا کہ نوادلین نے اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں شکایت کی کہ یا اللہ کفار کے مردار کی بدبو ہمیں سخت تکلیف دے رہی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا: یہ بدبو علماءِ سُوء کے پیٹ کی بدبو سے کہیں اور زیادہ ہے۔

حدیث شریف حدیث شریف میں ہے: مَا من عبد يخطب خطبة الا والله سائلها عنها يوم القيمة ما اراد بها ہر وہ بندہ جو قوم کو خطاب کرتا ہے قیامت میں اللہ تعالےٰ اسے پوچھے گا کہ تیرا اس خطاب سے مطلب کیا تھا۔

ف : حضرت شیخ افتادہ آفندی نے فرمایا کہ اگر واعظ کو معلوم ہو تا کہ میری بھلائی وعظ سنانے کی بجائے سننے میں ہے تو

ترجمہ: (۱) یہ واعظین جو محراب و منبر پر جلوہ گر ہوتے ہیں تنہائی میں کچھ اور کام کرتے ہیں (۲) پھر ایسے دانشوروں سے باز پرس بھی مشکل ہے۔ دوسروں کو توبہ کی تلقین کرنے والے خود توبہ بہت کم کرتے ہیں۔

وہ کبھی وعظ کرنے کے درپے نہ ہوتا۔

حدیث شریف نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کَمْ مِنْ وَاعِظٍ یَلْعَبُ بِہِ الشَّیْطَانُ. بہت سے ایسے واعظ ہیں کہ جن سے شیطان کھیلتا ہے۔

ہاں اگر اس کا یہ ارادہ ہو کہ لوگ مجھ سے نفع یاب ہوں۔ اگر اس کے باوجود بھی اسے عذاب ہو تو وہ اس کے لیے ایک قسم کی فنا ہوگی، لیکن پھر بھی دھیان رکھے کہ اس میں حظ نفسانی کو دخل بالکل نہ ہو۔ نیز فرمایا کہ لوگوں کو اگر اس لیے وعظ سناتا ہے کہ لوگوں کو اس کا پتہ چل جائے جس کا مجھے پتہ ہے یا یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جس کا میں معتقد ہوں۔ ان کو کوئی علم نہ چلے۔ پہلے کو تو وعظ کرنے کی ضرورت نہیں، دوسرا بھی غلطی میں مبتلا ہے کہ لوگوں کو جاہل تصور کرتا ہے اور خود کو فاضل، تو یہ ایک تکبر ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نفس کے حیلے بے شمار ہیں۔ اس سے خلاصی وہ پا سکتا ہے جسے فضل الٰہی نصیب ہو۔ کم از کم اس حدیث شریف کا مضمون ملحوظ رہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ یؤید ھٰذا الدّین بالرجل الفاسق اللہ تعالٰے اپنے دین کی تائید ایک فاسق سے کراتا ہے۔

جب تک سالک حقیقت تک نہ پہنچے تب تک گمراہی میں پڑنے سے خائف رہے

حدیث شریف حدیث شریف میں ہے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الناس کلھم سکاری الا العالمون (تمام لوگ مخمور ہیں صرف علماء باہوش ہیں۔)

مخلصین تو ہمیشہ بڑے خطرہ میں ہیں۔ البتہ مخلصین (بالفتح) امن وسلامتی میں ہیں مخلص (بالفتح) تو وہ سالک ہے جو توحید حقیقی تک پہنچا۔ اور فانی ہو کر قہر سے محفوظ، اور اللہ تعالٰے کا کرم وجود وعدم کی حد سے باہر ہے۔ اسی کا نام فنا کلی ہے ان عبادی لیس لک علیہم سلطان سے یہی لوگ مراد ہیں۔

تنبیہ ہر مرتبہ میں شریعت کی پاسداری ضروری ہے، کیونکہ کمال اسی کا نام ہے ورنہ شریعت سے روگردان سالک ناقص ہے۔ ایسے مجذوب نقصان سے خالی نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی ایک کے متعلق جنون اور سفاہت کا طاری ہونا نہیں سنا گیا کیونکہ وہ مرتبۂ کمال میں کامل اور وہ عقل کل کے مالک ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ دروازہ کے بند ہونے والی آواز سے بھی وہ بحالتِ استغراق میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اَللّٰھم اَوْصلنا الی الْکمالِ (اے اللہ! ہمیں کمال کے مرتبہ تک پہنچا۔)

تفسیر عالمانہ: وَاسْتَعِیْنُوْا، اے بنی اسرائیل! اپنی ضروریات کو۔ بِالصَّبْرِ، صبر سے طلب کر کے فتح یابی کے منتظر رہو، لیکن اس میں بھروسہ صرف اللہ تعالٰے پر ہو۔ یا صبر سے مراد روزہ ہے، کیونکہ روزے میں کھانے پینے والی چیزوں سے صبر کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں کسر شہوت اور تصفیہ نفس ہے۔ وَالصَّلٰوۃِ ط یعنے نماز کو وسیلہ بناؤ

اوراس کے ذریعہ سے التجا کرو۔ یہاں تک کہ مقصود کو پہنچ جاؤ اور مصائب وتکالیف سے بچ جاؤ۔

ربط : جب بنی اسرائیل کو ایسے امور یعنے تکلیف اور ریاست ومرتبہ کا ترک اور مال سے روگردانی کا حکم دیا گیا جو ان پر شاق تھے۔ اب ان کا علاج بتایا جارہا ہے۔

حدیث شریف : حدیث شریف میں ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی امر غم میں ڈالتا تو آپ نماز میں مشغول ہوجاتے۔

حکایت حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سفر میں تھے تو آپ کو لڑکی کی فوتیدگی کی اطلاع ملی۔ آپ نے (انا للہ وانا الیہ راجعون) پڑھ کر فرمایا کہ وہ ایک عورت تھی۔ جسے اللہ تعالےٰ نے ڈھانپا۔ اور وہ ایک بوجھ تھا جسے اللہ تعالےٰ نے میرے لیے آگے اپنے ہاں محفوظ فرمایا۔ پھر راستہ سے ہٹ کر آپ نے نماز ادا فرمائی اور سواری پر سوار ہوکر پڑھتے تھے، (واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ ۔ (استعانت حاصل کرو صبر اور نماز سے)

وَاِنَّهَا اور بے شک وہ نماز، لَكَبِيْرَةٌ بہت بھاری ہے جسے اللہ تعالےٰ نے بندوں کے لیے مقرر فرمایا جیسا کہ خود فرمایا، کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ ۔ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ ہاں خاشعین پر نماز کوئی بوجھ نہیں۔ خاشعین بمعنے عاجز سوالی لوگ۔

ف : خشوع جوارح سے ہوتا ہے اور خضوع قلب سے۔ یا خشوع بصر سے ہوتا ہے اور خضوع باقی اعضا سے۔

سوال : خاشعین پر نماز کیوں ثقیل نہیں۔

جواب : اس لیے کہ وہ اپنے رب کی مناجات میں ایسے مستغرق ہوتے ہیں کہ ان کو تکالیف اور مشقتوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : وقرۃ عینی فی الصلوٰۃ ، کیونکہ آپ کو نماز کی مشغولی میں راحت وسرور ملتا۔ اسی لیے آپ نے دنیوی امور کو الٹا تکلیف سے تعبیر فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ظن کبھی یقین کا معنے دیتا ہے۔ اور کبھی شک کا، کیونکہ یہ اضداد سے ہے، جیسے لفظ رجا بمعنے امن وخوف کے لیے آتا ہے۔ (کذا فی تفسیر الکواشی) اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ یعنے وہ اللہ تعالےٰ سے ملنے والے ہیں۔ اس میں قیامت کی حاضری کی طرف اور وہاں پر سوال ہونے کا اشارہ ہے یہی وجہ موزوں ہے۔

حدیث شریف (۱) نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ ومن کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقاءہ یعنے جسے اللہ تعالےٰ کی زیارت کا اشتیاق ہے، اس کے ملنے کو بھی اللہ تعالےٰ محبوب رکھتا ہے۔ اور جو اللہ تعالےٰ کو ملنا نہیں چاہتا اسے اللہ تعالےٰ بھی نہیں چاہتا۔ اس لقاء سے مراد موت ہے۔

حدیث شریف (۲) حدیث شریف میں ہے: لقی اللّٰه وھو علیہ غضبان یعنے وہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگیا۔ یا اس سے مراد موت ہے۔ اب معنیٰ یوں ہوا کہ انہیں یقین ہے کہ وہ عنقریب مریں گے۔

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ع اور انہیں یقین ہے کہ وہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی طرف واپس ہونے والے ہیں۔ یعنی ان کو اپنے اعمال کی جزاء وسزا ملے گی۔ اور جن کو جزاء کا یقین نہیں اور نہ ہی ثواب کی امید رکھتے ہیں اور نہ ہی عذاب سے ڈرتے ہیں۔ تو پھر یہ نماز ان کے لیے بڑا بوجھ ہے۔ جیسے منافقین اور ریا کار لوگوں پر بوجھل محسوس ہوتی ہے۔

مسئلہ: طاعات کے دکھ پر صبر کرنا نفس کے ساتھ جہاد کرنا اور اسے شہوات سے روکنا اور لمبی آرزوؤں سے اسے باز رکھنا ہے۔ یہ عادات انبیاء اور صالحین کے ہیں۔

ف: حضرت یحییٰ بن ایمان فرماتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مقسوم لکھ دیا ہے، اس سے زائد کی طلب نہ کرنا، اور رضا یہ ہے کہ جو فیصلہ تقدیر نے دنیا و آخرت کا کر دیا ہے اس پر خوش ہونا اور بس۔ یہ عمل سلوک میں ایسے ہے جیسے تمام بدن کے لیے روح۔

حضرت حافظ شیرازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ؎

گویند سنگ لعل شود در مقامِ صبر
آرے شود ولیک بخونِ جگر شود

ف: اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کی علیحدہ علیحدہ تعریف فرمائی ہے، اور ہر ایک کی حد و انتہا بیان فرمائی ہے مثلاً فرمایا: من جاء بالحسنة فله عشر امثالها۔ اور صدقہ فی سبیل اللہ کے متعلق فرمایا: مثل الذين ينفقون اموالهم فی سبيل الله كمثل حبة انبتت سبع سنابل فی كل سنبلة (الآیۃ) اور صابرین کے متعلق اجر بے حساب کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ صبر والوں کے متعلق فرمایا: انما يوفی الصابرون بغير حساب! اور اپنے لیے صبر کی تعریف فرمائی۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے: ليس بشیء اجبر علی اذی سمعه من الله تعالیٰ انهم ليدعون له ولد اوانه ليعافيهم ويرزقهم۔ (اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر والا کوئی نہیں ہوگا کہ وہ اپنے متعلق مکروہ امر سنے اور صبر کرے۔ لوگ میرے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں، لیکن میں ان کو معاف کر دیتا ہوں۔ اور روزی بھی بدستور جاری رکھتا ہوں۔)

حلیم اور صبور میں فرق: اللہ تعالیٰ کے لیے صبر کا معنیٰ حلم کا یعنی مستحقین سے عقوبت کی تاخیر۔ خطا کار گناہ کے بعد صبور کے عذاب سے مطمئن نہیں ہوتا، لیکن حلیم کے عذاب سے مطمئن ہوتا ہے۔

ف: خشوع کو کہا گیا کہ کیا تو لوگوں کی امامت کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو کہ خشوع غصہ پینے کو نہیں کہا جاتا بلکہ

(ص ۲۸۵ پر)

يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ
اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ
وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ
اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰىٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ
الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ۝ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَاِذْ قَالَ
مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ
فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً
فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى
كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝
وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا
وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ
الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ
فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ۝ ع

ترجمہ: اے اولادِ یعقوب! یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اس سارے زمانہ پر تمھیں
بڑائی دی اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی اور نہ کافر کے لیے کوئی سفارش مانی
جائے گی اور نہ کچھ لے کر اس کی جان چھوڑی جائے گی اور نہ اس کی مدد ہوگی اور یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون
والوں سے نجات بخشی کہ تم پر برا عذاب کرتے تھے تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمھاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے
پھر اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی اور جب ہم نے تمھارے لیے دریا چیر دیا تو تمھیں بچا لیا
اور ہم نے فرعون والوں کو تمھاری آنکھوں کے سامنے غرق کر دیا اور جب ہم نے موسےٰ سے چالیس راتوں کا

وعدہ فرمایا پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور تم ظالم تھے پھر اس کے بعد ہم نے تمھیں معافی دی کہیں تم احسان مانو اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق اور باطل میں تمیز کر دی کہ کہیں تم ہدایت پاؤ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمھارے لیے بہتر ہے تو اس نے تمھاری توبہ قبول کی بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز تمھاری تصدیق نہیں کریں گے جب تک ہم خدا کو علانیہ نہ دیکھ لیں تو تمھیں کڑک نے گھیرا اور تم دیکھ رہے تھے پھر تمھارے مرنے کے بعد ہم نے تمھیں زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو اور ہم نے بادل کو تمھارا سائبان بنایا اور تم پر من اور سلویٰ اتارا کھاؤ ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں اور انھوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا، ہاں اپنی ہی جانوں کا بگاڑ کرتے تھے اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ۔ اور دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں ہم تمھاری خطائیں بخش دیں گے اور قریب ہے نیکی والوں کو اور زیادہ دیں تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا تو ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتارا یہ ان کی نافرمانی کا بدلہ ہے۔

(بقیہ متن صفحہ ۲۸۴)

خشوع یہ ہے کہ شریف اور کمینہ کو حق میں برابر سمجھنا چاہیئے۔ اور اللہ تعالےٰ نے جو فرض مقرر فرمائے اس کے لیے اللہ تعالےٰ سے پورا خوف دل میں رکھ کر ادا کرنا چاہیئے۔ جس نے دل و جان سے خوف خدا نہ کیا اس نے منافقت کا ثبوت دیا۔

ف : حضرت سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ تجھے خشوع کی تکمیل اس وقت ہوگی۔ جب کہ جسم کا بال خوف خدا سے سرشار ہو یہی اعلےٰ درجہ کا خشوع ہے کیونکہ جب دل پر اثر ڈالتا ہے تو اس کا ظہور جسم کے ہر ذرّہ پر نمایاں ہوتا ہے۔ پھر وہ جتنا اپنے آپ کو چھپائے، نہیں چھپ سکے گا۔ اس کا سرنگوں اور ادب سے بھرپور اور تواضع کا مجسمہ ہوگا سلف صالحین تو ایسے عمل کو چھپانے کی کوشش میں رہتے

مسئلہ خشوع مذموم بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ تکلف کر کے رونی شکل بنائے اور سر نیچے رکھے۔ جیسے جاہلوں کی عادت ہے کہ وہ اس طرح کر کے لوگوں کو پھنسانے کی ٹوہ میں رہتے ہیں تاکہ لوگ ہمیں نیک اطوار سمجھیں۔ یہ شیطان کا ایک دھوکہ ہے اور نفس کا ایک مکر ہے۔

ف : حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ جب بولتے تو کھلے لفظوں میں اور جب چلتے تو نہایت تیز چلتے۔ اور جب کسی

کو سزا دیتے تو سخت ترین اور نہایت درجہ عبادت گذار اور صدق کے پتلے اور خشوع سے پُر اور حق کے مظہر تھے۔ (کذا فی تفسیر القرطبی)

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے: واستعینوا بالصبر یعنے نفس کو شہوات اور اس کی خواہش کے متابعت پر صبر کے ذریعہ مدد طلب کرو۔ بالصّلوٰۃ یعنے باب غیب اور بارگاہ رب پر حاضر باشی کا التزام کرو۔ وانہا لکبیرۃ یعنے صبر اور نماز سے استعانت امر عظیم اور سخت ترین شے ہے۔ الا علی الخاشعین ۰ یعنے ان لوگوں پر سخت نہیں جن پر اللہ تعالے کی جلوہ گری ہے۔ اسی لیے ان کے نفوس قدس اللہ تعالے سے خاشع رہتے ہیں۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ تعالے علیہ وسلم نے فرمایا: اذا تجلی اللہ شیئًا خضع لہٗ جب اللہ تعالے کسی شئے پر جلوہ گری فرماتا ہے تو اسے خضوع نصیب ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالے نے فرمایا: وخشعت الاصوات للرحمٰن فلا تسمع الا ھمسا خشوع قلبی تجلی حق مع الحق۔ کا وارث بناتی ہے اور مخلوق سے دُوری پیدا کرتی ہے۔

اَلَّذِین یظنون یعنے وہ لوگ جو تجلی حق کا یقین رکھتے ہیں۔ انہم ملاقوا ربہم یعنے انھیں یقین ہے کہ انھیں جمال حق کا مشاہدہ نصیب ہوگا۔ وانہم الیہ راجعون ۰ جذبات حق کے ساتھ اللہ تعالے کی طرف رجوع کرنے والے ہیں اور جذباتِ حق کا ایک جذبہ ثقلین کے عمل کے برابر ہوتا ہے۔

(تفسیر آیات صفحہ ۲۸۴)

تفسیر عالمانہ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا بنی اسرائیل ذکر کرو یعنی شکر کرو۔ نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ میری ان نعمتوں کو جو میں نے تمھیں عطا فرمائیں مثلاً من وسلوٰی کا نازل کرنا اور بادل کو سایہ بنانا اور پتھر سے پانی نکالنا وغیرہ۔

سوال: یہ انعامات تو ان کے آباؤ اجداد کو ملے ان کو یاد دلانے کا کیا فائدہ۔

جواب: باپ کی شرافت کا اثر بیٹے پر ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالے نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ میں نے تمھیں فضیلت دی یعنی فضلت آبائکم (میں نے تمھارے آباؤ اجداد کو فضیلت دی، نہیں فرمایا، کیونکہ آباء کی فضیلت ہوتی ہے ۔ق) اور یاد کرو، علی العٰلمین) میں نے تمھیں اہلِ عالم پر فضیلت بخشی۔ یہ عطف الخاص علی العام ہے۔ صرف ان کی بزرگی کے اظہار کے لیے یعنی میں نے انھیں علم و ایمان اور عمل صالح اور انبیاء اور عاقل بادشاہ بنا کر ان کے ہم زمان لوگوں پر فضیلت دی۔ اور یہ وہی حضرات تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ اقدس میں تھے۔ ان کے بعد والے بھی وہی لوگ مراد ہیں جنھوں نے فساد اور

بگاڑ پیدا نہیں کیا۔ اس آیت کی نظیر وہ آیت ہے جو بی بی مریم علیٰ نبینا و علیہا السلام کے لیے فرمایا۔
علی العالمین - تیرے رب نے تجھے تمام عالم سے برگزیدہ فرمایا۔ یعنی تیری ہم زماں عورتوں پر، کیونکہ بی بی خدیجہ اور بی بی عائشہ اور بی بی فاطمہ (رضی اللہ تعالےٰ عنہن) ان سے افضل ہیں (صرف مصنف کے خیال کے مطابق، جمہور کے نزدیک توقف بہتر ہے) اسی بنا پر بنی اسرائیل کو حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر کوئی فضیلت نہیں، کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس امت کے لیے فرمایا ہے: کنتم خیر امۃٍ اخرجت للناس (تم بہترین امت ہو لوگوں کی نصیحت کے لیے بھیجے گئے ہو) (کذافی التیسیر)
اس سے معلوم ہوا کہ العالمین استغراق عرفی ہے حقیقی نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل میں سے جو بھی ہمارے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے انھیں دوسرے لوگوں پر فضیلت ہوگی۔ اور انھیں دوہرا اجر ملے گا ایک اس لحاظ سے کہ وہ اپنے نبی پر ایمان لا، دوسرا ہمارے نبی علیہ السلام پر ایمان لانے کی وجہ سے۔
حدیث شریف حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کو دوہرا ثواب ملتا ہے:
(۱) جس نے لونڈی خریدی اور اس کی تربیت کر کے اسے مفت آزاد کر دیا۔ اور نکاح بھی کر دیا۔
(۲) وہ عبد جو اپنے آقا اور اللہ تعالےٰ کی اطاعت کرے۔
(۳) وہ اہلِ کتاب جو ہمارے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہو کر ان کی رسالت کی گواہی دے۔
ف: امام قشیری رحمۃ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کی نفوس کی فضیلت کی شہادت دی ہے۔ چنانچہ ان کے متعلق فرمایا: وانی فضلتکم علی العٰلمین۔ اور سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فضیلت کو فضل ربی سے تعبیر فرمایا۔ کما قال:
قل بفضل اللہ و برحمتہ۔ (فرمایئے! اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے)
اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ان کی گواہی دی ان کی نفوس کی وجہ سے اور حضور علیہ السلام کے فضل کی گواہی دی ہوئی فضل ربی ہے۔ جس فضل میں نفس کو دخل ہو اس پر عجب پیدا ہوتا ہے۔ اور جس فضل میں رب تعالےٰ کی رحمت ہو تو اس میں ایجاب ہوتا ہے۔

تفسیر عالمانہ

شانِ نزول: یہود کہتے تھے کہ ہم خلیل اللہ علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اور ہمارا باپ ذبیح اللہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہے۔ اللہ تعالےٰ ان دونوں کی شفاعت ہمارے حق میں قبول فرماتا ہوا ہمیں معاف کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ

نے ان کے رد میں آیت نازل فرمائی۔

وَاتَّقُوْا ، اے بنی اسرائیل اللہ تعالےٰ سے ڈرو۔ **یَوْمًا** ، قیامت کے دن سے یعنے حساب و عذاب کے دن سے۔ اَیْوَمًا محل کا ذکر کر کے حال کے ارادہ کرنے کے قبیل سے ہے۔ **لَّا تَجْزِیْ** یعنے اس میں نہ کسی کی کوئی کفایت کرنے والا اور نہ کچھ ادا کرنے والا اور نہ کسی کو بچانے والا ہوگا۔ عائد اس میں محذوف ہے اور یہ جملہ یومًا کی صفت ہے۔ **نَفْسٌ** ، مومن ، **عَنْ نَّفْسٍ** کافر سے **شَیْئًا** کسی چیز کا جو اس پر حقوق لازم ہوں گے اس کی نصب مفعول بہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ لفظ نفس کو نکرہ لانے میں تعمیم مقصود ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے : لن تنفعکم ارحامکم[1] و لا اولادکم اور یہ نفع بھی کیسے دے سکیں گے۔ جب کہ یوم یفر المرء من اخیہ[2] میں حکم عام ہے۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

چوں یفر المرء آید من اخیہ یہرب المولود من ابیہ

زاں شود بر دوست آں ساعت عدو کہ بت تو بود داز رہ مانع او

ترجمہ: یوم یفر المرء من اخیہ قرآن میں آیا ہے کہ بچہ باپ سے بھاگے گا اس وقت دوست دوست کا دشمن ہوگا تیرا بت راہ حق سے مانع ہے۔

مسئلہ یہ زجر کفار کے لیے ہے۔ مومن کو اللہ تعالےٰ نے مستثنیٰ فرمایا ہے۔ کما قال : یوم لا ینفع مال و لا بنون اِلا من اَتی اللہُ بقلب سَلیم یعنے جو قلب شرک سے خالی ہوگا صرف اسے مال اور اولاد نفع دے گا یعنے قیامت میں۔

وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْہَا شَفَاعَۃٌ اللہ تعالےٰ کے عذاب سے چھڑانے کے لیے کافر کے حق میں مومن کی شفاعت قبول نہیں ہوگی۔ شفاعۃ شافع اور شفیع کا مصدر ہے۔ شافع و شفیع اسے کہتے ہیں : جو دوسرے کی قضائے حاجت کا طلب گار ہو۔ شفیع سے ماخوذ ہے ، کیونکہ یہ شخص اپنے نفس کو (جس سے اپنی طلب مراد کر رہا ہے) کا ساتھی بناتا ہے۔

مسئلہ : کافر کے لیے کوئی شفاعت نہیں ہے۔ ہاں مومن کی شفاعت ضرور ہوگی۔

حدیث شریف : نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں : میری امت کے اہل کبائر کے لیے میری شفاعت ضروری ہوگی۔

مسئلہ : جو آپ کی شفاعت کی تکذیب کرتا ہے۔ اسے شفاعت نصیب نہیں ہوگی۔

قاعدہ : جہاں پر شفاعت کی نفی ہے وہاں کفار مراد ہیں۔

---

[1] تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد تمہیں فائدہ نہیں دے گی۔ [2] اس دن مرد اپنے بھائی سے بھاگے گا۔

وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا مشفوع لہ سے نہیں لیا جائے گا۔ اور مشفوع لہ سے نفس ثانیہ یعنی عاصی کافر مراد ہے۔ عَدْلٌ فدیہ مال سے یا کوئی دوسرا نفس اس کے عوض یا توبہ جو اسے نار سے نجات دلائے! العدل بالفتح شئے کا مثل خلاف جنس سے اور (بالکسر) شے کا مثل اس کی جنس سے اور فدیہ کو اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ وہ اس کے مساوی اور اس کا ہم مثل اور اس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ اللہ تعالےٰ کے عذاب سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔ اور نہ اس وقت ان کے لیے کوئی نافع ہوگا اور نہ شافع اور نہ دافع۔

سوال: ضمیر جمع اور پھر مذکر کی کیوں حالانکہ پہلے نفس کا لفظ مستعمل ہو رہا ہے۔ جو واحد اور مؤنث ہے؟

جواب: نفس ثانیہ نفی کے تحت واقع ہے جو نفوس کثیرہ پر دال ہے۔ اور چونکہ نفس سے مراد عباد اور انسان مراد ہیں بنابریں جمع کا صیغہ لایا گیا۔

فائدہ: یہاں پر نصرۃ معونۃ سے عام ہے کیونکہ نصرۃ صرف دفع ضرر سے مخصوص ہے۔ اور معونۃ عام ہے یہ آیت غایت بلاغت میں ہے، کیونکہ اس میں ان تمام وجوہ کو جمع کر لیا ہے کہ جن سے انسان دنیوی مصیبتوں سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ چار ہیں:

1. اپنے بوجھ اٹھانے کے لیے دوسرے کو قائم مقام مقرر کر دے۔
2. مال دے کر آئی مصیبت سے بچ جائے۔
3. کوئی شخص اس کا سفارشی ہو، جو سفارش کر کے اسے چھوڑا لے۔
4. کوئی مددگار مدد کر کے عذاب سے بچا لے۔

یہاں پر اللہ تعالےٰ نے تمام وسائل سے کفار کو ناامید کر دیا۔

روایت بطرز حکایت: حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص قیامت میں اپنے لڑکے کو لپیٹ کر بولے گا۔ اے میرے پیارے بیٹے! میں دنیا میں تیرا باپ تھا آج مجھے تیری نیکیوں میں سے صرف رتی برابر ایک نیکی کی ضرورت ہے براہ کرم مجھے دے دے تاکہ میں اس مصیبت سے بچ جاؤں۔ لڑکا جواب دے گا کہ جس طرح آج تجھے خطرہ ہے مجھے بھی ہے فلہٰذا مجھ سے دور ہو میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا۔ پھر وہ شخص اپنی زوجہ سے جا کر کہے گا: اے فلانی! دنیا میں میں تیرا شوہر تھا۔ وہ عورت اسے دیکھ کر اس کی بہت تعریف کرے گی۔ مرد کہے گا: مجھے تیری ایک نیکی درکار ہے، براہ مہربانی ایک نیکی دے دے۔ وہ عورت جواب دے گی کہ اس خوف سے تو میں بھی کانپ رہی ہوں۔ اس پر اللہ تعالےٰ فرمائے گا:

وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى۔ یعنی جس پر

گناہوں کا بھاری بار آپڑے گا تو اس سے اس کا گناہ کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا۔
شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں سے

برفتند[1] ہر کس درود آنچہ کشت
نماند بجز نام نیکو و زشت
ہر آں خورد سعدی کہ بیخے نشاند
کسے برد خرمن کہ تخمے فشاند

تفسیر صوفیانہ یبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم۔ اس کا ظاہر عام ہے لیکن اس کا باطن خاص ہے ۔اس کا تعلق اس قوم سے ہے جو بنی اسرائیل سے تھی۔ اللہ تعالٰی نے بھلائی جان کر انھیں پوشیدہ طور پر اپنا خطاب سنایا جس پر انھوں نے اللہ تعالٰے کی اس نعمت کو یاد کیا جو ان کو عطا ہوئی اور نور کے قطرات کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کی ۔جب کہ اللہ تعالٰے نے مخلوق کو ظلمت میں پیدا کیا۔ تو پھر اس پر اپنے نور سے قطرات ڈالے اس کی برکت سے انھوں نے حضور علیہ السلام پر ایمان لایا۔

حدیث شریف حضور علیہ السلام فرماتے ہیں "جسے اس نور سے قطرہ نصیب ہوا اسے ہدایت نصیب ہوئی ۔اور جو اس سے چوک گیا وہ بہک گیا"

وانی فضلتکم علی العلمین ۔اس نعمت کی بدولت یعنے میں نے تمھیں حضرات کے ساتھ رفاقت کی فضیلت عطا فرمائی جن پر میرا انعام ہے یعنے انبیاء وصدیقین وشہداء وصالحین بسبب اس نعمت کے جو اس وقت نور کے قطرہ کے عطا ہوئی اور فضیلت ان لوگوں پر ہے جن کو وہ قطرہ نصیب نہیں ہوا۔ واتقوا یوماً یعنے اس دن کے عذاب سے ڈرو کہ جس سے عوام کو اپنے افعال سے ڈراتا ہے جیسا کہ فرمایا : واتقوا النار... الخ اور خواص کو اپنے صفات سے ،جیسا کہ فرمایا : انا نعلم ما یسرون وما یعلنون ۔بے شک ہم جانتے ہیں لسے جو وہ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں۔
اور فرمایا :

یسئل الصادقین عن صدقهم ۔ اور سچوں سے ان کے صدق کے متعلق سوال فرمائے گا۔
اور خاص الخاص کو اپنی ذات سے جیسا کہ فرمایا :
ویحذرکم الله نفسه ۔
اور فرمایا :
واتقوا الله حق تقاته ۔اور اللہ تعالٰے سے مکمل طور ڈرو۔
لا تجزی نفس عن نفس ،کیونکہ اس دن امر صرف اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ ولا یقبل منها شفاعة

---

[1] ترجمہ : لوگ گئے اور اٹھائیں گے وہی جو بویا۔ دنیا میں یا نیک نامی رہی یا بدنامی (۲) اے سعدی! جیسا بیج بویا وہی اٹھائے گا خرمن وہی اٹھائیگا جو بیج بوئیگا۔

صرف اسی کے حق میں نہ اس کے غیر کے لیے اللہ تعالےٰ کے اذن کے بغیر جیسا کہ فرمایا: من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ (ترجمہ: کون ہے جو اس کے ہاں سفارش کرے سوا اس کی اجازت کے)

ولا یؤخذ منھا عدل، یعنی کوئی فدیہ کیونکہ انسان کو صرف اپنی کمائی ہی ملے گی۔ اور اپنی سعی کو خود ہی دیکھ لے گا۔ اور اسے پتہ چلے گا۔ آج کس کی سعی قبول ہے۔ ولا ھم ینصرون، کیونکہ انھوں نے حق کی امداد نہ کی۔ اس لیے ان کی مدد نہ کی جائے گی۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

ان تنصروا اللہ ینصرکم۔ اگر اس کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تعالےٰ تمھاری مدد کرے گا۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ، یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے یعنے یاد کرو جب کہ ہم نے تمھیں یعنے تمھارے آبار کو نجات دی، کیونکہ پہلے لوگوں کو نجات دینا پچھلے لوگوں کو نجات دینا ہے، جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں:

قتلناکم یوم عکاظ (عکاظ کے دن ہمارے آبا نے تمھارے آبار کو قتل کیا۔

اور نجوی در اصل اس مکان کو کہتے ہیں جو زمین سے اونچا ہو کیونکہ جو شخص اس پر مکین ہوتا ہے وہ بچ جاتا ہے۔ اب ہر فائز کو ناجی کہتے ہیں، کیونکہ وہ تنگی سے نکل کر فراخی میں جا پہنچتا ہے۔ یعنے ہم نے تمھارے آبار کو ایک محفوظ مکان میں کر دیا اور ایذار سے اٹھالیا۔ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ، فرعون اور اس کے متبعین اور اس کے اہل دین سے۔ فرعون در اصل عمالقہ کے بادشاہوں کا لقب ہے۔ جیسے کسریٰ فارسیوں کے بادشاہوں کا۔ اور قیصر روم کے بادشاہوں کا، اور خاقان ترکوں کا اور نجاسی حبشہ کا تبع اہل یمن کا لقب ہوتا ہے۔

ف: عمالقہ ایک جابر قوم تھی جو لاؤد بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھی۔ ان میں شام کے ساکنین کو جبابرہ اور مصر کے بادشاہوں کو فراعنہ سے تعبیر کیا جاتا۔ جو سرکشی کرتا ہو اسے کہتے ہیں: تفرعن الرجل۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ سرکش اور متمرد ہو جائے۔ یہاں پر استغراق یعنے عموم نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو مصر میں رہتے تھے۔

فرعون کی مختصر سوانح

موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کا نام ولید بن مصعب بن الریان تھا۔ قبطیوں میں سے تھا۔ اس نے چار سو سال عمر گذاری منقول ہے کہ وہ اصفہانی عطار تھا۔ اس پر قرض غالب آگئے۔ تنگ آکر اپنے اصلی مسکن کو چھوڑ کر شام میں چلا گیا۔ وہاں بھی اسے آسانی میسر نہ ہوئی۔ پھر مصر میں جا بسا۔ وہاں کی ایک الٹی چال دیکھی کہ گاؤں میں تو سالم بوری تربوز کی صرف ایک درہم میں دستیاب ہو جائے لیکن بازار میں صرف ایک درہم سے ایک تربوز بکتا تھا۔ دل میں خیال کیا کہ اس طریق سے میرا قرض بہ آسانی ادا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ گاؤں سے ایک بوری ایک درہم میں خریدی۔ راستہ میں ایک ایک درہم میں خریداروں کو بیچتا جاتا پھر بازار میں ایک ایک درہم میں ایک ایک تربوز بیچتا۔ اسی طرح کئی روز کرتا رہا۔ لیکن

شہریوں وغیرہ کو دیکھا کہ بھولے بھالے ہیں، کسی کو کسی سے خطرہ نہیں اور نہ ہی وہ سیاسی امور سے واقف ہیں اچانک شہر میں وبا پھیلی۔ موت بکثرت واقع ہونے لگی، گورستان میں جا بیٹھا اور اہلِ اموات سے کہتا کہ قبرستان میں میت دفن کرنے کی اجازت نہیں۔ جب تک پانچ درہم تاوان نہ ادا کرو۔ چنانچہ ہر ایک نے بغیر سوچے تاوان ادا کر دیا اور کئی عرصہ تک ادا کرتے رہے۔ اور اس کے پاس تین ماہ کے عرصہ میں بہت دنیا جمع ہوگئی۔ کوئی بھی اسے پوچھنے والا نہیں تھا۔ بالآخر ایک روز اسی شہر کے لوگ آئے اور حسبِ دستوران سے تاوان مانگا، انھوں نے انکار کیا۔ اس نے بھی ضد کی۔ آخر بادشاہِ مصر (جس کا لقب فرعون تھا) اس تک نوبت پہنچی اسے بلایا گیا۔ اس نے کہا، تمھیں کس نے تاوان کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس نے کہا، مجھے کسی نے مقرر نہیں کیا اور نہ ہی مجھے یہ دنیا درکار ہے۔ یہ بہانہ اس لیے کیا کہ کسی طرح میں آپ کے ہاں بلایا جاؤں۔ اور حاضر ہو کر آپ کو آگاہ کروں کہ آپ کی قوم بڑی نااہل ہے اور تو ان سے بالکل بے خبر ہے۔ دیکھئے! یہ مال میں نے اسی معمولی ڈھنگ سے جمع کر لیا ہے۔ لیجیے! یہ آپ کا ہے، لیکن مجھے اپنی سلطنت کا متولی مقرر کر دیجئے۔ میں نہایت دیانت داری و وفاداری سے کام کروں گا۔

چنانچہ اس نے تمام امور اس کے سپرد کر دیئے۔ اس نے ایسی احسن کارکردگی دکھائی کہ لشکر کے مصالح نہایت منتظم ہوگئے اور رعیت کا حال بھی بالکل ٹھیک ہوگیا۔ ان میں کافی عرصہ رہا۔ عدل و انصاف میں بے نظیر ثابت ہوا یہاں تک کہ وہاں کا بادشاہ مرگیا۔ اس کے بعد سلطنت کا مالک اسی کو قرار دیا گیا۔ پھر جس عروج کو وہ پہنچا اہلِ دنیا جانتی ہے۔

ف: حضرت یوسف علیہ السلام کے فرعون کا نام ریان تھا۔ لیکن اس فرعون اور موسوی فرعون کے مابین چار سو سال سے کچھ زائد عرصہ کا فاصلہ ہے۔

يَسُومُونَكُمْ تم سے طلب کرتے۔ **سُوٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ**

بُرا عذاب اور سب سے زیادہ قبیح بہ نسبت دیگر امور کے اس کا تمھارے لیے ارادہ کرتے اور اعمالِ شاقہ کا مکلف بناتے، تمھیں عذاب چکھاتے اور اسی پر مداومت کرتے۔

یسومونکم۔ سام السلعۃ سے ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب سامان طلب کرے۔ اور 'سوم' بمعنے بغی بیغی ہے۔ بلا واسطہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ اسی لیے سوء العذاب یسومونکم سے منصوب اور مفعول بہ ہے اور جملہ نجینٰکم کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔

اب معنٰی یہ ہے، تم اقبح عذاب کے لیے طلب کیے گئے تھے۔ اس کی نظیر اہلِ عرب کا وہ قول ہے جو کہتے ہیں:

رایت زید یضربہ عمر یعنے میں نے زید کو اس حال میں دیکھا کہ وہ عمرو کا مضروب تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون نے انھیں خادم اور نوکر بنا رکھا تھا۔ بعض ان میں سے اس کے ملازم دربار اور بعض

ان میں سے مکانات کے معمار اور بعض ان میں سے کسان تھے جو کھیتی باڑی کرتے اور بعض ان میں سے اس کی ہر وقت خدمت میں رہتے۔ اور جو کوئی خدمت نہ کرتا اس سے جزیہ لیا جاتا۔

ف : حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل فرعون کی مختلف خدمات پر متعین تھے۔ جو بہت بڑی قوت والے ہوتے۔ وہ پہاڑوں کو کھود کر چٹانیں سر پر اٹھا کر لاتے یہاں تک کہ ان کی گردنیں اور ہاتھ زخمی اور ان کی پیٹھیں پھٹ گئیں اور بعض ان میں سے وہ تھے جو پتھر اور گارا اٹھا کر مکانات کی تعمیر کرتے۔ بعض ان میں سے وہ تھے جو کچی اینٹیں تیار کر کے پھر انھیں پختہ کرتے۔ بعض ان میں سے درود گر تھے بعض لوہار اور جو کمزور تھے وہ روزانہ جزیہ ادا کرتے۔ اگر سورج ڈوبنے سے پہلے نہ ادا کر سکتے تو ان کے ہاتھ گردن سے منہ تک باندھے جاتے اور ان کی عورتوں سے چرخہ کا کام لیا جاتا اور کاتنے کے بعد وہ سوت بنتیں۔

ف : بعض کہتے ہیں : یسومونکم کی تفسیر یذبحون ابناءکم ہے۔ گویا انھوں نے کہا : فرعونی کون سا عذاب ہم پر کرتے تو جواب میں فرمایا : یذبحون۔۔۔۔ الخ یعنے انھیں مار ڈالتے تھے۔ اور تشدید تکثیر کے لیے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے : فتحت الابواب۔ اور 'ابناء' سے مراد صرف مذکر نہیں۔ اگرچہ یہ لفظ نر و مادہ دونوں کے لیے بولا جاتا ہے جیسا کہ لفظ بنین یا بنی اسرائیل سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ابناء سے مراد لڑکے ہیں۔ اور وہ بھی چھوٹے نہ بڑے، کیونکہ وہ صرف چھوٹوں کو ذبح کرتے تھے۔

وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ لڑکیوں سے سبقت کر جاتے یعنے انھیں زندہ چھوڑتے۔

سوال : یہاں پر 'نساء' کیونکر بولا گیا ہے، حالانکہ نساء بڑی عورتوں کو کہتے ہیں اور یہاں پر چھوٹی لڑکیاں مراد ہیں ؟

جواب : مآل و انجام کے اعتبار سے 'نساء' بولا گیا ہے، کیونکہ جب انھیں زندہ چھوڑا گیا تو وہ لامحالہ بڑی ہی ہوئیں۔ علاوہ ازیں وہ لڑکیوں سے درگذر کرتے تو ان کی مائیں بھی بچ جاتیں۔ اور قاعدہ ہے کہ اختلاط کے وقت بڑی اور چھوٹی دونوں پر لفظ نساء بولا جاتا ہے۔

فرعون کے ظلم کا آغاز

فرعون نے خواب میں ایک آگ کو دیکھا کہ بیت المقدس سے آئی ہے اور مصر کو احاطہ کرتے ہوئے قبطیوں کو مصر سے نکال لیا، لیکن بنی اسرائیل کو کچھ نہ کہا۔ یہ بات اُسے بہت خوفناک معلوم ہوئی۔ کاہنوں اور جادوگروں سے تعبیر پوچھی۔ انھوں نے کہا : بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جو تمھاری ہلاکت کا موجب ہوگا۔ اور تمھارا ملک تم سے چھین لے گا۔ اس پر فرعون نے ہر بنی اسرائیل کے نومولود بچے کو مار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ اور شہر کی ہر دایہ کو بلایا اور کہا کہ بنی اسرائیل کے ہر نومولود بچے کو مارتی جاؤ اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑتی جاؤ۔ انھوں نے حکم بجا لایا۔ حتےٰ کہ اس نومود یعنے موسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کے ارادہ پر بارہ ہزار زندہ موجود اور نوے ہزار نومولود لڑکے مارے گئے۔

ف : حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان تمام لڑکوں کی قوت دی گئی۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان سب کی قوت اور موسے علیہ السلام کی قوت برابر ہوتی۔ اسی وجہ سے ان کے معجزات میں ایک معجزہ ان کا زورِ بازو بھی تھا۔

بہرحال ادھر لڑکوں کی کشت خون ادھر بڑے بڑے مرنے لگے۔ قبطیوں کے سردار فرعون کے پاس پہنچے اور کہنے لگے: بڑوں کو موت فنا کر رہی ہے اور چھوٹوں کو تو مروا رہا ہے۔ عنقریب یہ تمام امور ہمارے سروں پر آجائیں گے۔ فرعون نے یہ سن کر حکم جاری کر دیا کہ ایک سال بچوں کو مارو اور ایک سال زندہ رہنے دو۔

جس سال کے بچے زندہ رکھے جاتے تھے ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور جس دوسرے سال مارے جاتے تھے، موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کی قضا ان کی کوشش پر غالب آگئی۔ چنانچہ فرعون نے کوشش میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ قضا سے سبقت کر جائے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اپنے ارادہ کی تکمیل فرمائی کہ موسےٰ علیہ السلام بچ ہی گئے۔

وَفِيْ ذٰلِكُمْ یہ اشارہ ذبح اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کی طرف ہے۔ **بَلَاۤءٌ** مشقت اور بلاء اور لڑکیوں کو زندہ رکھنا ان کے لیے تکلیف اور بلا تھی۔ باوجودیکہ بظاہر معافی اور ترک عذاب تھا، کیونکہ بعد میں انھیں لونڈیاں بنایا جاتا اور بہت بڑے مشقت بھرے امور میں انھیں لگایا جاتا۔ یا اس لیے کہ نرینہ اولاد کے قتل ہو جانے کے بعد لڑکیوں کے بچ جانے میں آبار کے لیے مصیبت عظیم تھی۔ **مِّنْ رَّبِّكُمْ** اللہ تعالےٰ کی طرف سے ان کا تم پر مسلط ہو جانا **عَظِيْمٌ ۝** بلاء کی صفت ہے اور دونوں کا نکرہ ہونا تفخیم کے لیے ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذالکم کا اشارہ فرعون سے نجات دینے کی طرف ہے۔ اور 'بلاءٌ' بمعنے نعمت ہو کیونکہ دراصل 'بلاء' آزمائش کو کہتے ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو کبھی نعمت دے کر آزمائش کرتا ہے تاکہ بندے شکر کریں۔ پھر وہی آزمائش عطیہ اور نعمت ہو جاتی ہے اور کبھی مصائب کے ساتھ آزماتا ہے تاکہ صبر کریں پھر وہی آزمائش محبت ہو جاتی ہے۔ اور آزمائش خیر و شر دونوں میں ہوتی ہے۔ کما قال تعالےٰ:

ونبلوکم بالشر والخیر ... الخ ہم تمھیں خیر و شر سے آزماتے ہیں

من ربکم میں اشارہ ہے کہ موسےٰ علیہ السلام کو بھیج کر اور انھیں توفیق دے کر تمھیں فرعون سے نجات دیں گے۔

تفسیرِ صوفیانہ آل فرعون سے نجات میں نفس امارہ سے نجات دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے نجات کا یہ مطلب ہے کہ اس کے صفات ذمیمہ اور اخلاق رذیلہ سے نجات ملی۔ سوء العذاب یعنے روح کے صفات روحانیہ حمیدیہ کو ذبح کر کے ان کی خدمات بجا لانے کے لیے قدرت حیوانیہ کے اعمال میں اس کے بعض صفات جلیلہ کو باقی رکھنا اور صفاتِ ذمیمہ سے نجات پا جانا سوائے اللہ تعالےٰ کی مہربانی کے مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

حدیث شریف حضور علیہ السلام نے فرمایا: "تم میں کسی کو عمل نہیں نجات دلانے کا"۔ صحابہ کرام نے عرض کی، حضور! آپ بھی۔ آپ نے فرمایا: "ہاں، میں بھی۔ لیکن مجھے اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل میں لے لیا ہے۔

وفی ذالکم یعنی نفسی صفات کا غلبہ روح وقلب پر بلاءِ عظیم بڑا امتحان ہے۔ خیر و شر میں بڑا امتحان ہے، جسے اللہ تعالےٰ ہدایت دے اور اس کے حال کو بہتر بنا دے تو اسے نجات دینے میں لطف فرماتا ہے اور وہ نجات پا جاتا ہے۔ جسے اللہ تعالےٰ گمراہ اور رسوا کرے تو وہ زمین میں رہ کر نفس کی اتباع کرتا ہے۔ پھر اس کا انجام بُرا ہوتا ہے۔

سبق: آیت میں تنبیہ ہے کہ بندہ کو جو دکھ اور سکھ پہنچے تو وہ اللہ تعالےٰ کی آزمائش سمجھے۔ اسے چاہیئے کہ راحت میں شکر اور مصیبت میں صبر کرے۔

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

اگر بلطف بخوانی مزید الطافست[1]

وگر بقہر برانی دروں ما صاف است

اور اللہ تعالےٰ کی عادت کریمہ ہے کہ اپنے بندوں کو اپنی عبادت کی طرف رزق فراخ اور دائمی عافیت دے کر بلاتا ہے تاکہ اس کی طرف اس کی نعمت سے رجوع کریں۔ پس اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر انھیں دکھ اور سکھ میں مبتلا کرتا ہے تاکہ وہ اس کی طرف راجع ہوں، کیونکہ اللہ تعالےٰ کی مراد یہ ہے کہ اس کے بندے اس کی طرف طوعاً یا کرہاً رجوع کریں، لیکن پہلا طریقہ احرار کا ہے اور طریقۂ ثانی اغیار کا۔

حکایت داؤد بن رشید جو کہ محمد بن حسن کے تلامذہ میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ میں ایک رات نماز کے قیام میں تھا کہ سردی نے آن گھیرا میں اپنی مفلسی پر رو پڑا۔ آخر مجھے نیند آگئی۔ خواب میں مجھے کوئی کہہ رہا ہے: اے داؤد! ہم نے تجھے قیام کی توفیق دی اور دوسروں کو نیند دے دی۔ اس کے بعد داؤد بن رشید رات کو کبھی نہ سوتے تھے۔ (کذا فی روضۃ الاخیار)

مولانا روم رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

درد چشم داد حق تا من ز خواب[2]

برجہم در نیم شب با سوز و تاب

دردہا بخشید حق از لطف خویش

تا نخسپم جملہ شب چو گاؤمیش

حدیث شریف: مروی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبیوں میں سے کسی ایک نبی علیہ السلام کی طرف وحی

---

[1] ترجمہ: اگر لطف سے بلاؤ تو بڑی مہربانی، اگر ہٹا دو تو بھی ہمارا دل صاف ہے۔ [2] (۱) آنکھوں کا درد دیا تاکہ نیند سے آدھی رات کو بسوز و تاب سے بیدار رہوں

بھیجی اور فرمایا ؛ میں نے اپنے بندے پر بلاء نازل فرمائی ہے۔ اس پر اس نے مجھے پکارا لیکن میں نے اس میں تاخیر کی جس پر وہ شکایت کرنے لگتا ہے۔ میں کہتا ہوں ؛ اے میرے بندے ! میں اس سے اور کس طرح رحم کروں۔

نسخہ روحانیہ اگر کوئی تکلیف سے یہ سمجھے کہ مجھ سے اللہ تعالے کا لطف دور ہوگیا ہے تو وہ نہایت غلطی کا شکار ہوگیا۔ عقلاً بھی عادتاً بھی اور شرعاً بھی۔

عقلاً تو اس طرح کہ عقل کے امکان میں ہے کہ اس سے بہت بڑی مصیبت میں اپنے بندے کو مبتلا کر دے اور آخرت میں کافر کو اس سے کہیں اور زیادہ عذاب دے تو وہ قادر ہے جب وہ اتنی بڑی قدرت والے نے بڑے عذاب یا مصیبت سے بچا کر معمولی میں مبتلا کیا ہے تو یہ بھی اس کی نوازش ہے۔ اس سے زیادہ دکھ پہنچاتا تو اس سے کون پوچھتا۔ اور عادتاً اس طرح کہ ہر دکھ اور تکلیف کا انجام نیک ہوتا ہے اور یہ بھی ہے کہ اسے دوسری بڑی مصیبت میں مبتلا نہیں کیا گیا۔ مثلاً جو جذام میں مبتلا ہے وہ نابینائی کی مصیبت سے اچھا ہے۔ اگر دونوں میں مبتلا ہو جائے ، تب بھی فقر و افلاس کا تو شکار نہیں اور اگر فقر و افلاس بھی گھیر لے تب بھی اسے خوش ہونا چاہیئے کہ اس کا دین تو محفوظ ہے۔

اور شرعاً اس طرح کہ حدیث شریف میں ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بندے کو اللہ تعالے اپنا محبوب بناتا ہے تو اسے کسی مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اگر وہ اس پر صبر کرتا ، اور اس پر راضی ہوتا ہے ، تو اسے اپنے خاص بندوں میں داخل فرمالیتا ہے۔

سبق ؛ مصیبت میں گرفتار بندے کو یہ بات معمولی نہ سمجھنی چاہیئے کہ اسے مصیبت میں کس نے مبتلا کیا ، اور پھر اس پر جو اس نے عطیات اور اجر و ثواب مقرر فرمایا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ دکھ درد کیا حقیقت رکھتا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ فَرَقْنَا ، اور یاد کرو اے بنی اسرائیل ! جب کہ ہم نے۔ بِكُمُ تمھاری نجات کے لیے دریا کو چیرا۔

ربط باءِ سببیت کی ہے اور یہی اولی ہے ، کیونکہ یہاں پر اپنے احسانات و انعامات شمار فرما رہے ہیں۔ اور سببیت میں ان کی تعظیم بھی ہے۔ اور یہ بھی منجملہ انعامات کے ہے۔ اور بعض کہتے ہیں ؛ باء بمعنے لام کے ہے جیسے اللہ تعالٰی کے اس قول "ذالك بان الله هوالحق " میں ہے۔

اَلْبَحْرَ ، دریائے قلزم مراد ہے جو فارس کے دریاؤں میں سے ایک دریا ہے۔ یا کوئی اور دریا تھا جس کا نام اساف ہے یہاں تک کہ اس میں بنی اسرائیل کے اسباط کی گنتی کے مطابق بارہ راستے ہو گئے۔

ف ؛ سبط پوتے کو کہتے ہیں۔ اور اسباط بنی اسرائیل میں عرب کی طرح قبائل کو کہا جاتا ہے۔ اور وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے۔

فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ یعنے تم کو کنارے لگا کر غرق نہ ہونے دیا۔ **وَاَغۡرَقۡنَا**۔ غرق، بہنے والی شئے میں ڈوبنے کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دسوب چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں:

"رسب الشیٔ فی الماءِ رسوبا" یہ اس وقت میں جب کہ کوئی چیز پانی میں نیچے ہو جائے۔ الاغراق بمعنے پانی میں ہلاک کرنا۔

اٰلَ فِرۡعَوۡنَ، فرعون اور اس کی قوم مراد ہے، کیونکہ اس میں وہی داخل ہوئے۔ اور یہی مراد لینا اَولیٰ ہے۔ **وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ** ۝ تم آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جب تم دریا میں چلے تو وہ پھٹ گیا۔ اور جب وہ آئے تو دریا ان پر بہ چلا اور تم بسلامت پار کنارے لگ گئے۔ اور تم دیکھ رہے تھے کہ ان کے مردے غرق ہو کر دریا کے کنارے سے باہر نکالے جا رہے تھے۔

ف: امام قرطبی فرماتے ہیں: جب اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کیا تو بنی اسرائیل کہنے لگے: اسے موسیٰ علیہ السلام! ہمارے قلوب تا ہنوز مطمئن نہیں کہ فرعون غرق ہوا ہو۔ اللہ تعالےٰ نے دریا کو حکم دیا کہ فرعون کو باہر پھینک دو۔

فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہونے کا مختصر حال

مروی ہے کہ جب فرعون کی ہلاکت کا وقت قریب آیا تو اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ اپنی قوم کو رات کے وقت مصر سے لے چلیں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام کو رات کو چلنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ قبطیوں سے زیورات عاریۃً لے لیں، لیکن جب نکلیں تو ایک دوسرے کو بلائیں نہیں اور صبح سے پہلے تک منتظر رہیں۔ اور جب نکلیں تو اپنے گھروں کے دروازوں کو خون سے آلودہ کر کے چلیں تاکہ انھیں پتہ چل جائے کہ بنی اسرائیل اپنے گھروں سے چل چکے ہیں۔ چنانچہ رات کو نکل چلے۔ اس وقت وہ چھ لاکھ اور بیس ہزار جنگی تھے۔ بیس سال کے لڑکے اور ساٹھ سال کے بوڑھے ان کے علاوہ تھے قبطی اس سے بے خبر تھے اور ان پر موت واقع ہوگئی۔ اور وہ مردگان کے دفن میں مصروف ہوئے۔ جس سے ان کی طلب میں رک گئے۔

مزار یوسف | بنی اسرائیل جب رات کو چلے تو آگے جنگل میں جا کر راستہ بھول گئے اور انھیں پتہ نہ چل سکا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کے بوڑھوں کو بلا کر سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے انتقال کا وقت قریب ہوا تو اپنے بھائیوں سے وعدہ لیا کہ جب مصر سے باہر نکلو تو مجھے بھی ساتھ لے جانا۔ اس وجہ سے راستہ بند رہے گا۔ موسےٰ علیہ السلام نے پوچھا: ان کا مزار کہاں ہے۔ ان کے مزار کا علم سوائے ایک بڑھیا کے کسی کو نہ تھا۔ اس بڑھیا سے دریافت کیا گیا، تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی: اگر میں بتا دوں تو کیا میری منہ مانگی بات مان

ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالےٰ سے پوچھتا ہوں جیسا وہ فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ معاملہ پیش کیا تو حکم ہوا کہ اسے کہہ دیجئے کہ تیرا سوال پورا کیا جائے گا۔ بوڑھی نے کہا: میں ایک طویل عمر بوڑھی ہوں۔ چل نہیں سکتی مجھے ایک سواری عطا ہو اور مصر سے مجھے بھی نکال لے چلو۔ یہ تو دنیاوی سوال ہے اور آخرت میں یہ چاہتی ہوں کہ جہاں تیری قیام گاہ ہو میں تیرے ساتھ رہوں۔ موسےٰ علیہ السلام نے کہا: تیرے سوال دونوں پورے کیے جائیں گے۔ بوڑھی نے کہا: یوسف علیہ السلام کی مزار دریائے نیل کے اندر ہے۔ دعا فرمائیے! اس سے پانی ہٹ جائے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی اور ساتھ یہ بھی عرض کی کہ طلوعِ فجر نہ ہو جب تک کہ ہم یوسف علیہ السلام کا مزار تلاش کر کے انہیں ساتھ نہ لے چلیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ کو کھدوا کر قبر سے صندوق مبارک (جو صنوبر کا تھا) نکال لیا۔

ف: مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ موسےٰ علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کا صندوق دریا کی موج سے اللہ کی دی ہوئی توفیق سے نکالا۔ یہ وہ پہلا علم ہے جو اللہ تعالےٰ نے عنایت فرمایا۔ اور سب سے پہلے یہ علم حضرت آدم علیہ السلام کو عنایت ہوا پھر تو ارثاً عطا ہوتا رہا۔ آخر یوسف علیہ السلام کے صندوق کو اٹھایا گیا۔ اور شام میں جا کر دفن کیا گیا۔ اس کے بعد ان پر راہ کھل گئی اور چل پڑے۔ حضرت ہارون علیہ السلام قوم کے آگے اور موسیٰ علیہ السلام قوم کے پیچھے پیچھے[1]

جب فرعون کو علم ہوا تو قوم کو جمع کر کے بنی اسرائیل کے تعاقب کو نکلا۔ ان سب کے آگے والے لشکر (جو کہ ستر۷۰ لاکھ تھا) میں ہامان کو بھیج کر روانہ کیا کہ جس میں تمام گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان میں کوئی مادہ گھوڑی نہ تھی۔ اور ہر ایک کے سر پر خود اور ہاتھ میں تلوار تھی۔ ادھر بنی اسرائیل چل کر جب کہ دریا کے کنارے پہنچے تو دیکھا کہ دریا اپنی پوری طغیانی میں تھا۔ یہاں تک کہ فرعون کا لشکر قریب آ گیا۔ اشراق کا وقت تھا۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو دیکھ کر اپنی جماعت سے کہا: یہ تو بہت قلیل جماعت ہے۔ ادھر بنی اسرائیل فرعونیوں کو دیکھ کر گھبرائے اور حیرانگی میں موسےٰ علیہ السلام کو کہنے لگے: اے موسیٰ علیہ السلام! تم ابھی پیدا نہیں ہوئے تو بھی ہم دکھ میں تھے اور اب تمہاری پیدائش کے بعد بھی ہمیں تکلیف سے نجات نہیں، کیونکہ ہمارے دریا آگے ہے اگر آگے بڑھیں تو ڈوبتے ہیں۔ اور پیچھے فرعون ہمارے قریب آ پہنچا ہے۔ جو ہمیں مارے بغیر نہیں رہے گا۔ اب کیا کیا جائے۔ بتائیے تمہارے رب کا وعدہ کہاں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: گھبرائیے مت۔ میرا رب عنقریب اور ضرور بالضرور کوئی راہِ نجات نکالے گا۔ ابھی گفتگو ہو رہی تھی کہ اللہ تعالےٰ نے موسےٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اپنا عصا پتھر پہ مارو۔ انھوں نے عصا مارا لیکن کچھ نہ ہوا۔ اللہ تعالےٰ سے پھر حکم ہوا اب مارو۔ چنانچہ موسےٰ علیہ السلام نے عصا بھی مارا اور کہا، راستہ دیجئے اے ابو خالد!

---

[1]: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قوم کے پیچھے پیچھے چلنے کا مقصد یہ تھا کہ قوم کو پیچھے سے تعاقب کرنے والوں کا خطرہ تھا۔ اس لیے خطرہ کے مقابلہ کے لیے ہر وقت اور سب سے پہلے بنفسِ نفیس تیار رہے۔ کاش! آج کل کے رہنما اس اصول کو سمجھیں اور اپنائیں۔ (اویسی غفرلہ)

اتنا کہنے پر دریا پھٹ دیا۔ اور اس میں بارہ ۱۲ راستے بن گئے اور ہر راستہ پہاڑ برابر تھا۔ اور ہر ایک علیٰحدہ علیٰحدہ بارہ قبیلوں کے لیے، جن پر وہ لوگ گذرے۔ دریا پھٹنے پر اللہ تعالےٰ نے ہوا کو چلنے کا حکم دیا اور دھوپ تیز کر دی جس سے وہ بالکل خشک ہو گئے۔ بنی اسرائیل اس میں کود پڑے، لیکن ہر ایک کے راہ کے آگے پہاڑ کے برابر پانی حائل ہو گیا۔ جس سے ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ کہنے لگے: کیا بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بھائی مارے گئے۔

موسےٰ علیہ السلام نے فرمایا: چلو۔ وہ بسلامت چل رہے ہیں۔ ان کا راستہ بھی تمھارے راستہ جیسا ہے لیکن انھوں نے نہ مانا۔ موسےٰ علیہ السلام نے کہا: یا اللہ! تو ان کی بُری عادتوں کو دیکھ رہا ہے۔ جس طرح کہتے ہیں اسی طرح کر دے۔ اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ اپنا عصا دائیں بائیں دریا کے پانی میں مارو۔ چنانچہ ایسا کرنے پر ہر ایک قبیلہ کے مابین چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہو گئیں (سوراخوں کی طرح) جن سے وہ سب ایک دوسرے کو دیکھ کر باتیں سن رہے تھے۔ اسی طرح چلتے چلتے آخر کار دریا کو عبور کر گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم دریا سے پار ہو گئی تو فرعون کا لشکر دریا کے کنارے آپہنچا۔ اور دیکھا پہاڑ پھٹا ہوا تھا۔ فرعون لشکر کو کہنے لگا: دیکھو! یہ میرے خوف سے پھٹ گیا ہے۔ قوم نے کہا: اگر تو خدا ہے تو دریا میں چل جیسے موسیٰ علیہ السلام چلے۔ فرعون سیاہ گھوڑے پر سوار تھا۔ اور لشکر میں کسی کی بھی مادہ گھوڑی نہ تھی۔ جبریل علیہ السلام ایک تیز رَو گھوڑی پر سوار ہو کر آگے سے گذرے۔ فرعون کے گھوڑے نے اس کی بو سونگھی اور پیچھے دوڑا۔ جبریل علیہ السلام دریا میں چلے گئے اور فرعون کا گھوڑا بھی چلا آیا۔ فرعون نے بہت روکا۔ مگر وہ نہ رُکا۔ گھوڑا دریا میں کود پڑا۔ قوم نے فرعون کو دریا میں جاتے دیکھ کر اپنے اپنے گھوڑے پیچھے پیچھے کر لیے۔ اور وہ جبرائیل علیہ السلام کو نہ دیکھ سکا۔ اور میکائیل علیہ السلام ایک اور گھوڑے پر ان سب کے پیچھے تمام قوم کو ہانکتے ہوئے دریا میں لائے۔ یہاں تک کہ ایک بھی باقی نہ رہا۔ سب کے سب دریا میں کود پڑے۔ ادھر فرعون کا لشکر تمام داخل ہوا ادھر موسیٰ علیہ السلام کی قوم دریا سے باہر نکلی۔ فرعون کا پہلا لشکر دریا سے باہر نکلنے والا تھا کہ دریا موج مارتا ہوا۔ ان سب کو ڈبو گیا۔

فرعون نے ڈوبتے وقت کہا:

"میں مانتا ہوں کہ معبود وہی ایک ہے اور میں ایمان لایا ہوں اس معبود پر جس پر بنی اسرائیل نے ایمان لایا۔ اور میں سچا پکا مسلمان ہوں۔" ادھر بنی اسرائیل دیکھ کر کہہ رہے تھے کہ اب فرعون باہر آ کر ہمیں قتل کر دے گا۔

اللہ تعالےٰ کے حکم سے چھ سو بیس ہزار افراد دریا سے باہر نکلے جن کے سروں پر لوہے کے زنجیر جکڑے ہوئے تھے۔ اور فرعون کی لاش بھی باہر پھینکی گئی۔ جس کو دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ سرخ بیل ہے۔ اس کے بعد ڈوبنے کو

پانی سے ظاہر کر دیا۔ یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کا ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ اور ان کی نعمت کے لیے ادائیگی شکر کا موجب تھا۔

نبی علیہ السلام کا علم غیب اور معجزہ بعینہٖ یہی قصہ ہمارے نبی علیہ السلام کا معجزہ جلیلہ ہے کہ اس سے ہر منکر کا دل اور عقل مند کی عقل مطمئن ہو سکتی ہے۔ انہیں چاہیئے کہ بطیب خاطر اسے قبول کریں، کیونکہ ہمارے نبی علیہ السلام نے باوجودیکہ آپ امی تھے خبر دی۔ حالانکہ آپ نے کسی کتاب سے پڑھا اور نہ ہی کسی سے سنا۔ یہ ایک غیب ہے۔ جس کا اہلِ عرب کو علم نہ تھا۔ آپؐ کا اس کی خبر دینا دلیل ہے کہ آپ کی طرف وحی کی گئی ہے۔ اور یہی بات نبوت کی پختہ علامت ہے۔

ف : جس طرح بنی اسرائیل کے اصلاف اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود دریا سے نجات پا جانے کے بعد بچھڑے کی پرستش میں مبتلا ہو گئے اور بعد میں سادات انبیاء و رسل علیہم السلام کو قتل کرنے لگے۔ اللہ تعالےٰ نے ان پر احسان کیا لیکن احسان کا بدلہ عجیب دیا کہ نافرمان ہو گئے، دین سے دور جا پڑے اور بُرے اخلاق کے خوگر ہو گئے اسی طرح ان کے اسلاف کا حال ہے کہ وہ واقعہ صحیح ماننے کے باوجود اثر پذیر نہ ہوئے بلکہ الٹا تورات کو بدل ڈالا اور اللہ تعالیٰ پر طرح طرح کے بہتان باندھے اور اپنی مرضی کے مطابق قوانین بنا ڈالے۔ صرف کوڑی کے چند ٹکوں کے طمع میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مخالفت میں تل گئے وغیرہ وغیرہ۔

سبق آیت میں کافروں کو تہدید کی جا رہی ہے تاکہ ایمان لائیں اور مومنوں کو تنبیہ ہو رہی ہے تاکہ عبرت پکڑیں۔ اور ہر وقت گناہوں سے بچ جائیں خصوصاً اس روز جب کہ موسیٰ علیہ السلام کو مع بنی اسرائیل کے غرقابی سے نجات ملی۔ یعنے دسویں محرم کا دن۔

عاشورہ کے فضائل و مسائل

حدیث شریف (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی پاک صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لاتے تو یہودیوں کو دسویں محرم کے دن روزہ رکھتے دیکھ کر فرمایا: ماھذا الیوم الذی تصومونہ (اس دن تمھارے روزہ رکھنے کا موجب کیا ہے۔) تو انھوں نے کہا: وہ بڑا دن ہے، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو دریا سے نجات ملی اور فرعون اور اس کی قوم غرق ہوئی۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے ادائیگی شکر پر روزہ رکھا ہم بھی ان کی اقتداء کرتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں۔ حضور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

نحن احق و اولی بموسٰی منکم و امر بصیامہ (رواہ مسلم) (ہم موسےٰ علیہ السلام کی اقتدا کے

زیادہ لائق وحقدار ہیں بہ نسبت تمہارے اس کے بعد آپؐ نے اس روز روزہ رکھنے کا حکم دیا۔)

ف : اس حدیث شریف کی اقتدار کرتے ہوئے خود بھی روزہ رکھا اور امت کو بھی حکم دیا۔ حالانکہ یہ اس حدیث شریف کے خلاف ہے جسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالٰی عنہا نے روایت کیا کہ عاشورہ کا وہ مقدس دن ہے کہ جاہلیت میں اس روز قریش روزہ رکھتے اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بھی قبل از دعویٰ نبوت تا ہجرت اس روز روزہ رکھا۔ اور صحابہ کرام کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا لیکن جب رمضان شریف کے روزوں کی فرضیت نازل ہوئی تو آپ نے عاشورا کا روزہ چھوڑ دیا اور فرمایا جو چاہے عاشورہ کا روزہ رکھے اور جو چاہے ترک کر دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرضیت کے منسوخ ہونے کے بعد صرف اباحت باقی تھی، لیکن حضرت موسےٰ علیہ السلام کے واقعہ کے بعد وہ اباحت سنت سے بدل گئی اس سے دو متضاد روائیتوں میں تطبیق واضح ہوگئی۔

حدیث شریف (۲) کفار کا ایک قیدی عاشورا کے دن بھاگ نکلا تو اس کے گرفتار کرنے کے لیے شہ سوار روانہ ہوئے جب اس نے سواروں کو پیچھے آتے دیکھا اور اسے یقین ہوگیا کہ اب میں گرفتار ہونے والا ہوں تو آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا: اللھم بحق ھذا الیوم المبارك اسئالك ان نجیبنی منھم (اے اللہ! اس مبارک دن کے صدقے مجھے ان سے نجات دے۔ اس کی دعا ایسی مستجاب ہوئی کہ وہ تمام سوار فوراً ہی اندھے ہوگئے۔ اور قیدی نجات پاکر آگے کو نکل گیا۔ اور اس روز روزہ رکھا خواب میں اسے کھلایا پلایا گیا۔ اس کے بعد بیس سال زندہ رہا، لیکن اسے طعام و پانی کی حاجت نہ رہی۔ وہ خواب والا طعام و شراب اسے کافی ہوگیا۔

حدیث شریف (۳) حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"التمسوا فضلہ فانہ مبارک اختارہ اللہ من الایام من صام ذالك الیوم جعل اللہ لہ نصیبا من عبادۃ جمیع من عبدہ من الملائکۃ والانبیاء والمرسلین والشھداء والصالحین" (اس دن کی فضیلت حاصل کرنے کی کوشش کرو، کیونکہ یہ وہ مبارک دن ہے جسے اللہ تعالٰے نے باقی ایام پر فضیلت بخشی ہے (سوائے رمضان شریف کے) جس نے اس دن روزہ رکھا تو اللہ تعالٰی اس کی عبادت کو وہ حصہ عطا فرمائیگا جو ملائکہ اور انبیا علیہم السلام اور صدیقین و صالحین کو عطا فرمایا یعنی وہ عبادت مقبول ہوگی۔ یہ فضائل روزے کے متعلق تھے۔ نماز کے متعلق بھی فضائل وارد ہیں۔

عاشورہ کے دن نماز عاشورہ کے دن کی نماز کے متعلق حضور غوث پاک سیدنا محی الدین شیخ عبدالقادر قدس سرہ نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالٰے عنہ اپنی ایک طویل حدیث میں فرماتے ہیں کہ جس نے عاشورہ کے دن چار رکعت نماز اس طریق سے پڑھی کہ ہر رکعت میں ایک دفعہ فاتحہ شریف اور

پچاس دفعہ سورہ اخلاص تو اس کے آئندہ زندگی کی پچاس سال کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور ملاءِ اعلےٰ میں اس کے لیے نور کے ہزار منبر بنائے جائیں گے۔

مسئلہ عاشوراء کی ساری رات جاگنا مستحب ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے "من احیا لیلۃ عاشوراء فکانما عبد اللہ بعبادۃ ملائکۃ المقربین" (جو عاشوراء کی ساری رات جاگتا رہا، اس نے گویا مقربین ملائکہ جیسی عبادتِ الٰہی بجا لائی۔)

تفسیر صوفیانہ بحر سے مراد دنیا ہے اور اس کا پانی لذات و شہوات ہیں۔ اور موسےٰ سے قلب اور قوم سے صفات مطلوب ہیں۔ فرعون نفس امّارہ ہے۔ اور اس کی قوم سے نفس کے صفات مراد ہیں۔ یہ سب موسیٰ (قلب) اور اس کی قوم کے اعداء ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کو بالکل مٹا دیں۔ اور قلب اور اس کے صفات اللہ تعالےٰ کی طرف جانے والے ہیں اور ان کا دشمن ان کے پیچھے ہے اور دنیا کا دریا ان کے آگے ہے۔ انھیں اللہ تعالےٰ کی طرف اس دریا کو عبور کرکے جانا اور دریا کا پار کرنا ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے عصا کی ضرب کے بغیر پہنچنا ناممکن ہے۔ اور وہ عصا موسےٰ (قلب) کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ اس کا بھی سفید ہاتھ ہے۔ اگر وہ عصا اس کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو وہ غرق ہو جاتے فرعون اور اس کی قوم غرق ہو گئی اور اگر یہی عصا فرعون اور اس کی قوم (نفس امارہ اور اس کے صفات) کے ہاتھ میں ہوتا تو یہ معجزہ دریا کا پھٹنا ان سے سرزد نہ ہوتا۔ جب موسیٰ کا ذکر کا عصا مارتا ہے تو بحر (دنیا) اور اس کا پانی (شہوات و لذات) دائیں بائیں ہٹ جاتے ہیں۔ پھر اللہ تعالےٰ اپنے لطف کی ہوا اور ہدایت کے سورج کو دنیا کے دریا کے گڑھے پر چلاتا ہے تو وہ دریا (دنیا) شہوات و لذات کے پانی سے خشک ہو جاتا ہے۔ پھر موسیٰ (قلب) اور اس کی قوم (صفات) دریا میں کود پڑتے ہیں اور دنیا کے دریا کو صحیح و سالم ہو کر عبور کر جاتے ہیں جنھیں اللہ تعالےٰ کے لطف نے نجات بخشی اور کنارے پہنچ کر اللہ تعالےٰ کے ساتھ واصل ہوئے۔ پھر فرعون (نفس) اور اس کی قوم (شہوات) کو حکم ہوا کہ تم ڈوب کر جہنم کی آگ میں داخل ہو جاؤ۔ (کذا قال صاحب التاویلات النجمیہ قدس اللہ تعالیٰ نفسہ الذکیہ)

تفسیر عالمانہ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی، اور یاد کرو اے بنی اسرائیل! جب کہ ہم نے وعدہ دیا۔ مفاعلہ کا صیغہ بمعنے ثلاثی ہے یا اپنے اصل پر ہے، کیونکہ یہ وعدہ اگرچہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے تھا۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اسے قبول کیا تھا۔ اور قبول کرنا وعدہ کرنے کے مشابہ ہے یا اس طرح ہو کہ اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وحی بھیجنے کا وعدہ کیا اور موسےٰ علیہ السلام نے طُور پہاڑ پر حاضری کا وعدہ کیا۔ موسیٰ، وٰعدنا کا مفعول ثانی ہے۔

موسیٰ کی وجہ تسمیہ عبرانی لغت میں مُو بمعنے آب اور شی بمعنے شجر۔ شین کو عربیت میں سین سے تبدیل کیا گیا ہے اور اس نام سے اس لیے موسوم ہوئے کہ ان کی امی جان نے فرعون کے ڈر سے انھیں

صندوق میں رکھ کر دریا میں پھینک دیا۔ پھر دریا کی موجوں نے انہیں فرعون کے گھر کے قریب درختوں کے مابین کھڑا کر دیا۔ آسیہ (فرعون کی گھر والی) کی نوکرانیاں نہانے کے لیے آئیں تو صندوق کو دیکھ کر فرعون کے گھر لے گئیں۔ بنابریں اس مکان کی وجہ سے کہ جس میں وہ پائے گئے، اس سے موسوم ہوئے اس لیے کہ وہاں پانی اور شجر تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کا نسب نامہ: موسےٰ بن عمران بن یصہر بن فاہث بن لاوی بن یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً چالیس راتوں کو مکمل کرنا۔ یہاں دراصل مضاف محذوف ہے۔ دراصل (تمامَ اربعین لیلۃ) تھا۔ یہ وعدنا کا مفعول ثانی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے موسےٰ علیہ السلام کو تیس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا اور وہ ذیقعدہ کا مہینہ تھا۔ پھر اس پر دس دن ذوالحج کے اور بڑھائے اور انہیں 'لَيْلَة' سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ مہینوں کی ابتداً رات سے ہوتی ہے۔ اور عرب کے مہینوں کی وضع بھی چاند کی سیر پر وضع کی گئی ہے۔ اسی لیے تاریخ پر واقع ہوتی ہے اسی حیثیت سے مہینوں میں اصل رات ہے دن اس کے تابع ہوتے ہیں۔ یا اس لیے کہ ظلمت روشنی سے پہلے ہی ہوتی ہے۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ عجل بقرہ گائے کے بچے کو کہتے ہیں۔ یعنی سامری نے بچھڑے کو مصنوعی معبود بنا کر پیش کیا تو تم نے اس کی پرستش شروع کر دی۔ **مِنْۢ بَعْدِهٖ** وعدہ کے وقت گذرنے کے بعد اور لفظ ثمّ اس لیے لایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وعدہ دیا کہ تم طور پر تشریف لاؤ تمھیں تورات دی جائے گی۔ جس میں بنی اسرائیل کی فضیلت ہے تاکہ خاصری کو بلند درجات پر تنبیہ اور غائبین کے لیے تعریف اور دین کی تکمیل ثابت ہو چونکہ توراۃ بہت بڑی نعمتوں سے ایک نعمت تھی۔ جب انھوں نے سب سے زیادہ قبیح قسم کا کفر وجہل کا عمل کیا تو یہ بات محل تعجب ہوئی کہ بڑے انعام کے بعد بڑی بے فرمانی کیوں اس لیے ان کی عقل کی قباحت کی دلالت پر لفظ ثمّ لائے اس کی مثال ہوگی کہ جیسے کوئی شخص کسی کو کہے کہ میں نے تجھ پر احسان کیا۔ اور فلاں فلاں انعام دیئے، لیکن تو نے میرے لیے فلاں برائی اور نقصان کا ارادہ کیا۔ **وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝** اور تم ظالم ہو شریک ٹھہرانے اور عبادت کو اپنے محل سے ہٹا کر غیر محل میں رکھنے کی وجہ سے یعنے اللہ تعالےٰ کو چھوڑ کر بچھڑے کی عبادت کرتے ہو۔ یہ جملہ اتخذتم کی ضمیر سے حال ہے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ توبہ کے بعد ہم نے تمھارے گناہ معاف کر دیئے۔ **مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ** بچھڑے کی پرستش کے بعد جو قبح میں انتہائی درجہ کا عمل بد تھا۔ اس پر ہم نے تمھیں کوئی سزا نہ دی، بلکہ موسےٰ علیہ السلام کی واپسی تک مہلت دے دی۔ انھوں نے آکر تمھیں متنبہ فرما کر اور تمھارے گناہوں کے کفارہ کی خبر دی۔ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝** تاکہ تم نعمت کی معافی کا شکریہ ادا کرو۔ اور اس کے بعد طاعت پر دوام حاصل کرو، کیونکہ

انعام شکر کا موجب ہے۔ دراصل شکر کہتے ہیں، نعمت کے تصور و اظہار کو۔ اور اس کی حقیقت یہی ہے کہ شکر سے اپنا عجز ظاہر کرے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

خردمند طبعان منت شناس

بدوزند نعمت بمیخ سپاس

ترجمہ: منت شناس اور دانا طبع لوگ شکر کی میخ سے ہی نعمت کو سیتے ہیں۔

وَإِذْ آتَيْنَا، اور جب کہ ہم نے دیا۔ مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ، تورات جو اس بات میں جامع تھی کہ وہ کتاب بھی تھی اور حق و باطل کے فرق بتانے میں حجت بھی۔ جیسے کوئی کہتا ہے، لقیت الغیث و اللیث، یعنے میں اس شخص کو ملا جو جُود و جرات کا جامع ہے۔ اس لحاظ سے کتاب و فرقان سے ایک ہی شے مراد ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ تاکہ اس میں تدبر اور جو اس میں موجود ہے، اس پر عمل کرو۔ یہ جملہ حکمت بیان کرنے کے لیے ہے نہ کہ علت بیان کرنے کے لیے یعنے اس میں نازل کرنے کی ایک حکمت یہ ہے کہ تم اس میں تدبر کرتے ہوئے عمل کرو۔ یعنے اللہ تعالےٰ نے اسے اس لیے نازل کیا تاکہ نبی علیہ السلام کی نبوت کی صحت پر دلالت کرے۔ پھر تم اس کی ہدایت کی اتباع میں کوشش کرو۔ جب تم یہ عمل کرو گے تو محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ ایمان لا چکے، کیونکہ یہ بھی معجزات لے آئے ہیں جو ان کے دعوئی نبوت کی صحت پر دلالت کر رہے ہیں۔

تورات کا شان نزول مروی ہے کہ جب بنی اسرائیل اپنے دشمن سے بے خوف ہوئے کیونکہ وہ تو دریا میں غرق ہو گیا اور یہ مصر میں آئے تو نہ اُن کے پاس کوئی کتاب تھی۔ اور نہ کوئی شریعت کہ جس سے اپنے دینی دنیوی مسائل کا حل سوچیں۔ اللہ تعالےٰ نے تورات دینے کا وعدہ فرمایا۔ موسےٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں اللہ تعالےٰ کے پاس کتاب لانے کے لیے جاتا ہوں۔ جس میں تمھارے لیئے اوامر و نواہی کا بیان ہو گا اور چالیس روز کا وعدہ فرمایا اور ان پر ہارون علیہ السلام کو خلیفہ مقرر فرمایا۔ جب وعدہ کا دن آگیا تو جبریل علیہ السلام ایک گھوڑے پر تشریف لائے (جسے فرس الحیاۃ) کہا جاتا ہے کہ جس شئے پر اس کا قدم آتا تو وہ زندہ ہو جاتا۔ اس گھوڑے پر وہ موسیٰ علیہ السلام کو لینے آئے تھے۔

سامری نے بچھڑا کس طرح تیار کیا جب سامری نے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کی یہ کیفیت دیکھی۔ اور تھا وہ سنار اہل باجرمی کے قبیلہ سے تھا۔ اس کا نام میجا تھا۔ گھوڑے کی یہ کیفیت دیکھی کہ جہاں بھی قدم رکھتا ہے وہ جگہ سرسبز ہو جاتی ہے۔ وہ دراصل منافق تھا اور اس قوم سے تھا جو گاؤ پرست تھی۔ جب گھوڑے کا وہ کرشمہ دیکھ چکا تو دل میں سوچا کہ اس میں ضرور کچھ ہے۔ چنانچہ اس کے قدموں سے ایک مٹھی بھر مٹی لے لی۔

جبریل کا موسیٰ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ جبریل علیہ السلام کو پہچانتا تھا، کیونکہ یہ بھی اس سال پیدا ہوا کہ جس سال فرعون کے زمانہ میں بچوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ اس کی ماں نے خوف کے مارے جنگل میں جنم لیا۔ تو جبریل علیہ السلام آکر اسے غذا دے جاتے۔ چنانچہ وہ سیدھے انگوٹھے کو چوستا تو اس سے شہد پیتا اور بائیں انگوٹھے سے دودھ۔ یہاں تک کہ جوان ہو کر واپس قوم میں چلا گیا، جب دریا عبور کرتے وقت جبریل علیہ السلام کو پہچانا تو اس کی گھوڑی کے پاؤں کے نیچے سے ایک مٹھی بھر مٹی لے لی اور اپنے قابو میں رکھی، یہاں تک کہ اسے یہ وقت میسر ہوا۔

بچھڑے کی صفت و پرستش اور موسیٰ علیہ السلام کی واپسی جب موسیٰ علیہ السلام طور کی طرف چلے تو یہی سامری بنی اسرائیل کا وقت یاد رکھتا تھا جب کہ ان کا ایک قوم پر گذر ہوا (جو بت کی پرستش میں مست تھی) دیکھ کر موسےٰ علیہ السلام کو کہنے لگے: ہمارا خدا بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسے ان لوگوں کا معبود ہے۔ سامری کو یہ قول یاد تھا، اور خیال رکھتا تھا کہ اسی ذریعہ سے بنی اسرائیل کو گمراہ کروں گا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی روانگی کے بعد وہ زیورات جو بنی اسرائیل نے فرعونیوں سے ایک شادی کے لیے مانگے تھے۔ وہ ان کے پاس موجود تھے۔ بنی اسرائیل موسےٰ علیہ السلام کے وعدہ کو گنتے رہے اور بیس دن گزرنے پر کہنے لگے: اب موسیٰ علیہ السلام کا وعدہ ختم ہو گیا۔ انھوں نے رات اور دن علیحدہ علیحدہ ایک ایک یوم قرار دیا۔ کہنے لگے: موسےٰ علیہ السلام نے وعدہ خلافی فرمائی۔ سامری نے کہا: وہ زیورات مجھے دو جو تم فرعونیوں سے لے آئے تھے۔ وہ دراصل موسیٰ علیہ السلام نے جمع کر کے ایک گڑھے میں دفن کرا دیئے تھے۔ سامری نے وہ اٹھا کر تین دنوں کے اندر بچھڑا تیار کر لیا۔ اور اس میں وہی مٹی ڈال دی جو کہ جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے اُٹھائی تھی۔ اس سے وہ بچھڑا نہایت خوبصورت تیار ہو گیا اور اس سے بچھڑے جیسی آواز نکلتی تھی۔ اس میں گوشت پوست خون بال وغیرہ سب کچھ تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ آواز پیچھے سے داخل ہو کر آگے منہ سے نکلتی تو بچھڑے کی آواز کے مشابہ ہو جاتی۔

بچھڑے کو سامنے لا کر قوم سے کہنے لگا: یہ تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا معبود ہے۔ موسےٰ علیہ السلام بھول گئے ہیں یعنے انھیں راستہ نہیں ملا، حالانکہ ان کا معبود تو یہیں پر تھا۔ سب کے سب بچھڑے کی عبادت میں ٹوٹ پڑے۔ سوائے حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے بارہ ہزار متبعین کے۔ ہارون علیہ السلام نے انھیں بہت روکا اور کہا: اے میری قوم! تم اس گناہ میں مبتلا ہو چکے ہو۔ تمہارا رب رحمٰن ہے۔ تم میری اتباع کرو۔ اور میرا کہا مانو۔ انھوں نے کہا: نہیں ہم تو اس کی پرستش کو نہیں چھوڑیں گے جب تک موسیٰ علیہ السلام واپس نہیں آئیں گے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں: موسےٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تیس دنوں کا وعدہ دے کر گئے تھے۔ پھر دس دن بعد میں بڑھا دیئے گئے۔ انہی دس دنوں میں قوم گمراہ ہوئی، کیونکہ موسےٰ علیہ السلام پر تیس دن گذرے اور واپس نہ آئے تو قوم نے سمجھا کہ فوت ہو گئے۔ اُدھر بچھڑے کی خوبصورتی اور سامری کی گمراہ کن باتوں سے بہک گئے اور بچھڑے کی عبادت میں

منہمک ہوگئے۔ (کذا فی تفسیر امام ابی اللیث اور فرمایا یہی طریق صحیح ہے۔)

جب موسیٰ علیہ السلام واپس ہوئے تو قوم کی اس حالت کو دیکھ کر غصہ میں آگئے اور تختیاں پھینک دیں۔ ان میں سے چھ جزء آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ صرف ایک جزء باقی رہ گیا کہ جس میں حلال و حرام تھا اور جس کی طرف ان کی ضرورت تھی پھر بچھڑے کو آگ میں جلا دیا اور اسے ذرہ ذرہ کرکے دریا میں پھینکا گیا۔ لوگوں نے اس سے پانی پیا، صرف بچھڑے کی محبت سے اس کا اثر ان کے ہونٹوں سے زردی کی طرح ظاہر ہوا، پھر پیٹ پھول گئے۔ اس کے بعد توبہ ظاہر کرنے لگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب توبہ اس طرح قبول ہوسکتی ہے کہ تم اپنے آپ کو قتل کر ڈالو۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

مسئلہ گذشتہ حکم موسوی امت کے لیے تھا۔ ہمارے لیے ظاہری جسم کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرکے نفس امارہ کو قتل کرنے کا حکم ہے۔ جو کہ خواہش کے بچھڑے کی پرستش کرتا ہے۔ مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

(۱) اے شہاں کشتیم ما خصم بروں
ماند خصمے زو بتر در اندروں

(۲) کشتن این کار عقل و ہوش نیست
شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

(۳) نفس اژدرہاست او کے مردہ است
از غم و بے آلتی افسردہ است

(۴) گر بیابد آلتِ فرعون او
کہ بامر او ہمی رفت آبِ جو

(۵) آنکہ او بنیاد فرعونی کند
راہ صد موسیٰ و صد ہاروں زند

عدد چالیس کے فضائل چونکہ چالیس کو درجۂ کمال حاصل ہے اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس روز تورات کے لیے ٹھہرایا گیا۔ اس کی فضیلت کی چند وجوہ ہیں:

(۱) گنتی کے اعداد اصولی حیثیت سے صرف چار ہیں۔
(۲) احاد (یعنی ایک سے نو تک) عشرات (یعنی بیس تیس چالیس تا نوے)۔
(۳) مأت (یعنی سو دو سو تین سو تا نو سو)۔
(۴) الوف (یعنی ایک ہزار دو ہزار تا نوے ہزار۔ عشر کا عدد خود کامل ہے۔ کما قال تعالیٰ وتلک عشرۃ کاملۃ

ؔ (ترجمہ: (۱) اے بزرگو! ہم نے باہر دشمنوں کو تو ختم کر ڈالا لیکن اندرونی دشمن نہیں مر سکا حالانکہ اس سے بدتر ہے (۲) اس کا مارنا عقل و ہوش کا کام نہیں شیر باطنی کو خرگوش مارے یہ کوئی مذاق ہے (۳) نفس اژدہا ہے اسے مردہ کیسے ہوسکتا ہے اور غم وصلح نہ کرنے سے دور ہے (۴) اگر اسے فرعون کی قوت مل جائے تو اس کے حکم سے [illegible]

جب عشرہ کے عدد کو چار بار دہرا کیا جائے۔ (گنتی کے اعداد کا کمال اسی میں ہے)، تو چالیس ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نام کمال الکمال ہے۔

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کی تخمیر چالیس روز ہوئی جیسے کہ حدیث قدسی ہے:

طینت طینۃ ادم بیدی اربعین صباحًا۔ (میں نے آدم علیہ السلام کی مٹی کو چالیس روز تک خمیر میں رکھا۔)

(۲) چالیس کے عدد میں ایسی تاثیر رکھی گئی ہے جو دوسرے اعداد میں نہیں۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلے اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے فرمایا:

ان خلق احدکم مجمع فی بطن اُمہ اربعین یومًا نطفۃ ثم یکون علقۃ مثل ذالک ثم یکون مضغۃ مثل ذالک۔ (الحدیث)

(ترجمہ: تم سب کی تخلیق کے آغاز کا حصہ تمہاری ماؤں کے پیٹ میں نطفہ کی صورت میں چالیس روز تک جمع رہتا ہے پھر وہ علقہ بنتا ہے تو وہ بھی چالیس روز میں، پھر گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے تو بھی چالیس روز میں۔ اسی طرح وغیرہ وغیرہ)

(۳) جسم کے طلسم کو کنز روحانی کا پتلا بنانے میں بھی چالیس روز لگتے ہیں۔

(۴) پھر اسے صحیح کرنے میں بھی چالیس روز صرف ہوتے ہیں۔" یہ اللہ تعالٰے کا ایک ایسا دستور ہے کہ کبھی اس کے برعکس ہونے والا نہیں۔

اربعین لیلۃ میں رات کی تخصیص کی دو وجوہ ہیں:

(۱) رات صرف تعبد و تقرب الٰہی کے لیے مخصوص ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: ان اقرب مایکون العبد من الرب فی جوف اللیل (بندے کا اپنے مولیٰ سے قرب کا بہترین وقت آدھی رات ہے۔)

دوسری حدیث شریف میں ہے:

ینزل اللہ کل لیلۃ الی السماء الدنیا۔ (الحدیث) (اللہ تعالٰے کی (رحمت خاص) کا ہر شب آسمان دنیا میں نزول ہوتا ہے۔)

اسی معنے کو لے کر اللہ تعالٰے نے اپنے پیارے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک (الآیۃ) (اور رات کو تہجد پڑھیے اور آپ کے لیے زائد ہے)

اور فرمایا: سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلًا من المسجد الحرام (الآیۃ) (پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے عبد مقدس کو راتوں رات مسجد حرام سے سیر کرائی)

(۲) اگر لیلۃ کے بجائے دن کا ذکر کیا جاتا تو وہم پیدا ہوتا کہ شاید عبادت صرف دن کو کی جائے اور رات محض

استراحت کے لیے ہے۔ کما قال تعالےٰ :

ھوالذی جعل لکم اللیل لتسکنوا فیہ والنھار مبصرا (وہ اللہ تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون کرو اور دن کو بنایا تاکہ تم راستہ دیکھو)

جب رات کا نام لیا گیا تو موسےٰ علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ جس طرح عبادت دن کو کی جاتی ہے۔ اسی طرح رات کو بھی کی جاتی ہے۔ (کذافی تاویلات النجمیہ)

مسئلہ شیخ شہیر بافتادہ آفندی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ہمارے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے چالیس روز کو عبادت کے لیے متعین نہیں فرمایا بلکہ آپ نے رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف اختیار فرمایا۔ ہاں، ہاں۔ موسیٰ علیہ السلام کے عمل کا بھی اس سے ثبوت ملتا ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا : وواعدنا موسیٰ ثلثین لیلۃً واتممناھا بعشر۔ (اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تیس راتوں کا وعدہ دیا اور ہم نے اسے دس راتوں کو مکمل کیا۔)

جو حضرات خلوت میں بیٹھ کر عبادت کرتے ہیں۔ وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ (کذافی واقعات الشیخ الہدائی قدس سرہٗ اللہ نفسہ الزاکیہ)

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ شکر تین وجوہ سے کیا جاتا ہے :

(۱) اقوال سے
(۲) اعمال سے
(۳) احوال سے

اقوال سے تو اس طرح کہ نعمت کا بیان یوں کیا جائے کہ نفس کو اس نعمت کا اقرار ہو۔ اور لوگوں کے سامنے اظہار ہو اور اپنے مالک کے سامنے اپنی عاجزی کا اعتراف ہو۔ کما قال تعالےٰ : واما بنعمۃ ربك فحدث۔ اور نبی پاک صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : التحدث بالنعم شکر (یعنے نعمت کو بیان کرنا بھی شکر ہے) اور اعمال سے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی نعمت کو اس کی اطاعت میں صرف کیا جائے۔ اور بے فرمانی سے بچے اور جو طاعات اس سے رہ گئیں ان کے تدارک میں کوشش کی جائے اور گناہوں سے کنارہ کشی جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا : اعملوا اٰل داؤد شکرا۔ (اے آل داؤد شکر کا کام کرو)

احوال سے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ صفت شکوریہ سے اپنے نفس کو معمور کرے۔ ہر نعمت میں اپنے منعم کے سوا کسی دوسرے کا تصور نہ کرے۔ اور شکر میں صرف شکور کا خیال ہو۔ نعمتوں میں منعم کو دیکھے اور نعمت کو منعم سے سمجھے اور اسی طرح شکور کو شکر میں دیکھے اور شکر کو شکور سے اس اعتبار سے منعم کا تصور اور شکر کو دو نعمتیں خیال کرے یہ نعمت بھی میرے منعم سے مجھے ملی۔ جب یہ بات واضح ہو جاتے گی کہ وجود نعمت منعم کے جمال کا آئینہ ہے اور نعمت کا شکر شکور کے جمال کا آئینہ ہے

پھر منعم اور نعمت کا دیکھنا دیگر نعمت ہو جائے گی۔ الی غیر نہایۃ اس سے معلوم ہوا کہ اس کے شکر کی ادائیگی نہیں ہو سکتی اور اس کا شکر شکور کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛ و من یقترف حسنا نزد لہ فیہا حسنا ان اللہ غفور شکور۔ (اور جو نیکی کا کام کرتا ہے ہم اس کو نیکی میں بڑھاتے ہیں بے شک اللہ تعالیٰ غفور و شکور ہے)

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ بِاتِّخَاذِکُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ط

یہ پانچواں انعام ہے یعنی جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس قوم کو جو بچھڑے کی پجاری تھی، سے فرمایا کہ تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ یٰقوم کی اضافت شفقت کے لیے ہے۔ جانوں پر ظلم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے عذاب کو واجب کر کے ضرر پہنچایا۔ اور اس ثواب کو جو موسیٰ علیہ السلام کی خدمت گذاری سے نصیب ہوتا تھا۔ اسے کم دیا۔ باتخاذکم العجل، بچھڑے کو معبود بنا کر۔ اس کے بعد انھوں نے عرض کی: اب ہم کیا کریں۔ تو فرمایا، فتوبوا یعنی توبہ کا پختہ ارادہ کرلو۔ فار کی سببیت کی ہے، کیونکہ ظلم توبہ کا سبب تھا۔ الی بارئکم یعنی جس نے تمھیں پیدا کیا جو تمام عیوب و نقائص اور تفاوت سے بری ہے۔ اور تمھارے بعض کو بعض سے مختلف ہیئات اور شکلوں میں ممیز کیا اور لفظ باریؑ اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ لوگ جہالت اور عبادت کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں کہ اس علیم و حکیم کی عبادت کو چھوڑ بیٹھے کہ جس نے انھیں پیدا کیا۔ اپنی لطیف حکمت سے جو تمام تفاوت و تنافر سے بُری ہے اور اس بچھڑے کی عبادت میں مصروف ہوئے جو عبادت میں مشہور ہے۔ اور جو شخص اپنے منعم حقیقی کے حقوق کو پہچانے تو اس کا مستحق ہے کہ اس سے نعمتیں چھینی جائیں۔ اسی لیے وہ خود آپ کو قتل کرنے اور ترکیب انسانی کو توڑنے پر مامور ہوئے پھر انھوں نے عرض کی؛ ہم کیسے توبہ کریں، تو جواب میں فرمایا؛ فاقتلوا انفسکم یعنی تمھارا بے گناہ تمھارے مجرم کو قتل کریں اور انفسکم اس لیے فرمایا کہ مومن آپس میں بھائی ہوتے ہیں۔ اور بھائی گویا دوسرے بھائی کی جان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛ ولا تلمزوا انفسکم، یعنی اپنے بھائی مسلمان کے شکوے مت کرو۔ (کذا فی الیسر)

تفسیر ابی اللیث میں ہے کہ فار تعقیب کی ہے اور ان کی توبہ کا نام نفس کا قتل ہے یعنی توبہ کا پختہ ارادہ کر کے اپنے نفسوں کو قتل کرو۔ (کذا فی الکشاف)

تفسیر کبیر میں ہے کہ توبہ کی تفسیر قتل نفس نہیں بلکہ قتل نفس اس توبہ کا بیان ہے۔ گویا فرمایا کہ تمھاری توبہ نہیں مکمل ہو سکتی جب تک کہ تم اپنے نفسوں کو قتل نہ کرو۔ وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ مرتد کی توبہ کی تکمیل قتل میں ہے۔

ذٰلِکُمْ، تمھاری توبہ اور قتل۔ خَیْرٌ لَّکُمْ عِنْدَ بَارِئِکُمْ، اللہ تعالیٰ کے دربار میں زیادہ نافع ہے تمھارے اس فعل سے رک جانے سے جو سراسر عذاب ہے۔ اور قتل شرک کے لیے طہارت اور دائمی زندگی

اور سرمدی رونق کا وسیلہ ہے۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ط یہ خطاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یعنے تم جس کے مامور ہوئے۔ اسے بجا لاؤ۔ پس اللہ تعالیٰ نے تمھاری توبہ قبول فرمائی اور تم سے درگذر فرمایا۔

سوال: فتاب علیہم کیوں نہ فرمایا تاکہ ضمیر قوم کی طرف لوٹائی جاتی؟

جواب: چونکہ یہ نعمت کی تذکیر ہو رہی ہے اور یہ زیادہ مناسب مخاطبین کے لیے ہے نہ کہ گذشتہ لوگوں کے لیے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے تو انھیں قتل کرنے کا حکم دیا اور قتل کرنا نعمت نہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت بڑے گناہ پر متنبہ اور اس پر آگاہ فرمایا کہ اس بڑی مصیبت سے یوں چھوٹ سکتے ہو۔ اور یہ بھی دینی نعمتوں سے ایک نعمت ہے۔

إِنَّهُ وہ اللہ تعالیٰ هُوَ التَّوَّابُ بندوں کو توبہ کی بکثرت توفیق دینے والا اور ان کی توبہ کو بہت قبول کرنے والا ہے۔ الرَّحِيمُ ۝ مطیعین کے لیے کثیر الرحمۃ ہے۔ یہاں پر ان کے قتل کو اُن کے گناہوں کا کفارہ مقرر فرمایا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

فرو ماندگاں را برحمت قریب
تضرع کنانرا بدعوت مجیب

ترجمہ: عاجزوں کو رحمت سے قریب ہے عاجزوں کی دعا کو قبول کرنے والا ہے۔

بنی اسرائیل کی توبہ کا واقعہ مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے قتل کا حکم فرمایا تو وہ جنگل میں نہایت عاجزی و انکساری سے بیٹھ گئے اور انھیں کہا کہ جو بھی اپنے قاتل کی طرف ہاتھ بڑھائے گا یا اسے دیکھے گا یا اپنے ہاتھ یا پاؤں سے اسے ہٹانا چاہے گا وہ ملعون اور مردود التوبہ ہو گا۔ پھر وہ اپنی گردنوں کو اوپر اٹھاتے تاکہ آسانی سے مارنے والے گردن اڑائیں، لیکن مارنے والے کے سامنے کسی کا بیٹا ہوتا۔ کسی کا باپ کسی کا بھائی، کسی کا دوست تو مارنے سے ہاتھ رک جاتے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو عرض کی اب کیا کیا جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سیاہ بادل بھیجا تاکہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں، چنانچہ شام تک اسی طرح قتل کرتے رہے۔ جب کشت و خون بکثرت ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے رب سے دعا مانگی اور رونے لگے، زاری سے کہا: یا اللہ! بنو اسرائیل بہت مارے گئے اب انھیں کچھ تو باقی رکھ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بادل ہٹا لیا اور توبہ قبول فرمائی اور انھیں قتل کرنے سے روکا گیا۔ اس وقت ستر ہزار افراد قتل ہو چکے تھے۔ جو مر گئے وہ شہید کے حکم میں اور جو بچ گئے ان کے گناہ معاف کر دیئے گئے۔ نازد وحی بھیجی کہ قاتل و مقتول دونوں بہشت میں داخل کئے جائیں گے۔ یہ اس روایت کے مطابق ہے جس

میں ہے کہ مجرم کو مجرم قتل کرے۔ اب فاقتلوا انفسکم کا یہ معنٰے ہوا کہ مجرم ایک دوسرے کو قتل کریں ورنہ گزشتہ روایت کے مطابق قاتل سے مراد وہ مرد ہے جو بے گناہ تھا۔

سابقہ اُمتّوں کے مسائل

مسئلہ: اپنے نفسوں کو قتل کرنا وہ سخت امر ہے جو انھیں اس پر عمل کرنا لازم تھا۔ اسے اغلال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: جس عضو سے خطا ہو جاتی اسے کاٹنا ضروری تھا۔

مسئلہ: نماز سوائے مسجد کے اور جگہ جائز نہ تھی۔

مسئلہ: پانی کے بغیر ان کی طہارت نہیں ہو سکتی تھی۔

مسئلہ: روزے دار کو شام کے افطار کے بعد اگر نیند آ جائے پھر طعام کھانا حرام تھا۔

مسئلہ: گناہوں کی وجہ سے بہت پاک چیزیں ان پر حرام ہوگئیں۔ اسی وجہ سے مَن و سلویٰ کی بندش ہوئی۔

مسئلہ: زکوٰۃ تمام مال سے چوتھائی حصہ دینا لازم تھی۔

مسئلہ: جو گناہ ان سے رات کے وقت سرزد ہوتا تو صبح کے وقت ان کے دروازوں پر لکھ دیا جاتا۔

مسئلہ: مروی ہے کہ بنی اسرائیل جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اُون کا موٹا لباس پہنتے۔ اور اپنے ہاتھوں کو گردنوں سے باندھ دیتے۔

مسئلہ: یوں بھی ہوتا کہ کھوپڑی میں سوراخ نکال کر لوہے کی زنجیر اس پر رکھ کر ستون سے باندھ دیتے اور اس حالت میں عبادت ادا کرتے۔

ان سب امور کو اُصر یعنے اعمال شاقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ف: یہ تمام امور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے ہم سے اٹھا لیے گئے۔

توبہ کے مراتب توبہ بھی اللہ تعالےٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو خداوند قدوس نے صرف امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو عنایت فرمائی۔ ورنہ اگلی امتیں اس طرح کی توبہ سے محروم رہیں۔ اس کے چار مراتب ہیں:

(۱) پہلے مرتبہ کا نام توبہ ہے اور سالک کی یہ پہلی منزل ہے۔ اور یہ نفس امارہ کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ اور یہ ہے بھی عوام کے لیے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام برائیوں سے رک کر مامورات الٰہی بجا لانے پر مستعد ہو جائے۔ اور فوت شدہ نماز وغیرہ کو ادا کرے اور جن کے حقوق دینے ہیں انھیں واپس لوٹائے۔ جن لوگوں کو ناراض کیا ہے انھیں راضی کرے۔ اور گذشتہ بُرے اعمال پر افسوس کا اظہار کرے اور پختہ ارادہ کرے کہ آئندہ کسی برائی کے نزدیک نہ جائے گا۔

(۲) توبہ کے دوسرے مرتبہ کا نام اِنَابَۃٌ ہے (یعنی رجوع الی اللہ) یہ نفسِ لوّامہ کے لیے ہے اور یہ بھی خواص مؤمنین اولیاء اللہ کیلئے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مکمل طور پر اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع ہو اور دنیا سے روگردانی اور اس کے اسباب سے بالکل دوری اور عاداتِ سنجیدہ کا اختیار اور نفس کو بُری عادات سے باز رکھ کر اس کا تزکیہ اور اس کی خواہشات کی مخالفت اور اس کے ساتھ جہاد کرنے پر مداومت کرنا، کیونکہ نفس جب رجوع الی اللہ کا خوگر ہو جاتا ہے تو قلب کے حکم میں اور اُس کے اوصاف سے موصوف ہو جاتا ہے، کیونکہ رجوع الی اللہ قلب کی صفت ہے چنانچہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا: وَجَاءَ رَبَّہٗ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ۔

(۳) تیسرے مرتبہ کا نام رَوبَتٌ (رغبۃ الی اللہ ہے) اور یہ مرتبہ خواص اولیاء کا ہے۔ اور رغبۃ الی اللہ ہے اور یہ مرتبہ خواص اولیاء کا ہے۔ اور رغبۃ الی اللہ شوق لقائے الٰہی کی علامات سے ہے۔ جب نفس رغبت الی اللہ سے تکمیل پاتا ہے تو وہ روح کا مقام حاصل کر لیتا ہے اور راغب الی اللہ مشتاق لقائے الٰہی کی علامات سے ایک علامت یہ ہے کہ وہ اپنی طبعی عادت کو تنہائی کا عادی کرے۔ اور بظاہر نشست و برخاست دوستوں سے رکھے مخلوق سے دور رہے اور حق سے انس پیدا کرے اور نفس سے کونین کے تعلقات قطع کرنے کے لیے سخت جہاد کرے۔

(۴) (چوتھا مرتبہ) یہ نفس مطمئنہ کو نصیب ہوتا ہے۔ اور یہ مقام بھی سادات حضرات انبیاء علیہم السلام اور اخص الخواص اولیاء کا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ۔

یہ ایک جذبہ عنایت ربانیہ ہے جو انبیاء علیہم السلام اور اخص اولیاء کے نفوس قدسیہ کو انانیت سے کھینچ کر ہُوِیَّتِ حق کی جانب پہنچاتی ہے یعنی ان کے نف[illegible] طاعتِ الٰہی میں لقائے ربانی کے لیے مطیع رہتے ہیں پھر ان کو اسیر الی اللہ کی راہ میں چلنے کا موقع ملتا ہے۔ گویا اپنے نفوسِ قدسیہ کو مشاہدۂ لقائے ربانی میں مٹا کر دُوئی کا تصور ختم کر کے دائمی لقاء حاصل کر لیتے ہیں؛

حکایت جب حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کو قتل گاہ میں لایا گیا تو پہلے ان کا دایاں ہاتھ کاٹا گیا تو آپ ہنس پڑے۔ پھر دوسرے ہاتھ کو کاٹا گیا تو بہت ہنسے اور خیال کیا کہ شاید خون سے منہ میں تغیر نہ آئے تو اپنے منہ کو جہاں سے خون بہہ رہا تھا اس کے آگے کر دیا جس سے اس کا رُخ مبارک خون آلود ہو رہا تھا۔ اور آپ اشعار ذیل پڑھ رہے تھے؎

اَللّٰہُ یَعْلَمُ اَنَّ الرُّوْحَ قَدْ تَلَفَتْ
شَوْقًا اِلَیْکَ وَ لٰکِنِّیْ اُمَنِّیْھَا
وَنَظْرُکَ یَا سُؤْلِیْ وَ یَا اَمَلِیْ
اَشْھٰی اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا وَ مَافِیْھَا

۳ - يَا قَوْمِ اِنِّيْ غَرِيْبٌ فِيْ دِيَارِكُمْ
سَلَّمْتُ رُوْحِيْ اِلَيْكُمْ فَاحْكُمُوْا فِيْهَا

۴ - مَا اُسَلِّمُ النَّفْسَ لِلْاِسْلَامِ تَتْلَفُهَا
اِلَّا لِعِلْمِيْ بِاَنَّ الْوَصْلَ يُحْيِيْهَا

۵ - نَفْسُ الْمُحِبِّ عَلَى الْاَلَامِ صَابِرَةٌ
لَعَلَّ مُسْقِمُهَا يَوْمًا اَرْمِلِيْهَا

ترجمہ: (۱) اے اللہ! تجھے معلوم ہے کہ میں اپنی روح کو تیرے شوق میں خرچ کر رہا ہوں ۔ اور میری آرزو بھی یہی ہے ۔

(۲) اے میرے محبوب! اور میری تمنا تیری ہی نظر میرے لیے دنیا اور مافیہا سے زیادہ پیاری ہے۔

(۳) اے قوم! میں تمہارے دیار میں اجنبی ہوں۔ اور میں نے اپنی روح تمھیں دے دی اب تمھاری مرضی جس طرح چاہو کرو۔

(۴) میں اپنے نفس کو ان بیماریوں سے دور رکھنا نہیں چاہتا۔ جو اسے مٹا رہی ہیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وصال کے بعد میرا نفس ہمیشہ کے لیے زندہ ہوجائے گا۔

(۵) عاشق دکھ اور درد سے صبر کرتا ہے امید پر کہ جس نے زخمی کیا وہ کبھی تو مرہم بھی لگائے گا۔

اس کے بعد حضرت حلاج نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا: اے میرے آقا! میں تیرے بندوں میں ایک اجنبی ہوں اور تیرا ذکر مجھ سے زیادہ غریب ہے اور غریب کو غریب سے محبت ہوتی ہے۔ اسی حال میں ایک مرد نے ان سے پوچھا: يَا شَيْخُ مَا الْعِشْقُ. عشق کسے کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس کے ظاہر کو تم دیکھ رہے ہو، لیکن اس کا باطن مخلوق سے نہایت ہی مخفی راز ہے۔

تفسیر صوفیانہ

تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ ہر قوم کا ایک بچھڑا ہوتا ہے۔ جو اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اور وہ درا ہم وہ ہیں کہ جن کی پرستش میں ہر وقت لگے رہتے ہیں۔ اور دوسری ایک قوم ہے جو شہوات کے بچھڑے کی پرستش کرتے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو جاہ و جلال کے بچھڑے کی پرستش میں سرمست ہیں یہ لوگ اللہ تعالےٰ کے ہاں مبغوض ترین ہیں، پھر اللہ تعالےٰ ہر سعید کے موسےٰ (قلب) پر الہام کرتا ہے اور فرماتا ہے:

يَا قَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْا اِلٰى بَارِئِكُمْ اے قوم! ماسوا سے دور رہ کر اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کرو اور یہ سوائے نفس کو مارنے کے بغیر حاصل نہیں ہوسکے گا، کیونکہ شہوات نفس کی حیات ہے انہی شہوات کی وجہ سے فرعون ربوبیت کا مدعی ہوا اور بنی اسرائیل بھی شہوات کی وجہ سے بچھڑے کے پجاری بنے اور شہوات سے

ہی شیطان نے سجدہ سے انکار کیا اور متکبر بنا۔ یا یہ معنے ہے کہ نفس کو منہیات سے دور رکھ کر اسے قتل کر کے اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کرو۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کی مدد سے قتل کرو، کیونکہ نفس کو ظاہری قتل کرنا مومن اور کافر کے لیے آسان ہے لیکن باطن میں بڑا مشکل امر ہے صرف خواص اولیاء کے لیے سہل ہے جو صدق کی تلوار لے کر نفس کو اللہ تعالےٰ کی مدد سے قتل کرتے ہیں اسی لیے صدیقین کا مرتبہ شہداء سے بلند ہے۔ جب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جنگ سے واپس لوٹتے تو فرماتے: رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ (ہم جہاد اصغر سے فارغ ہو کر اب جہاد اکبر کی طرف جا رہے ہیں۔) اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہد جب کافر کی تلوار سے مارا جاتا ہے۔ تو وہ دکھ سے صرف ایک بار راحت پاتا ہے، لیکن جب صدق کی تلوار سے مارا جائے تو وہ دن میں ہزار بار نفس کو زندہ کرتا ہے اور ہر بار اسے نئی بصیرت نصیب ہوتی ہے اور نفس کے مکر میں ہر بار اضافہ ہوتا ہے۔ اسی لیے مجاہد اس جہاد سے آنکھ جھپکنے کی دیر بھی راحت نہیں پا سکتا اور نہ ہی اس کے مکر سے اسے اطمینان ہوتا ہے اصل صورت یہ ہے کہ نفس تدبیر حق کی ایک صورت ہے اور اللہ تعالےٰ کے تدبیر خفی سے صرف خاسرین ہی مطمئن رہتے ہیں۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ یعنے نفس سے صدق کی تلوار سے قتل کرنا تمھارے لیے بہتر ہے، کیونکہ ہر ایک قتل کے وقت مالک کے ہاں تمھارے لیے رفع درجات ہوتے ہیں، کیونکہ نفس کو قتل کرنے اور شہوات کے دور کرنے سے اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور قرب توبہ کی توفیق سے نصیب ہوتا ہے۔ یہی اللہ تعالےٰ کی رحمت ہے جیسے حدیث قدسی میں ہے:

مَنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا۔ جو بندہ میرے ہاں ایک بالشت نزدیک ہوتا ہے میں اس کے ایک گز قریب ہو جاتا ہوں۔

اسی کو اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

فَتَابَ عَلَيْكُمْ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

مثنوی شریف میں ہے ؎

۱ ثمرا گر بگذشت بیخش ایں دم است
آب ترتش دہ اگر او بے نم است

۲ بیخ عمرت را بدہ آب حیات
تا درخت عمر گردد بانبات

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قُلْتُمْ۔ یہ چھٹا انعام ہے یعنے یاد کرو، اے بنی اسرائیل! اپنے اسلاف کے ان ستر افراد کے قول کو کہ جب موسےٰ علیہ السلام انھیں کوہ طور پر گوسالہ پرستی کے عذر پیش کرنے کے لیے لے گئے تھے لیکن یہ ستر افراد ان ستر افراد کے غیر ہیں۔ جن کو فرعون کے غرق ہونے کے بعد تورات لینے کے لیے کوہ طور پر پہلی بار لے گئے تھے۔ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ، ہم تیرے اس قول کی تصدیق نہیں کریں گے کہ یہ اللہ تعالےٰ کی

ـــــــــــــــــــ

لہ ترجمہ: (۱) ثمر گیا جڑ تو باقی ہے اسے تر پانی سے تر و تازہ کر کہ وہ نمی سے خالی نہیں ہے (۲) اپنی زندگی کی جڑ کو آب حیات دے تاکہ تیرے ثمر کا درخت پھل دیسکے۔

کتاب ہے اور میں نے اس کا کلام سنا ہے اور تیرا یہ کہنا کہ ہمیں اس کتاب کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔
حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً ، یہاں تک کہ اسے ایسا ظاہر دیکھ لیں کہ اس کے اور ہمارے مابین کوئی چیز حائل نہ ہو۔

ف : جہر مسموعات میں ہوتا ہے جس طرح معائنہ مبصرات میں ہوتا ہے۔

ف : اس کی نصب علی المصدر یہ ہے، کیونکہ یہ بھی رویت ہے کی ایک قسم سے ہے گویا کہ فعل ناصب کا مصدر ہے۔ یا فاعل سے حال ہے۔ ای حتی نری اللہ مجاھرین یا مفعول سے حال ہے ای حتی نری اللہ مجاھرا (بفتح الھاء)۔

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ ۔ صاعقۃ اس جلانے والی آگ کو کہتے ہیں کہ جس میں آواز ہو اور وہ آسمان سے نازل ہو اور دراصل ہر اس امر کو کہتے ہیں جو ڈرانے والا مار دینے والا یا عقل وفہم کو زائل کرنے والا ہو۔ اس میں آواز بھی ہوتی ہے اور آگ بھی وغیرہ وغیرہ۔

فائدہ : انھیں صاعقہ نے اس لیے جلایا کہ انھوں نے وہ سوال کیا جو کہ دنیا میں محال ہے یا اس لیے کہ ان کی سرکشی اور ضد حد سے بڑھ گئی۔

عقیدہ : رویت مقدسہ بحیثیت کیفیت کے مومنین کو نصیب ہوگی، لیکن آخرت میں بعض انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں باعتبار بعض احوال کے دنیا میں حاصل ہوئی۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ تم اس صاعقہ کو آسمان سے نازل ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اگر وہ نار تھی تو پھر تمام نے دیکھا۔ اگر وہ آواز تھی تو پھر جو مر گئے ان کے بقایا نے سنی دیکھی جو مر گئے اسے مجازاً رویۃ الموت سے موسوم کرتے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ ، پھر ہم نے تمھیں زندہ کیا۔ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ، اس صاعقہ کے سبب تمھاری موت کے بعد۔

سوال : بعث کو مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ سے کیوں مقید کیا گیا۔ حالانکہ بعث بھی موت کے بعد اٹھنے کا نام ہے؟

جواب : کبھی بعث کا اطلاق اغمار اور نیند پر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے وہم پیدا ہوتا کہ یہاں بھی یہی معنے ہے۔ اس وہم کے زائل کرنے پر من بعد موتکم اضافہ کیا گیا۔

ف : حضرت قتادہ فرماتے ہیں : انھیں زندہ اس لیے فرمایا تاکہ وہ اپنی بقایا زندگی اور رزق پورا کرلیں، کیونکہ ان کی یہ موت وقت سے پہلے تھی اور ان کے حق میں یہ موت ایسے تھی جیسے دوسروں کے لیے سکتہ طاری ہوتا ہے، کیونکہ اگر وہ اپنی میعاد پر مرتے تو پھر قیامت تک نہ اٹھتے۔

سوال : موت کے بعد مکلف بنانا اگر جائز ہے تو پھر آخرت میں بعد از موت کیوں نہیں مکلف بنایا جاتا؟

جواب : ان کے مکلف بننے سے مرنے کے بعد زندہ ہونے سے مانع ہے کہ انھیں قیامت کے دن بہشت کی لذتوں اور دوزخ کی تکالیف کی معرفت پر مجبور کیا گیا۔ علم بدیہی کے بعد تکلیف ہبط جاتی ہے۔ اور ان کو علم بدیہی حاصل نہ تھا اور نہ ہی معرفت۔ قیامت بہشت کی نعمتوں اور دوزخ کی تکالیف کی معرفت پر ان کو مجبور کیا گیا، بلکہ موت کے بعد زندہ ہونا بمنزلہ نوم و اغماء کے تھا۔ اب ان کو مکلف بنانے میں کسی قسم کا اشکال نہیں۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ تاکہ تم اس کی نعمتوں کا اظہار اور اس کی توحید بیان کرکے اور فرمانبردار ہو کر صاعقہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دیکھ کر ایمان کی نعمت کا شکریہ ادا کرو بعد اس کے کہ تم حتّٰی نری اللہ جھرۃ کہہ کر کافر ہو چکے تھے، کیونکہ نعمت کی زیادتی کی طلب میں نعمت کا ترک کفرانِ نعمت ہے۔ یعنے تم ایمان کی نعمت کا شکریہ ادا کرو۔ پس اس معجزہ کے ظہور کے بعد کسی اور شئے کی طلب ہرگز ہرگز نہ کرنا۔

بنی اسرائیل پر صاعقہ کا وقوع

جب موسےٰ علیہ السلام طور سے واپس قوم کے ہاں پہنچے تو ان کی قبیح حالت کو دیکھ کر اپنے بھائی اور سامری سے جو گفت گو فرمائی وہ مشہور ہے۔ پھر بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں ڈال دی۔ اب قوم نے نادم ہو کر موسےٰ علیہ السلام سے عرض کی، اگر ہمارے رب نے ہمارے گناہ نہ بخشے تو ہم خاسرین سے ہوں گے۔ آپ ہمارے لیے سفارش فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا : آپ ان کو لے کر ان کی کوتاہی کی معافی چاہیں۔ چنانچہ آپ نے ان میں سے برگزیدہ ستّر افراد کو چن لیا۔ جب کوہ طور کے قریب پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے۔ لیکن جو یوں کہ ہم اس کا کلام بلا واسطہ سن لیں۔ موسےٰ علیہ السلام کوہ طور کے قریب گئے تو آپ کو ایک بادل نے گھیر لیا آپ نے د تو اس میں داخل تھے اور قوم کو بھی فرمایا کہ تم بھی اس میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ بھی داخل ہوئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا۔ جس میں امر و نہی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے موسےٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تو موسےٰ علیہ السلام کی پیشانی سے ایک نور چمکا کہ جس کو وہ ستّر آدمی دیکھ نہ سکتے تھے۔ جب انھیں موسےٰ علیہ السلام کے ساتھ کلامِ الٰہی کے سننے کا شرف حاصل ہوا۔ اور اوامر و نواہی کے فرامینِ مقدسہ سنے تو دیدارِ الٰہی میں طمع ظاہر کر بیٹھے۔ اس پر انھیں صاعقہ نے گھیرا تو بیہوش ہو کر گر پڑے اور ایک دن اور ایک رات مرے رہے۔ اب موسےٰ علیہ السلام روئے اور اللہ تعالیٰ کے دربارِ اقدس میں گڑگڑاتے ہوئے، آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر عرض کرتے ہیں کہ الٰہی میں نے بنی اسرائیل کے برگزیدہ ستّر آدمی چنے تاکہ ان کی توبہ قبول ہونے پر وہ میرے گواہ بنیں۔ اب میں ان کے پاس جا کر کیا جواب دوں گا، تُو نے انھیں ہلاک کر دیا۔ اگر انھیں بچھڑے والوں کے ساتھ ہلاک کر دیتا، تو اچھا ہوتا۔ کیا تو مجھے قوم کے ذریعہ ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ ان کی عجز و زاری سے اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ فرمایا۔ ان کے ارواح واپس لوٹائے۔ اب توبہ کی قبولیت اس شرط میں مشروط ہوئی کہ وہ لوگ اپنے آپ کو قتل کریں۔

سوال : موسےٰ علیہ السلام نے بھی تو دیدار کا سوال کیا تھا، لیکن ان پر موت طاری نہ ہوئی کیونکہ ان پر جو بیہوشی طاری ہوئی وہ موت نہیں تھی بلکہ غشی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : فَلَمَّآ اَفَاقَ۔ لیکن قوم کا کونسا جرم تھا کہ جب اپنی توبہ قبول

کرانے جارہے ہیں۔ اور اس میں دیدار کا سوال کر بیٹھے جس پر ان بے چاروں کو موت کا مزہ چکھنا پڑا۔

جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سوال محض اشتیاق اور عاجزی کے اظہار کی بنا پر تھا۔ اور قوم کا سوال تکذیب اور گستاخی پر مبنی تھا۔ ان کا سوال استرشادی نہ تھا، بلکہ عنادی تھا، کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ شاید باری تعالیٰ کسی جسم میں متشکل ہے اس ظن کے مطابق اس کے دیدار کو جسم کی شکل میں تصور کرکے دیدار کا شوق کر بیٹھے اور یہ بات محال تھی۔

مسئلہ آیت سے نفی رویت کا ثبوت نہیں ملتا، بلکہ اس میں الٹا رویت کے امکان کا ثبوت مل رہا ہے، کیونکہ ان ستر افراد نے دیدار کی تمنا ظاہر کی تو انھیں اس سے روکا نہ گیا۔ اسی طرح خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رویت کی التجا کی تھی، ان کو بھی منع نہیں کیا گیا۔ اِنِ استقر مکانہ فسوف ترانی، رویت کو استقرار مکان پر معلق کرکے ثبوت دیا جارہا ہے کہ رویت از قبیل ممکنات ہے۔

دنیا میں دیدارِ الٰہی کے امتناع کے وجوہ

① دنیا دار الاعدار ہے اسی لیے اسے جنت الکافر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اغیار میں محبوب کا جلوہ نہیں دکھایا جاتا۔

② اگر مومن کو دیدار نصیب ہو جائے تو کافر کہیں گے کہ ہم بھی اگر اسے دیکھ لیں، تو اس کی عبادت کریں گے۔ اب سلسلہ مساوی ہو تو پھر ان دونوں میں کیا فرق رہے گا۔

③ جو مزا (غیب) انتظار میں ہے وہ (عین) دیدار میں نہیں۔

④ دنیا محل معیشت ہے اگر اس کا دیدار نصیب ہو جائے تو پھر معاش اور بود و باش کے سلسلہ میں خلل پڑ جائے گا۔

⑤ اس زیارت کو قلب سے متعلق کیا گیا تاکہ ملائکہ کو مومنین کے قلب کی صفائی کا اندازہ معلوم ہو۔

⑥ اس کی شان کی رفعت مطلوب ہے، کیونکہ جس امر سے روکا جائے تو اس کے حصول میں طبعیت کا اشتیاق زوروں پر ہوتا ہے۔

⑦ اس دیدار کی ممانعت سے بھی بندوں پر رحم کرنا مقصود ہے، کیونکہ دنیا میں بندوں کی فطرت کو غیرت سے مزین کیا گیا ہے اگر دیدار الٰہی سے ان کے علاوہ کسی دوسرے کو نصیب ہو جائے تو غیرت سے ان کے دل پھٹ جاتے ہیں جیسے پہاڑ سے ان کی کیفیت ہوئی کہ اسے دیدار الٰہی کے جلوے تو نصیب تھے ہی، لیکن جب موسیٰ علیہ السلام نے بھی شرکت چاہی تو پہاڑ غیرت سے پاش پاش ہو گیا۔

ف: دیدار کا مطالبہ کرکے پھر اس کے دیکھنے سے غفلت کر جانا بڑی بے ادبی اور ترک تعظیم تھی۔ اور یہ لعبیدی اور شقاوتِ قلبی

کی علامات سے ہے اس کے بعد عدل کی بنا پر جلالِ الٰہی نے ان کو صاعقہ سے گرفت کر کے ان پر نعمتوں سے نوازا۔ کما قال اللہ تعالےٰ :

ثم بعثناکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون۔

اس میں بھی اپنے فضل کا اظہار فرمایا سعادت اور قرب کی ایک علامت و دلالت یہ ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کے جلووں کے مکاشفے حاصل کرتا جائے اور ساتھ اس کے الطافِ کریمانہ کا ملتجی رہے۔

ف : جس کے حال کی اصلاح باری تعالیٰ فرماتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ لسانِ جہل کو بند کر کے رحمت کے دروازے پر سوالی بن کر سوال و جواب میں ادب کو ملحوظ رکھتا ہے۔

مثنوی شریف میں ہے ؎

پیش شاہاں میکنی ترک ادب[1]
نار شہوت را ازاں کشی حطب
چوں نداری فطنت و نور ھدی
بھر کوراں روئے را میزن جلا

تفسیر صوفیانہ نفس امارہ کو قتل کرنا ضروری ہے۔ اسے قتل کر کے عالمِ حقیقت میں جو چاہے حکم دے۔ امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

توبہ میں نفوس کو قتل کرنے کا حکم اس امت کے لیے منسوخ نہیں ہوا صرف فرق یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو نفوس کا قتل کرنا ظاہری طور پر تھا اور ہم اپنے نفوس کو قتل کرنے میں اپنے تک محدود رکھتے ہوئے باطنی طور پر یہ حکم بجا لائیں۔ اس سے صرف اللہ تعالیٰ تک پہنچنا اور نفس کا خرابیوں سے نکلنا مقصود ہو۔ بعض کا یہ گمان ہے کہ توبہ میں بنی اسرائیل کے لیے نفوس کا قتل کرنا سخت امر تھا۔ یہ غلط ہے۔ بلکہ ہمارے لیے یہ حکم سخت ہے۔ کیونکہ وہ تو ایک بار قتل ہو کر جان چھڑا گئے۔ لیکن خواص اولیاؑ کے لیے ہر آن اپنے نفوس کو قتل کرنے کا حکم ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

لَیْسَ مَنْ مَّاتَ فَاسْتَرَاحَ بِمَیِّتٍ
اِنَّ الْمَیِّتَ مَیِّتُ الْاَحْیَاءِ

یعنے جو مر گیا اسے میت مت کہو کیونکہ وہ تو مر کر جان چھڑا گیا۔ بلکہ موت اس کے لیے ہے۔ جو زندہ ہو کر ہر موت کا مزا چکھتا ہے۔

مثنوی شریف میں ہے ؎

قوت از حق خواہم و توفیق ولاف[2]
تا بسوزن برکنم این کوہ قاف

---

[1] ترجمہ : (۱) بادشاہوں کے سامنے ترک ادب کرتا ہے وہ یہ نار شہوت کی لکڑیاں جمع کر رہا ہے۔ (۲) جب تیرے ہاں سمجھداری اور نور ہدایت نہیں تمہیں اندھوں کے لیے کوئی [illegible]

تفسیر عالمانہ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ، یہ ساتواں انعام ہے۔ یعنے اے بنی اسرائیل! ہم نے تم پر بادل کو سایہ بنایا۔ واقعہ یوں ہے کہ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور دریا عبور کر کے آگے جنگل میں (جو کہ مصر و شام کے درمیان ہے) جا پڑے اس میں کوئی مکان وغیرہ نہ تھا۔ اللہ تعالے نے انہیں حکم دیا کہ جبارین کے شہر میں داخل ہو کر ان سے لڑو۔ اس حکم کو قبول کرتے ہوئے جب شہر کے قریب پہنچے تو سنا کہ وہاں کے لوگ بڑے سرکش اور سنگدل اور بڑے لمبے قد والے ہیں۔ (ہر ایک کا قد ستر گز کا تھا) ان سے لڑنے کے لیے رُک گئے اور کہا: اے موسے! تو اور تیرا رب جا کر ان سے لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھتے ہیں۔ اللہ تعالے نے ان پر سزا مقرر فرمائی کہ چالیس سال جنگل میں حیران پھیرتے رہیں۔ اور وہ جنگل بارہ فرسخ یعنے چھتیس میل لمبا چوڑا تھا۔ اس سے انہیں سخت گرمی پہنچی۔ اور بھوک نے ستایا تو موسے علیہ السلام کو عرض کیا۔ اللہ تعالے نے ان پر رحم فرمایا کہ آسمان سے نور کا ستون نازل فرمایا، جو رات کو ان کے ساتھ رہتا۔ اور جس رات چاند نہ ہوتا بجائے چاند کے چمکتا رہتا۔ اور ان پر ایک سفید بادل نرم نرم بھی بھیجا جو برسانے والے بادلوں سے نہایت اطیب تھا۔ جو انہیں سورج کی گرمی سے بچاتا چھتری کی طرح ان کے اوپر رہتا۔

بادل کو غمام اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آسمان کو چھپا لیتا ہے اور حزن کو بھی غم اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ قلب کو ڈھانپ لیتا ہے۔ بعد ازاں انھوں نے طعام طلب کیا، موسے علیہ السلام نے اللہ تعالے سے التجا کی۔ دعا مستجاب ہوئی۔ چنانچہ فرمایا:

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ، یعنے ہم نے ترنجبین (بفتح الراء وتسکین النون) اتاری۔ یہ سفید رنگ برف کی طرح ایک طعام جو شہد جیسی گھی سے مرکب شدہ غذا تھی۔ یا مَنّ ان نعمتوں کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالے نے بندوں پر بلا تکلیف اور بغیر کھیتی باڑی کرنے کے عنایت فرمائیں۔

کھمبی کے فضائل: یہ بھی اسی مَنّ سے ہے جس کے متعلق حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: اَلْکَمْاَةُ مِنَ الْمَنِّ۔ یعنی کھمبی مَنّ سے ہے جس کا پانی آنکھوں کی شفا ہے۔

ف: ظاہر بات یہ ہے کہ صرف اس کا پانی بغیر کسی دوسری چیز کی ملاوٹ کے آنکھوں کی شفا ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے بلا قید ذکر فرمایا، جس میں کسی چیز کی ملاوٹ کا بیان نہیں۔

حکایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالے عنہ فرماتے ہیں: میں نے تین کھمبیاں نچوڑیں اور ان کا پانی ایک شیشی میں بند کر کے رکھ دیا۔ اس سے میری لونڈی نے سُرمہ کی طرح استعمال کیا جو اللہ تعالے کے فضل سے صحت یاب ہو گئی۔

بقایا واقعہ: جب وہ لوگ اس سے اُکتا گئے تو کہنے لگے: اے موسے علیہ السلام! ہم اس کی چاشنی سے تنگ آ گئے ہیں۔ ہمیں گوشت چاہیئے۔ اللہ تعالے نے ان پر سلویٰ نازل فرمایا۔

وَالسَّلْوٰى یعنے سلویٰ کو جنوب کی ہوا سے جمع کر کے ان کے سامنے کر دیتی۔ ہوا سے ان کا حلق کاٹا جاتا اور

پیٹ چیر اجاتا، اور بال دور ہو جاتے۔ پھر سورج کی گرمی سے پک جاتا۔ اس کے بعد اسے مَن کے ساتھ کھاتے (گویا سلویٰ ایک پرندہ تھا......

ف : اکثر مفسرین یوں فرماتے ہیں کہ انھیں پکڑ کر ذبح کرتے اور مَن برف کی طرح طلوع فجر سے لے کر غروب شمس تک آسمان سے نازل ہوتی رہتی اور سلویٰ بھی۔ ہر شخص کل تک کی کفایت کا روزینہ لے لیتا۔ صرف جمعہ کے روز دو دنوں کا اکٹھا لیتے کیونکہ ہفتہ ان کی عبادت کا دن تھا۔ اور نہ ہی ہفتہ کو نازل کیا جاتا۔ اگر کوئی شخص روزینہ کی کفایت سے زائد لیتا تو وہ گل سڑ کر بدبودار ہو جاتا۔

كُلُوْا، اور ہم نے کہا، کھاؤ۔ مِنْ طَيِّبٰتِ، حلال چیزوں سے۔ مَا رَزَقْنٰكُمْ، جو کچھ ہم نے عطا فرمایا من و سلویٰ سے۔ لیکن یاد رہے کہ اسے ذخیرہ بنانے کی خاطر نہ اٹھانا اور نہ ہی میری نافرمانی کرنا۔ لیکن انھوں نے ضرورت سے زائد اٹھایا۔ اور گوشت کو خشک کر کے رکھا۔ اس خطرہ سے کہ شاید ختم ہو جائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہمیشہ تک جاری رہتا۔ طیّب ہر اس شے کو کہتے ہیں کہ جس سے نہ طبع نفرت کرے اور نہ شرع کراہت کرے۔ وَمَا ظَلَمُوْنَا، اور ہم نے ظلم نہ کیا بلکہ انھوں نے خود ہی اس بہت بڑی نعمت سے ناشکری کر دی اور رکاوٹ کے باوجود بھی اسے ذخیرہ کرنے لگے اور نہ ہی ہمارے حق کا خیال رکھا۔ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے کہ میرے عذاب کی طلب کی اور وہ رزق جو ان پر بلا مشقت و بلا تکلیف نازل ہوتا تھا، ناشکری کر کے اسے بند کرا دیا۔ وہ طعام ایسا تھا کہ نہ دنیا میں انھیں تکلیف اور نہ آخرت میں ان سے حساب۔ ہم نے وہ طعام ان سے ہٹا لیا جب کہ انھوں نے ہم سے بھروسہ چھوڑ دیا۔

مثنوی شریف میں ہے ؎

سالہا[1] خوردی و کم نامد ز خور
ترک مستقبل کن و ماضی رانگر

حدیث شریف حضور نبی اکرم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں، اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے نہ تو کوئی طعام بدبودار ہوتا اور نہ گوشت خراب ہوتا۔ اور اگر بی بی حوا علیہا السلام کی خیانت نہ ہوتی تو ہمیشہ تک عورتیں اپنے شوہروں کی خیانت نہ کرتیں، کیونکہ بدبو اس وقت سے شروع ہوئی۔

قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص کسی امر کی ابتدا کرتا ہے تو وہ امر دوسرے کے لیے سبب بنتا ہے۔ اسی طرح عورتوں کے لیے خیانت جاری رہے گی۔ اُن کی ماں نے سب سے پہلے یوں خیانت کی کہ ابلیس کی بات مان کر گندم کا دانہ کھا لیا۔ پھر آدم علیہ السلام کے پاس آکر انھیں طرح طرح کی باتوں سے رغبت دلا کر گندم کا دانہ کھلا دیا۔ اسی روز سے عورتوں کی خیانتیں اپنے شوہروں کے لیے شروع ہوئیں۔

---

[1] تو نے بہت سال کھایا لیکن کم نہ ہوا مستقبل کا خیال چھوڑ کر ماضی کو غور سے دیکھ۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں ؎

کرا خانہ آباد و ہمخوابہ دوست
خدا را برحمت نظر سوئے اوست

مسئلہ : (الاشباہ والنظائر) میں فرماتے ہیں کہ طعام جب متغیر ہو جائے اور اس کا تغیر بڑھ جائے تو وہ نجس ہے اس کا استعمال حرام ہے۔

مسئلہ : تیل، دودھ اور گھی جب بدبودار ہو جائیں تو ان کا استعمال حرام نہیں۔

تفسیر صوفیانہ جب اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو غربت کی سزا دی تو عین اس غم میں رحمت سے بھی نوازا۔ اور انعامات عنایت فرمائے کہ ان کے سروں پر بادل کو سایہ اور من و سلویٰ جیسے بہشتی طعام بھجوائے۔ اس سفر میں نہ تو ان کے بال بے ہوئے اور نہ ہی ناخن بڑھے۔ اور نہ ہی ان کے کپڑے پھٹے، بلکہ میل کچیل سے بھی صاف ستھرے رہے، اور جو صغیر ان کے تھے جوں جوں وہ بڑے ہوتے کپڑے بھی ان کے جسموں کے مطابق بڑھتے رہے۔ اور سورج بھی اپنی شوخی سے باز رہا۔ اسی طرح اس کا حال ہے جس نے اپنا سارا معاملہ اللہ تعالےٰ کے سپرد کر دیا، تو اس کے لیے بھلائی کے اسباب تیار ہو جاتے ہیں، لیکن بنی اسرائیل کی شومیِ قسمت کہ وہ الٹا خرابیوں کی طرف جھک گئے۔

کلوا من طیبات ما رزقنکم، یعنے امرِ شرع کے مطابق تم ہمارے رزق کو کھاؤ۔ وما ظلمونا یعنے جب کہ انھوں نے شرعی امور میں اپنی طبع کے مطابق تصرف کرنا شروع کیا، تو انھوں نے ہمارا کیا بگاڑا۔ ولکن کانوا انفسھم یظلمون۔ بلکہ انھوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا کہ حرصِ دنیا اور شہواتِ نفسانیہ کی طرف جھک گئے۔

ف : تنویر میں فرماتے ہیں کہ جس امر میں تمھارا داخلہ اللہ تعالےٰ کی رضا کے لیے ہوتا ہے تو اس کی تولیت اللہ تعالےٰ خود اپنے ذمہ کرم لگا لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے تجھے اس کی امداد شاملِ حال رہتی ہے۔ اور اگر تو اپنی مرضی کے مطابق اس امر کو شروع کرتا ہے تو پھر تجھے نفس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ (پھر وہ جس گھڑے میں ڈال دے)

حکایت ایک شخص جنگل میں جا رہا تھا اسے پیاس نے ستایا تو بڑی تلاش کے بعد اسے کنواں مل گیا۔ کنویں پر پہنچا تو پانی خود بخود باہر آگیا۔ اب وہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہنے لگا یا الٰہ العٰلمین مجھے یقین ہے کہ تو اس پر قادر ہے، لیکن مجھے تو اتنی طاقت بھی نہیں کہ اس سے پانی اٹھا کر پیوں۔ براہ کرم کسی اعرابی کو بھیج تاکہ وہ اس سے چلو بھر کر میرے منہ میں ڈالے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بھی تیرے الطافِ خفیہ سے ہے، لیکن میں تیری تدبیر سے بھی بے خوف نہیں ہوں۔

سبق بندے کو اس کی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے مغرور نہ ہونا چاہیئے بلکہ اسے چاہیئے کہ اس کی نعمتوں کے شکر کی ادائیگی میں جد و جہد کرے۔ اور نعمتوں کو فرمانبرداری میں صرف کرنے کی کوشش کرے۔ ورنہ گمراہ ہو کر بدبختی کا شکار ہو جائے گا۔

لے : ترجمہ : کسی کا گھر آباد اور گھر والی موافق ہے تو سمجھو کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے۔

حضرت شیخ ابو عبداللہ قرشی رحمۃ اللہ تعالٰے فرماتے ہیں کہ جو شخص (ولی) اپنی کرامات اور خوارق عادات سے کراہت نہیں کرتا جیسے عامی آدمی اپنے گناہوں سے کراہت نہیں کرتا وہ حق کے مابین حجاب اور رحمت ونعمت کے لیے اس سے پردہ بن کر ثابت ہوگی جیسے وہ کبھی سعادت کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح وہ شقاوت واستدراج کا موجب بھی ہو جاتی ہے جیسے کہ مثنوی شریف میں ہے ؎

(۱) بندہ می نالد بحق از درد و نیش
صد شکایت میکند از رنج خویش

(۲) حق ہمی گوید کہ آخر رنج و درد
مر ترا لابہ کناں او دوست کرد

(۳) ایں گلہ زاں نعمتی کن کت زند
از یاد در مطرودت کند!

سبق مومن سالک کے لیے ضروری ہے کہ ذات وصفات وافعال سے مستغنی ہو کر امر و نہی پہ ہر حال میں عمل پیرا ہو تاکہ وہ صدیقین اور اہل الیقین سے ہو جائے۔ اے اللہ ہمیں ان لوگوں سے بنا دے جو ہر آن تیرے ساتھ ہوتے ہیں اور اپنے تمام معاملات میں تجھے مقدم رکھتے ہیں۔ آمین آمین آمین بجاہ النبی الامین صلے اللہ علیہ وسلم۔

تفسیر عالمانہ | **وَاِذْ قُلْنَا**۔ یہ آٹھواں انعام ہے، کیونکہ اللہ تعالٰے نے ان پر شہر کا داخلہ مباح کر کے جنگل کی وحشت دور فرمائی یعنی یاد کرو اے بنی اسرائیل! جب کہ تمہارے آباء کو جنگل کی تکلیف سے نجات پانے کے بعد ہم نے فرمایا۔ **اُدْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ**، اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ۔ قریہ کی نصب علی الظرفیہ ہے۔ بیت المقدس کو قریہ سے تعبیر فرمایا۔ اور قریہ کے قاف کو بالفتح وبالکسر وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہوں، قری (بمعنے جمع ہونا) سے ماخوذ ہے۔

فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا، بغیر روک ٹوک کے خوشگوار جہاں سے چاہو کھاؤ۔ رغدا کی نصب علی المصدریہ ہے۔ کُلُوْا سے حال ہے۔ ای رَاغدین متوسعین۔ اس میں اشارہ ہے کہ انہیں داخلہ کا حکم اقامت و سکنیٰ کے لیے تھا۔ تیسیر میں فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے ہر شے مباح کی اور تم پر فراخی کر دی کہ اس میں عیش کرو۔ جہاں سے چاہو نہ کوئی تنگی ہے اور نہ کوئی رکاوٹ۔ ہر شے کا مالک کر دیا۔ بطریق غنیمت کے اور صرف کھانے کا ذکر اس لیے ہے کہ اصلی مقصود وہی ہے۔

وَّادْخُلُوا الْبَابَ، یعنے قریہ کے ابواب کے کسی دروازہ سے داخل ہو جاؤ۔ اس کے اس وقت سات دروازے تھے اور اس سے مراد دوسرا باب ہے جسے ہمارے زمانہ میں باب الحطہ اور باب القبہ کہتے ہیں۔ جس میں موسٰے وہارون علیہما السلام عبادت کرتے اور بنی اسرائیل ساتھ ہو کر اس میں نماز ادا کرتے۔ **سُجَّدًا**، یعنے سر کو تواضعاً نیچے کرتے ہوئے۔

لہ ترجمہ: بندہ اپنے درد والم سے حق کے آگے روتا ہے اپنے درد و رنج کی ہزاروں شکایتیں عرض کرتا ہے (۲) حق تعالٰی اسے کہتا ہے کہ رنج و درد تیرے ساتھ مذاق کرتے ہیں کہ یہ تو تجھے دوست سے نصیب ہوتے ہیں (۳) یہ گلہ تجھے نعمت سے ہونا چاہیے جو تجھے حق تعالٰی سے مردود بناتی ہے۔

جب کہ اس کا حقیقی معنے لیا جائے یا یہ سجدے کرتے ہوئے۔ اللہ تعالےٰ کی شکر گزاری ہیں کہ اس نے تمھیں جنگل سے نکالا تو یہ معنے شرعی ہوگا۔ وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ، حطة بالخبریۃ مرفوع ہے۔ اس کا مبتدا محذوف ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی: مَسْئَلَتُنَا مِنَ اللّٰہِ اَنْ یَّحُطَّ عَنَّا ذُنُوْبَنَا۔ یا منصوب ہے " اَیْ حُطَّ عَنَّا ذُنُوْبَنَا حِطَّةً۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے کلمہ شہادت مراد ہے۔ یعنے تم وہ کلمہ شہادت کہو جو گناہوں کو گرا دینے والا ہے۔ یعنے اور کہو: حِطَّةٌ۔

نَّغْفِرْ لَكُمْ، مجزوم ہے۔ اس لیے کہ امر کا جواب ہے۔ نغفر غفر سے مشتق ہے بمعنے ستر ای نستر علیکم۔ ہم تمھارے گناہ بخش دیں گے۔

خَطٰیٰكُمْ، خطیئة۔ خطاء سے (جو کہ صواب کی ضد ہے) مشتق ہے۔ یعنے اس کے طفیل تمھیں سزا نہیں دی جائے گی۔ جب کہ تم اس سجدہ اور دعا کے امر کو بجا لاؤ گے۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے گوسالہ پرستی کی تھی۔ اور پھر تائب ہوئے۔

وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ہم انھیں محسنین کو اپنے فضل سے ثواب میں بڑھائیں گے۔ اور ان سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے گوسالہ پرستی نہ کی۔ المحسنین اسے کہتے ہیں جو اپنے اور غیر کے فعل میں نیکی کرے۔ بعض کہتے ہیں: محسن وہ ہے جو عقیدۂ توحید پر مداومت کرے۔ اور اپنے نفس کے جملہ اُمور کو ٹھیک رکھے اور ادائیگی فرائض میں چست و چالاک رہے اور برائیوں سے رُکے۔ بعض کہتے ہیں: مُحسن وہ ہے جو ان اعمال پر پابند ہو جو نفس کو سنواریں اور شرعاً محمود ہوں۔

ف: اس جملہ کو امر کے جواب سے بدل بنا کر وعدہ کے ساتھ ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ محسن دائماً زیادتی ثواب کے درپے رہتا ہے۔ اگرچہ حطہ نہ بھی کہے۔ اور استغفار کرے پھر تو سبحان اللہ! مختصر یہ کہ ان کو دو چیزوں کا حکم ہوا۔ عمل یسیر اور قول صغیر ہے یعنے داخلہ کے وقت سر جھکا کر منہ سے حطہ پکاریں تاکہ گناہ معاف اور حسنات میں زیادتی نصیب ہو۔

فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا، یعنے ظالموں نے استغفار اور توبہ کے لفظ کو معصیت سے تبدیل کر ڈالا۔ قَوْلًا یعنے دوسرا وہ جو مامور بہ کے خلاف تھا۔ (بدّل) کا مفعول ثانی محذوف ہے۔ غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ، غَیْرَ الَّذِیْ قَوْلًا کی صفت ہے۔

سوال: بدل میں مغایرت کا مفہوم تو نکل سکتا تھا۔ اسے دوبارہ ذکر کرنے میں کیا فائدہ؟

جواب: تاکہ ان کی مخالفت پر نص ہو اور معلوم ہو جائے کہ ان کی مخالفت ہر طرح تھی قولاً بھی اور فعلاً بھی۔

ف: مروی ہے کہ انھوں نے حطہ کی بجائے حنطہ (گندم) کہا۔

بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بولی میں حطہ کے بجائے حطا سمقاثا (یعنے سرخ گندم) اور اس سے اللہ تعالےٰ کے

حکم کی حقارت مقصود تھی۔

ف : حضرت مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قریہ کا دروازہ بہت نیچے رکھا گیا تاکہ وہ داخل ہوتے وقت اپنے سر سجدہ کے لیے جھکا دیں۔ لیکن چونکہ وہ توسجدہ کے منکر تھے۔ اسی لیے اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔

اس وقت انھوں نے قولاً کی طرح فعلاً بھی حکم کی مخالفت کی۔ اور نیک لوگوں نے ہر طرح حکم کی فرمانبرداری کی اسی لیئے :

فبدل الذین ظلموا... الخ فرمایا ورنہ فبدلوا ہونا موزوں تھا۔

ف : ظاہری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف قولاً مخالفت کی عملاً نہیں جیسا کہ بعض جماعت کا خیال ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی مخالفت جس طرح قولاً تھی اسی طرح عملاً بھی۔ قولا غیر الذی قیل لھم کا معنے یہ ہے کہ انھوں نے اس امر کو تبدیل کیا جس کا انھیں حکم ہوا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا امر بھی تو ایک قول ہے۔ اس بنا پر انھوں نے تمام امرالٰہی کی مخالفت کی۔

فَاَنْزَلْنَا، ان کی مخالفت کے بعد۔ **عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا**، ہم نے ظالموں پر نازل کیا، یعنے ان لوگوں پر جنھوں نے ہمارے فرمان کو تبدیل کیا۔

سوال : عَلَیہم، کیوں نہ فرمایا تاکہ کلام مختصر ہوتا، حالانکہ الذین ظلموا اس سے قبل بھی گذر چکا ہے؟

جواب : اس سے تکرار لازم آتا۔ اس سے قبل (المحسنین) کا لفظ بھی گذرا ہے۔ اگر عَلَیہم کہتے تو محسنین کے دخول کا احتمال ہوتا اور الذین ظلموا سے تکرار لازم نہیں آتا اس لیے کہ ظلم کا اطلاق صغیرہ اور کبیرہ ہر دونوں پر ہوتا ہے اور فسق صرف کبائر کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ یہاں ظلم سے کبیرہ گناہ مراد ہیں، کیونکہ اس کے بعد فسق کا ذکر آگیا۔ اس قرینہ سے ظلم کا معنے گناہ کبیرہ ہوگا اور پہلے ظلم سے صغیرہ مراد ہے۔

رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ، ہم نے ان پر وہ عذاب مقدر کیا جو آسمان سے نازل ہوا۔ رجزاً کی تنوین تہویل و تفخیم کے لیے ہے۔ **بِمَا**، یہ 'ما' مصدریہ ہے۔ **كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ** ۝ یعنے یہ عذاب انھیں اس لیے مل رہا ہے کہ وہ طاعتِ الٰہی سے نکل گئے۔ رجز دراصل اس مکروہ شئے کو کہتے ہیں جس سے طبیعت نفرت کرے۔ اسی طرح رجس ہے یہاں طاعون مراد ہے۔

مروی ہے کہ صرف ایک گھڑی میں چوبیس ۲۴ ہزار افراد مر گئے۔ اور یہ بیماری ان کے لیے لگاتار رہی۔ یہاں تک کہ ستر ہزار افراد فوت ہوئے۔

طاعون کے فضائل و مسائل

حدیث شریف (۱) : حدیث شریف میں ہے کہ طاعون ایک عذاب ہے جو بنی اسرائیل پر یا پہلے لوگوں پر نازل کیا گیا۔ جس گاؤں کے متعلق تمھیں معلوم ہو تمھیں وہاں طاعون ہے تو اس گاؤں میں ہرگز نہ جاؤ۔ اور اگر تمھارے گاؤں میں طاعون آجائے

تو اس سے ہرگز نہ نکلو۔

حدیث شریف (۲) حدیث شریف میں ہے کہ میرے پاس حضرت جبریل علیہ السلام بخار اور طاعون دونوں کو لاتے۔ میں نے بخار کو مدینہ شریف میں رہنے کا حکم دیا اور طاعون کو شام کی طرف بھیج دیا۔ پس طاعون میری امت کے لیے رحمت ہے اور کافروں کے لیے عذاب۔

مسئلہ طاعون میں مرنے والا شہید ہے۔ اور قبر کے عذاب سے بھی محفوظ رہے گا۔ اسی طرح طاعون میں صبر کرنے والا اگرچہ طاعون کے بغیر کسی دوسری بیماری میں مرجائے تو قبر کے عذاب سے محفوظ رہے گا، کیونکہ وہ مرابط فی سبیل اللہ کی طرح ہے۔ خلاصہ یہ کہ طاعون کی بیماری میں مرنے والا شہید ہے۔ اسی طرح طاعون میں صبر کرنے والے کا حکم ہے۔

مسئلہ : پیٹ کی بیماری اور اسہال اور استسقار سے مرنے والا بھی شہید ہے، کیونکہ مرتے دم تک اس کا ذہن اور عقل صحیح رہتا ہے۔

مسئلہ : سل کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے۔ اسی طرح پانی میں غرق ہونے والا اور دیوار کے نیچے دب کر مرنے والا شہید ہے۔ اور اللہ تعالٰے کی راہ میں مرنے والا تو شہید ہے ہی۔

مسئلہ : ذات الجنب اور جل کر مرنے والا شہید ہے۔ جو عورت وضع حمل کے وقت مرجائے۔ وہ بھی شہید کے حکم میں ہے۔

مسئلہ جو اچانک کی موت مرے اور سرسام یا برسام اور بخارات اور قولنج اور پتھری سے مرنے والے شہید کے حکم میں داخل نہیں۔ اس لیے کہ ان کی عقلیں شدت درد سے مختل اور دماغوں پر ورم اور مزاجوں میں فساد آجاتا ہے۔

ف : طاعون ایک مرض ہے جو لوگوں میں اکثر واقع ہوتا ہے، لیکن وہ صرف ایک قسم کی بیماری ہے اور وبا رعام بیماری ہے کبھی تو وہ طاعون کے ساتھ آجاتی ہے اور کبھی اس کے بغیر۔

حدیث شریف حدیث شریف میں ہے : فناء امتی بالطعن والطاعون (میری امت طعن اور طاعون سے فنا ہوگی۔) آپ سے صحابہ کرام نے پوچھا کہ طعن تو ہم جانتے ہیں، اور طاعون کیا شے ہے۔ آپ نے فرمایا : وخز اعداءکم من الجن۔ (تمہارے اعداء جنوں کی سزا کو طاعون کہا جاتا ہے، لیکن ہر دونوں سے مرنے والا شہید ہوگا۔

ف : ابن الاثیر فرماتے ہیں : طعن بمعنے تیر سے قتل کرنا اور 'رجز' بمعنے طعن بلا نفاذ ہے۔ اور یہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے منافی نہیں جو آپ نے فرمایا "غدۃ کغدۃ البعیر تخرج فی مراق البطن": طاعون اونٹ کے غدہ کی طرح ایک غدہ ہے جو مراق بطن سے خارج ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن مراق بطن کی رگ میں نشتر لگاتا ہے اس کی نشتر اندازی سے ایک غدہ نکلتا ہے جن کی نشتر اندازی غدہ کے خروج کا سبب بنتی ہے اور غدہ گوشت کے اندر سے

نکلتا ہے۔ اور مراق پیٹ کے نچلے حصہ پر ہے۔

حدیث شریف میں ہے؛

حدیث شریف اذا بخس المکیال حبس القطر اذا کثر الزنیٰ کثر القتل و اذا کثر الکذب الھرج یعنے جب تول میں کمی ہوگی تو بارش بند ہوجائیگی اور جب زنا بکثرت ہوجائے گا تو خون ریزی بہت واقع ہوگی۔ اور جب جھوٹ عام پھیل جائے گا، تو فتنے اور فساد برپا ہوجائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ زنا سے جیتے جی کو مار ڈالناہے کیونکہ جو نطفہ زنا سے ٹھہرا وہ حکمی طور پر مارا گیا۔ اسی لیے اس کی سزا فوری موت مقرر ہے (یعنے سنگساری) کیونکہ عمل کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔ اسی لیے تو کم تولنے کی سزا بارش کی بندش بندوں کے رزقوں کی کمی کا باعث ہے۔ یونہی کذب کو سمجھو کہ وہ بندوں میں تفرقہ اور عداوت کا موجب ہے۔ اس لیے اس کی سزا بھی ہرج متعین ہوئی جو کہ فتنہ اور فساد کا سبب ہے۔

سوال؛ طاعون یا اس جیسی اور بیماری کو عام کیوں کر دیا جاتا ہے؟

جواب؛ تاکہ وہ بیماری شیطانوں کے لیے عذاب اور اہل ایمان کے لیے شہادت اور رحمت ثابت ہو، کیونکہ موت مومن کے لیے تحفہ اور فاسق کے لیے حسرت ہے اس کے بعد اللہ تعالےٰ ہر ایک کو قیامت میں اعمالِ دنیا کے مطابق اٹھائے گا۔ اور جزا و سزا ہوگی۔

مسئلہ طاعون سے بھاگنا حرام ہے، کیونکہ طاعون سے بھاگنا اپنے مالکِ مختار کو فراموش کرنے کا ثبوت دینا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا کہ طاعون سے بھاگنے والے اور مقیم کے لیے خود طاعون فتنہ ہے۔ بھاگنے والا کہے گا کہ مجھے اس سے بھاگنے سے نجات ملی اور مقیم کہے گا: میں ٹھہر گیا اس لیے مجھے موت آئی۔

حدیث شریف؛ حدیث شریف میں ہے طاعون سے بھاگنے والا جنگ سے بھاگنے والے کی طرح ہے۔ اور اس میں صبر کرنے والا جنگ میں صبر کرنے والے کی طرح۔

ف؛ زحف سے وہ جنگ مراد ہے، جس میں مخالف کی جماعت بکثرت معلوم ہوتی ہے۔ اس فرار سے لشکر سے جنگ میں بھاگ جانا مراد ہے، لیکن ضروری ہے کہ اسے مثل اور ضعف سے مقید کیا جائے۔

مسئلہ؛ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ طاعون سے بھاگنا حرام ہے کیونکہ یہ بھی گناہ کبیرہ ہے۔

نکتہ؛ ہوسکتا ہے کہ اس جنگ سے بھاگنا کوتاہی عمر کا سبب بن جاتے جیسے کہ جہاد سے بھاگنا قصرِ عمر کا سبب بن جاتا ہے اللہ تعالےٰ نے فرمایا؛ قل لن ینفعکم الفرار ان فررتم من الموت او القتل واذا لا تمتعون الا قلیلاً۔ (فرمائیے تمہیں بھاگنا نفع نہ دے گا اگر موت یا قتل سے بھاگو گے تو اس وقت تم زندگی کا نفع نہ اٹھاؤ گے مگر تھوڑا۔)

مسئلہ؛ فرار کی نیت کے بغیر کسی اور وجہ سے چلا جانا جائز ہے، لیکن اس رخصت کے لیے چند شرائط ہیں۔ اور ہیں بھی سخت۔ صرف محدود افراد اس پر کامیاب ہوسکیں گے؛

(۱) اعتقاد کی حفاظت۔

(۲) مرض کے اسباب عادیہ سے احتراز۔ مثلاً ہوا فاسد چلنے سے یہ نہ سمجھے کہ بیماری اسی ہوا سے پھیلی ہے وغیرہ وغیرہ موت سے بچنے کے لیے مختلف تدابیر سوچنا بیوقوفی اور عبث فعل ہے۔ اس کی حرمت کو عوام الناس جانتے ہیں پھر خواص کا کیا کہنا۔

ف: بعض بیماریاں متعدی ہوتی ہیں، لیکن ان میں بھی اذنِ الٰہی کا تصور ذہن میں ضرور رہے۔ حدیث شریف میں ہے: حضور پُر نور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ان من القرف التلف۔ یعنے بعض ملاقاتیں ہلاکت میں۔ قرف بالتحریک یعنے بیماروں سے ملنا ملانا۔

سوال: حدیث شریف میں ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا عدویٰ۔ یعنے کسی ایک کی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی۔ یہ تو پہلی حدیث کے خلاف ہے؟

جواب: اس میں طبعی تعدی کی نفی ہے بمطلقاً سرایت کی نفی نہیں چونکہ جاہلیت کے لوگ تعدی کے قائل تھے۔ اس لیے ان کے غلط نظریہ کو دور کرنے کے لیے یہ ارشاد ہوا۔ عوام اور مبتدی سالک کی ایک اسباب پر نظر ہونی چاہیئے۔ اور متوسطین کو توکّل کا کاربند ہونا چاہیئے۔ اور کاملین کے احوال کسی معاملہ کے پابند نہیں۔ توکل اور تسبب ان کے ہاں یکساں ہیں۔

مثنوی شریف میں ہے ؎

(۱) در حذر شوریدن شور و سر است
رد توکل کن توکل بہتر است

(۲) با قضا پنجہ مزن اے تند و تیز
تا نہ گیرد ہم قضا با تو ستیز

(۳) مردہ باید بود پیشِ حکمِ حق!
تا نیاید زخم از رب الفلق

حکایت

جالینوس نے اپنے شاگردوں کو دو ٹکیاں فندق کے برابر کی دے کر فرمایا کہ میرے مرنے کے بعد ایک کو لوہے کی سنان پر رکھ دینا اور دوسری کو پانی کے بھرے ہوئے گھڑے میں ڈال کر توڑ دینا۔ اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا، تو جس گولی کو لوہے کے سنان پر رکھا گیا تو لوہا پانی کی طرح بہ کر نیست و نابود ہو گیا۔ اور جسے پانی میں ڈالا گیا تو پانی منجمد ہو کر پتھر بن گیا۔

حکماً فرماتے ہیں، جالینوس کا اس سے مطلب یہ تھا کہ میرے پاس وہ ادویہ موجود ہیں جو لوہے جیسی شدید شے کو پانی پانی

(باقی بر صفحہ نمبر ۳۲۸)

لہ: ترجمہ (۱) خطرہ کے وقت شور مچانا شور و فغان ہے جا توکل کر اس لیے کہ توکل بہتر ہے (۲) اے تند و تیز مزاج قضا سے پنجہ سے نہ اڑا تا کہ تیرے ساتھ قضا و قدر کی جنگ نہ ہو جائے (۳) حکم الٰہی کے آگے مردہ کی طرح ہونا چاہیئے تاکہ تجھے رب الفلق سے نہ زخم...

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ
اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًاؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ
رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى
طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَ
فُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَاؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌؕ
اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ
وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ
بِغَيْرِ الْحَقِّؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ
كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ ع

ترجمہ: اور جب موسےٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے فرمایا: اس پتھر پر اپنا عصا مارو، فوراً اس میں سے بارہ چشمے بہ نکلیں گے۔ لوگوں نے اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ ہم نے فرمایا ہمارے دیئے رزق سے کھاؤ اور پیو اور زمین میں فساد برپا کرتے نہ پھرو اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا۔ تو آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہمارے لیے نکالے کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ فرمایا: کیا ادنےٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو۔ اچھا کسی شہر میں اترو تمھیں ملے گا جو تم نے مانگا اور ان پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے۔ یہ بدلہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاءؑ کو ناحق شہید کرتے تھے یہ بدلا تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے تجاوز کرنے کا۔

(بقیہ متن صفحہ گذشتہ)

کر سکتی ہیں، اور بہتے پانی کو بہنے سے روک سکتی ہیں، لیکن موت ایک ایسا مرض ہے کہ جس کا کوئی علاج نہیں۔ کسی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

الا یا ایھا المغرور تب من غیر تاخیر

فان الموت قد یاتی ولو صیرت قارونا

بل مات ارسطالیس بقراط بافلاج

و افلاطون بسرسام و جالینوس مبطوقاً

(اے دھوکہ میں آیا ہوا انسان جلد گناہوں سے توبہ کرلے، کیونکہ موت ضرور آئے گی۔ اگرچہ تو قارون جیسا بھی مالدار بن جائے۔ ارسطو سِل سے مرا اور بقراط فالج سے اور افلاطون برسام سے اور جالینوس اسہال سے۔)

(تفسیر آیات گذشتہ صفحہ)

تفسیر عالمانہ وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ ۔ یہ دیگر نعمت ہے جس کا بنی اسرائیل نے کفران کیا۔ یعنے یاد کرو۔ اے بنی اسرائیل جب موسےٰ علیہ السلام نے پانی کی طلب کی۔ لِقَوْمِهِ ، اپنی قوم کی خاطر یہ اس وقت تھا۔ جب جنگل میں پیاس سے مر رہے تھے تو موسےٰ علیہ السلام کے ہاں فریادی ہوئے، تو انھوں نے اللہ تعالےٰ سے ان کے لیے پانی طلب کیا۔ فَقُلْنَا ، پس ہم نے وحی کے ذریعہ فرمایا کہ اضْرِب بِّعَصَاكَ ، اپنے عصا کو مارو وہ جنت کے مورد کے درخت سے تیار شدہ تھا۔ جس کا طول بمطابق موسےٰ علیہ السلام کے قد مبارک کے دس گز تھا۔ اس کی شاخیں تھیں جو اندھیرے میں روشن ہو جاتی تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے بہشت سے اٹھایا تھا۔ توارثاً انبیاء علیہم السلام کو ملتا رہا۔ یہاں تک کہ شعیب علیہ السلام کے ہاں پہنچا۔ پھر انھوں نے موسےٰ علیہ السلام کو دے دیا۔ الْحَجَرَ ؕ لام عہد کی ہے۔ مخصوص پتھر کی طرف اشارہ ہے۔

حجرِ موسوی کا واقعہ مروی ہے کہ یہ پتھر طوری تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ اٹھا رکھا تھا بالکل ہلکا اور آدمی کے سر کی طرح چوڑا تھا۔ اس کی طرفیں چار تھیں اور ہر طرف میں تین آنکھیں تھیں۔ یا یہ وہ پتھر تھا۔ جو موسےٰ علیہ السلام کے کپڑے اٹھا کر بھاگ گیا تھا جب کہ موسےٰ علیہ السلام نے نہاتے وقت اپنے کپڑے اس پر رکھے اور وہ قوم کے پاس پہنچا۔ اس سے اللہ تعالےٰ نے اس کی برأت ظاہر کی ہے۔ جس کے متعلق قوم موسےٰ علیہ السلام کو ایک عیب لگاتی تھی۔ جبریل علیہ السلام نے موسےٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ اس کو اٹھا لیجئے۔ اس میں اللہ تعالےٰ کی قدرت ہے اور تیرے لیے معجزہ بن کر رہے گا۔

حدیث شریف حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی عادت تھی کہ وہ نہاتے وقت ایک دوسرے کے ستر کو دیکھا کرتے۔ لیکن موسےٰ علیہ السلام اس قبیح عادت سے بری تھے۔ وہ اکیلے جا کر غسل فرماتے۔ ایک دن اپنے کپڑے پتھر پر رکھے تو وہ کپڑے لے کر بھاگا۔ اور موسےٰ علیہ السلام اس کے پیچھے ہو لیے۔ جب قوم کے نزدیک پہنچے تو انہیں دیکھ کر کہنے لگے کہ انھیں تو اُدرہ نہیں ہے۔

اُدرہ وہ بالضم خصیہ کی پھونک (موٹاپن) کو کہا جاتا ہے۔ یا الحجر کی لام جنس کی ہے یعنے اپنا عصا ایسی شے کو مارو جو کہ پتھر کی جنس سے ہو اور حجت میں بھی زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ کسی ایک پتھر پر عصا مار کر پانی نکالنا زیادہ دلالت رہے ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے ثبوت میں بہ نسبت معین پتھر کے کیونکہ احتمال ہوگا کہ شاید اس مخصوص پتھر میں پانی کی تاثیر موجود ہو جیسا کہ مخصوص

پتھر میں مقناطیس ہوتا ہے کہ لوہے کو کھینچ لیتا ہے۔

فَانْفَجَرَتْ ، پس انھوں نے مارا جس سے بہ نکلے۔ فا ضرب محذوف کے ساتھ متعلق ہے اور انفجار بمعنے انسکاب اور ربخاس بمعنے ترشح۔ پہلے پانی اچھلتا ہے پھر بہتا ہے۔

مِنْهُ اس پتھر سے۔ **اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا** ط بارہ چشمے میٹھے پانی کے۔ قوم کی تعداد کے مطابق بہ نکلے تاکہ ہر قبیلہ کا علیٰحدہ چشمہ ہو۔

فائدہ: جب کسی جگہ پر نازل ہوتے تو عصا مارتے تو پانی بہنا شروع ہو جاتا۔ جب کوچ کرتے تب بھی عصا مارتے تو پانی بند ہو جاتا۔

قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ ، ہر ایک نے بارہ قبیلوں میں سے جان لیا۔ **مَشْرَبَهُمْ** ط یعنے اپنا خاص چشمہ یا اپنے پانی پینے کی جگہ تاکہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے پانی پر نہ جائے۔ مشرب مصدر میمی ہے یا ظرف مکان ہے۔

بارہ [۱۲] چشمے کیوں تھے چونکہ ان بارہ قبیلوں کی اپنی اپنی جماعت تھی۔ اور ایک دوسرے پر فوقیت رکھنے کا شوق رکھتے تھے اسی لیے ایک قبیلہ کا آدمی دوسرے قبیلہ میں عقد نکاح نہ کر سکتا تھا۔ محض طبعی فاخرانہ عادت کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے ان کے ہر ایک قبیلہ کے لیے علیحدہ علیحدہ نہر تیار کر دی تاکہ خود بھی پیئں اور جانوروں کو بھی پلائیں اور ایک دوسرے کے ساتھ نہ لڑیں نہ جھگڑیں۔ اور پتھر کے ہر ایک گوشہ کی تین راہوں سے ایک ایک چشمہ بہتا ہوا نہروں کی شکل بن کر ہر قبیلہ کے پاس پہنچتا۔ اور وہ چھ ہزار افراد تھے اور لشکر بارہ میل تک پھیلا ہوا تھا۔

سوال: اللہ تعالےٰ قادر ہے بغیر پتھر کے پانی جاری کر سکتا تھا۔ اور عصا کی ضرورت کے بغیر نہریں جاری فرما سکتا تھا۔ عصا کے ذریعے پانی بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: یہ اس کی حکمتِ بالغہ ہے کہ مسببات کو اسباب سے متعلق کرتا ہے تاکہ بندے اپنی مراد کو اسباب سے حاصل کریں، پھر ان اسباب کے ذریعہ ان کے لیے ثواب مرتب ہو۔ اور آخرت میں سزا و جزا مقرر ہو سکے۔

منکر معجزہ کی تردید جو شخص اس جیسے معجزہ کا منکر ہے۔ وہ اپنی جہالت و قلب تدبر کا ثبوت دیتا ہے کہ اس نے اللہ تعالےٰ کی قدرتِ کریمہ سے یہ بات بعید سمجھی، کیونکہ جب پتھر سے یہ بات ممکن مانتا ہے کہ پھر بال کاٹ اور لوہے کو کھینچ سکتا ہے تو کون سی شئے مانع ہے کہ اللہ تعالےٰ اس میں زمین میں سے پانی نکالنے کی قدرت پیدا کر دے۔ یا ہوا کو اطراف سے کھینچ لے جس میں تبرید کی قدرت ہے۔ اس کے سبب سے پانی ٹھنڈا ہو جائے۔

محمدی و موسوی معجزہ کا موازنہ امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی پاک صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھوں اور انگلیوں سے جو معجزات دکھلاتے وہ بہت بڑے معجزات شمار کئے جاتے ہیں کیونکہ ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ رات دن پتھروں سے پانی نکل رہا ہے۔ لیکن جو معجزہ ہمارے نبی علیہ السلام نے دکھایا وہ پہلے

کسی نبی علیہ السلام سے ہرگز ہرگز ظاہر نہیں ہوا، کیونکہ گوشت اور خون سے پانی کا نکلنا ایک لاحل عقدہ ہے۔ اس[ع] بات کی تہہ کو پہنچنے والا نہ کوئی دماغ اور نہ کوئی میٹر آج تک پیدا ہوا نہ آئندہ ہوگا۔ عجز کے سوا چارہ نہیں، گویا حیات النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات بھی تاقیامت اس قدر پُرزور عاجز کن ہیں کہ کسی کو کچھ کہنے کی مجال ہی نہیں۔

کُلُوْا ۔ یہاں قُلْنَا مقدر ہے یعنے ہم نے کہا یا انہیں کہا گیا کہ کھاؤ۔ **وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰہِ** ۔ وہ جو ہم نے من وسلویٰ اور پانی عنایت فرمایا کھاؤ اور پیو۔ اکل کا تعلق پہلے دو یعنے من وسلویٰ سے اور شرب کا تعلق پانی سے ہے۔

سوال: من رزقنا کیوں نہ فرمایا۔ حالانکہ فقلنا سابقہ کا تقاضا یونہی ہے کہ رزقنا ہونا چاہیئے؟

جواب: اشارہ ہے کہ اکل وشرب کا حکم بذریعہ خطاب نہ تھا، بلکہ موسےٰ علیہ السلام کے واسطہ سے تھا۔

وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ ۔ "عثی" بمعنے سخت فساد برپا کرنا۔ یعنے انہیں کہا گیا فساد میں سرکشی مت کرو۔ درآنحالیکہ **مُفْسِدِیْنَ** ○ تم فساد کرنے والے ہو۔ اس حال سے ان کی تعریف مقصود ہے کہ وہ فساد میں رہتے ہیں۔ عامل کو مقید کرنا مطلوب نہیں ورنہ معنے یوں ہوگا: تمادوا فی العناد حال کونکم مصلحین۔ اور یہ بالکل ناجائز ہے۔ یا یوں ہو کہ عَثْی کا اصل معنے ہے مطلقاً تعدی۔ اگرچہ بمعنے فساد میں اکثر آتا ہے۔ پس حال سے مقید کرنا عامل کے معنے کو خاص کرنا ہے۔

امتِ محمدی کی امتِ موسوی وغیرہ پر فضیلت

آیت سے امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کی فضیلت پر دلالت ہو رہی ہے کہ بنی اسرائیل جب پانی کے محتاج ہوں تو موسیٰ علیہ السلام کو عرض کریں۔ اسی طرح بقل وقثاء وغیرہ کے محتاج ہو کر موسےٰ علیہ السلام کو کہتے رہے، لیکن ہمارے لیے یہ حکم ہے کہ تم جب محتاج ہو کر براہِ راست اللہ تعالےٰ سے سوال کیا کرو۔ چنانچہ فرمایا: ادعونی استجب لکم۔ یہ بہت بڑی بشارت ہے۔ دوسرا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی وغیرہ طلب کیا اور عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے مائدہ مانگا۔ لیکن ہمارے نبی علیہ السلام نے ہمارے لیے مغفرت چاہی اور وہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے۔ چنانچہ فرمایا: واستغفر لذنبك وللمومنین۔

جب اللہ تعالےٰ نے موسیٰ کی طلب پر قوم کی ضرورت پوری کر دی تو ہمیں بھی امید ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا سوال پورا فرمالیا ہوگا۔

مسئلہ

آیت سے ثابت ہوا کہ پانی طلب کرنے کے لیے دعائیں کرنا جائز ہے۔ یہ اس وقت جبکہ بارش نہ ہوئی ہو اور اس کی ضرورت سخت ہو۔ پس اس وقت حکم ہے کہ اپنی عبودیت اور فقیری ومسکینی وذلت کو ظاہر کریں، کیونکہ ہمارے نبی پاک صلے اللہ علیہ وسلم بھی عیدگاہ کی طرف متواضع ومتذلل ہو ومتخشع ومتوسل ومتضرع ہو کر پانی کی طلب میں کئی بار تشریف لے گئے۔

ع: یہ عبارت ہماری ہے بطور تبصرہ بر تفسیر امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ ۱۲۔ اویسی غفرلہ۔

معجزہ حضرت جندبہ رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کے دن ایک اعرابی حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضور هلكت الكراع والمواشی واجدبت الارض۔ (ہماری بھیڑ بکریاں جانور مرتے جارہے ہیں اور زمین سوکھی پڑ گئی) دعا فرمائیے اللہ تعالٰی ہمیں بارش عطا فرمائے۔ حضور علیہ السلام نے ہاتھ اٹھائے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت آسمان گویا شیشہ تھا۔ یعنے بادل کا نشان بھی نہیں تھا۔ ادھر ہاتھ اٹھے ادھر بادل اٹھا اور لگا برسنے۔ دوسرے جمعہ تک لگاتار بارش ہوتی رہی۔

مثنوی شریف میں ہے ؎

تا فرود آید بلا بے دافعے!
چوں نباشد از تضرع شافعے

تا سقاہم ربہم آید خطاب!
تشنہ باش اللہ اعلم بالصواب

مسئلہ: دکھ دور کرنے کے لیے دعا نہ مانگنا اہلِ طریقت کے نزدیک بہت بُرا ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالٰی کے ساتھ مقابلہ کرنا اور اس کی تکالیف کو برداشت کرنے کا دعویٰ کرنا ہے۔

شیخ محقق ابن الفارض قدس سرہ فرماتے ہیں ؎

ويحسن اظهار التجلد للعدى
ويقبح غير العجز عند الاحبة

(دشمن کے سامنے اپنی طاقت ظاہر کرنا ضروری ہے، لیکن دوستوں کے سامنے قوت کا اظہار قبیح ہے۔)

حدیث شریف زمین چالیس مردوں سے (جو کہ خلیل الرحمٰن علیہ السلام کی طرح ہوں گے) خالی نہیں رہے گی۔ ان کی بدولت تمہیں بارش حاصل ہوتی ہے اور ان کے صدقے تم مدد دیئے جاتے ہو۔ ان میں سے جب ایک فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالٰی اس کے عوض دوسرا مقرر فرما دیتا ہے ؎

گر نہ داری تو دم خوش در دعا[2]
رو دعا مے خواہ از اخوان صفا

حدیث شریف حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی سال دوسرے سال سے بارش میں کم نہیں ہوتا، لیکن جب کوئی قوم گناہوں میں زیادہ مبتلا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالٰی ان سے بارش کو پھیر کر دوسرے لوگوں کو دے دیتا ہے۔ جب سب لوگ گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالٰی بارش کو جنگلوں اور ویرانوں میں برساتا ہے۔

---

[1] ترجمہ: نہ ملنے والی بلا جب نازل ہو تو درگاہ حق میں تضرع کے سوا کوئی بہتر سفارش نہیں (۲) پیاسا رہ تاکہ سقاہم ربہم (انہیں ان کا رب پلائے گا) کا خطاب آئے۔

[2] [illegible]

مسئلہ : شیخ بافادہ آفندی فرماتے ہیں کہ سالک کی ترقی سنن مصطفویہ علے صاحبہا التحیۃ والثناء پر مداومت کرنے میں ہوتی ہے۔

حکایت : ایک سال حجاج کے زمانہ میں بارش بند ہوگئی۔ لوگ کئی بار نماز استسقاء پڑھ چکے، لیکن کچھ نہ ہوا۔ انہیں کسی ذریعہ سے فرمایا گیا کہ اگر وہ شخص دعا کرے کہ جس کی عصر اور عشاء سے پہلے والی چار رکعتیں ترک نہ ہوئی ہوں، تو بارش ہو جائے گی۔ ورنہ اگر چالیس سال دعا مانگتے رہو گے تب بھی بارش نہیں ہوگی۔ ایسی عادت کا انسان بہت تلاش کیا گیا، لیکن مل نہ سکا۔ آخر حجاج نے ظاہر کیا کہ مجھ سے کبھی یہ سنتیں ترک نہیں ہوئیں۔ اس نے دعا مانگی تو فوراً بارش شروع ہوگئی

سبق : دیکھئے! یہ حجاج کتنا ظالم تھا، لیکن سنتِ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی برکت سے بارش حاصل ہوگئی۔

مسائلِ استسقاء

مسئلہ : استسقاء سے پہلے سب لوگ گناہوں سے توبہ کریں اور حسبِ توفیق خیرات کریں اور روزے رکھیں اور نیک لوگوں کو سفارشی بنائیں۔ اور پانی جانوروں اور بہائم اور ضعیف لڑکوں کے لیے طلب کریں۔ اللہ تعالےٰ ان کی برکت سے پانی عطا فرمائے گا۔

مسئلہ داعی دعا کے وقت یقین رکھے کہ میری دعا ضرور مستجاب ہوگی۔ کیونکہ دعا قبول نہ ہونے کے تین اسباب ہیں یا تو اللہ تعالےٰ اجابت دعا سے عاجز ہے۔ یا اللہ تعالےٰ کا کرم بالکل نہیں یا اللہ تعالےٰ داعی کی دعا سے بے خبر ہے۔ اور یہ سب امور اللہ تعالےٰ کے لیے منتفی ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالےٰ کریم ہے عالم ہے قادر ہے اجابت دعا سے عاجز ہرگز نہیں۔ وہ مومنین کے بالکل قریب ہے وہ دعا سنتا ہے اور زاری کو قبول کرتا ہے۔ دعا جب بھی ہو ہر وقت اجازت ہوتی ہے۔

مسئلہ : چاہیئے کہ دعا کے لیے ان نیک لوگوں کو ساتھ لے جائیں کہ جن کی اجابت میں قوی امید ہے، کیونکہ اللہ تعالےٰ بعض کی دعا قبول فرمائے گا تو اس کے کرم کے خلاف ہے کہ باقیوں کی دعا کو رد کرے

حدیث شریف حضور علیہ السلام نے فرمایا : ان زبانوں سے دعا کراؤ کہ جن سے اللہ تعالےٰ کی نافرمانی نہ ہوئی ہو۔ صحابہ نے عرض کی : حضور! ہم میں وہ کون ہیں۔ جو ایسی زبانیں رکھتے ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا : تمہارے بعض تمہارے بعض کے لیے دعا کریں، کیونکہ نہ تو نے اس کی زبان سے اللہ تعالےٰ کی بے فرمانی کی ہے۔ اور نہ اس نے تیری زبان سے۔

مسئلہ تفسیر الفاتحہ للفناری میں ہے کہ طلب کے وقت توجہ میں استقامت اور دعا کے وقت ندا کا ہونا ضروری ہے تاکہ قبولیت حاصل ہو۔ اس میں پھر اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اللہ تعالےٰ کو اجابت کے لیے نہ پکار سکا، کیونکہ اس کا خیال تو ان تصورات کی طرف مبذول ہے جو اس پر غالب ہیں۔ پھر اجابت دعا کا کیا معنٰے۔

حکایت : فرعون نے قبل از دعوائے الوہیت حکم دیا تھا کہ اس کے دروازہ پر بسم اللہ شریف لکھ دی جائے جب موسیٰ علیہ السلام

پر وہ ایمان نہ لایا تو موسیٰ علیہ السلام نے اس پر عذاب کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی لیکن اس سے کچھ نہ ہوا۔ پھر بارگاہِ الٰہی میں عرض کی، یا اللہ! میں اس کے لیے التجا کر رہا ہوں، لیکن تو توجہ نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیرا خیال تو یہ ہے اسے عذاب میں مبتلا کروں لیکن تو اس کے کفر کو دیکھ رہا ہے اور میں اس کے ان کلمات کو دیکھ رہا ہوں جو اس کے مکان کے دروازے پر لکھے ہوئے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسانی روح اور اس کے صفات عالم قلب میں بمنزلہ موسیٰ علیہ السلام کے ہیں کہ وہ اپنے رب سے پانی اسلیئے طلب کرتے ہیں تاکہ وہ حکمت اور معرفت سے معمور ہو جائیں اور اسے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ والے عصا کی ضرب کا حکم ہے اور اس عصا کی دو طرفیں نفی اور اثبات کی ہیں جن سے نور چمکتا ہے۔ جب کہ صفاتِ نفس کی تاریکیاں حملہ آور ہوتی ہیں۔ اور اس عصا کو حضرت باری تعالیٰ کی جنت سے اٹھایا گیا۔ اور حجرِ قلب پر مارا جاتا ہے۔ اور یہ قلب پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ پھر اس سے بارہ چشمے حکمت کے پانی کے بہ نکلے، کیونکہ لا الٰہ الا اللہ کے بارہ حروف ہیں اور ہر حرف کا علیحدہ چشمہ ہے۔ پھر انسان کی صفات کے ہر سبط نے اپنا گھاٹ معلوم کر لیا۔ اور صفات انسانیہ کے بارہ اسباط یوں ہیں: پانچ حواس ظاہری اور پانچ باطنی، ایک دل اور دوسرا نفس۔ ان میں ہر ایک کا گھاٹ لا الٰہ الّا اللہ کے حروف ہیں، کہ انسانی صفات کی ہر صفت نے اپنا گھاٹ معلوم کر کے لا الٰہ الا اللہ کے ہر حرف کو اپنا ساقی اور قائد بنا لیا۔ لا الٰہ الّا اللہ، کے چشموں سے کسی کا گھاٹ میٹھا اور اعلیٰ ذائقہ دار ہے اور کسی کا کڑوا اور بے لذت ہے۔ نفس کا چشمہ تو خواہشات وشہوات کا ہے۔ اور قلب تقویٰ و طہارت اور طاعت سے پیاس بجھاتی ہے اور روح کی سیرابی کشف و مشاہدہ اور اسرار سے ہوتی ہے جو اسے حقائق کے چشموں سے تجلی صفات کے پیالے ساقی کے ہاتھوں نصیب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو باری تعالیٰ شراب میں حقیقتِ ذات کے جلوے ملا کر خوب سیراب کرتا ہے۔

کلوا واشربوا۔ اے حقیقت شناس لوگو! اللہ تعالیٰ کے امر سے اس کے رزق کو خوب کھاؤ اور پیو۔ ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔ لیکن اس کے امر کی نافرمانی اور گناہوں کو اختیار کر کے اور دین کو دنیا سے بیچ کر کے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہوئے اور ان دونوں کو اپنے مولیٰ سے اعلیٰ سمجھ کر زمین پر فسادمت پھیلاؤ۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قُلْتُمْ، ان کے اسلاف کی اور خرابی کی یاد دہانی ہو رہی ہے کہ انھوں نے نعمتِ الٰہی کی ناشکری کی، موجودہ اہلِ کتاب کو بمنزلہ گذشتہ اہلِ کتاب کے قرار دے کر ان سے خطاب فرمایا، کیونکہ ان کے اور ان کے مابین اتحاد ہے۔ اور اس قول کے قائلین وہ لوگ تھے جو جنگل سے نکل کر من وسلویٰ عطا کیئے گئے۔ جب وہ اس کھانے سے اکتا گئے۔ اور انسان کی فطرت کا تقاضا بھی یونہی ہے کہ جب ایک شئے پر مداومت کرتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے۔ انہیں وہی پہلی معاش یاد آگئی جو انھیں مصر میں حاصل تھی۔ اور تھے وہ جاٹ اسی لیے ان کی طبیعتوں نے اپنے عادات کی طرف شوق کیا تو کہنے لگے؛

يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ۔ طعام وہ ہے جو غذا کے کام آئے۔ اس سے مراد منّ و سلویٰ ہے۔

سوال: طعام واحد کہہ رہے ہیں حالانکہ وہ تو دو تھے، من و سلویٰ۔

جواب: ان کو آپس میں ملا کر کھاتے۔ اسی لیے واحد کہا۔ یا طعام واحد اس لیے کہا کہ اس میں تبدل و اختلاف نہ تھا۔ اگر ایک شخص کے دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے نہ ہوں تو اچھا ہے، تو اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ ایک طعام پر اکتفا کرتا ہے،

تفسیر بغوی میں ہے کہ عرب کی عادت ہے کہ دو چیزوں کو ایک سے تعبیر کرتے ہیں جیسے قرآن شریف میں یخرج منهما اللؤلؤ والمرجان۔ حالانکہ لؤلؤ اور مرجان نمکین پانی سے خارج ہوتے تھے نہ کہ میٹھے سے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں: انھوں نے کہا ہم دولت مندی پر اکتفا نہیں کرتے، کیونکہ ہم سب غنی ہیں تو اس لحاظ سے ایک دوسرے کی امداد نہیں کرتے، کیونکہ ہر ایک دولت مند ہے۔ یہی ہیں سب سے پہلے نوکر و خادم مقرر کرنے والے۔

فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ - ہمارے لیے اللہ تعالےٰ سے سوال کیجئے۔ فاء سببیت کی ہے یعنے دعا سے صبر نہ کرنے کے سبب سے۔

يُخْرِجْ لَنَا یعنے ہمارے لیے ظاہر کرے۔ اور کوئی شے پیدا کرے۔ مفعول محذوف ہے اور جزم امر کے جواب کے لیے ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی دُعا اجابت کا سبب تھی یعنے اگر آپ اپنے رب سے ہمارے لیے دعا مانگیں تو آپ کا رب ہمارے لیے ظاہر کرے۔

مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ۔ یہ اسناد مجازی ہے۔ قابل (ارض) کو فاعل (اللہ) کے قائم مقام رکھا گیا ہے من تبعیضیہ اور ما موصولہ ہے۔

مِنْۢ بَقْلِهَا۔ من بیانیہ ہے۔ ضمیر سے حال کے قائم مقام ہے۔ ای مما تنبت کائنا من بقلها۔ بقل وہ سبزی جو زمین اگاتی ہے، لیکن یہاں پر مطلق سبزیاں مراد ہیں اور وہ چیزیں جنھیں لوگ عمل میں لاتے ہیں جیسے پودینہ و کرفہ اور گندنا وغیرہ وغیرہ۔

وَقِثَّآئِهَا، کھیرا۔ یہ ایک شے ہے جو ککڑی کے مشابہ ہوتی ہے۔ وَفُوْمِهَا یعنے گندم کیونکہ 'عدس' کا ذکر دلالت کرتا ہے کہ یہاں پر گندم مراد ہو، کیونکہ وہ اس کی جنس ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ 'فوم' سے مراد ثوم ہے کیونکہ 'بصل' کا ذکر دلالت کرتا ہے کیونکہ ثوم پیاز کی جنس سے ہے۔

ابن التمجید فرماتے ہیں کہ فوم سے ثوم مراد لینا زیادہ موزوں ہے کیونکہ اس کے قریب قریب بصل اور عدس کا ذکر ہوا۔ اور عدس کو پیاز اور ثوم سے پکایا جاتا ہے۔

وَعَدَسِهَا: مشہور دانہ ہے کہ جس کی کیل وزن برابر ہی ہے۔ وَبَصَلِهَا: مشہور سبزی ہے۔ اس سے ہانڈیوں یعنے سالن کو درست کیا جاتا ہے۔ قَالَ: جملہ مستانفہ ہے۔ سوال مقدر کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ گویا پوچھا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یا موسیٰ علیہ السلام نے انھیں کیا جواب دیا۔ تو کہا گیا کہ اس نے بطور انکار فرمایا۔ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ: اپنے نفسوں کے لیے بدلتے ہو اور وہ چیز پسند کرتے ہو۔ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى: جو نہایت کم مرتبہ اور گھٹیا درجہ کی ہے۔ بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ: اس کے عوض میں اچھی چیز۔ کیونکہ 'بار' زائل شے کی مصاحبت میں آتی ہے نہ کہ جو شے آنے والی ہو۔ من وسلویٰ کی لذت اور بلا مشقت حاصل ہونے کی خیریت بیّن ہے اور ثوم اور مسور اور پیاز وغیرہ کی خساست بھی ظاہر ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ گندم اگرچہ من وسلویٰ سے افضل ہے۔ لیکن اب توقیت کے لحاظ سے کم ہے۔ آیت سے قطعی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے یہ ارادہ کیا ہو کہ من وسلویٰ بالکل نہ ہوں۔ اور ان کے عوض وہ اشیا ہوں اور استدلال صرف صوری ہے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کبھی من وسلویٰ ہو اور کبھی یہ چیزیں اسی لیے تو انھوں نے کہا: لن نصبر علی طعام واحد۔

اِهْبِطُوْا: جنگل سے نکلو اگر تمھارا ارادہ ان اشیا کے حصول کا ہے۔ مِصْرًا: کسی ایک شہر میں۔ کیونکہ تم جنگل میں ہو اور جس چیز کے خواہشمند ہو وہ یہاں نہیں مل سکے گی۔ بلکہ اس کا حصول آبادیوں میں ہے۔

فوائد

ف[۱]: اس مصر سے مصرِ فرعون مراد نہیں، کیونکہ انھیں فرمایا گیا: یا قوم! ادخلوا الارض المقدسة التی کتب اللہ لکم۔ جب انھیں اس ارضِ مقدسہ کے داخلہ کا حکم دیا گیا تو اب مصر کا فرعون مراد لینا کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہی مطلب زیادہ مناسب ہے۔

ف[۲]: مصر ہر بڑے شہر کو کہتے ہیں۔ مصر الشیٔ یمصرہ سے ماخوذ ہے بمعنے انقطاع۔ چونکہ مصر اپنی عمارت کے اعتبار سے خالی میدان سے منقطع ہوتا ہے۔ بنابریں اس نام سے موسوم ہوا۔

ف[۳]: کبھی قریہ کو مصر کہا جاتا ہے جیسے کبھی مصر کو قریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ف[۴]: مصر منصرف بھی ہوتا ہے اور غیر منصرف بھی۔ یہاں پر منصرف ہے، کیونکہ ایک غیر معین شہر مراد ہے۔

ف[۵]: بعض مفسرین کہتے ہیں یہاں پر مصر فرعون ہی مراد ہے، لیکن اس کا منصرف ہونا سکون الاوسط کی وجہ سے ہے، جیسے هِنْدٌ و دَعْدٌ اور نوح ہیں۔ یا تاویلاً منصرف ہے کہ اس سے شہروں سے کوئی شہر مراد ہے۔ نہ خاص مصر۔ پھر اس میں صرف علمیت پائی گئی۔ بنا بریں منصرف ہے۔

فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ: شہر میں چلے جانے کی علت ہے۔ یعنے اب تمھارے لیے وہی زمین سے اُگائی ہوئی سبزیاں ہیں جن کی تمھیں طلب ہے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ: ذلت اور خواری۔ وَالْمَسْكَنَةُ

فقر و افلاس۔

ف : فقیر کو مسکین اس لیے کہا جاتا ہے کہ فقر اسے ساکن کر دیتا ہے اور گویا چلنے پھرنے سے ہٹا دیتا ہے یعنے انہیں ہر دونوں قبلہ کی طرف محیط ہو گئے یا انہیں چمٹ گئے۔ اور انہیں ذلت و فقر اس لیے لازم کیا گیا کہ انہوں نے کفران نعمت کیا۔ اس کی سزا یہ ملی کہ ذلت و فقر کا نشانہ ہو گئے۔ جیسے گارا دیوار کو لازم ہوتا ہے۔ انہیں بھی فقر و افلاس یونہی لازم ہوا کہ اب یہود کو دیکھا جاتا ہے کہ اگرچہ وہ دولت مند ہوتے ہیں، لیکن فقراء معلوم ہوتے ہیں۔

وَبَآءُوْا۔ راجع ہوئے۔ بِغَضَبٍ۔ بڑے بڑے رنج کے ساتھ۔ مِنَ اللّٰهِ ط جو اللہ تعالیٰ سے ہوا، یعنے اس کے مستحق ہوئے۔ اور ان کو لازم ہو گیا۔ اسی محاورہ سے حضور علیہ السلام کا قول ہے : اَبُوْءُ بِنِعْمَتِكَ عَلَی۔ یعنے اپنے نفس پر تیری نعمت کو لازم پکڑتا۔ اور نفس کو اس کے قریب کرتا ہوں۔

ف : اللہ تعالیٰ کے غضب کا یہ معنےٰ ہے کہ دُنیا میں ان کی مذمت کی اور آخرت میں انہیں بُری سزا دے گا۔

ذٰلِكَ ذلت و مسکنت اور عظیم غضب کا لازم ہونا بِاَنَّهُمْ اس سبب سے ہے کہ یہود کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے آیات سے کفر کرتے ہیں۔ آیات سے یہی معجزات مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام سے ظاہر ہوئے اور یہ بھی ہے کہ وہ قرآن پاک اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور آپؐ کی وہ صفات جو تورات میں تھیں ان کا انکار کرتے اور عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو جھٹلاتے ہیں۔ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ط نبیوں کو ناحق شہید کرتے تھے جیسے شعیب و زکریا و یحییٰ علیہم السلام کو شہید کر دیا تھا۔

ف : بغیر الحق کی قید سے اشارہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا قتل حق کی وجہ سے محال ہے اور وہ کفار قاتلین بھی ان کے قتل کو قتلِ ناحق سمجھتے تھے۔

سوال : انبیاء علیہم السلام کے قتل پر کفار کو کس طرح توفیق ملی ؟

جواب : اس میں بھی انبیاء علیہم السلام کی شان بڑھانا اور ان کے مراتب میں اضافہ تھا تاکہ ان سے وُہ معاملہ ہو جو کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں، نہ کہ اس میں معاذ اللہ ان کی رسوائی مطلوب ہوتی۔

ف : حضرت ابن عباس و حضرت حسن فرماتے ہیں کہ قتل وُہ انبیاءؑ علیہم السلام ہُوئے جنہیں جہاد کرنے کا حکم نہیں ملا تھا اور جنہیں جہاد کرنے کی اجازت تھی۔ ان میں سے کوئی نبی بھی شہید نہیں ہُوا۔ اس تقریر سے ثابت ہُوا کہ آیات ذیل میں تعارض نہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ؛

ویقتلون النبیین بغیر الحق ۔ (اور انبیاء علیہم السلام کو ناحق شہید کرتے تھے)

اور فرمایا ؛ انا لننصر رسلنا ۔ (ہم اپنے رسولوں کی مدد کریں گے)

اور فرمایا ، ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون ۔ اور بیشک ہمارا کلمہ ہمارے بندوں یعنی رسل کرام پر سبقت کر گیا اور مدد کیے جائیں گے

علاوہ گزشتہ تقریر کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ نصر سے حجۃ اور حق کا بیان مراد ہے۔ اس معنے سے تمام انبیاء علیہم السلام مددو دئے ہوئے تھے۔

ف : مروی ہے کہ صرف ایک دن میں ستر نبی شہید ہوئے (علیہم السلام)۔ مولانا روم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ؎

چوں سفیہا نراست این کار و کیا
لازم آید یقتلون الانبیاء
انبیاء راگفتہ قوم راہ گم
از سفہ انا تطیرنا بکم

ذٰلِكَ یہ جو مذکور ہوا، یعنی ان کا آیات عظام سے کفر اور انبیاء علیہم السلام کو شہید کرنا۔ **بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ** ع بسبب اس کے ہے کہ وہ میرے امر سے متجاوز ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کے محارم کے مرتکب ہو بیٹھے یعنی انھیں چھوٹے گناہوں نے ان بڑے گناہوں اور سرکشی کی طرف کھینچا کہ جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ چھوٹے گناہوں کی مداومت سے بڑے گناہوں کا ارتکاب ہو جاتا ہے جیسا کہ چھوٹی عبادات کی عادات سے بڑی عبادات ادا کرنے کی طلب حاصل ہو جاتی ہے۔

نسخۂ روحانی قلب کی غفلت ایک بیماری ہے جو ایمان کی لذت سے محروم رکھتی ہے کیونکہ بیمار بسا اوقات میٹھے کو کڑوا محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ غفلت دل کے لیے زہر قاتل ہے۔ جس طرح ہم زہردار طعام سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اسی طرح اللہ والے غفلت سے دور رہتے ہیں۔

ف : بندے اور مولیٰ کی مراد میں بہت بڑا فرق ہے۔ جس چیز کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے اس میں بھلائی ہوتی ہے بخلاف بندے کے کہ ضروری نہیں کہ اس کے ہر ارادے میں بھلائی ہو۔

ف : اگر بنی اسرائیل کے بجائے اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا التحیۃ والثناء ہوتی تو یہ بنی اسرائیل کی طرح باتیں نہ بناتے کیونکہ ان کے قلوب انوار سے معمور اور سینے اسرار سے مسرور ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف میں فرمایا: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔

تفسیر صوفیانہ جس طرح بنی اسرائیل ایک طعام پر صبر نہ کرتے ہوئے غیر معقول باتیں کہہ بیٹھے، اسی طرح انسان کا نفس اپنی کم ہمتی کی بنا پر اس طعام یعنی اسرارِ غیبی جو اللہ تعالیٰ سے اُسے نصیب ہوتے ہیں) کہتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبر کرتے جب کہ آپ پر واردات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

لَسْتُ كَاَحَدِكُمْ فَاِنِّیْ اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ۔

(مجھ جیسے تم کب ہو سکتے ہو مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا ہے)

بلکہ یہ انسان صبر نہ کر کے قلب مومن سے کہتا ہے ؛ فادع لنا ربك يخرج لنا مما تنبت الارض یعنی اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ ہمیں بشریت کی زمین شہوات حیوانیہ کی سبزی اور لذاتِ جسمانیہ کی ککڑی عنایت فرمائیں ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : اتستبدلون کیا تم باقی پر فانی کو ترجیح دیتے ہو اهبطوا مقاماتِ روحانی عاری سے اُتر کر قالب سفلی کے شہر پر چلے جاؤ فان لكم ما سألتم تمہیں وہی کچھ ملے گا جو تم نے خسیس مطالب طلب کیے وضربت عليهم الذلة والمسكنة جانوروں اور حیوانوں کی طرح تم پر ذلت وخواری مسلط کی جائے گی بلکہ اس سے بھی زیادہ ذلیل رہو گے کیونکہ تمہارا انجام اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستعد ہو چکا ہے ذلك بانهم كانوا يكفرون یہ اس لیے کہ وہ لوگ وارداتِ غیبیہ اور مکاشفاتِ روحانیہ سے کفر کرنے والے تھے بآيٰت الله ويقتلون النبيين بغير الحق اور عالمِ غیب سے انبیاء علیہم السلام کے مقام سے جو کچھ ان کو عطیہ ملا اس کو باطل قرار دیتے اور ان کے اسرار کا انکار کرتے یہ یہ خرابیاں اُنھیں ان کی شامتِ اعمال ہیں جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ کر اپنی جدوجہد طاعت کے بجائے معصیت میں جاری رکھی اور حق کی طلب کے بجائے ماسوا کی تمنا میں رہتے ہیں۔

مسئلہ : آیت سے ثابت ہوا کہ اچھا اور لذیذ طعام کھانا جائز ہے ۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میٹھے طعام اور شہد کو محبوب رکھتے اور ٹھنڈا میٹھا پانی نوش فرماتے تھے۔

مسئلہ : مسور کی دال اور زیتون صالحین کا طعام ہے ۔

مسور کی دال کے فضائل

حدیث شریف میں ہے :

عَلَيْكُمْ بِالْعَدَسِ فَإِنَّهٗ مُبَارَكٌ مُقَدَّسٌ۔

مسور کی دال کو لازم پکڑو اس لیے کہ وہ مبارک لا مقدس اناج ہے ، اس لیے کہ وہ قلب کو رقیق کرتی اور آنکھوں سے آنسو لاتی ہے ۔ اس کے لیے ستّر انبیاء اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دُعا فرمائی ہے ۔

(۲) حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ ایک روز زیتون سے ، ایک روز مسور کی دال سے ، ایک روز گوشت سے کھانا کھاتے تھے ۔ اگر اس میں کچھ فضیلت نہ ہوتی تو ان کا یہ معمول نہ ہوتا۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی کا کوئی طعام ضیافت سے خالی نہ تھا جس میں مسور کی دال نہ ہو۔

(۴) اس کا خاصہ ہے کہ جسم کو ہلکا پھلکا رکھتی ہے جس سے عبادت میں راحت میسر ہوتی ہے ۔

(۵) اس سے شہوتِ نفسانیہ میں اضافہ نہیں ہوتا جیسے گوشت اور گندم سے ہوتا ہے ۔

مسئلہ : پیاز اور لہسن کی طرح ہر بدبودار پاک شئے کا کھانا مباح ہے ۔

حدیث شریف میں ہے :
مَنْ اَكَلَ الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ وَكُرَاثَ فَلَا يَقْرِبَنَّ مَسْجِدَنَا۔
(جس نے پیاز، لہسن اور گندنا کھایا وہ ہماری مساجد کے قریب نہ آئے)
کیونکہ جس طرح بدبُو سے بنی آدم کو دکھ ہوتا ہے اسی طرح ملائکہ کو بھی ہوتا ہے۔
ف : اس سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو عبادت کے وقت اُترتے ہیں، نہ کہ وہ فرشتے جو بندوں کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں۔
ف : ملائکہ کو بدبُو سے دُکھ ہونا انہی مخصوص اشیأ سے یا عام ہر بدبو دار شئے سے ہوتا ہے اس کا علم شارع کو ہے۔
مسئلہ : اس علت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں اگرچہ کوئی بھی نہ ہو تب بھی یہ اشیأ کھا کر نہ جانا چاہیے، کیونکہ مسجدیں فرشتوں کی نزول گاہ ہیں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
اِن كُنْتُمْ لَابُدَّ لَكُمْ مِنْ اَكْلِهَا فَاَمِيْتُوْهَا طَبْخًا۔ یعنی اگر تمہیں ضرور کھانا ہی ہے تو ان کی بدبُو کو مٹا کر یعنی پکا کر کھاؤ۔
مسئلہ : اسی سے فقہاء نے مسئلہ اخذ کیا ہے کہ جہاں بھی لوگ جمع ہوتے ہوں وہاں بدبودار چیزیں کھا کر نہیں جانا چاہیئے۔
مسئلہ : اسی طرح لہسن و پیاز پر قیاس کرتے ہوئے ہر بُو دار شے کے مسئلے کا قیاس کیا گیا ہے۔
نکتہ : حضور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے پیاز وغیرہ سے اس لیے کراہت فرمائی ہے کہ آپؐ کے پاس وحی آیا کرتی اور آپ ربِ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتے۔ لیکن اپنے ماسوا باقیوں کے لیے مباح فرما دیا۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ آپؐ نے اپنی آخری عمر میں اسے بیانِ جواز کی خاطر تناول فرمایا۔
مسئلہ : رخصت کے ساتھ سالک کے لیے عزیمت (اعلیٰ طریقہ) یہ ہے کہ اپنے قول و فعل و حال میں اپنے نبی پاک شہِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرے۔ حضرت عارف جامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں : ؎

یا نبی اللہ السّلامُ عَلیکَ
اِنَّمَا الفَوزُ وَالفَلَاحُ لَدَیکَ

گر نرفتم طریقِ سنّتِ تو
ہستم از عاصیانِ اُمّتِ تو

ماندہ ام زیر بارِ عصیاں پست
رفتم از پا نگیری دست

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ وَإِذْ
أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ط خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ
مِنَ الْخَاسِرِينَ ○ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً
خَاسِئِينَ ○ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ○ وَإِذْ
قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ط قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ط قَالَ
أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ط قَالَ إِنَّهُ
يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ ط عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ط فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ○
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا ط قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ
فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ
تَشَابَهَ عَلَيْنَا ط وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ○ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا
ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا ط قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ
فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ○ ع

ترجمہ: بے شک ایمان والے اور یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ
اور پچھلے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انھیں کچھ اندیشہ ہے
اور نہ کچھ غم اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر پہاڑ کو اونچا کیا جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں اسے قوت کے ساتھ
لے لو اور اس کے مضمون کو یاد کرو اس امید پر کہ تمھیں پرہیزگاری نصیب ہو پھر اس کے بعد تم پھر گئے تو
اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم خسارہ والوں میں ہو جاتے اور بیشک ضرور تمھیں معلوم ہے
تم میں بعض وہ ہیں جنھوں نے ہفتہ کے معاملہ میں سرکشی کی تو ہم نے ان سے فرمایا کہ ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے
تو ہم نے اس بستی کا یہ واقعہ اس کے آگے اور پیچھے والوں کے لیے عبرت اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت
بنا دی اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو بولے آپ ہمیں
مسخرہ بناتے ہیں فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ بتائے کہ
گائے کیسی ہے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی ہے نہ جوان بلکہ ان دونوں کے بیچ میں ہے

تو کرو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے بولے اپنے رب سے دعا کیجئے ہمیں بتا دے اس کا رنگ کیا ہے کہا وہ فرماتا ہے
وہ ایک پیلی گائے ہے جس کی رنگت ڈھڈھاتی دیکھنے والوں کو خوش کر دیتی ہے بولے اپنے رب سے دعا
کیجئے کہ ہمارے لیے صاف بیان کر دے وہ گائے کیسی ہے بیشک گایوں میں ہمیں شبہ پڑ گیا ہے اور اللہ
چاہے تو ہم راہ پا جائیں گے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی کہ زمین جوتے
اور نہ کھیتی کو پانی دے بے عیب ہے جس میں کوئی داغ نہیں بولے اب آپ ٹھیک بات لائے تو اسے ذبح
کیا اور ذبح کرنے والے معلوم نہ ہوتے تھے۔

تفسیر عالمانہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی وہ لوگ جو صرف زبان سے ایمان رکھتے ہیں لیکن دل اُن کے موافق
نہیں وہ منافقین ہیں جیسا کہ انھیں کفّار کے بیان میں ذکر کرنے کا قرینہ بتاتا ہے اور انہیں ایمان کے
ساتھ تعبیر اور نفاق کی تصریح نہ کرنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اگرچہ اُن کو مومن کہا جا رہا ہے۔ لیکن ان کو ایمان کوئی فائدہ
نہیں دے گا اور نہ ہی انہیں کفر کے گڑھے سے بچا سکتا ہے وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا یہ لفظ یا تو عربی ہے ھَادَ سے مشتق ہے
یہ لفظ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی بُرے فعل سے توبہ کرلے۔ اور ان کو یہود اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے گوسالہ پرستی
سے توبہ کی تھی اور ان کو اس نام سے اس لیے خاص کیا گیا کہ ان کی ایسی توبہ تھی کہ جان دینے پر قبول ہوئی۔ یا یھودا کا
معرب ہے گویا یعقوب علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے کے نام سے منسوب ہیں۔ بعض کہتے ہیں انہیں یہود اس لیے
کہا جاتا ہے کہ جب اُن کے پاس کوئی نبی یا رسول تشریف لاتا تو اسے بادشاہ کی طرف لا کر شہید کر دیتے۔ وَالنَّصٰرٰی
نَصرانٌ کی جمع ہے جیسے ندامٰی، ندمان کی جمع ہے۔ اس نام سے اس لیے موسوم ہیں کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام
کی نصرت کی تھی یا اس لیے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس بستی میں تھے جس کا نام ناصرہ ہے یا وہ نصرت کی
طرف منسوب ہیں کہ وہ ایک بستی ہے کہ جس میں عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے۔ وَالصّٰبِئِیْنَ صَبَاءٌ سے مشتق ہے۔
یہ اسے کہتے ہیں جو دین سے خارج ہو جائے اور انھیں صابی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ یہودیت و نصرانیت سے
خارج ہو کر ستارہ و ملائکہ پرستی میں مشغول ہو گئے۔

مسئلہ: ان کا بت پرستوں جیسا حکم ہے کہ نہ اُن کے ذبائح کھائے جائیں اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے
اگرچہ وہ زبور بھی پڑھتے تھے۔

حدیث شریف ایک اعرابی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور! صابئین
کو صابئین کیوں کہا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا: وجہ یہ ہے کہ جب اُن کے پاس کوئی نبی یا
رسول تشریف لاتا تو وہ انہیں گرفتار کر لیتے اور پانی گرم کر کے اُن کے سروں پر ڈالتے رہتے یہاں تک کہ وہ زخمی ہو کر

پھٹ جاتا۔ (کذا فی روضۃ العلماء)

مَنْ مبتدا ہے، اور اس کی خبر فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ ہے۔ پھر یہ جملہ اِنَّ کی خبر ہے۔ اٰمَنَ جو بھی ایمان لایا ان کفار میں سے
بِاللّٰہِ اللہ پر اور تمام نبیوں پر اور جو کچھ ان پر نازل کیا گیا (اس پر بھی ایمان لایا) وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یوم قیامت پر
یعنی جو شخص ایمان ظاہر کرے مبدا اور معاد کے لیے لائق طریق پر اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو جائے۔ وَعَمِلَ
اور عمل کرے صَالِحًا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ فَلَھُمْ، فا سببیت کی ہے۔ پس ان کے لیے اَجْرُھُمْ
اُن کا اجر جس کا ان کو وعدہ دیا گیا ہے عِنْدَ رَبِّھِمْ جس اُن کے مالک کے نزدیک اور ان کا انجام کمال لائق کی طرف ہوگا اور
عِنْدَ کا متعلق وُہ ثبت (فعل) ہے جو لھم کا متعلق ہے اس میں خبر دی جا رہی ہے کہ ان میں سے جو بھی ایمان لانے اور
نیک عمل کرے تو اُن سے بُرے اعمال اور اُن کے آبا کی غلطیوں کا مواخذہ نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کے ثواب میں کچھ کمی ہوگی۔
وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ اس کا عطف جملہ پر ہے ای فلھم اجرھم ولا خوفٌ علیھم یعنی انہیں اس وقت کوئی خوف
نہیں ہوگا جبکہ کفار خوف سے ڈرتے ہوں گے وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ اور نہ ہی انہیں کوئی ڈر ہوگا اُس وقت جبکہ قصور وار لوگ
عمر کو ضائع کرنے اور ثواب کے فوت ہو جانے سے ڈر رہے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے ان سے خوف و حزن
اٹھا لیا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ جو بھی مخلص ہو کر ایمان لائے اور اچھے عمل کرے اسے بہشت میں داخل کیا جائے گا۔

ف : اسلام کے حسن کی دھاک تو ہر نفس میں سمائی ہوئی ہے اس سے رُوگردانی بشری بیماری یا اندھی تقلید سے کی جاتی ہے
کیونکہ پیدائش کے وقت فطرتاً اور طبعاً ہر ایک میں دین موجود ہوتا ہے اگر اسے اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے تو سوائے دین کے
اور کچھ اس سے سرزد بھی نہ ہو۔ جیسے کہ حدیث شریف میں ہے:

کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ۔ یعنی ہر نومولود میں
فطرۃ اسلامی موجود ہوتی ہے پھر ماں باپ کی مرضی کہ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنائیں۔

ف : ابن الملک اس حدیث شریف کی شرح میں فرماتے ہیں کہ فطرتِ اسلام سے مراد وہ لفظ بَلٰی ہے جو روزِ میثاق بندوں
نے اللہ تعالیٰ کے فرمان "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کے جواب میں فرمایا۔

سوال : جس لڑکے کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا اُس کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کی
فطرت میں کفر سمایا ہوا ہے اور حدیث اُن کے خلاف ہے۔

جواب : حضرت خضر علیہ السلام نے اُس کی فطرۃ کے متعلق نہیں فرمایا بلکہ آپ فرما رہے ہیں کہ پیدائش سے اس کے
متعلق کفر لکھا جا چکا ہے اور حدیث شریف کا اشارہ اس سے قبل یعنی میثاق کی طرف ہے۔ چنانچہ تحقیق یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ
نے ذریت آدم علیہ السلام کو ان کی پشت سے ظاہر کر کے الست بربکم فرمایا اس وقت تو ذات باری تعالیٰ کے مشاہدہ سے
ہر ایک نے ایمان ظاہر کر دیا۔ لیکن کفار کو اس قول سے نفع نہ ہوا کیونکہ وُہ تو اس سے قبل ہی ایمان کے دائرہ سے خارج تھے۔

اس وقت سے مومن اور کافر سب ایک ہوگئے ان کے مابین کوئی تمیز نہ تھی جب اپنی اپنی ماؤں کے بطون میں آئے تو اس وقت کافر و مومن کے مابین امتیاز نہ ہوا کیونکہ وہ فرشتہ جو اس وقت شقاوت و سعادت لکھنے پر متعین ہے اس نے بطونِ اُمہات میں سعید و شقی اس لحاظ سے لکھا کہ انہوں نے آگے چل کر مومن بننا ہے یا کافر، اقرار والے قول کا اعتبار نہیں کرتا۔ اب اسی فطرت یعنی بلیٰ والے قول پر پیدا ہوتے ہیں۔

مقاماتِ اربع کی تحقیق

مقامِ اوّل علمِ الٰہی، اسے بطنِ معنوی اور صوفیہ کی اصطلاح میں بطن الاُم اور بطن امّ الکتاب کہتے ہیں۔

مقامِ ثانی مقامِ بلیٰ ہے اسے مولودِ معنوی کہا جاتا ہے۔

مقامِ ثالث بطن الاُم الصّوری ہے۔

مقامِ رابع مولود صوری یعنی صورۃ مولود معنوی۔ اس مقام پر سعید و شقی میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، جیسے عالمِ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ میں امتیاز نہیں تھا البتہ بطن صوری جسے صورۃ علم اللہ کہا جاتا ہے اس وقت سعید و شقی کے مابین امتیاز ہوا کرتا ہے۔ یہاں حدیث شریف:

اَلسَّعِیْدُ سَعِیْدٌ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ وَالشَّقِیُّ شَقِیٌّ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ۔

(سعادت مند اپنی ماں کے پیٹ سے ہی سعید ہے اور بدبخت اپنی ماں کے پیٹ میں بدبخت ہے)

کا معنیٰ واضح ہوگیا اور اس حدیث کا مطلب بھی ظاہر ہوگیا کہ فرمایا گیا ہے:

السعید قد یشقیٰ والشقی قد یسعدُ۔

یعنی سعید کبھی بدبخت ہوجاتا ہے اور کبھی شقی کو سعادت نصیب ہوجاتی ہے۔

اور کلّ مولودٍ یولد علیٰ فطرۃ الاسلام کا مفہوم بھی سامنے آگیا (کذا حققہ الشیخ بالی الصوفیوی قدس سرہٗ)

صاحبِ روح البیان کی تحقیق

میں (اسمٰعیل حقی رح) کہتا ہوں کہ میرے شیخ کتاب اللائحات الباقیات میں فرماتے ہیں کہ بطن الام اہل مشرب کے نزدیک باطن الغیب المطلق الذاتی کا نام ہے یعنی السعیدُ سعید باطنی غیب مطلق میں ازلاً اور ظاہر شہادت مطلقہ میں ابداً ان دونوں حالتوں میں اس کی سعادت میں شقاوت بالکل داخل نہیں ہو سکے گی اور الشّقیُّ شَقِیٌّ غیب مطلق کے باطن میں ازلاً اور شہادۃ مطلقہ کے ظاہر میں ابداً ان دونوں حالتوں میں اس کی شقاوت میں سعادت کو کسی قسم کا دخل نہیں البتہ عالمِ برزخ جو ان دونوں کا جامع ہے کبھی سعادتمند کی سعادت میں شقاوت اور شقی کی شقاوت میں سعادت داخل ہوسکے گی اس لحاظ سے سعادت مند ذاتی اعتبار سے سعید ہوگا اور عارضی طور پر شقی ہوگا اور شقی ذاتی طور پر شقی ہوگا اور عارضی طور پر سعید۔ پھر اس کا خاتمہ ذاتی اعتبار پر ہوگا۔ اگر وہ ذاتی طور سعید ہے تو اس کی عارضی شقاوت دُور ہوجائے گی

اورسعادت ذاتی کا غلبہ ہو جائے گا۔ جس کی وجہ سے خاتمہ خیر پہ ہوگا اور اسے سعید لوگوں میں داخل کیا جائے گا، اور جس کی شقاوت ذاتی ہے اور سعادت عارضی تو خاتمہ کے وقت سعادت دُور ہو جائے گی۔ اور شقاوت ذاتی کے غلبہ سے اشقیاؑ کے زمرہ میں داخل ہوگا۔ یہی مطلب ہے اس حدیث شریف کا، جس میں فرمایا:

السعید قد یشقی والشقی قد یسعد۔

معلوم ہوا کہ تبدل عارضی میں ہے نہ کہ ذاتی میں، اور اعتبار ذاتی کا ہوتا ہے نہ کہ عارضی کا۔

تفسیر صوفیانہ جس کے قلب کا انشراح اللہ تعالیٰ کے نُور سے ہوتا ہے تو اس کا ایمان تقلیدی نہیں ہوتا اور نہ کسی رسم و عادت اور آباؑ کی اقتدا اُسے ہوتا ہے ایسے لوگوں کے لیے فرمایا گیا: لاخوفٌ علیھم یعنی ان کو انانیت کے حجاب سے کوئی خوف نہیں ولا ھم یحزنون اور نہ ان کو دُوئی کا خطرہ ہے کیونکہ وہ تو وحدیت اور ہُوِیّت کے نُور سے حاصل ہو چکے ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ اہل کتاب کے اسلاف کی دیگر خیانت کا تذکرہ ہے۔ یعنی اے بنی اسرائیل! یاد کرو جب ہم نے تمہارے اسلاف سے وعدہ لیا کہ تورات پر عمل کرو۔

ف: یہ حکم جنگل میں جانے سے پہلے کا ہے جب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے اور غرقابی سے نجات پائی۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ط ہم نے تمہارے اُوپر پہاڑ چھتری کی طرح بلند کیا، یہاں تک کہ تم نے احکام قبول کر لیے اور وعدے لیے گئے۔ طُور سریانی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔

واقعہ یُوں ہے کہ جب مُوسیٰ علیہ السّلام ان کے پاس تورات لے کر آئے تو اس میں دیکھا کہ تکالیف اور مشقت بھرے احکام ہیں تو قبول کرنے سے انکار کر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ پہاڑ کو ان کے سروں پر چھتری کی طرح لا کر کھڑا کر دیں۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اگر احکام قبول کر لو تو درست (چنانچہ پہاڑ ان کے سروں پر کھڑا کر دیا) ورنہ یہ پہاڑ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ جب انہوں نے سوائے قبول کرنے کے کوئی چارہ نہ دیکھا تو قبول کر لیا اور سجدہ میں گر گئے لیکن آنکھ کے گوشہ سے پہاڑ کو دیکھتے رہے۔ اب بھی یہود کی یہی عادت ہے کہ منہ کی ایک طرف سے سجدہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے بڑوں سے اسی طرح کے سجدہ سے عذاب ہٹا تھا فلہٰذا ہم ایسے ہی سجدہ کرتے رہیں گے لیکن یہ رفعِ طُور اس لیے نہیں تھا کہ وہ تورات کو قبول کر لیں کیونکہ یہ تو جبر ہے اور اسلام میں جبر نہیں۔ اور جبر اختیار کو سلب کر لیتا ہے۔ یہ امر تشریعی ہے جیسا کہ کفار کے لیے جنگ کرنے کا حکم ہے۔

سوال: یہ جبر ہی تو ہے اور قرآن پاک فرماتا ہے: لا اکراہ فی الدّین۔ دین میں جبر و اکراہ نہیں۔

جواب: یہ آیت یعنی لا اکراہ فی الدّین آیۂ قتال سے منسوخ ہے۔

ف: ابن عطیہؒ فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سجدہ کے وقت

ایمان پر مجبور فرمایا۔ بظاہر مجبوراً ایمان قبول کر رہے تھے اور قلوب غیر مطمئن تھے۔

خُذُوْا یہاں قولوا مقدر ہے۔ یعنی ہم نے فرمایا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ جو حکم ہم نے کتاب میں دیا اُسے لے لو بِقُوَّةٍ ساتھ جدّ و جہد و عزیمت و مواظبت کے وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ حفظ کر لو جو کچھ اس میں ہے اور اُس سے پڑھ لو نہ اُسے بھلاؤ نہ اُس سے غفلت کرو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ تم کو امیدوار رہنا چاہیے کہ تم متقی ہو جاؤ گے۔ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ پھر تم نے میثاق اور اُس کے ایفاء اور اس کی مداومت سے اعراض کیا مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ بعد پختہ وعدہ ہو جانے کے فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ اس کا عطف مہلت دینے اور عذاب کی تاخیر کی وجہ سے ہے لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ ہو جاتے تم خاسرین میں سے۔ لیکن تم پر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ طُور کو اٹھایا یہاں تک کہ تم نے توبہ کی پھر تم سے ہٹ گیا اگر اس کا فضل نہ ہوتا تو تم پر گر پڑتا اور تم مارے جاتے۔ الخُسران دراصل راس المال کے چلے جانے کو کہتے ہیں۔ یہاں پر ہلاکتِ نفس مراد ہے۔

ف : اللہ تعالیٰ نے اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا التحیۃ و السلام پر فضل فرمایا ہے کہ احکام یکے بعد دیگرے فرض فرمائے جب ایک کا استقرار ان کے دلوں پر ہو جاتا۔ پھر دُوسرا نازل ہوتا اور بنی اسرائیل پر احکام یکبارگی فرض ہوئے۔ بنا بریں ان پر شاق گزرا جس کی وجہ سے منکر ہو گئے یہاں تک کہ عذاب دیکھ کر قبول کیا۔

مسئلہ : اللہ تعالیٰ نے آیت میں چار چیزوں کا حکم دیا :

۱۔ حفظ الاحکام

۲۔ ان پر عمل کرنا

۳۔ ان کو فراموش نہ کرنا

۴۔ انھیں ضائع نہ کرنا۔

پھر فرمایا : واذکروا ما فیہ۔ کتبِ الٰہیہ سے مقصود بھی یہی ہوتا ہے کیونکہ ان کا مقتضیٰ صرف تلاوت و ترتیب ہی نہیں بلکہ ان پر عمل کرنا مطلوب ہے۔

عجیب تمثیل اس کی مثال یوں ہے کہ بادشاہ اپنے کسی ملازم کی طرف مراسلہ بھیجے کہ اتنے عرصے کے اندر ایک عظیم الشان کوٹھی تیار کرا دو۔ اب اس مراسلہ کو ملازم صاحب پڑھتے تو روزانہ ہیں لیکن کوٹھی تیار نہیں کراتے یہاں تک کہ بادشاہ تشریف لائے اب وہ اس ملازم کو صرف زجر و توبیخ نہیں فرمائیں گے بلکہ سخت سزا دیں گے۔ اسی طرح قرآن بھی ہمیں اپنے مالک کی طرف سے اس حکم کو لایا ہے کہ ہم اس کے ارکانِ اسلام یعنی نماز روزہ وغیرہما کی تعمیر کریں ورنہ سزا پائیں گے۔ اس کی محض تلاوت پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس پر عمل کرنے کی جدّ و جہد کریں۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

ہست قرآن حالہائے انبیاء
ماہیان بحرِ پاک کبریا
ور بخوانی و نہ قرآن پذیر
انبیاء و اولیاء را دیدہ گیر

ترجمہ: قرآن انبیاؑ کے حالات ہیں وہ بحرِ کبریا کے شناور ہیں اگر قرآن نہ پڑھو یا نہ کوئی فرق نہیں پڑتا انبیاءؑ و اولیاءؒ سے وابستگی پیدا کرو۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا: یہ وہ وقت ہے جس میں لوگوں سے علم چھینا جائے گا یہاں تک کہ اس سے تھوڑی سی مقدار پر بھی قابو نہیں پاسکیں گے۔ حضرت زیاد بن لبید انصاری نے عرض کی کہ حضورؐ! ہم سے کیسا علم چھینا جائے گا جبکہ قرآن کو ہم خود بھی پڑھتے اور اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی پڑھاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اے زیاد! تجھے تیری ماں روئے، یہی تورات اور انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس نہیں تھی، پھر اُن کو اُن سے کیا فائدہ ہوا؟

حکایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کسی کو فرمارہے تھے کہ تُو ایسے زمانے میں ہے کہ جس میں فقہاءؒ کثیر ہیں اور قرّاء قلیل۔ اس وقت قرآن کے حدود کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اگرچہ حروف کی نگہداشت نہیں ہو رہی۔ اس وقت سائل تھوڑے ہیں اور عطا کرنے والے بکثرت ہیں، لمبی نمازیں پڑھنے والے ہیں اور خطبہ میں اختصار کرنے والے ہیں۔ اعمال پہلے اور خواہشات بعد میں ظاہر کرتے ہیں۔ ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں فقہاء قلیل ہوں گے اور قُرّاء بکثرت اس وقت قرآن کے حروف کی تو بڑی حفاظت کی جائے گی لیکن حدود کی پابندی بالکل نہ ہو گی۔ سوالی بکثرت ہوں گے اور معطی تھوڑے۔ خطبے لمبے لمبے اور نمازوں میں اختصار کریں گے اور اعمال سے پہلے اپنی خواہشات ظاہر کریں گے۔

تفسیر صُوفیانہ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ وعدہ لینا الست بربکم میں عام تھا پھر بعض نے دل وجان سے قبول کیا اور بعض نے خوف سے۔ یہ وعدہ اس لیے لیا تاکہ ثابت ہو کہ ہر حال میں تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں جسے چاہے ہدایت کا خطاب سنائے اور جسے چاہے گمراہی کا، کیونکہ کوئی برہان رفع طُور سے زیادہ اظہر نہیں جو کہ اُن کے سروں پر کُھلم کُھلا تھا۔ شومئی قسمت سے جب وہ ذلیل وخوار ہوئے تو اظہارِ برہان نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ **خذوا ما اٰتینٰکم** میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دئیے ہُوئے اوامر و نواہی اور طاعات وعلوم کو لینا قوتِ انسانیہ کے بس کی بات نہیں جب تک کہ اس میں تائیدِ الٰہی اور قوتِ ربانی نہ ہو۔ **واذکروا ما فیہ** اس میں جو رموز و اشارات اور دقائق و حقایق ہیں۔ ان کو

یاد کرو لعلکم تتقون تاکہ تم ما سوا اللہ کے کسی سے نہ ڈرو ثم تولیتم من بعد ذٰلك یعنی اس کے بعد تم نے اتباعِ شرع اور طریق حق سے قوتِ طبیعیہ کے غلبہ کی وجہ سے باوجودیکہ تم سے وعدہ بھی لیا گیا اور طریق حق پر چلایا گیا لیکن تم نے رُوگردانی کی فلولا فضل اللہ علیکم ورحمتہٗ یعنی ابتداء میں سبقت عنایت اور وسط میں اخذ میثاق بالقوۃ کی توفیق اور انتہا میں قبول توبہ اور اس کی توفیق پھر اس پر ثابت قدم رکھنا نہ ہوتا لکنتم من الخٰسرین تو تم گناہوں پر اصرار کرنے والے اور عقوبت وخسران میں گرفتار اور دُنیا و آخرت کو چھین کر عذاب دنیا و آخرت میں مبتلا ہو جاتے۔ جیسا کہ تم میں سے بعض کو یہ تمام خرابیاں پیش آئیں۔

تفسیر عالمانہ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ یہ خطاب حضور علیہ السلام کے ہم زمان یہود سے ہے ای باللہ قد عرفتم الخ اللہ تعالیٰ کی قسم کہ اے بنی اسرائیل! بے شک تمہیں معلوم ہے الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ (ظلماً) حد سے بڑھ گئے تمہارے اسلاف میں سے۔ منکم کا محل نصب ہے کیونکہ حال ہے فِی السَّبْتِ ہفتہ کے دن یعنی تجاوز کر گئے اس حد سے جو ان کے لیے مقرر کی گئی کہ صرف عبادت کے لیے مستعد رہیں اور اس کی تعظیم کریں لیکن شکار میں مشغول ہوئے۔

ف: سبت دراصل قطع کو کہتے ہیں، اور یہود کو بھی یہی حکم تھا کہ وہ دیگر اعمال سے قطع تعلق کر کے صرف عبادت میں مشغول رہیں اور نیند کو بھی سُبات اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی حرکاتِ اختیاریہ کو قطع کرتی ہے۔

سبق اس میں تحذیر و تہدید ہے گویا فرماتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ انہیں کیسا عذاب پہنچا۔ پس تم بھی بچو شاید تم پر بھی ان کی طرح عذاب آ پہنچے۔

واقعہ یُوں ہے کہ داؤد علیہ السلام کے زمانۂ اقدس میں ابلہ (ایک مقام ہے دریائے قلزم کے کنارے پر شام و مدینہ کے مابین) کے ساکنین پر اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار حرام فرما دیا اور ادھر یہ ہُوا کہ سوائے ہفتہ کے باقی تمام دنوں میں مچھلی چھپی رہتی اور ہفتہ کے روز ظاہر ہوتی تاکہ اُن کی آزمایش ہو یا اس لیے کہ اسی دن اس مچھلی (کہ جس نے حضرت یونس علیہ السلام کو پیٹ میں محفوظ رکھا) کی زیارت کے لیے تمام دریا کی مچھلیاں حاضر ہوتیں۔ چنانچہ ہفتہ کے دن اتنا ہجوم ہوتا کہ پانی کے اوپر مچھلی ہی مچھلی ہوتی پانی کی ایک بُوند بھی نظر نہ آتی۔ ہفتہ کے دن کے بعد متفرق ہو کر دریا کے اندر ایسی گم ہو جاتی کہ کہیں مچھلی کی بُو تک نہ آتی۔

بالآخر شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارے لیے ہفتہ کے روز شکار حرام ہے نہ کہ کوئی اور امر۔ چنانچہ انہوں نے دریا کے کنارے گہرے گڑھے کھود لیے اور جمعہ کی شام کو ان گڑھوں کی طرف دریا سے نالیاں بنالیں۔ اب صبح ہفتہ کو مچھلیاں ان گڑھوں میں آ پہنچتی تھیں لیکن ان کی گہرائی کی وجہ سے باہر نہ نکل سکتی تھیں۔ ان لوگوں نے اتوار کے دن اُن مقید مچھلیوں کو پکڑنا، بیچنا اور اپنے کھانے میں لانا شروع کر دیا جس سے انہیں بکثرت مال

حاصل ہوتا۔ اب اس طرح ان کی عادت ہوگئی یہاں تک کہ چالیس سال یا ستر سال تک یہی عمل جاری رہا۔ لیکن کوئی عذاب نازل نہ ہوا۔ وہ خائف ضرور تھے۔ مگر جب کچھ نہ ہُوا تو خوش ہوئے اور یقین کر لیا کہ اب ہفتہ کا شکار ان کے لیے حلال ہے۔ بنا بریں دیگر گناہوں پر بھی جرأت کرتے گئے۔ یہی طریقہ ان کی اولاد میں جاری رہا۔ اگر وہ ایک دوبار کرتے تو انھیں کچھ نہ ہوتا۔ جب یہ عمل کیا تو اس وقت ستر ہزار اس کے مرتکب تھے۔ ان کے تین گروہ ہوگئے، ایک تو اس کام سے کلی طور پر باز آگیا بلکہ دوسروں کو بھی روکا۔ دوسرے گروہ والے خود تو رُک گئے لیکن دوسروں کو نہ روک سکے۔ تیسرا وہ گروہ کہ جنہوں نے فرمانِ ایزدی کی بے قدری کی۔ روکنے والے گروہ کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ انہوں نے کہا اے بھائیو! تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور سنتِ نبی کے خلاف کیا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ ایسی بُرائی سے رُک جاؤ قبل اس کے کہ تم پر کوئی عذاب نازل ہو۔ انہوں نے سُنی اَن سنی کر دی اور ان کی نصیحت کو قبول نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں عذاب میں مبتلا کر دیا۔

فَقُلْنَا لَهُمْ پس ہم نے بطورِ قہر کے فرمایا کُوْنُوْا قِرَدَةً بندر ہو جاؤ۔ قرد کی جمع ہے جیسے دِیَكَةٌ، دیكٌ کی جمع۔ فارسی میں اسے بوزینہ (بندر) کہتے ہیں۔

ف: یہ امر تحویل کا ہے کیونکہ انہیں ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف بدلنے کی قدرت تو نہیں تھی۔ اس میں اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ کی طرف اشارہ ہے۔ جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ یہ شئے ہو جائے تو وہ ہمارے ارادہ کے مطابق کسی رکاوٹ اور تاخیر کے بغیر فوراً ہو جاتی ہے۔

خٰسِئِیْنَ ۝ج یہ اور قردہ دونوں کونوا کی خبریں ہیں ای کونوا جامعین بین القردۃ والخسئ۔ اور خاسئین، خسئ سے ہے بمعنے صغار و طرد یعنی ذلت و خواری۔

واقعہ یُوں ہوا کہ جب مجرمین نے نصیحت قبول کرنے سے انکار کیا تو روکنے والوں نے کہا ہم تمہارے ساتھ اس بستی میں نہیں ٹھہرتے۔ چنانچہ بستی میں ایک دیوار کھینچی گئی۔ اس کے بعد داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت کی۔ اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہُوا صرف ان کے گناہ پر اصرار کی وجہ سے رات کے وقت ان کی شکلیں بگڑیں۔ صبح کو روکنے کے لیے سارا گروہ ان کے گھروں میں گیا۔ دروازے بند تھے اب نہ اُن سے کوئی آواز آتی نہ ان کے گھروں سے آگ کا دُھواں ظاہر ہوتا۔ دیوار کو پھاند کر اندر داخل ہو گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے نوجوان بندر بنے بیٹھے ہیں اور بُوڑھے خنزیر، ان کے کان بھی ہیں اور بندروں اور خنزیر جیسی آواز بھی۔ اس گروہ نے انہیں نہ پہچانا لیکن ان بندروں اور خنزیروں نے انھیں پہچان لیا۔ اب وہ بندر اور سؤر اپنے رشتہ داروں کے قریب ہوتے ہوئے ان کے کپڑے سُونگھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔ وہ انہیں جواب میں کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تمہیں روکا نہیں تھا؟ لیکن تم نے نہ مانا۔ وہ سروں کو ہلا کر نعم کا اشارہ کرتے اور آنسو بہاتے۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ بعد از مسخ ان میں فہم و عقل باقی تھا۔

ف : بندروں کی ابتدا یہاں سے نہ ہُوئی بلکہ اس سے پہلے بھی بندر تھے۔ یہ صرف ان جیسی شکل میں تبدیل ہوئے۔ کیونکہ یہ شکل قبیح ہے اور ان کے اعمال وافعال بھی قبیح ہیں اور وہ تین دن بعد مر گئے ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ یہ بندر جو دنیائے عالم میں پھیلے ہُوئے ہیں اُن بندروں کی اولاد ہیں جو اُن سے پہلے موجود تھے۔

فَجَعَلْنٰهَا پس ہم نے اس امت کے مسخ وعقوبت کو **نَكَالًا** عبرت بنایا۔ اس سے عبرت پکڑے جو عبرت کا ارادہ رکھتا ہے۔ یعنی یہ عبرت ان جیسے عمل کرنے سے روک لے گی **لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا** یعنی جو امم وقرون پہلے تھے اور جو بعد میں آئیں گے، کیونکہ ان کے مسخ کا ذکر پہلے لوگوں کی کتابوں میں آیا ہے، تو انہوں نے عبرت لی اور وہ بھی عبرت حاصل کریں گے جو بعد میں آئیں گے۔ پس ما بین یدیھا ماضی کے لیے وما خلفھا مستقبل کے لیے مستعار ہیں۔ **وَمَوْعِظَةً** اور نصیحت ہے **لِّلْمُتَّقِيْنَ** ○ متقیوں کے لیے۔ وہ نیک لوگ جنہوں نے ایسے بُرے عمل سے روکا تھا یا ہر وہ متقی جو اس واقعہ کو سُنے گا۔ پس بہر دو تقدیر لام استغراقی عرفی کے لیے ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ؎

۱ نرود مُرغ سُوئے دانہ فراز
چوں دگر مرغ بیند اندر بند

۲ پند گیر از مصائب دگراں
تا نہ گیرند دیگر از تو پند

ترجمہ: (۱) پرندہ اس دانے کی طرف نہیں جاتا جب وہ دیکھتا ہے کہ دوسرا اسی وجہ سے پھنسا ہے۔
(۲) دُوسروں کی مصیبتوں سے نصیحت حاصل کر، نہ کہ دوسرے تجھ سے نصیحت پائیں۔

تفسیر صُوفیانہ

یہ سزا ان لوگوں کے لیے ہے جو احسان کی قدر نہیں جانتے نہ ہی منعم کی نعمتوں کا بدلہ بجائے شکر کے ناشکری سے دیتے ہیں۔ پس انہیں وصال کی عزّت سے ہجر کی ذلّت میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ اگلی اُمتوں کو جسموں کے خسف ومسخ سے سزا دی جاتی اور اس اُمت کی سزا قلوب پر ہوتی ہے اور قلوب کی سزا اجسام کی سزا سے شدید تر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ۔ الآیۃ اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو پھیر دیتے ہیں۔

اسی طرح وہ سزا کا مستوجب ہے جو بادشاہوں کی خدمت میں پورا نہیں اُترتا اور سلوک کی راہ میں صحیح طور پر نہیں چلتا اور جو شخص قربت کے فرش پر حرمت کے قدموں سے نہیں چلتا تو وہ محرومی اور خسارہ اٹھاتا ہے اور بادشاہ کی نظروں سے گر جاتا ہے۔

ف : مسخ کی علامت خنزیر جیسی ہے اور وہ حرام کھاتا ہے۔ جسے حرام کھاتا دیکھو، یقین کر لو کہ اس کا دل مسخ

ہو چکا ہے۔ قلب کے مسخ کی تین علامتیں ہیں :

(۱) طاعت کی لذت نہ پائے۔

(۲) بلا خوف وخطر نافرمانی کرے۔

(۳) کسی کی موت سے عبرت نہ لے بلکہ ہر روز وہ دنیوی امور میں منہمک رہے۔ (کذا فی زہرۃ الریاض)

ف : حضرت عوف بن عبداللہ اہلِ خیر سے تھے جسے کچھ لکھتے تو تین نصیحتیں فرماتے :

(۱) جو آخرت کے کام میں مصروف ہو اس کی دنیوی معاش خود بخود درست ہو گی۔

(۲) جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے مابین نیک اطوار بنائے اللہ تعالیٰ اس کے لیے لوگوں کے مابین اچھائی پیدا کر دے گا۔

(۳) جو اپنے باطن کو درست رکھے گا اس کے ظاہر کو اللہ تعالیٰ درست کر دے گا۔

ف : محمد بن علی ترمذی فرماتے ہیں : صلاح چار قسم ہے :

(۱) لڑکوں کی اصلاح کتابوں سے ہوتی ہے۔

(۲) ڈاکوؤں کی اصلاح قید خانے سے۔

(۳) عورتوں کی گھر میں۔

(۴) بوڑھوں کی مساجد میں۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ بنی اسرائیل کے اسلاف کی غلط کاریاں یاد دلا کر زجر و توبیخ فرمائی جا رہی ہے۔ یعنی یاد کرو اپنے آباؤ اجداد کے اس وقت کو جب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ لقومہٖ اپنی قوم سے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً[1] کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بقرہ (گائے) ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ف : بیل کی قسموں سے ایک مادہ گائے کو بقرہ کہتے ہیں یا بقرہ کا واحد ہے خواہ مذکر ہو یا مؤنث۔ بقراً سے مشتق ہے بمعنے چیرنا۔ اس نام سے اس لیے موسوم ہے کہ یہ بھی زمین کو کھیتی کے لیے چیرتا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بوڑھا دولت مند تھا اُسے اس کے چچازاد بھائیوں نے میراث کی طمع میں قتل کر کے شہر کے دروازے کے سامنے یا کسی دوسری بستی کے قریب میدان میں چھوڑ آئے۔ اور پھر خود ہی آکر واویلا کرتے ہوئے اس کی دیت کے مطالبے کے درپے ہوئے۔ بلکہ چند لوگوں پر اس کے قتل کا الزام لگا دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے پوچھا وہ منکر ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام پر یہ بات شاق گزری اور یہ واقعہ قسامۃ کے حکم کے نزول سے پہلے کا تھا۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی التجا کی تاکہ بات ظاہر ہو کر کس نے قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] ادائیگیِ دیت کا حکم ۱۲

فرمایا: ایک گائے ذبح کرکے اس کے بعض حصّہ کو مقتول کے جسم پر لگاؤ وہ زندہ ہوکر خود بتا دے گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔
قَالُوْٓا گویا سوال کیا گیا کہ پھر انہوں نے اس حکم پر کیا کیا، کیا فرمانبرداری کی یا رک گئے؟ تو جواب میں کہا قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ملا کیا تو ہمیں ٹھٹھا کی جگہ خیال کرکے ہمارے ساتھ استہزاء کرتا ہے۔ ہم قتیل کے بارے میں پوچھتے ہیں تم گائے کے ذبح کا حکم دیتے ہو ان کے مابین مناسبت بھی نہیں ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ جواب انہوں نے جہالت کی وجہ سے دیا، نہ تو ان کا فرمانبرداری کا ارادہ تھا اور نہ ہی ذبح کرنے کا خیال تھا۔

قَالَ جملہ مستانفہ ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ پناہ کا طالب ہوں کہ میں جاہلین میں سے ہو جاؤں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ میں استہزاء کرنا جہل اور بیوقوفی ہے۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ دین کے مسائل میں استہزاء کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

مسئلہ: اسی طرح اہلِ اسلام سے استہزاء کرنا بھی گناہِ کبیرہ ہے۔

مسئلہ: اسی طرح صاحبِ عزت وتعظیم سے استہزاء کرنا گناہِ کبیرہ ہے کیونکہ یہ جہالت ہے اور استہزاء کرنے والا مستحق وعید ہے۔

مسئلہ: مزاح استہزاء سے نہیں کیونکہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ ایسا مزاح کہ اس سے انسان غصّہ اور شکل سے بچ جانے کے لیے کرے تو جائز ہے۔

حکایت ایک شخص عبیداللہ بن حسین کوفہ کے قاضی کے پاس آیا تو اُس پر اُون کا جُبّہ تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا، یہ جُبّہ مادہ کی اُون سے ہے یا نر کی اُون سے، اس نے کہا: اے قاضی! تُو تو جاہل ہے۔ عبیداللہ قاضی نے پوچھا، تجھے کیسے معلوم ہوا کہ مزاح بھی جہالت ہے۔ تو اس نے یہی آیت پڑھی۔ قاضی صاحب نے اس سے روگردانی کی اور کہا کہ یہ ایسا جاہل ہے کہ اسے یہ تمیز نہیں کہ استہزاء کیا ہے اور مزاح کیا ہے۔

ف: قوم نے جب دیکھا کہ بقرہ کا ذبح کرنا ضروری ہے تو اس کی صفتیں پوچھنے لگے۔ جیسا کہ مفصل بیان ہوتا ہے اگر وہ کوئی گائے بھی ذبح کرلیتے تو جائز ہوتا۔ لیکن چونکہ انہوں نے جتنی زیادہ کرید کی سختی بڑھتی گئی لیکن اس کے تحت ایک حکمت تھی۔

ایک ولی کی کرامت کا بیان

بنی اسرائیل میں ایک مردِ صالح تھا اُس کا ایک چھوٹا لڑکا اور ایک بچھیا تھی۔ بچھیا کو جنگل میں لے جا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کی:

اللّٰھم انی استودعك ھٰذہ العجلة لِاَبْنی حتی یکبو۔

(اے اللہ! میرا لڑکا جب تک جوان نہ ہو یہ بچھیا تیری امان میں ہے)
اس کے بعد وُہ فوت ہوگیا اور وہ بچھیا جنگل میں جوان ہُوئی اور اس کی عادت تھی کہ جس آدمی کو دیکھتی تو بھاگ جاتی یہاں تک کہ لڑکا جوان ہوگیا اور تھا بہت نیک۔ اپنی ماں کا بڑا خدمت گزار تھا۔ رات کے تین حصّے کرتا، ایک حصّہ میں نماز ادا کرتا، ایک حصہ میں نیند کرتا اور ایک حصّہ ماں کے سرہانے بیٹھا رہتا، صبح کو لکڑیاں جمع کر کے بازار میں بیچ کر جو کچھ حاصل کرتا۔ ایک حصّہ اللہ کی راہ میں، ایک حصّہ خود خرچ کرتا؟ ایک ماں کی خدمت میں حاضر کرتا۔ ایک دن اس کی ماں نے کہا: بیٹا! تیرے باپ نے تیرے لیے ایک بچھیا چھوڑی تھی اور فلاں جنگل میں ہے، جا اور ابراہیم و اسحاق علیہما السلام کے معبود سے دُعا مانگ، اُمید ہے کہ وہ تیرے پاس آ جائے گی، اس کی علامت یہ ہے کہ جب تُو اسے دُور سے دیکھے گا تو تجھے ایسا معلوم ہوگا کہ اُس کے چمڑے سے نور کی شعاعیں نکل رہی ہیں اُس کی خوب صورتی اور زردی کی وجہ سے اس کا نام مُذہبہ بھی تھا کیونکہ اُس کی زردی حُسن کی تھی نہ کہ عیب کی۔ نوجوان جب جنگل میں آیا تو اُسے دیکھا گھاس چر رہی ہے آواز دیتے ہُوئے (کہ میں تجھے ابراہیم واسحاق ویعقوب علیہم السلام کے رب کی قسم دیتا ہُوں) میرے پاس آجا۔ چنانچہ وہ سن کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آکر ٹھہری۔ نوجوان اس کی گردن کو پکڑے ہُوئے روانہ ہُوا۔ گائے بول پڑی۔ کہنے لگی: حضور! مجھ پر سوار ہو جائیے۔ یہ تیرے لیے زیادہ سہولت کی بات ہے۔ نوجوان نے کہا: میری ماں نے مجھے سوار ہونے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ فرمایا تھا کہ گردن سے پکڑ کر گھر لے آؤں۔ گائے نے کہا: بنی اسرائیل کے رب کی قسم! اگر تو مجھ پر سوار ہوجاتا تو میں کبھی تیرے قابُو میں نہ آتی، اب کے بعد اگر تُو پہاڑ کو بھی حکم دے کہ اپنی جگہ سے ہٹ جا، تو وہ ہٹ جائے گا کیونکہ یہ سب کچھ تجھے اپنی والدہ کی خدمت گزاری سے مل رہا ہے۔ آخر وہ گائے کو اپنی والدہ کے پاس لے آیا۔ ماں نے کہا: بیٹا! تُو مفلس ہے اور بہت دُکھ اٹھاتا ہے، رات کو قیام کرتا اور دن کو لکڑیاں اکٹھی کرتا ہے، جاؤ اسے بیچ آؤ۔ عرض کی: کتنے میں بیچوں۔ ماں نے کہا: صرف تین دینار میں، لیکن پھر بھی مجھ سے مشورہ کرلینا۔ دراصل اس کی قیمت تھی بھی صرف تین دینار ہی۔ وُہ اسے فروخت کرنے کے لیے بازار میں لیے جارہا تھا اُدھر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو بھیجا یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ لڑکا ماں کا کہا مانتا ہے یا دنیا کے لالچ میں آجاتا ہے۔ اگرچہ وہ علیم وخبیر ہے تاہم لڑکے کی آزمائش کے لیے فرشتہ بھیج دیا۔ فرشتے نے لڑکے کے پاس آکر کہا: اے نوجوان! اس گائے کی کیا قیمت ہے؟ اس نے کہا: صرف تین دینار، لیکن شرط خیار ہے کہ میں اپنی والدہ سے پُوچھ کر بیچوں گا۔ فرشتے نے کہا: چھ دینار لے لے مگر والدہ سے مشورہ مت لے۔ نوجوان نے کہا: اگر اس گائے کو سونے سے تول کر بھی قیمت دے دو تب بھی ماں کے مشورہ کے بغیر نہیں دے سکتا۔ ماں کے پاس پہنچ کر ماجرا سنایا۔ ماں نے کہا: چلو چھ دینار میں بیچ دو لیکن پھر بھی مجھ سے پُوچھ لینا۔ نوجوان نے واپس آکر فرشتے سے کہا: مجھے چھ دینار منظور ہیں لیکن شرط وہی ہے۔

فرشتے نے کہا، بارہ دینار لے لے مگر ماں سے مشورہ لینے کے لیے مت جا۔ نوجوان نے کہا: ہرگز نہیں، مشورہ تو ضروری ہے۔ نوجوان پھر ماں کے پاس پہنچا۔ ماں نے کہا: بیٹا! جو خریدار ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ہے، جو تیرے امتحان کے لیے آدمی کی شکل بن کر آیا ہے اب جاؤ اسے کہو کہ میری ماں کہتی ہے کہ اس گائے کو بیچ دیا جائے یا نہ؟ نوجوان نے واپس جا کر اس آدم نما فرشتے سے کہا میری ماں یوں کہتی ہے۔ اُس نے کہا: اسے اب فروخت نہ کرو اسے موسیٰ بن عمران علیہ السّلام بنی اسرائیل کے ایک مقتول کے لیے خریدیں گے تو اسے دنانیر سے تول کر فروخت کرنا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ سے بنی اسرائیل کے لیے جُوں جُوں صفات پُوچھتے گئے اللہ تعالیٰ اس گائے کی صفتیں بیان فرماتا گیا۔ یہاں تک کہ اس گائے کی صفات مکمل ہوگئیں۔

ف: یہ صلہ ماں کی خدمت گزاری کا ہے جو اس نوجوان کو نصیب ہوا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل ہے۔

سوال: جانوروں سے اس گائے کی تخصیص کس لیے؟

جواب: وُہ گائے اور بچھیا کے پجاری تھے، اُس کی محبت میں وارفتہ تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ۔ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت گھر کر گئی۔

پھر تائب ہُوئے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت میں مشغول رہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں اُن کی محبوب شے کے ذبح کا حکم دیا تاکہ اُن سے توبہ کی حقیقت کا اظہار ہو اور وُہ چیز ہٹ جائے جس کی محبت میں مبتلا تھے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ گائے کا حکم اس لیے ہوا کہ ان دنوں ان کے ہاں بہترین قربانی گائے کی تھی تاکہ تقرب افضل واعلیٰ شے سے ہو۔

قَالُوْا گویا سوال ہُوا کہ اُس کے بعد موسیٰ علیہ السّلام کی قوم نے کیا جواب دیا۔ تو اُس کے جواب میں کہا گیا کہ وہ لوگ حکم کی تعمیل کی طرف مائل ہُوئے اور کہا اے موسیٰؑ! اُدْعُ لَنَا ہمارے لیے دعا کیجئے رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا اپنے رب سے کہ واضح کرے اور ہمیں بتائے مَا هِیَ ط مَا مبتدا ہے اور ھِیَ اس کی خبر ہے اور جملہ محل نصب میں ہے۔ یعنی بیان کرے ہمارے اس سوال کو۔ انھوں نے اس کے حال اور صفت سے سوال کیا جبکہ انھوں نے ایسی گائے کا ذکر سُنا کہ جس کا بعض حصہ لگانے سے مُردہ زندہ ہو جائے۔ پس لفظ مَا اس جگہ صفت و حال سے سوال کے لیے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے، ما زیدٌ؟ تو جواب میں کہتے ہیں، طبیب او عالم۔ یعنی انہوں نے پُوچھا کہ اس کا سن اور اس کی صفت کیسی ہے؟ چھوٹی ہے یا بڑی؟ قَالَ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے کہا بعد اس کے کہ انھوں نے دُعا فرمائی اور وحی آئی، حکم ہوا اِنَّهٗ کہ وہ اللہ تعالےٰ يَقُوْلُ اِنَّهَا فرماتا ہے وہ ذبح کرو کہ جس کے متعلق ذبح کرنے کا حکم ہے بَقَرَةٌ وہ گائے ہے لَا فَارِضٌ بوڑھی سن رسیدہ نہیں۔

فرض سے مشتق ہے بمعنے قطع ۔گویا وہ سن کو قطع کرکے آخروقت کو پہنچ چکی ہے وَلَا بِكْرٌ ط اور نہ ہی چھوٹی ہے۔

سوال : بِکر اور فارض پر تانیث کیوں نہ لائی گئی ؟

جواب : یہ لفظ حائض کی طرح مونث کے لیے خاص ہیں اس لیے تانیث کی حاجت نہیں ہوئی۔

عَوَانٌ درمیانی ہے بَيْنَ ذٰلِكَ اس ذکر کردہ فارض وبکر کے مابین فَافْعَلُوْا یہ امر موسٰی علیہ السلام کی طرف سے ہے ، مامور بہ مذکور کی صفت بیان کرنے پر متفرع ہے مَا تُؤْمَرُوْنَ ٥ ما تؤمرون ' بہ کے حکم میں ہے ۔یعنی جس کا حکم تمہیں دیا گیا ہے ۔ گائے کے ذبح کرنے کا ۔ اس فعل میں جارہ کا حذف کرنا عام ہو چکا ہے یہاں تک کہ متعدی بدو فعل کے احکام میں لاحق ہو چکا ہے قَالُوْا گویا پوچھا گیا ۔ اس بیان ثانی اور امر متکرر کے بعد انہوں نے کیا کیا تو جواب میں فرمایا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا دُعا فرمائیے تاکہ ہمیں پتا چلے کہ اس کے الوان میں سے کون سا لون ہے جس کا ہمیں حکم دیا جا رہا ہے ۔ لَون عرض مشاہد کو کہتے ہیں ، جو بعض جوہر میں پایا جاتا ہے قَالَ موسٰی علیہ السلام نے بعد از مناجات کے فرمایا اِنَّهٗ وُہ اللہ تعالیٰ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فرماتا ہے کہ وُہ زرد رنگ کی گائے ہے ۔ صفرۃ وہ رنگ ہے جو بیاض وسواد کے مابین ہوتا ہے اور مشہور رنگ ہے اور یہاں پر صفرۃ سے سیاہ رنگ مراد نہیں جیسا کہ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ میں صفر سے سیاہ رنگ والے اونٹ مراد ہیں اور اس میں سواد کو صفر سے تعبیر کرنا اس لیے ہے کہ صفرۃ سواد کے مقدمات سے ہے یا اس لیے کہ اونٹوں کی سیاہی زردی کے اوپر ہوتی ہے فَاقِعٌ لَّوْنُهَا مبتدا اور خبر ہے اور یہ جملہ بقرۃ کی صفات سے ہے فقوع بمعنے زردی کی ، اور اس کا خالص ہونا تاکید میں کہا جاتا ہے اصفر فاقع جیسا کہ کہتے ہیں اَسْوَدُ حَالِكٌ ۔

سوال : فاقع کا اسناد لون کی طرف کیوں ہے حالانکہ یہ بھی تو ملوّن یعنی گائے کے احوال سے ہے ۔

جواب : فاقع کو لون سے ملابست ہے جیسا کہ اس کی تاکید بتاتی ہے ۔گویا دراصل عبارت یوں تھی : صفراء شدید الصفرۃ صفرتھا ۔ جیسا کہ جدّ جدّہ کہنا صحیح ہے ۔ یعنی اس کا رنگ پکا ہے ۔

بعض مفسرین کہتے ہیں وہ گائے تمام زرد تھی یہاں تک کہ اُس کے سینگ اور کھر بھی۔

تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ٥ دیکھنے والے اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں یعنی اس کا حُسن اور اس کے رنگ کی صفائی دیکھنے والوں کو بھاتی اور دلوں کو سہاتی تھی بوجہ تکمیل خلقت اور سینگوں اور کھروں کی لطافت کے ، اور السّرور نفع کے حصول یا اس کی اُمید سے دل میں لذت پانا ۔

مسئلہ : حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ،

جس نے زرد رنگ کا جُوتا پہنا اس کے غم قلیل ہوجائیں گے کیونکہ اس رنگ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

تسر النا ظرین۔ دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے۔

مسئلہ: حضرت ابن الزبیر اور محمد بن کثیر سیاہ رنگ کے جُوتے پہننے سے روکتے تھے کیونکہ سیاہ رنگ غم والم میں ڈالتا ہے۔

مسئلہ: مذکورہ حضرات فرماتے ہیں کہ سُرخ رنگ کا موزہ فرعون کا تھا، اس کے وزیر ہامان کا سفید رنگ کا۔

مسئلہ: علماء کا موزہ سیاہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا موزہ سیاہ رنگ کا تھا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ کیا وُہ گائے سائمہ ہے یا کام کرنے والی۔ اور کشاف میں ہے کہ سوالات کا تکرار صرف اس کے حال اور صفت کے پُوچھنے اور زائد معلومات کے انکشاف کے لیے تھا تاکہ اس کے وصف معلوم کرنے میں تزاید حاصل ہو۔

مسئلہ: کسی بات کے کھوج میں پڑنا نحوست ہے۔

حکایت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا: اگر میں تجھے کہتا ہوں میرے پاس فلاں بکری لے آ، تو تم پُوچھنا شروع کر دیتے ہو اَضَائِنٌ اَمْ مَاعِزٌ، اگر میں بیان کر دیتا ہوں تو تم پھر پُوچھتے ہو نر یا مادہ۔ اگر اس کی بھی خبر دے دیتا ہُوں تو پھر کہتے ہو، سیاہ یا سفید، اس کی کیا ضرورت ہے، پس جب میں کہوں بکری لے آؤ تو پھر بار بار سوال نہ کرو، جو مرضی ہو لے آؤ۔

حدیث شریف میں ہے: بہت بڑا مجرم وُہ شخص ہے کہ اس شَے کے متعلق پُوچھتا ہے جس کی تحریم نازل نہیں ہوئی پھر اس کے سوال کی وجہ سے حرام ہو جائے۔

اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ یعنی گائے مذکورہ کی جنس باعتبار عوان ہونے اور زرد ہونے کے ہمیں پتا نہیں چلتا کہ کیا کیا جائے۔

سوال: پہلے بقرۃ بولتے رہے اب بقر کیوں بول رہے ہیں؟

جواب: اس لیے کہ اس سے بقرہ کی جنس مراد ہے یا اس لیے کہ قاعدہ ہے کہ جمع کے حروف اپنے واحد سے کم ہو جائیں تو اس سے مذکر و مؤنث دونوں مراد لینا جائز ہوتا ہے۔

وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ یعنی ہمیں گائے ذبح کرنے کی ہدایت نصیب ہو جائے گی۔

حدیث شریف میں ہے: اگر استثناء یعنی اِن شاء اللہ نہ کہتے تو ان کے لیے گائے کا بیان کبھی نہ ہوتا۔

قَالَ موسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا إِنَّهٗ کہ بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَـرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ یعنی وہ ایسی گائے نہیں کہ کام کاج سے ذلیل وخوار ہو۔

ف : عرب کہتے ہیں :

دَابَّةٌ ذَلُوْلٌ بَيِّنَةُ الذِّلَّةِ۔

صعوبۃ کی ضد کا نام ہے۔ یہ بقرہ کی صفت ہے یعنی وہ گائے غیر ذلول ہے۔

سوال : ذلولۃ کیوں نہ کہا ؟

جواب : فعول جب وصف ہو کر واقع ہو تو اس وقت اس پر تائے تانیث داخل نہیں ہوتی جیسے صبور وغیرہ۔

تُثِيْرُ الْاَرْضَ زمین کو کھیتی کے لیے چیرتی ہے۔ اور یہ ذلول کی صفت ہے۔ گویا کہا گیا : لَا ذَلُوْلٌ مُثِيْرَةٌ۔ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ یعنی وہ سانیہ نہیں ہے کہ جس پر پانی لادا جاتا ہو۔

ترکیب : پہلا لا نافیہ ہے اور دوسرا تاکید کے لیے، اور یہ لا زاید ہے پہلے کی تاکید کر رہا ہے کیونکہ معنیٰ یہ ہے کہ إِنَّهٗ ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ وَ تسقی۔ علاوہ ازیں یہ دونوں فعل ذلول کی صفت ہیں۔ گویا کہا گیا ہے ؛ لَا ذَلُوْلٌ مُثِيْرَةٌ وَسَاقِيَةٌ۔ (کذا فی الکشاف)

ف : امام ابو منصورؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گائے نہیں تھی بلکہ بیل تھا کہ زمین کا چیرنا اور کھیتی کا پلانا بیل کا کام ہے نہ کہ گائے کا۔ باقی رہا تانیث کے ساتھ افعال کا لانا صرف لفظ کی وجہ سے ہے نہ کہ تانیث کی وجہ سے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تائے تانیث جو افعال میں بیان ہوتی رہی وحدت کے لیے ہے۔

لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ بعد از تسلیم کہ اثارۃ الارض و اسقاء الحرث بیل کا کام ہے۔ ابو منصور کے خلاف ہو کر فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ گائے سے کھیتی وغیرہ کا کام لیتے ہوں جیسا کہ ہمارے زمانے میں بیل سے کام لیتے ہیں۔

مُسَلَّمَةٌ اسے اللہ تعالیٰ نے عیوب سے پاک رکھا اور کام کاج سے محفوظ فرمایا۔ یا یہ معنیٰ ہے کہ اس کا رنگ خالص ہے سلمٌ سے مشتق ہے یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ سمجھا جائے کہ ایسی خالص تھی کہ اس میں کسی دوسری قسم کی ملاوٹ نہ تھی۔ اس کی تائید اگلا لفظ کرتا ہے لَّا شِيَةَ فِيْهَا ط کوئی دوسرا رنگ نہیں، جو کہ اس کے چمڑے کے رنگ کے مخالف ہو۔ یہ زرد رنگ کی تھی یہاں تک کہ سینگ اور کھر بھی۔ شِيَةٌ کا اصل وَشْيٌ تھا جیسے عدۃ وصفۃ وزنۃ کا اصل وعدٌ اور وصفٌ اور وزنٌ تھا اس کا ماخذ وشیُ الثَّوب ہے بمعنے استعمال الوان الغزل فی نسجه۔ قَالُوا ان اوصاف کے سننے کے بعد کہنے لگے اَلْـٰٔنَ یہ اسم اشارہ کے معنیٰ کو متضمن ہونے کی وجہ سے

مبنی ہے جِئۡتَ بِالۡحَقِّ ط گائے کا حقیقی وصف اب بیان کیا ہے اس سے پہلے تمام اشکال کا بیان تھا فَذَبَحُوۡهَا فاء فصیحیہ ہے یعنی انہوں نے اوصافِ مذکورہ جیسی گائے حاصل کر لی جو ایک نوجوان کے پاس تھی اسے سونے کے برابر خرید اگیا۔ وَمَا كَادُوۡا نہیں قریب تھا یَفۡعَلُوۡنَ ۵ کہ یہ عمل کرتے۔ یہ جُملہ ذَبَحُوۡا کی ضمیر سے حال ہے۔ ای ذبحوا والحال انھم کانوا الخ یعنی اسے ذبح کر دیا۔ لیکن اس سے قبل اس سے بچنے کے درپے تھے یعنی بعد توقف اور بہت دیر کے ذبح کرنے پر آمادہ ہوئے۔

ف: بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سوالات کرنے میں از ابتدا تا انتہا چالیس سال گزر گئے۔

سبق عاقل پر لازم ہے کہ سنتے ہی فرماں برداری کا عمل شروع کر دے اُس میں کھوج میں نہ پڑے۔ کیونکہ توحید کا اصلی مقصد اسی کا مقتضی ہے۔ مثنوی شریف میں ہے؛ ؎

تا خیال دوست در اسرارِ ما ست

چاکری و جاں سپاری کارِ ما ست

ترجمہ: جب تک دوست کا تصور ہمارے دل میں ہے تو غلامی اور جاں سپاری ہمارا کام رہے گا۔

تفسیر صُوفیانہ حِکَم عطائیہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو صرف اپنا عبد بنانے کے لیے اسے بشریت کے ہر منافی وصف سے خارج کر لیا تاکہ وہ اپنے معبود کی نداء کا جواب دے اور اس کے قہر سے بچ کر اُس کے قُرب کا اہل ہو جائے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی حفاظت کاملہ پر موقوف ہے۔ یہ اس وقت ہے جب کسی معصیت کا مرتکب نہ ہو۔ اگر کسی وقت ارتکاب ہو جائے تو اس پر اصرار نہ کرے کیونکہ اصطلاح میں حفظِ الٰہی اسی کا نام ہے کہ بندہ گناہوں سے دُور رہے لیکن ان کا صدور اس سے ممکن ہو بخلاف عصمت کے کہ وہاں گناہوں کا صدور محال ہوتا ہے۔ اسی لیے اصطلاحاً عصمتِ انبیاءؑ کے لیے اور حفظِ اولیاء کرام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ الئٰن جئت بالحق دلالت کرتا ہے کہ بندہ اپنی غلطیوں اور ان پر اصرار نہ کرنے کی بنا پر کہتا ہے۔ اسی کا نام ایمان خالص ہے۔

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ انّ اللّٰہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ اس میں نفس بہیمیہ کے ذبح کا حکم ہے کیونکہ اس کے ذبح سے قلبِ روحانی کو زندگی نصیب ہوتی ہے۔ یہی وہ جہادِ اکبر ہے جس کے متعلق سرورِ عالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر۔

(جہادِ اصغر سے فارغ ہو کر جہادِ اکبر کی طرف جا رہے ہیں)

اور فرمایا:

المجاهد من جاهد نفسہ ۔
(مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے)

اور فرمایا :

مُوتوا قبل انت مُوتوا ۔
(مرنے سے پہلے مرجاؤ)

اسی معنی کی طرف اشارہ ہے ۔ اتتخذنا هزوا کیا تم ذبح نفس کے بارے میں ہمارے ساتھ استہزا کرتے ہو ۔ نفس کو ذبح کرنا ہر ذی ہمت کا کام نہیں ۔ قال اعوذ باللہ ان اکون من الجٰھلین یعنی میری پناہ ان جاہلوں سے جو گمان کرتے ہیں کہ نفس کو ذبح کرنا بیکار بات ہے ۔ یہ بات وہ کہیں گے جو نفس کے تابع اور دُنیا کے طالب ہیں قالوا ادع لنا ربك یبیّن لنا ما ھی انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے دُعا فرمایئے کہ وہ نفس کون سا ہے جسے صدق کی تلوار سے ذبح کیا جائے اب اس کی صفتوں کو بیان فرمایا کہ لا فارض وہ نہ تو بوڑھا ہو کر بڑھاپے کے ضعف اور نفسانی قویٰ کی کمزوری سے سلوک کی راہ طے نہ کر سکے جیسا کہ صوفیہ کرام فرماتے ہیں :

"اَلصُّوْفِی بَعْدَ الْاَرْبَعِیْنَ بَارِدٌ۔"
(صوفی چالیس سال کے بعد ٹھنڈا پڑ جاتا ہے)

ولا بکر اور نہ ہی ایسا نوجوان ہو کہ جوانی کی مستی سے سلوک کی باتوں سے رُوگردانی کرے عوانٌ بین ذٰلك یعنی کامل العقل ہو ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً ۔
(یہاں تک کہ جوانی کو پہنچے اور چالیس سال کا ہو جائے)

فافعلوا ما تؤمرون ۝ پس جس کا تمہیں حکم ہُوا اسے بجالاؤ ۔ جب تم اس کے قریب ہو گے تو وہ بھی تمہارے قریب ہو جائے گا کیونکہ وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا خواہ جوان ہو یا بُوڑھا ۔ قالوا ادع لنا ربك یبیّن لنا ما لونھا انہوں نے کہا کہ ہمارا رب بیان فرمائے کہ وہ نفس کس طرز کا ہو جو جہاد کے کام آسکے قال انّہٗ یقول انّھا بقرۃ صفراء فرمایا کہ اس کا حکم کہ وہ نفس زرد رنگ کا ہو ، اس میں ریاضت کرنے والوں کے منہ کی زردی اور مجاہدہ کرنے والوں کی نشانی کی طرف اشارہ ہے فاقعٌ لونھا اس کا رنگ پکّا ہے یعنی ان کا یہ رنگ زینت ہے نہ کہ عیب ۔ جیسا کہ ولیوں کے دیدار سے نصیب ہوتا ہے کہ ان کے رخساروں سے رونقِ بہار معلوم ہوتی ہے جو طاعتِ الٰہی کی غمازی کر رہی ہوتی ہے اور ان کے چہروں سے شواہدِ غیب کے آثار ٹپکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے میں بشریت کے اوصاف کو مٹا کر ربوبیت کے اوصاف کو اپنا لیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود۔
(ان کے رخساروں میں سجدوں کے آثار چمکتے ہیں)

اِنَّ البقر تشٰبہ علینا۔ بیشک بقرہ کے آثار ہم پر ملتبس ہو گئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ بہت سے گمراہ طالبانِ حق کے لباس میں پھرتے ہیں ان کا بھیس بدل کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں وانا اِن شآء اللہ لمھتدون۝ بے شک اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہمیں راہِ راست نصیب ہو جائے گا۔ یعنی کسی اللہ والے کو پا لیں گے جب تیری مشیّت نے ہمارا ساتھ دیا، جیسے موسیٰ اور خضر علیہما السلام کی ملاقات نہ ہوتی قال انّہٗ یقول انھا بقرۃ لا ذلولٌ تثیر الارض اس میں اشارہ ہے کہ طالبِ صادق وُہ ہے جو حرص سے دُنیا حاصل کرتا ہُوا خواہشاتِ نفسانیہ اور دُنیا کی رونقوں کے پیچھے نہ پڑے۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَزَّ مَنْ قَنَعَ وَ ذَلَّ مَنْ طَمَعَ۔
(جس نے قناعت کی وہ عزّت پائے گا اور جس نے طمع کیا وہ ذلیل ہوگا)

اور فرمایا:

لَیْسَ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَہٗ۔
(مومن اپنے آپ کو ذلیل نہیں کرتا)

ولا تسقی الحرثَ دنیا کی کھیتی کے لیے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ نہیں رکھتا۔ چنانچہ فرمایا:

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ نَّصِیْبٍ۔
(جو دنیا کی کھیتی کا خواہشمند ہوگا اسے ہم دنیا میں دیں گے لیکن آخرت میں اسے کچھ نہیں ملے گا)

مُسَلَّمَۃٌ لَّا شِیَۃَ فِیْھَا۔ یعنی نفوس قدسیہ ایسے ہیں جو نفسی صفات سے بالکل آزاد ہو کر خالص مخلص ہو کر اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند رہتے ہیں اُن کی طلب اور ان کا مقصد صرف ذاتِ حق ہے۔ جیسا کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربًا فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لا یسئلون الناس الحافا۔

(ان فقراء کے لیے جو روکے گئے اور سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے جاہل انھیں دولتمند سمجھتے ہیں تم انہیں ان کے چہروں سے پہچان جاؤ گے وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے)

فَذَبَحُوھا وما کادوا یفعلون۝ انہوں نے ذبح کیا لیکن قریب تھا کہ وُہ ذبح نہ کرتے۔ اس میں اشارہ ہے کہ نفس کو ذبح کرنا طبیعتِ انسانیہ کے خلاف ہے لیکن صادق لوگوں نے صدق کی تلوار سے اسے ذبح کر دیا لیکن یہ بھی صرف اس کے فضل اور حُسنِ توفیق کی بدولت ورنہ طبیعتِ انسانیہ کی رُو سے وہ ہرگز نفس کو ذبح نہ کرتے۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ
بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ ثُمَّ قَسَتْ
قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا
يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهٰرُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا
يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُّؤْمِنُوا لَكُمْ
وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ
يَعْلَمُونَ ۝ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ اٰمَنُوا قَالُوا اٰمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ قَالُوا
أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ أَوَلَا
يَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ
إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ۙ ثُمَّ
يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ
وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ
عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ بَلٰى مَنْ
كَسَبَ سَيِّئَةً وَّأَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيـَٔتُهٗ فَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ۝ وَ
الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ۝

ترجمہ: اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو
تم چھپاتے تھے تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو اور اللہ یونہی مُردے جلائے گا اور
تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی
مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کرّے اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہ نکلتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ
جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں کہ اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کوتکوں سے

بے خبر نہیں تو اے مسلمانو! کیا تمھیں یہ طمع ہے کہ یہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے اور ان میں ایک گروہ وہ تھا کہ اللہ کا کلام سُنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے دانستہ بدل دیتے اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وُہ علم جو اللہ نے تم پر کھولا مسلمانوں سے بیان کیے دیتے ہو کہ اس سے تمھارے رب کے یہاں تمھیں پر حجت لائیں کیا تمھیں عقل نہیں کیا نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور ان میں کچھ اَن پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت اور وہ نرے گمان میں ہیں تو خرابی ہے ان کے لیے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے ان کے لیے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ان کے لیے اس کمائی سے اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن تم فرمادو کہ خدا سے تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے جب تو اللہ ہرگز عہد کے خلاف نہ کرے گا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمھیں علم نہیں ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطا اسے گھیر لے وہ دوزخ والوں میں سے ہے انہیں ہمیشہ اس میں رہنا اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ جنت والے ہیں انہیں اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا یہ مضمون لفظاً مؤخر ہے لیکن معناً مقدم ہے کیونکہ قصہ مذکورہ بالا کی ابتداء اسی سے ہے۔ یعنی یاد کرو کہ بنی اسرائیل مقتول کو قتل کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر اس کے متعلق سوال کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے۔ انہوں نے کہا: ان اللہ یامرکم الآیۃ

سوال: یہ آیت قصہ کی ابتداء میں کیوں مذکور نہ ہوئی؟

جواب: کیونکہ اس مضمون سے قصہ بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ گائے ذبح کر کے مقتول کا پتا دینا مطلوب ہے۔ پھر جو شئے مقصوداً مدِّ نظر ہو وہی مقدم ہوا کرتی ہے۔

سوال: حضور علیہ السلام کے ہمعصر یہود کی طرف یہ قصہ کیوں منسوب کیا جا رہا ہے؟

جواب: یہ لوگ اپنے اسلاف کے اس فعل سے راضی تھے۔

سوال: جمع کو کیوں مخاطب کر رہے ہیں حالانکہ قتل کرنے والی کوئی جماعت تو نہ تھی؟

جواب: مقتول جماعت میں ملا تھا۔

القتل اس بنیاد کو توڑنا جس سے زندگی ختم ہو جائے۔ یعنی یاد کرو اے بنی اسرائیل! اپنے اسلاف کے بُرے عمل کو: جبکہ انہوں نے ایک نفس محترم کو قتل کیا۔

ف: مقتول کا نام عامیل بن شراحیل تھا۔

فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ط فادّٰرءتم در اصل تدارءتم تھا۔ درء سے مشتق ہے، بمعنی دفع۔ ای تدافعتم وتخاصمتم فی شانها، یعنی اس کے حق میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جھگڑتے تھے کیونکہ خصما میں سے ہر ایک مدافعت کرتا اور کہتا میں تو اس فعل سے بری ہوں کوئی اور ہوگا وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ وہ جو تم چھپاتے تھے اسے اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ یعنی وہ جو تم چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ اسے مستور و مکتوم نہیں رکھے گا بلکہ ظاہر کردے گا۔

سوال : مخرج کا عمل کیسے صحیح ہوسکتا ہے حالانکہ وہ ماضی کے معنیٰ میں ہے ؟

جواب : گویا یہ حکایت ہے جو کہ آئندہ تدارء میں ہوگا بمعنے حاضر کے، جیسے باسطٌ ذراعیہ میں حکایت ہے۔

فَقُلْنَا، فَادّٰرَءْتُمْ پر عطف ہے۔ درمیان میں کلام بطور جملہ معترضہ کے استعمال کیا گیا ہے اضْرِبُوْهُ اس نفس کو مارو۔

سوال : نفس مونث سماعی کے لیے ضمیر مذکر کیوں لایا گیا ؟

جواب : بتاویل شخص اور انسان کے۔

بِبَعْضِهَا ط بقرہ کے بعض کے ساتھ جو بھی ہو یا اس کی زبان سے، کیونکہ وہ کلام کا آلہ ہے، یا دُم کی ہڈی کیونکہ یہی سب سے پہلے پیدا ہوتی ہے اور سب کے بعد گلتی سڑتی ہے اور اسی پر دیگر تمام اعضاٗ کی تخلیق کی ترکیب ہوتی ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور عضو مراد ہے۔

ف : بعض نصف سے کم کو کہتے ہیں۔ معنیٰ یہ ہے کہ پھر انہوں نے اسے مارا جس سے وہ زندہ ہوگیا۔

سوال : اس میں عبارت فضربوا فیحیٰ کیوں محذوف ہے ؟

جواب : چونکہ کذٰلك یحی اللہ الموتیٰ دال موجود ہے مدلول کا ذکر نہیں کیا گیا۔

واقعہ مروی ہے کہ انہوں نے وہی ٹکڑا جسم سے لگایا تو وہ مُردہ باذن اللہ تعالیٰ زندہ ہوا اور اس کی رگوں سے بدستور خون جاری تھا اور کہا مجھے فلاں بن فلاں نے قتل کیا ہے جو کہ اُس کے چچا زاد بھائی تھے۔ پھر وُہ مرگیا۔ پھر ان دونوں کو پکڑ کر قتل کیا گیا اور انہیں مقتول کی وراثت سے محروم کیا گیا۔

سوال : موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اس کے ٹکڑے لگانے کا حکم دیا خود کیوں نہ لگایا۔

جواب : تاکہ ان کی طرف سحر یا حیلہ کی نسبت نہ ہو۔

كَذٰلِكَ یہاں قلنا مقدر ہے۔ یعنی جب انہوں نے مارا اور وہ زندہ ہوا تو ہم نے کہا کذٰلك اسی طرح۔ کذٰلك کا خطاب ان لوگوں کو ہے جو مقتول کے زندہ ہونے کے وقت موجود تھے یعنی مثل اس زندہ کرنے عجیب کے۔

يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى قیامت کے دن اللہ تعالیٰ زندہ کرے گا۔

سوال : بنی اسرائیل کو تو قیامت میں اُٹھنے کا اقرار تھا تو پھر انہیں کذٰلك یحی اللّٰه کہہ کر کیوں الزام لگایا جا رہا ہے۔
جواب : واقعی وہ قولاً اور تقلیداً تو اقراری تھے لیکن انہیں عیان وایقان کے طور ثبوت دے رہے ہیں۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام کا قول لیطمئن قلبی اعیان و ایقان کے لیے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب ان لوگوں کو ہو جو منکرینِ قیامت حضور علیہ السلام کے ہم زمان آیات مبارکہ نزول کے وقت موجود تھے۔ اب دیگر تاویلات کی ضرورت نہیں بلکہ حکایت کا ببعضها تک ختم ہو جاتا ہے۔

وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ اپنے دلائل تمہیں دکھاتا ہے کہ بے شک وہی ہر شے پر قادر ہے لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ عقل کا مادہ عَقَلْتُ نفسی عن کذا ہے۔ یعنی میں نے نفس کو اس سے روکا یعنی اِس لیے ہوا تاکہ تمہارے عقول کی تکمیل ہو جائے اور تم جان لو کہ وہ جب ایک نفس کے زندہ کرنے پر قادر ہے تو وُہ تمام نفوس کے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔
سوال : اس قتیل کے زندہ کرنے میں اتنی شرائط بیان فرمانے میں کیا حکمت تھی کہ گائے ذبح ہو پھر اُس کا ایک ٹکڑا مقتول کے بعض حصہ کو لگایا جائے جبکہ وُہ باری تعالیٰ بلا واسطہ اس کے زندہ کرنے پر قادر ہے۔
جواب : اس میں تقرب الی اللہ کا اشتمال اور ادائے واجب اور یتیم کو تجارت سے نفع دینا اور اللہ تعالےٰ پر متوکل ہونے کی برکت اور اولاد پر شفقت کرنا اور والدہ کے خدمت گزار کو فائدہ دینے کی وجہ سے بیان کیا گیا ہے۔
مسئلہ : سالک کو چاہیے کہ اپنی قربانی مالک کے حضور میں پیش کرے۔ اسے یہ بھی لائق ہے کہ اچھی قربانی کرے اور قیمتی ہو۔ جیسا کہ مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دُنبہ تین سَو دینار کی قیمت کا ذبح کیا تھا۔

عقیدہ مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ اسباب تاثیر کے صرف علامات ہیں ان میں کسی قسم کی تاثیر نہیں ہوتی کیونکہ دو مونیں جو دو جسموں (مقتول بنی اسرائیل اور گائے) سے حاصل ہوئیں۔ کسی لحاظ سے بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن سے حیات پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ قادر ہے اس نے حیات پیدا کر دی۔

تفسیر صوفیانہ جسے چاہیے کہ میں اپنے سب سے بڑے دشمن کی حقیقت معلوم کر لوں جو کہ میری حقیقی موت کے درپے رہتا ہے تو اسے اپنے نفس کی خواہشات کو مٹانا چاہیے۔ جب اس سے طفولیت کی حرص زائل ہو جائے گی کیونکہ اس کے بعد اس کا حال عجیب اور خوش منظر طلب دنیا سے دُور اور اس کی گرد و غبار سے ایسا صاف ہو جائے گا کہ خود نفس ایسی باتوں کو قبول کرے گا جس کی وجہ سے اسے حیاتِ طیبہ نصیب ہو جائے گی اور احوال اس کے سامنے منکشف ہو جائیں گے اور عقل و وہم کا جھگڑا بھی دُور ہو جائے گا فقلنا اضربوه ببعضها الخ اس میں بعض عارفین فرماتے ہیں کہ جو شخص چاہتا ہے کہ مجھے احیاءِ قلب نصیب ہو جائے تو اسے چاہیے کہ اپنے نفس کی خواہشات کو مٹا دے کیونکہ جس نے نفس کی خواہشات کو ریاضاتِ شاقہ

کے ذریعے سے مٹایا تو اُس کے دل کو اللہ تعالیٰ انوارِ مشاہدات سے زندہ کر دے گا ۔ جو نفسانی خواہشات کو مٹا کر طبعی موت سے مرے گا اسے حقیقی حیات نصیب ہوگی ۔ پھر جیسے گائے کے ذبح کے بعد اس کی زبان مقتول کو ماری گئی اور وہ زندہ ہوگیا اور کہا کہ مجھے فلاں شخص نے قتل کیا ہے ۔ اسی طرح جس نے نفس کو جو کہ سچائی کے چھُرے سے مذبوح ہو ۔ اس کی زبان کو دائمی ذکر کے ساتھ مقتول کے قلب پر مارا جائے تو بھی اس دل کو اللہ تعالیٰ اپنے نور سے زندہ کرے گا پھر وہ بندہ کہے گا وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء ۔

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :؎

۱ شخصم بچشم آدمیاں خوب منظر است
وز خبثِ باطنم سر خجلت فتادہ پیش

۲ طاؤس را بنقش و نگاری کہ ہست خلق
تحسین کنند او خجل از پائے زشت خویش

ترجمہ :(۱) میرا ظاہر تو لوگوں کو اچھا نظر آتا ہے لیکن میں اپنی اندرونی خباثت کی وجہ سے شرمساری سے سر جھکائے ہوئے ہوں ۔

(۲) مور کی حسین و جمیل شکل پر لوگ تحسین کہتے ہیں لیکن وہ اپنے پاؤں کی وجہ سے شرمسار ہے ۔

قاعدہ صوفیہ کسی بزرگ سے اسلام کے بارے میں پُوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا : مخالفت کرکے نفس کو ذبح کرنا ۔ اور نفس کی مخالفت کا مطلب ہے اسے خواہشات سے دُور رکھنا ۔

حکایت ۱ حضرت سرّی سقطی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ، مجھ سے تیس یا چالیس سال نفس مطالبہ کرتا رہا کہ میں اخروٹ کو کھجور کے شیرہ میں ملا کر کھاؤں لیکن میں نے اسے اس خواہش سے محروم رکھا ۔

حکایت ۲ ایک مرد کو ہوا میں اڑتا ہُوا دیکھ کر اس سے پوچھا کہ آپ نے یہ مرتبہ کہاں سے پایا ؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جب سے میں نے خواہشاتِ نفسانی کو چھوڑا اللہ تعالیٰ نے ہوا کو میرے تابع کر دیا ہے ۔

نسخۂ رُوحانی کسی نے بزرگ سے پُوچھا کہ مجھے ایسا طریقہ بتاؤ جس سے میں تجریدی حج ادا کروں ۔ بزرگ نے فرمایا : پہلے دل کو سہو سے صاف کرو ، پھر نفس کو لہو و لعب سے دور رکھو ۔ اس کے بعد زبان کو لغویات سے بچاؤ ، پھر جہاں چاہو جاؤ ۔

تفسیر عالمانہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ یہ خطاب اہلِ کتاب کے اُن علماء کو ہے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زمان تھے ۔ ثُمَّ ان کی قساوتِ قلبی کے بعد کی وجہ سے ہے کہ بعد ذکر کرنے یعنی باوجودیکہ ہم نے تمہیں وہ امور بتائے ہیں جو دل کو نرم کرتے ہیں اور اس میں رقت پیدا کرتے ہیں ۔ لیکن پھر بھی تم

شک میں ہو۔

ف : قسوۃ اور قساوۃ غلیظ و شدید ہونے کو کہتے ہیں جیسے کہ پتھر میں ہوتی ہے اور قلوب کو اس سے اس لیے موصوف کیا گیا کہ وہ عبرت پکڑنے سے دور ہیں اور نصائح ان پر اثر نہیں کرتے۔

مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ بعد ان واقعات کے سننے کے کہ مقتول زندہ ہوا اور وہ لوگ بندر و خنزیر ہوئے اور پہاڑ ان کے سروں پر آیا اور دیگر آیات بینات اور وہ حالات کہ جن کو سن کر پہاڑ پگھل جائیں اور پتھر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔

فَهِيَ پس یہ قلوب **كَالۡحِجَارَةِ** اپنی شدت و قساوۃ کی وجہ سے پتھر کی طرح ہیں۔ فاء تفریع کے لیے ہے، جو قلوب کو پتھر سے مشابہت دی گئی ہے کہ وہ قساوت میں برابر ہیں یہ التشبیہ علیٰ وجہ الشبہ کے قبیل سے ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے:

اَحۡمَرُ خُدَّهٗ فَهُوَ كَالۡوَرۡدِ۔

(اس کا چہرہ گلاب کی طرح سرخ ہے)

اَوۡ اَشَدُّ یا اس سے بھی زیادہ سخت **قَسۡوَةً** ط تمیز ہے اور اَوۡ بمعنے بَلۡ ہے یا تخییر کے لیے ہے۔ یعنی اگر تم چاہو اس سے بھی زیادہ سخت شے، مثلاً لوہے سے تشبیہ دو تب بھی موزونیت سے خالی نہیں۔

سوال : اَوۡ کا اصلی معنیٰ یعنی شک و تردد کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب : شک و تردد اللہ تعالیٰ علام الغیوب سے محال ہے۔

سوال : اَشَدُّ قَسۡوَةً کیوں کہا گیا تو یہ ان افعال میں ہوتا ہے جن سے افعل التفضیل و افعل التعجب کی بنا نہ ہو سکے حالانکہ یہ مجرد کا فعل ہے اور اس سے افعل التفضیل و افعل التعجب دونوں مشتق ہو سکتے ہیں۔

جواب : یہی معنی مراد پر زیادہ ظاہر اور قسوۃ کی زیادتی پر زیادہ دال ہے کیونکہ اس میں جو لفظ یعنی قسوۃ بھی موجود ہے اور پھر زیادتی کے معنیٰ کے لیے لفظ اشد بھی بخلاف لفظ اقسی کے کہ اس میں صرف جوہر کلمہ یعنی قسوۃ کی دلالت ہوگی۔

سوال : قساوۃ کی تشبیہ حجارۃ سے کیوں ہے حالانکہ اس سے بہت بڑے سخت لوہا اور تانبہ تو موجود ہیں۔

جواب : وہ آگ وغیرہ سے نرم ہو جاتے ہیں مثلاً لوہے کو آگ نرم کر دیتی ہے اس میں نرمی کا مادہ ہے، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں نرم ہو جاتا تھا اور تانبے سے برتن وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں بخلاف پتھر کے کہ نہ اسے آگ نرم کر سکے اور نہ کوئی اور شے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں کو اس سے تشبیہ دی۔ اللہ تعالیٰ عالم ہے کہ تشبیہ دے رہا ہے اور اسے علم ہے کہ یہ قوم ایمان نہیں لائے گی۔

وَاِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ ربط : اب ان کے دلوں کی پتھروں سے زیادہ سختی کا بیان فرماتے ہیں کہ

کفّار کے قلوب کس طرح پتھر سے شدّت میں زیادہ ہیں ۔ گویا اب اَشَدُّ قَسْوَۃً کی دلیل کو زیادہ پختہ بنانا مطلوب ہے۔

ترکیب : من الحجارۃ ، اِنَّ کی خبر ہے اور اس کا اسم لَمَا الخ ہے ۔ لام تاکید کے لیے ہے اور ما سے مراد پتّھر ہے ۔

لَمَا يَتَفَجَّرُ بہت بار پھٹ جاتا ہے مِنْهُ اس کی ضمیر ما کی طرف راجع ہے الْاَنْهٰرُ ط نہر کی جمع ہے ۔ نہر پانی کے جاری ہونے کے مقامات سے ایک جاری ہونے کی وسیع جگہ کا نام ہے ۔ یعنی لبعض پتھر وہ ہیں کہ اُن میں پھٹنا بکثرت ہوتا ہے کہ جس سے پانی فراوانی سے نکل کر بہتا ہے ۔ وَاِنَّ مِنْهَا اور بعض پتھروں میں سے وُہ ہیں لَمَا يَشَّقَّقُ یہ دراصل يَتَشَقَّقُ تھا یعنی پھٹ جاتے ہیں اور صَدْع بمعنے شے کے اطراف کو چیرنا ۔ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ط اس سے پانی طول یا عرض میں چلتا ہے اور اس سے پانی اُبلتا ہے ۔ اس سے چشمے مراد ہیں نہ کہ نہریں وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ پہاڑ کی اونچائی سے گر کر نیچے آتا ہے مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط خشیۃ اس خوف کو کہتے ہیں جو علم سے ہو ۔ یہاں مجاز ہے کہ وہ ڈرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی وجہ سے اور یہ ممتنع نہیں جس کا ارادہ کیا جا رہا ہے ۔ اور کفّار وُہ ہیں کہ نہ وُہ تابعدار ہوتے ہیں اور نہ ہی نرم اور نہ ہی ڈرتے ہیں اور نہ وہ جس کے مامور ہیں اس پر عمل کرتے ہیں وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ اور اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ یعنی جو تم عمل کر رہے ہو اس سے بے خبر نہیں ۔ یہ شدید وعید ہے اس عمل کی وجہ سے جس پر اُن کے قلوب ہیں اور اعمالِ سیئہ کی وجہ سے جن پر یہ وعید مرتّب ہو رہی ہے ۔

نکتہ کافر کا دل پتھر سے سخت اس لیے ہے کہ پتّھر میں فہم و فراست کے اسباب و خطاب نہ ہونے کے باوجود اللہ سے ڈر رہا ہے اور اس کے لیے فرمانبردار رہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۔

اور کافر کا دل باوجودیکہ اس میں عقل و فہم کے اسباب ہیں اور قبول کرنے کی ہیئت بھی موجود ہے نہ ڈرتا ہے اور نہ نرم ہوتا ہے ۔

مسئلہ : معتزلہ کہتے ہیں :

"خشیۃ الحجر علیٰ وجہ المثل" ۔ یعنی اگر اُن میں عقل ہوتی تو وہ عمل ضرور کرتے ۔

اور اہلِ سنّت والجماعت فرماتے ہیں :

پتھر اگرچہ جماد ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسے فہم دیتا ہے اور الہام فرماتا ہے پھر اس الہام کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جمادات اور تمام حیوانات میں علم رکھا ہے (خلافاً للعقلاء) اور اس کے سوا دیگر کوئی واقف نہیں ہوتا ، ان کی صلوٰۃ بھی ہے اور تسبیح و خشیت بھی ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وان من شئ الّا یسبّح بحمدہٖ۔

اور فرمایا:

والطّیر اصافات۔ اور: کل قد علم صلوٰتہ وتسبیحہ۔

سبق: سالک کے لیے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لائے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے۔

معجزاتِ محمدیؐ ۱۔ حضور علیہ السلام ایک دن کوہِ ثبیر پر تھے اور کفار آپؐ کی تلاش میں تھے۔ کوہِ ثبیر نے عرض کی: حضورؐ! مجھ سے اُتر جائیے، ایسا نہ ہو کہ کافر آپؐ کو پکڑ لیں اور میں اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤں۔ اُدھر حرا پہاڑ نے عرض کی: حضورؐ! میرے ہاں تشریف لے آئیے۔

۲۔ جس کھجور کے تنے کا، جو کہ مسجد کے ستونوں میں سے ایک تھا، آپؐ سہارا لے کر وعظ فرماتے، منبر تیار ہونے پر آپؐ نے اس سے ٹیک لگانا چھوڑ دیا تو وہ آپؐ کے فراق میں رو پڑا اور اونٹنی کی طرح اس سے چیخ و پکار کی آواز آ رہی تھی یہاں تک کہ عام مسجد والوں نے سُنا۔ آپؐ نے نیچے اُتر کر اسے گلے لگایا۔ تب اسے سکون نصیب ہوا[1]

مثنوی شریف میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں: ؎

آنکہ او را نبود از اسرار داد

کے کند تصدیق او نالہ جماد

ترجمہ: جسے عطیہ ایزدی سے اسرار نصیب نہ ہوں وہ جماد کے نالہ کی کب تصدیق کرتا ہے۔

۳۔ ایک یہودی بکریاں چرا رہا تھا کہ بھیڑیے نے بکری پر حملہ کر کے بکری اٹھالی۔ وہی یہودی اس کے پیچھے بھاگا اور اس سے بکری چھڑالی۔ بھیڑیا یہودی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا ایک دن ایسا بھی ہوگا کہ ان کا چرواہا میرے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ لوگوں نے کہا سُبحان اللہ! بھیڑیا بھی کلام کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو ایمان رکھتا ہوں اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی، بھیڑیے کا بولنا کون سی عجب بات ہے قیامت کے دن کفّار کے چمڑے بولیں گے۔

۴۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کنکریاں تسبیح پڑھتی تھیں۔

۵۔ زہر آلود بکری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بول پڑیں۔

۶۔ دو درخت چل کر آپؐ کے پاس آئے (اور جُھک گئے) جن کی اوٹ میں بیٹھ کر آپؐ نے قضاءِ حاجت فرمائی پھر وہ اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے۔ وغیرہ۔ اس طرح بے شمار واقعات ہیں[2]

---

[1] فقیر نے اس واقعہ کو شرح مثنوی میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اویسی غفرلہٗ

[2] تفصیلی معجزات کے لیے فقیر کی کتاب "المعجزات" پڑھیے۔ اویسی غفرلہٗ

حکایت قطبِ وقت شیخ ھدائی اسکداری کے واقعات میں ہے کہ پانی جاری میں چلتے وقت پانی کا ذکر یا دائمُ یا دائمُ اپنے کانوں سے سنتے تھے۔ حضرت مولانا رومؒ نے مثنوی شریف میں فرمایا ؎

۱ نطق آب و نطق خاک و نطق گل
ہست محسوس حواس اہلِ دل

۲ فلسفی کو منکر حنانہ است
از حواس اولیاء بیگانہ است

۳ ہر کرا در دل شک و پیچا نیست
در جہان او فلسفی پنہا نیست

ترجمہ: (۱) پانی مٹی اور گارے کا بولنا اہلِ دل کے حواس کو محسوس ہوتا ہے۔
(۲) وہ فلسفی جو حنانہ کے نالہ کا منکر ہے وہ حواسِ اولیاءؒ سے بیگانہ ہے۔
(۳) جس کے دل میں شک اور ٹیڑھا پن نہیں جہان میں اس کے نزدیک فلسفی بے عقل ہے۔

ف: بعض حکماءؒ فرماتے ہیں کہ ثم قست قلوبکم کا معنیٰ یُبُسٌ بمعنے خشکی ہے۔ یعنی تمہارے دل خشک ہوگئے۔ اور دل کی خشکی کا یہ مطلب ہے کہ دل دو پانیوں سے محروم ہوجاتا ہے:
ایک اللہ تعالیٰ کے خوف کے پانی سے،
دوسرا مخلوق پر شفقت کے پانی سے۔
جس دل میں نہ خوفِ خدا ہو اور نہ مخلوق پر شفقت، تو وہ دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوجاتا ہے۔

روحانی نسخے

حدیث شریف: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر کثرتِ کلام سے بچو، اس لیے کہ ذکرِ الٰہی کے بغیر کثرتِ کلام سے دل سخت ہوجاتا ہے اور جس کا دل سخت ہو وُہ اللہ کے قُرب سے دُور ہوجاتا ہے۔

حدیث شریف: فرمایا: چار چیزیں بدبختی کی علامت ہیں:
۱۔ آنکھ کا خوفِ خدا سے آنسو نہ بہانا۔
۲۔ دل کا سخت ہوجانا۔
۳۔ طویل آرزو۔
۴۔ دنیوی معاملات میں حریص ہونا۔

ف: آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہودیوں نے جبکہ بہت بڑے بڑے معجزات دیکھے لیکن چونکہ عنایت ربانی

اُن کے شامل نہ ہُوئی اسی لیے سختی قلب کے سوا انہیں کچھ نصیب نہ ہُوا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آیاتِ ظاہرہ تو دکھائے اور انہوں نے ظاہری حواس سے انہیں دیکھا لیکن انہیں اس برہان سے محروم رکھا جسے قلب سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی بات ان کے لیے آڑ بن گئی اور اُن سے تکذیب و انکار سرزد ہوا۔ چنانچہ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ سے معلوم ہوتا ہے۔

تفسیرِ صُوفیانہ کچھ یہی کیفیت ان بعض سالکین کی ہے کہ جب وُہ ریاضات میں شاغل ہوتے ہیں تو روحانیت کی صفائی کی وجہ سے ان پر بعض آیات کا ظہور ہوجاتا ہے اور ان سے خرقِ عادات کرامات سرزد ہونے لگتے ہیں پھر جبکہ عنایت ربّانی ان کے شاملِ حال نہیں ہوتی تو پھر سوائے عجب و غرور کے انہیں اور کچھ نصیب نہیں ہوتا اور یہ واردات عموماً رہبانوں کو حاصل ہوتے ہیں اور ان فلسفیوں کو بھی جنہیں اللہ تعالیٰ خسارہ میں ڈالنے کی وجہ سے مہلت دیتا ہے اور انہیں اس کا علم تک نہیں ہوتا اسی لیے گمراہی میں بڑھتے رہتے ہیں۔

سوال: قلوب کو پتھر سے کیوں تشبیہ دی گئی ہے؟

جواب: جیسے پتھر نرم نہیں ہوسکتا اسی طرح یہ دل بھی ذکرِ حقیقی سے نرم نہیں ہوسکتے۔ ذکرِ حقیقی وُہ ہے جسے اللہ تعالےٰ نے قرآن میں اہتمام سے بیان فرمایا: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا)۔

اقسامِ قلوب سختی کے لحاظ سے دل کئی قسم کے ہیں:

(۱) بعض اُس پتھر کی طرح ہیں کہ اُن سے نہریں جاری ہوتی ہیں یہ وہ ہیں جن میں صفائی کی وجہ سے رُوح کے انوار کے غلبوں سے بعض ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں جو خرقِ عادات کے مشابہ ہوتے ہیں اور یہ راہبوں اور کاہنوں میں ہوتا ہے۔

(۲) بعض ان پتھروں کی طرح ہیں کہ جن کے پھٹنے سے پانی نکلتا ہے۔ یہ وُہ ہیں جن پر بعض اوقات (جبکہ بشریت کے حجابات انوارِ رُوح سے دُور ہوجاتے ہیں۔ وہ بعض آیات اور معانی کا مشاہدہ کرلیتے ہیں اور یہ بعض فلسفیوں اور بعض شعراء کو حاصل ہوتا ہے۔

(۳) بعض ان پتھروں کی طرح ہیں کہ وُہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گرجاتے ہیں۔ یہ وُہ ہیں جن میں بعض صفائی ہوتی ہے کہ وُہ بقدرِ صفائی قلب حجابات سے آگے بڑھ کر رُوح کے انوار کے عکس کے قابل ہوتے ہیں اُن میں خوفِ الٰہی بھی ہوتا ہے اور خشیۃ بھی۔ یہ بات بعض اہل الادیان والملل میں ہوتی ہے۔ یہ مراتب مشترک ہیں اہلِ اسلام میں ہوتے ہیں اور اُن کے غیروں میں بھی۔

سوال: جب یہ مراتب مسلم وغیر مسلم میں مشترک ہیں تو پھر فرق کیا رہا؟

جواب: یہ مراتب اہلِ اسلام کو ایمان کی تائید سے نصیب ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ کرامات و فراسات کی وجہ سے

اپنے قرب میں رہتے رہتے ہیں اور ان کی یہ کرامات وغیرہ تجلیِ انوارِ حق سے ظاہر ہوتی ہیں ۔ کما قال تعالیٰ :

"افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علیٰ نورٍ من ربہ ۔"

(جس کا اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے سینہ کھول دیتا ہے تو وُہ اپنے رب کے نور پر ہوتا ہے)

(۴) بعض قلوب ایسے پتھر کی مانند ہیں کہ نہ اُن پر قرآن کا اثر ہوتا ہے اور نہ احادیث کا اور نہ ہی وعظ ونصیحت کا اور نہ ہی حکمت کا اور یہ قلوب کفار اور منافقین کے ہوتے ہیں ۔ کیونکہ یہ وہ قلوب ہیں جن پر مُہر لگ چکی ہے ۔

وما اللہ بغافلٍ عمّا تعملون اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں تمہیں یا تو جلد از جلد سزا دے گا یا دیر سے ۔ جلد سزا یوُں کہ تمہارے انکار کو تمہاری قساوۃ قلبی کا سبب بنا دے گا جس سے تم انکار کیے جاؤ گے اور تمہارے قلوب کا میلان اعمالِ فاسدہ کی طرف رہے گا ۔ پھر تمہارے اس انکار کی وجہ سے تمہارے قلوب پر یہ مہر لگ جائے گی ۔

حدیث شریف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا :

"ہر دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں (قدرت) میں ہے ، چاہے تو وُہ تمہارے دلوں کو سیدھا رکھے یا انہیں ٹیڑھا کر دے ۔"

اور دیر سے سزا دینے کا مطلب یہ ہے کہ کل قیامت میں تمہارے اعمال کی وجہ سے تمہیں سزا دے گا ۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ اَفَتَطْمَعُوْنَ ربط : حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت الی الحق اور کفار کو اس کے قبول کرنے کے بڑے حریص تھے پھر ان کے عناد اور سرکشی سے آپ کا سینہ تنگ ہو جاتا یعنی ملال میں پڑ جاتے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بنی اسرائیل کے گزشتہ کے حالات سنوائے کہ باوجود آیات کے مشاہدات کے، پھر بھی انہوں نے نہ مانا ۔ اس میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود تھا اس بارے میں کہ آپ کے ہمعصر اسرائیل حق قبول نہیں کر رہے تو کیا ہوا ۔ آپ سے پہلے بھی ایسے ہوتا رہا ۔ یہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے ہے اور ہمزہ واقعہ کے انکار و استبعاد کی وجہ سے ہے ۔ جیسے کہتے ہیں :

"اَتَضْرِبُ اَبَاکَ" (کیا تُو اپنے باپ کو مار رہا ہے ؟)

یعنی یہ ہمزہ انکاری ہے نہ کہ وقوع کے انکار کے لیے ۔ جیسے کہا جاتا ہے :

"ءَاَضْرِبُ اَبِیْ" ۔

اور فا عطف کے لیے ہے جو مقدر پر عطف ہے جس کا مقام مقتضی ہے ۔ دراصل عبارت یوُں تھی : اَتَسْمَعُوْنَ اَخْبَارَھُمْ وَ تَعْلَمُوْنَ اَحْوَالَھُمْ فَتَطْمَعُوْنَ ۔ خلاصۂ کلام یہ کہ تم اُن کے مایوس کن احوال کی تفصیل جانتے ہو

پھر بھی تم طمع رکھتے ہو کہ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ ایمان لے آئیں گے تمام یہود یا اُن کے علماً۔ کیونکہ یہ شدۃ طمع اور اخلاق ذمیمہ میں ان کے برابر ہیں فلہٰذا ان میں سے سوائے ان اعمال کے جو ان اسلاف سے صادر ہوئے کچھ نہیں حاصل ہوگا۔ پس اُن کی تکذیب پر غم نہ کھاؤ۔ اور لام لَکُمْ میں استجابت کے معنے کی تضمین کی وجہ سے ہے ای فی ایمانھم مستجیبین لکم۔ یا تعلیل کے ہے ای فی ان یحدثوا الایمان لاجل دعوتکم واؤ حالیہ ہے۔ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک گروہ پہلے تھا۔ فریقٌ ایک ایسی جمع ہے جس کا اپنے لفظ سے واحد نہیں ہے جیسے رهطٌ۔ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللّٰهِ جو تورات سے کلام الٰہی سنتے تھے ثُمَّ يُحَرِّفُونَهٗ اس میں جو احکام تھے انہیں تبدیل کرتے۔ جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور آیۂ رجم۔ بعض کہتے ہیں کہ ستر منتخب شدہ یہودنے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا جبکہ طور پر موسیٰ علیہ السلام نے سنا، جس میں امر و نہی تھا۔ پھر انہوں نے کہا ہم نے اللہ تعالیٰ سے کلام سنا تو اس نے آخر میں فرمایا اگر تم سے ہو سکے تو اسے عمل میں لانا اگر نہ ہو سکے تو کوئی حرج نہیں۔ (کذا فی التیسیر)

ازالہ توہم لیکن بات یہ ہے کہ انہوں نے بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں سنا تھا کیونکہ یہ تو موسیٰ علیہ السلام کا خاصہ تھا۔ ان کے ساتھ دنیا میں کسی کی شرکت نہیں تھی۔

اب معنیٰ یوں ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کا کلام یعنی تورات سنتے تھے جبکہ موسیٰ علیہ السلام پڑھتے تھے مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ یعنی بعد اس کے کہ انہوں نے عقل سے اس کلام کو سمجھا اور ضبط کیا کہ ان کو کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہا۔ معنیٰ یہ ہے کہ لوگ کیسے ایمان لا سکتے ہیں جبکہ یہ اپنے اسلاف کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ بھی ان اہلِ سوء سے ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں فلہٰذا ان سے ایمان لانے کی طمع نہ کرو۔ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ جسے تحریف کرتے ہیں انھیں علم تھا کہ ہم کاذب و مفتری ہیں وَاِذَا لَقُوا جب یہود ملاقی ہوتے ہیں الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ان لوگوں سے جو ایمان دار ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قَالُوْا منافقین کہتے ہیں اٰمَنَّا ہم بھی تمہاری طرح ایمان رکھتے ہیں کہ حضور سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی رسول بشر بہیں وَاِذَا خَلَا جب واپس چلے جاتے ہیں بَعْضُهُمْ وہ لوگ کہ جو منافق نہیں ہیں یعنی جب فارغ ہوتے ہیں مومنین کے مشغلہ سے اور متوجہ اور ملنے والے ہوتے ہیں اِلٰى بَعْضٍ ان لوگوں کی طرف جو منافق ہیں اس وقت کہ اُن کے نزدیک سوائے ان کے اور کوئی نہیں ہوتا قَالُوْا تو وہ گھر میں بیٹھنے والے عتاب دیتے ہیں ان کے اس عمل پر اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ کیا تم خبر دیتے ہو۔ استفہام بمعنی نہی ہے، یعنی مومنین کو خبر مت دو بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ وہ باتیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں خصوصی طور پر تورات میں بتائی ہیں یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف۔ فتحؔ سے اس لیے تعبیر کر رہے ہیں کہ وہ ایک پوشیدہ راز اور بند دروازہ کی طرح ہے کہ کوئی اس سے واقف نہیں ہے لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ لام تحدیث سے متعلق ہے نہ کہ فتح سے، اور ضمیر بہٖ میں ما فتح اللہ کی طرف راجع ہے یعنی تاکہ وہ حجت پکڑیں۔ پس تم پر حجت قائم کرتے ہوئے تمہیں عاجز کر دیں گے عِنْدَ رَبِّكُمْ اس کے

حکم اور کتاب میں جیسے کہتے ہیں هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ اس کی کتاب اور شریعت ہیں۔ اس واقعہ کو سن کر یہود وغیرہ اگرچہ اس غرض کو حاصل نہیں کرسکتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے حجت بازی کرنا لیکن ان کی حماقت اور بیوقوفی کے اظہار کے لیے ایسے ہی بیان فرما دیا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ان کے کلام سے متصل ہے بطور توبیخ وعتاب کے ہے یعنی کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ پھر اس ظاہر فاحش کو معلوم کر لوگے۔ اُن کا یہی بیان تم پر حجت ہوجائے گا، اس اعتبار سے ان کا عدم تعقل ابتداءً ہوگا۔ یا یہ معنی ہے کہ کیا یہ عمل تم کرتے ہو اور فاحش ظاہر کو سمجھتے بھی نہیں ہو جبکہ یہ بات بالکل واضح ہے اس لحاظ سے ان کا عدمِ تعقل فعل کے بعد ہوگا۔ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ ہمزہ انکار و توبیخ کا ہے اور واؤ عاطفہ ہے، اس کا عطف مقدر پر ہے کہ جس کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے۔ اور ضمیر توبیخ دینے والوں کی طرف لوٹتی ہے یعنی حجت کے خطرہ پر انھیں بیان کرنے پر کیوں ملامت کرتے ہیں۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمام وہ جو چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ کفر کو چھپاتے تھے اور ایمان کو ظاہر کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ مومنین پر اپنے نبی علیہ السلام کی طرف وحی بھیج کر ظاہر کر دے گا۔ اہلِ ایمان حجّت پکڑ کر کفار کو عاجز کر دینے پر قادر ہوجائیں گے۔ جیسے کہ رجم کی آیت اور بعض محرمات کو حرام قرار دینے کی آیات سے ہوا۔ پس ملامت وعتاب کرنے میں کیا فائدہ! وَمِنْهُمْ اور یہودیوں میں سے بعض اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ توراۃ کو نہیں جانتے کہ مطالعہ کر کے نبوّت کے دلائل کی تحقیق کر کے ایمان لائیں اِلَّآ اَمَانِيَّ اُمْنِيَّةٌ کی جمع ہے تمنّی سے ماخوذ ہے اور استثناءً منقطع ہے کیونکہ وہ جنس کتاب سے نہیں۔ یعنی نہیں جانتے سوائے شہوات باطلہ کے جو ان کے ہاں ہیں اور وہ مفتریات جن کے وہ مرتکب ہوئے۔ مثلاً:

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کی تبدیلی

۲۔ ہمیں (یہود کو) چند دنوں کے سوا عذاب نہیں مس کرے گا۔ (۳) انبیاء علیہم السلام ہماری سفارش کریں گے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ ہمارے (یہود کے) گناہوں پر مواخذہ نہیں کرے گا بلکہ ہم پر رحم فرمائے گا۔

یہ اقوال ایسے ہیں کہ ان کی کوئی دلیل ان کے پاس موجود نہیں تھی۔

وَاِنْ هُمْ اور نہیں ہیں وہ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ مگر گمان کرتے ہیں، ان پر یقین نہیں رکھتے۔ یعنی وہ نہیں ہیں مگر قصوروار۔ یعنی ان کا امر گمان اور تقلید پر مبنی ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسا امر نہیں کہ جس سے وہ مرتبۂ علم کو پہنچ سکیں۔ جب ایسی بات ہے تو پھر ان سے ایسے ایمان کی امید کیسے کی جاسکتی ہے کہ جس کی بنیاد یقین پر ہو۔ فَوَيْلٌ وَيْلٌ یہ وہ کلمہ ہے جو ہلاکت میں پڑنے والا کہتا ہے۔ یعنی کسی کے لیے عذاب کی دُعا مانگنا معنے بہت بڑی سزا۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اس کا مابعد ہے۔

حدیث شریف: نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَيْل جہنّم کی ایک وادی ہے جس میں کافر کو ڈالا جائے گا

توچالیس سال تک وہ اس کی تہ تک نہیں پہنچ پائے گا۔

قول سعید حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، ویل جہنم کی ایک وادی ہے جس میں اگر دنیا کے پہاڑ ڈالے جائیں تو جل کر راکھ ہو جائیں۔

لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ ان کے لیے خرابی ہے جو تحریف شدہ کتاب کو لکھتے ہیں **بِاَيْدِيْهِمْ** اپنے ہاتھوں سے۔ بایدیھم تاکید ہے، تاکہ کسی کو یہاں مجازی معنے کا وہم نہ ہو۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

كَتَبْتُ اِلٰى فُلَانٍ۔

(میں نے فلاں کو لکھا)

اس میں مجازی معنے کا وہم ہے کہ اس نے دوسرے کو لکھنے کو حکم دیا ہو اگرچہ اس نے خود نہیں لکھا لیکن امرِ کتابت کو اپنی کتابت سے تعبیر کیا ہے **ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ** پھر عوام کو کہتے ہیں **هٰذَا** یہ تحریف شدہ کتاب **مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ** اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ یعنی یوں کہتے کہ یہی وہ اصل توراۃ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی۔

شانِ نزول جب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو یہود کے علماء کو خطرہ لاحق ہوا کہ آپ کے اوصاف جو توراۃ میں درج ہیں عوام کو معلوم ہو گئے تو پھر ہمارے کھانے پینے اور عزّ وجاہ کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ انہوں نے توراۃ کے اندر جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اوصاف درج تھے تبدیل کر ڈالے عوام کو وہی تحریف شدہ اوصاف سناتے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اوصاف کے برعکس تھے۔ اسی لیے ان کے عوام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تکذیب کرتے رہے۔ اس حیلہ سے ان یہودی علماء کے حلوے مانڈے بحال رہے۔[1]

اصل تورات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک حسین چہرے والے، گھنگریالے بالوں والے، شرمیلی آنکھوں والے اور متوسط قد والے صلی اللہ علیہ وسلم بقدر حسن جمالہ وعلیٰ آلہ وبارک وسلم۔

تحریف شدہ حلیہ کا ذکر لمبے قد والے، نیلی آنکھوں والے، لٹکے ہوئے اور سیدھے بالوں والے۔ (معاذ اللہ)

ف: توراۃ میں حضور علیہ السلام کا بیان تھا اور آپ کے حسن وجمال کا ذکر بھی۔ جب یہود اپنے علماء سے پوچھتے تو

---

[1] اس سے وہ لیڈر نما مولوی عبرت پکڑیں جو احکامِ خداوندی کو پس پشت ڈال کر امراء و احکام کی خوشنودی کے لیے مسائل بتانے میں ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ اویسی غفرلہٗ

وُہ پچھلے اوصاف سناتے جس کی وجہ سے عوام یہود حضور علیہ السّلام کی پیروی سے محروم رہے۔

لِيَشْتَرُوْا بِهٖ تاکہ وُہ یہودی علماٗ تحریف شدہ مسائل کے عوض میں اپنے لیے حاصل کریں ثَمَنًا روپے پیسے۔ ثمن سے وہ رشوت مراد ہے جو تحریف اور غلط تاویل کے عوض مال لیتے تھے۔

سوال : ثمن تو وسیلہ ہوتا ہے اور مقصود مبیع۔ یہاں اس کے برعکس کیوں کہا گیا ہے ؟

جواب : ان کی غلطی کے اظہار کے لیے کہ جو شئے مقصود بالذات تھی اسے انہوں نے وسیلہ بنایا اور وسیلہ کو اصل مقصود سمجھا ان کی اُلٹی چال کی وجہ سے آیت میں یُوں ذکر ہوا۔

قَلِيْلًا ط اتنا تھوڑا کہ وُہ کسی شمار میں نہ ہو۔

سوال : یہود کے علماٗ تو بہت مال حاصل کرتے تھے، آیت میں اسے قلیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جواب : اس کا قلیل ہونا یا تو اس کے فنا ہو جانے کی وجہ سے ہے یا اس لیے کہ اس کا انہیں کوئی ثواب نہیں ملے گا بلکہ الٹا عذاب۔ یا اس لیے کہ وہ حرام تھا اور حرام میں برکت نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں حرام مال کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ (کذا فی تفسیر القرطبی)

فَوَيْلٌ لَّهُمْ ان کے لیے بڑا عذاب ہے مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ اس وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا۔ یعنی انھیں یہ سزا ان کی تحریف کی وجہ سے ہے وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝ اور انہیں بڑا سخت عذاب ہے اُن کے بُرے عمل کی وجہ سے۔ مثلاً رشوت لینا اور گناہوں کا ارتکاب کرنا وغیرہ۔

اَلْكَسْبُ اصل میں ایسا فعل جو حصولِ نفع اور دفعِ ضرر کے لیے کیا جائے۔ اسی لیے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر نہیں ہوتا۔

فوائد و لطائف آیاتِ مذکورہ میں چند لطیف اشارے ہیں :

(۱) بندے کا علم اور یقین اور معرفت اور اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہو جانا وغیرہ اسے اس وقت تک فائدہ نہیں پہنچاتا جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا۔

(اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت شامل حال نہ ہوتی تو تم سے کوئی ایک بھی نہ بچ سکتا)

یہ بات حق ہے، دیکھیے شیطان ابلیس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ کلام کیا اور اس سے مخاطب ہوا۔ کما قال :

يٰۤاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔

(اے ابلیس! میں نے تجھے حکم دیا میرے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے کو سجدہ کیوں نہ کیا)

ابلیس کو اتنی قدر افزائی کے باوجود اسے ایمان حقیقی نے فائدہ نہ بخشا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے

شاملِ حال نہ تھا۔ وہ ابلیس مشاہدہ کے باوجود ایمان پر ثابت قدم نہ رہ سکا تو برہان دیکھنے والوں کی کیا امید رکھی جائے۔
مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ جز عنایت کے کشاید چشم را
جز محبت کہ نشاید خشم را
۲ جہد بے توفیق خود کس را مباد
در جہاں واللہ اعلم بالسداد
۳ جہد فرعونے چو بے توفیق بود
ہرچہ او می دوخت آں تفتیق بود

ترجمہ: ۱۔ عنایت الٰہی کے سوا کب آنکھ کھل سکتی ہے جہاں محبت ہو وہاں غصہ کیسا۔
۲۔ بے توفیق الٰہی کوشش نہ ہو جہاں میں کوشش سے راہ سیدھی نصیب نہیں ہوتی۔
۳۔ چونکہ فرعون کی کوشش توفیقِ الٰہی سے نہ تھی اسی لیے اس نے جو کچھ کیا ضائع ہوا۔

(۲) عالم بے عمل (سرکش) اور عوام گمراہی میں برابر ہیں۔ کیونکہ عالم کے لیے ضروری ہے کہ وُہ اپنے علم کے مطابق عمل پر کار بند ہو اور عوام کو چاہیے کہ ایمان و عقاید میں کسی کی تقلید نہ کریں اور نہ ہی گمان کی راہ پر چلیں کیونکہ ایمان صرف آرزو کا نام نہیں بلکہ تحقیق کا نام ہے۔ جو لوگ محض تقلید آبائی کے پابند ہیں اور اپنے ظنونِ فاسدہ پر عمل کرتے ہیں اور اپنے خیالات کو پیشوا مانتے ہیں انہیں اپنی کتابوں سے سوائے ظاہری قرآت کے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ نہ انہیں معانی کی معرفت نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی اسرار و حقائق کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے زمانہ کے اکثر لوگوں کا یہی حال ہے کہ ادھر دیکھو تو اسلام کے علمبردار ہیں لیکن اسلام کی تعلیمات سے کوسوں دُور ہیں۔ ایسے مدعی اور صرف اسلام کے متمنی کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ انھیں سوائے خسران اور گمراہی اور حسرت و ندامت و وبال کے اور کچھ نصیب نہیں ہوگا۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ تشنہ را گر ذوق آید از سراب
چوں رسد در وے گریزد جوید آب
۲ مفلساں گر خوش شوند از زرِ قلب
لیکن آں رسوا شود در دار ضرب

ترجمہ: (۱) پیاسے کو اگرچہ سراب سے پیاس بجھانے میں مزہ محسوس ہوتا ہے لیکن جب اسکے قریب پہنچ کر اسے خالی پاتا ہے تو پانی تلاش کرتا ہے۔ (۲) اگرچہ کھوٹے سونے سے تنگدست خوش ہو جاتا ہے لیکن جب کسوٹی پر پرکھتا ہے تو شرمسار ہوتا ہے۔

(۳) جس نے دین کے کسی مسئلہ کو تبدیل کیا یا تحریف کی یا اس میں وہ عمل بدعت کے طور پر شامل کیا جو اصولِ دین سے خارج ہے تو وہ بھی اس آیت کی وعید میں داخل ہے۔

حدیث شریف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے آخری دور کے لوگوں کے حالات کو معلوم کر کے فرمایا کہ خبردار! تم میں سے جو اہلِ کتاب تھے بہتّر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور میری اُمت تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ وہ سب کے جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے کہ وہ بہشتی ہوگا۔

ف: حدیث شریف میں اس طرف اشارہ ہے کہ دین میں اپنی طرف سے ایجاد بندہ شامل نہ کرو جو کتاب اللہ، سنتِ رسولؐ اور سنتِ صحابہؓ کے خلاف ہو جس سے لوگ گمراہ ہو جائیں۔ جن باتوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو ڈرایا وہی باتیں ان میں گھس گئیں اور جہان میں وہ بیماریاں عام ہو گئیں۔

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا:

۱ نخواہی کہ نفریں کنند از پست
نکو باش تا بد نگوید کست

۲ نہ ہر آدمی زادہ از دد بہست
کہ ددز آدمی زادہ بد بہست

ترجمہ: ۱۔ اگر تو چاہتا ہے تیرے بعد تجھے کوئی بُرا نہ کہے تو نیک ہو جا تاکہ کوئی تیری برائی نہ کرے۔
۲۔ ہر آدمی جانور سے اچھا نہیں، ظالم آدمی سے جانور بہتر ہے۔

(۴) بعض لوگ نمائشی صوفی بن کر اولیاءؒ اور اہلِ دل لوگوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن ان کا دل اُن کے طریقوں سے دُور ہوتا ہے اور وہ غفلت کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ اُن کے اقوال غمازی کرتے ہیں کہ یہ ان میں سے نہیں اور وہ ہمیشہ اپنی خواہشات کے پابند ہوتے ہیں جہاں خواہشات لے جاتی ہیں وہ اُدھر بھاگ جاتے ہیں۔ اگر انھیں احکامِ الٰہی کی طرف بلایا جائے تو اس سے کتراتے ہیں ان کو اولیاءُ اللہ کے طریقوں سے ذرہ بھر بھی حصّہ نصیب نہیں ہوتا۔ فویل لہم مما کتبت ایدیہم و ویل لہم مما یکسبون۔ ان کی ان خرابیوں کا انہیں بہت عذاب ہوگا اور وہ جو الحاد عن الحق اور بُرے عقاید اور مخلوق کو دھوکا دینے اور انہیں گمراہ کرنے کا عمل کرتے ہیں، تو اس وجہ سے انھیں وعیدِ شدید ہے۔ وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

مثنوی شریف میں ہے:

۱ چند ہزاراں دام و دانہ است اے خدا ما چو مرغانِ حریصِ بے نوا
۲ دمبدم ما بستہ دام نویم ہر یکے گر باز و سیمرغ شویم

ترجمہ : (۱) لاکھوں دام و دانے ہیں اے اللہ! ہم پرندے کی طرح حریص بے نوا ہیں۔

(۲) ہم ہر لحظہ نئے دام میں پھنستے ہیں خواہ ہم باز و سیمرغ بھی ہو جائیں تب بھی دام سے نہیں بچ سکتے۔

تفسیر صوفیانہ سالک کے لیے ضروری ہے کہ موجود حق کی طرف پہنچنے کی کوشش کرے اور موہوم مطلق سے بچے بطون امتیازات سے غافل ہو کر حالات کے دھوکا میں نہ آ جائے۔ اس لیے راہِ حق ہر دقیق سے دقیق اور راہ عمیق سے زیادہ گہرا اور دُور دراز راہوں سے بھی زیادہ دُور ہے۔

ف : سب سے بڑا جاہل وہ آدمی ہے جو نفس کی شرارتوں کے یقین ہونے پر لوگوں کی مدح کی وجہ سے نفس کی اصلاح ترک کر دیتا ہے۔ حضرت حارث بن اسد المحاسبی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : جو شخص کسی کی مدح سے خوش ہوتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جس کی مسخریاں کی جاتی ہیں۔ اُسے یُوں کیوں نہ کہا جائے کہ تیرے پیٹ سے جو فضلات خارج ہوتے ہیں وہ بڑے خوشبو دار ہیں۔ کیا اس بات سے خوش ہوگا ؟ نہیں ہرگز نہیں۔ تو ایسے ہی مدح سُن کر خوش ہونے والے کی کیفیت ہے۔

سبق : دانا کے لیے ضروری ہے کہ وُہ ایسی باتوں کی طرف دھیان نہ کرے بلکہ وہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

ف : اس واعظ کے لیے بھی خرابی ہے جو لوگوں کے ہاتھ پاؤں چُومنے پر تکبّر کرتا ہے اور فخر محسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں ان لوگوں سے افضل ہُوں۔ ایسا شخص صرف مدح و ذم کی خرابیوں میں مقیّد رہتا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ جس کے دل سے ایسے باطل خیالات دُور فرما دے تو وُہ بچ جائے گا، ورنہ مشکل ہے۔

نسخہ اچھے لوگوں کے پرکھنے کا خاص طریقہ یہ ہے کہ انھیں تعریف کرنے والے اور طمانچہ مارنے والے برابر نظر آئیں اور غلط طریقے والے اس کے برعکس ہیں۔

حکایت حضرت جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی مجلس میں فرمایا کہ اگر میں نے حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد نہ سُنا ہوتا کہ :

اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ۔

(اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فاجر بندے سے کراتا ہے)

تو میں کبھی وعظ کرنے کی جُرأت نہ کرتا۔ اب مجھے سہارا مل گیا کہ وہی فاجر میں ہی سہی، دین کو تو فائدہ ہے۔

تفسیر عالمانہ وَقَالُوْا اور یہودیوں نے اپنے گمان پر کہا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ہمیں آگ نہیں چھوئے گی۔ یعنی آخرت میں ہمارے ہاں آگ نہیں پہنچے گی اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ط ہاں چند گنتی کے دنوں تک۔ وُہ یا تو سات دن ہوں گے اس لحاظ سے کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اور دنیا کے ایک ہزار کے مقابلے میں ایک دن سزا ملے گی اس کا مجموعہ سات یوم ہے یا چالیس یوم مراد ہیں اتنی مقدار کہ ان کے آبا نے بچھڑے کی پرستش کی۔

ف : حضرت ابو منصور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے ان ایام کو سمجھ رکھا ۔ جتنے دن ان کے آبا نے نافرمانی میں گزارے ۔ یہ لوگ فرقہ جہمیہ کے عقیدہ کی طرح خلود نار کے قائل نہیں یا اس لیے انہوں نے ایامِ قلیل سے تعبیر کیا کہ ان کا عقیدہ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ابناٗ اور احبا ہیں ۔ اور باپ بیٹے کو اور دوست دوست کو اتنا بڑا عذاب نہیں پہنچاتا ۔ ہاں کسی وقت زجر و توبیخ مقصود ہوتی تو مختصر وقت میں پھر وہ اس سے راضی ہو جاتا ہے ۔

مسئلہ : اُن کا یہ مذکورہ خیال فاسد ہے کیونکہ کفر کی سزا دائمی ہے ۔ جیسا کہ ایمان کی جزا دائمی ہے ۔ اس لیے جو بھی اپنے کسی دین پر عقیدہ رکھتا ہے تو وہ عقیدہ اس کا دائمی ہوتا ہے نہ کہ مذبذب ۔ اسی طرح پھر اُس کی جزا کا حال ہے کہ وہ بھی دائمی ہونی چاہیے ۔

قُلْ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ! انہیں تبکیتاً و زجراً فرمائیے **اَتَّخَذْتُمْ** اتخذتم کا ہمزہ قطعی ہے کیونکہ یہ ہمزہ استفہامیہ ہے بمعنے توبیخ کے اور ہمزہ وصلی کلام کے ادراج سے گر گیا ۔ دراصل ءَاِتَّخَذْتُمْ تھا ۔ **عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا** کیا اللہ تعالیٰ سے تم نے کوئی وعدہ لے رکھا ہے ۔ کیا تمہیں اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی کوئی خبر پہنچی ہے یا تمہارے گمان کے مطابق کوئی تمہارے ہاں اللہ تعالیٰ کا عہد نامہ ہے کیونکہ یہ باتیں کسی عہد قوی کی بنا پر کہی جا سکتی ہیں اس لیے اسے عہد سے تعبیر کیا گیا ہے **فَلَنْ** یہ فاء فصیحیہ ہے شرط محذوف کا پتا دے رہی ہے دراصل عبارت یوں تھی؛ اِنِ اتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا اَوَ اَمَا نًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ یعنی اگر تمہارے پاس اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد و پیمان ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا **يُّخْلِفَ اللّٰهُ** اخلاف سے ہے یعنی وعدہ توڑنا **عَهْدَهٗۤ** یعنی وہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کر رکھا ہے ۔ یعنی وہ تو اپنا وعدہ پورا کرتا ہے ۔

ف : امام منصور رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اس آیت میں دو وجہیں ہیں :

(۱) کیا تمہارے پاس اے اہلِ کتاب ! اللہ تعالیٰ سے کوئی خبر آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دائمی عذاب میں مبتلا نہیں فرمائے گا ۔ اگر کچھ تمہارے پاس خبر ہے تو اللہ تعالیٰ تو اپنے عہد و پیمان کے خلاف نہیں کرتا ۔

(۲) تمہارے پاس کوئی ایسے نیک اعمال ہیں جن کی وجہ سے تمہیں اللہ تعالیٰ نے بہشت کا وعدہ دے رکھا ہے ۔ اس اعتبار سے بھی وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا ۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ کیا تم افتراءً کہہ رہے ہو **عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** ۝ اللہ تعالیٰ پر ایسا افترا کر رہے ہو جس کا تمہیں علم تک نہیں کہ کیا ہونے والا ہے ۔ یہ اَمْ ہمزہ استفہام کے مضمون کو برابر کرنے کے لیے ہے ۔ اب مطلب یہ ہوا کہ ان دو امروں میں سے ایک بات تو ضرور ہو گی کیونکہ ان دونوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے ۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ اگر تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا کوئی وعدہ ہے تو وہ وعدہ خلافی نہیں کر   لیکن اس کا تمہارے ساتھ کوئی وعدہ نہیں تم اپنے خیالی پلاؤ   میں مست ہو ۔

حدیث شریف میں ہے! جب قیامت میں ان پر یہی گنتی کے ایام گزریں گے تو جہنم کا داروغہ جہنمیوں کو فرمائے گا اے اللہ تعالیٰ کے دشمنو! تمہارے گمان کے مطابق تو وہ مدت ختم ہوگئی اور تم جہنم میں پڑے ہو، یقین کرلو کہ تم نے اس جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے۔

بَلٰی یہ لفظ نفی کے بعد اثبات کے لیے آتا ہے۔ گویا کہ یہ نفی کا جواب ہے (اثباتاً) اور لفظ نعم ایجاب کے جواب میں آتا ہے۔ یعنی اے یہودیو! تم کہتے ہو کہ ہمیں صرف چند روز جہنم میں رہنا ہوگا۔ تمہارا یہ گمان غلط ہے تم نے ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے جیسا کہ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ کا جملہ بتاتا ہے۔ اسی لیے اس مضمون کو شرط وجزا کے طریقہ پر بیان فرمایا۔ مَنْ مرفوع اور مبتدا ہے متضمن بمعنے الشرط کے۔ اسی لیے اس کی خبر میں فاء داخل ہوئی ہے اگرچہ یہ جزا ہے شرط کی کَسَبَ اَلْكَسْبُ بمعنے اِستجلابُ النّفع کے ہے۔ یعنی نفع کمانا۔

سوال: کفار کے لیے کون سا نفع ہے؟

جواب: مجازاً نقصان حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا گیا بطریق تحکم کے۔ جیسے ان کے لیے سیئۃ تحکماً استعمال ہوا ہے۔

سَيِّئَةً کوئی بڑا گناہ۔ کبائر سے کوئی ایک کبیرہ۔ **وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ** اور اسے وُہ گناہ محیط ہوگیا، اس کی جمیع جوانب کو، یعنی قلب، زبان، ہاتھ کو محیط ہوگیا۔ جیسے دشمن گھیر لیتا ہے۔ یہ معنی صرف کافر کے لیے ہوسکتا ہے۔ اسی لیے اسلاف نے سیئۃً کا ترجمہ کفر کیا ہے۔ **فَاُولٰٓئِكَ** یہ مذکورہ لوگ کہ جنہوں نے بُرے اعمال کیے اور خطایا وغیرہ ان کے محیط ہو گئے۔

سوال: یہ اشارہ جمع کے لیے ہے اور مَنْ کے لیے صیغہ واحد استعمال ہوتا آرہا ہے۔

جواب: مَنْ میں دو پہلو ہیں:

(۱) لفظاً مفرد اسی لیے اس کے لیے ضمائر واحد کے لگائے گئے ہیں۔

(۲) معناً جمع۔

اَصْحٰبُ النَّارِ جہنم کے ساتھی۔

سوال: کفار کو جہنم کا ساتھی کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: ساتھی ساتھی کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ جیسے دُنیا میں جہنم کے اسباب کے ساتھ رہے بنابریں انھیں جہنم کا ساتھی کہا گیا۔

جہنّم کے داخلہ کے اسباب

(۱) اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب ،
(۲) اللہ تعالیٰ کے کلام پاک کی تحریف ،
(۳) اللہ تعالیٰ پر افترا پردازی وغیرہ ۔

ترکیب : اصحٰب النار ' اولٰئك کی خبر ہے اور جُملہ مبتدا گزشتہ کی خبر ہے ۔

هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ٥ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے نہ ان کو ساتویں دن چھٹکارا نصیب ہوگا نہ چالیسویں دن ۔ جیساکہ ان کا گمان ہے ۔ یہ جملہ نصب علی الحالیہ کے موقعہ پر ہے ۔ چنانچہ دُوسرے مقام پر اسے صراحتہً حال بنایا گیا ۔ کما قال : اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۔ اس آیت سے کبیرہ کے مرتکب کے لیے جہنم کا خلود ثابت نہ ہوا ۔ کیونکہ یہ آیت تو خاص کفّار کے لیے ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور وُہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی تہِ دل سے تصدیق کرتے ہیں وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور اچھے عمل کرتے ہیں ۔ یعنی فرائض کی ادائیگی کرتے اور گناہوں سے بچتے ہیں اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ع یہی لوگ بہشتی ہیں اور وہ اس میں رہیں گے یعنی ان پر نہ موت ہوگی نہ ہی اس سے نکالے جائیں گے ۔

سوال : جہنمیوں کے ذکر کے بعد بہشتیوں کے ذکر کی ضرورت کیا ہے ؟

جواب : اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے کہ وعدہ کرتا ہے تو وعید کو بھی ساتھ ذکر کر دیتا ہے جیساکہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ بندوں کو صحیح راستہ بتانے پر کبھی ترغیب دے دی تو کبھی ترہیب ۔ کبھی خوش کر دیا تو کبھی ڈرا دیا ۔ نرمی و درشتی سے انسان کمال کو پہنچتا ہے اور اسی طریق سے جمال وجلال کے جلووں سے نوازا جاتا ہے ۔

حکایت ایک شیخ نے اپنے مرید سے فرمایا کہ اگر تُو حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کر لے تو تیرے لیے اس شغل سے بہتر ہے کہ جس میں تو مشغول ہے ۔ مرید نے کہا حضرت بایزیدؒ کا دیکھنا کیسے بہتر ہو سکتا ہے جبکہ وہ ایک مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کے جلوے ہر روز ہمیں ستّر بار دکھائی دیتے ہیں اور جو آخرت میں نصیب ہوں گے وُہ ان کے علاوہ ہیں ۔ ایک دن شیخ موصوف اپنے اس مرید کو لے کر حضرت بایزیدؒ کی زیارت کے لیے اُن کے درِ اقدس پر پہنچے ۔ پتا کیا تو ان کی اہلیہ محترمہ نے فرمایا : اس کی کیا زیارت کرو گے وہ تو ایک عام آدمی ہے ابھی آجاتا ہے گھر کے لیے جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کرنے گیا ہے ۔ چنانچہ وُہ دونوں حضرت بایزیدؒ کے راستے میں کھڑے ہو گئے ۔ دُور سے دیکھا کہ حضرت بایزیدؒ لکڑیاں شیر پر لادے آرہے ہیں چابک کی جگہ ان کے ہاتھ میں ایک اژدہا ہے ۔ شیر کو اس چابک (اژدہا) سے کبھی کبھی مارتے ہیں ۔ مرید حضرت بایزیدؒ کی اس کیفیت کو دیکھ کر جاں بحق ہو گیا ۔ حضرت بایزیدؒ نے اس کے شیخ سے فرمایا کہ تُو نے جہاں مرید کو تجلّیاتِ جمالیہ کی تلقین کی تھی وہاں اسے تجلّیاتِ جلالیہ کی تلقین بھی کرنا تھی اب وہ اسی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ، وُہ

تجلیاتِ جلالیہ کا پرتو برداشت نہ کرسکا۔ آیندہ محتاط رہنا، مریدوں کو تجلیاتِ جلالیہ کا مشاہدہ بھی کروایا کرو۔

ف : حضرت الشیخ مشہور با فتادہ آفندی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت بایزیدؒ چونکہ تجلیاتِ جمالیہ اور جلالیہ دونوں کے مظہر تھے اس لئے وُہ مرید آپؒ کی تجلیاتِ جلالیہ کا بوجھ نہ اٹھا سکا۔ حضرت مولانا روم رحمہ اللہ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں :

عاشقم بر قہر و بر لطفش بجد ۔۔۔ بوالعجب من عاشق این ہر دو ضد
واللہ ار زین خار در بستان شوم ۔۔۔ ہمچو بلبل زین سبب نالاں شوم
این عجب بلبل کہ بکشاید دہاں ۔۔۔ تا خورد او خار را با گلستاں
این چہ بلبل این نہنگ آتشیت ۔۔۔ جملہ ناخوش ماز عشق اوراخوشیت

ترجمہ :(۱) میں محبوب کے لطف وقہر دونوں پر بہ دل وجان عاشق ہوں مجھ پر تعجب بھی ہے کہ میں دو متضاد باتوں کا عاشق ہوں۔ بخدا! اگر میں اس کانٹے سے نکالا جاؤں اور باغ میں پہنچایا جاؤں تو اس کی جدائی سے بلبل کی طرح گریہ کروں گا۔ اس بلبل پر تعجب ہے جو باغ کے گل کے ساتھ کانٹے کو بھی کھا جائے۔ یہ بلبل تو نہ ہوئی بلکہ آتشیں مگرمچھ ہوا اس سے تمام لوگ ناخوش ہیں لیکن وہ عشقِ محبوب میں خوش ہے۔

تفسیر صوفیانہ آیات سے ثابت ہُوا کہ بعض مغرورین بالعقل جیسے فلاسفر اور طبالیعیہ وغیرہ کو غلط فہمی ہے جو کہتے ہیں کہ رُوح کی صفائی کو افعال واقوال اور اعمال کی قباحت کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ جب ارواح اپنے اجسام سے نکل جاتی ہیں تو یَرۡجِعُ کُلُّ شَیۡءٍ اِلٰی اَصۡلِہٖ (ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے) کے مطابق اجساد عناصر میں مل جاتے ہیں اور ارواح حظائر قدس میں پہنچتی ہیں۔ بنا بریں ارواح کو اعمال کے نتائج مزاحم نہیں۔ ہاں صرف چند ایام کے لیے۔ لیکن اُن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ عاقل حسًّا اور عقلاً جانتا ہے کہ شہواتِ حیوانیہ کی تابعداری اور لذاتِ نفسانیہ کو پورا کرنا اخلاق ذمیمہ (حرص، آرزو، حسد، کینہ، بغض، بخل، تکبّر، کذب، افترا وغیرہ) پیدا کرتا ہے اور یہ صفات نفس امّارہ کے ہیں جو ہمیشہ بُرائی کا حکم دیتا ہے۔ ارواح کا اُن سے متعلق ہونا ان کی صفائی میں تکدّر پیدا کر دیتا ہے۔ وُہ اپنے اخلاق (حلم، کرم، مروّت، صدق، حیا، عفت، صبر، شکر وغیرہ) سے تبدیل ہو کر اخلاقِ حیوانیہ شیطانیہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہاں خواہشاتِ نفسانیہ کا قلع قمع کرتا ہے تو اس کو مکارمِ اخلاق سے حصہ نصیب ہوتا ہے۔ اور اُس کی رُوح کو بھی صفائی نصیب ہوتی ہے اور پھر وہ اپنے اصلی وطن کی طرف لوٹنے کا متمنی رہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس بیّن فرق کو معلوم کرنے کے بعد وہ رُوح جو ہمیشہ نفس امّارہ کی تابع ہو جیسے عوام کی کیفیت ہے اس رُوح کا کب مقابلہ کر سکتی ہے جو الہاماتِ حق کے تابع ہے جیسے خواص اولیاءُ اللہ کی ارواح کا حال ہے۔

ف : بعض لوگ کہتے ہیں کہ ارواح اگرچہ دنیا میں چند خرابیوں میں مبتلا رہیں، لیکن جب اجسام سے جُدا ہوتی ہیں تو جس قدر ان کو خواہشاتِ طبعیہ سے تعلق تھا اسی قدر چند روز عذاب میں مبتلا ہوں گی۔ جب اُن سے کدورتِ دُنیویہ

(باقی برصفحہ ۳۸۳)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ
تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ
وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ
تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط
وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ
وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ ع

ترجمہ: اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی
کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قایم کرو اور زکوٰۃ دو پھر
تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم رُوگردان ہو اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خُون نہ کرنا اور اپنوں کو
اپنی بستیوں سے نہ نکالنا پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم گواہ ہو پھر یہ جو تم ہو اپنوں کو قتل کرنے لگے اور اپنے
میں سے ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکالتے ہو ان پر مدد دیتے ہو (ان کے مخالف کو) گناہ اور زیادتی میں
اور اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو بدلہ دے کر چھڑا لیتے ہو اور ان کا نکالنا تم پر حرام ہے تو کیا خدا
کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو تو جو تم میں ایسا کرے اس کا بدلہ کیا ہے مگر
یہ کہ دنیا میں رسوا ہو اور قیامت میں سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے
داؤ سے بے خبر نہیں یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے آخرت کے بدلے دُنیا کی زندگی خریدی تو نہ اُن پر عذاب ہلکا
ہوگا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

(صفحہ گزشتہ سے آگے)

اور خواہشاتِ نفسانیہ زائل ہو جائیں گی تو پھر وہ اپنی اصلی حالت پر آ جائیں گی۔ ان لوگوں کا خیال بھی باطل ہے کیونکہ
ان کے اس خیال کا رد قرآن پاک نے کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ

یعنی جب گناہوں کا قلب پر غلبہ ہوجاتا ہے تو گناہوں کی مقدار قلب پر ایک سیاہی جم جاتی ہے اگر بندہ اس گناہ سے توبہ کرلے تو اس کی وہ سیاہی دُور ہوجاتی ہے اگر وہ اس گناہ پر ڈٹا رہے تو وہ سیاہی دل کو گھیر لیتی ہے یہاں تک کہ اس سے فطری صفائی بھی دُور ہوجاتی ہے اور نورِ ایمان سے فارغ اور اعمال کی روشنی سے محروم ہوجاتا ہے پھر خطیئات جب اس کا احاطہ کرلیتی ہیں تو وہ جہنمی ہوجاتا ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔

ف : ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بعض سالکین اثنا طلبِ سلوک میں شہوات کی طرف اگر میل کرے تو شیطان اس پر غالب ہوکر اپنے زہد کا دھوکا دے کر عُجب، وکبر میں ڈال دیتا ہے جس سے وُہ اپنے آپ کو معظم الشان اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اسی وجہ سے پھر وہ مارا جاتا ہے۔

بعض سالکین کو یُوں دھوکا لگتا ہے کہ سلوک اثناءُ میں اسے بعض کرامات اور رؤیاء صالحہ نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ اسے مشاہدات اور مکاشفات روحانیہ سے نوازا جاتا ہے نہ کہ رحمانیہ سے۔ تو اسے گمان ہوتا ہے کہ اب عبادت کی منزل طے ہوگئی اور میں کامل اولیا کے مرتبہ کو پہنچ گیا ہُوں فلہٰذا مجھے اب عبادت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے دھوکا کھا کر وہ سلوک کی منازل طے کرنے سے رُک جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر آفات کا حملہ ہوتا ہے تو گرتا ہُوا اپنی پہلی حالت پر لوٹ آتا ہے۔ ہاں جو مومنین اہلِ طلب ہیں اور قانونِ شریعت پر اپنے شیخ کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وُہ حقیقت تک پہنچنے والے ہیں۔ اس لیے یہی لوگ اصحابِ وصول ہیں۔ جنات الاصول تک انہیں راستہ مل جائے گا اور وہ اس میں سیر کرتے رہیں گے اگرچہ منازل و مقاصد کی حد اور انتہا ہے لیکن سیر فی المقصد کی کوئی حد اور انتہا نہیں بخلاف ان لوگوں کے جن پر خطاؤں نے گھیرا پالیا۔ وُہ جُدائی کی نار میں جلتے رہیں گے نہ اُن کے مجاہدات فائدہ دیں گے اور نہ استدلالات بالشبہات انہیں مقصد تک پہنچائیں گے۔

(تفسیرِ آیاتِ صفحہ گزشتہ)

تفسیر عالمانہ

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۗ قف یاد کرو جب کہ تورات میں ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا۔ میثاق پختہ وعدہ کو کہتے ہیں۔ وہ دو قسم کا ہے :

(۱) عہدِ خلقت و فطرت

(۲) عہدِ نبوت و رسالت

اور اِذْ منصوب بفعل اذکر مقدر ہے۔ ہمارے نبی علیہ السلام اور اہلِ ایمان کو خطاب ہے تاکہ انہیں ان لوگوں کے ایمان لانے سے طمع منقطع ہو جبکہ اُن کے اسلاف نے ایمان نہ لایا کیونکہ سانپ سے سانپ پیدا ہوتا ہے۔

پتہ ہے : شعر

اِذَا طَابَ اَصْلُ الْمَرْءِ طَابَتْ فُرُوْعُہٗ

(جب مرد کا جوہر اچھا ہو تو اس کی تمام نسل اچھی ہوگی)

یا وہ یہود جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زمان تھے مراد ہیں انھیں زجر کی جا رہی ہے کہ تمہارے اسلاف کا یہ فعل قبیح تھا۔ یعنی یاد کرو جبکہ ہم نے اُن سے وعدہ لیا کہ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

۱۔ اَنْ گرا یا گیا تو تَعْبُدُوْنَ کو مرفوع پڑھا گیا۔

۲۔ اس لیے کہ ناصب نہیں رہا۔

۳۔ اس لیے کہ مضارع بمعنے نہی ہے۔

جیسے کہا جاتا ہے :

تَذْهَبُ اِلٰى فُلَانٍ تَقُوْلُ لَہٗ كَذَا۔ اس مضارع سے بھی امر مراد لیا گیا ہے۔ یعنی تَذْهَبُ بمعنے اِذْهَبْ ہے۔

۴۔ یہ کہ امر و نہی سے زیادہ بلیغ ہے۔

اس لیے اس میں ابہام ہے کہ ممنوع انسان پر لازم ہے کہ جس فعل سے اُسے روکا گیا ہے اس سے رکنے کیلیے اتنی عجلت کرے کہ جیسے نہی کے صدور کے بعد کہا جا سکے وہ رک چکا ہے اور اس کی خبر ناہی دے رہا ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی توحید کے قائل نہ ہو اور نہ ہی اس کے سوا کسی کے لیے الوہیت ثابت کرو۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ قسم کا جواب ہے۔ چنانچہ اس کا معنیٰ اس پر دلالت کرتا ہے۔ گویا کہا گیا ہے : وَ اَحْلَفْنَا هُمْ وَ قُلْنَا بِاللّٰہِ الخ

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ای تُحْسِنُوْنَ اِحْسَانًا بمعنے تعبدون۔ کیونکہ یہ جملہ خبریہ ہے یا اَحْسِنُوْا یہاں محذوف ہے جبکہ اسے جملہ انشائیہ قرار دیا جائے۔ یعنی بہت احسان اور بہت بڑی خدمت۔ اور ان کے فرمان کی پابندی کرو جبکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو وَذِی الْقُرْبٰى یعنی قرابت داروں کے ساتھ بھی احسان کرو۔ قُرْبٰی، حُسْنٰی کی طرح مصدر ہے وَالْيَتٰمٰى یتیم کی جمع ہے۔ یتیم اس چھوٹے بچے کو کہتے ہیں جس کا باپ اس کے بالغ ہونے سے پہلے فوت ہو جائے۔ اور حیوانات میں وہ چھوٹا بچہ جس کی ماں مرگئی ہو۔ ان سے احسان کا یہ معنیٰ ہے کہ ان کی تربیت اچھی طرح کرو اور ان کے حقوق کو ضائع نہ ہونے دو۔ وَالْمَسٰكِيْنِ مِسْكِيْنٌ کی جمع ہے سُكُوْنٌ سے مشتق ہے۔ گویا اسے فقر نے حرکت سے اور چلنے پھرنے سے عاجز کر دیا ہے اور ہم نے کہا وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ لوگوں سے کہو حُسْنًا اچھا قول۔ اس قول کو حُسن سے موسوم کرنے سے مبالغہ مطلوب ہے اس کے زیادہ حُسن میں احسان کرنے کا مخصوص قوم کے لیے حکم دیا گیا ہے۔ وہ والدین، اقربا، یتامیٰ اور مساکین ہیں۔ اور چونکہ

مال تمام کے لیے اکتفا نہیں کر سکتا اس لیے حُسنِ قول کا حکم دیا گیا کہ اس سے عقلمند عاجز نہیں ہیں۔ اب معنٰی یہ ہوا کہ اُن کے ساتھ حُسنِ معاشرت اور حُسنِ قول سے نرمی کرو۔ اور انہیں نیکی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو۔ یعنی اے یہود! تم سچ اور حق بات کہو، میرے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں سچ اور حق بات کہو۔ جو شخص تم سے ان کے متعلق کوئی بات پُوچھے تو سچ بولو اور ان کی جو صفت ہے صحیح طور پر بیان کر دو، ان کے فضائل مت چھپاؤ۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ط اور نماز قایم کرو اور زکٰوۃ دو جیسے کہ ان کی شریعت میں تھی انہیں علیحدہ بیان فرمایا۔ اگرچہ یہ بھی تعمیماً عبادت مذکورہ میں داخل تھیں۔

خلاصہ یہ کہ ہم نے تم سے اے بنی اسرائیل! مذکورہ احکام کا وعدہ لیا، تم نے قبول کر لیا اور تم اُن پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوئے۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ بطریقہ التفات۔ یعنی پھر تم نے اعراض کیا اُن کی ادائیگی سے باقتضائے میثاق۔ اور وعدہ کو ترک کر دیا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ مگر تم میں سے چند ایک نے ایفائے عہد کیا اسلاف میں سے جو یہودیت پر قایم رہے اور اخلاف میں سے جو مسلمان ہُوئے، جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ یہ جملہ تذلیلیہ ہے یعنی تمہاری عادت ہے کہ اطاعت سے منہ پھیرتے رہتے ہو اور حقوق کی رعایت نہیں کرتے۔ یہ واؤ حالیہ نہیں ہے کیونکہ اعراض اور تولّی ایک شئے ہیں۔ یہ جملہ معترضہ ہے، توبیخ کی خاطر تاکیداً لایا گیا ہے اعراض در اصل بجائے سامنے سے بجانب عرض چلے جانے کو کہتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر آیت میں چند مسائل بیان ہوئے:

(۱) **عبادت** ۔ عبادت کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ بندہ صرف معبود کی عبادت کے لیے تفرد اختیار کرے اور ہر مقصود سے متجرد ہو جائے۔ پس جو شخص اپنی عبادت میں مخلوق کا خیال رکھتا ہے اور اپنی تعریف کا خواہشمند ہے اور اُخروی و دُنیوی فوائد میں سے اپنے نفس کے لیے عبادت کی آڑ میں کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی اور وجہ کو مخلوط کرتا ہے تو وہ اخلاص کے مرتبہ سے گرا ہوا ہے ؎

حجاب راہ توئی حافظ از میاں برخیز
خوشا کسے کہ ازیں راہ بے حجاب رود

ترجمہ: اے حافظ! حجاب راہ تو خود ہے وہ انسان بڑا خوش قسمت ہے جو اس راہ بلا حجاب جاتا ہے۔

(۲) **احسان الی الوالدین** ۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے حقوق کی عظمت فرمائی کہ اُن کے حقوق کو اپنے حقوق سے ملا کر قرآن پاک میں جابجا بیان فرمایا کیونکہ پہلی نشأۃ تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہوئی ہے اور نشأۃ ثانیہ والدین سے، اور نشأۃ ثانیہ یہی تربیت ہے جو والدین کرتے ہیں۔

ف : مفسرین فرماتے ہیں کہ تین آیات ایک ساتھ نازل ہوئی ہیں جو ایک کو دوسری سے ملائے بغیر قبول نہیں کی جاتیں :

(۱) اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔

(۲) اَنِ اشْکُرْلِیْ وَ لِوَالِدَیْکَ ۔

(۳) وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۔

مسئلہ : والدین سے احسان کا معنیٰ یہ ہے کہ اُن سے معاشرہ اچھا ہو اور اُن کے ساتھ تواضع ہو اور ان کے فرمان کی پابندی اور اُن کے دوستوں اور تعلقداروں سے پیار اور اُن کی وفات کے بعد مغفرت کی دُعائیں کرنا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :

سالہا تو بگزرد کہ گزر نکنی سوئے تربت پدرت
تو بجائے پدر چہ کردی خیر تا ہماں چشم داری از پسرت

ترجمہ ، کئی سال گزر جاتے ہیں تیرا باپ کی قبر پہ گزر نہیں ہوتا۔
بتائیے تُونے باپ سے کون سی بھلائی کی ہے جو اپنے بیٹے سے امید رکھتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ وبالوالدین احساناً میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمام مخلوق میں زیادہ معزز ماں باپ ہیں کیونکہ بندہ کے ظاہری وجود کے یہی سبب ہیں لیکن اُن کی خدمت کا حق عبودیت الٰہیہ سے عہدہ برآ ہونے کے بعد ہے کیونکہ درحقیقت سب کے وجود کا موجد وہی اللہ تعالیٰ ہے۔

سبق جب والدین کے حقوق سے ذاتِ حق کی عبادت مقدم ہے۔ پھر دیگر معاملات کس قطار میں ! فلہذا بندہ کو چاہیے کہ عبادتِ الٰہی میں غیر کا وہم بھی ختم کر دے ۔ دوسرا حکم یتامیٰ کی پرورش کے متعلق ہے ؎

برحمت بکن آبش از دیدہ پاک
بشفقت بیفشانش از چہرہ پاک

ترجمہ : رحمت سے یتیم کے منہ سے آنسو پونچھ اور شفقت سے اس کے چہرے سے گرد صاف کر۔

فضائلِ یتامیٰ

حدیث شریف : جس قوم کے دسترخوان میں یتیم شامل ہو ان کے دسترخوان کے قریب شیطان نہیں بھٹکتا۔

حدیث شریف جس نے کسی یتیم کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا اور اسے گھر کا ایک فرد سمجھا یہاں تک کہ وہ بڑا اور کاروبار کرنے کے لایق ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے گناہ ضرور بخش دے گا۔ ہاں کوئی ایسا عمل اس کے اعمال نامے میں نہ ہو جو بخشش کے لائق نہ ہو (یعنی شرک وغیرہ)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جس شخص کی دو پیاری چیزیں لے لے اور وہ اس پر صبر کرے اور اسے ثواب جانے تو اس کے بھی گناہ بخش دئے جاتے ہیں۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ دو پیاری چیزیں کون کون سی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: دو آنکھیں، یعنی وہ نابینا ہوجائے۔ اسی طرح جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں اُن پر وہ خرچ کرے اور ان کے ساتھ احسان کرے یہاں تک کہ وہ بڑی ہوجائیں یا مرجائیں، تو اس شخص کے بھی گناہ بخش دئے جائیں گے، ہاں کوئی ایسا عمل اس سے سرزد نہ ہوا ہو جو بخشش کے لائق نہ ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو سُن کر ایک اعرابی مہاجر نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر کسی کی دو لڑکیاں یا دو بہنیں ہوں ان کے لیے کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہی۔ یعنی اس کے گناہ بخش دئے جائیں گے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یتیم کی پرورش کرنے والا اور میں بہشت میں اکٹھے ہوں گے جیسے یہ دو انگلیاں۔" آپؐ نے درمیانی انگلی اور سبابہ کی جانب اشارہ کیا۔

(سبابہ اس انگلی کو کہتے ہیں جو انگوٹھے کے ساتھ ہے) اس کا یہ نام زمانۂ جاہلیت میں پڑا کہ جو کسی کو گالی دیتا تو اس انگلی سے اشارہ کرکے۔ اسلام کے ظہور پر اس نام کو اہلِ اسلام نے مکروہ سمجھا تو اس کا نام مشیرہ رکھا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی توحید بیان کرتے وقت اہلِ اسلام اسی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔

ف: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشیرہ انگلی مبارک دوسری انگلیوں سے بڑی تھی پھر درمیان والی انگلی پھر اس کے ساتھ والی بنصر یعنی چھوٹی انگلی۔

سوال: اس حدیث شریف نے یتیم کو تربیت کرنے والے کو اپنے قریب بتایا ہے حالانکہ دوسری میں تو یوں ہے:

اُحْشَرُ اَنَا وَ اَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ ھٰکَذَا۔

(میں اور ابوبکرؓ اور عمرؓ قیامت میں یوں ہی اٹھیں گے)

آپؐ نے اپنی تین انگلیوں سے اشارہ کیا۔ یہ تناقض ہے۔

جواب: تناقض نہیں اس لیے کہ قیامت میں منازل و مراتب مختلف ہوں گے اور جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے تعلق نہیں تو وہ انضمام اور اقتراب کو قربت پر محمول کرتا ہے جو مقصد کے بالکل خلاف ہے کیونکہ رسل کرام، انبیاءِ عظام، صدیقین، شہداء اور صالحین کے درجات مختلف ہوں گے، پھر یہ مرتبہ کفل الیتیم کا کہاں، اور صحابہ کرامؓ کا مرتبہ کہاں۔ صرف مطلق فضیلت ہی مطلوب ہے۔ (کذا فی تفسیر القرطبی)

ف: آیت میں تیسرا حکم مساکین پروری کا ہے۔ مساکین وہ لوگ ہیں جنہیں ضروریات نے ذلیل و خوار کر دیا۔ صدقہ

دینے پر برانگیختہ کرنا اور ان سے موافقت رکھنا اور مساکین وضعفا کے حالات کی جستجو آیاتِ مذکورہ کے خاص موضوع ہیں۔

حدیث شریف : بے شوہر عورتوں اور مسکینوں کی خبرگیری کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے۔

ف : حضرت طاؤس رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی بہنوں کی خبرگیری کرنے کو جہاد سے افضل سمجھتے تھے ؎

۱ نخواہی کہ باشی پراگندہ دل
پراگندگاں را از خاطر مہل

۲ پریشان کن امروز گنجینہ چست
کہ فردا کلیدش نہ در دست تست

ترجمہ : ۱۔ اگر نہیں چاہتے کہ تمہیں پریشانی ہو تو پریشانوں کی خبرگیری کر۔
۲۔ آج ہی اپنا خزانہ لٹادے کیونکہ مرنے کے بعد تیرے ہاتھ میں کچھ نہ ہوگا۔

ف : آیت میں چوتھا حکم قولِ حسن ہے۔ جب بندہ عبودیت کے حق کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہوا اور اس کی رحمت و شفقت اپنے والدین وغیرہ پر عام ہوئی تو اس پر لازم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر کے لوگوں کو نرم گفتگو سے حکمت اور موعظہ حسنہ کی طرف بلائے اور حق کا راستہ دکھائے بایں طور کہ بات نرم اور چہرہ کشادہ اور نیک اور برے کے ساتھ نرم لہجہ سے پیش آئے خواہ وہ مذہباً سُنّی ہو یا متبدع، اسے منہ پر شرمسار نہ کرے اور ہاں متبدع سے ایسی بات کرے کہ اسے محسوس ہو کہ تم اس کے مذہب سے راضی نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ و ہارون علیٰ نبینا وعلیہما السلام کو فرعون کے بارے میں فرمایا :

"فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا۔"

(اس کے ساتھ نرم کلام کرنا)

دنیا میں حضرت موسیٰ و ہارون سے (بعض انبیاء کے سوا) کون افضل ہو سکتا ہے، اور فرعون جیسا کوئی اور کمینہ کون! حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ان حضرات کو نرم کلام کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ حکم یہود و نصاریٰ کے لیے بھی ہے۔ جب ایسے گمراہوں کے لیے یہی حکم ہے تو پھر اپنے ہم مذہب سے نرم کلامی تو بطریقِ اولیٰ ہے۔

حضرت حافظ شیرازی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں : ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرفست
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ترجمہ : دونوں جہان کی آسائش صرف دو لفظوں میں ہے : دوستوں پر لطف اور دشمن کی خاطر مدارات (دنیوی امور میں)۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں : ؎

درشتی نہ گیرد خردمند پیش
نہ سستی کہ ناقص کند قدر خویش

ترجمہ : دانا سخت گیری کو عمل میں نہیں لاتا، نہ اتنی سستی کہ اس کی اپنی قدر گھٹ جائے۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ اے یہود! اس وقت کو یاد کرو جبکہ تورات میں ہم نے تم سے اقرار اور وعدہ لیا اور تمہیں کہا کہ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ بعض تمہارا البعض کی خونریزی مت کرے۔

ف : غیر کو اپنا نفس قرار دیا گیا اصل نسبت کی وجہ سے یا دین کی وجہ سے۔ اس لیے کہ جب اتصال قوی، نسبی اور دینی انہیں بیان کر دیا گیا تو پھر ان کے ہر ایک کو اپنا نفس قرار دیا گیا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جب کسی نے اپنے غیر کو قتل کیا گویا اس نے اپنے نفس کو قتل کیا۔ کیونکہ اس سے اس کا قصاص لیا جائے گا۔ اور یہ خبر بھی بمعنی نہی کے ہے اس لیے کہ فعل سے رُکنے میں اتنی عجلت ہُوئی کہ گویا وُہ فعل ہو بھی گیا اور پھر اس کی خبر بھی دی گئی۔

وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ تم میں سے کوئی کسی کو اُس کے گھر سے نہ نکالے یا یہ کہ اپنے ہمسایوں کو گالی مت دو ایسا نہ ہو کہ وہ تنگ آ کر گھروں سے نکل جائیں اخراج من الدیار کو قتل کے ساتھ ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ اخراج بمنزلہ قتل کے ہے۔ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ پھر تم نے میثاق کا اقرار کیا اور معترف ہُوئے کہ واقعی یہ میثاق ہم پر لازم و واجب ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ اور اس پر تم شاہد ہو۔ یہ اقرار کی تاکید ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے :

فلانٌ مقرعلیٰ نفسہٖ ھٰکذا شاھدٌ علیھا۔

یا یہ کہ تم اے یہودیو! آج اپنے اسلاف کے اقرار پر شاہد ہو کہ انہوں نے واقعی پختہ وعدہ کیا تھا۔

ثُمَّ اَنْتُمْ مبتدا ہے هٰٓؤُلَآءِ خبر ہے اور صفات کے مختلف ہونے کے افادہ کا دارومدار اس پر ہے کہ اختلافات صفات بمنزلہ اختلافاتِ ذات کے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے :

رجعت بغیر الوجہ الذی خرجت بہ۔

اب معنیٰ یُوں ہوا کہ اس کے بعد تم شاہدین متناقضین ہُوئے۔ یعنی تم لوگ ان اقرار کنندگان کے غیر ہو۔ گویا انہوں نے پُوچھا کہ ہم کیسے ہیں؟ جواب میں فرمایا تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَکُمْ تم انہیں قتل کرتے تھے جو تمہارے نفوس کے قایم مقام تھے۔ اور یہ ثمّ انتم ھٰؤلاء کا بیان ہے۔ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْکُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ ھم کا مرجع فریق ہے اور اس سے مراد ایک طائفہ ہے تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ اس میں ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے۔ تخرجون کے ضمیر فاعل سے حال ہے یا اس کے مفعول سے اخراج کی کیفیت کے بیان کرنے کے لیے یہ حال

لایا گیا۔ یا اس وہم کو مٹانے کے لیے ہے کہ انھوں نے سمجھ رکھا تھا کہ اخراج کی حرمت صرف بطریق اصالۃ و استقلال کی وجہ سے ہے اور مظاہرہ سے کوئی گناہ نہیں۔ معنیٰ یہ ہے کہ ان پر غلبہ پانے کی وجہ سے تم اپنی تمام قوت خرچ کرتے ہو۔

بِالْاِثْمِ تظٰہرون کی ضمیر سے حال ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ متلبسین بالاثم۔ اور اثم وہ فعل ہے کہ جس کا فاعل ذم و ملامت کا مستحق ہو وَالْعُدْوَانِ ط بمعنے ظلم میں تجاوز کرنا۔ یعنی گناہ اور تجاوز کرکے ان پر مظاہرہ کرتے ہو۔

مسئلہ : جیسے ظلم کرنا گناہ ہے اسی طرح ظلم کی اعانت بھی گناہ ہے۔ (کذا فی التفسیر الکبیر)

وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہوکر آتے ہیں۔ یعنی تمہارے سامنے اسی حالت میں ظاہر ہوتے ہیں اور اس میں اختیاری طور پر حاضر ہونا مراد نہیں۔

حلِ لغات اُسٰرٰی اور اَسْرٰی، اَسِیْرٌ کی جمع ہیں۔ اَسِیْر وہ ہے جسے قہراً پکڑا جائے۔ فعیل بمعنے مفعول ہے۔ اَسر بمعنے شَدٌّ، اور اِیْثَاقٌ سے ماخوذ ہے۔ اُسٰرٰی اور اَسْرٰی میں فرق یہ ہے کہ جب قیدیوں کو باندھ کر لاتے تو اسے اُسٰرٰی کہتے اور جب بغیر باندھنے کے پکڑ کر لاتے تو اس کا نام اَسْرٰی رکھتے۔

تُفٰدُوْھُمْ یعنی انھیں قید سے نکالتے ہو فدیہ دے کر۔

ف : فدیہ قیدی اور قابلِ فدیہ دونوں پر بولا جاتا ہے۔

وَھُوَ مبتدا ہے اور یہ ضمیر شان کا ہے۔ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُھُمْ ط تم پر ان کا نکالنا حرام تھا۔ مُحَرَّمٌ میں ایک ضمیر ہے جو فاعل کے قایم مقام ہے اور یہ اخراج کے لیے خبر واقع ہوئی ہے اور جملہ ضمیر شان کی خبر ہے۔

واقعہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات میں وعدہ لیا کہ :

(۱) ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا۔

(۲) ایک دوسرے کو گھروں سے نہ نکالنا۔

(۳) بنی اسرائیل کے کسی عبد یا لونڈی کو جہاں دیکھو اسے خرید کر مفت آزاد کرنا۔

یہود میں سے دو گروہ قریظہ اور نضیر دونوں بھائی تھے۔ اسی طرح اوس اور خزرج۔ اور تھے مشرک، بتوں کے پجاری۔ نہ ہی قیامت کو جانتے نہ ہی جنت و دوزخ کو اور نہ ہی حلال و حرام کو۔ اُن کی آپس میں جنگ چھڑ گئی۔ بنو قریظہ اوس کے معین و حلیف بن گئے اور نضیر خزرج کے۔ پھر جب اوس اور خزرج کے مابین جنگ ہوتی تو بنو قریظہ اوس کے ساتھ اور بنو نضیر خزرج کے ساتھ ہو جاتے۔ پھر ہر قوم اپنے خلفاء کی مدد کرتی جس سے خوب خون ریزی ہوتی۔ جب کوئی گروہ کسی دوسرے پر غالب آجاتا تو ان کے گھروں کو خراب کرتے اور انہیں وہاں سے

نکال دیتے حالانکہ ان کے پاس تورات بھی تھی۔ جس میں ہر قسم کی جزا و سزا کا بیان تھا۔ جب جنگ ختم ہو جاتی تو قریظہ خزرج کو اپنے حلفاء کا فدیہ دے کر اُن کے قیدی چھڑا لیتے اور نضیر اوس کو فدیہ دے کر اپنے حلفاء کے قیدی چھڑا لیتے۔ جب عرب انہیں عار دلاتے ہوئے کہتے کہ تم اُن کے ساتھ قتال کی امداد کیوں نہیں کرتے بلکہ فدیہ دے دیتے ہو۔ تو جواباً کہتے اس لیے کہ ہم صرف فدیہ دینے پر مامور ہیں۔ اور جنگ کرنا ہمارے لیے حرام ہے پھر وُہ کہتے کہ تم اُن کے ساتھ جنگ بھی تو کرتے ہو۔ تو جواباً کہتے کہ جنگ اس لیے کرتے ہیں تاکہ ہمارے حلفاء ذلیل وخوار نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس منافقت کی مذمت فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تم لوگ ہر ایک حکم سے اعراض کرتے ہو صرف فدیہ دینے پر رضامند ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کا وعدہ لیا:

(۱) ترک القتل

(۲) ترک الاخراج

(۳) ترک المظاہرہ علیہم مع اعدائہم۔

(۴) فداء اُساریٰ۔

مگر انھوں نے فدیہ کے سوا تمام امور سے اعراض کیا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ اس سے فدیہ مراد ہے اور ہمزہ توبیخی انکار کے لیے ہے اور فاء کا مقدر فعل پر عطف ہے۔ یعنی دراصل عبارت یُوں تھی، اَتَفْعَلُوْنَ ذٰلِکَ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ یعنی تم ان جملہ امور کے خلاف مرتکب ہو کر کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ اس سے مراد حرمۃ قتال و اخراج ہے لیکن چونکہ میثاق کا دارو مدار تمام احکام پر تھا اس لیے بعض سے انکار اور بعض پر ایمان لانے پر توبیخ کی گئی فَمَا جَزَآءُ نفی ہے یعنی نہیں جزا مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ وہ جو ایسا کرتا ہے یعنی بعض کے ساتھ کفر اور بعض پر ایمان مِنْکُمْ اے یہودیو! تم میں سے۔ یَفْعَلُ کے فاعل سے حال ہے اِلَّا خِزْیٌ استثناء مفرغ ہے جو مبتدا کی خبر واقع ہوا ہے۔

حل لغات: خِزْیٌ بمعنے ذلّت وخواری۔ یہ کہ بنو قریظہ قتل کیے گئے اور قیدی ہوئے۔ اور بنو نضیر اذرعات اور ریحا (جو کہ شام سے ہیں) کی طرف جلاوطن ہوئے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خزی سے جزیہ لینا مراد ہے۔ یعنی ان کی جزا صرف رُسوائی اور ذلّت وخواری ہے۔

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا حیوٰۃ دنیا میں خزی کی صفت ہے بطریق قصر مذکور کے ان کی جزا کا بیان ہے تاکہ انھیں اپنے (جو کہ بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہیں) سے ناامیدی ہو۔ اور ظاہر کرنا ہے کہ بعض کو کتاب سے کفر

کرنے کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت میں سزا میں ملیں گی يُرَدُّوْنَ لوٹائے جائیں گے۔

حلِ لغات: الرَدُّ بمعنے الرّجعُ بعد الاخذ ۔ (پکڑ کر لوٹانا)

اِلٰىٓ اَشَدِّ الْعَذَابِ ط سخت ترین عذاب کی طرف ۔ یعنی جہنم کے عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے ۔ دنیا کی رسوائی کے علاوہ قیامت میں ہر وہ عذاب انھیں ملے گا جو انہیں پہلے دنیا میں مل چکا ہے ۔ ہر دوسرا اس سے سخت تر ہوگا ۔ کیونکہ پہلے والے عذاب منقطع ہو گئے اور یہ منقطع نہیں ہوگا ۔

حدیث شریف میں ہے : "دنیا کی رسوائی آخرت کی رسوائی سے کم تر ہے ۔" اس لیے کہ ان کی معصیت سب معصیتوں سے سخت تر ہے ۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

ہر کہ ظالم تر جہش با ہولتر
عدل فرمود است بدتر را بتر

ترجمہ : جو بڑا ظالم ہے اس کی جگہ (آخرت میں) ہولناک ہے عدل ایسے آدمی کو بدتر سے بدتر کہتا ہے ۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اس سے جو تم بُرے عمل کرتے ہو ۔ منجملہ ان کے یہ بُرا عمل بھی ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے تمہارے اعمال سے کوئی چیز مخفی نہیں ۔ اس کی قیامت میں تمہیں سزا دے گا ۔ یہ تہدید شدید ہے تاکہ گناہوں سے بچے رہیں اور طاعت پر بشارت عظیم سنائی جا رہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے غفلت ممتنع ہے اور ہر شے پر قادر ہے ۔ اسی بنا پر تمام حقوق اُن کے مستحقین کو ضرور پہنچیں گے اُولٰٓئِكَ وہ لوگ جو اوصافِ قبیحہ مذکورہ سے موصوف ہیں ۔ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا دنیا سے تبادلہ کی خواہش رکھتے ہیں بِالْاٰخِرَةِ آخرت کے عوض ہیں یعنی آخرت سے اعراض کرتے ہیں باوجودیکہ اس کے حاصل کرنے پر قادر ہیں کیونکہ مذکورہ احکام میں بعض سے کفر کرنا صرف حلفاء کی رعایت کی وجہ سے تھا وہ اس لیے کہ ان سے ان کو دینی یا دنیوی منافع حاصل ہوتے تھے ۔ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ اُن سے نہ دُنیوی عذاب ہلکا ہوگا اور نہ ہی اُخروی وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ اُن سے عذاب نہیں روکا جائے گا ۔ کیونکہ اُن کا عذاب نہ کسی کی سفارش سے ٹلنے والا ہے اور نہ کسی کے جبر سے ، لذاتِ دنیوی و اُخروی کو جمع کرنا ممتنع اور غیر ممکن ہے ، لیکن اللہ نے اپنے بندے کو یہ قدرت دی ہے کہ ان میں کسی ایک کو حاصل کرے جسے چاہے ۔ پس جب ایک کے حصول میں مشغول ہوتا ہے تو دوسرے کو اپنے اوپر حرام کرتا ہے ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہود کے اعراض عن الایمان بما فی کتبھم اور ان کے حصول ما فی ایدیھم اور لذاتِ دُنیا کو بیع و شرا سے تعبیر فرمایا ہے ۔

اس میں اہلِ کتاب کی بہت بڑی مذمت بیان کی گئی ہے کیونکہ دنیوی کاروبار میں جسے خسارہ ہوتا ہے وہ

لوگوں کی نظروں میں حقیر سمجھا جاتا ہے۔ تو جو آخرت کے امور میں خسارہ میں ہو اس کو تو حقیر سمجھنا بطریقِ اولیٰ ہے۔

تفسیر صوفیانہ

سالک پر لازم ہے کہ وہ آخرت کی بہتر تجارت کی کوشش کرے اور فقط دنیوی امور کی طرف نہ جھکے اور نہ ہی خواہشاتِ نفسانیہ سے شیطان کے کہنے پر کسی کا خون بہائے اور نہ ہی اصل فطرت کے ملک سے ہٹے۔ اگر ایسا کرے گا تو گمراہ اور بدبخت ہو جائے گا۔ لا تسفکون دماءکم میں ایک لطیف اشارہ اور بھی ہے وہ یہ کہ اپنے آپ کو کسی مصیبت یا دُکھ کی وجہ سے قتل نہ کرے اور نہ جنگلوں میں حیران و سرگردان پھرے۔ اگر ایسا کرے تو وہ اپنے دین سے جہالت کا ثبوت دیتا ہے اور کم عقلی کی دلیل بنتا ہے اسی طرح جمیع باتوں کو سمجھئے۔

حدیث شریف

میں ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ارادہ ہُوا کہ وہ کپڑوں کے بجائے ٹاٹ لپیٹیں اور گھروں میں رہنے کی بجائے جنگلوں میں چلے جائیں اور پھر وُہ واپس نہ آئیں اور نہ ہی گوشت کھائیں اور نہ اپنی بیویوں سے ہمبستری کریں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نماز پڑھتا ہُوں اور نفلی روزہ کبھی رکھتا ہُوں کبھی نہیں رکھتا اور بیویوں کے پاس جاتا ہُوں اور گھروں میں گزارتا ہُوں اور گوشت کھاتا ہُوں۔ یہ سارے کام میری سُنّتیں ہیں، جو بھی میری سنّتوں سے اعراض کرے گا وُہ مجھ سے نہیں۔ جب صحابہ کرامؓ نے سُنا تو اپنے ارادوں کو ترک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاٰتِ كُلَّ ذِىْ حَقٍّ حَقَّهٗ۔

(اور صاحبِ حق کا حق ادا کرو)

کمال صرف اسی میں ہے کہ قیود سے تجاوز کر کے عالمِ شہود تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ عارف کامل تو ہر شئے میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا۔ وُہ یہ سمجھتا ہے کہ کس سے مانگوں اور کہاں بھاگوں جبکہ اُسی کا حکم ہے:

اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔

(جہاں جاؤ گے وہاں اللہ ہی ہو گا)

یہاں پر وہ مقولہ مشہور ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے علم حاصل کرتا ہے اُسے اگر کہا جائے کہ تو کل مر جائے گا تو پھر بھی کتاب کو نہیں چھوڑتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میں پڑھتا تو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے ہوں فلہذا بقیہ زندگی تک کتاب کیوں چھوڑوں اسی لیے طالبِ حق کے لیے ضروری ہے کہ وُہ اپنی نیّت کو خالص رکھے کیونکہ خلوصِ نیت سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں پھر کیوں نہ نیت کو خالص رکھا جائے تاکہ اسی نیک نیّتی پر موت آئے۔

قیدی کئی قسم کے ہیں:

(۱) بعض وُہ جو اپنی خواہشات کے پابند ہیں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ انہیں راہِ حق کی رہبری کی جائے۔

(۲) بعض وُہ ہیں جو دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں، ان کا علاج یہ ہے کہ انھیں مرت بار بار یاد دلائی جائے۔

مثنوی شریف میں ہے ؎

ذکرِ حق کن بانگ غولاں را بسوز
چشم نرگس را زیں کرگس بدوز

ترجمہ : ذکرِ الٰہی ایسا کرکہ اُلو (نفس) کی آواز دب جائے نرگس کی آنکھ کو اس گدھ سے دُور رکھو۔

(۳) بعض وہ ہیں جو وسوسہ کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ایسے لوگوں پر شیطان ہر وقت سوار رہتا ہے۔ ان کا علاج یہ ہے کہ دلائل اور براہین کے ذریعے انھیں یقین کا راستہ دکھایا جائے تاکہ وہ شکوک و ظنیات اور اندازہ سے بچ جائیں اور تقلیدِ آبائی سے نجات پاکر درجہ یقین کو پہنچ

(۴) بعض اپنے صفات کے خیالات اور اپنے وجود کے توہمات میں پھنسے ہُوئے ہیں۔ اُن کا علاج یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو وجودِ حق کا ایسے طریق سے سمجھایا جائے کہ وُہ اپنی ہستی موہوم کو تصور میں بھی نہ لاسکیں۔

(۵) بعض ایسے قیدی ہیں جو بے مثال ذات کے قبضہ میں آجاتے ہیں۔ ایسے قیدی کا نہ کوئی علاج ہے اور نہ ہی نجات کا امکان۔ اور نہ ہی کسی کو اُن کے چُھڑانے کی طاقت، اور نہ ہی ان کے لیے کوئی فدیہ یا بدلہ۔ اور نہ ہی وہاں کسی کی رسائی، بلکہ اُن تک پہنچنا ممکن ہی نہیں اور نہ ان کو وہاں سے بھاگنے کا چارہ۔ یہ اولیاء کاملین کا مقام ہے۔ جس نے یہ طریقہ اختیار کیا وہ اپنے مطلوب تک پہنچ جائے گا اور وہ دل کے اندھاپن سے بچ جائے گا۔ مشاہدۂ حق سے باریاب ہو کر دنیا و آخرت کی اندھیریوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

اصلِ صد یوسف جمالِ ذوالجلال ۔۔۔ اے کم از زن شو فدائے آں جمال
اصل بیند دیدہ چوں اکحل بود ۔۔۔ فرع بیند چونکہ مرد احول بود
سُرمۂ توحید از کحالِ حال ۔۔۔ یافتہ رستہ ز علت و اعتدال

ترجمہ : ہزاروں یوسف (حسین) کے جمال کی اصل ذات ذوالجلال ہے عورت سے کم نہ ہو تو بھی جمالِ حقیقی کا فدائی بن جا۔ سرمہ والی آنکھ اصل کو دیکھتی ہے جس کی آنکھ بھینگی ہے وہ فرع (مجازی حسن) کو دیکھتی ہے۔ تجھے اگر حال کا سرمہ نصیب ہوا تو علت و اعتدال تو نجات پا جائے گا۔

نسخہ : طریقِ حق کے لیے عشق ضروری ہے۔

حکایت ایک بڑھیا دھاگے کی اَٹی لے کر بازار کو چلی اور کہہ رہی تھی مجھے بھی یُوسف علیہ السلام کے خریداروں میں شامل کر لو تاکہ قیامت میں میرا نام بھی یوسف علیہ السّلام کے عشاق میں لکھا جائے۔

دعا اے اللہ ! ہمیں اپنی ذات اور اپنے جمال سے دُور نہ رکھنا۔ اور ہمیں اُن لوگوں میں پہنچا جو تیرے وصال سے نوازے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِن بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ
بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ
وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ۝ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَمَّا
جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ
كَفَرُوا ۚ فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۚ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ
أَنفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ
فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ ۚ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ
اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا
مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَلَقَدْ جَاءَكُم مُّوسَىٰ
بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَ
رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ۖ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا
فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ قُلْ
إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن
كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝
وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ
أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَن يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ : اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور ہم نے
عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطا فرمائیں اور پاک رُوح سے اس کی مدد کی تو کیا جب تمہارے پاس کوئی
رسول وہ (حکم) لے کر آئے جو تمہارے نفس کی خواہش نہیں تکبر کرتے ہو تو ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو
تم جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ کو تم شہید کرتے ہو اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں

بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ان کے کفر کے سبب سے تو ان میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب (قرآن) آئی جو ان کے ساتھ والی کتاب (توراۃ) کی تصدیق فرماتی ہے اور اس سے پہلے وہ اسی نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو گئے تو اللہ کی لعنت منکروں پر کسی غلط قیمت پر انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا کہ اللہ کے نازل کیے ہوئے سے منکر ہوں اس کی جلن سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے جس بندے پر چاہے وحی نازل کرے تو غضب پر غضب کے حقدار ہوئے اور کافروں کے لیے ذلّت کا عذاب ہے اور جب ان سے کہا جاوے کہ اللہ کے اُتارے پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں وہ جو ہم پر اترا اس پر ایمان لاتے ہیں اور باقی سے منکر ہوتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے ان کے پاس والے کی تصدیق فرماتا ہوا تم فرماؤ کہ تم نے اگلے انبیاء کو کیوں شہید کیا اگر تمہیں اپنی کتاب پر ایمان تھا اور بیشک تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر تشریف لایا پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنایا اور تم ظالم تھے اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پیمان لیا اور پہاڑ کو تمہارے سروں پر بلند کیا لو جو ہم تمہیں دیتے ہیں زور سے اور سنو۔ بولے ہم نے سُنا اور نہ مانا اور ان کے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا ان کے کفر کے سبب تم فرما دو کیا برا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو تم فرماؤ اگر پچھلا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمہارے لیے ہو نہ اوروں کے لیے تو بھلا موت کی آرزو تو کرو اگر سچے ہو اور ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے ان بداعمالیوں کے سبب سے جو آگے کر چکے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو اور بیشک تم ضرور انہیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں اور مشرکوں سے ایک کو تمنّا ہے کہ کہیں ہزار برس جئے اور وہ اسے عذاب سے دُور نہ کرے گا اتنی عمر دیا جانا اور اللہ ان کے کردار دیکھ رہا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا اور اللہ تعالیٰ کی قسم بیشک اے بنی اسرائیل! ہم نے مُوسیٰ موسیٰ علیہ السلام کو۔ مُوسیٰ عبرانی لغت کا کلمہ ہے۔ اس کی تفصیل و اذ واعدنا موسیٰ الخ میں گزر چکی ہے اَلْکِتٰبَ توراۃ یکبارگی وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ ان کے لیے پے درپے ہم نے رسول بھیجے۔ قفینا ' قفا بہ سے ہے بمعنے کسی کسی کے بعد بھیجنا۔ اب اس جملہ کا معنیٰ یُوں ہُوا کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد پئے درپے رسول بھیجے اور وہ یہ حضرات ہیں: یوشع ، شمویل ، داؤد ، سلیمان ، شمعون ، شثیا ، ارمیا ، عزیر ، حزقیل ، الیاس ، الیسع ، یونس ، زکریا ، یحیٰی وغیرہم علیٰ نبینا وعلیہم السلام۔ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی اور ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو دیا۔ عیسیٰ جنہیں سریانی میں الیسوع کہا جاتا ہے بمعنے مبارک۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ اور اس کی طرح اور اسماء جو عربیت میں استعمال ہوتے ہیں کسی سے مشتق نہیں۔ ابن کے الف کو ثابت رکھ کر پڑھنا چاہیے جیسے عبداللہ ابن عمر۔ اگر الف نہ لکھا جائے تو بھی جائز ہے۔

سوال : لفظ ابن کا قاعدہ ہے کہ جب دو ناموں کے درمیان واقع ہو تو اس کا الف نہیں لکھا جاتا ، یہاں اس کے برعکس ہے۔

جواب : ان اسموں کے مابین الف گرتا ہے جہاں ابن باپ کی طرف مضاف ہو جب ماں کی طرف ہو۔ جیسے یہاں ہوا۔ تو الف نہیں گرتا۔

مَرْيَمَ سریانی لغت میں بمعنے خادمہ و عابدہ۔ چونکہ ان کی والدہ نے انہیں بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کیا اور کثیر العبادۃ بھی واقع ہوئیں۔ بنا بریں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے ساتھ اپنی کتاب میں سات بار ذکر فرمایا اور اس کا نام مریم رکھا۔ اور اس سے خطاب اُسی طرح فرمایا جیسے انبیاء علیہم السلام سے خطاب کیا جاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: یا مریم اقنتی لربك واسجدی وارکعی مع الراکعین۔ یہاں بی بی مریم کو مردوں کے ساتھ شریک کیا۔
الْبَيِّنٰتِ اس سے معجزات مراد ہیں جیسے مردے زندہ کرنا، برص والوں اور کوڑھیوں کو تندرست کرنا اور غیبی خبریں دینا اور انجیل وَاَيَّدْنٰهُ اور ان کو ہم نے قوت دی بِرُوْحِ الْقُدُسِ روح القدس سے یہ اضافۃ الموصوف الی الصفۃ کے قبیل سے ہے۔ اصل بالروح المقدسۃ المطہرۃ تھا۔ اس سے عیسیٰ علیہ السلام کی رُوح مراد ہے۔ قدس سے کرامت کی وجہ سے موصوف کیا گیا ہے کیونکہ قدس اللہ تعالیٰ خود ہے یا جبریل علیہ السلام ہیں اور انہیں مطہرہ سے اس لیے موصوف کیا گیا ہے کہ اُن سے گناہ کبھی سرزد نہیں ہوا تھا۔ اور جبریل علیہ السلام کو رُوح اس لیے کہا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے پاس ایسے امور پیش کرتے جن میں قلوب کی زندگی کے اسباب ہیں۔ اور انہیں تقویت دینے کا یہ معنیٰ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ابتداً سے لے کر بڑھاپے تک شیطان سے محفوظ رکھا، یہاں تک کہ بوقتِ ولادت بھی ان کے قریب نہ جا سکا۔ اور جب یہودیوں نے اُن کے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو انہیں آسمان پر اٹھا لیا۔

سوال : ایسی تقویت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص کیوں، کہ صرف ان کو عطیہ معجزات اور تائید بروح القدس سے موصوف کیا گیا ہے۔

جواب : باقی حضرات صرف تورات کے احکام کے اجرا کے لیے بھیجے گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہت سے احکام کو منسوخ کرنے پر مامور کیا گیا اور ان کے زمانہ کے لوگوں کے جتنے غلط عقیدے اور بُری رسمیں تھیں ان سب کو مٹانے کا حکم دیا۔ پھر ظاہر ہے کہ غلط عقاید اور بُری رسموں کے مٹانے پر مردِ میدان کی ضرورت ہے اور وہ بغیر تائیدِ ایزدی کے مشکل ہے۔

ف : حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے مابین چار ہزار نبی بھیجے گئے۔ بعض کے نزدیک ستر ہزار۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى یہ خطاب ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زمان

اہلِ کتاب کو ہے۔ مذکورہ امور اُن کے بڑوں سے سرزد ہُوئے۔ ان سے صرف تکبّر کا ارتکاب ہُوا۔ لیکن چونکہ اُن کے اِن امور سے یہ راضی تھے اس لیے ان کو مخاطب کیا گیا۔ یہ فاءُ عاطفہ ہے، مناسب مقام کے لحاظ سے فعل مقدر ہے مثلاً :

ای لم تطیعوھم افکلما جاءکم رسولٌ بما لا تھوٰی۔ تمہارے پاس رسول علیہ السلام وہ احکام لے آئے جن کو تمہارے نفوس نہیں چاہتے۔

اَنْفُسُکُمُ ان کے لائے ہُوئے احکام تمہاری خواہش کے مطابق نہیں اسْتَکْبَرْتُمْ تمہیں ان کی فرمانبرداری اور ان پر ایمان لانے سے انکار ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر فَفَرِیْقًا ایک گروہ کی (ان انبیاء علیہم السلام میں سے) کَذَّبْتُمْ تم نے تکذیب کی جیسے عیسٰی اور حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ○ ایک گروہ کو تم قتل کرتے تھے جیسے زکریا و یحیٰی وغیرہما علٰی نبینا وعلیہم السلام۔

سوال : دونوں مقامات میں فریق کو کیوں مقدم کیا گیا ہے ؟

جواب : اہتمام کے لیے، تاکہ سامع کو شوق ہو جائے کہ انھوں نے ان حضرات سے کیا کیا، قصر کے لیے نہیں کہ صرف یہ مانا جائے کہ انبیاء علیہم السلام صرف یہی دو گروہ تھے اور بس۔

سوال : قَتَلْتُمْ ماضی کی بجائے مضارع کیوں استعمال کیا گیا ہے ؟

جواب "۱" مضارع استعمال کیا گیا ہے لیکن مراد تو ماضی ہے۔ ان کو اس حال پر ان کی رسوائی کا اظہار کرنے کی وجہ سے مضارع لایا گیا ہے۔ یُوں ظاہر کیا گیا ہے کہ وُہ معاملہ اگرچہ گزر گیا لیکن وُہ چونکہ انتہائی طریق سے بُرا تھا۔ گویا ابھی حاضر ہے۔ اور یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ اس واقعہ کی تذکیر سے عمل کرنے والوں اور ان کی اولاد کو عار دی جائے۔

(۲) یا یہ مطلب ہے کہ ایک گروہ کو تم قتل کرو گے اور ابھی تک وُہ تمہاری نیت تمہارے دل کی گواہی دے رہی ہے کیونکہ تمہیں تو ہو کہ میرے نبی حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے منصوبے بناتے تھے۔ اگر میری حفاظت اُن کے شاملِ حال نہ ہوتی تو عرصہ سے ان کا کام تمام کر ڈالتے۔ اسی طرح تم نے اُن پر جادو چلایا اور پھر اُن کے کھانے (بکری کے گوشت) میں زہر ملا دیا یہاں تک کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے وصال شریف کے وقت فرمایا، "ہمیشہ میرے حلق میں خیبر والا لقمہ عود کرتا رہا اب میری رگِ جاں کے ٹوٹنے کا وقت آ گیا۔"

ف : ابہر وہ ایک رگ ہے جو دل کے اندر ہے جب وُہ ٹوٹ جائے تو انسان مر جاتا ہے۔

یہودیوں کے زہر دینے کا واقعہ واقعہ کی تفصیل یُوں ہے کہ جب خیبر (ایک مشہور مقام کا نام ہے جو حجاز میں واقع ہے) فتح ہوا حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بکری کا گوشت ہدیۃً پیش کیا گیا، اس میں زہر ملائی گئی تھی۔ آپؐ نے یہودیوں سے فرمایا : میں تم سے ایک بات پُوچھتا ہُوں، کیا

تم سچ کہوگے؟ انہوں نے کہا: ہاں ہم سچ بولیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: تمہیں اس بکری کے گوشت میں زہر ملانے کا خیال کیونکر پیدا ہوا؟ انہوں نے کہا: بات دراصل یُوں ہے کہ ہم نے سوچا کہ اگر آپؐ جھوٹے ہیں تو زہر سے مرجائیں گے ہماری جان چُھوٹ جائے گی اور اگر آپؐ سچے ہیں تو زہر آپؐ کو نقصان نہ دے سکے گی۔

تفسیرِ صُوفیانہ یہود اس لیے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اختیار نہ کرتے کہ انہیں اپنے جاہ وجلال اور دنیوی شوکت چھن جانے کا خطرہ تھا اسی طرح جب دل میں دُنیا کی محبت ہو ایمانِ کامل نصیب نہیں ہوسکتا۔

ف: نفس کی سات صفتیں نہایت گندی ہیں:

(۱) عُجب (۲) تکبّر
(۳) غضب (۴) ریاء
(۵) حسد (۶) مال کی محبّت
(۷) مرتبہ کی محبّت

اور جہنّم کے بھی سات دروازے ہیں۔ جس نے اپنے نفس سے یہ سات گندی عادات دُور کیں تو قیامت میں اس سے دوزخ کے ساتوں دروازے بند کردیے جائیں گے اور وُہ بہشت میں داخل کیا جائے گا۔

حکایت حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعض خلفاء کو فرمایا:
کُنْ ذَنَبًا وَلَا تَکُنْ رَاْسًا۔ (دُم بن سر نہ بن)

یعنی سرداری ترک کر کے کسی کا نوکر بن کر رہنا کیونکہ بوقتِ حادثہ سر کٹ جاتا ہے لیکن دم بچ جاتی ہے۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ تا توانی بندہ شو سلطاں مباش
زخم کش چوں گوئی شو چوگاں مباش

۲ اشتہار خلق بند محکمست
در رہ ایں از بند آہن کے کم است

ترجمہ: ۱۔ حتی الامکان نوکر بننا بادشاہ نہ بننا، گیند کی طرح چوٹیں کھاتا رہ لیکن ڈنڈا نہ بننا۔
۲۔ مخلوق میں مشہور ہونا ایک مضبوط قید ہے اس راہ میں ایسی قید لوہے کی بیڑی سے کم نہیں۔

حکایت بعض مشائخ نقشبندیہ سے منقول ہے کہ وہ شیخ المعروف بدوہ عمر روشنی کی طبع پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ چونکہ اُن کے دل میں کچھ حُبِّ ریاست گھر کر چکی تھی اس لیے کہ شہر تبریز میں مرجع اصاغرو

اکابر سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے اُن کا حال دگرگوں تھا۔ ڈر کے مارے خوفزدہ تھے کہ کہیں موت کے بعد ان کا نتیجہ بُرا نہ ہو۔

ف : شرح حکم میں ہے کہ اپنے وجود کو یعنی وُہ امور جو مخلوق میں شہرت کا سبب بنتے ہیں۔ جیسے علم وعمل اور حال، گمنامی کی زمین میں دفن کر دے اور وُہ بھی تین باتیں ہیں :

(۱) اپنے آپ کو ہمیشہ گھاٹے میں سمجھ اور وہ جو تیرے علم سے ظاہر ہو۔ اس پر مت اعتبار کر تاکہ اُس سے تیرے نفس کی خرابیاں تجھے خرابی میں نہ ڈالیں۔

(۲) اپنے آپ کو اس حیثیت سے دیکھ جیسے کہ تُو ہے، اپنی اس حیثیت کو نہ دیکھ کہ جس حیثیت سے چند القابات سے نوازا گیا ہے کیونکہ یہ بھی گھاٹے والی بات ہے کہ تو اپنے آپ کو القاب کی حیثیت سے دیکھے۔ اپنے مالک کو ہر کمال سے موصوف سمجھ، جو کچھ تجھ سے ظاہر ہوتا ہے اسے مالک کی مہربانی سمجھ، اپنی طرف کسی بات کو منسوب نہ کر، اس سے گمنامی کی صفت حاصل ہو جائے گی۔

(۳) نفس کے ہر دعوے کو مٹا دے اُسے کوئی بات نہ ظاہر کرنے دے جس سے عُجب پیدا ہو وُہ تجھے خرابی میں لے جائے گی۔ جیسے بیج ایسی زمین میں ڈالا جاتا ہے جو زرخیز ہو نہ کہ ردّی۔

تفسیر عالمانہ

وَقَالُوْا وہ یہودی جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانۂ اقدس میں موجود تھے کہتے تھے کہ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط غلف اغلف کی جمع ہے۔ اس اغلف (جلد پردہ دار) سے مستعار ہے جو ابھی ختنہ نہ کیا گیا ہو۔ یعنی ہمارے دل جبلی پردوں سے مستور ہیں اُن کی طرف (جو احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے آئے ہیں) نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی وہ انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی کہ ان کے دل ایسے ہی پیدا نہیں ہوئے کیونکہ وُہ تو فطرت اور قبول کے تمکّن پر پیدا کیے گئے ہیں اُن کے اس قول سے اعراض فرماتے ہوئے کہا بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ انہیں رسوائی میں ڈالا ہے اور اپنے دربار سے اُنھیں دُور ہٹا دیا ہے اُن کا یہ حال اُن کے کفر کی وجہ سے ہے جو انہیں عارض ہوا۔ اور استعداد کو ایک بار نہ قبول کرتے ہُوئے اپنے بُرے اختیار اور باطل کر دینے کی وجہ سے ہے فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فاء زاید ہے مبالغہ کے لیے لائی گئی ہے یعنی تھوڑا ایمان رکھتے ہیں۔ اور وہ جو بعض کتاب سے ایمان تھا اور بعض سے کفر۔ فاء سببیت لعنت کے لیے ہے جو انہیں ایمان نہ لانے کی وجہ سے نصیب ہُوئی وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ کتٰب سے مراد قرآن مجید ہے اور اسے مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ سے موصوف کرنا عزّت بڑھانے کے لیے ہے مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ یعنی تورات اور توحید اور بعض شرائع کے موافق ہے۔ ابن التمجید فرماتے ہیں کہ مصدّق صرف بعثت نبویہ علی صاحبہا السلام کے ساتھ اور ان کی علامات صفات سے مخصوص ہے نہ کہ شرائع و احکام سے، کیونکہ

قرآن تو اُس کے اکثر احکام وشرائع کا ناسخ ہے وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا آپ کے وسیلۂ جلیلہ سے مشرکینِ عرب اور کفارِ مکّہ پر فتح ونصرت کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ کہا جاتا :

اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا بِالنَّبِيِّ الْمَبْعُوْثِ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ الَّذِيْ نَجِدُ نَعْتَهٗ فِي التَّوْرَاةِ[1]۔

اور اپنے اعدا سے کہتے کہ وہ وقت قریب ہے کہ نبی آخر الزماں تشریف لائیں گے اور ہماری تصدیق کریں گے ہم ان کے ساتھ ہو کر تمہیں عاد وارم کی طرح قتل کریں گے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوا وہ جو کتاب سے جانتے تھے کیونکہ مَا اُنْزِلَ کی معرفت دراصل مَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ کی معرفت ہے۔ اور فاء دلالت کر رہی ہے کہ اُن کی طلب فتح کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری میں کوئی لمبی مدت نہ گزری تھی کہ وہ اس بات کو بھول جاتے كَفَرُوا بِهٖ حسد اور حرص علی الریاسۃ کی وجہ سے اُن کے ساتھ کفر کیا اور اُن کی صفت کو بدل ڈالا اور یہ جملہ لَمَّا اُولیٰ کا جواب ہے اور لمّا ثانیہ محض لمّا اُولیٰ کی تائید وتکریر کے لیے ہے فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ لعنۃ اللہِ علیھم (ضمیر) کے بجائے اسمِ ظاہر لایا گیا۔ اس دلالت کی بناء پر کہ لعنت انہیں صرف ان کے کفر کی وجہ سے لاحق ہوئی ہے۔ اور فاء اس دلالت کے لیے ہے کہ لعنت کا ورود کفر کے بعد ہے۔

ف : کفار پر لعنت کا معنیٰ طردؔ اور رحمت وکرامت اور جنّت سے مطلقاً دُور کرنا اور مومنین جو گنہگار ہیں اُن کے لیے لعنت سے یہ مطلب ہے کہ انھیں اُس کرامت سے دُور کرنا جو ان گناہوں سے پاک ہیں اور انھیں کرامت کا وعدہ دیا گیا جو اس گناہ سے بری ہیں۔

حدیث شریف

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں :

"جس نے احتکار کیا وہ ملعون ہے۔"

یعنی وُہ شخص جو کسی چیز کو خریدے اور اس لیے جمع رکھ دے کہ اسے مہنگائی کے وقت بیچے گا تو وہ شخص ابرار کے درجہ سے دُور ہے نہ رحمتِ غفار سے۔

تحقیق لعنت علی الغیر

وُہ صفات کہ جن کی وجہ سے لعنت کی جاتی ہے تین ہیں :

(۱) کفر (۲) بدعت (۳) فسق

اور ان میں سے ہر ایک کے تین مراتب ہیں :

(۱) وصف اعم کو لے کر لعنت کرنا۔ جیسے کہا جائے :

لعنۃ اللہ علی الکٰفرین او المبتدعۃ او الفسقۃ۔ کافرین یا بتدعین یا فاسقین پر لعنت۔

(۲) وصف اعم سے اخص کو لے کر لعنت کرنا۔ جیسے کہا جائے :

---

[1] اے اللہ! اس نبی علیہ السلام کی برکت سے ہماری مدد فرما جو آخر زمانہ میں مبعوث ہونگے جن کا ذکرِ خیر ہم تورات میں پاتے ہیں۔

لعنۃ اللہ علی الیھود والنصاریٰ او علی القدریۃ والخوارج والرافض او علی الزناۃ والظلمۃ و آکل الربا۔ اس طرح سب پر مطلقاً لعنت کرنا جائز ہے۔

(۳) ایک متعین شخص پر لعنت کرنا۔ یہ اس وقت جائز ہے جبکہ کفر شرعاً اس سے ثابت ہو چکا ہو بشرطیکہ اس میں کسی مسلم پہ ایذاء کا موجب نہ بنے اور اگر اُن کا کفر شرعاً ثابت نہ ہو، جیسے کہا جائے لعنۃ اللہ علی زید او عمرٍ و غیرھما۔ معین اشخاص پر لعنت کرنا جائز ہے کیونکہ اس کے خاتمہ کا حال غیر معلوم ہے۔ بہت بار کا مشاہدہ ہے کہ جسے ہم کافر سمجھتے ہیں وہ مرنے سے پہلے اسلام لاتا ہے یا اپنی غلطی سے توبہ کر کے مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا مقرب ہو جاتا ہے اس بنا پر اس پر لعنت کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے۔

حضرت وحشی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا لیکن پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے جنت کی بشارت دی۔ اور یہی حجت پکڑتے ہیں جو لوگ یزید پر لعنت نہ کرنے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس نے توبہ کی ہو اور اپنے کیے ہوئے فعل سے رجوع کر لیا ہو اس احتمال سے اس پر لعنت نہ کرنا چاہیے۔ اور جو لوگ لعنت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ یزید کا کفر مشہور ہے اور اس کے شدید شر کی خبر متواتر ہے اس لیے کہ جب اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دیا تو اُس نے کفر کیا علاوہ ازیں اس قول سے کافر ہوا جیسا کہ اس نے شراب نوشی کے وقت کہا :

فَاِنْ حُرِمَتْ یَوْمًا عَلٰی دِیْنِ اَحْمَد ۔ فَخُذْھَا عَلٰی دِیْنِ الْمَسِیْحِ ابْنِ مَرْیَم ۔

یعنی آج یہ شراب احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی وجہ سے حرام ہے تو تُو اسے دینِ عیسوی کی وجہ لے کر پی لے۔

اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل اور ان کے قتل کے آمر اور مجوز اور راضی ہونے والے تمام پر لعنت جائز ہے۔ جیسا کہ سعد الملۃ والدین التفتازانی فرماتے ہیں :

"حق بات یہ ہے کہ یزید کا قتل حسین رضی اللہ تعالیٰ پر راضی ہونا، اس سے خوش ہونا اور اہلِ بیت کی اہانت کرنا اگرچہ اس کے تفاصیل احاد تواتر بالمعنیٰ ہیں۔ ۱۲"

تو پھر ہم اس کے شان بلکہ ایمان میں کیا شک کریں بلکہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اور اس کے انصار و اعوان پر لعنت بھیجے۔

الصاحب بن عباد کی عادت تھی کہ جب پانی میں برف ملا کر پیتے تو یہ شعر پڑھتے : ؎

قَعْقَعَۃُ الثَّلْجِ بِمَاءٍ عَذْبٍ ۔ تَسْتَخْرِجُ الْحَمْدُ مِنْ اَقْصَی الْقَلْبِ

یعنی برف میٹھے پانی کے ساتھ حمد کو اقصیٰ قلب سے نکالتی ہے ۔
پھر کہتے : اَللّٰھُمَّ جَدِّدِ اللَّعْنَ عَلٰی یَزِیْدَ ۔ اے اللہ ! یزید پر لعنت کی تجدید فرما ۔

عقیدہ حضرت امیر معاویہؓ کی لعنت سے زبان کو روکا جائے کیونکہ اس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ہے اس لیے کہ کاتب وحی اور ذو السابقہ اور صاحب فتوحاتِ کثیرہ تھے ۔ فاروق وعثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عامل تھے لیکن اُن سے اجتہادی غلطی سرزد ہوئی اور وُہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت کے طفیل معاف فرما دے گا ۔

حکایت خیاطؒ فرماتے ہیں : مجھے آج تک کسی نے لاجواب نہیں کیا صرف ایک لڑکے سے لاجواب ہوگیا تھا جبکہ اس نے مجھ سے پُوچھا کہ امیر معاویہؓ کے حق میں تیرا کیا خیال ہے ؟ میں نے کہا اس کے بارے میں توقف کرتا ہُوں ۔ پھر اُس نے پوچھا : اُس کے بیٹے یزید کے حق میں کیا رائے ہے ؟ میں نے کہا : اس پر لعنت بھیجتا ہُوں ۔ پھر پُوچھا : جو یزید سے محبت رکھتا ہو اس کے متعلق کیا گمان ہے ؟ میں نے کہا : اس پر بھی لعنت ۔ لڑکے نے کہا : یقین جانئے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بیٹے یزید کو دوست نہیں رکھتے تھے ۔ (کذا فی روضۃ الاخیار)

مسئلہ : لعنت پھر لعنت کرنے والے کی طرف لوٹتی ہے جبکہ جس پر لعنت کی جائے وہ اس کا اہل نہ ہو ۔

مسئلہ : کسی شے پر لعنت کرنے سے بسا اوقات اس سے برکت چھن جاتی ہے ۔

مسئلہ : اللہ کی مخلوق میں کسی شے پر لعنت نہ کی جائے یہاں تک کہ نہ جماد پر نہ حیوان پر اور نہ انسان پر ۔

حدیث شریف حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :
مجھے دوزخ دکھائی گئی تو میں نے اس میں زیادہ تر عورتوں کو پایا کیونکہ وہ لعنت بکثرت بھیجتی ہیں اور اپنے شوہروں کی نافرمانی کرتی ہیں اگرچہ زمانہ بھر ان کے ساتھ احسان کرتے رہو ۔ جب کسی وقت کسی قسم کی کمی دیکھیں گی تو کہیں گی ، میں نے تجھ سے کبھی بھلائی دیکھی ہی نہیں ۔

مسئلہ : حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں :
"جو شخص علم کے بغیر فتویٰ دیتا ہے تو اسے آسمان وزمین لعنت کرتے ہیں ۔"

حکایت علی بلخی کی بیٹی نے اپنے باپ سے پُوچھا کہ جب قے حلق تک خارج ہو گیا وضو باقی رہتا ہے ؟ علی بلخی نے کہا : نہیں بلکہ اس پر وضو کا اعادہ ضروری ہے ۔ پھر علی بلخی کے ہاں خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا : نہیں اے علی بلخی ! وضو نہیں ٹوٹتا جب تک قے سے مُنہ بھرا نہ ہو ۔ میں نے یقین کر لیا کہ ہر فتویٰ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر کیا جاتا ہے ۔ بعد ازاں میں نے قسم

اُٹھائی کہ آیندہ کسی قسم کا فتویٰ نہیں دُوں گا۔ (کذا فی الروضۃ)

بِئْسَمَا ما نکرہ منصوبہ بئس کے فاعل کے لیے مفسر ہے ای بئس شیئا۔ اِشْتَرَوْا صفت ہے،
اِشْتَرٰی بمعنے بَاعَ وَابتاع۔ یہاں پر پہلا معنٰی مراد ہے بِهٖٓ اس شے کے سبب سے، ای بذالك الشئ۔
اَنْفُسَهُمْ اس سے مراد ایمان ہے نفس کو ایمان کی بجائے ذکر کرتے ہیں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس کی خلقت
علم وعمل کے لیے ہے۔ جسے ایمان کے لیے تعبیر کیا جاتا ہے اور جبکہ انہوں نے ایمان کو چھوڑ کر کفر کا جامہ پہنا تو
گویا کہ انہوں نے نفسوں کو کفر سے تبدیل کیا اور مخصوص بالام ہے اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کتاب
(جو ان کے احکام کا تعین کرتی ہے) کے ساتھ کفر کرتے ہیں باوجودیکہ اس کی حقیقت جانتے ہیں بَغْيًا اَنْ
يَّكْفُرُوْا کی علت ہے۔

ف: حسد اس چیز کو طلب کرنا جو اس کے پاس نہ ہو۔ کیونکہ حاسد کا کام ہے کہ جو مرتبہ وقدر اور خصلت حمید
محسود کو حاصل ہے۔ وُہ چاہتا ہے وہی مجھے مل جائیں۔ اور باغی وہ ظالم ہے جو اس فعل کو بوجہ حسد کے کرتا ہے۔ اب
معنٰی یہ ہُوا کہ بہت بُری شے ہے یہ کہ انہوں نے ایمان دے کر کفر خریدا، جس میں بغی کے سوا اور کچھ ہے نہیں اور
وہ بغی اس لیے اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ یا حسد اس لیے کہ ان ینزل الخ کیونکہ حسد کا صلہ علٰی آتا ہے یعنی نازل کرے
مِنْ فَضْلِهٖ اپنے فضل سے عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ جسے چاہے اور جسے چُن لے مِنْ عِبَادِهٖ اپنے بندوں میں سے
یعنی اُس کے وُہ بندگان جو اعبائے رسالت کے تحمل کے اہل ہیں۔ اس سے مراد سیّدنا محمد مصطفٰی صلّی اللہ
علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں۔

ف: یہود کا عقیدہ تھا کہ نبی آخر الزماں تشریف لانے والے ہیں۔ لیکن آرزومند تھے کہ سیّدنا اسحاق علیہ السلام
کی اولاد سے ہوں۔ جب حضور حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے تشریف لائے تو یہود کو حسد ہُوا کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ
علیہ وسلم کو بنی اسرائیل سے ظاہر ہونا چاہیے تھا لیکن ان کے غیر میں ظاہر ہوا ہے۔

فَبَآءُوْا لوٹے جو ملتبس ہیں بِغَضَبٍ ساتھ غضب کے جو ہونے والا ہے عَلٰى غَضَبٍ ط پے در پے
غضب اور لعنت در لعنت کے مستحق ہوئے موافق اس کے کہ انہوں نے کفر در کفر کیا کیونکہ نبی برحق کے ساتھ
کفر کیا اور لغاوت کی وَلِلْكٰفِرِيْنَ ضمیر کے بجائے اسم ظاہر میں اس طرف اشارہ ہے کہ کفر انہیں محیط تھا
عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ٥ اور کفار کے لیے رُسوا کرنے والا عذاب ہے۔ اس سے کفار کی اہانت اور ذلّت
مراد ہے کیونکہ انھیں لالچ تھا کہ قرآن کا نزول ہماری قوم میں ہوتا، اب دوسری قوم میں نازل ہوا تو ان میں
حسد پیدا ہوگیا۔ تو اس کی یہ سزا ملی کہ جس ذات سے تم حسد کرتے ہو ان کی وجہ سے ہی تمہیں ذلیل و خوار
کیا جارہا ہے۔

ف : اس سے ثابت ہُوا کہ مومنین کا عذاب ان کو ادب سکھانے اور گناہوں سے پاک کرنے کے لیے اور کافروں کو عذاب ان کو ذلیل اور ان پر سختی کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ف : دین و دنیا کا فیض و فضل اللہ تعالیٰ کے کرم پر مبنی ہے۔ کسی پر فیض و فضل ہو جائے تو دوسرے کو اس پر حسد نہیں کرنا چاہئے اور پھر نبوت اور ولایت امور اکتسابیہ سے نہیں کہ بندہ جدّ و جہد اور خاص اہتمام سے انہیں حاصل کرے۔ نبوت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کو بھیجے۔ تجلّی جو اعیان فی العلم کی موجب ہے عنایت کرکے جسے نبی بنا دے اور یہ اس کا ایک فیض ہے جسے جو چاہے دے دے[1] اسی طرح ولایت بھی ایک خاص عطیہ ہے جسے کسب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ تمام مقامات عُلیا کو یُونہی سمجھو کہ وُہ اختصاصیہ عطائیہ ہیں کسبیہ نہیں اُسے نصیب ہوتے ہیں۔ جس کو فیضِ الٰہی منتخب فرمائے[2]۔

سوال : عام طور پر مشہور ہے کہ ولایت کسبی ہے اور آپ اُسے بھی عطائی کہہ رہے ہیں۔

جواب : چونکہ اس کا ظہور چند شرائط و اسباب کے تحت ہوتا ہے اور وہ شرائط و اسباب آہستگی پذیر ہوتے ہیں اس لئے محجوب انسان سمجھتا ہے کہ ولایت کسبی ہے حالانکہ ولایت بھی عطائی ہے۔

ف : حسد کرنے سے کیا بنتا ہے صرف اتنا ہوتا ہے کہ جُہال زبانی باتوں سے اپنے محسود کو کچھ نہ کچھ کہہ بیٹھتے ہیں اس سے محسود کو کون سا نقصان پہنچا، بلکہ اسے تو فائدہ ہُوا کہ حاسد کے حسد سے اس کے درجات بڑھ گئے۔ ویسے اللہ تعالےٰ کا طریقہ جاری ہے کہ اہلِ جمال سے اہلِ جلال ملائے رکھتا ہے تاکہ کمال کا ظہور اچھی طرح ہو۔ حافظ مرحوم رحمہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں : ؎

دریں چمن گل بے خار کس نچید آرے
چراغِ مصطفوی با شرار بُولہبیست

ترجمہ : اس چمن میں کوئی گل کانٹے کے بغیر نہیں مصطفیٰ کے چراغ کے ساتھ ابولہب کی چنگاری بھی تھی۔

حکایت حضرت عارفِ رومیؒ جب حضرت شمس تبریزؒ سے جُدا ہوئے تو ان کی تلاش میں گرمی کی پروا کیے بغیر بڑے بڑے شہر چھان مارے۔ ایک دن سُنار کی دکان کے آگے سے گزرے اور وہ دکان شیخ صلاح الدین زرکوب کی تھی۔ آپ کو شیخ موصوف نے فرمایا : مولانا! کیوں حیران پھر رہے ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ فلک جب اپنے آفتاب کو گم پاتا ہے تو وہ حیران و ششدر ہو کر چکر لگاتا ہے تاکہ اپنے سورج کو پاکر ظلمت کے دکھ سے بچ جائے۔ شیخ موصوف نے فرمایا : میں تیرا سورج ہوں میرے قریب آجایئے۔ مولانا نے فرمایا : میں کیسے یقین کرلوں کہ آپ میرے شمس ہیں۔ شیخ موصوف نے مولانا کو اُن کے مراتب کی پوری تفصیل بتا دی کہ جن مراتب سے

---

[1] اس سے مرزائیوں کے عقیدہ کی تردید ہُوئی کہ وُہ قائل ہیں کہ نبوت بھی کسبی ہے ۱۲

[2] اگرچہ اس میں کسبِ عمل کو بھی دخل ہوتا ہے ۱۲ اویسی غفرلہٗ

حضرت شمس تبریزؒ نے مولانا کو آگاہ فرمایا تھا۔ مولانا نے شیخ موصوف کے ہاتھ چوم لیے اور معذرت کی اور کہا میرے شمس نے پہلے مجھے اپنی جھلک دکھائی اب مجھے اپنے چہرے کی جانب سے نوازا۔ اس کے بعد مولانا ان کے ہاں رہنے لگے اور بہت بڑے مراتب حاصل کئے۔ مولانا کے بعض بدخواہوں کو معلوم ہُوا تو حسد کے طور شیخ موصوف کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن مولانا نے اپنے سلطان ولد کو بھیج کر ان کو اس ارادۂ بد سے روکا۔ شیخ موصوف نے فرمایا: مولانا! فکر مت کیجئے اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی طاقت بخشی ہے کہ آسمان کو زمین پر دے ماروں اور اپنے حاسدوں کو پاش پاش کردوں لیکن بہتر ہے کہ اس میں صبر کروں، آئیے مل کر ان کی اصلاح کی دعا کریں۔ شیخ نے دُعا فرمائی تو ان لوگوں کے ارادے ٹھنڈے پڑ گئے اور وہ اس ارادۂ بد سے تائب ہو کر استغفار کرنے لگے۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

چوں کنی بر بے حسد مکر و حسد

زاں حسد دل را سیاہیہا رسد

خاک شو مردانِ حق را زیر پا

خاک بر فرقِ حسد کن ہمچوں ما

ترجمہ: جب بے حسد پر مکر و حسد کرو گے تو اس سے تیرے دل کی سیاہی بڑھے گی۔ مردانِ خدا کا خاکِ پا اور زیرِ پا ہو جا ہماری طرح حسد کے سر پر مٹی پھینک۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ اور اس کے گردونواح کے یہودیوں کو کہتے ہیں۔ اور لام بمعنے اِنہاء و تبلیغ کے ہے اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ تمام کتبِ الٰہیہ پر ایمان لاؤ قَالُوْا نُؤْمِنُ کہتے ہیں ہم ایمان پر استمرار رکھتے ہیں بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا اس سے مراد تورات اور جو کچھ بنی اسرائیل کے انبیاء پر نازل ہوا اس کے ماسوا ہم پر نازل نہیں ہیں انزال کتب کا اسناد اپنی طرف اس لیے کر رہے ہیں کہ جو نبی علیہ السلام پر نازل ہوتا ہے وہ ان کی امت پر بھی نازل ہوتا ہے کیونکہ اس پر عمل کرنا اُن کو لازم ہوتا ہے وَ اور وہ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ماسوا اس کے جو ان پر نازل ہوا، کے ساتھ کفر کرتے ہیں وَهُوَ حالانکہ تورات کے ماسوا قرآن الْحَقُّ حق ہے یعنی معروف بالحقیقت ہے اور اس کو لائق ہے کہ علی الاطلاق حق کا اسم اس کے لیے خاص ہو مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ تورات کی تصدیق کرتا ہے اس کا مخالف نہیں۔ حق سے حال مؤکدہ ہے اور اس کا عامل فعل ہے۔ اور ذوالحال وہ ضمیر ہے جس پر کلام دلالت کر رہا ہے یعنی اُحِقُّہٗ مُصَدِّقًا یعنی اس کا حال یہ ہے کہ جو کچھ اُن کے پاس ہے اُس کی تصدیق کنندہ ہے اس میں ان کے اپنے قول کی تردید بھی ہے۔ کیونکہ جب اس کا انکار کر رہے ہیں جو تورات کا انکار ہے اس کے بعد اعتراض فرمایا کہ تم نے انبیاء علیہم السلام کو شہید کر دیا باوجودیکہ تمہارا دعویٰ ہے کہ ہم ایمان دار ہیں حالانکہ تورات میں کسی نبی کے قتل کی اجازت نہیں تھی قُلْ اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! فرمائیے۔ یہ امر تبکیت کا ہے،

جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے ان کے متناقض اقوال و افعال کی وجہ سے فَلِمَ در اصل لِمَا تھا۔ اس کی لام تعلیل کی ہے جو ما استفہامیہ پر داخل ہوئی ہے۔ الف گر گیا ہے تاکہ استفہامیہ و خبریہ کے مابین فرق رہے۔ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ استقبال صیغہ حکایت حال ماضیہ کے لیے ہے اور یہ جواب ہے شرط محذوف کے لیے۔ در اصل عبارت یوں تھی: قل لهم ان کنتم مؤمنین بالتوراۃ الخ آپ فرمائیے کہ اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہو تو پھر اس سے قبل کس وجہ سے انبیاء علیہم السلام کو شہید کرتے تھے۔ حالانکہ یہ فعل تورات میں بھی حرام تھا۔ ان کے آباء کے فعل یعنی قتل کا اسناد اَبنا کی طرف صرف ان کی آپس میں ملابست کی وجہ سے ہے۔

مسئلہ: ابو اللیث رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ گناہ سے راضی ہونے والا گویا اس کا مرتکب ہوا ہے۔ کیونکہ یہود اپنے آباء کے انبیاء کو قتل کرنے پر راضی تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں قاتل الانبیاء قرار دیا۔

چنانچہ فرمایا: فلم تقتلون الآیۃ

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞ شرط کا جواب محذوف ہے جیسا کہ گزشتہ مضمون دلالت کرتا ہے۔ در اصل عبارت یوں تھی: اِن کنتم مؤمنین فلم تقتلونهم۔ اعتراض کا تکرار محض الزام کی تاکید اور تشدید تہدید کے لیے ہے۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ تبکیت و توبیخ کا تکملہ ہے۔ یہ بھی امر کے تحت داخل ہے اور یہ لام قسم کی ہے در اصل عبارت یوں تھی: باللّٰهِ قَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى الخ اللہ تعالیٰ کی قسم بے شک موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس معجزات لائے جو ظاہر اور واضح تھے۔ یعنی عصا اور ہاتھ کا نورانی ہونا اور دریا کا پھٹ جانا وغیرہ وغیرہ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا مِنْۢ بَعْدِهٖ بعد ان کے معجزات لانے کے اور ثُمَّ رتبہ کی تراخی کے لیے ہے اور اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اُن کا یہ عمل نہایت قبیح تھا وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۞ یہ حال ہے اتخذتم کی ضمیر سے۔ یعنی تم بچھڑے کے پجاری ہوئے حالانکہ تم عبادت کو اُس کے غیر محل میں رکھنے والے تھے وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ تم میں سے وعدہ لیا وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ تم پر پہاڑ کھڑا کر دیا اور ہم نے کہا خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ اسے بڑی جد و جہد سے پکڑو وَّاسْمَعُوْا ؕ اور جو کچھ تورات میں ہے اُسے قبول کرو اور اطاعت کرو قَالُوْا گویا پوچھا گیا کہ پھر انہوں نے کیا جواب دیا تو فرمایا قالوا انہوں نے کہا سَمِعْنَا ہم نے تیرا قول سُنا تو ہے لیکن ہم عمل نہیں کریں گے وَعَصَيْنَا ۗ بلکہ تیرے امر کے خلاف کریں گے۔ اگر پہاڑ کے گرنے کا خطرہ نہ ہوتا تو ظاہراً بھی نہ مانتے جب اُن کے اسلاف کا یہ حال ہے تو غور فرمائیے کہ ان کے اخلاف کا کیا حال ہوگا۔ فردوسیؒ فرماتے ہیں:

۱ ز بد گوہراں بد نباشد عجب سیاہی نباشد بریدن ز شب

۲ ز بد چشم بہی داشتن بود خاک در دیدہ پناشتن

ترجمہ :(۱) بدگوہروں سے بُرائی نہ ہو تعجب ہے کیارات سے بھی سیاہی مٹائی جاسکتی ہے ؟
(۲) بُرے سے بھلائی کی امید رکھنا ایسے ہے جیسے آنکھوں میں مٹی ڈالنا ۔

وَ اُشْرِبُوْا بیشک وُہ پلائے گئے فِیْ قُلُوْبِھِمُ یہ ان کے پلانے کے مقام کا بیان ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے : اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ نَارًا ۔ الْعِجْلَ بچھڑے کی محبت ۔ مضاف محذوف ہے ۔ کہاجاتا ہے : اُشْرِبَ قَلْبُہٗ کَذَا ای مَحَلَّ الشَّرَابِ ۔ یا یہ معنیٰ ہے کہ ان میں بچھڑے کی محبت مختلط ہوگئی جیسے رنگ کپڑے میں مل جاتا ہے ۔ دراصل اَشْرَبَہٗ اور جَعَلَہٗ شَارِبًا کا ایک ہی معنیٰ ہے ۔ اب مطلب یہ ہُوا کہ انہوں نے بچھڑے کی محبت کو پی لیا تھا اور بچھڑے کی محبت ان کے دل میں ایسے سرایت کرگئی جیسے پانی جسم میں مل جاتا ہے ۔

ف : امام راغب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہلِ عرب کی عادت ہے کہ جب کسی شئے کی محبت یا بُغض کسی میں دیکھتے ہیں تو پینے کے فعل کو اس کے لیے استعمال کرتے ہیں کیونکہ پینے کی شے جسم کے ذرّہ ذرّہ میں سرایت کرجاتی ہے ۔ اسی لیے اطبّاء نے کہا ہے کہ پانی اغذیہ اور ادویہ کی سواری ہے ۔

بِکُفْرِھِمْ ان کے کفر کی وجہ سے جواُن سے پہلے سرزد ہوا وہی اس بُرے عمل کا سبب بنا ۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ مجسّمیہ یا حلولیۃ مذہب کے لوگ تھے اور بچھڑے کا جسم نہایت اچھا لگا اس لیے اس کی طرف جُھک گئے اور ان کا دل بچھڑے سے لگ گیا ۔ اُدھر سامری نے بھی غلط فہمی میں ڈال دیا ۔ اُن کی لذّتِ پرستش کو (جو ان کو بچھڑے سے حاصل ہوئی) کفر سے مجازاً تعبیر کیا گیا ہے

حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے پاس واپس تشریف لائے تو بچھڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کرا کر تمام نہروں میں ذرّہ ذرّہ کرکے ڈالا پھر فرمایا کہ تم ان نہروں سے پانی پی لو ۔ جس کے دل میں بچھڑے کی محبت رچی ہوئی تھی اس کے مُنہ سے سونے کا پانی ظاہر ہوجاتا ۔

قُلْ یہ توبیخی امر ہے اور ان یہودیوں سے خطاب ہے جو حضور علیہ السلام کے ہمزمان تھے صرف اس ارادہ پر کہ وُہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں پھنس کر صرف ان کے اعمال کی اقتدا کرتے تھے بِئْسَمَا بُرا ہے وہ فعل یَاْمُرُکُمْ بِہٖٓ جو تمہیں ایسی قباحتوں کا حکم دیتا ہے اِیْمَانُکُمْ تمہارا وہ ایمان جو تم نے اپنی بنائی ہوئی تورات سے تیار کیا ہے مخصوص بالذم محذوف ہے ۔ یعنی وہ مضمون جو پہلے مذکور ہوا جیسے سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا اور ان کا بچھڑے کو پُوجنا ۔ ایمان کی طرف اُن کے فعل کی نسبت محض تہکماً ہے اور پھر ایمان کو ان کی طرف مضاف کرنے میں اشارہ ہے کہ ان کا درحقیقت ایمان ہی نہیں کیونکہ ایمان اُن کا اپنا تیار کردہ ہے چنانچہ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ سے معلوم ہوتا ہے یعنی اگر تم صحیح معنے پر تورات پر ایمان لاؤ تو تورات تمہیں ایسی قباحتوں سے روک لے گی ۔ لیکن تمہاری یہ کیفیت بتاتی ہے کہ تم مومن نہیں ہو ۔

مسئلہ : جو منہ سے کہے کہ مومن ہوں۔ اس کا عمل بھی تصدیق کرے کہ واقعی وُہ مومن ہے ورنہ وہ کامل مومن نہیں۔

سبق حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ صوفیہ کرام کے نزدیک توحید کا مطلب یہ ہے کہ بندہ حدوث سے ہٹ کر قدم میں پہنچے، اس عالم کے بکھیڑوں اور دلی تمناؤں کو مٹا کر عقل اور جہل سے دُور ہو کر ذاتِ حق کے مُلک میں جا کر بسیرا کرے ؎

طالبِ توحید را باید قدم بہ لا زدن
بعد ازاں در عالمِ وحدت دم اِلّا زدن

ترجمہ : طالبِ توحید کو پہلا قدم لا پر رکھنا ہے پھر عالمِ وحدت میں اِلّا کا دعویٰ کرنا۔

حکایت حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب قاصد نے خوشخبری سُنائی کہ حضرت یوسف علیہ السلام ابھی زندہ ہیں، تو آپ نے اس سے پُوچھا، زندہ تو ہیں لیکن یہ بھی تجھے خبر ہے کہ ان کا دین کیا ہے؟ اس نے کہا، ان کا دین اسلام ہے۔ تو آپ نے فرمایا: الحمدُ للہ! اب میں خوش ہُوں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی تکمیل ہوگئی۔

ف : آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ توحید اصل الاصول ہے اور قبولیت کا دار و مدار اسی پر ہے اور اس سے گناہوں کی معافی ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطائیں اسی سے نصیب ہوتی ہیں۔

اسلامِ دحیہ کلبی حضور سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ دحیہ کلبی مسلمان ہو جائے۔ کیونکہ اس کے ماتحت ستر قبیلے تھے اس کے اسلام لانے سے وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایک دن حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یُوں دُعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْ دِحْیَۃَ الْکَلْبِی الْاِسْلَامَ۔

(اے اللہ! دحیہ کلبی کو دولتِ اسلام سے نواز)

اس کے بعد جب دحیہ کلبی نے اسلام لانے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی بھیجی اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام صبح کی نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بعد سلام ارشاد فرمایا کہ اے پیارے حبیب! ابھی آپ کے پاس دحیہ کلبی حاضر ہوگا۔ لیکن آپ کے صحابہ میں سے بعض کی زمانۂ جاہلیت سے اس کے ساتھ ناراضگی ہے فلہذا خیال رہے۔ صحابہؓ نے جب سُنا تو دل سے یہ بات نکال دی اگرچہ حضور علیہ السلام نے انہیں نہیں فرمایا تھا۔ چنانچہ جب حضرت دحیہ کلبی مسجد نبوی میں حاضر ہُوئے تو حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے دحیہ کے لیے اپنی چادر مبارک بچھا دی اور فرمایا کہ اس پر بیٹھ جاؤ۔ حضرت دحیہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کو دیکھ کر رونے لگے اور آپؐ کی چادر مبارک کو اٹھا کر چُوما اور اسے آنکھوں سے لگایا اور ادب سے اسے سر پر رکھ لیا اور عرض کی، حضورؐ! مجھے اسلام کے شرائط بتائیے۔ آپؐ نے فرمایا، پڑھیے لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ دحیہ نے

کلمہ شریف پڑھا۔ اس کے بعد زار و قطار رونے لگے ۔ آپؐ نے فرمایا : دولتِ اسلام کے حصول کے بعد اب رونے کا کیا معنیٰ ! عرض کی : اپنے گناہوں کو یاد کرتا ہوں تو بے ساختہ رونا آتا ہے اس کا کفارہ جو ہوگا میں ادا کر دوں گا اپنے رب سے پوچھیے ، اس کے عوض مجھے اپنے آپ کو قتل بھی کرنا پڑے گا تو کروں گا ، اگر سارا مال بھی خرچ کرنا پڑے تو دریغ نہ کروں گا ۔ آپؐ نے فرمایا : وہ گناہ کیسا ہے ؟ عرض کی : آپؐ کو معلوم ہے کہ میں ایک بادشاہ ہوں اور مجھے عار تھی کہ میں اپنی لڑکیوں کو کسی کے نکاح میں دوں ۔ اسی لیے میں نے یکے بعد دیگرے اپنی ستر لڑکیوں کو قتل کیا ہے ۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم متحیر ہوئے ۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کی : اللہ تعالیٰ سلام کے بعد فرماتا ہے کہ دحیہ کو فرمائیے مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ! جبکہ تو نے کلمہ شریف پڑھا ہے ہم نے تمہارا ساٹھ سال کا کفر اور ساٹھ سال کے تمام گناہ بخش دئے ، اسی طرح لڑکیوں کے مارنے کے گناہ بھی بخش دیے ۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام آبدیدہ ہوگئے اور کہنے لگے : یا اللہ ! جب تو دحیہ کلبی کے گناہ ایک بار کلمہ شریف پڑھنے سے بخش دیتا ہے تو مومنین تو کئی بار یہ کلمۂ شہادت پڑھیں گے پھر کیوں نہ ان کے گناہ بخش دیے جائیں گے کیونکہ وہ صدقِ دل اور خالص عمل سے یہ کلمہ شریف پڑھیں گے ۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

اُذْکُرُوا اللّٰہ کار ہر او باش نیست
اِرْجِعِیْ بر پائے ہر قلاش نیست

ترجمہ : اللہ کا ذکر ہر اوباش کو نصیب نہیں اور اِرجعی کا خطاب بھی ہر قلاش کو نہیں ہوگا ۔

حضرت شیخ سعدی نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے : ؎

۱ گر بمحشر خطابِ قہر کند
انبیاء را چہ جائے معذرتست

۲ پردہ از روئے لطف گو بردار
کاشقیا را امید مغفرتست

ترجمہ : ۱ ۔ اگر قیامت میں قہر کا خطاب ہو تو انبیاء بھی معذرت نہ کر سکیں گے ۔
۲ ۔ لطف سے پردہ اٹھائیے اس لیے کہ اب تو اشقیاء بھی مغفرت کی امید میں ہیں ۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ فرمائیے اگر تمہارے لیے آخرت یعنی بہشت خاص ہے عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً اللہ تعالیٰ کے نزدیک ظرف جز میں استقرار لَکُمْ کے لیے ہے خَالِصَةً حال ہے دَارُ سے ، یعنی سالم اور خالص تمہارے لیے مِنْ دُوْنِ النَّاسِ سوائے لوگوں کے ، یہ خَالِصَةً سے مل کر محل نصب میں ہے یعنی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحاب کے سوا ۔ لام عہد کے لیے ہے اور یہ اختصاص کے لیے

استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے:

هٰذَا لِیْ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ۔

یعنی یہ اس کے ساتھ مخصوص ہوں۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اگر تمہارا قول صحیح ہے کہ بہشت میں یہود کے سوا اور کوئی داخل نہیں ہوگا فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ تو موت کو محبوب سمجھو اور اس کا بہ دل و جان سوال کرو اور کہو: اَللّٰهُمَّ مَيِّتْنَا (اے اللہ! ہمیں موت دے دے) کیونکہ جسے بہشت کے داخلہ کا یقین ہوتا ہے وہ لامحالہ موت کا اشتیاق ظاہر کرتا ہے اور اس کی نعمتوں کی طرف جلد پہنچنے کا متمنی ہوتا ہے اور خواہش رکھتا ہے کہ اس دار ہلاکت اور پریشانیوں کی قرارگاہ سے چھوٹ جائے۔ اس کی طرف پہنچنے کی کوئی راہ نہیں سوائے موت کے۔ بنأ بریں اے یہود! تم اس کی آرزو میں جلدی کرو۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ اگر تم اپنے قول میں (کہ بہشت صرف تمہارے لیے ہی ہے) سچے ہو تو اس کی آرزو کرو۔ تَمَنّیْ دراصل نفس میں کسی شئے کو مقدر کرنے کا نام ہے اور اکثر اس میں استعمال ہوتی ہے کہ جس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اور اس موت کی ہرگز آرزو نہیں کریں گے اَبَدًا ہمیشہ، یعنی زمان مستقبل میں۔ کیونکہ لفظ اَبَدًا مستقبل کے جمیع اوقات کے لیے آتا ہے جیسے لفظ قط ماضی کے جمیع اوقات کے لیے ہوتا ہے اور یہ دلیل ہے کہ لفظ لَنْ تابید کے لیے نہیں۔ کیونکہ آخرت میں تو موت کی آرزو ضرور کریں گے اگرچہ دنیا میں نہیں کرتے بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ بسبب اس کے کہ وہ بُرے عمل کرتے ہیں جو نار کے موجب ہیں۔ جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کے ساتھ کفر کرنا اور تورات کی تحریف کرنا۔ اور ہاتھوں کی تخصیص اس لیے ہے کہ عموماً اعمال انھیں سے ہوتے ہیں اور انسان کے جوارح میں عام صنائع اور اکثر منافع کا دارومدار ہاتھ ہیں، اس لیے انھیں کبھی نفس سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی قدرت سے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ○ اللہ تعالیٰ اُنھیں اور اُن سے جو صادر ہوتا ہے جاننے والا ہے۔ یہ تہدید ہے۔

حدیث شریف اگر یہود موت کی آرزو کرتے تو اپنی تھوک نگلنے کے فوراً بعد مرجاتے۔ اس کے بعد پھر کوئی یہودی رُوئے زمین پر زندہ نہ رہتا۔

پس وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا معجزات سے ہے کیونکہ یہ لَنْ تَفْعَلُوْهُ کی طرح غیبی خبر ہے اور اگر کسی ایک نے موت کی آرزو کی ہوتی تو ضرور منقول ہو کر مشہور ہوتا۔

سوال: تمنیٰ قلب سے ہوتی ہے کیا پتا اُنھوں نے آرزو کی ہو۔

جواب: آرزو قلب سے نہیں ہوتی بلکہ زبان سے ہوتی ہے۔ جیسے کوئی آرزو کرتے ہُوئے کہتا ہے: لَيْتَ لِیْ كَذَا۔

حکایت: حضرت نافع فرماتے ہیں کہ ہم ایک یہودی کے پاس بیٹھے تھے وہ ہمارے ساتھ جھگڑ رہا تھا کہ تمہاری

کتاب میں فَتَمَنَّوُ الْمَوْتَ ہے اور میں موت کی آرزو کرتا ہوں لیکن مجھ پر موت واقع نہیں ہوگی۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے سُنا تو گھر میں داخل ہو کر تلوار لٹکائے ہُوئے باہر آئے تو یہودی فوراً بھاگ گیا۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا اگر میرے آنے تک ٹھہرتا تو اُس کی گردن ضرور اڑاتا۔ کیونکہ یہ جاہل خیال رکھتا ہے کہ یہ حکم یہود کے لیے ہر آن کے لیے ہرگز نہیں وہ تو صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو اس وقت قرآن پاک کی مخالفت اور نبوت کا انکار کرتے تھے جبکہ انھیں نہیں تھا۔

سوال ، مومن بھی تو یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ جنّت کا سوائے اُن کے کوئی مستحق نہیں لیکن اُن یہود سے ایسی آرزو کسی سے منقول نہیں۔ پھر یہود پر یہ حجّت قایم کرنا کیسا ؟

جواب (۱)، مومنین یہ دعویٰ نہیں رکھتے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑے فضل و شرف اور مرتبہ والے ہیں جیسا کہ یہود کا اپنے لیے دعویٰ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ابناء اور احبّاء ہیں اور جنّت صرف ہمارے لیے ہی ہے اور انسان جس سے محبت رکھتا ہے اس سے ملنے سے کراہت نہیں کرتا اور نہ ہی اُس کے انتقام سے خوف رکھتا ہے بلکہ وُہ تو اپنے محبوب تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس جب کہا گیا کہ اے یہود! تُم موت کی آرزو کرو۔ جب انھوں نے آرزو سے گریز کیا تو اُن کے اپنے دعوے از خود ختم ہو گئے اور اُن کا کذب ظاہر ہو گیا۔

(۲) نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے موت کی آرزو سے روکا ہے، فرمایا :

" کوئی تم میں سے دُکھ کی وجہ سے موت کی آرزو نہ کرے ، لیکن یُوں کہہ سکتا ہے اے اللہ! مجھے زندہ رکھ اگر میرے لیے زندگی بہتر ہو اور اگر میرے لیے موت بہتر ہے تو مجھے موت دے دے۔"

حضرت مقاتلؒ فرماتے ہیں : ؎

لَوْلَا بَنَاتِیْ وَ سَیِّئَاتِیْ
لَذُبْتُ شَوْقًا اِلَی الْمَمَاتِ

یعنی اگر میری لڑکیاں اور میرے گناہ نہ ہوتے تو میں موت کی ضرور آرزو کرتا۔

اسی وجہ سے جو الزام یہود پر ہوا وُہ مومنین پر نہیں آسکتا۔

مسئلہ : حضرت عبداللہ تستری قدس سرّہٗ فرماتے ہیں ، تین آدمیوں کے سوا موت کی آرزو کوئی شخص نہیں کرتا :

(۱) موت کے بعد حالات سے بے خبر۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنے والا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے دیدار کا مشتاق۔

مولانا روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :ے

شد ہوائے مرگ طوق صادقاں
کہ جہوداں را بدیں دم امتحاں

ترجمہ : موت کی آرزو سچوں کے گلے کا طوق ہے کیونکہ یہودیت کے لیے تو موت ذلت ہے۔

حکایت حضرت مولانا روم قدس سرہٗ کا جب انتقال قریب ہُوا تو حضرت ملک الموت متمثل ہو کر سامنے ہُوئے تو آپؒ نے فرمایا :ے

پیشتر آ پیشتر آ جانِ من
پیک در حضرت سلطانِ من

ترجمہ : اے میرے حبیب! آگے آئیے کیونکہ تُو تو میرے سرکار کا پیام ہے۔

حکایت ابُو حازم کو کسی بادشاہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی حاضری کیسے ہوگی۔ تو آپ نے فرمایا کہ فرماں بردار تو ایسے حاضر ہوگا جیسے کوئی غائب اپنے گھر والوں کے پاس جو اُس کے مشتاق ہوں اور مجرم کی حاضری ایسے ہوگی جیسے بھاگا ہُوا نوکر اپنے غصہ ور مالک کے پاس لوٹے ے

۱ انبیاء را تنگ آمد ایں جہاں
چوں شہاں رفتند اندر لامکاں

۲ چوں مراسوئے اجل عشق و ہواست
نہی لا تلقوا باید یکم مراست

۳ زانکہ نہی از دانہ شیریں بود
تلخ را خود نہی حاجت کے شود

ترجمہ :۱۔ انبیاء علیہم السلام کو یہ جہان تنگ نظر آتا تھا بادشاہوں کی طرح لامکان کو تشریف لے گئے۔
۲۔ چونکہ ہماری خواہش و تمنا موت کی ہے اسی لیے ہمیں لاتلقوا (ہلاکت کی طرف ہاتھ نہ بڑھاؤ) کا حکم ہے۔
۳۔ اس لیے کہ میٹھے میوے سے ہی روکا جاتا ہے کڑوے پھل کی رکاوٹ کی ضرورت ہی نہیں۔

ف : موت ایک مصیبت عظمیٰ اور بڑی آزمایش کا نام ہے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اُس سے غفلت کی جائے اور اس کے ذکر سے اعراض کیا جائے اور اس کے بارے میں کوئی فکر بھی نہ ہو۔ اس کے لیے کوئی عمل بھی نہ ہو۔ صرف اسی کے متعلق بڑی عبرت نصیب ہو۔ اگر کوئی عبرت کرے تو اس میں فکر کیا جائے تو بہت کچھ نصیب ہوتا ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ "موت ہی بڑا واعظ ہے اور موت کے ذکر سے لذتِ نفسانیہ کا قلع قمع

ہوتا ہے اور مستقبل کی آرزو ختم ہو جاتی ہے ، پھر جتنی بھی دنیاوی تمنائیں ہوتی ہیں سب مٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اگرچہ غافل دل بہت بڑے واعظ کی محتاج ہیں اور اُن کے لیے کچھ الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اَکْثِرُوْا ذِکْرَھَاذِمِ اللَّذّاتِ (لذتوں کو مٹانے والی موت کو زیادہ یاد کرو) اور کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ (ہر جی موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے) جیسے ارشادات سمجھ دار کے لیے کافی ہیں۔

سبق دانا کو ضروری ہے کہ مرنے سے پہلے ہی اپنی تیاری کرلے نہ کہ اس وقت جبکہ موت سر پر آجائے۔ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے : ؎

اے برادر چو عاقبت خاکست[1]
خاک شو پیش ازانکہ خاک شوی

دُعا : اے اللہ ! ہمارا راستہ آسان فرما۔ آمین !

وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ ولتجدنّ وجدان عقل سے ہے اور وُہ علم کے قائم مقام ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وجدان تجربہ وغیرہ کے بعد استعمال ہوتا ہے۔ لام قسم کی ہے اصل عبارت یُوں تھی : وَاللّٰہِ لَتَجِدَنَّ الْیَھُوْدَ الخ اے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ! آپ یہود کو لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے عَلٰی حَیٰوۃٍ ج وہ موت کی آرزو ہرگز نہیں کریں گے اور حَیٰوۃ کی تنکیر نوعی ہے اور اس حیٰوۃ سے حیٰوۃ متاذولہ مراد ہے اور یہ حیاۃ وہ ہے جس میں لوگ بسر کر رہے ہیں کیونکہ وہ بھی مطلق الحیاۃ کی ایک نوع ہے وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا ج معنوی لحاظ سے ماقبل پر عطف ہے گویا یُوں کہا گیا ہے : اَحْرَصُ مِنَ النَّاسِ۔

سوال : جب مشرکین بھی ناس کے افراد میں سے ہیں تو پھر انھیں علیحدہ کیوں ذکر کیا گیا ہے۔

جواب : (۱) مشرکین سب سے زیادہ حیاۃ ظاہری کے حریص ہیں۔

(۲) یہودیوں کو توبیخ بھی ہے کہ مشرکین اگرچہ حیٰوۃ ظاہری کے حریص ہیں تو ہوں کیونکہ ان کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ مرنا تو ہے ہی نہیں اور ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور یہ حیات ان کے لیے جنّت ہے اس لیے ان کا حریص ہونا بجا ہے لیکن اہلِ کتاب کے حریص ہونے سے تعجب ہے کہ ان کے پاس کتاب ہے جس میں مرقوم ہے کہ یہ حیٰوۃ عارضی ہے۔

سوال : پھر یہودیوں کو مشرکین سے زیادہ حریص کہنے کا کیا معنٰی ؟

جواب : مشرکین کا تو حریص ہونا بجا ہے کہ وُہ جاہل ہیں اور یہ یہود عالم ہونے کے باوجود حیات کے لیے حرص کرتے ہیں فلہٰذا یہ اُن سے زیادہ حریص ہُوئے۔

یَوَدُّ اَحَدُھُمْ ان کی حرص کا بیان ہے اور جملہ مستانفہ ہے یعنی ان مشرکین میں سے ایک فرد آرزو رکھتا ہے لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ ج کاش ہزار سال عمر دیا جائے۔ یہ اُن کی آرزو کی حکایت ہے۔ اگر یہ

---

[1] اے بھائی ! جب انجام خاک ہے اس سے پہلے خاک ہوجا جبکہ تجھے خاک میں جانا ہے۔

جملہ تمنائیہ ہوتا تو عبارت یُوں ہوتی : لَوْ اُعَمِّرَ الخ لیکن غائب کا صیغہ لایا گیا ہے یَوَدُّ اَحَدُهُمْ کی وجہ سے جیسے کہا جاتا ہے حَلَفَ بِاللّٰهِ لیفعلن - یہ جملہ محلاً منصوب ہے کہ یود کا معمول ہے - قَالَ یَقُوْلُ کے باب کا قانون جاری کیا گیا اس لیے کہ یَوَدُّ قلبی فعل ہے - اب مطلب یہ ہوا کہ وُہ مشرکین ہزار سال زندہ اور باقی رہنے کی آرزو کرتے ہیں - یہ دراصل مجوس سے خاص ہے -

سوال : ہزار سال کی حد بندی کیوں، حالانکہ وہ دائمی بقا چاہتے تھے -

جواب : یہ ان کے اپنے قول کے مطابق ہے کہ جب ان میں سے کسی کو چھینک آتی تو دوسرا اسے دُعا دیتے ہُوئے یُوں کہتا : عِشْ اَلْفَ سَنَةٍ (تو ہزار سال زندہ رہ) اور علیک سلیک کے وقت بھی یونہی کہتے یا یُوں کہتے : عِش الف نوروز و الف مہرجان - جس کا فارسی میں ترجمہ ہوگا : زی ہزار سال (ہزار سال تک زندہ رہ)

سوال : مجوسیوں کو مشرک کیوں کہا جاتا ہے ؟

جواب : مجوس دو خداؤں کے قائل تھے خالق نور اللہ اور خالق ظلمۃ اہرمن -

وَمَا هُوَ اہلِ حجاز کے قانون پر مشبہ بلیس ہے اس کا اسم هُوَ ہے یعنی کوئی ایک ان میں بِمُزَحْزِحِهٖ لفظ ما کی خبر ہے اور بأ زائدہ ہے اور زَحْزَحَ یعنی بعید کرنا - یعنی اسے بچانے والا نہیں مِنَ الْعَذَابِ عذاب سے اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ یہ کہ اسے عمر دی جائے - یہ جملہ مُزَحْزِحِهٖ کا فاعل ہے - وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ۝ اور اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال کو دیکھتا ہے - بصیر وُہ ہے جو شے کی کنہ کو جانے اور خبیر وہ ہے جو شے کی کنہ سے باخبر ہو - یعنی اللہ تعالیٰ اُن کے گناہوں کی کنہ کو جانتا ہے، اس سے کوئی شے مخفی نہیں - دنیا میں ان کو رسوائی اور ذلت کی سزا دے گا اور آخرت میں انہیں سخت سزا میں مبتلا کرے گا - اور یہ حیاۃ چند دنوں کے بعد ختم ہو جائے گی خواہ کوئی ہزار سال یا اس سے زاید عمر گزارے -

مسئلہ : جو بڑی عمر صرف اس لیے چاہے کہ اس میں نیکی ہی کرتا رہے تو وہ کامیاب لوگوں میں سے ہے -

حدیث شریف میں ہے :

طُوْبٰی لِمَنْ طَالَ عُمْرُهٗ اَحْسَنَ عَمَلُهٗ -

(مبارک ہو اس بندے کو جس کی عمر لمبی اور عمل نیک ہوں)

مسئلہ : جو لمبی عمر صرف گناہوں کے لیے چاہے اس جیسا بدبخت کوئی اور نہ ہوگا - موت سے ڈرنے سے کیا فائدہ آخر اس نے ایک دن آکر ہی رہنا ہے -

مسئلہ : تمام اُمت کا اتفاق ہے کہ موت کا کوئی سن مقرر نہیں، نہ ہی میعاد متعین ہے، نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مرض میں موت ہے اور فلاں میں نہیں - یہ صرف اس لیے کہ مرد اس کی تیاری میں ہر وقت مستعد رہے -

حکایت ایک بزرگ ہمیشہ شہر کے قلعہ کے اردگرد چکر لگا کر کہتے تھے ، الرحیل الرحیل (لوگو ! موت کی تیاری کرلو) جب وہ فوت ہوگئے تو اس شہر کے امیر نے پوچھا اب اس بندۂ خدا کی آواز نہیں آتی - لوگوں نے کہا : وہ فوت ہوگئے ہیں - امیر نے کہا : ؎

۱ ما زال یھیج بالرحیل و ذکرہٗ
حتی اناخ ببابہ الجمال

۲ فاصابہ متقظا متشمّرًا
فارھبۃ لم تلھہ الآمال

ترجمہ : وُہ بزرگ ہمیشہ کوچ کا اعلان کیا کرتے تھے آخر موت نے ان کے دروازے پر اونٹ لاکر بٹھا دیا۔ موت نے ان کو بیدار اور جانے کے لیے بالکل تیار پایا کیونکہ انہوں نے پہلے ہی سے رختِ سفر باندھ رکھا تھا ۔ انہیں دنیا کی آرزوؤں نے غافل نہیں کیا تھا۔

؎

۱ بانگِ طبلت نمی کند بیدار
تو مگر مردہ نہ درخوابی

۲ تو چراغے نہادہ در راہ باد
خانہ در ممر سیلابی

ترجمہ :۱۔ تجھے نقارہ کی آواز بیدار نہیں کرتی تُو خواب میں نہیں بلکہ مُردہ ہے ۔
۲۔ تُو نے ہوا کے راستہ پر چراغ رکھا ہوا ہے اور تیرا گھر سیلاب کی گزرگاہ میں ہے۔

سبق موت کا آنا حق ہے اگرچہ طویل عمر ہی کیوں نہ گزرے آخر کار وہ آکر ہی رہے گی، کوئی اسے چاہے یا نہ چاہے۔

حکایت شارح خطیب حضرت وہب بن منبّہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت دانیال علیہ السلام ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ آواز آئی :

یادانیال قف ترعجبا -
(اے دانیال ! ذرا ٹھہریئے ایک کرشمہ دیکھتے جائیے)

دانیالؑ نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ دوبارہ ندا آئی - دانیال کہتے ہیں میں ٹھہر گیا اور دیکھا کہ ایک گھر سے مجھے کوئی بلا رہا ہے - میں اندر گیا تو دیکھا کہ ایک چارپائی موتیوں اور یاقوت سے مرصّع ہے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

چار پائی کے اوپر سے آواز آئی ؛

اے دانیال ! آپ عجیب معاملہ دیکھنے والے ہیں۔

میں چار پائی کے اُوپر چڑھ گیا اور اس کے اوپر سنہری بستر بچھا ہوا پایا جو مُشک اور عنبر سے پُر ہے اور اس کے اوپر ایک نوجوان مرا پڑا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آرام فرما رہا ہے۔ اس کے اوپر نہایت شاندار پوشاکیں اور زیورات تھے۔ جن کا وصف بیان سے باہر ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی اور سر پر سونے کا تاج تھا اور کمر میں سبز رنگ کی ایک تلوار بندھی تھی۔ وہ کہنے لگا : "اس تلوار کو اٹھائیے اور اس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھیے۔" میں نے دیکھا کہ اس پر یہ عبارت مرقوم ہے : "یہ تلوار صمصام بن عوج بن عنق بن عاد بن ارم کی ہے"۔ پھر کہا : میں نے ایک ہزار سات سو برس کی عمر پائی اور بارہ ہزار باکرہ عورتوں سے شادی کی اور چالیس ہزار شہر بنوائے۔ افسوس ! کہ یہ زندگی ظلم و تشدد اور بے انصافی اور بے وقوفی سے گزری، میرے خزانے کی چابیاں چار سو خچر اٹھاتے اور دُنیا کے بادشاہ مجھے خراج ادا کرتے۔ اور میری شاہی میں کوئی میرا ہمسر نہ تھا۔ بنا بریں میں نے ربوبیت کا دعویٰ کر دیا۔ آج مجھے بھوک نے ستایا میں نے ایک ہزار موتی صرف جوار کے ایک دانہ کے عوض دے کر اناج طلب کیا۔ لیکن افسوس کہ آج میں بھوک سے مر گیا ہوں۔ اے دنیا والو! میری موت سے نصیحت پکڑو۔ موت کو بکثرت یاد کرو۔ کسی دھوکے میں نہ رہو میری طرح مارے جاؤ گے۔ اب میرے اقارب میرے گناہوں کی ڈھال نہیں بن سکے۔

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا : ؎

۱   چوں ہمہ نیک و بد ببایدمرد
خنک آنکس کہ گوئی نیک برد

۲   برگ عیشے بگور خویش فرست
کس نیارد از پیش فرست

ترجمہ :(۱) جب تمام نیک اور بُر وں نے مرنا ہے اسے مبارک جو نیکی کی گیند لے گیا۔
(۲) عیش کا سامان اپنی قبر میں بھیج تیرے پیچھے اور کوئی نہ لائے گا تو اپنا سامان خود بھیج۔

غافل قلوب کا علاج پانچ باتوں سے ہوتا ہے ؛
(۱) وعظ و نصیحت
(۲) تخویف
(۳) ترغیب کی مجالس میں بیٹھنا، اولیاءُ اللہ کے واقعات سننا۔ ان طریق سے دل نرم پڑ جاتے ہیں اور شاغل الی اللہ ہو جاتے ہیں۔

(باقی ص ۴۲۰ پر)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَ
مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا
الْفٰسِقُوْنَ ○ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○
وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا
الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ
السِّحْرَ ۤ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ
حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ
الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا
يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۫ وَ
لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ ع

ترجمہ: تم فرماؤ جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو اس (جبریل) نے تو تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے یہ قرآن
اتارا اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا ہے مسلمانوں کو ہدایت اور بشارت دیتا ہے جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں
اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہو تو اللہ دشمن ہے کافروں کا اور بے شک ہم نے
تمہاری طرف روشن آیات اتاریں اور ان کے منکر نہ ہوں گے مگر فاسق لوگ اور کیا جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں
ان میں ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے بلکہ ان کے بہتیرے مومن ہیں اور جب ان کے پاس اللہ سے
ایک رسول تشریف لایا ان کی کتابوں کی تصدیق فرماتا ہے تو اہل کتاب سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب
اپنی پیٹھ پیچھے پھینک دی گویا وہ کچھ علم ہی نہیں رکھتے اور اس کے تابعدار ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے
سلیمان کی شاہی کے زمانہ میں اور سلیمان نے کفر نہ کیا ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں
اور وہ جادو جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اترا اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے تھے
جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو سراسر آزمائش ہیں تو اپنا ایمان ضائع نہ کرو تو ان سے سیکھتے وہ جس سے

جدائی ڈالیں مرد اور اس کی عورت میں اور اس سے ضرر نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے اور وہ سیکھتے ہیں جو انھیں نقصان دے گا نفع نہ دے گا اور بیشک ضرور انھیں معلوم ہے کہ جس نے یہ سودا لیا آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں اور بیشک کیا بُری شے ہے وُہ جس کے عوض انہوں نے اپنی جانیں بیچیں کسی طرح انہیں علم ہوتا اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے ہاں ثواب بہت اچھا ہے کسی طرح انہیں علم ہوتا۔

(صفحہ ۴۱۸ سے آگے)

(۴) موت کو بکثرت یاد کرنا کیونکہ اس سے نفس کی خواہشات مٹتی ہیں اس لیے موت کا کام بھی ہے کہ جماعتوں کو منتشر کرتی ہے اور بچوں بچیوں کو یتیم کرتی ہے۔

(۵) جس کو سکرات جاری ہو اُس کو دیکھنا۔ کیونکہ موت والے اور اس کی سکرات پر نگاہ ڈالنا نفس کی لذتوں کو ختم کرتا ہے اور دل کی خوشیوں کو بھگاتا ہے اور نیند کو دفع کرتا ہے اور خوشی کو دور کرتا ہے، نیک عمل کے لیے برانگیختہ کرتا ہے اور موت کے لیے تیار رہتا ہے کیونکہ یہ کیفیت بھی کچھ ایسی ہے۔

حکایت حضرت کعب سے پُوچھا گیا کہ آپ موت کی کیفیت بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ موت ایسے ہے جیسے کانٹا انسان کے پیٹ میں دیا جائے۔ پھر ہر کانٹے کے ساتھ ایک ایک کر کے آنتوں کو اس طرح نکالا جائے کہ انہیں سختی سے ایک بڑے زور والا آدمی کھینچے۔ اب خود اندازہ لگائیے کہ انسان کی اس وقت حالت کیا ہوگی۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر میت کا درد صرف بال برابر اہل السمٰوٰت والارض پر رکھا جائے تو اس کی سختی سے سب مرجائیں۔ قیامت میں ستّر قسم کے درد ہوں گے ان میں سب سے معمولی کی یہ کیفیت ہے کہ سکرات موت کے درد سے ستّر گنا زیادہ ہوں گے۔

(تفسیر آیاتِ صفحہ گزشتہ)

تفسیر عالمانہ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ **شانِ نزول**: جب سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ابن صوریا یہودی نے (جو فدک میں رہتا تھا) حاضر ہو کر عرض کی: "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی نیند کیسی ہے کیونکہ ہمیں علم دیا گیا ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند یُوں ہوگی کہ آپ نے فرمایا: "میری آنکھیں نیند کرتی ہیں لیکن دل بیدار رہتا ہے۔" اس نے کہا "صَدَقْتَ۔" پھر پُوچھا: "فرمائیے بچہ باپ سے ہوتا ہے یا ماں سے۔" تو آپ نے فرمایا: "ہڈیاں، عصب، عروق باپ سے ہوتے ہیں اور خون، گوشت، ناخن، بال ماں سے ہوتے ہیں۔" اس نے کہا: "صَدَقْتَ۔"

پھر پُوچھا: کیا وجہ ہے کہ بچّہ کبھی اپنے چچاؤں کے مشابہ ہوتا ہے جس میں اخوال (ماموں) کی کوئی علامت بھی اس میں نہیں ہوتی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں ماموں کی مشابہت تو ہوتی ہے لیکن چچا صاحبان کی کوئی ایک علامت بھی نہیں ہوتی۔" آپؐ نے فرمایا: جس کا پانی غالب ہوگیا اسی سے مشابہت ہوگی۔" اس نے کہا: "صَدَقْتَ۔" اور اس طعام کے متعلق پُوچھا جو حضرت یعقوب علیہ السّلام نے اپنے لیے حرام قرار دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام سخت بیمار ہوئے تو آپ نے منت مانی کہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ شفا دے تو میں اپنے لیے اپنا محبوب ترین طعام (اونٹ کا گوشت) اور محبوب ترین مشروب (اونٹنی کا دُودھ) حرام قرار دُوں گا۔ اُس نے کہا: "صَدَقْتَ یَا مُحَمَّدُ۔" پھر پُوچھا کہ بہشت میں سب سے پہلے کون سا طعام ملے گا؟" آپؐ نے فرمایا: "مچھلی۔" اُس نے کہا: "صَدَقْتَ۔" اس نے کہا: "باقی صرف ایک سوال رہ گیا ہے اگر آپؐ نے اس کا صحیح جواب دے دیا تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا اور آپ کی فرماں برداری بھی کروں گا۔ وُہ یہ کہ آپ کے پاس کون سا فرشتہ آتا ہے جو کہ عرض کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "وُہ جبریل علیہ السّلام ہیں"۔ اُس نے کہا: وہ تو ہمارا دشمن ہے کیونکہ عذاب کا فرشتہ ہے جو قتال و عذاب اور کشتیوں کے ٹوٹنے اور تکالیف کے احکام نازل کرتا ہے ہمارے احکام لانے والا فرشتہ تو حضرت میکائیل علیہ السلام ہے کیونکہ وہ رحمت کا فرشتہ ہے جو برسات اور خوشخبریاں اور فراخیِ رزق کے احکام نازل فرماتا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

کب سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تمہارے ساتھ عداوت شروع ہوئی۔

اس نے کہا: اس نے تو کئی بار ہمارے ساتھ دشمنی کی اور ہم سے سخت عداوت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہمارے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم سنایا کہ بیت المقدس ایک مرد کے زمانہ میں خراب ہوگا جس کا نام بخت نصر ہے۔ پھر جب اس کی خرابی کا وقت آیا تب بھی ہمیں بتایا جب اس نے اس خرابی کی خبر دی تو ہم نے اپنے بنی اسرائیل میں سے ایک بہادر آدمی اس کی طلب میں بھیجا تو وہ اس کی طلب میں بابل پہنچا تو وہاں ایک لڑکا پایا جو نہایت کمزور تھا اس نے اسے پکڑ کر مارنے کا ارادہ کیا تو اسے جبریل علیہ السلام نے روکا اور کہا اگر اس کریم نے اسی کو تمہاری ہلاکت کے لیے مسلّط کیا ہے تو تم اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے اور اگر وہ یہ نہیں ہے تو پھر بلاوجہ کیوں مارتے ہو۔ تو ہمارے فرستادہ اس بات کو مان کر واپس آئے اور بخت نصر جوان ہوا اور بادشاہ بن کر ہمارے ساتھ لڑا اور بیت المقدس کو خراب کر ڈالا اور ہمارا قتال کیا۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نبوت کے لیے حکم فرمایا کہ بنی اسرائیل کو دے تو اس نے ہماری بجائے کسی اور کو دے دی۔ اس وجہ سے ہم اسے دشمن سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں میکائیل علیہ السلام بھی اس کے دشمن ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسے تم کہتے ہو ایسے نہیں ہے وہ تو ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ تم حمیر سے زیادہ کافر ہو اور ایک اگر دوسرے کا دشمن ہے تو دوسرا ضرور اس کا دشمن ہوگا۔ اور جو ان دونوں کا دشمن ہے وہ اللہ تعالےٰ کا

دشمن ہے اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

مَنْ کَانَ الخ میں مَنْ کا جواب محذوف ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی:

ای من عادی جبریل من اھل الکتب الخ یعنی جو اہلِ کتاب یہودیوں سے حضرت جبریلؑ کا دشمن ہے تو اس کی دشمنی کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ اس کی محبت واجب ہے۔

فَاِنَّهٗ پس جبریل علیہ السلام نے نَزَّلَهٗ قرآن کو نازل کیا۔ قرآن کو مضمر کرکے بیان کیا اس کی کمال شہرت کی وجہ سے عَلٰی قَلْبِكَ تمہارے دل پر۔ تنزیل کی زیادہ تقریر اور محلِ وحی کا بیان ہے کیونکہ وہ وحی کا سب سے پہلے قبول کرنے والا ہے اور حفظ و فہم کا مرکز ہے یعنی اس نے آپ کو یاد کرکے سنایا اور سمجھایا کہ کلام کا حق یہ ہے کہ عَلٰی قَلْبِكَ کے بجائے عَلٰی قلبی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکایتِ کلام واقع ہوا تو وہ جس طرح کلام کرے گا ویسے ہی بیان ہوگا کیونکہ نقل میں عبارت کا بعینہٖ آنا مضمون میں زیادتی کا موجب ہوتا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ کَمَا تَکَلَّمْتُ الخ یعنی آپ وہ بیان فرمائیے جو میں نے اپنے کلام میں فرمایا ہے کہ اس نے آپ کے قلبِ انور پر اتارا بِاِذْنِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے امر و تیسیر سے مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ جو کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے نازل ہوئیں اُن کے موافق ہے، توحید اور بعض شرائع کے بیان میں یہ نَزَّلَهٗ کی ضمیر مفعول سے حال ہے وَهُدًی دینِ حق کی طرف ہادی ہے وَّبُشْرٰی اور جنت کی خوشخبری دینے والا ہے لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ اہلِ ایمان کے لیے۔ اس بنا پر اس کی دشمنی کی کوئی وجہ نہیں بلکہ اگر انصاف کریں تو اسے محبوب سمجھیں بلکہ اس انزالِ کتب سے (جو ان کے لیے نفع بخش اور ان کے نازل شدہ احکام کا مصحح ہے) کا شکریہ ادا کریں۔ بعد ازاں شرط و جزاء کی تعمیم سے تردید فرمائی کہ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ جو اللہ کے امر کا بوجہ عناد کے مخالف اور بوجہ مکابرہ کے اس کی طاعت سے خارج ہے۔ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکٰلَ ان دونوں کو علیحدہ ان کے فضلِ شان کے اظہار کی وجہ سے بیان فرمایا گویا وہ کسی اور جنس سے ہیں جو دوسرے ملائکہ سے افضل ہیں کبھی تغایر فی الاوصاف تغایر فی الجنس کا سبب بن جاتا ہے۔ یہاں بھی ایسے ہی ہے۔

ف: حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ جبر و میک و اسراف سریانی لغت میں بمعنے عبد ہیں اور ایل اور آئیل اللہ تعالیٰ کو کہتے ہیں۔ اب معنیٰ ہوا: عبد اللہ یا عبد الرحمٰن۔

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْکٰفِرِیْنَ ۝ شرط کا جواب ہے اور فَاِنَّهٗ نہیں فرمایا تاکہ اس ضمیر کے متعلق وہم نہ ہو کہ اس کا مرجع جبریل و میکائیل ہیں للکفرین یعنی اللہ تعالیٰ ان کا دشمن ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ جو ان کو دشمن رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دشمن رکھتا ہے انہیں سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابن صوریا نے کہا: آپ کون سی چیز لائے ہیں کہ جس سے ہم اسے پہچانیں۔ اور آپ کے پاس کون سی دلیل ہے کہ جس پر ہم آپ کی فرمانبرداری کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ

أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ج واضح دلیلیں جو معانی اور اس بات پر دلالت کرنے والی ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں وَمَا يَكْفُرُ بِهَا اور ان آیات کے ساتھ جو حلال و حرام کو واضح کرنے والی اور حدود و احکام کی تفصیل کرنے والی ہیں اُن سے کُفر نہیں کرتا اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝ مگر متردین فی الکفر اور خارجین عن الحدود ۔ کیونکہ جو شخص اس صفت کا نہ ہو تو وہ ان جیسے آیات کے ساتھ کفر کرنے کی جراُت نہیں کرتا ۔ اور احسن یہ ہے کہ اس لام کا اشارہ اہل کتاب کی طرف ہو۔

حضرت حسن فرماتے ہیں کہ جب فسق معاصی کے کسی نوع میں استعمال ہو تو اس کے بڑے نوع کفر وغیرہ پر واقع ہُوا کرتا ہے ۔

ف : قرآن پاک ایک نورِ الٰہی ہے ۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تاریکیوں کو دُور فرمایا ۔ یہود اسے بُجھانا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نور کو مکمل کرنے والا ہے ۔ اس میں انھیں سوائے رسوائی اور شرمساری کے کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے لوگ اندھیری رات میں حمام میں داخل ہوں اور اس میں اچھے بھی ہوں اور بُرے بھی ۔ اس کے بعد کوئی شخص روشن چراغ لے آئے تو اس کے بجھانے کے لیے سوائے اہلِ عیوب کے کوئی عجلت نہیں کرے گا اس خطرہ پر کہ ان کے عیوب ظاہر نہ ہوں اور نہ اسے خرابی کا نشانہ بننا پڑے ؎

۱ شمع درخشندہ دراں جمع نخواہند کہ تا
عیب شاں درشبِ تاریک بماند مستور

۲ وائے آں وقتیکہ روشن شود ایں راز چو روز
پردہ برخیزد ایں ببایدِ بظہور

ترجمہ : ۱ ۔ روشن شمع میں نہیں آئیں گے اس لیے کہ ان کے عیوب اندھیری رات میں پوشیدہ رہتے ہیں ۔
۲ ۔ افسوس اس وقت ہوگا جب یہ پوشیدہ رازوں کی روشنی کی طرح روشن ہوگا پردہ اٹھے گا تو یہ ظاہر ہو جائے گا ۔

اَوَ ہمزہ انکار کے لیے ہے اور باقتضائے کلام مقدر فعل پر عطف ہے یعنی اکفروا بالآیات البیّنات (کیا کفر کرتے ہیں ان آیات بیّنات کے ساتھ جو نہایت واضح ہیں كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا یہ مفعول مطلق ہے ، فعل عٰهدوا کی تاکید کے لیے واقع ہوا ہے نَبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ط انھوں نے عہد کو توڑ ڈالا۔

ف : فریق طائفہ کو کہتے ہیں جو قلیل و کثیر کو شامل ہوتا ہے ۔ نبذ کا اسناد بعض کی طرف اس لیے ہے کہ ان میں بعض نے عہد نہیں توڑا تھا۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ بلکہ ان کے اکثر تورات پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ دین میں سے کوئی شے نہیں اس لیے عہد کے توڑنے کو گناہ نہیں سمجھتے اور نہ ہی اس کی پرواہ کرتے ہیں اس میں اُن لوگوں کا ردّ ہے جو وہم کرتے ہیں کہ

عہد توڑنے والے تھوڑے تھے وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ جب اُن کے ہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اللہ کی طرف سے، جاء کے متعلق ہے مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ان کی کتاب تورات کی تصدیق فرماتے ہیں نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے کتاب کو پھینک مارا۔ کتاب سے مراد تورات ہے كِتٰبَ اللّٰهِ نبذ کا مفعول ہے یعنی وہ شے جو ان کو عطا ہوئی ہے، یعنی تورات۔ کیونکہ جب انہوں نے رسول علیہ السلام سے کفر کیا جو ان کی تورات کا مصدق ہے تو گویا انہوں نے تورات کو چھوڑا۔ باوجودیکہ اس میں موجود تھا کہ سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تشریف لائے ہیں وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ عناد کی وجہ سے تورات کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں اور انہیں اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اس کے تارک اور روگردان کی مثال اس کے ساتھ دی جو کسی چیز کو اس کی لاپرواہی کی وجہ سے اور اس سے روگردانی کرتے ہوئے پسِ پشت ڈال دیا جائے كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ جملہ حالیہ ہے یعنی اسے پسِ پشت ڈالا اُن کا یہ حال تھا کہ اُنھیں اس کے ساتھ مشابہت تھی جو نہ جانتا ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔

ف : یہود کے چار گروہ تھے: (۱) تورات پر ایمان لانے والے اور اس کے حقوق پر پابندی کرنے والے۔ جیسے مومنین اہلِ کتاب، وہ بہت تھوڑے تھے جس کا اشارہ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ میں ہوا۔

(۲) کھلم کھلا عہد کو توڑ کر متمرد اور فاسق ہوئے نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ سے یہی گروہ مراد ہے۔

(۳) کھلم کھلا عہد کو توڑا لیکن بوجہ جہالت یہی اکثر و بیشتر تھے۔

(۴) تورات پر بظاہر تو عمل کیا لیکن خفیہ طور پر عہد توڑتے رہے، اپنے کو متجاہل کہتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو شخص جاہلوں جیسا عمل کرے اور باوجود جاننے کے عمداً خلاف کرے تو اُسے بھی جاہلوں میں سے سمجھا جاتا ہے۔ یہی اور جاہل رتبہ میں برابر ہیں۔ جیسے جاہل سے نیکی کا ظہور مشکل ہے اسی طرح عالمِ بے عمل سے بھی خیر کی اُمید نہیں کرنا چاہیے۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں زبانی واعظ کا کلام ضائع ہے اور قلبی واعظ کا تیر چلنے والا ہے۔ پہلے سے مراد عالم بے عمل ہے اور دوسرے سے مراد وہ عالم باعمل ہے کہ جس کا کلام دل پر اثر کرتا ہے اور اس کی بات حکمت و عبرت و فکر انگیز ہوتی ہے۔ عاقل کے لیے ضروری ہے کہ ذوالجلال کی گرفت کے خوف سے فرمانبرداری کی طرف جلدی کرے۔

ف : ندامت چار قسم ہے :

(۱) ندامت یومی، یعنی وہ شخص گھر سے بغیر کھائے پیئے نکلے۔

(۲) ندامت سال بھر، یعنی وہ شخص جو موقع پر کھیتی نہ کر سکے۔

(۳) ندامت عمر بھر، یعنی وہ شخص جو اپنی غیر موافق عورت سے بیاہ کرے۔

(۴) ندامت ابدی، یعنی وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے فرمان پر نہ چلے۔

ف : تریاقِ ظاہر کا کتاب سے مطالعہ کرنا باطل کی زہر کو دُور نہیں کرتا، بلکہ اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص بیمار ہو اور طب کی کتابوں کو صرف دیکھتا رہے تو بیکار ہے جب تک علاج نہ کرے گا۔ ادویہ کا محض دیکھنا کسی کام کا نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا۔ یعنی اُس کے اوامر پر عمل فرماتے اور اس کے نواہی سے بچتے۔

ف : علومِ ظاہری پر عمل کرنا ناممکن ہے جب تک چار مراتب حاصل نہ ہوں۔ مثلاً علمِ ظاہری سے یہ جانے کہ زانی کا حکم رجم و جلاوطنی ہے۔ لیکن بایں معنی کہ جو انسان کے اندر ایک ایسی فطرت بھی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جماع، زنا میں مشغول ہو دانا لوگ سرے سے اس بُری خصلت کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح کھانے پینے کے متعلق سمجھے کہ انسان میں کھانے پینے کا بھی ایک محل ہے سمجھدار آدمی اس محل پر قابو پاتا ہے جس سے اسے خواہشات پریشان نہیں کرتیں۔ انسان کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو اور ماہر فی الفنون ہو، سب کچھ ہو لیکن جب تک اپنے علم پر عمل نہ کرے اس سے اس کا جہل بہتر ہے کسی نے کیا خُوب کہا :

حَفِظْتَ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ اَشْيَاءَ۔

(تُو نے ایک شے کو تو قابو کر لیا لیکن بہت سی تجھ سے نکل گئیں)

حکایت نصیر الدین طُوسی کسی ولی اللہ کی خدمت میں زیارت کے لیے حاضر ہوا، ان کی خدمت میں عرض کیا گیا : یہ بہت بڑے عالم ہیں جن کا نام نصیر الدین طوسی ہے۔ ولی اللہ نے پُوچھا : ان کا کیا کمال ہے ؟ لوگوں نے کہا : نجوم میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ ولی اللہ نے فرمایا : سفید گدھا اس سے زیادہ عالم ہے۔ طوسی سُن کر لوٹ آیا۔ اُن کی مجلس میں بیٹھنا بھی گوارا نہ کیا۔ آیندہ شب آٹے کی چکی کے دروازے پر شب باشی کا اتفاق ہُوا تو آٹا پیسنے والے نے کہا : مولانا ! گھر کے اندر تشریف لائیے اگر آپ نے دروازہ بند نہ کیا تو آپ کو برسات گھیر لے گی۔ مولانا نے اس سے پُوچھا : بھائی ! تجھے کیسے معلوم ہوا ہے ؟ اس نے کہا : میرا ایک سفید گدھا ہے جب وہ اپنی دُم آسمان کی طرف تین بار ہلاتا ہے تو بارش نہیں ہوتی اور جب زمین کی طرف ہلاتا ہے تو بارش ہو جاتی ہے۔ جب طوسی نے سُنا تو اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہُوئے ولی اللہ کی تصدیق کی اور ان کے متعلق رنج و غصہ زایل ہو گیا۔

حکایت ایک ولی اللہ نے ابنِ سینا سے فرمایا : تُو نے اپنی عمر علومِ عقلیہ میں ضائع کر دی بتائیے تو اس وقت تک کس مرتبہ کو پہنچا ہے ؟ اس نے کہا : ہاں مجھے ایک گھڑی معلوم ہُوئی ہے جس میں لوہا مٹی ہو جاتا ہے۔ ولی اللہ نے فرمایا : اس گھڑی کے متعلق مجھے بتائیے۔ جب وہ وقت آیا تو خبر دیتے ہُوئے لوہے میں انگلی دبا دی۔ انگلی اس کے اندر دھنس گئی۔ وہ گھڑی گزرنے کے بعد ولی اللہ نے فرمایا : اب بھی انگلی لوہے کے اندر دبائی جا سکتی ہے ؟ اس نے کہا : نہیں، کیونکہ وہ اس گھڑی کی خصوصیات سے ہے اب تو کوئی امکان نہیں۔ ولی اللہ نے لوہا پکڑا اور اپنی انگلی اس میں دبا دی۔

سبق عاقل کے لیے ضروری ہے کہ اپنی عمر مٹنے والی اشیاء میں ضائع نہ کرے۔ جیسا کہ ابنِ سینا نے طریقِ وصول میں استقلال العقل کا دعویٰ کیا تو وہ نار کا مستحق بنا۔

اسی طرح یہود (اللہ اُن کو رُسوا کرے) نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے رُوگردانی کی اور استقلال کا دعویٰ کیا جس کی وجہ سے نقصان وخسارہ میں پڑے اور جہل وکفر کی ظلمت میں رہے۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

۱ اے کہ اندر چشمۂ شور است جات
تو چہ دانی شط و جیحون و فرات

۲ وائے آنکہ زندہ کہ با مرہ نشست
مرہ گشت و زندگی از وے برست

ترجمہ : ۱۔ اے فلاں! چشمۂ شور میں تیری جگہ ہے تو کیا جانے کہ شط وجیحون وفرات کیا ہیں۔
۲۔ اس زندہ پر افسوس کہ مُردہ کی صحبت میں بیٹھ کر مُردہ ہوگیا اور اس سے زندگی چلی گئی۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ یہود نے کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈالا اور جادوگروں کی کتابوں کی فرمانبرداری کی جنہیں شیاطین پڑھتے اور عمل کرتے۔ شیٰطین سے مراد سرکش جن ہیں۔ تَتْلُوْا ماضی حال کی حکایت ہے اور اتباع سے مراد محل وتحفص اور اس کی طرف اچھی طرح متوجہ ہونا مراد ہے۔ **عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ** ج ان کے ملک کے زمانہ میں، یہاں پر مضاف محذوف ہے اور علیٰ بمعنے فِی ہے۔

حضرت سُدی فرماتے ہیں کہ شیاطین آسمان کی طرف چڑھ جاتے تھے تو ملائکہ کی وہ باتیں سُن لیتے جو زمین پر موت وغیرہ سے متعلق واقعات ہونے والے ہوتے۔ پھر جادوگروں کے پاس آکر سُنی ہوئی ایک ایک بات کے ساتھ ستر جھوٹ ملا لیتے اور خبر دیتے۔ ان باتوں کو لوگ لکھ لیتے۔ بنی اسرائیل میں مشہور ہوگیا کہ جنّات غیب جانتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے لوگوں کے ذریعہ وہ کتابیں جمع فرمائیں اور ایک صندوق میں بند کرکے کُرسی کے نیچے دفن کردیں۔ اور فرمایا: میں آئندہ کسی سے یہ نہ سُننے پاؤں کہ جنّات غیب جانتے ہیں۔ جو یہ کہے گا اس کی گردن ماردُوں گا۔ پھر جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہوگیا اور دیگر متعدد علماء بھی خدا کو پیارے ہو گئے جو سلیمان علیہ السلام کے فرمان اور کتابوں کے دفن کے مقام کو جانتے تھے۔ صرف نا اہل لوگ باقی رہ گئے تو شیطان بصورتِ انسان ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ کیا میں تمہیں ایسے خزانے کی نشان دہی نہ کروں جو تم ہمیشہ کھاتے رہو تب بھی ختم نہ ہو؟ اُنھوں نے کہا: ضرور، ہمیں اور کیا چاہیئے۔ اس نے کہا، کرسی کے نیچے سے کھودو۔ وہ خود بھی ساتھ تھا انھیں وہ جگہ دکھادی اور خود دُور کھڑا رہا۔ اُنھوں نے کہا: آپ بھی ہمارے قریب آجائیے۔ اس نے کہا، نہیں، میں یہیں ٹھہرتا ہوں اور تم گڑھا کھودو اگر وہ خزانہ نہ ملے تو بیشک میرا سرتن سے جُدا کردینا۔ اُس کے خود قریب نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی شیطان اس کُرسی کے قریب ہوتا تو جل جاتا۔

چنانچہ اس کے حکم کے مطابق گڑھا کھودا گیا اور اس میں سے وہ کتابیں نکال لی گئیں۔ شیطان نے کہا: سلیمان علیہ السلام جن وانس وشیطان وپرندوں کو انہی کتابوں کے ذریعے قابو کر لیتے تھے۔ بعدازاں یہ بات کہہ کر شیطان اڑ گیا اور لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ سلیمان علیہ السلام جادوگر تھے۔
بنی اسرائیل نے یہ کتابیں لے لیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں میں اکثر جادو پایا جاتا ہے۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی برأت فرمائی:
اتبعوا ما تتلوا الشیٰطین علیٰ ملک سلیمٰن ج
وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ سلیمان علیہ السلام سحر کے علم سے کافر نہیں تھے یعنی وہ ساحر نہیں تھے، ساحر کافر ہوتا ہے۔ جادو کو تاکیداً کفر کرنے کی وجہ یہی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نہایت پاکیزہ انسان تھے انہیں کفر سے کیا واسطہ! یہ سب کذب بیانی یہود کی ہے۔ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا لیکن شیاطین جادو کے استعمال اور اس کی تعلیم وتدوین کی وجہ سے کافر ہوئے يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ انہوں نے کفر کیا اس لحاظ سے کہ وہ لوگوں کو اغوا وضلالت کے لیے سکھاتے تھے۔ مروی ہے کہ سحر شیطان کا استخراج ہے اس لیے کہ شیطان کا جوہر لطیف ہے اور فہم وذکاء دقیق وَ مَا اور سکھاتے تھے لوگوں کو وہ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ دو فرشتوں پر نازل کیا گیا۔ یعنی جو انہیں الہام سے معلوم ہوا یعنی علم سحر۔ وہ دونوں لوگوں کے امتحان کے لیے اتر کر جادو سکھانے آئے جو بھی اسے سیکھتا اور عمل کرتا تو وہ کافر ہو جاتا۔ اور جو اس کو سیکھ کر کنارہ کش ہوتا یا سیکھ تو لیتا اور اس پر عمل پیرا نہ ہوتا اور اس سے بچتا تو وہ مومن ہوتا ع

عَرَفْتُ الشَّرَّ لَا لِلشَّرِّ وَ لٰكِنْ لِلتَّوَقِّيَةِ
(میں شر کو شر کی خاطر نہیں بلکہ بچاؤ کی خاطر سیکھتا ہوں)

مسئلہ: اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کاہن کے پاس آئے صرف بطور امتحان اس سے سوال کرے تاکہ اس کے متعلق معلومات حاصل کر کے صدق وکذب کی تہ تک پہنچے تو یہ جائز ہے۔
ف: امام فخر الدین فرماتے ہیں کہ ان کے نازل کرنے میں ایک حکمت یہ تھی کہ جادوگر شیطان سے باتیں چرا لیتے۔ پھر جو کچھ سنتے اس میں خلط ملط کر کے لوگوں کو سناتے۔ یہ وحی نازل علی الانبیاء پر اشتباہ کا سبب بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دو فرشتوں کو نازل کیا تاکہ لوگوں کو جادو کی کیفیات سکھائیں تاکہ انہیں جادو اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں فرق معلوم ہو۔
بِبَابِلَ باء بمعنی فی ہے اُنْزِلَ کے ساتھ یا محذوف سے متعلق ہے مَلَكَيْن سے حال ہے اس بابل سے مراد عراق یا بابل ارض کوفہ مراد ہے۔ اس کا غیر منصرف ہونا عجمیت اور علمیت کی وجہ سے ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ میں قول حسن یہ ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام جودی پہاڑ سے نیچے اترے تو آپ نے ایک گاؤں

تیار کرایا جس کا نام ثمانین رکھا۔ ایک دن اُٹھے تو ان کی اسّی بولیاں ہوگئیں۔ اُن میں سے ایک لغت عربی تھی اور وہ ایک دوسرے کی بولی نہ سمجھتے تھے (کذا فی القرطبی) گویا یہ تَبَلْبُل بمعنے مختلف ہونا ہے۔ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ مَلَکَین سے عطف بیان ہے۔ یہ ان دونوں فرشتوں کا نام ہے اور اُن کا منع صرف ہونا عُجمیت اور علمیت کی وجہ سے ہے ہاروت و ماروت کے متعلق بہترین توضیح اُن کے متعلق جو مشہور ہے کہ (معاذ اللہ) انہوں نے شراب پی اور خونریزی کی اور زنا کیا اور ایک شخص کو قتل کیا اور بُت کو بھی سجدہ کیا۔ یہ بات قابلِ اعتماد نہیں کیونکہ اس کا دارو مدار یہود کی روایت پر ہے۔ علاوہ ازیں دلائلِ عقلیہ و نقلیہ کے بھی خلاف ہے۔

تفسیر صوفیانہ یہ مقولہ امثال و رموز سے ہے جس میں دانا اور سمجھدار کے لیے ارشاد کی خاطر ترغیب و ترتیب کی گئی ہے اس لیے کہ مَلَکَین سے عقل نظری اور علمی مراد ہے اور زہرہ عورت سے نفس ناطقہ مراد ہے۔ نشاۃِ اولیٰ میں ظاہر ہے کہ یہ دونوں اس کی تعلیم کے لیے معترض ہوتے ہیں جو نشاۃِ ثانیہ میں اس کی استعداد ہے لیکن وہ نفس انہیں گناہ کی طرف رغبت دلاتا ہے اپنی اصلی عادت کے مطابق جو کہ اس کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیشہ ردی امور کی طرف جائے، اور آسمان کی طرف اُس کا اُڑ جانا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ نفس جب ان دونوں سے کچھ سیکھ لیتا ہے تو وہ ملأ الاعلیٰ کی جماعت سے مل جاتا ہے کیونکہ وہ قدوسین کے اوصاف سے موصوف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض صوفیہ کرام نے فرمایا ہے۔

ہاروت و ماروت کے متعلق صاحبِ روح البیان کا نظریہ ان مجلس کا جامع فقیر کاتب الحروف (حقی) عرض کرتا ہے کہ میں نے بڑی بڑی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے خواہ وہ صوفیہ کرام ہوں یا اہلِ شرع، سب اس بات پر متفق ہیں کہ ہاروت و ماروت کا واقعہ درست ہے۔ پھر یہ بات دور ہے کہ تمام لوگ یہود کے غلط نظریہ پر اتفاق کریں۔ ہاں میرا نظریہ اس میں یہ ہے کہ اُن سے عصیان کا وقوع ممکن ہے، اگرچہ بالتکلف ان کی فطرت میں طاعت ہے۔ جیسے انسان کی فطرۃ عصیان ہے لیکن اس سے نیکی بالتکلف ہوتی ہے دلیل اس کی یہی آیاتِ ذیل ہیں جنہیں جمہور نے بیان کیا ہے: يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (وہ رات دن اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور وہ اس سے تھکتے نہیں)

اور فرمایا:

وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔

(اور وہی عمل کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ہوا ہے)

دیکھیے اُن سے گناہ کا سرزد ہونا ممکن نہ ہوتا تو ان کی مدح کیوں ہوتی۔ مدح تو اس فعل پر ہوتی ہے جس کا کرنا ممتنع نہ ہو (کذا فی التیسیر)۔

شانِ نزول قطع نظر اس کے اس کے شانِ نزول سے بھی یُونہی معلوم ہوتا ہے ۔ چنانچہ ادریس علیہ السلام کے زمانے میں جب ملائکہ کرام نے بنی آدم پہ عار کا اظہار کیا کہ یہ لوگ گناہ زیادہ کرتے ہیں اور نیکی کم ۔ پھر ان کے درجات بھی جلد بلند ہو جاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : اگر تم ان کی جگہ ہوتے اور تمہارے اندر بھی ان کی طرح شہوات ہوتے تو تم سے بھی گناہ سرزد ہوتے ۔ فرشتوں نے کہا : نہیں یا رب ! ہرگز نہیں ۔ ہم سے ایسا ہونا غیر متوقع ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ، تم اپنے سے اپنی پسند کے دو فرشتے لو جنہیں میں زمین پہ بھیج دُوں ۔ انہوں نے ہاروت اور ماروت کو چنا ۔ یہ دونوں تمام فرشتوں سے زیادہ نیک اور عبادت گزار تھے ۔ ان دونوں کو بشری خواہش دے کر زمین پر اتارا گیا پھر ان سے وہی کچھ سرزد ہوا جو ان کے بارے میں مشہور ہے ۔ اور یہ کوئی بعید بھی نہیں ۔ ویسے فرشتوں کا زمین پر اُترنا گناہ کے لیے نہیں جب تک ان میں بشری تقاضے پیدا نہ کیے جائیں ۔ ابلیس میں شہوت کا مادہ رکھا گیا ہے اور اس کی ضروریات میں بھی ۔ لیکن اس کے باوجود اس کا ملائکہ میں شمار ہوتا ہے جیسے کہ بعض کا قول ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ شہوت اس میں اس وقت رکھی گئی جبکہ اس کا نام فرشتوں سے کاٹا گیا ۔ اسی اعتبار سے جاننا ہے کہ ہاروت اور ماروت میں زمین پر اتارتے وقت شہوت رکھی گئی ہو تا کہ ان میں ترکیبِ بشریت کا مادہ پایا جائے اور ان کا امتحان لیا جا سکے ۔

ف : آکام المرجان میں ہے اللہ تعالیٰ نے انسان ، فرشتہ اور جن میں فرق رکھا ہے صورت میں بھی اور شکل میں بھی ۔ یہاں تک کہ اگر فرشتے کو انسان کی صورت میں تبدیل کر دے تو وہ ملکیت سے خارج ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح شیطان کو انسان کی صورت میں تبدیل کر دے تو وہ شیطانیت سے خارج ہو جائے گا ۔

حکایت ہاروت اور ماروت سے جب غلطی سرزد ہوئی تو حضرت ادریس علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اُن کے متعلق سفارش کی کہ اُن کے لیے تخفیف کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ان سے پُوچھیے کہ آخرت اور دنیا کے عذاب میں سے جسے چاہیں انہیں دیا جائے ۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں دنیا کا عذاب دیا جائے کیونکہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے کم تر ہے ۔ چنانچہ اب وہ بابل کے ایک کنوئیں میں لٹکے ہوئے ہیں اور ان کو ان کے بالوں سے لٹکایا گیا اور انہیں قیامت تک ایسے ہی رکھا جائے گا ۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اس کنوئیں کو آگ سے بھر دیا گیا ہے پھر اس میں ان کو لٹکایا گیا ہے ۔

بعض کا خیال ہے کہ انھیں اُلٹا لٹکایا گیا ہے ان کی زبان اور پانی کے درمیان چار انگل کا فاصلہ ہے اس طرح وُہ پیاس کے عذاب میں مبتلا کیے گئے ہیں ۔

ف : حضرت شیخ مشہور بافتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ وُہ موم جو چربی سے تیار ہو اس کی بدبُو بہت گندی ہوتی ہے ملائکہ کو اس کی بدبُو سے سخت تکلیف پہنچتی ہے ۔ بنابریں ہاروت و ماروت کو اس بدبُو سے

عذاب دیا جاتا ہے۔ ہاں وہ موم جو شہد سے حاصل ہوتی ہے اس کی بُو اچھی ہوتی ہے۔ (کذا فی واقعات الھرائی)

حدیث شریف: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دنیا سے بچو، اللہ کی قسم وہ ہاروت و ماروت سے بھی زیادہ جادو رکھتی ہے۔"

ف: علماء فرماتے ہیں کہ دنیا شہوت اس لیے زیادہ رکھتی ہے کہ اس سے دنیوی خواہشات بڑھتی ہیں اور ان کی رغبت زیادہ ہوتی ہے اسے جمع کرنے نہ کرنے کا یہی نتیجہ ہے کہ جو اسے جمع کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت اور اس کے دیدار سے محروم ہوجاتا ہے اور جو اسے اپنے سے دُور رکھتا ہے وہ اللہ کی اطاعت اور اس کے دیدار سے سرشار رہتا ہے۔

ف: دنیا کے سحر کا معنیٰ یہ ہے کہ دُنیا کی محبّت اور اس کی لذتوں میں مبتلا ہوجانا۔ اور پھر اس کے ذریعے جھوٹی آرزوئیں سر ہوجائیں، یہاں تک کہ اس کا دل پر قبضہ ہوجائے اس لیے **حدیث شریف** میں ہے: "جب تیری کسی سے محبت ہوجاتی ہے تو پھر تُو نہ اس کے عیب کو دیکھ سکتا ہے اور نہ اس کے عیب سُن سکتا ہے۔"

ف: اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ دنیا کی محبّت میں نہ حق کا راستہ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی حق کی بات سُنی جاسکتی ہے۔ اور رہے بھی اسی طرح جب کسی کی محبّت غالب ہوجاتی ہے اور عقلی دلائل بھی اس سے منع کرنے والے نہ ہوں تو وہ حق کے سُننے سے بہرہ ہوجاتا ہے اور حق کو دیکھنے سے اندھا۔ اور اسی طرح آخرت کی باتوں سے بہرہ اور آخرت کے امور سے اندھا ہوجاتا ہے۔ کسی شے کی محبّت سے روکنے کا یہی معنیٰ ہے کہ اس کی محبّت میں مستغرق نہ ہوجاؤ۔ حضرت امیر خسرو دہلوی قدس سرّہٗ فرماتے ہیں: ؎

بر ایں مردار چندت گاہ زاری گاہ زور

چوں غلیواجی کہ شش ماہ مادہ و شش ماہ نر ست

ترجمہ: اس مردار پر کتنی مدت گزارے گا کبھی اس کے لیے زاری کرتا ہے کبھی زور لگاتا ہے جیسے چیل کہ وہ چھ ماہ نر رہتی ہے اور چھ ماہ مادہ۔

سبق: اس قصہ میں اشارہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل پر بھروسا ہو اور بس۔ اور کسی گناہ سے بچاؤ ہو تو بھی اس کی مہربانی سے ہے۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ ہمچو ہاروت و ماروت شہیر — از بطر خوردند زہر آلُود تیر

۲ اعتماد بود شان بر قدس خویش — چیست بر شیر اعتماد گاؤ میش

۳ گرچہ او با شاخ صد چارہ کند — شاخ شاخش شیر نر پارہ کند

۴ گر شود پر شاخ ہمچوں خارپشت — شیر خواہد گاؤ را ناچار مشت

ترجمہ: ۱۔ مشہور ہاروت و ماروت کی طرح انھوں نے کبر سے زہر آلود تیر کھایا۔
۲۔ انھیں اپنے تقدس پر ناز تھا، گائے کو شیر پر اعتماد کیسا۔
۳۔ اگرچہ وہ اپنی سو شاخوں سے کئی سیکڑے بھی لائے تب بھی شیر اسے پاش پاش کر دے گا۔
۴۔ بلکہ وہ سراپا سینگ بن کر بھی شیر کا مقابلہ کرے تب بھی شیر اسے دبوچ لے گا۔

تفسیر عالمانہ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ مفعول بہ ہے اور مِن زائدہ ہے۔ وہ استغراق (جوکہ اَحَدٍ سے معلوم ہو رہا ہے) تاکید کا فائدہ دے رہا ہے۔ لیکن شیاطین نے کفر کیا کہ لوگوں کو وہی باتیں سکھاتے ہیں۔ اور اکسانے کے لیے فرشتے لے آئے تاکہ لوگ سخت گمراہ ہو جائیں۔ اور وہ فرشتے بھی لوگوں کو جادو نہ سکھاتے حَتّٰى یہاں تک کہ پہلے نصیحت کرتے اور اسے عمل سے روکتے تھے يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش بن کر آئے ہیں جس نے ہم سے جادو سیکھ کر اس کی حقیقت کا اعتقاد رکھا تو وہ کافر ہو جائے گا اور جو اس پر عمل کرنے سے بچا بلکہ اسے دھوکا دہی سے بچنے کا ذریعہ سمجھا تو وہ ایمان پر باقی رہے گا۔ اَلْفِتْنَةُ آزمائش و امتحان کو کہتے ہیں۔ مثلاً اہل عرب کہتے ہیں: فَتَنْتُ الذَّهَبَ بِالنَّارِ۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب سونے کو پوری طرح پرکھ لیا جائے پھر کہا جا سکے کہ یہ کھرا ہے یا کھوٹا۔ اس فتنہ سے وہ افعال مراد ہیں جو مکروہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ یا بندوں کی طرف سے آئیں جیسے بلاء، مصیبت، قتل، عذاب وغیرہ۔ کبھی یہ فتنہ دین میں بھی ہوتا ہے، جیسے ارتداد و معاصی، اور کسی کو معاصی پر مجبور کرنا۔

سوال: فتنة واحد ہے اسے تثنیہ ہونا چاہیے کیونکہ فرشتے دو تھے۔
جواب: فِتْنَةٌ مصدر ہے اور مصدر میں تثنیہ نہیں ہوتا۔
سوال: مصدر کسی پر محمول نہیں ہوتا۔
جواب: جب مبالغہ مقصود ہو تو جائز ہے۔ یہاں مبالغہ مقصود ہے۔

فَلَا تَكْفُرْ اس کی حقیقت کا اعتقاد رکھ کر یہ کفر نہ کر۔ یہ اس لیے ہے کہ اس کا سیکھنا گویا فتنہ کا عین ہے۔

سوال: فرشتے فتنہ نہیں تھے حالانکہ آیت میں ان کو صرف فتنہ کہا گیا ہے۔
جواب: چونکہ اس وقت ان کا یہی کام تھا اس لیے ان کو صرف فتنہ کہا گیا ہے۔ جادو گمراہی نہیں اور نہ ہی اس پر عمل کرنا گمراہی ہے گمراہی اگر ہے تو اس کو حق سمجھنے میں، یہ قول کفر مت کر ان کو سات بار کہتے۔ اگر وہ کہتا کہ ضرور سیکھوں گا تو اُسے سکھاتے۔

فَيَتَعَلَّمُوْنَ جملہ منفیہ پر عطف ہے کیونکہ یہ مثبت کی قوت میں ہے اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ کہنے کے بعد اسے سکھاتے۔ اور ضمیر واحد کے لیے جو معنوی اعتبار سے النّاس کے لیے ہے یعنی لوگ سیکھتے تھے۔

مِنْهُمَا ان فرشتوں سے مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ اس کے سبب اور استعمال سے بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ وہ جزن وشوہر کے درمیان تفریق ڈالے بایں طور کہ اللہ تعالیٰ اُن کے مابین تفرقہ اور نافرمانی پیدا کر دے جبکہ وہ سحر استعمال کریں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ مسببات کے بعد اسباب عادیہ پیدا کرتا ہے آزمائش کی خاطر، کیونکہ بظاہر وہی سحر مؤثر تھا۔

جادُو سیکھنے کے بعد لوگوں کی کیفیت

حضرت سُدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اُن کے پاس کوئی جادو سیکھنے آتا تو اُسے کہتے کہ ہم سے جادو مت سیکھ کیونکہ ہم فتنہ ہیں۔ اگر وُہ نہ مانتا تو اس کے سامنے راکھ رکھ کر فرماتے کہ اس پر پیشاب کر دے۔ جب اس پر وہ پیشاب کرتا تو اس سے آسمان کی طرف نور چمک اُٹھتا۔ وُہ ایمان و معرفت ہوتا اور ایک سیاہ چیز دُھوئیں کی طرح آسمان سے نازل ہوتی جو اس کے کانوں میں داخل ہو جاتی وہ کفر اور غضبِ الٰہی ہوتا۔ جب وُہ فرشتے اسے خبر دیتے تو وہی بات ہوتی جو مرد اور عورت کے مابین جُدائی ڈالنے والی تھی ویسے وُہ اس سے مزید بھی جانتے تھے۔ چُونکہ وہ لوگ زیادہ تر یہی سوال کرتے تھے اس لیے وہ بھی یہی سکھاتے۔ بعض کہتے ہیں کہ جادو کے ذریعے مرد پر گرفت یُوں ہوتی کہ وُہ اپنی عورت سے جماع پر قادر نہیں ہو سکتا تھا۔

جادُو کی علامت

نصاب الاحتساب میں ہے کہ جو شخص دیکھے کہ میں اپنی اہلیہ سے جماع پر قادر نہیں ہوں لیکن غیر سے یہ قدرت حاصل ہے تو سمجھ لے کہ اس پر جادو کیا گیا ہے۔

جادو دفع کرنے کا طریقہ

سرکنڈے (کانے) جمع کر کے یعنی ایک گٹھڑی بنا کر اس کے درمیان کلھاڑا رکھ کر آگ سلگا دو، جب کلھاڑا گرم ہو جائے تو اسے نکال کر اس پر پیشاب کر دو، اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ اور نہیں وُہ جادوگر نقصان پہنچانے والے جو کچھ کہ وُہ عمل کریں یا لوگوں کو سکھائیں مِنْ اَحَدٍ کسی ایک کو اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر استثناء مفرغ ہے۔ اور باء کا متعلق محذوف ہے اور ضارّین کی ضمیر سے حال ہے یا اس کے مفعول سے، اگرچہ نکرہ ہے، لیکن اسے نفی پر اعتماد ہے اسی لیے ذوالحال بننے کے لائق ہے۔ یا بہٖ کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ یعنی وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے جب تک اللہ تعالیٰ کا علم یا اس کا ارادہ وقضا ساتھ نہ ہو نہ اس کے امر سے کیونکہ اللہ تعالیٰ کفر اور کسی کو نقصان پہنچانے اور فحشا کا امر نہیں فرماتا۔ اس لحاظ سے جادو کا کام ساحر کا ہے لیکن اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جب جادوگر جادو کا عمل کرتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اسے پیدا فرماتا ہے یہ صرف بندوں کی آزمائش کی خاطر پیدا کرتا ہے۔ گویا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس کا کسی کو انکار نہیں کہ سحر سے دلوں میں محبت و بغض اور شرور وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ جادو بندہ کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سے بڑے بڑے دُکھوں اور بیماریوں میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ مشاہدہ سے

معلوم ہوا ہے اس کا انکار ہٹ دھرمی ہے۔

سحر کی تحقیق جادو ایک ایسا امر ہے جو خارق للعادۃ ہے، لیکن ایسے نفس سے جو شرارت کا مجسمہ ہو اور وہ مخصوص اعمال کو عمل میں لا کر اس میں تعلیم و تعلم کو بھی دخل ہے ان دو باتوں سے معجزہ و کرامت اور سحر میں فرق ہو گیا۔ خارج میں اُس کے ثبوت میں اختلاف ہے۔ علماء اہل حق اس کے خارج کے وجود کے قائل ہیں اور معتزلہ منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خارج میں سحر کا نہ کوئی وجود ہے اور نہ ایسا کوئی ثبوت ہے بلکہ وہ ایک شعبدہ بازی اور خیالی بات ہے۔ اور وہ صرف ایسے ہوتا ہے کہ آنکھوں میں ایسی باتیں دکھائی جاتی ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ مثلاً رسیوں کا سانپ بن جانا اور وہ دفعۃً معلوم کر لینے کی بات ہے جس کا سبب صرف ہاتھ کی چالاکی اور اپنے حیلوں کو دیکھنے والوں سے پوشیدہ رکھنا ہے اور بس۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰی"۔

(ان کے خیال میں تھا کہ یہ رسیاں سانپ ہیں جو بھاگتے ہوئے نظر آئے)

معتزلہ کی تردید اہل حق معتزلہ کی تردید میں فرماتے ہیں کہ جادو کے خارج میں موجود ہونے کی دو دلیلیں ہیں:

(۱) جادو فی نفسہٖ ممکن الوقوع ہے جس میں قدرتِ ایزدی کو دخل ہے کیونکہ جادوگر تو صرف سبب ہے خالق تو اس کا پروردگار ہے۔

(۲) آیۂ مذکورہ فیتعلمون منہما ما یفرقون بہٖ بین المرء وزوجہٖ وما ہم بضارین بہٖ من احد الا باذن اللہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ اس کا موثر حقیقی میں ہوں فلہذا یہ محض خیالی بات نہیں بلکہ فی الواقع امر ہے۔

فائدہ عجیبہ شعبدہ بازی یا ایسے امور ظاہر کرنا جن میں ہاتھ کی چالاکی کو دخل ہو، یا ادویہ کے ذریعے عجیب و غریب امور ظاہر کرنا، یا ہندسہ کے آلات کے سبب سے یا کسی پتھر کے خواص سے کوئی بات دکھائی جائے یہ معاملہ اور ہے جسے جادو سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ مجاز ہے۔ حقیقی جادو اور ہے۔ یہ باتیں دراصل ایسی ہیں کہ جن کا مآخذ دقیق اور سبب لطیف ہے جو ہر ایک نہیں جان سکتا۔ بعض لحاظ سے جادو حلال بھی ہوتا ہے۔

جادوگروں کے اقسام عام طور پر جادو عورتوں سے زیادہ ہوتا ہے خصوصاً حالتِ حیض میں۔ اور یہ ہوتا بھی ان ارواحِ خبیثہ میں ہے جن کی طبائع خرابیوں اور فساد کی طرف راغب ہوں۔ اس کے لیے کسی قسم کی ریاضت بھی نہیں ہوتی۔ اس قسم کی عادت عورتوں، بچوں اور مخنثوں میں ہوتی ہے۔ جب کسی انسان کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے تو وہ ایسی باتوں کی طرف میلان رکھتا ہے جو نقصان دہ ہوں۔ اور انہی سے اُسے لذت حاصل ہوتی ہے۔ بہت بار دیکھا گیا ہے کہ وہ ایسی باتوں کا عاشق ہوتا ہے، اس سے وہ اپنی عقل، دین، شکل و

صورت، جسم و جان اور مال کو برباد کر ڈالتا ہے۔ شیطان کی خباثت مشہور ہے جب دیکھتا ہے کہ کسی میں اس قسم کی خرابی ہوگئی ہے تو وہ اس کا حامی ہو جاتا ہے۔ اور وہ امور اس کی طبیعت میں گھس جاتے ہیں جیسے راشی کو رشوت کی عادت ہوتی ہے، پھر ان کے ذریعے اپنے مقاصد پُورے کرتے ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی کو مال دے کر کہا جائے کہ فلاں کو جا کر قتل کر دو۔ یا برائی پر اعانت کی نیت سے مال دیا جائے۔ اس وجہ سے جادوگر اور ایسے بدمعاش لوگ آیاتِ کلامِ الٰہی کو نجاسات اور خون سے لکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی دوسرے غلیظ طریقے استعمال کرتے ہیں اور دُھونیاں وغیرہ بھی دیتے ہیں۔ نماز و روزے کے قریب نہیں جاتے۔ ناجائز طریقے سے ناحق قتل کرا دیتے ہیں۔ ذی محرم عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک کو نجاست میں پھینکنے سے گریز نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے بُرے اعمال کا وہ ارتکاب کرتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ جب وہ کوئی برا عمل کرتے ہیں تو شیطان ان کی مدد کرتا ہے۔ بعض دفعہ یُوں ہوتا ہے کہ وُہ پانی پر تیرتے ہیں، ہوا میں اُڑتے ہیں، دور دور کے مقامات پر پہنچ جاتے ہیں، لوگوں کے مال جمع کر کے لا دیتے ہیں، بعض کے دشمنوں کو مروا دیتے ہیں، بعض کو بیمار کر ڈالتے ہیں۔ بسا اوقات جادوگر عرفات میں حاجیوں کے سامنے نظر آتا ہے تاکہ لوگوں کو نیک گمان ہو کہ فلاں صاحب بڑے بزرگ ہیں۔ حالانکہ وہ شیطان جادوگر کی صورت میں متصور ہو کر جاتا ہے۔ بظاہر وہ لوگوں کو کرامات محسوس ہوتی ہیں لیکن ہوتا وہ شیطان کی مکاری کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادات واجبات سے ہیں یا مستحبات سے، لیکن یہ جادوگری کے اعمال نہ واجبات سے ہیں نہ مستحبات سے بلکہ ان افعال سے تو منع کیا گیا ہے اور انھیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے حرام اعتقادات سے بچائے۔

جادُوگروں کی رہائشی علامتیں

گمراہ لوگوں کی عبادات بھی عجیب و غریب ہوتی ہیں ان کے تمام امور غیر مشروع ہوتے ہیں۔ پھر ان سے کبھی کبھار مکاشفات کا ظہور بھی ہوتا ہے اور عجیب تاثیریں ظاہر ہوتی ہیں۔ وُہ ایسے مقامات پر بسر کرتے ہیں جو شیاطین کے مسکن ہیں۔ مثلاً:

(۱) جہاں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔

(۲) حمام

(۳) کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہیں

(۴) اونٹوں وغیرہ کے بیٹھنے کے مقامات۔

(۵) نجاست آلود مقامات۔

ایسے مقامات پر شیطان ان سے ملتا اور انھیں اپنی باتیں بتاتا ہے۔ جیسے وہ بتوں کے اندر گھس کر کفار کو عجیب و غریب باتیں بتاتا تھا۔

مسئلہ: علماء فرماتے ہیں کہ جادُو کے عمل سے اگر ایمان کے شرائط میں سے کوئی فعلی یا قولی شرط ضائع ہوتی ہو

تو ایسے جادو کو اپنانا کفر ہے ورنہ نہیں۔

مسئلہ : عوام کے جھاڑ پھونک کے بعض طریقے ایسے ہیں جن کا کوئی معنیٰ و مطلب معلوم نہیں ہوتا یا وہ شرکیہ کلمات ہوتے ہیں یا جنّات کی تعظیم کے الفاظ ہوتے ہیں۔ علمائے اسلام نے ایسی جھاڑ پھونک سے روکا ہے کیونکہ ان میں شرکیہ الفاظ کا خطرہ ہے اگرچہ جھاڑ پھونک والے کو معلوم بھی نہ ہو کہ یہ شرک ہے یا نہیں۔

مسئلہ : حدیث صحیح سے جھاڑ پھونک کی اجازت ثابت ہے جبکہ اس میں شرکیہ الفاظ نہ ہوں اور حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جہاں تک ہو سکے اپنے مسلمان بھائی کو نفع پہنچاؤ۔

مسئلہ : ہمارے نزدیک بیمار کے لیے آیاتِ الٰہی لکھنا جائز ہے بشرطیکہ سیاہی میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو[1]

مسئلہ : اسی طرح آیات کو دھو کر پلانا یا لکھ کر گلے میں تعویذ کے طور پر ڈالنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے اسمأ میں شیطان کو دفع اور ذلیل کرنے کی تاثیر ہے۔

مسئلہ : بزرگوں کی جھاڑ پھونک اور دم کرنے میں بڑی برکتیں ہیں کیونکہ ان حضرات نے جب سے شہرت کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت شرعی احکام کے مطابق بجالائی تو آیت قرآنیہ وسخّرلکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض کا حکم ان کے لیے ثابت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اور شیاطین ان حضرات کی اطاعت کرتے ہیں۔ اُن کی ایسے ہی فرمانبرداری کرتے ہیں جیسے وہ سلیمان علیہ السلام کی کرتے تھے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اذن وعطا سے ہوتا ہے۔

حکایت حضرت الہدائی قدس سرہٗ اپنے واقعات میں اپنے شیخ حضرت الشیخ مشہور با فتادہ آفندی قدس سرہٗ سے بیان فرماتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنا ایک خط جنّات کے بادشاہ کو لکھا کہ فلاں شخص کو تمہارے ایک جن نے پکڑا ہُوا ہے اسے حکم دو کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ چنانچہ جنّات کے بادشاہ نے حکم مان لیا اور ان کے لکھے کی تعظیم کی کہ پکڑنے والے جن کی گرفت کی، جس پر بیمار تندرست ہو گیا۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ ہم پیمبر فرد آمد در جہاں ۔ فرد بود و صد جہانش در نہاں

۲ عالم کُبریٰ بقدرت سحر کرد ۔ کرد خود را در کہن نقش نورد

۳ ابلہانش فرد دیدند و ضعیف ۔ کے ضعیفیت آنکہ باشد خریف

ترجمہ : ۱۔ پیغمبر زمین پر تشریف لاتا ہے ہوتا تو وہ ایک فرد ہے لیکن اس میں کئی عالم پوشیدہ ہوتے ہیں۔

۲۔ قدرتِ الٰہی کے ساتھ عالم کبریٰ نے ظہور فرمایا ہے اپنے آپ کو پرانے نقش میں لپیٹا ہے۔

۳۔ بیوقوفوں نے اسے کمزور دیکھا وہ ضعیف کیسے ہو سکتا ہے جو ہر وقت تازہ ہو۔

---

[1] اسی لیے مرشدی مفتیٔ اعظم سیدنا حضرت مصطفیٰ رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور استاذی حضرت مولانا سردار احمد لائلپوری قدس سرہٗ پین کی سیاہی استعمال نہیں فرماتے تھے۔ ایسے ہی دیگر اولیاءِ کرام کا طریقہ منقول ہے۔ اویسی غفرلہ

مسئلہ : جادوگر کو قتل کرنا واجب ہے، وہ مرد ہو یا عورت، جبکہ ان کا طریقہ زمین میں فساد اور نقصان ڈالنے کا ہو۔ اگر ان کا مقصد کفر پھیلانا ہو تو صرف مرد کو قتل کرنا چاہیے عورت کو صرف سخت سزا دے کر اسے قید کیا جائے۔ کیونکہ ساحر کافر ہوتا ہے اور کافر کو قتل کرنا واجب ہے اور کافرہ عورت اہل حرب سے نہیں۔ جب اسے اصل کفر کی وجہ سے قتل نہیں کیا جاتا تو پھر عارضی کفر کی وجہ سے اسے کیوں قتل کیا جائے۔

مسئلہ : اگر ساحر گرفتاری سے پہلے توبہ کرلے تو توبہ قبول، ورنہ نہیں۔

نبوت وصحابیت کے بے ادب کی سزا

اشباہ (فقہ کی کتاب) میں ہے کہ ہر کافر کی توبہ دُنیا میں قابل معافی ہے لیکن جو نبی علیہ السلام کی گستاخی کرے یا شیخین (صدیق و عمر) کو گالی دے یا ان پر جادو کا عمل کرے اس کی توبہ قبول نہیں جبکہ توبہ سے پہلے اسے گرفتار کرلیا جائے، اگرچہ عورت ہی ہو اور وہ بے دینی پھیلائے۔

ف : زندیق وُہ ہے جو زمانہ کو قدیم سمجھے اور تمام حوادث کو اس کی طرف منسوب کرے اگرچہ وہ نبوت کا اقرار کرے اور شریعت کا بھی قائل ہو۔ گزشتہ مضامین زیادہ تر آکام المرجان سے منقول ہیں، ان مضامین کو دل پر لکھیے۔

وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ اور سیکھتے تھے وُہ باتیں جو انہیں نقصان پہنچاتی ہیں کیونکہ ان کا اس سے عمل کا ارادہ تھا یا اس لیے کہ علم اکثر عمل کی طرف کھینچتا ہے **وَلَا يَنفَعُهُمْ** ؕ اور انہیں نفع نہ دیتیں۔ اس کی تصریح اس لیے فرمائی تاکہ پتا چل جائے کہ وہ ان امور سے نہیں جن میں خیر و شر دونوں ہوں بلکہ اس میں خالص شر اور ضرر محض ہے کیونکہ وہ لوگ اس سے یہ ارادہ نہیں رکھتے تھے کہ جادُو سے جھُوٹے نبی کی خرابیوں سے بچ جائیں گے یا لوگوں کو اس سے بچائیں گے۔ اس لحاظ سے اس میں کسی قسم کا نفع نہ ہُوا بلکہ سراسر نقصان ہی نقصان۔

مسئلہ : جس علم میں اس کی خرابیوں سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو اس سے اجتناب بہتر ہے۔ جیسے فلسفہ کا پڑھنا، اس کے پڑھنے سے گمراہی میں پڑنے سے نہیں بچا جا سکتا۔ اگرچہ کسی شاعر نے کہا : ع

عَرَفْتُ الشَّرَّ لٰكِن لِلتَّوَقِّيَة

(میں نے شر کو شر کی وجہ سے نہیں سیکھا لیکن صرف بچنے کی خاطر)

اور جو شخص شر کو نہیں جانتا وہ ضرور شر میں واقع ہوگا۔

مسئلہ : تجنیس میں ہے، نجوم کا سیکھنا حرام ہے۔ ہاں قبلہ کی طرف پہچاننے اور سایۂ اصلی کی خاطر سیکھا جائے تو جائز ہے۔

حدیث شریف

مصابیح کی بعض احادیث سے ایک حدیث یہ بھی ہے کہ جس نے نجوم کے علم سے کچھ سیکھا تو وُہ سمجھ لے کہ اس نے سحر کے شعبہ کو سیکھا۔

مسئلہ: جب اس علم کے سیکھنے میں کچھ بھلائی نہیں تو جن کتابوں میں فلاسفہ وغیرہ کے بیانات ہوں تو اپنے پاس رکھنا بلکہ اُن کی طرف دیکھنا بھی ناجائز ہے۔ (کذا فی نصاب الاحتساب)

وَلَقَدْ عَلِمُوْا ان یہود نے تورات سے جان لیا تھا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ کہ جس نے سحر اختیار کیا شیطان کی باتوں کو کتاب اللہ کے عوض لیتے تھے۔ پہلی لام قسم محذوف کا جواب ہے اور دوسری لام ابتدا کی ہے مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﵁ اس کے لیے آخرۃ میں کوئی حصہ نہیں۔ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ البتہ بُری شے ہے وہ جو انہوں نے خریدی۔ کیونکہ شراء اضداد میں سے ہے اور لام قسم محذوف کا جواب ہے اور مخصوص بالذم بھی محذوف ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی، وَاللهِ لَبِئْسَ مَا بَاعُوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ السِّحْرَ وَالْكُفْرَ۔ اور ایمان کو نفس سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ نفس صرف علم وعمل اور ایمان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ لَوْ کا جواب محذوف ہے ای لَمَا فَعَلُوْا یعنی اگر انہیں علم ہوتا تو وہ سحر اور اس پر عمل کرنا نہ سیکھتے۔

سوال: پہلے ان کے لیے علم ثابت کیا پھر اس کی ان سے نفی کر دی۔

جواب: اس لیے جب اپنے علم پر عمل نہ کیا تو گویا حقیقۃً انہوں نے کچھ نہ پڑھا تو یہاں پر علم سے نفع لینے کی نفی ہے نہ کہ علم کی نفی۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اور اگر وہ یہود اٰمَنُوْا ایمان لاتے نبی علیہ السلام اور قرآن پر وَاتَّقَوْا اور بچتے سحر اور شرک سے لَمَثُوْبَةٌ تو اُن کے لیے ثواب ہے۔ لمتوبۃ بروزن مَفْعُلَہ۔ اس کی گردان ثَابَ يَثُوْبُ بمعنے رَجَعَ ہوگی اور جزاء کو ثواب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ نیکی کرنے والے کے اس اجر کا بدلہ ہے جو اس کی طرف لوٹتا ہے یہ مبتدا ہے اور لَوْ کا جواب محذوف ہے اور تنکیر تقلیل کے لیے ہے۔ یعنی ثواب سے شے قلیل جو ہونے والی ہے۔ مِّنْ عِنْدِ اللهِ خَيْرٌ ؕ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر۔ یہ مبتدا کی خبر ہے۔ مطلب یہ کہ انھوں نے اللہ سے کوئی خیر کا اجر پایا، اس کے عوض ان کے نفوس نے خریدا۔ یہاں فعل محذوف ہے۔ عبارت کے طریقہ کو تبدیل کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کے لیے خیریت کا ہونا یقینی ہے۔ مفضل علیہ کو محذوف کرنے میں مفضل کی شان بلند کرنا مطلوب ہے تاکہ ہر بات اسی کی طرف منسوب ہو۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ اگر جانتے کہ اللہ تعالیٰ کے ثواب میں بہتری ہے۔

ف: صرف زبان پر علم کو محدود رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں جب تک اس کا دل پر اثر نہ ہو، اور دل پر تاثیر کی نشانی یہی ہے کہ اس پر عمل کرنے کو جی چاہے اور کتاب وسنت کی پابندی کرے۔ جو اپنے اوپر کتاب وسنت مسلط کرلے اس سے حکیمانہ باتیں سرزد ہوتی ہیں اور جو اپنے اوپر خواہشاتِ نفسانیہ کو مسلط کرلے اس سے بدعت کی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

علم نافع کی علامات حضرت شیخ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ علم کہ جس میں خطراتِ نفسانیہ اور تصوراتِ غلط دور ہوں اور روحانی امور بھی اس میں شامل ہوں اور طبیعت کو بھی اس سے

لذت نصیب ہو تو اُسے حاصل کر ۔ یہ وہی علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام پر نازل فرمایا ۔ نبی علیہ السلام اور خلفاءِ راشدین و تابعین و تبع تابعین اور ائمۂ دین (جو خواہشاتِ نفسانیہ سے مبرا ہیں) کی اقتداء میں اپنی نجات سمجھ۔ ان کی فرمانبرداری ظنون و شکوک و اوہام اور غلط دعاوی سے بچاتی ہے ۔ اگر تُو چاہتا ہے کہ تُو اللہ تعالیٰ کا خالص بندہ بنے تو علم و عمل میں کسی کی اقتداء حاصل کر ۔ ورنہ گمراہی ہے ۔ پہلے وہ علم سیکھ جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان ہو ۔ اور عمل بھی وہی مقبول ہے جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول علیہ السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی محبت ہو اور اہل السنۃ والجماعت کے اعتقادات کے مطابق اعتقاد رکھ ورنہ عمل بیکار ہے۔

ف : بعض علماءِ کرام نے فرمایا کہ بُرے آدمی میں علم کا اضافہ ایسے ہے جیسے اندرائن کو پانی دیا جائے اسے جتنا پانی دیا جائے گا اس کا کڑواپن بڑھتا جائے گا ۔ اسی طرح جس نے علمِ دین صرف اس لیے پڑھا کہ وہ دنیوی کاروبار چلائے گا اور اس سے دنیاوی فوائد حاصل کرے گا ، تو وہ شخص ایسے ہے جیسے گندگی کو یاقوت کے آبلے سے اٹھائے ۔ یہ بہت برا وسیلہ ہے ۔ اصل بات تو یوں ہے کہ بندے کو چاہیے کہ اپنی آخرت پر تمام دنیا کے امور کو قربان کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ۔

ف : اگر تُو یہ جاننا چاہے کہ اللہ کے ہاں تیرا مرتبہ کیا ہے تو اپنے اعمال کی طرف دیکھ ۔ یہی اعمال علامات اور احوال کرامات ہیں اور کرامات اللہ تعالیٰ کے قُرب کی دلیلیں ہیں ۔ علوم تو صرف وسیلہ ہیں ۔

تفسیرِ صُوفیانہ

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص معلوم کرے کہ میرا اللہ تعالیٰ کے ہاں کتنا مرتبہ ہے ، تو اپنے دل کو غور سے دیکھے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کتنی عظمت ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اتنی الفت کرتا ہے جتنی بندے کو اس سے اُلفت ہے ، انسان تو لطیفۂ ربانی ہے ۔ وارداتِ الٰہیہ کے قابل صرف یہی ہے اس کا نچلا حصہ ملکی ہے اور اوپر والا حصّہ ملکوتی ہے یا یُوں کہو کہ طبیعت اور نفس ملکی اور سر و روح ملکوتی میں جو شخص عبادتِ حقانیہ سے علائق کو توڑ لیتا ہے تو وُہ ملک اور ملکوت میں پُورا تصرف کرتا ہے اور یہ دونوں اس کے وجود میں ملک ملکوت عالم خارج میں ہیں وُہ اسی کے دروازہ ہیں ۔

ف : علماءُ بقدر علوم و استدلال قُربِ حق تک پہنچتے ہیں لیکن اولیاءُ اللہ اپنے مشاہدہ و معائنہ کے مطابق قُرب حاصل کرتے ہیں ۔ مگر یہ مشاہدہ وُہ نہیں جو دُوسری اشیاء کا ہوتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ایسی تشبیہات سے منزّہ ہے کہ اس کے لیے کیف یا این کہا جا سکے ۔ بلکہ یہ مشاہدہ ہے کہ دیکھنے والا پہلے اپنے وجود کو فنا دے ۔

ف : سالک کو سب سے پہلے افعال کی تجلّی نصیب ہوتی ہے پھر صفات کی ذات کی تجلّی تو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب کُلی فنا حاصل ہو ۔ لیکن وُہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی اور وُہ فنا بقا کا عین ہوتی ہے صرف لفظی فرق ہے ۔

حضرت بایزید بسطامی قدس سرّہٗ فرماتے ہیں کہ میں اخلاص صرف ان فقراءُ کے لیے مانتا ہُوں جنہیں فنا کا درس حاصل ہے ۔ حضرت چراغ الشہاب کہ از خود برنی ہیچو قندیل اداب ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○
مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا
نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ
اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○ اَمْ
تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ
بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ
اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَ
اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ
اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ○ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ
هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ
اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ ع

ترجمہ : اے ایمان والو! راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے ہی سے بغور سنو
اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی
اُترے تمھارے رب کے پاس سے اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل
والا ہے جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے کیا تجھے خبر
نہیں کہ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں و زمین کی بادشاہی اور
اللہ کے سوا تمھارا نہ کوئی حمایتی نہ مددگار کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ویسا سوال کرو جو موسیٰ سے پہلے
ہوا تھا اور جو ایمان کے بدلے کفر لے وہ ٹھیک راستہ بہک گیا بہت کتابیوں نے چاہا کاش تمھیں
ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں اپنے دلوں کی جلن سے بعد اس کے کہ حق اُن پر خوب ظاہر ہو چکا ہے
تو تم چھوڑو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور نماز قایم رکھو اور زکوٰة
دو اور اپنی جانوں کے لیے جو بھلائی آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے یہاں پاؤ گے بیشک اللہ تمھارے کام

دیکھ رہا ہے اور اہل کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو یہ ان کی خیال بندیاں ہیں تم فرماؤ لاؤ اپنی دلیل اگر سچے ہو' ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا منہ جھکایا اللہ کے لیے اور وہ نکوکار ہے تو اس کا نیگ اس کے رب کے پاس ہے اور انھیں نہ کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم۔

تفسیر عالمانہ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا اے ایمان والو! رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کو رَاعِنَا مت کہو۔ اس میں مومنین کو راہِ خیر کی رہبری کی جا رہی ہے۔
رَاعِنَا مُرَاعَاۃٌ سے رَعیٌ کا مبالغہ ہے بمعنی حِفْظُ الْغَیْر اور اس کے امور کی تدبیر اور اس کے مصالح کا تدارک۔

شانِ نزول مومنین کا طریقہ تھا کہ جب ان پر کوئی علمی چیز بیان ہوتی تو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کرتے: رَاعِنَا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی ہماری رعایت اور ہماری طرف توجہ فرمائیے تاکہ آپ کا چہرہ ہماری طرف رہے اور ہم آپ کا کلام اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس سے یہود کو موقعہ مل گیا کہ اُن کے ہاں لفظ رَاعِنَا لغت عبرانیہ یا سریانیہ میں گالیوں کا کلمہ تھا جو ایک دوسرے کو اس سے گالیاں دیتے تھے۔ جب انہوں نے یہ کلمہ مومنین کے منہ سے سُنا تو موقع پا کر اس کلمہ سے حضور علیہ السلام کو بلانے لگے اور ان کا مقصد اس سے گالیوں کا ہونا۔ مومنین کو اس کلمہ سے روکا گیا کیونکہ اس میں یہود کی زبان سے التباس پڑتا تھا اور انھیں حکم ہُوا کہ اس کے ہم معنی لفظ کو استعمال کریں کہ جس میں کسی قسم کا التباس نہ ہو۔
وَقُوْلُوا انْظُرْنَا ہماری طرف توجہ فرمائیے۔ نَظَرَۃٌ سے ماخوذ ہے بمعنی اِنْتِظَرَۃٌ وَاسْمَعُوْا ط اور اچھی طرح سُنو وہ کلام جو تمہارے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اور ان مسائل کو یاد کر لو جو آپ تمہیں فرماتے ہیں صرف یاد ہی نہیں بلکہ انھیں دل میں جگہ دو یہاں تک کہ تم استعداد اور طلب مراعات کے محتاج نہ رہو۔ وَلِلْكٰفِرِيْنَ یہود کے لیے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی اور انھیں گالیاں دیں عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ عذاب دردناک ہے جبکہ انہوں نے بہت بڑی گالیاں دینے پر جرأت کی اس آیت سے ثابت ہُوا کہ ایسے الفاظ سے احتراز کیا جائے جن میں تعریض ہو۔
سوال: فقہاء کرام فرماتے ہیں: لَا بَاسَ بِالتَّعَارِیْض (یعنی کلمے استعمال کرنا جائز ہیں)، تم کہتے ہو تعریضی کلمات کا استعمال ناجائز ہے۔
جواب: تعریض اسے کہتے ہیں کہ انسان منہ سے ایسا کلمہ بولے جس کا ظاہر تو کچھ اور ہو اور مراد کچھ اور۔ یہ اس وقت ہے جب انسان کو جھوٹ بولنے سے بچاؤ حاصل ہو ورنہ بلا ضرورت ایسے کلمات کا استعمال ہرگز جائز نہیں۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچے" یعنی ان کی عزت و حرمت کے در پے نہ رہے۔

ف: حدیث شریف میں زبان کو ہاتھ سے اس لیے مقدم کیا گیا ہے کہ زبان سے عموماً ایسی بات سرزد ہوتی رہتی ہے پھر باقی اعضاء سے ہاتھ کو دکھ دینے میں زیادہ دخل ہے اس لیے ہاتھ کا ذکر حدیث شریف میں صراحۃً ہوا ہے۔
مثنوی شریف میں ہے:

۱	ایں زباں چوں سنگ و ہم آہن وش است	وآنچہ بجہد از زباں چوں آتش است
۲	سنگ و آہن را مزن برہم گزاف	گہ ز روئے نقل و گاہ از روئے لاف
۳	زاں کہ تاریک است و ہر سو پنبہ زار	درمیان پنبہ چوں باشد شرار
۴	عالمے را یک سخن ویراں کند	روبہاں مردہ را شیراں کند

ترجمہ: ۱۔ یہ زبان پتھر اور لوہے کی طرح ہے جو کچھ زبان سے نکلتا ہے وہ آگ ہے۔
۲۔ پتھر اور لوہے کو ایک دوسرے پر خواہ مخواہ نہ مار، نہ ہی کسی کی نقل کر کے نہ ہی لاف و گزاف سے،
۳۔ اس لیے کہ ہر طرف سے تاریکی اور روئی پڑی ہے روئی پر انگارہ پڑ جائے تو پھر بربادی کے سوا کچھ نہیں۔
۴۔ صرف ایک سخن جہان کو ویران کر ڈالتا ہے بلکہ یہ مردہ لومڑیوں کو شیر بنا دیتا ہے۔

آیت سے دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ فعل کے صدور کے ذرائع اور اسباب اور وہ اعمال جو اس کی حمایت کرتے ہوں ان کو بند کرنا ضروری ہے۔

ف: ذریعہ وہ شے ہے جو فی نفسہٖ غیر ممنوع تو نہ ہو لیکن اس کے عمل سے دوسرے ممنوع فعل کا صدور لازم آتا ہو۔ وجہ استدلال یوں ہے کہ یہود اس کلمہ کو اپنی لغت میں گالیوں پر اطلاق کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے روک دیا کہ یہ کلمہ چونکہ گالیوں کا سبب اور ذریعہ ہے فلہٰذا مسلمانوں کو بھی اس کا ایسے اطلاق نہ کرنا چاہیے۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔

(تم کفار کو گالی مت دو ورنہ لاعلمی میں وہ تمہارے معبود کو گالیاں دیں گے)

اس آیت میں ان کے معبودوں کو گالیوں سے اس لیے روکا گیا ہے کہ یہ عمل معبودِ حقیقی کو گالیوں کا سبب بنتا ہے۔ اور فرمایا:

وَاسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ۔

(ان سے سوال کیجئے اس گاؤں کے بارے میں جو دریا کے کنارے پر تھا)

حکایت واقعہ یُوں ہے کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن شکار کرنے سے منع کیا۔ قدرت کی شان کہ ہفتہ کے روز مچھلیاں زیادہ آنے لگیں جنہیں وہ گڑھوں کی مدد سے اتوار کے دن شکار کرنے لگے۔ چونکہ ہفتہ کے دن شکار کی ممانعت ذریعہ اور سبب بنا اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں بندر اور خنزیر کی صورت میں بدل دیا۔

حدیث شریف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ بی بی اُم حبیبہ اور بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر حبشہ کے گرجا میں دیکھی۔ اس کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اُن لوگوں کا طریقہ ایسا تھا کہ جب ان کا کوئی نیک آدمی فوت ہوتا تو اس کی قبر کے اوپر مسجد بنا کر اس نیک آدمی کی تصویر کھنچوا کر اس مسجد میں آویزاں کر دیتے۔ ایسے لوگ اللہ کے نزدیک بہت بُرے ہیں۔

ف : علماءِ کرام فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے ان صالحین کی تصاویر اس لیے بنائیں تاکہ وہ لوگوں کو دکھائی جائیں اور لوگ انھیں دیکھ کر ان کے حالات دریافت کریں اور ان کی طرح عبادات کرنے کی سعی کریں۔ یہی طریقہ ان کے سابقین کا تھا کہ تصاویر قبروں پر آویزاں ہوتیں اور لوگ انھیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ بعد ازاں نااہل پیدا ہو گئے ان کو اپنے اسلاف کے اطوار کا صحیح علم نہ تھا شیطان نے انھیں وسوسہ میں ڈالا کہ تمھارے آبا و اجداد ان تصاویر کی پرستش کرتے تھے۔ چنانچہ وہ شیطان کے بہکاوے میں آ گئے اور ان کی پرستش کرنے لگ گئے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصاویر کھنچوانے سے روک دیا اور اس پر سخت وعیدیں سنائیں اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہے اُن لوگوں پر جو اپنے انبیاء و اولیاء کی قبور کو سجدہ گاہ بناتے ہیں۔"

اور فرمایا:

"یا اللہ! میری قبر کو بُت نہ بنانا کہ اس کی پرستش ہو۔"

اور فرمایا:

"بندہ متقیوں کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ امور ترک نہ کر دے جو اباحت کا حکم تو رکھتے ہوں لیکن ان میں خطرہ ہو۔"

اور فرمایا: "گناہِ کبیرہ ہے اس شخص کے لیے جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہے۔" عرض کیا گیا: "کون بدبخت ہے جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "ہاں جو کسی دوسرے کے باپ کو گالیاں دیتا ہے تو وہ بھی اس کے باپ کو گالیاں دے گا۔" اس میں ماں باپ کی گالیوں کے سبب اور ذریعہ کو بھی روکا گیا ہے۔ اور فرمایا: "حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے لیکن ان کے درمیان چند مشتبہات ہیں، جو ان مشتبہات سے بچتا ہے اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا، جو ان کا ارتکاب کرتا ہے وہ حرام کا ارتکاب کرتا ہے۔" اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی راعی چراگاہ کے اردگرد پھرے تو کسی نہ کسی طریق سے اس میں واقع ہو جائے گا۔" اس میں حرام سے بچنے سے پہلے ان کے اسباب

مشتبہات سے بھی روکا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب عینہ کی بیع کرنے لگو گے اور گاؤ کے دُم سینے پر لگاؤ گے اور کھیتی باڑی میں انتہائی مصروف ہو جاؤ گے اور جہاد ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر ذلت مسلّط کر دے گا جس سے تم مُرتد ہو جاؤ گے۔

ف : عینہ وُہ بیع ہے کہ کسی کو کوئی چیز میعادِ مقررہ تک بیچ دی جائے پھر تھوڑے پیسے نقد دے کر واپس لے لی جائے (۲) اسے بیع عینہ اس لیے کہتے ہیں کہ صاحب بیع کو نقد رقم مل جاتی ہے اور مشتری اس لیے خریدتا ہے تاکہ اسے وہ نقد رقم میں بیچے جو اسے فوراً مل جائے۔ عینہ حاضر شئے کو کہتے ہیں۔(۳) اس حدیث میں زراعت کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ اس وقت ہے جب زراعت جہاد کے ترک کا سبب بنے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے گھر میں کھیتی کا سامان ملاحظہ فرمایا تو ارشاد فرمایا :

حدیث شریف "یہ وہ گھر ہے جس میں ذلت آئے گی"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کھیتی دنیا کے کاروبار سے ہے اور جہاد سے روکنے کا سبب ہے اس لیے اس کی مذمت کی گئی ہے۔ اور دنیوی کاروبار میں زیادہ منہمک رہنا کافروں کا کام ہے۔ مسلمان کے لیے تو یہ ایک عارضی عمل ہے کیونکہ مسلمان تو اس عمل کو صرف آخرت کا سبب سمجھتا ہے اور کفار اسے دنیا کی زیب و زینت سمجھتے ہیں انھیں آخرت سے غفلت ہے۔

حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمایا :

حدیث شریف "دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنّت"۔

یعنی بہ نسبت اس کے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے آخرت کی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔ یہ دُنیا کافر کے لیے جنّت ہے۔ یعنی بہ نسبت اس کے کہ جو عذاب اس کے لیے آخرت میں تیار ہے۔

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا دوست نہیں رکھتے وہ لوگ جو کافر ہیں۔

شانِ نزول یہود کا ایک گروہ تھا جو مومنین کے لیے محبت کا اظہار کرتا اور دعویٰ کرتا کہ ہم تمہارے لیے بھلائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُن کی تکذیب کے لیے یہ آیت نازل ہُوئی۔

اَلْوُدُّ کسی شئے کی آرزو رکھتے ہُوئے محبوب رکھنا۔ محبت کی نفی سے کراہت مقصود ہے۔ یعنی دوست نہیں رکھتے وہ لوگ جو کافر ہیں۔

مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ مِنْ بیانیہ ہے کیونکہ **الَّذِیْنَ کَفَرُوْا** جنس ہے۔ اس کے تحت دو نوع ہیں :

(۱) اہل کتاب (۲) مشرکین

یُوں کہا گیا ہے کہ دوست نہیں رکھتے وُہ لوگ جو کافر ہیں۔ یعنی اہل کتاب اور مشرکین۔ پھر بیان کیا کہ وُہ جو کافر ہیں وہ عموم میں باقی ہیں یعنی ہر دو نوع مراد ہیں۔ اب معنٰی یہ ہُوا کہ تمام کفار دوست نہیں رکھتے۔

اَنۡ یُّنَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ یہ کہ تمہارے نبی علیہ السلام پر کچھ نازل ہو۔ کیونکہ جو نبی علیہ السلام پہ نازل ہوا وہی اُمت پر نازل ہُوا مِّنۡ خَیۡرٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ فاعل کے قایم مقام ہے اور مِنۡ زایدہ ہے خیر کے استغراق کے لیے ہے اور خیر سے وحی اور قرآن اور نصرۃ مراد ہے۔ مِنۡ ابتدا غایت کے لیے ہے۔ معنٰی یہ ہے کہ اپنے آپ کو زیادہ حقدار سمجھتے ہیں کہ وحی ہم پر نازل ہونی چاہیے تھی یہ تمہارے ساتھ حسد کرتے ہیں اور مکروہ سمجھتے ہیں کہ تم پہ وحی کی کوئی شے نازل ہو۔ یہود تو اس لیے حسد کرتے ہیں کہ وُہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے ہیں اور ان کا خاندان وحی کا گہوارہ رہا اور تم لوگ عموماً اَن پڑھ رہے اور مشرکین اس سے حسد کرتے ہیں کہ اُن میں اکثر ذی مرتبہ اور مالدار ہیں اور اُن کا گمان تھا کہ دُنیوی منصب کی طرح منصبِ نبوت بھی صرف انہی کو ملتا ہے جو ذی مرتبہ اور صاحبِ جائیداد اور جس کے پاس ظاہری اسباب بہت زیادہ ہوں۔ اسی لیے وُہ کہتے تھے:

لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡیَتَیۡنِ عَظِیۡمٍ۔

(یہ قرآن دو گاؤں کے درمیان رہنے والے بڑی شوکت والے مرد پر کیوں نہ اترا)

اس سے طائف کا نعیم بن مسعود ثقفی یا مکہ کا ولید بن مغیرہ مراد ہے۔ اُن دونوں کی آرزو یہی تھی کہ نبوت ان میں سے کسی ایک کو ملتی۔ ان کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاللّٰهُ یَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مختص فرماتا ہے۔

حلِ لغات عربی میں کہتے ہیں:
خَصَّهٗ بِالشَّیۡءِ وَاخۡتَصَّهٗ۔

یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی معاملہ میں صرف اسی کو مخصوص کیا جائے۔

مَنۡ یَّشَآءُ کا مفعول بہ محذوف ہے۔ رحمۃ سے نبوت، وحی، حکمت اور نصرت مراد ہے۔ اب معنٰی یہ ہُوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے نوازتا ہے اور اپنا خاص فضل و کرم صرف اسی کو عطا کرتا ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے کہ جسے چاہے نوازے۔ نہ ہی یہ اس پر واجب اور نہ ہی کسی کا کوئی حق اس پر واجب ہے۔

سوال: بعض مشایخ کی عبارات میں واقع ہُوا ہے کہ فلاں بات واجب ہے۔

جواب: اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس شے کا حق اسی طرح تھا کہ وہ مستحقین کے لیے واجب ہے اور ثابت نہ ہو کر اللہ پر کسی دوسرے واجب کرنے والے سے واجب ہے۔

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○ اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل وکرم سے نبوت ووحی سے چن لیتا ہے۔ اس سے معتزلہ پر حجت قایم ہوگئی کہ کسی پر اس کا فضل وکرم کرنا اس کا اپنا احسان ہے اس پر کوئی شے واجب نہیں کیونکہ جس پر کوئی شے واجب ہوتی ہے اسے قاضی مَاوجَبَ کو ادا کرنے والا کہا جاتا ہے، نہ کہ فضل واحسان کرنے والا۔ اور یہ بھی ہے جس پر بہتر فعل کا عمل میں لانا واجب ہوتا ہے تو وہ ذوالجلال کہلاتا ہے نہ کہ ذو الفضل۔ اس سے ثابت ہُوا کہ نبوت و وحی کے لیے کسی بندے کو چُن لینا اس کا فضل محض ہے۔ اور ان کے علاوہ دُوسروں کو اس نعمت سے محروم رکھنا فضل وکرم کی تنگی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی اپنی مشیت وحکمت ہے۔ پھر جو شخص اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے سے اعراض کرتا ہے تو وہ اس کی حماقت وجہالت ہے۔

ف : اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے دو قسم کے ہیں :

(۱) وُہ جن کو اللہ تعالیٰ نے حق کی تائید وحمایت کے لیے منتخب فرمایا مخصوص عباد وزہاد اور اہل الاعمال والاوراد ہیں۔

(۲) وہ حضرات جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے لیے مخصوص فرمایا ہے وہ اہل محبت اور اہل عشق ہیں۔ وہ سب کے سب اس کی خدمت کے لیے اور اس کے حکم کے ماتحت ہیں کیونکہ ان سب کا مقصد اور توجہ وہی ذات ہے اور بس۔ اور عبودیت ایک ایسی صفت ہے کہ بندہ جب تک زندہ رہے اس سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ اور عبودیت کے اسرار میں سے ایک یہ ہے کہ قلب سے حسد کو خارج کر دے۔

ف : بعض حکما نے فرمایا ہے کہ حاسد اللہ تعالیٰ سے پانچ وجوہ سے مقابلہ کر رہا ہے :

(۱) اس نے اللہ تعالیٰ کی ہر اس نعمت سے بغض کیا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے غیر کو عطا فرمائی۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی تقسیم سے غصہ کیا، گویا اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے یارب! تُو نے یہ تقسیم غلط کی تجھے چاہیے تھا کہ یوں تقسیم کرتا۔

(۳) اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنے فضل وکرم سے دیتا ہے اور حاسد اللہ تعالیٰ کے فضل فراواں سے بخل کرتا ہے۔

(۴) جس پر اللہ تعالیٰ کی عطا ہوئی تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کا منتخب بندہ ہے اور حاسد اسے رُسوا کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے زوالِ نعمت کا خواہاں ہوتا ہے۔

(۵) حاسد اللہ تعالیٰ کے دشمن ابلیس کی مدد کر رہا ہے کہ وُہ بھی آدم علیہ السلام پر حسد کر کے رسوا ہوا۔

حسد کا روحانی نقصان اور عالمِ مثال میں اس کی مثال

جان اے جانِ من! حسد کا نقصان تیرے دشمن پر تو اثر انداز نہیں ہوگا البتہ اس کا خمیازہ تجھے بھگتنا پڑے گا۔

اے بھائی! اگر حسد کی خرابی تیرے سامنے منکشف ہو جائے خواہ بیداری میں یا خواب میں، تو تجھے نظر آئے گا

حسد سے تو ایک بھاری پتھر اٹھا کر جس پر حسد کر رہا ہے اس کو مارنا چاہتا ہے جو تو اس پتھر کو اپنے دشمن کی طرف پھینکتا ہے تو وہ تیری دائیں آنکھ پھوڑ دیتا ہے۔ پھر تیرا غضب بڑھ جاتا ہے پھر دوبارہ زور سے مارتا ہے تو تیری بائیں آنکھ پہ لگتا ہے جس سے تو اندھا ہو جاتا ہے بعد ازاں پھر غصہ سے اور زور لگا کر مارتا ہے تو تیرا سر پھوڑ دیتا ہے۔ اس سے تیرے دشمن کا تو کچھ نہیں بگڑتا لیکن تُو نے اپنا بیڑا غرق کر لیا جس سے تیرے اردگرد تیرے دشمن خوش کیاں اڑاتے ہیں یہ انجام ہے حسد کرنے کا۔ در اصل یہ شیطان کا کھلونا ہے۔

حکایت شیخ ابوبکر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص ایک بادشاہ کے پاس آیا کرتا اور کہتا کہ محسن پر احسان کر، تاکہ بُرے کی بُرائی تیرے اُوپر اثر انداز نہ ہو سکے۔ ایک شخص میں حسد جاگا اور تدبیر سوچی کہ اس کو اس مرتبہ سے گرائے۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ جو شخص تجھ سے ہمکلام ہوتا ہے کہتا ہے کہ بادشاہ کے منہ سے بدبو آتی ہے۔ بادشاہ نے کہا: کیسے یقین ہو کہ وُہ ایسے کہتا ہے۔ حاسد نے کہا: آزمائش شرط ہے، دیکھنا کل جب وہ آپ کے قریب آئے گا تو کلام کرتے وقت اپنے منہ میں رومال ڈال کر بات کرے گا۔ وہ صرف تیرے منہ کی بدبو کی وجہ سے ایسا کرے گا۔ ادھر حاسد بادشاہ کو یہ الفاظ کہنے کے بجائے سیدھا اس شخص کے پاس پہنچا اور اپنے گھر اسے دعوت پر بلایا اس نے دعوت قبول کر لی۔ حاسد نے طعام میں کچھ کچا لہسن ملا دیا۔ طعام سے فارغ ہو کر وہ سیدھا بادشاہ کے ہاں چلا گیا اور حسبِ دستور کلام شروع کر دیا لیکن قدرے دُور کھڑے ہو کر۔ بادشاہ نے فرمایا: ذرا قریب ہو جائیے۔ اس نے اس خطرہ سے کہ بادشاہ کو اس کے منہ سے لہسن کی بدبو کی وجہ سے نفرت نہ ہو اپنے منہ پر رومال ڈال لیا۔ بادشاہ کو حاسد کی بات کا یقین آ گیا۔ چنانچہ غصہ میں آ کر ایک خط لکھا اور اسے کہا کہ یہ خط فلاں حاکم کو دے آؤ۔ اس میں لکھا تھا کہ جب یہ شخص تمہارے پاس آئے اسے قتل کر دو اور گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھال اتار کر میرے ہاں بھیج دو۔ یہ شخص خط لے کر باہر نکلا تو راستے میں وہی حاسد مل گیا، ماجرا پُوچھا تو اس شخص نے کہا مجھے بادشاہ نے یہ خط دیا ہے تاکہ فلاں حاکم کو پہنچاؤں۔ حاسد نے نہایت عجز و انکساری سے خط مانگا اس لالچ سے کہ شاید اس میں انعام و اکرام لکھا ہو جیسا کہ اس سے قبل بادشاہ کی عادت تھی۔ اس شخص نے حاسد کے عجز کو دیکھ کر خط حاسد کو دے دیا۔ جب حاسد نے خط حاکم کو پہنچایا، حاکم نے خط پڑھا اور حاسد کو بتایا اس میں لکھا ہے کہ تمہیں قتل کروں اور گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھال اتار کر بادشاہ کو بھیجوں۔ حاسد چیخا، چلایا اور قسمیں کھائیں کہ یہ خط میرے نام کا نہیں دوسرے شخص کا ہے چلیے بادشاہ سے تحقیق کر لیجئے۔ حاکم نے کہا: یہ میرے بس کی بات نہیں۔ حاکم نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھال اتار کر بادشاہ کو بھیج دیئے۔ اگلے روز حسبِ معمول وُہ شخص بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ بادشاہ متعجب ہُوا اور پوچھا کل جو میں نے تجھے خط دیا تھا اس کا کیا ہوا؟ عرض کیا، فلاں شخص مجھ سے بہ منت سماجت لے گیا۔ بادشاہ نے پوچھا: کل مجھ سے ہمکلام ہوتے وقت تُو نے منہ پر رومال کیوں ڈالا؟ عرض کی، حضور! اسی شخص نے مجھے طعام کھلایا جس میں

کچا لہسن تھا۔ اُدھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، بات کرتے ہُوئے شرم آئی کہ کہیں میرے منہ کی بدبُو آپ کو تکلیف نہ دے میں نے منہ پر رومال ڈال لیا۔ بادشاہ ہنس دیا اور کہنے لگا: واقعی بُرے کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا:

ہر کہ او نیک مے کند یابد
نیک و بد ہر چہ مے کند یابد

ترجمہ: جو بھی نیکی یا بُرائی کرتا ہے نیکی یا برائی جیسی کرے گا ویسی پائے گا۔

مَا شرطیہ اور جازم ہے اور بہ بنائے مفعولیت منصوب ہے بمعنی ای شیئٍ۔ نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ کا محل نصب ہے لفظ ما کی تمیز ہے اور نسخ لغت میں ازالہ اور نقل کو کہتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے:

نَسَخَتِ الرِّیْحُ ای اَزَالَہٗ۔

اور کہتے ہیں:

نَسَخْتُ الْکِتٰبَ ای نَقَلْتُہٗ مِنْ نُسْخَۃٍ اِلٰی نُسْخَۃٍ۔

اور آیت کا نسخ بمعنی عبادت کے وقت کا انتہا قرأۃ، یا وہ حکم جو منسوخ ہو جو اس قرأۃ سے حاصل ہو۔

اقسامِ نسخ

نسخ کئی قسم ہے:

(۱) صرف قرأۃ کا منسوخ ہونا، جیسے آیۂ رجم۔ مروی ہے کہ یہ آیت یُوں تھی:

اِنَّ مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ الشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا

اب یہ آیت منسوخ التلاوت ہے لیکن حکم موجود ہے اور اس نسخ کا معنیٰ یہ ہے کہ نسخ تلاوت کے وقت اس کی قرأۃ کی تکلیف اُٹھالی گئی۔

(۲) حکم منسوخ، جیسے متوفّی عنہا زوجہا کی عدت کا ایک سال ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِیَّۃً لِّاَزْوَاجِھِمْ مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ۔

یہ غیر اخراج ہے اس کا حکم منسوخ ہے، اس آیت سے کہ جس میں حکم ہے کہ متوفی عنہا زوجہا کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِھِنَّ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّعَشْرًا۔

اس کی دُوسری مثال یہ ہے کہ پہلے حکم تھا کہ ایک فرد مسلمان دس کفار کے ساتھ صبر کرے۔ بعد میں یہ منسوخ ہو کر حکم ہُوا کہ ایک دو کے ساتھ صبر کرے۔ اسے منسوخ الحکم کہا جاتا ہے لیکن اس کی تلاوت موجود ہے۔ یہی قسم نسخ فی القرآن میں زیادہ مشہور ہے۔ آیت ناسخہ و منسوخہ دونوں میں تلاوت میں ثابت ہو گی لیکن منسوخہ آیت پر عمل ہرگز نہیں کیا جائے گا۔ اس جیسے نسخ کا معنیٰ یہ ہے کہ اس حکم کے ساتھ جو بندہ کو مکلف بنایا گیا تھا اس آیت سے اس کے انتہاء کا حکم

بیان کیا گیا ہے۔ حکم منسوخ ہو جانے کے بعد تلاوت کا حکم باقی رکھا گیا تا کہ اس کی قرأت سے بندوں کو ثواب حاصل ہو کیونکہ قرآن کو جس طرح کہ اس کے حکم کی وجہ سے حفظ کیا جاتا ہے تا کہ اس پر عمل کرنا بآسانی نصیب ہو۔ اسی طرح اس کی تلاوت اس لیے کی جاتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس پر اسے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ جس کا حکم و تلاوت دونوں منسوخ ہو جائیں۔ جیسے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کتاب اللہ میں پہلے دس رضعات یعنے دودھ چوسنے کا حکم تھا پھر پانچ کا کہ جس سے تحریم نکاح ثابت ہو جائے۔ اس قول کے مطابق اب یہ حکم بھی منسوخ ہے اور قرأت بھی اس جیسے نسخ کا مطلب یہ ہے کہ اس قرآت اور اس سے جو حکم حاصل ہو رہا تھا، کی تکلیف بندہ سے اٹھالی گئی۔ یہ آیت منسوخ ہوئی۔

قاعدہ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ جمہور کا اتفاق ہے کہ نسخ اوامر و نواہی میں ہوتا ہے نہ کہ اخبار میں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ پر کذب کا احتمال نہ ہو (کذب اللہ تعالیٰ سے محال ہے)۔

اَوْ نُنْسِهَا یا ان کے دلوں سے آیات کو مٹا دیں۔

شانِ نزول (۱) مروی ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رات گزارنے کے بعد صبح کو جب اُٹھے کہ سورۃ پڑھیں، لیکن انہیں وہ سورۃ سوائے بسم اللہ کے اور کچھ یاد نہ تھا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتِ حال بتائی۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ سورۃ اب منسوخ ہو گئی ہے اب نہ اس کی تلاوت ہوگی۔ نہ ہی اس کا حکم باقی رہا۔

(۲) مروی ہے کہ مشرکین اور یہود نے کہا کہ نبی علیہ السلام کی عجیب کیفیت ہے کہ ایک دن صحابہ کو کہتے ہیں کہ یہ کام کرو۔ پھر اسی سے انھیں روک دیتے ہیں بلکہ بسا اوقات اس حکم کے خلاف امر فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں اُن کا اپنا من گھڑت ہے مثلاً آج کوئی بات کہی اور کل اس سے رجوع فرما لیا۔ مثلاً زنا کی سزا پہلے یوں بتائی کہ زانی مرد عورت کو زبانی سزا کافی ہے۔ چنانچہ کہا:

فَاٰذُوْهُمَا (انھیں زبانی سزا دو)

پھر حکم دیا کہ انھیں اُن کے مرتے دم تک گھروں سے باہر نہ جانے دو۔

پھر یہ فرمایا:

فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔

یعنی انھیں سو کوڑے لگاؤ۔

اس سے یہودیوں کا مقصد صرف اسلام پر طعن و تشنیع کے سوا اور کچھ نہیں تھا تاکہ جو لوگ بھی اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اس ارادہ سے باز آ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وجہ سے آیات کے منسوخ ہونے کی حکمت بتائی۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ جس آیت کو اللہ تعالیٰ منسوخ کرتا ہے اس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے کہ اس کی تلاوت یا حکم دونوں منسوخ کر دے۔ پھر اس کے عوض دوسری آیت وغیرہ نازل فرمائے یا نہ، یہ اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔

نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اس سے اور بہتر حکم (جو بندوں کی مصلحت کے مطابق ہے) لاتے ہیں کہ منسوخ ہونے والی آیت کے بجائے اس آیت میں بندوں کا نفع اور ثواب زائد ہے۔

ازالۂ وہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آیتِ ناسخہ آیتِ منسوخہ سے افضل ہے یا بہتر ہے، بلکہ دونوں شان میں برابر ہیں کیونکہ دونوں اللہ تعالیٰ کے کلام ہیں اور اسی کی وحی اور اسی کی کتاب ہیں۔ صرف چونکہ بندہ کے فوائد منافع اور ثواب ناسخہ آیات میں زاید ہیں۔ اسی لیے ان کو برقرار رکھا گیا اور ان منسوخہ آیات کو اٹھا لیا گیا۔

اَوْ مِثْلِهَا ط یا یہ کہ آیتِ منسوخہ کی مثل نفع اور ثواب کے لحاظ سے دوسری آیت نازل کی گئی۔ اس کے دو طریقے ہیں:

(۱) آیتِ ناسخہ عمل کے لحاظ سے منسوخہ آیت سے آسان ہے۔

(۲) آیتِ ناسخہ میں عملی لحاظ سے مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اسی لیے اس میں منسوخہ آیت کی نسبت زائد ثواب ہے۔ پہلے کی مثال جیسے عورت متوفی عنہا الزوج کی عدت کا ایک سال کے بجائے چار ماہ دس دن کا حکم ہے۔ دوسرے کی مثال کفار سے پہلے جنگ کرنا اختیاری تھا، پھر واجب کیا گیا۔

(۳) ان دو صورتوں کے علاوہ ایک تیسری صورت بھی ہے، وہ یہ کہ منسوخہ اور ناسخہ آیات مشقت یا آسانی میں برابر ہوں جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا۔

مسئلہ: ضروری نہیں کہ نسخ ایک آیت یا اس سے زاید پر جاری ہو، بلکہ آیت کے کسی ایک ٹکڑے کو بھی منسوخ کیا جاتا ہے۔

سوال: آیت میں تو پوری آیت کا حکم ہے اور تم نے ایک ٹکڑے کا حکم کہاں سے ثابت کر لیا۔

جواب: آیت کا حکم بیان کرنا اغلبیت کے لحاظ سے ہے کہ اکثر نسخ تو آیت یا اس سے زاید میں ہوتا ہے لیکن کبھی کم میں بھی نسخ جاری ہو جاتا ہے۔

عقیدہ: ہر حکم کا حقیقی ناسخ اللہ تعالیٰ ہے یا خطابِ شرعی کو مجازاً ناسخ کہا جاتا ہے کیونکہ نسخ اسی سبب سے ہوا۔ بنا بریں فعل کا اسناد اسی کی طرف ہوتا ہے۔

ف: منسوخ وہی حکم ہے جو بندوں سے ہٹایا گیا ہے اور منسوخ عنہ وُہ بندہ ہے جسے اس حکم کے ہٹائے ہُوئے سے دُور رکھا گیا ہے۔ یعنی بندہ مکلّف عاقل بالغ۔

نسخ کی حکمت[1]: تم نے اطباء کو دیکھا ہوگا کہ مریض کے مزاج کے مطابق ادویہ اور اغذیہ تبدیل کرتے ہیں۔ اسی

---

[1] نسخ کی مزید تفصیل فقیر کی کتاب "القول الراسخ فی تحقیق المنسوخ والناسخ" یا "احسن البیان" کا حصہ اول میں پڑھیے۔ اویسی غفرلہ

طرح حضرات انبیاء علیہم السلام ہمارے روحانی معالج ہیں۔ ہمارے نفوس کے کوائف کو دیکھ کر اعمالِ شرعیہ اور احکامِ خلقیہ کو تبدیل کرتے رہتے ہیں کیونکہ ارواح کو بھی اس کی ضرورت ہے جیسے اجسام کو اغذیہ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اعمال و احکام ارواح کی اغذیہ ہیں۔ انھیں مزاجوں کے مطابق تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ دیکھئے کسی وقت ایک دوائی کسی انسان کے لیے مفید ہوتی ہے اور وہی دوائی کسی دوسرے وقت اسی انسان کے لیے زہر قاتل بن جاتی ہے۔ اسی طرح اعمال کے کوائف ہیں کہ کسی وقت مفید ہوتے ہیں اور کسی وقت نقصان دہ۔ کچھ ایسی ہی کیفیت پیر و مرید کی بھی ہے کہ سلوک کی راہ میں مختلف عادات و اطوار انہیں استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اس کا علم اسے ہے جس نے کسی مرشد کا دامن پکڑا ہے۔ مثنوی شریف میں ہے ؎

۱	رمز ننسخ آیت او ننسہا	نأت خیراً در عقب می‌دان ہما
۲	ہر شریعت را کہ حق منسوخ کرد	او گیا برد و عوض آورده ورد
۳	اندریں شہر حوادث میر اوست	در ممالک مالک تدبیر اوست
۴	آنکہ داند دوخت او داند درید	ہرچہ را بفروخت نیکوتر خرید

ترجمہ : ۱۔ رمز آیت ننسخ او ننسہا پڑھ، اس کے بعد نأت بخیر کو بھی۔ اے میرے عزیز! سمجھ۔

۲۔ جس شریعت کو حق تعالیٰ نے منسوخ کیا، لکڑی کو لے لیا لیکن پھول اس کا فرمایا۔

۳۔ اس شہر میں حوادث ہیں جن کا مالک وہی ہے اپنے ملکوں کی تدابیر کا خود مالک ہے۔

۴۔ جو سینا جانتا ہے وہ پھاڑ بھی سکتا ہے، جو کچھ بیچا اس سے بہتر خریدا۔

اَلَمْ تَعْلَمْ یہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور استفہام تقریری ہے یعنی بے شک آپ جانتے ہیں کہ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ جب وہ ہر شے پر قادر ہے تو نسخ کرکے آیت منسوخ کی طرح دوسری آیت یا اس سے بہتر لانے پر بھی قادر ہے۔ اَلَمْ تَعْلَمْ کیا تو نہیں جانتا۔

سوال : اس خطاب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں خاص فرمایا؟ حالانکہ غیر بھی اس میں شامل ہے۔

جواب : اس کی وجہ یہ ہے کہ خطاب سے مذکور شے کے متعلق مخاطب کے علم کی تقریر مطلوب ہوتی ہے۔ اور نبی علیہ السلام کے سوا کوئی بشر زیادہ عالم نہیں ہے کیونکہ جتنا ملک السمٰوٰت والارض کے اسرار کے عالم آپ ہیں، کسی دوسرے کو کیا خبر!

علم غیب کا بیان

اذ قد وقف من اسرار ملكوت السمٰوٰت والارض على ما يطلع عليه غيره وعلم غيره بالنسبة الى علمه عليه السلام ملحق بالعدم لان علم الاولياء من علم الانبياء بمنزلة قطرة من سبعة ابحر وعلم الانبياء من علم نبينا محمد عليه السلام

کیونکہ آسمان و زمین کے ملکوت کے اسرار جو کچھ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں کسی دوسرے کو ہوا بھی نہیں لگی کیونکہ دوسروں کے علم آپ کے علم کے سامنے کالعدم ہیں اس لیے کہ اولیاء کرام کے علوم انبیاء علیہم السلام کے علوم کے آگے ایسے ہیں جیسے قطرہ کو دریا سے نسبت ہے پھر

بمنزلة المنزلة وعلم نبینا من علم الحق سبحانہ بمنزلة المنزلة۔ (روح البیان ج ۱ ص ۱۳۰)
انبیا علیہم السلام کے علم کے مقابلے ایسے ہے پھر حضور کے علم کو اللہ تعالیٰ کے علم کے آگے اسی طرح۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور حکم دیتا ہے جو ارادہ کرتا ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کے ملک اسی کے ہیں۔ یہ آیت عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کے بمنزلہ دلیل کے لیے ہے۔ مُلْكٌ بمعنی تمام القدرۃ اور اس پر قابض ہونا۔

سوال: السموٰت والارض کی تخصیص بالذکر کیوں ہے حالانکہ تمام دنیا و آخرت اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

جواب: اللہ تعالیٰ کی مصنوعات سے یہ دونوں اعظم بالشان اور عجیب ترین ہیں۔

وَمَا لَكُمْ تمہارے لیے نہیں اے مومنو! مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اللہ کے ماسوا۔ یہ بمایہ ولی سے حال ہونے کی وجہ سے نصب کے محل میں ہے، در اصل ولی کی صفت ہونا چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ وہ مقدم واقع ہوا ہے۔ بنا بریں اسے منصوب ہونا زیادہ لائق ہے مِنْ استغراق کے لیے ہے اور وہ زائد ہے وَّلِيٍّ بمعنی قریب وصدیق۔ بعض کہتے ہیں ولی بمعنی والی، یعنی وہ جو امر کی درستی کرنے والا ہو وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ یعنی معین وناصر۔

ف: ولی اور نصیر میں فرق یہ ہے کہ ولی کبھی مدد کرنے سے ضعیف ہوجاتا ہے اور نصیر نہیں ہوتا۔ اور نصیر کبھی اجنبی ہوتا ہے اور ولی نہیں ہوتا۔ اس میں مومنین کو تسکین دی گئی ہے کہ تمہارا یار و مددگار اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ فلہذا اس کے ماسوا کسی دوسرے پر اعتماد مت کرو اور اس کے ماسوا کسی سے التجا بھی نہیں کرنی چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تین امور کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے:

عقیدہ

(۱) اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں زمین و آسمان ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی حامی و ناصر نہیں۔

اور یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ دینی اور دنیوی معاملات میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں کرے گا۔ اور اس آیت پر عمل کا موجب ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا چاہیے اور ہر امر اس کے سپرد کرنا چاہیے۔ کفار کی طرف نہ دھیان کرنا چاہیے اور نہ ہی ان کے شک آمیز اقوال (منجملہ ان کے امر نسخ بھی ہے) کی طرف خیال کرنا چاہیے۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ یہ لفظ اَمْ ہمزہ استفہام جو الم تعلم میں واقع ہے کی وجہ سے ہے۔ یعنی اے لوگو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جملہ امور کا مالک اور ہر شے پر قادر ہے۔ وہ امر و نہی جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ کیا تم عمداً سوال کرتے ہو جیسے یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو تنبیہ ہوجائے کہ وہ اپنے امور خصوصاً نسخ کے معاملہ میں مضبوط ہوجائیں اور اس کی تحقیق و تفتیش کے درپے نہ ہوں اور نہ ہی سوچے سمجھے بغیر اعتراض کریں اَنْ تَسْئَلُوْا یہ کہ تم اے مسلمانو! سوال کر بیٹھو رَسُوْلَكُمْ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے، چونکہ ان کی شان بہت بلند ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی خواہشات سے مغلوب ہوکر ان سے

ناجائز سوال کر بیٹھو۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔ وُہ جو کچھ تمہارے پاس بھیجتا ہے یہ اس کا فضل ہے۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کے اسرار سے کیا خبر۔ یہ ان کو اس وقت فرمایا جب صحابہ کرام خواہ مخواہ نسخ کے احکام کی حکمتوں اور اس کی تفصیل کے پیچھے پڑ گئے۔ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى یہ ما مصدریہ ہے، اور یہ فعل مصدر بن کر تشبیہ کا فائدہ دے رہا ہے۔ اسی لیے اسے مصدر تشبیہ کہتے ہیں۔ پھر یہ مصدر محذوف کی صفت ہے اور اصل عبارت یوں تھی :

سوالاً مشبهاً بسوال موسٰی علیه السلام۔

یعنی ایسا سوال نہ کرو جو حضرت موسٰی علیہ السلام کے سوال کے مشابہ ہو۔

وُہ سوال یہ تھا کہ اُن کے متبعین نے جب دیکھا کہ بعض لوگ گؤ سالہ پرستی کرتے ہیں تو انھوں نے بھی کہہ دیا،

اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰـهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ۔

(ہمارا معبود بھی ایسا ہونا چاہیے)

دوسرا سوال یہ کیا کہ ہمیں اپنا خدا دکھاؤ اور وہ بالکل آمنے سامنے ہو کر آئے۔ علاوہ ازیں وہی سوالات کیے جو اس پارہ کے اوّل میں گزرے۔

مِنْ قَبْلُ حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے۔ یہ سُئِلَ سے متعلق اور تاکید کے لیے ہے وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ جو کفر کو اپنے لیے اختیار کرتا ہے بِالْاِيْمَانِ ایمان کی بجائے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وُہ آیات جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مصلحت کے لیے نازل ہوتی ہیں اگرچہ وہ ناسخہ سہی، ان پر جو شخص بھی اعتبار نہ کرے (حالانکہ یہ اُس وقت تمہاری بہبودی اور خالص حق کے لیے ہیں) ان کے برعکس چاہے فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ○ تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔ یعنی ایسے راستے سے بھٹکا جو ہدایت اور حق کا راستہ ہے اور وُہ خواہشاتِ نفسانیہ کے چنگل میں پھنس گیا اور ہلاکت کے گڑھے میں جاگرا۔

ف : سَوَاءُ السَّبِيْلِ ہر وہ راستہ جو زیادتی و کمی سے پاک ہو اور وہی حق کی راہ ہے۔

شانِ نزول یہودیوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کیا کہ آپ پر قرآن مجید یکبارگی کیوں نہیں اُترتا جیسے حضرت موسٰی علیہ السلام پر تورات یکبارگی نازل ہُوئی۔ تب یہ آیت اُتری۔ کما قال اللہ تعالیٰ :

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ اِلٰی قولہ جَهْرَةً۔

اس لحاظ سے اَمْ تُرِيْدُوْنَ کے مخاطب یہود ہوں گے۔

سوال : رسولکم کا خطاب تو اسی تفسیر کے خلاف ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہودیوں کے بھی تو رسول تھے۔

جواب : آپ کی رسالتِ عامہ میں وُہ بھی شامل ہیں کیونکہ وُہ آپ کی اُمتِ دعوت میں داخل ہیں۔ ان کے تبدّلِ کفر کا

یہ معنیٰ ہے کہ انہوں نے اپنی قدرت کو صرف کرنے کو ترک کیا انہیں قدرت حاصل ہونے کے باوجود وہ کفر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں: یہی تفسیر زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ آیت مدنیہ ہے اور اس سورۃ کے ابتدا یٰبَنِی اسرائیل اذکروا نعمتی تک ان کی حکایت نقل ہے اور ان پر حجت قایم کرنی تھی قایم کردی۔

مسئلہ : اس آیت میں آداب غلامانہ بھی سمجھائے گئے ہیں جو اپنے آقا اور رسول اور خلیفہ کا ادب نہیں کرتا تو سمجھ لو کہ وہ کفر کو پسند کر رہا ہے۔

ف : ادب کا معنیٰ یہ ہے کہ بھلائی کو جمع کر لیا جائے۔

حدیث شریف میں ہے، حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"والد پر اولاد کے حقوق میں سے ہے کہ اولاد کا اچھا نام رکھے اور اسے اچھی عورت کا دودھ پلائے اور اسے اچھے آداب سکھائے ورنہ اس سے قیامت میں سوال ہوگا۔ اور گرفت ہوگی اگر اس نے ان کے حقوق میں کمی کی۔"

ف : بستان العارفین میں ہے کہ ایمان کی مثال ایک ایسے شہر کی ہے کہ جس کے پانچ دروازے ہوں:

(۱) سونے کا (۲) چاندی کا

(۳) لوہے کا (۴) تانبے کا

(۵) کچی اینٹ کا۔

جب تک شہر والے اس شہر کے پانچویں دروازے کی حفاظت کریں گے دشمن ان پر حملہ نہیں کر سکے گا جب اس کی حفاظت سے غفلت کریں گے تو دشمن اس میں گھس کر سارے شہر کو تباہ کر ڈالے گا۔

اسی طرح ایمان کے پانچ قلعے ہیں:

(۱) یقین (۲) اخلاص

(۳) اداء الفرائض (۴) اتمام سُنن

(۵) مستحبات

جب مستحبات کی پابندی کی جائے تو شیطان دور رہتا ہے۔ جب مستحبات کو ترک کر دیا جائے تو شیطان کو حملہ کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے پھر وہ سنت کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہے، اس کے بعد فرائض، پھر اخلاص میں خلل ڈالتا ہے، پھر یقین ختم کرا لیتا ہے۔

سبق سالک کو چاہیے کہ مستحبات کی پابندی کرے۔ کسی ایک معاملہ میں وضو ہو یا نماز، بیع شراء ہو یا دوستی رفاقت وغیرہ، کوتاہی نہ کرے۔

ف: شریعت احکام کا نام ہے، طریقت ادب کو کہتے ہیں۔ جتنے گمراہ ہوئے ادب کے ترک کرنے کی وجہ سے ہوئے۔ مثال کے طور پر ابلیس کو دیکھئے۔ ایسے ہی دوسرے گمراہوں کو جانیے ؎

۱ بے ادب مرد کے شود مہتر
گرچہ او را جلالت نسب است

۲ با ادب باش تا بزرگ شوی
کہ بزرگی نتیجۂ ادب است

ترجمہ: ۱۔ بے ادب کب سردار بن سکتا ہے، چاہے اس کی نسبت کتنی ہی بزرگ ہو۔
۲۔ با ادب ہو تاکہ بزرگی نصیب ہو کیونکہ بزرگی ادب کا نتیجہ ہے۔

ف: حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پوچھا گیا کہ کون سا ادب اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے؟ آپؒ نے فرمایا: اللہ کی ربوبیت کی معرفت اس کی طاعت پر عمل اور ہر سکھ پر حمد اور دُکھ پر صبر۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ یہ لوگ علماءِ یہود کا ایک گروہ تھا۔

شانِ نزول مروی ہے کہ فنحاص بن عازو اور زید بن قیس یہود کے چند افراد حضرت حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو جنگِ اُحد کے بعد کہنے لگے "کیا تم سوچتے نہیں کہ تمہیں اس موقع پر کتنی تکلیف پہنچی ہے۔ اگر تم حق پر ہوتے تو تمہیں شکست نہ ہوتی۔ بنا بریں تمہیں چاہیے کہ ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ ہم تم سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔" حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "تمہارے نزدیک عہد شکنی کتنا گناہ ہے؟" انہوں نے کہا: "گناہِ کبیرہ ہے۔" حضرت عمارؓ نے فرمایا: "اب تم جواب دو کہ میں عہد کر چکا ہوں کہ جب تک زندہ رہوں گا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر نہیں کروں گا۔" یہود نے کہا: "افسوس! کہ عمار ہمارے دین سے صابی ہو گیا اور ایسا خارج ہو گیا کہ اب اس کے لوٹنے کی امید بھی نہیں ہے۔" پھر پوچھا: "اے حذیفہ! تیرا کیا حال ہے؟" انہوں نے فرمایا: "میں اللہ کے رب اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی اور اسلام کے دین اور قرآن کے امام اور کعبہ کے قبلہ اور مومنین کے بھائی ہونے پر راضی ہوں۔" یہود نے کہا: "اس رب کی قسم جو موسیٰ علیہ السلام کا معبود ہے تم دونوں کے دلوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔" وہ دونوں حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے حضور میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آپؐ نے فرمایا: "تم نے بہت اچھا جواب دیا اور بڑی کامیابی حاصل کی۔"

خلاصہ یہ کہ بہت سے یہود لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ تمہارے دین سے پھر جانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ کیونکہ لَوْ مصدریہ ہے یہ جب فعل کے بعد واقع ہوتا ہے تو اس میں تمنّی کا معنیٰ ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ۔

یعنی آرزو رکھتے ہیں تمہارے لیے توحید سے پھر جانے کی۔

مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ اے مومنین کے گروہ كُفَّارًا ۖ کہ تمہیں مرتد بنا دیں۔

حلِ لغات لفظ کُفاراً ، یَرُدُّوْنَکُمْ کی ضمیر مخاطب سے حال ہے اور ہو سکتا ہے کہ یَرُدُّوْنَکُمْ کا مفعول ثانی ہو جبکہ وہ یُصَیِّرُوْنَکُمْ کے معنی کو متضمن ہو۔

حَسَدًا یہ فعل وَدَّ کی علت ہے۔ گویا کہا گیا ہے کہ حسد کی وجہ سے بہت سے یہود تمہارے مرتد ہونے کی خواہش رکھتے ہیں مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ فعل وَدَّ کے متعلق ہو تو بھی جائز ہے۔ اب معنیٰ ہوگا کہ وہ لوگ اپنے نفسوں کی آرزو اور خواہش کے مطابق تمہارے مرتد ہونے کے متمنی ہیں نہ کہ بحیثیت دین کی تائید اور میل الی الحق کی خاطر۔ اگرچہ اُن کا یہی خیال ہے کہ ہم دین کی محبت سے یہ آرزو رکھتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ کیونکہ جب اُن کی ذاتی خواہش ہے تو دعویٰ حق کا کیا مطلب؟ اور جائز ہے کہ حَسَدًا کے متعلق ہو۔ اب معنیٰ یہ ہوگا کہ یہ خواہش اُن کے اصل نفوس سے حسد کی وجہ سے بھڑک اٹھتی ہے اور حسد کے انتہائی درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ بعد اس کے کہ انہیں یقین ہو چکا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں۔ اُن کا ہر قول برحق ہے اور اُن کا دین بھی حق ہے اس لیے کہ اُن کی تائید معجزات سے بھی ہو رہی ہے اور اُن کی کتاب تورات میں بھی اُن کے اوصاف درج ہیں فَاعْفُوْا پس درگزر کرو۔

حلِ لغات عفو بمعنی ترک عقوبت المذنب۔ جیسے کہا جاتا ہے:
عَفَتِ الرِّيْحُ الْمَنْزِلَ یعنی گھر کو ہوا نے مٹا دیا۔

اور کہتے ہیں:

عفا المنزل ویعفو بمعنی دَرَسَ۔ متعدی ولازم دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور مجرم کے گناہ کو ترک کرنا گویا اس کے گناہ کو مٹا دینا ہے۔ اس حیثیت سے کہ اس سے بدلہ لینے اور اُسے سزا دینے سے درگزر کیا جاتا ہے چونکہ یہ معنی صَفْحٌ کو مستلزم نہیں۔ اسی لیے فرمایا: وَاصْفَحُوْا کیونکہ انسان کبھی معاف تو کر دیتا ہے لیکن اعراض نہیں کرتا۔

حلِ لغات الصفح بمعنی ترك التقريع باللسان او الاستنقاء فی اللوم۔ جیسا کہ کہتے ہیں:
صفحت عن فلان۔

یہ اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ اس کے گناہ سے بالکل روگردانی کی جائے۔

اور اہلِ عرب کہتے ہیں، قَدْ ضَرَبْتُ عَنْهُ صَفْحًا۔ (یعنی میں نے اس سے اعراض کر لیا اور اسے چھوڑ دیا)

اور عفو وصفح سے یہ مراد نہیں کہ ان کے افعال سے رضا کا اظہار کیا جائے۔ کیونکہ اُنھوں نے تو اللہ تعالیٰ سے کفر کیا اور کفر کا اللہ تعالیٰ حکم نہیں دے گا۔ بلکہ مراد ہے کہ اُن سے جنگ کرنا اور ان کی بُری باتوں کا جواب دینا چھوڑ دو۔

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اللہ تعالیٰ اس حکم کے ساتھ حکم دیتا ہے جو اذن بالقتال اور جزیہ کا مقرر کرنا یا بنی قریظہ کو قتل کرنا اور بنی نضیر کو جلاوطن کرنا وغیرہ۔

شانِ نزول مروی ہے کہ صحابہ کرام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی اور کہا کہ ہمیں اجازت دے دیں کہ جن یہود نے کفر کیا اور مسلمانوں کو کفر کی طرف بلایا ہم اُن سے لڑیں۔ یہ آیت نازل ہوئی اور حکم کیا گیا کہ جنگ ترک کرو۔ اور ان کے مقابلہ سے روگردانی کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ ان سے انتقام لینے پر قادر ہے۔ اور جب وقت آئے گا تو ان سے ضرور انتقام لے گا۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ اس کا فَاعْفُوْا پر عطف ہے۔ گویا انہیں صبر اور استقامت اور عبادت ونیکی کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہوا۔ مراد یہ ہے کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں فرائض و واجبات وتطوعات میں سرگرم رہو جیسا کہ قرینہ بتاتا ہے وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ اگرچہ خیر تمام عبادات کو شامل ہے لیکن نماز اور زکوٰۃ کو خصوصی طور پر بیان فرمایا۔ اُن کے عظیم الشان اور بلند قدر ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ نماز عبادت بدنیہ ہے تاکہ انسان کا ہر عضو عبادت کرکے اللہ تعالیٰ کی نعمت عطا کردہ کی شکرگزاری کرے اور زکوٰۃ عبادتِ مالیہ ہے، اس میں اغنیاء کو ان نعمتوں کی شکرگزاری کا موقع مل جائے جو انھیں لذیذ عیش کی وسعت نصیب ہوئی۔ وَمَا تُقَدِّمُوْا جملہ شرطیہ ہے یعنی جو خیرات بھی ہو خواہ نماز ہو یا زکوٰۃ وغیرہ اپنی بہتری کے لیے آخرت کی طرف بھیجو۔ تَجِدُوْهُ یعنی عمل کا ثواب وجزا نہ وہی بعینہٖ کیونکہ وہ تو باقی نہیں رہتے۔ علاوہ ازیں ان اعمال کے عین کے حصول میں رغبت نہیں دلائی جاتی عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اللہ تعالیٰ کے ہاں یعنی آخرت میں محفوظ پاؤ گے۔ یعنی اس کا ثمرہ جو کہ ایک لقمہ جو کہ اُحد پہاڑ کے برابر ہو جائیں گے۔ تقدیم (آگے بھیجنے کے حکم) میں اشارہ ہے کہ جو انعام اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرمائے ہیں۔ ان سے مقصد اصلی یہ ہے کہ اپنے لیے آخرت کا سامان بھیجیں اور آنے والے دن کے لیے ذخیرہ بنائیں۔

حدیث شریف جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:
جب بندہ مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس نے کیا چھوڑا؟ فرشتے کہتے ہیں اس نے آخرت کے لیے کیا بھیجا۔ یعنی لوگ دنیا کی باتیں کرتے ہیں، فرشتے آخرت کے متعلق۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○ یعنی وہ اللہ تعالیٰ ہر شے کو جانتا ہے خواہ تمہارے اعمال قلیل ہوں یا کثیر۔

ف : عمل کا لفظ عام ہے ، نیک ہو یا بُرا ، ترغیب ہو یا ترہیب ، اعمال کی ترغیب اسی لیے ہونی چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر نیک عمل پر اچھی جزا دیتا ہے ، وہ تھوڑا ہو یا زیادہ ، جیسے کہ بُرے عمل کی سزا دے گا ۔ خواہ وہ بُرا عمل تھوڑا ہو یا زیادہ ، اس کی بارگاہ میں کوئی عمل ضائع نہیں جاتا ۔

حکایت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جنت البقیع سے گزر ہوا تو فرمایا "السلام علیکم یا اھل القبور! ہمارے حالات سُننے ہیں تو سُن لو ، وہ یہ کہ تمہاری عورتوں کے نکاح کر دیے گئے اور تمہارے مکانات میں اور لوگ بسنے لگے ہیں اور تمہارے مال تقسیم ہو گئے " آپ کے ان کلمات کے بعد ہاتف نے جواب دیا : اے ابن الخطاب ! ہمارا حال یہ ہے کہ جو اعمال ہم نے کیے اُن کی ہمیں جزا مل گئی ۔ اور جو مال ہم نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اس کا اچھا بدلہ مل گیا ۔ لیکن افسوس ہے کہ جو مال ہم پیچھے چھوڑ آئے وہ گھاٹے میں ہے ۔

کسی نے کیا خوب فرمایا ہے : ؎

قدّم لنفسك قبل موتك صالحاً

واعمل فليس الى الخلود سبيل

ترجمہ : اپنے لیے اگلے ملک میں موت سے پہلے کوئی نیکی بھیج اور اچھے عمل کر اس دنیا میں کسی نے نہیں رہنا ۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرّہٗ نے فرمایا : ؎

۱ تو غافل در اندیشۂ سود و مال
که سرمایۂ عمر شد پائمال

۲ غبار ہوا چشمِ عقلت بدوخت
سموم ہوا کشتِ عمرت بسوخت

۳ بکن سرمۂ غفلت از چشم پاک
که فردا شوی سرمہ در چشم خاک

ترجمہ : ۱ ۔ سود و مال کے فکر میں غافل ہو گیا ، اسی طرح زندگی کا سرمایہ ضائع ہو گیا ۔
۲ ۔ خواہشات کی غبار نے تیری عقل کی آنکھ سی دی ۔ خواہشات کی زہریلی ہوا نے تیری کھیتی جلادی ۔
۳ ۔ غفلت کا سُرمہ آنکھ سے صاف کر عنقریب تو خود خاک کی آنکھ کا سُرمہ بننے والا ہے ۔

ف : دُنیا کے ہر عمل کا ثواب مرنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے ، صرف چند اعمال ایسے ہیں جن کا مرنے کے بعد ثواب ملتا رہتا ہے وہ یہ ہیں پہلا اپنی نیک کمائی سے مسجد بنوانا ، پُل تعمیر کروانا ، رباط اور اوقاف فقراء کے لیے مقرر کرجانا ۔

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اپنی 'بوستان' میں فرمایا ہے۔ اس

۱ ازاں کس کہ خیرے بماند رواں
دما دم رسد رحمتش بر رواں

۲ نمرد آنکہ ماند پس از وے بجائے
پل و مسجد و خان و مہمان سرائے

۳ ہر آنکو نماند از پسش یادگار
درخت وجودش نیاورد بار

۴ دگر رفت و آثار خیرش نماند
نشاید پس مرگ الحمد خواند

ترجمہ :۱۔ جس کی مرنے کے بعد خیرات (نیکی) جاری رہی ہر لحظہ اس پر رحمت کی بارش ہوتی رہے گی۔
۲۔ وہ مرتا نہیں جس کے پیچھے پل، مسجد اور خیرات اور مہمان خانہ باقی رہا۔
۳۔ جس کی مرنے کے بعد کوئی یادگار نہ ہو اس کے وجود کا درخت پھل نہ لائے گا۔
۴۔ کوئی مرا اور نیکی چھوڑ کر نہ گیا اس کے پیچھے فاتحہ بھی نہ پڑھنی چاہیے۔

حدیث شریف اسی طرح حدیث شریف میں اشارہ ہے کہ جب انسان مرتا ہے تو اس کے اپنے اعمال کی جزا ختم ہو جاتی ہے، صرف تین عمل ایسے ہیں جن کا ثواب ملتا رہتا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ عقل راجح سے فائدہ اٹھائے (یعنی علم پڑھے اور اس پر عمل کرے)۔ (حدیث کے الفاظ یہ ہیں :) اَوْ عِلْمٍ یُّنْتَفَعُ بِہٖ ۔

بعض کہتے ہیں وہ قوتِ عقلیہ جس سے شرعی امور کا مخصوص قرآن و حدیث سے استنباط کرے۔ صحیح یہ ہے کہ حکم عام ہے خواہ علم کا فائدہ تصنیف سے ہو یا تعلیم و تدریس سے، لیکن علوم شرعیہ ہیں یا ایسے علوم میں، جن سے شرعی امور متعلق ہیں۔ علم کو مفید ہونے کی قید اس لیے لگائی جاتی ہے کہ وہ علم جو کہ غیر مفید ہو اس سے نیک ثمرہ کے حصول کا کیا معنیٰ، وہ الٹا وبالِ جان اور موجبِ عذاب بنے گا۔

حدیث شریف میں ہے :
من کتم علما یعلمہ الجم یوم القیٰمۃ بلجام من النار۔

(جو شخص اپنے علم کو چھپاتا ہے قیامت میں اس کے منہ میں جہنم کی لگام دی جائے گی)
امام سخاوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں : یہ وعید اس شخص کے لیے بھی ہے جو اپنی کتاب کسی کو مطالعہ کے لیے نہیں دیتا۔
تیسرا وہ جو اس کے وجود سے صادر ہوں، جیسے نیک اولاد چھوڑ جائے۔ حدیث شریف میں اسی طرف اشارہ ہے،

و ولد صالح یدعو لہ۔ (یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعائے خیر کرے)
ولد کو صالح سے اس لیے مقید کیا گیا ہے کہ غیر صالح اولاد سے فائدہ کے حصول کا کیا معنیٰ !

مسئلہ : اولاد کا گناہ والد کے نام نہیں لکھا جائے گا جبکہ اس کا ارادہ نیک ہو کہ اس کی اولاد نیک ہو۔ لیکن اولاد بد نکلی ۔ "یدعو لہ" کی قید میں ہر اولاد کو تنبیہ ہے کہ وہ اپنے والدین کے لیے ہر وقت نیک دعائیں مانگے نہ یہ کہ صرف مرنے کے بعد۔

مسئلہ : اولاد نیک دعا مانگے یا نہ مانگے والدین کو تو ثواب ضرور ملے گا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص درخت بوئے اور اس کی نیت لوگوں کو اس کے ثمرات سے فائدہ پہنچانے کی ہو تو اس کو اس کی نیت سے ثواب ملے گا خواہ لوگ اس کے ثمرات کھا کر اس کے لیے دعا مانگیں یا نہ مانگیں۔

مسئلہ : حدیث کے حکم میں اولاد کے ثواب میں ماں بھی داخل ہے

سوال : حدیث مذکور کو اس حدیث سے کیا مطابقت ہوگی؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا :

مَن سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ فلہٗ اجرھا و اجر من عمل بھا الیٰ یوم القیٰمۃ ۔

(جس نے کوئی نیک طریقہ اسلام میں جاری کیا اس کا ثواب اور اس پر عمل کرنے والے کا ثواب بھی اسے قیامت تک ملتا رہے گا)

پہلی حدیث میں صرف تین شخصوں کے لیے مرنے کے بعد ثواب ملنے کا وعدہ تھا اب ایک اور بھی نکل آیا۔ اسی طرح دوسری حدیث میں ہے :

مَن مات یختم علیٰ عملہ الا المرابط فی سبیل اللہ فانہ لہ عملہ الیٰ یوم القیٰمۃ ۔

(جو شخص مر جاتا ہے اس کے عمل کے ثواب پر مہر لگ جاتی ہے (یعنی عمل کا ثواب آگے کو نہیں ملتا) ہاں مجاہد فی سبیل اللہ کا ثواب قیامت تک بڑھتا رہے گا ،

جواب : پہلی حدیث میں جو کہا گیا کہ جس نے اچھا طریقہ جاری کیا وہ علم مفید کے کھاتے میں شامل ہو گیا۔ اور مجاہد فی سبیل اللہ کے عمل میں بڑھنے کا یہ معنیٰ ہے کہ عمل تو اس کا وہی ہے جو اس نے اپنی زندگی میں کیا لیکن اس عمل کے ثواب میں برکت ہوگی۔ اور حدیث میں جن اعمال کا حکم ہے وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد اس کے مرنے کا اثر موجود ہے۔ اسی عمل سے ہی اس کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔

چوتھا یہ کہ اس کی روح کی پرورش سے اولاد معنوی پیدا ہو۔ مثلاً پیران عظام۔ مشائخ کرام۔ صوفیہ حضرات کہ جنہوں نے شریعت مطہرہ کے قواعد کے مطابق اپنے مریدین کی تربیت فرمائی تو ان کو بھی ان کے مرنے کے بعد ثواب ملے گا۔ ممکن ہے یہ حدیث کی پہلی قسم میں داخل ہو۔

وَقَالُوْا اور کہتے ہیں۔

شانِ نزول یہ آیت نجران کے وفد کے حق میں نازل ہوئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں نصاریٰ مع یہود جمع ہوکر ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔ یہود بنی نجران کے متعلق کہتے ہیں کہ نصاریٰ بہشت میں نہ جائیں گے یہودنے کہا ہمارے سوا کوئی بہشت میں داخل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اہلِ کتاب میں سے یہود و نصاریٰ کہتے ہیں، لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ط مَنْ کَانَ کے بجائے کَانُوْا نہیں فرمایا مَنْ کے لفظاً مفرد ہونے کی جانب پر محمول کرکے اور خبر کو جمع لایا گیا۔ لفظ مَنْ کے معنی پر محمول کرتے ہوئے۔ اور هُوْدًا ھائد کی جمع ہے۔ بمعنی تائب۔ جیسے فرمایا "هُدْنَا اِلَيْكَ"۔ پہلے تو مدح کے طور پر ان لوگوں پر اس کا اطلاق ہوتا تھا جنہوں نے گئوسالہ پرستی سے توبہ کی تھی لیکن پھر جب ان کی شریعت منسوخ ہوئی تو اب ایک جماعت لازمی پر استعمال ہونے کی وجہ سے اس کا اسم علم کی طرح ہوگیا۔ نصٰرٰی، نصران کی جمع ہے جیسے سکرٰی، سکران کی جمع ہے۔

تِلْكَ یعنی وہ غلط دعوٰی جو کرتے پھرتے ہیں کہ بہشت میں سوائے یہود و نصٰریٰ کے اور کوئی داخل نہیں ہوگا۔

اَمَانِیُّهُمْ ط یہ صرف ان کی خواہشاتِ فاسدہ ہیں کہ جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں آرزوئیں پیش کرتے ہیں۔

حلِ لغات اَمَانِیُّ، اُمْنِيَّةٌ کی جمع ہے۔ یعنے وہ شے کہ جس کی آرزو کی جائے۔ بروزن افعولہ اعجوبہ کی طرح ہے۔ اہلِ عرب ہر اس چیز کو، جس میں کسی قسم کی دلیل نہ ہو، مجازاً تمنی وغرور واضلال و احلام سے موسوم کرتے ہیں۔

ف : امانی جمع اس لیے لایا گیا کہ یہ تمنائیں دونوں یعنی یہود و نصاریٰ سے صادر ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لسانِ مبارک سے ان کے اقوال کے بطلان کی طرف اشارہ فرمایا۔

قُلْ هَاتُوْا

حلِ لغات : هَاتُوْا دراصل اٰتُوْا تھا۔ ہمزہ سے تبدیل کیا گیا۔ اور یہ تعجبی امر ہے۔ ای احضروا۔

بُرْهَانَكُمْ یعنی وہ حجت پیش کرو جس میں ثابت ہو کہ بہشت میں صرف تم لوگ داخل ہوگے۔

سوال : براھین کو جمع کرکے کیوں نہ لایا گیا!

جواب : ان سب کا دعوٰی ایک تھا وہ یہ کہ بہشت میں ہمارا غیر داخل نہیں ہوگا۔ فلہٰذا اس دعوٰی پر حجت ایک ہی پیش ہوگی۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، کیونکہ جس دعوٰی پر کوئی دلیل نہ ہو وہ دعوٰی ثابت نہیں ہوا کرتا۔ بَلٰی ان کا قول لن یدخل الجنۃ الخ اثبات اور نفی دونوں پر مشتمل تھا۔ اثبات اس طرح کہ کہتے ہیں

بہشت میں یہود ونصاریٰ داخل ہوں گے۔ اور نفی اس طرح کہ وہ قائل تھے کہ ہمارے سوا اور کوئی بہشت میں داخل نہیں ہوگا۔ لفظ بلیٰ اس کلام کے اثبات کے لیے آتا ہے جس کی وہ نفی کر رہے تھے۔ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ اللہ تعالیٰ کے لیے خلوص کرے کہ اس میں دوسرے کی شرکت نہ ہو۔ اسلم ایک شے کو دوسری شے کے لیے خاص کرنا۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ سالم اسی کے لیے مخصوص کرنا کہ اس میں کسی دُوسرے کا حق نہ ہو۔ نہ بحیثیت تخلیق کے، نہ بحیثیت مالکیت کے نہ بحیثیت استحقاق عبادت و تعظیم کے۔

سوال: اسے وجہہٗ سے کیوں تعبیر کیا گیا!

جواب: یہ تمام اعضاء سے اشرف ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ تمام حواس اور فکر و تخیل کا معدن ہے۔ یہ وہ مجاز ہے کہ جزء کا ذکر کرکے کل مراد لیا گیا ہے۔ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ اسی سے ہے جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وجہٗ کے اخلاص سے مراد ذات کا اخلاص کرنا مراد ہو کیونکہ جو شخص اپنے منہ سے سخاوت کرتا ہے وہ اپنے دیگر اعضاء سے بخل نہیں کرتا۔ اب وجہٗ سے مراد عضو مخصوص ہی ہوگا۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ اسلم کی ضمیر سے حال ہے۔ یعنی وہ شخص اپنے اخلاص اور نفس کو اللہ تعالےٰ کی طرف خضوع و فرمانبرداری کے ساتھ سپرد کرنے کی وجہ سے تمام اعمال میں محسن ہے بایں طور کہ جو عمل بھی کرتا ہے وہ ٹھیک ہوتا ہے، کیونکہ اس کا اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنا اسے مستلزم نہیں ہے کہ وہ شرعاً بھی مستحسن ہو۔ اور حقیقۃً احسان اور عمل کی ادائیگی علی الوجہ اللائق یہی حسن صفاتی ہے جو حسن ذاتی کے تابع ہے۔

حدیث شریف: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عبادت ایسے کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اگر ایسے نہیں ہوسکتا تو اتنا ضرور خیال رکھو کہ وُہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

یہی ایمان کی حقیقت اور احسان کا ظاہری معنیٰ ہے۔ اور احسان کا باطنی معنیٰ وہی ہے جو **حدیثِ قدسی** میں فرمایا گیا:

كُنْتُ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ۔

(میں بندے کا کان اور آنکھ بن جاتا ہُوں)

اور یہ مرتبہ نوافل کی ادائیگی سے ملتا ہے وہ یہی کہ ذاتِ حق اور اس کی ہستی بندہ کے صفات کا آئینہ بن جاتی ہے اور بندہ کے احوال ذاتِ حق کا آئینہ اور اس کی ہستی کا مظہر ہوتے ہیں۔ بندہ باعتبار قرب النوافل کے ظاہر، مرئی اور مشہود ہوتا ہے اور باعتبار قرب الفرائض کے حق ہوتا ہے۔

فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ اسے اس کا ثواب ملے گا اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بہشت کا وعدہ فرمایا ہے۔ گویا وہی اعمال بہشت میں اس کے داخلہ کا سبب ہیں۔ ان کے بغیر اس کا داخلہ قطعی محال ہے۔ عِنْدَ رَبِّهٖ اس کے اعمال

اس کے مالک کے پاس محفوظ ہیں ۔ وہ اس کے امور کی تدبیر کرنے اور انہیں کمال تک پہنچانے والا ہے ۔ وہ نہ کسی کے اعمال کو ضائع کرتا ہے اور نہ ہی گھٹاتا ہے ۔ یہ عِنْدَ ظرفیہ ہے ورنہ عندمکانیت کا مقتضی ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ مکانیت سے پاک ہے ۔ یہ جملہ مَنْ کا جواب ہے اگر اسے شرطیہ سمجھا جائے ، ورنہ خبر ہے اگر اسے موصولہ بنایا جائے ۔ اور چونکہ وہ متضمن معنی الشرط ہے اسی لیے اس کی خبر میں فاء آئی ہے ، وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ نہ انہیں دنیا کا ڈر ہے اور نہ وہ آخرت میں غمگین ہوں گے جبکہ انہیں بہشت میں داخل کیا جائے گا ۔ چنانچہ اللہ تعالے نے ان کے بہشت میں داخل ہونے کی خبر دی ہے ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۔

(سب تعریف ہے اس ذات کے لیے جس نے ہم سے تمام غم اور حزن دُور فرمائے ہیں)

دنیا میں انہیں غم تھا کہ شاید انہیں زندگی میں کوئی مصائب اور تکالیف ہوں ۔ اور انہیں غم بھی ہوتا ہے کہ جو اعمال کرنے کے لائق تھے وہ ادا نہ ہو سکے ۔ اسی طرح ایسی عبادات سے وہ جنت کا غم رکھتے ہیں کہ جن کی ادائیگی سے دائمی سعادت نصیب ہوتی ہے اس لیے کہ مومن کامل جس طرح اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتا اس طرح اس کے غضب اور عذاب سے بھی بے خوف نہیں ہوتا اور کوتاہ اندیش تو ضائع شدہ عمر اور ثواب کی محرومی سے روئیں گے کیونکہ خوف اسے کہا جاتا ہے کہ جس کی مستقبل میں امید ہو ۔ اور حزن وہ ہے جو زمانہ ماضی میں واقع ہو ۔ جو دنیا میں بے خوف ہو کر گزارے گا وہ آخرت میں غمگین ہو گا ۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

۱ لا تخافوا ہست نزل خائفاں
ہست درخور از برائے خائف آں

۲ ہر کہ ترسد مرد را ایمن کنند
مر دل ترسندہ را ساکن کنند

۳ آنکہ خوفش نیست چوں گوئی مترس
درس چہ دہی نیست او محتاج درس

ترجمہ : ۱ ۔ خائفین کی مہمانی ہے لَا تَخَافُوا (نہ ڈرو) خائف اس مہمانی کے لائق بھی ہے ۔

۲ ۔ جو ڈرتا ہے اسے بے خوف بناتے ہیں خوف والے دل کو تسکین بخشتے ہیں ۔

۳ ۔ جسے خوف نہ ہو اس کے لیے بے سود ہے کہ کہا جائے نہ ڈر ، اسے سبق کیا دیا جائے وہ سبق کے لائق نہیں ہے ۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ
يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا
فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ
اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۬ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ
عَلِيْمٌ ۝ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ
قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَقَالَ
الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ
تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ
وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ
قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ
اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ
وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ ع

ترجمہ: اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں اسی طرح جاہلوں نے ان کی سی بات کہی، تو اللہ قیامت کے دن فیصلہ کردے گا جس بات میں جھگڑ رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے اُن میں نام خدا لیے جانے سے اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے، ان کو نہ پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے، اُن کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب، اور پورب پچھم سب اللہ ہی کا ہے تو تم جدھر مُنہ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمھاری طرف متوجہ) ہے بیشک اللہ وسعت والا علم والا ہے اور بولے خدا نے اپنے لیے اولاد رکھی ہے پاکی ہے اسے، بلکہ اُسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اُس کے حضور گردن ڈالے ہیں نیا پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا، اور جب کسی بات کا حکم فرمائے تو اس سے یہی فرماتا ہے کہ ہوجا وہ فوراً ہو جاتی ہے اور جاہل بولے اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا یا ہمیں کوئی نشانی ملے، ان سے اگلوں نے بھی ایسی ہی کہی ان کی سی بات اِن کے اُن کے دل ایک سے ہیں، بیشک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لیے، بے شک ہم نے تمھیں حق کے ساتھ بھیجا خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا اور تم سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا اور

ہرگز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو، تم فرما دو اللہ ہی کی ہدایت ہے اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تو ان کی خواہشوں کا پیرو ہوا بعد اس کے کہ تجھے علم آ چکا تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور نہ مددگار، جنھیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جیسی چاہیے اس کی تلاوت کرتے ہیں وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کے منکر ہوں تو وہی زیاں کار ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ اس میں ہر ایک فریق یہود و نصاریٰ کے ایک دوسرے پر گمراہی کا فتویٰ دینے کا بیان ہے عموم کے بعد خصوص ہے کہ اس میں علی العموم ہر ایک اپنے ماسوا تمام کو گمراہی کا فتویٰ دے رہا تھا لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ یعنی نصاریٰ ایسے امر پر نہیں کہ جو صحیح اور قابلِ اعتماد ہو۔ وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ ہر ایک نے کہا جو کہا، حالانکہ ہر ایک يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ کتاب پڑھتا ہے۔ الکتٰب میں الف لام جنس کا ہے یعنی بے شک وہ اہلِ علم و اہلِ کتاب و اہلِ تلاوت ہیں۔ اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں سے ایک کتاب کی تلاوت کرتا ہے اس کا حق یہ ہے کہ وہ باقی کتب کی تکفیر نہ کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر ایک کتاب میں دوسری کتاب کی تصدیق ہوتی ہے كَذٰلِكَ مثل اس قول کے کہ جو گمراہ علما کا تم نے سُنا ہے۔ یہ معنیٰ اس وقت درست ہے جبکہ کاف مثلیہ ہو اور اس کا محل نصب اور قالَ کا مفعول بہ ہو۔ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ کہتے ہیں وہ لوگ جو لاعلم ہیں، یعنی بُتوں کے پجاری۔ اور فرقہ معطلہ و دیگر گمراہ فرقے۔ یعنی ہر ایک گروہ کہتا ہے کہ دیگر ہر ایک کسی قطار میں نہیں مِثْلَ قَوْلِهِمْ کاف کے محل سے بدل اور اس میں بڑی توبیخ ہے اس حیثیت سے کہ ان کے نفوس کو باوجودیکہ اہلِ علم ہیں ان جاہلوں کے ساتھ ملا دیا گیا جو علم سے بالکل بے خبر ہیں فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ان فریقوں کے مابین فیصلہ فرمائے گا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ اس میں کہ اختلاف کرتے ہیں قیامت میں۔ فیما الخ کا متعلق یختلفون ہے۔ اس کو مقدم صرف آیات کی محافظت کے لیے کیا گیا ہے يَخْتَلِفُوْنَ ○ اختلاف کرتے ہیں امرِ دین میں۔

سوال: اللہ تعالیٰ ان کے مابین کیسے فیصلہ فرمائے گا؟

جواب: ہر گروہ کے لائق سزا مقرر فرمائے گا۔

ف: فعل یَحْکُمُ با اور فی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

هكذا حكم الحاكم فى هذه القضية۔

(فلاں حاکم نے اس قضیہ کا فیصلہ یونہی فرمایا ہے)

آیت میں صرف محکوم فیہ کا ذکر ہے محکوم بہ کا ذکر نہیں۔

ف : كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ

(ہر گروہ صرف اپنے معاملے پر خوش ہے)

یہ صرف گمراہ فرقوں میں نہیں بلکہ ہر شعبہ میں یہ خیالات جاری و ساری ہیں۔ یہاں تک کہ ایک صوفی اپنے مشن کو دُوسرے کے مشن سے بہترین سمجھتا ہے۔ اسی طرح ہر شیخ اپنے طریقے کو دوسرے کے طریقے سے اعلیٰ سمجھتا ہے۔ اسی طرح ہر عالم اپنے مسلک کو دُوسرے کے مسلک سے نمایاں محسوس کرتا ہے اور پھر ایک جماعت دوسری جماعت کو غلط کار کہتی ہے اور یہ طریقہ ہمیشہ سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ راہِ ہدایت پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے جس سے فائدہ بھی ہو۔

ف : جو شخص دعویٰ کرے کہ وہ ہی صاحبِ ارشاد اور اہلِ دل ہے لیکن تزکیۂ نفس سے محروم۔ اور اسے مبداء کا علم ہے نہ معاد کا۔ یقین کرو کہ یہ سب کچھ دنیوی لالچ میں کرتا ہے۔ ایسے آدمیوں کو اُن عورتوں سے بھی زیادہ عذاب ہوگا جنھیں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں دیکھا کہ ان کے سینے کاٹے جارہے ہیں۔ آپؐ نے جبریل علیہ السلام سے پُوچھا: یہ کون ہیں؟ اُنھوں نے عرض کی: یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے زنا کیے اور حرام بچے جنے۔ اور دعویٰ دلیل کے بغیر باطل ہے اور ایسا مدعی خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرے گا۔ اسے اسی زانیہ عورت کی طرح سمجھو اور اسی کی طرح وہ خواہشِ نفسانی میں گرفتار ہے۔ اسی عورت کا یہ ولدالحرام حقیقۃً ہلاک ہونے والا ہے کہ اس کی کوئی تربیت نہیں کرے گا۔ اور بدعتی گمراہ کی فرمانبرداری بھی ایسے ہی ہے کہ اس سے بدعتِ سیئۃ اور بے دینی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

حکایت حضرت شیخ صدرالدین تبریزی سے عرض کیا گیا کہ تبریز میں ایک بہت مشہور شخص ہے اور علمِ عرفان میں یکتا ہے۔ اسی لیے لوگ اسے عارف کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ایک دن وہی شخص کسی ایک بزرگ کامل کی خدمت میں حاضر ہُوا انہوں نے پُوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ عرض کی: نام تو محمود ہے لیکن لوگ مجھے عارف کہتے ہیں۔ اس بزرگ نے فرمایا: تجھے اپنی حقیقت معلوم ہے؟ اس نے کہا: میں نے بڑے بڑے مشائخ اور صوفیہ کی کتابیں اور مقالے پڑھے ہیں۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے عارف کہلاتا ہُوں۔ بزرگ نے فرمایا: ان کا کلام تو حق ہے، لیکن بتا تجھے اس سے کیا فائدہ! ؎

بپرِ خویش باید کرد پرواز
ببالِ دیگر نتواں پریدن

ترجمہ: اپنے پروں سے اڑنا چاہیے دوسروں کے پروں سے اڑنا ناممکن ہے۔

ف: نسخہ پر جب تک عمل نہ کیا جائے صرف اس کے لکھنے سے کیا فائدہ! یہ تو ایسے ہے جیسے کسی تاجر کو غلام لکھے کہ میں نے فلاں شہر سے فلاں فلاں سامان خریدا ہے۔ اب تاجر اعلان کر دے کہ میرے ہاں فلاں سامان ہے اب جب تک وہ سامان اس کے پاس نہیں پہنچے گا صرف غلام کا لکھا ہوا کیا کام دے گا۔ اعلان کے مطابق جب لوگ اس سے مال خریدنے آئیں تو سوائے رسوائی کے اسے کیا حاصل ہوگا۔ کیونکہ خریدنے والے سامان کے خریدار ہیں نہ کہ اس کے غلام کے خط کے۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱	مرغ بر بالا پران و سایہ اش	می دود بر خاک پران مرغ وش
۲	ابلھی صیاد آں سایہ شود	می دود چندانکہ بے مایہ شود
۳	بے خبر کاں عکس آں مرغِ ہواست	بے خبر کہ اصل آں سایہ کجاست
۴	تیر اندازے بسوئے سایہ او	ترکشش خالی شود از جستجو
۵	ترکش عمرش تھی شد عمر رفت	از دویدن در شکار سایہ تفت
۶	سایہ یزدان چو باشد دایہ اش	وارہاند از خیال و سایہ اش

ترجمہ: ۱۔ پرندہ اوپر اڑتا ہے اس کا سایہ زمین پر پرندے کی طرح دوڑتا ہے۔

۲۔ بیوقوف سایہ کو پرندہ سمجھ کر شکار کرے تو کیا حاصل کرے گا۔

۳۔ وہ بے خبر ہے کہ نیچے تو اس کا عکس ہے اسے خبر نہیں کہ سایہ اصل کب ہو سکتا ہے۔

۴۔ تیر انداز سایہ پر تیر برساتا ہے تو ترکش تیروں سے خالی ہو جائے گا۔

۵۔ زندگی کا ترکش خالی ہوا اور عمر برباد ہوگئی، سایہ کو شکار سمجھ کر دوڑنے سے۔

۶۔ جس کی تربیت سایۂ یزداں کرے وہ خیال و سایہ سے نجات پا جاتا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون۔

شانِ نزول نصاریٰ کا بادشاہ ططیوس رومی نامی اور اس کے اصحاب نے بنی اسرائیل سے جنگ کی ان کے خلفاء کو مار ڈالا اور اُن کی اولاد کو قید کر لیا اور تورات کو جلا دیا اور بیت المقدس کو خراب کر ڈالا بلکہ اس میں مردار پھینکے اور اس میں خنازیر ذبح کرائے۔ بیت المقدس ہمیشہ ویران رہا۔ یہاں تک کہ اہلِ اسلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں آباد کیا، پھر نصرانیوں کے ہاتھ آگیا۔ سَو سال سے زیادہ اُن کے پاس رہا۔ یہاں تک کہ اسے بادشاہ ناصر صلاح الدین ایوبی نے ۵۸۵ھ کی صبح کو فتح کیا۔

مَنْ در اصل استفہام کے لیے آتا ہے یہاں پر بمعنی نفی ہے۔

مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اس سے مراد بیت المقدس ہے۔ جمع کا صیغہ اس لیے ہے کہ آیت میں حکم ہر مسجد کے لیے ہے جہاں بھی ہو، جیسا کہ ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ایک نیک بخت کو ایذا پہنچائے۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ اٰذَی الصَّالِحِیْنَ۔ کیونکہ خصوصی سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ مَنَعَ کا دوسرا مفعول ہے جو ممنوع اور ممنوع عنہ کا مقتضی ہے۔ کبھی دو مفعولوں کی طرف بنفسہٖ متعدی ہوتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: منعتہ الامر اور کبھی مفعول اوّل کی طرف تو خود لیکن مفعول ثانی کی طرف حرفِ جر عَنْ یا مِنْ سے، جیسے منعتہ من الامر۔ یا محذوف ہو جیسے آیت ہذا میں ہے۔ اب معنی یہ ہُوا کہ من ان یسبح الخ روکا جائے اس سے کہ اس کی تسبیح و تقدیس کی جائے یا اس میں نماز پڑھی جائے۔ وَسَعٰی اور عمل کرے فِیْ خَرَابِهَا ؕ اس کے گرانے کا۔

حل لغات: خراب بروزن سلام جو کہ تسلیم کا اسم ہے۔ دراصل رخنہ اندازی اور تفرقہ بازی کو کہتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ وہی مانعین مَا کَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ؕ ان کے لیے لائق نہیں کہ اس میں داخل ہوں خشیت و خضوع کے بغیر چہ جائیکہ اُسے خراب کرنے پر جرأت کریں لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ اُن کے لیے دنیا میں بڑی رسوائی ہے کہ جس کا کوئی حساب نہیں جیسے قتل کیا جانا، قید ہونا (اہلِ عرب کے حق میں) یا جزیہ مقرر کرنا (اہلِ ذمہ کے حق میں) اُن کے بلاد کو فتح کرنا جیسے قسطنطنیہ و رومہ و عموریہ فتح ہُوئے۔ وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ آخرت میں ان کے لیے دوزخ کا دائمی عذاب ہوگا۔ کیونکہ اس کا سبب بھی عظیم ہے۔ جیسا کہ اُن کی گزشتہ حکایت دلالت کرتی ہے۔

شانِ نزول بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت مشرکینِ عرب کے حق میں نازل ہُوئی جبکہ انھوں نے مکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت سے روکا اور ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ اسی بناء پر وُہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مساجد سے روکنے والے تھے نیز انھیں کفار نے مسجدِ حرام سے روکا تھا جبکہ وہ مدینہ طیبہ سے روانہ ہو کر حدیبیہ تک پہنچے۔ یہ واقعہ ہجرت کے چھٹے سال کا ہے۔

ف: حدیبیہ ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ کی راہ میں واقع ہے۔ اس بنا پر مساجد سے مسجدِ حرام مراد ہوگی اور خراب کا مطلب یہ ہے کہ اُسے اللہ کے ذکر اور عبادت سے معطّل چھوڑنا چاہتے ہیں خراب کا حقیقی معنیٰ مراد ہو گا۔ یعنی ذکر و عبادت سے مسجد کو معطل رکھنا بھی تخریب ہے۔ کیونکہ اس کی بنا سے مقصود تو ذکر و عبادت ہی ہوتا ہے جب تک اس میں وہی مقصود حاصل نہ ہوگا۔ گویا وہ گری ہوئی اور خراب شدہ ہے اور مسجد کی تعمیر جیسے بنا و اصلاح سے ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی حاضری و لزوم بھی تعمیر سمجھی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے؛ فُلَانٌ عَمَّرَ مَسْجِدَ فُلَانٍ (فلاں شخص فلاں مسجد میں حاضر ہُوا کرتا ہے) آسمانوں کے ملائکہ کے مکینوں کو عمار یعنی تعمیر کنندگان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فضائلِ حاضریٔ مسجد

حدیث شریف : (۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں : جسے دیکھو کہ اسے مسجد کی حاضری کی عادت ہے اس کے متعلق ایمان کی گواہی دو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

انما یعمر مسٰجد اللہ من اٰمن باللہ۔ مسجد کی حاضری کو تعمیر قرار دیا گیا ہے۔

(۲) حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں :

چھ خصلتیں حاصل کرو، تین سفر کی، تین حضر کی۔

— تین حضر کی جو حاصل کرنی چاہئیں :

(i) تلاوتِ قرآن ،

(ii) مسجد کی حاضری ،

(iii) اللہ تعالیٰ کی محبت میں دوست بنانا۔

— تین سفر کی جو حاصل کرنی چاہئیں :

(i) خرچ

(ii) خوش خلقی

(iii) خوش طبعی ، بشرطیکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو۔

(۳) قیامت کی علامات میں سے ہے مساجد کے مینار بلند کرنا، انھیں منقش کرنا اور سنگارنا، لیکن حاضری نہ دینا اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غیر آباد رکھنا، اللہ تعالیٰ کی مساجد کو صلوٰۃ و تلاوتِ قرآن سے غیر آباد رکھنا اور ان میں شعائرِ اسلام ظاہر نہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ بالخصوص جب دیکھو کہ شراب کے ابواب کھلے ہوئے اور مساجد کے دروازے بند ہیں وغیرہ۔ ہم نے اپنے زمانے میں روم کے اکثر بلاد کا مشاہدہ کیا ہے۔ اب تو دین کی غربت پہ رونا چاہیے بلکہ خون کے آنسو بہانے چاہئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

تفسیر صوفیانہ حضرت امام قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں : اس شخص سے کون زیادہ ظالم ہے جو شہوت سے عبادات کے مقامات کو ویران کرتا ہے۔ یعنی عبادت گزار لوگوں کے قلوب کو غلط آرزو اور گندے تعلقات سے خراب کرے۔ اور محبت کے اوطان کو لذاتِ نفسانیہ اور خواہشاتِ نفسانیہ سے تباہ کرنے والا بھی بڑا ظالم ہے اور اوطان المحبۃ سے وجد والوں کے ارواح مراد ہیں۔ اور غیروں کی طرف متوجہ ہو کر مشاہدات کے مقامات کو خراب کرنے والا بھی بہت ظالم ہے۔ اور اوطان المشاہدات اہلِ توحید کے قلوب ہیں۔

ف : آیت سے بیت المقدس اور بیت اللہ کی فضیلت بھی ثابت ہوئی۔

حدیث شریف میں ہے "جو شخص ثواب کی نیت سے بیت المقدس کی زیارت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ہزار شہید کا ثواب عطا فرمائے گا۔ اور اس پر آتشِ جہنم حرام ہے۔ اسی طرح جو شخص عالم باعمل کی زیارت کرتا ہے گویا اس نے بیت المقدس کی زیارت کی" (کذا فی مشکوٰۃ الانوار)

مسئلہ : تحفہ (کتاب) میں ہے کہ بیت اللہ شریف کی مسجد تمام مساجد سے افضل ہے، پھر مدینہ طیبہ کی مسجد، پھر بیت المقدس کی مسجد، پھر دنیا کی جامع مساجد (جن میں جمعہ ادا کیا جاتا ہے) پھر اپنے محلہ کی مسجد، پھر شارع عام پر واقع ہونے والی مسجدیں، مرتبہ میں یہی مسجدیں کم درجہ والی ہیں یہاں تک کہ ان میں اعتکاف بیٹھنا بھی جائز نہیں اگر ان میں امام اور مؤذن مقرر نہ ہو، ان کے بعد جو مساجد گھروں میں بنائی جاتی ہیں ان میں مردوں کو اعتکاف بیٹھنا جائز نہیں البتہ ان میں عورتیں اعتکاف بیٹھ سکتی ہیں۔

مسئلہ : حضرت شیخ مشہور بافتادہ آفندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسجد حرام اور مسجد مدینہ اور مسجد بیت المقدس کے بعد تمام مقامات کی مساجد سے زیادہ افضل شہر بروسہ کی بڑی جامع مسجد ہے، اس لیے کہ یہ جگہ اس بڑھیا کے مکان کی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لائی لیکن کشتی پر سوار نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اسے طوفان سے بچا لیا۔ یہ بات کسی اہلِ کشف بزرگ کے کشف کے ذریعے معلوم ہوئی۔

مسئلہ : جو شخص یہاں (یعنی بروسہ کی جامع مسجد میں) عبادت میں مشغول ہو تو اللہ تعالیٰ اسے غفلت سے بچائے گا۔

مسئلہ : مکہ مکرمہ میں صرف ایک دن نہایت خشوع و خضوع سے عبادت کی جائے تو باقی مقامات کی ایک سال کی عبادت جیسی ترقی نصیب ہوتی ہے۔ اور فرمایا :

ہمارے ملک میں شغلِ عبادت کے دو بہترین مقام ہیں :

(۱) شہر بروسہ میں سید بخاریؒ کی جامع مسجد

(۲) قسطنطنیہ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر میں

ھ

عابد اندر نماز و عارفاں اندر نیاز
عاشقاں از شوقِ وصلِ یار در سوز و گداز

ترجمہ : عابد نماز میں، عارف نیاز میں، عاشق محبوب کے شوقِ وصال کے سوز و گداز میں۔

دُعا : یا اللہ! ہمیں ان لوگوں سے بنا جو تیرے شوق میں مستغرق ہیں۔ (آمین)

تفسیر عالمانہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ق اس سے زمین کی دو طرفیں مراد ہیں کیونکہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ صرف مشرق و مغرب مراد لیے جائیں جبکہ تمام زمین اسی کی ملک ہے کوئی خاص زمین ملک و تصرف کے لیے مقرر نہیں اور نہ ہی عبادت کے لیے کوئی خاص محل معین ہے کہ فلاں مکان پر نماز جائز ہے اور فلاں پر نہیں۔ پھر اے کافرو! مسجد حرام یا مسجد اقصٰی سے روکو گے تو ہم کسی دوسرے مقام پر نماز ادا کر لیں گے کیونکہ ہمارے لیے رُوئے زمین مسجد مقرر کی گئی ہے فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا جس طرف مُنہ پھیرو گے وہی تمہارا قبلہ ہے۔

حلِ لغات : وَلّٰی قبیل اضداد سے ہے۔ وَلّٰی بمعنی سامنے کو منہ کیا اور بمعنی پیچھے منہ پھیر۔

فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ط یعنی وہاں پر وہی قبلہ کی جہت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا۔ اور اسی سے راضی ہے کیونکہ اس کی طرف منہ کرنا کسی خاص مسجد یا مکان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یا ثَم سے اس کی ذات یعنی حضورِ علمی مراد ہے اس لحاظ سے فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ جز بول کر کُل مراد لینا مجازاً ہے۔ اب معنی یُوں ہوگا کہ جس طرف بھی منہ کر کے نماز پڑھو گے مجھے وہاں پاؤ گے۔ یعنی اس ذات تک پہنچنے کے لیے کسی مقام کی محتاجی نہیں کیونکہ وہ ذات نہ جوہر ہے نہ عرض، اسے کسی ایسے مکان کی ضرورت نہیں کہ جس میں وُہ سمائے۔ جب اُس کے لیے مکانیت ممتنع ہے تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ اس کا علم جمیع جہات اور مکانات کو محیط ہے۔ یعنی وہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے اسی لیے ان کی جزا بھی وہی دے گا۔

حدیث شریف میں ہے:

"تم اپنی رسّی زمین کی تہ تک پھینکو تو اللہ تعالیٰ کی ذات وہاں بھی موجود ہوگی"۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے۔ مطلب یہ کہ تمہاری رسّی اس کے علم سے باہر نہیں ہوگی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تو مکانیت سے پاک ہے کیونکہ وُہ تو مکانات کو پیدا کرنے سے بھی پہلے ہے۔ (کذا فی المقاصد الحسنہ)

ف : اَيْنَ ہمیشہ مکانیت میں استعمال ہوتا ہے یہاں بھی ایسے ہی ہے اور وہ تُوَلُّوْا کی وجہ سے منصوب ہے۔ اَيْنَمَا میں لفظ مَا زائدہ ہے، حرف تاکید کے لیے لایا گیا ہے اور ثَمَّ ظرف مکان یعنی هُنَاتْ (وہاں پر) کے معنی میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے:

لَمَّا قَرُبَ مِنْ هٰهُنَا بعد ثم و هنات۔

(جب وہ اس مکان کے قریب ہُوا تو وہاں سے بعید ہوگیا)

ترکیب : وَجْهُ اللّٰهِ مبتدا مؤخر ہے اور لفظ ثَمَّ خبر مقدم ہے اور جملہ محلاً مجزوم ہے اس لیے کہ شرط کی جزا واقع ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ اللہ تعالیٰ مالک اور خالق ہونے کے لحاظ سے تمام اشیاء کو محیط ہے۔ یہ جملہ وَلِلّٰهِ

المشرق والمغرب کا تتمہ ہوگا۔ اسی طرح وسعت سے مراد وسعتِ رحمت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وللہ المشرق والمغرب اس معنی پر مشتمل نہیں کہ عبادت اور صلوٰۃ صرف بعض مساجد سے مخصوص ہو، بلکہ جہاں چاہو زمین کے ہر گوشے پر عبادت اور نماز ادا کر سکتے ہو۔ تمام زمین تمہارے لیے سجدہ گاہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ شرعی احکام میں وسعت دیتا ہے اپنے بندوں کو ایسے امور پر مجبور نہیں فرماتا کہ جن کی ادائیگی ان کے لیے مشکل ہو، اس سے صرف بندوں کی سہولت مقصود ہے تاکہ وہ بآسانی عبادتِ الٰہی بجا لائیں۔ قبلہ کی جہت بھی آسانی میں شامل ہے۔ یہ عموم ہم نے لفظ واسع کی وجہ سے سمجھا ہے۔

ف: حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اسماء الحسنیٰ کی شرح میں فرمایا ہے:

اَلْوَاسِع "سِعَۃ" سے مشتق ہے۔ یہ وسعت کبھی وسعتِ علم سے منسوب ہوتی ہے جب کسی کی وسعت علمی معلوماتِ کثیرہ کو محیط ہو۔ اور کبھی وسعت الی الاحسان اور وفورِ نعمت کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ لیکن علی الاطلاق واسع ذاتِ حق ہے اور بس۔ کیونکہ جب اس کے علم کو دیکھا جاتا ہے تو اس کی معلومات کا کنارہ نہیں ملتا۔ بلکہ دریاؤں کو روشنائی بنا کر اس کے کمالات تحریر کیے جائیں تو دریا ختم ہو جائیں گے مگر کمالات ختم نہ ہونے پائیں گے۔ اگر اس کے احسانات اور انعامات پر غور کیا جائے تو بھی اس کے مقدرات کا کوئی حساب نہیں اور مخلوق میں جس کی وسعت کو دیکھو کوئی نہ کوئی انتہا ضرور ہے۔ لیکن اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جس کی کوئی انتہا نہ ہو اسی کو وسعت لائق ہے۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ علی الاطلاق واسع وہی اللہ تعالیٰ ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ ہر وسیع سے وسیع تر ہے اور ہر وسیع اوسع سے تنگ ظرف نظر آئے گا۔ اور پھر جو وسعت کسی کنارہ تک ٹھہر جائے اس پر زیادتی مقصود ہے۔ اور ہمارا رب تعالیٰ ایسا ہے کہ نہ تو اس سے کوئی اور اوسع ہے اور نہ ہی زیادتی تصور میں آسکتی ہے۔ بندہ اپنے عرفان میں جتنی ترقی بھی کر لے تاہم اپنی وسعتِ علمی کے مطابق محدود رہے گا۔ بندہ کو چاہیے کہ اخلاق میں اتنی وسعت دکھائے جس میں فقراء اور حاسدوں کا غیظ و غضب اور غلبۂ حرص اور دیگر بُری عادات کی گنجائش نہ ہو۔ اسے بھی (مظہر) واسع کہا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی محدود ہوگا۔ واسع مطلق صرف وہی حق تعالیٰ ہے۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ اے سگِ گرگیں ازست از حرص و جوش
پوستین شیر را بر خود مپوش

۲ غرّہ شیرت بخواہد امتحاں
نقش شیر و بانگ واخلاق سگاں

ترجمہ: (۱) اے گندگی کے کُتّے اور حرص و ہوس سے بھرپور شیر کی کھال مت پہن۔

(۲) تیسرا دھوکا تجھ سے امتحان لے گا کیونکہ تیری شکل شیروں کی اور آواز و عادات کتوں کی ہیں۔

عَلِیْمٌ ۝ بندوں کی مصلحتیں اور اعمال اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ یہ تہدیداً فرمایا، تاکہ بندہ عبادت میں سستی اور کمی نہ کرے۔ پھر اس میں نیک لوگوں کو خوشخبری بھی ہے کہ انھیں یقین ہو گا کہ جس کی وہ عبادت کر رہے وہ انہیں ہر وقت جانتا ہے۔

ربط : یہ آیت ومن اظلم ممن منع الخ سے مرتبط ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اے مومنو! اللہ تعالیٰ کے شہر وسیع ہیں اللہ تعالیٰ کی مساجد کو خراب کرنے والوں کی تخریب تمہیں عبادت سے نہیں روک سکتی۔ کیونکہ جس طرف بھی منہ کر کے نماز ادا کرو گے خدا کی ذات موجود ہو گی۔ فلہذا تمہاری عبادت ہر طرف منہ کرنے سے منظور ہو گی۔

شانِ نزول حضرت مجاہد اور حسن رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، جب آیت :

قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔

(تمہارا رب فرماتا ہے کہ مجھ سے دُعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا)

نازل ہُوئی تو لوگوں نے کہا : ہم اللہ تعالیٰ سے کہاں دعا عرض کریں۔ اس پر یہ آیت :

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الخ

یعنی جس جہت جاؤ گے اللہ تعالیٰ موجود ہو گا، اسے کسی جہت اور تحیز کی محتاجی نہیں۔

سوال : جب اللہ تعالیٰ جہت اور تحیز سے پاک ہے تو پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب : (۱) تمام انبیاء اور اولیاء علیٰ نبینا علیہم السلام نے دعا کے وقت ہاتھ اٹھائے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے رحمت کے خزانے آسمانوں میں ہیں، کما قال :

وفی السماء رزقکم وما توعدون۔

(جن باتوں کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے اور تمہارا رزق آسمانوں میں ہے)

اور فرمایا :

وان من شیء الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔

(کوئی شے ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور ہم ہر شے کو اندازے سے معلوم کر کے نازل کرتے ہیں)

نیز عرشِ معلیٰ صفاتِ رحمانیہ کے استقرار کا مرکز ہے۔ اسی لیے دُعا کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا جاتا ہے۔ اے آقا! مجھے اسی خزانہ سے عطا فرما دے۔

حکایت حضرت امام الحرمین قدس سرہٗ ایک بڑے بزرگ کے مہمان ہوئے وہاں بڑے بڑے علماء بھی مدعو تھے اور عوام بھی۔ ان میں سے ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور عرض کی، حضرت! میرا ایک عقدہ حل فرمایئے، یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مکانیت سے تنزیہ پر کون سی دلیل ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔

(رحمٰن عرش پر اپنے شان کے لائق مستوی ہے)

اس پر حضرت امام صاحب علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مکانیت سے تنزیہ کی دلیل حضرت یونس علیہ السلام کا قول ہے جو انھوں نے مچھلی کے پیٹ میں عرض کیا:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔"

(تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تُو پاک ہے، بے شک میں ظالموں میں سے ہوں)

سب لوگ متعجب ہوئے کہ تنزیہ پر یہ دلیل کیسی؟ میزبان نے عرض کیا: حضرت! اس کی وضاحت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا: اسی مجلس میں ایک فقیر محتاج ایک ہزار روپے کا مقروض ہے اس کا قرض ادا کردو پھر اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ میزبان نے قبول کر لیا۔ آپ نے فرمایا: جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شبِ معراج بہت بلندیوں پر تشریف لے گئے تو وہاں آپؐ نے فرمایا: "لا احصی ثناء علیك انت علی نفسك۔"

(میں تیری ثنا کب بیان کر سکتا ہوں جیسے کہ تُو نے اپنی تعریف فرمائی ہے)

اور حضرت سیدنا یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ کے اندھیروں اور دریا کی تہ کے اندر پڑھا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ الخ۔ دونوں حضرات اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوئے۔ اور یہ خطاب حضوری ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی مکان میں نہیں۔

حدیث شریف میں ہے، حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (تواضعاً) فرمایا:

"مجھے حضرت یونس علیہ السّلام پر فضیلت مت دو کیونکہ انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اسی ذات کے جلووں کو دیکھا جسے میں نے عرش کے وراء الورا دیکھا۔"

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی سمجھایا کہ مجھے اور یونس علیہ السلام کو ذاتِ حق کے جلوے نظر آئے۔

شانِ نزول بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کی طعن و تشنیع پر نازل ہوئی جب کعبہ مکرمہ کی تبدیل کا حکم ہوا مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے ساتھ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے جب آپؐ نے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا تاکہ یہودیوں کی تالیفِ قلوب ہو اور وہ آپؐ کی تصدیق کریں۔

اس پر دوسرے لوگ بھی اسلام میں جلد شامل ہو جائیں گے۔ سولہ ماہ آپؐ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے لیکن دل میں تمنا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم فرمائے کیونکہ یہی آپؐ کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا اور اوّل القبلتین بھی وہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

قد نرٰی تقلّب وجهك فی السّماء فلنولينّك قبلة ترضٰها۔

آپؐ مسجد بنی سلمہ میں ظہر کی نماز ادا فرما رہے تھے ابھی دو رکعت پڑھی تھیں کہ ارشاد ہوا :

فولّ وجهك شطر المسجد الحرام۔

(اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر دیجئے)

اسی حکم پر نماز میں ہی اپنے رُخِ مبارک کو پھیر دیا۔ اسی لیے اس مسجد کا نام مسجد القبلتین پڑ گیا۔ جب پھرنے کا حکم نازل ہُوا تو اس میں بعض لوگ مرتد ہو گئے۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بڑی آزمائش تھی۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا :

وما جعلنا القبلة التی كنت عليها الّا لنعلم من يتبع الرسول ممن ينقلب علٰی عقبيه وان كانت لكبيرة الّا علی الّذين هدی الله۔

(ہم نے قبلہ نہیں جس پر تم ہو صرف اس لیے تاکہ ہم ظاہر کریں کہ کون رسول کی تابعداری کرتا ہے اور کون پیچھے ہٹتا ہے اور یہ سخت ہے مگر ان لوگوں پر آسان ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی)

اے اللہ! ہمیں ہدایت نصیب فرما اور اپنے دین پر ثابت قدم رکھ اور کافروں پر فتح و نصرت نصیب فرما۔

سبق مومن کے لیے ضروری ہے کہ وُہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مضبوطی سے عمل کرے جیسے اس کا حکم ہو۔ سرِ تسلیم خم کرے نبی پاک علیہ السلام کی فرمانبرداری میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔ عقلِ عاجز کو ان کے حکم کے سامنے جھکا دے اور فہمِ قاصر کو اس میں دخیل نہ بنائے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مدرسہ سے آداب حاصل کرے کہ جب بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم ہُوا تو ادب سے سر جھکا دیا۔ یہ نہیں پُوچھا کہ کیوں ایسا ہوا ہے پھر جب تک حکمِ ربانی نہیں ہوا چُون و چرا کو گنجائش نہ دی بلکہ ارشادِ ربانی کے منتظر رہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی آپؐ کی تعظیم و تکریم فرمائی کہ جس طرح آپ چاہتے تھے ویسا ہی کیا بلکہ آپ کو تمام انبیاء علیہم السلام کا سرتاج بنا دیا۔

ف : تحویلِ قبلہ کا معاملہ دو گروہوں کو شاق گزرا اور دونوں ہی ذاتِ حق سے محجوب تھے۔

پہلا گروہ وہ تھا جنھوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ جب بھی بیت اللہ سے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہُوا تھا۔ یہی مقام مکاشفہ سے عروج کی صورت تھی۔ یعنی آپ کو مقامِ قلب سے مقامِ مشاہدہ (جسے مقامِ روح کہا جاتا ہے) کا عروج ہُوا۔ پھر ان کا گمان تحویلِ قبلہ کو البعد القرب اور نزول بعد العروج سمجھ بیٹھے اور انہیں بدگمانی

ہوئی کہ پہلے والا مرتبہ اشرف تھا وہ (معاذ اللہ) ضائع ہوگیا اور معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ان کا یہ خیال تھا کہ اب تحویل قبلہ سے آپ اپنے عروجی مرتبہ سے گر گئے۔ اسی بدگمانی سے ان پر تحویلِ قبلہ شاق گزرا اور اسلام کی دولت سے محروم ہوگئے انھیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ وہ صورت ہے جسے رجوع الی مقام القلب کہا جاتا ہے جو دعوت کے لیے حالت تمکین میں نصیب ہوتی ہے بلکہ اسی کا نام مشاہدۃ الجمع فی عین التفصیل اور مشاہدۃ التفصیل فی الجمع ہے۔ اسی مقام تک پہنچ کر بندہ نہ وحدت کے ساتھ کثرت سے محجوب ہوتا ہے اور نہ کثرت کے ساتھ وحدت سے محجوب ہوتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ تھا جنھیں اپنے اعمال سے پیار تھا انھیں تحویل قبلہ کا راز معلوم نہیں تھا انہیں گمان تھا کہ تحویلِ قبلہ سے ہماری عبادت ضائع ہوگئی اور جن کا ازلی بخت یاور تھا وہ کسی گمان میں نہ پھنس سکے اس پر انھیں راہِ راست نصیب ہوا اور توحید ذاتی محمدی کے شرف سے مشرف ہو گئے۔

اے اللہ! ہمیں ہدایت یافتہ لوگوں سے بنا اور انبیاء و مرسلین کے ساتھ محشر میں اٹھا۔

تفسیر صوفیانہ اہلِ تاویل حضرات فرماتے ہیں کہ وللہ المشرق والمغرب سے مراد عالمِ نور و ظہور ہے کہ جس جہت کو نصاریٰ نے قبلہ سمجھا ہوا ہے اُن کا قبلہ تو در اصل اس کا باطن چاہیے تھا اور عالمِ ظلمت و مستور وہ ہے جسے یہود نے اپنا قبلہ سمجھا ہے ان کا قبلہ خود درحقیقت اس کا ظہور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو سمجھایا کہ تم جس جہت کی طرف متوجہ ہوگے جائز ہے اس لیے کہ وہ متجلّی و انور روشن ہے کیونکہ جب وہ اپنے جلوے تمہارے قلوب پر ظاہر فرماتا ہے تو وہ جلوہ اس کا صفتِ جمالیہ سے ہے جو تمہیں مشاہدہ اور فانی ہونے کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ لیکن جب تم اس سے دور ہوجاتے ہو اور درمیان میں پردہ آجاتا ہے تو یہ صفتِ جلالیہ ہے جو تمہیں بحالتِ بقا بعد الفنا نصیب ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے تم جہاں توجہ کرو گے وہاں ہی اللہ تعالیٰ کے جلوے ہوں گے کیونکہ اس کے سوا تو ہے بھی کچھ نہیں۔

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

میانِ کعبہ و بُت خانہ ہیچ فرقے نیست
ہر طرف کہ نظر میکنی برابر او ست

ترجمہ: کعبہ و بُت خانہ میں کوئی فرق نہیں جہاں سے دیکھو گے وہی نظر آئے گا۔

سبق بندہ کو وہ مقام حاصل ہوجائے کہ نہ وہ حق سے محجوب ہو اور نہ حق اس سے محجوب ہو۔ اس کیفیت میں تمام پردے ہٹا دئے جاتے ہیں۔ اسے صوفیہ کرام کی اصطلاح میں مقام جمع الجمع اور بقا کہا جاتا ہے۔ یہ مرتبہ تجلی عینی سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرت شیخ مشہور بہ افتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل کے لیے آگ حاصل کرنے کی غرض سے کوہِ طور پر پہنچے تو انھیں پہلے یہ حکم ہوا:

"اِنِّیۡ اَنَا رَبُّکَ۔"

دیکھئے یہاں سب سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو ربوبیت کے جلوے دکھائے گئے۔ بعدازاں فرمایا:

"وانا اخترتک فاستمع لما یوحی انّنی انا اللّٰہ لا الٰہ الا انا فاعبدنی۔"

(اے موسیٰ علیہ السلام! میں نے آپ کو اپنے لیے چُن لیا۔ اب وحی سُنیئے، میں اللہ ہُوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میری ہی عبادت کرنا)

اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کا جارہ دکھایا بعدازاں بھی ذات کے جلووں سے نوازا۔ پھر حکم فرمایا کہ اب جاؤ فرعون کی رہبری کرو۔ موسیٰ علیہ السلام اہل وعیال کی پروا کیے بغیر سیدھے فرعون کے پاس پہنچے۔ جب آپ رسالت کا پیغام لے کر ملکِ مصر میں داخل ہُوئے آدھی رات تھی۔ فرعون کے دروازے پر اپنے عصا سے دستک دی تاکہ تعمیلِ ارشادِ خداوندی میں تاخیر واقع نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ دروازہ کی دستک سے ہیبت کے مارے فرعون کی داڑھی سفید ہوگئی۔ جب اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو کہا، تُو ہمارا پروردہ نہیں ہے؟ ایک عرصہ تک ہمارے ہاں رہا ہے! ۔ آپؑ نے فرمایا: ہاں، میں وہی ہُوں، اسی لیے تو میں تیرا حق ادا کرنے آیا ہُوں کہ سب سے پہلے تجھے ہی دعوتِ حق دُوں۔ اس بات کو سُن کر فرعونیوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا۔ آپ نے اپنا عصا نیچے پھینکا تو وُہ بڑا اژدہا بن گیا جو سب کو ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ تو سب نے موسیٰ علیہ السلام سے پناہ کی التجا کی۔ آپ نے ان کو اماں دے دی۔ اس معجزہ کے پیشِ نظر فرعون تو مومن ہونا چاہتا تھا لیکن ہامان بدبخت نے اسے روکے رکھا۔ فرعون کو دعوتِ حق دے کر آپ وہاں پہنچے جہاں اپنے اہل وعیال کو چھوڑ آئے تھے دیکھا کہ آپ کی اہلیہ بچہ جَن چکی ہیں۔ قدرت نے ان کی حفاظت کے لیے بھیڑیے مقرر فرما دیے۔ بھیڑیوں کی نگرانی سے کسی کا بھی وہاں سے گزرنا ممکن نہ تھا۔

سبق: سبحان اللہ! قادر قدیر کی کیا ہی نرالی شان ہے!

فضیلتِ حنفیت ہمارے امام اعظم (سیدنا ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ) نے بہ ذاتِ خود اپنے مسلک کی اشاعت کا کبھی ارادہ نہ فرمایا لیکن حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اے ابوحنیفہؓ! اس مذہب کو خُوب پھیلاؤ۔" یہ حکم آپ کو عالمِ رؤیا میں ہُوا حالانکہ خود امام صاحب اس سے دُور رہنا چاہتے تھے۔ آپ کی دلیل ہمارے حنفی مذہب کی حقانیت کے لیے شاہد عادل ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خود حکم فرمائیں۔ اس کے وصول الی الحقیقۃ میں کسی قسم کا وہم تک نہیں ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ قدس سرہٗ ساری ساری رات عبادت میں مشغول رہتے تھے ایک دن کعبہ میں ہی ہاتف سے سُنا کہ اے ابوحنیفہؓ! تُو نے میرے دین کے لیے مخلصانہ خدمات انجام دیں اور میری معرفت کا حق ادا کر دیا فلہٰذا میں نے تجھے اور تیرے مذہب پر چلنے والوں کو بخش دیا۔ (کذا فی عین العلم للشیخ محمد بلخی)

مسئلہ : بعض عارفین سے منقول ہے کہ انسانوں کا قبلہ کعبہ مکرمہ ، آسمان والوں کا قبلہ بیت المعمور ، کرّوبیوں کا قبلہ کُرسی اور حاملینِ عرش کا قبلہ عرشِ معلّٰی ہے ۔ سب کا مقصودِ اعظم ذاتِ حق ہی ہے ۔

تفسیر عالمانہ

وَقَالُوا اور کہا

شانِ نزول : جب یہود نے کہا کہ عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں ، اسی طرح نصاریٰ نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں ۔ اور کفار نے کہا : ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں ۔ تو یہ آیت نازل ہوئی ۔

قَالُوا کی ضمیر ان تینوں گروہوں کی طرف لوٹتی ہے ۔ یہود و نصاریٰ نے صراحۃً اور مشرکین نے اشارۃً کہا جیساکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

کذٰلك قال الذین لا یعلمون مثل قولھم ۔

یعنی یہود و نصاریٰ کی طرح یہ لوگ کہتے ہیں اور جو کچھ یہ جاہل کہا کرتے ہیں یہ یہود و نصاریٰ بھی اُن کے شریک ہیں ۔

اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ

حل لغات : اتخاذ یا تو بمعنی الصنع والعمل کے ہے ۔ اس معنی پر صرف ایک مفعول کی طرف متعدی ہوگا یا بمعنی تصییر کے ہے (جسے دو مفعول چاہئیں) اس معنی پر یہاں پر اس کا مفعول اول محذوف ہوگا ۔ عبارت یُوں ہوگی :

اتخذ ای صیّر ۔

یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ بنایا اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض مخلوق سے ۔ اور فلاں فلاں کو اولاد بنایا ہے (معاذ اللہ) یہ بات ہرگز نہیں کیونکہ اس کی کوئی اولاد نہیں ، نہ وہ کسی کو اولاد یا متبنّٰی بناتا ہے ۔ اور نہ ہی اس کی شان ہے کہ کسی کو بیٹا بنائے ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تنزیہ بیان کی ۔

سُبْحٰنَهٗ

حل لغات : سُبْحَانَ دراصل سَبَّحَهٗ ، سبحانًا تھا ۔ اگر سبحانٗ کو بمعنی تسبیح کا مصدر قرار دیا جائے ۔ یعنی سبحان کو بمعنی تنزیہ کہا جائے تو اب مطلب یُوں ہُوا کہ وہ باری تعالیٰ اس سبب سے بھی منزّہ ہے جو اولاد کا متقضی ہو ۔ یعنی وہ اس کی طرح محتاج ہے کہ زندگی میں اس کی اعانت کرے اور مرنے کے بعد اس کے قائم مقام ہو ۔ اور اس سے بھی منزہ ہے کہ جسے ولدیت کا تقاضا ہے یعنی تشبیہ سے کیونکہ ولد اپنے والد کی جنس سے ہوگا ۔ پھر اللہ تعالیٰ کے لیے کس طرح ولد کا ہونا صحیح ہوسکتا ہے کہ اس کی مثل کوئی شے ہو حالانکہ اس کی مثل کوئی شے نہیں ۔ مولانا روم قدس سرہٗ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں : ؎

لم یلد ولم یُولد است او ز قدم
نے پدر دارد نہ فرزند و نہ عم

ترجمہ : وُہ قدیم سے لم یلد ولم یولد ہے نہ اس کا باپ ہے نہ بیٹا نہ چچا ۔

بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ

ربط : ان کے قول مذکور کی تردید اور ان کے قول کے فساد کا بیان ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ باطل لوگوں کے قول سے اعراض کرنا بھی ان کے قول کی تردید ہے۔ اور وسیط میں ہے :

بَلْ اَیْ لَیْسَ الْاَمْرُ الخ

یعنی جس طرح وہ گمان کرتے ہیں اس طرح نہیں۔

اب معنیٰ یہ ہوا کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے جس میں عزیر و عیسیٰ اور ملائکہ علیہم السلام بھی ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اس میں سے اللہ تعالیٰ کی کوئی بھی اولاد نہیں۔

کُلٌّ سب کے سب جو زمین میں ہیں، ذوی العقول یا غیر ذوی العقول لَّهٗ اللہ تعالیٰ سبحانہ کے لیے قٰنِتُوْنَ ○ فرماں بردار ہیں۔ اس کی مشیّت و تکوین سے کوئی شے ممتنع نہیں۔ اور ہر وہ شے کہ جس کی یہی شان ہو کہ وہ ایک مخلوق ہو تو وہ اپنے خالق واجب بذاتہٖ کی ہم جنس نہیں ہوا کرتی۔ نتیجہ نکلا کہ اس کے لیے اولاد نہیں، کیونکہ بیٹے کا حق ہے کہ وہ اپنے بیٹے کا ہم جنس ہو۔

سوال : پہلے ان تمام کو غیر ذوی العقول سے تعبیر فرمایا اور اب انھیں قٰنتون فرما کر ذوی العقول سے تعبیر کیا جا رہا ہے، اس کی کیا وجہ ہے ؟

جواب : ان عقلمندوں کی تحقیر مطلوب ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ثابت کر رہے ہیں۔

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا۔

حل لغات : بَدِیْعٌ بمعنی مُبْدَعٌ۔ اور مُبْدَعٌ اسے کہتے ہیں جو کسی شے کو اس طرز میں پیدا کرے جس کی پہلے کوئی مثال نہ ملے۔ اور اِبْدَاعٌ بمعنی اِخْتِرَاعُ الشَّیْءِ الخ یعنی کسی شے کو کسی سے دفعۃً پیدا کرنا۔ یعنی نہ ان کا پہلے کوئی مادہ موجود ہو نہ اس کے پیدا کرنے میں کوئی مدت گزرے۔ اور بدعتی کو بھی مُبْدِعٌ اس لیے کہتے ہیں کہ جس طرح بدعت ہے اس کی نظیر اربابِ شرع میں نہیں ملتی۔ یا آیت کا یہ معنیٰ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ پہلے معنے کے اعتبار سے اَبْدَعَ سے ماخوذ ہوگا۔ اور اضافت معنوی ہوگی۔ دوسرے معنی کے اعتبار سے بَدَعَ سے ماخوذ ہوگا۔ جبکہ کسی شکل میں فوقیت اور دل لبھانے والا حسن ہو۔ اب اضافت لفظیہ ہوگی۔ یہ ان کے بُرے قول کی دوسری تردید ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ والد ولد کا عنصر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ولد اس کے مادہ سے اثر گیر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو علی الاطلاق تمام مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے اثر لینے دینے سے پاک ہے۔ نتیجہ نکلا کہ وہ کسی کا والد نہیں۔ علاوہ ازیں جب وہ آسمان و زمین کو بغیر کسی مادہ کے پیدا کرنے پر قادر ہے تو وہ صرف

عیسیٰ علیہ السلام کو بن باپ کے پیدا کرنے پر کیوں قادر نہ ہوگا !

وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا جب کسی شے کے متعلق ارادہ کرتا ہے۔

حل لغات : قَضَاءٌ بمعنے احکام۔ یعنی کسی شے کو کسی شے کے سہارے کے بغیر مضبوط کرنا۔

جب وہ ہر شے پر قادر ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کرنے پر کیوں قادر نہیں۔

فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ٥ بیشک اللہ جس شے کو فرماتا ہے "ہو جا"۔ تو وہ ہو جاتی ہے۔ جس میں کسی قسم کا توقف نہیں ہوتا اور نہ ہی انکار رہتا ہے۔ یہ دونوں کَانَ تامہ ہیں بمعنی اَحۡدَثَ فَیَحۡدِثُ یعنی فرماتا ہے ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔

عقیدہ : اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ اشیاءٔ کے وجود کا تعلق کُنۡ سے متعلق نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق و ایجاد اور تکوین سے متعلق ہے۔ یہ ازلی صفت ہے۔ کُنۡ کا یہ مطلب ہے کہ صرف اتنا کہنے سے اللہ تعالیٰ اشیاء کو پیدا کرتا ہے جس میں کسی قسم کی تاخیر نہیں یہ اس کی کمال قدرت کی علامت ہے۔

یہ کسی کے علم میں نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اشیاءٔ سے تعلق کس طرح ہے۔ اس کی بحث نہیں چھیڑنی چاہیے۔ اور نہ ہی خالق کی کیفیت سے بحث کرنی چاہیے اور نہ ہی بعد از موت کے عذاب سے بحث کرنی چاہیے۔ اسی طرح کے اور بہت سے مسائل ہیں۔ کیونکہ یہ دقیق اسرار ہیں۔

مسئلہ : وہ لوگ دو باتوں سے گمراہ ہوئے :

۱۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ثابت کرنے سے ،

۲۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے اولاد منتخب فرماتا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

حدیثِ قدسی "بنو آدم میری تکذیب کرتے ہیں (یعنی مجھے کذب کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ یہ بات اس کے شایانِ شان نہیں،) اور پھر مجھے گالیاں دیتے ہیں (یہ بھی اسے لائق نہیں تھا) میری تکذیب تو یوں کرتے ہیں کہ ان کا گمان ہے کہ میں انھیں مرنے کے بعد پھر اٹھانے پر قادر نہیں۔ اور ان کی گالیاں یوں ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے حالانکہ میں اس بات سے منزّہ ہوں کہ اولاد و ازواج اپنے لیے بناؤں۔"

یہ گالیاں اسی لیے کہ ولد بمعنی جز کا کل سے نکالنا۔ اور یہ ترکیب کو چاہتا ہے۔ اور ہر مرکب محتاج ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ترکیب سے پاک ہے۔

سوال : جس طرح اس کے لیے اولاد کی نسبت کرنا گالیاں ہیں اسی طرح اُس کے لیے مرنے کے بعد لوٹانے کی قدرت سے انکار بھی گالیاں ہیں۔ کیونکہ کسی شے پر قادر نہ ہونا عجز کی علامت ہے اور اس کے لیے عجز کی نسبت کرنا بھی

گالیاں ہیں۔ پھر ایک کو گالیوں سے اور دوسرے کو تکذیب سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیوں ؟

جواب : قیامت میں دوبارہ لوٹانے کی نفی سے اس کی صفتِ کمال کی نفی ہوتی ہے اور اس کے لیے اولاد کی نسبت سے ایک صفت نقصان ثابت کرنا ہے۔ پھر یہ قاعدہ ہے کہ شتم تکذیب سے زیادہ فحش ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے جھوٹ کی نسبت نبی علیہ السلام پر جھوٹ کی نسبت سے زیادہ بُرا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ مجھ پر جھوٹ کی نسبت عام آدمیوں کی طرح نہیں۔

یعنی مجھ پر جھوٹ کی نسبت بہت بڑا گناہ ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات مستثنیٰ ہے کیونکہ حضور علیہ السلام پر جھوٹ باندھنے سے قواعدِ اسلام کو مٹانا اور شریعت و احکام میں فساد ڈالنا ہے۔

حدیث شریف : حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا :

"جو شخص میری طرف جھوٹ کی نسبت کرتا ہے وُہ جہنمی ہے۔

مسئلہ : پہلی شریعت میں اللہ تعالیٰ کو باپ کہہ لینا جائز تھا۔ اسی طرح کسی بڑے کو الٰہ کہنا بھی جائز تھا۔ یہاں تک کہ یُوں بھی کہہ دیتے کہ باپ ربِ اصغر اور اللہ تعالیٰ ربِ اکبر۔ مقصد یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے پیدا کرنے میں سببِ اوّل ہے اور باپ پرورش کے لحاظ سے سببِ اخیر ہے۔ اسی اعتبار سے باپ بیٹے کا من وجہ معبود ٹھہرا۔ معبود بمعنی مخدوم سمجھا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو رب کہنے کے جواز سے جاہلوں نے سمجھ لیا کہ یہ اس کے محبوب بندے طبعی ولادت کے لحاظ سے اس کی اولاد ہیں۔ اس کے بعد اندھی تقلید سے بعد والوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ثابت کرنی شروع کر دی۔

مسئلہ : چونکہ جاہلوں کو ایک شرعی مسئلہ سے غلط فہمی ہُوئی اس لیے اب مطلقاً اللہ تعالیٰ کو باپ کہنے اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو ابناءً کہنے سے روکا گیا ہے بلکہ اس کے قائل کو کافر قرار دیا گیا ہے خواہ اس ولادت سے ولادتِ سببیہ مراد ہو یا ولادتِ طبعیہ۔ تاکہ غلط عقیدے کی جڑ سرے سے ہی کاٹ دی جائے۔

مسئلہ : اللہ تعالیٰ کسی کو حبیب یا خلیل بنائے اسے اللہ تعالیٰ کا حبیب یا خلیل کہا جائے تو جائز ہے کیونکہ محبت کے الفاظ سے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں پیدا ہو سکتی۔

(۱) اُن کی کتاب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی :

وَلَّدْتُكَ وَ اَنْتَ نَبِيِّيْ۔

(میں نے تجھے پیدا فرمایا اور تُو میرا نبی ہے)

لیکن یار لوگوں نے ولدتک کی لام کو مخفف کر کے پڑھا اور لام کی شد کو بالکل اڑا دیا تاکہ معنیٰ یہ ہو جائے کہ میں نے تجھے بیٹا بنایا (معاذ اللہ) کیونکہ لام مشدد سے تولید سے مشتق ماننا پڑتا ہے جس کا معنیٰ ہے پیدا کرنا۔

(۲) نَبِیُّ میں ی کو ن کی جگہ پر اور نون کو یا ء کی جگہ پر قلب مکانی کر کے پڑھا، جس کا نبی کی بجائے بُنَیَّ (میرا بیٹا) کا معنیٰ بن جائے۔ (تعالی اللّٰہ عما یقول الظالمون)

(۳) ایک وحی یوں تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں خطاب فرمایا:

یَا اَحْبَارِیْ وَ یَا اَبْنَاءَ رُسُلِیْ۔

(اے میرے علماء اور میرے رسولوں کی اولاد)

انہوں نے احباری کے بجائے احبائی اور اَبناء رُسلی کی بجائے یا ابنائی پڑھا۔ اللہ تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ کما قال:

وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ۔

(یہود و نصاریٰ نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے محب ہیں)

پھر فرمایا:

قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ۔

(ان سے پُوچھیے اگر ایسی بات ہے تو پھر اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے۔ بلکہ تم بشری مخلوق ہو)

خلاصۂ تفسیر: اللہ تعالیٰ حدود و جہات سے منزّہ اور ازواج بنین و بنات سے پاک ہے نہ اس کی کوئی مثل ہے زمین میں نہ آسمان میں۔

سبق مومن پر لازم ہے کہ وہ ٹیڑھا پن اور گمراہی اور بُرے اعمال اور گندے اقوال سے بچتا رہے اور ہر صبح و شام توحید کا پابند رہے۔ یہاں تک کہ وُہ اپنے اندر شرکِ خفی کو بھی نہ گھُسنے دے۔

حدیث شریف: اگر امیر کو معلوم ہو جائے کہ ذکر الٰہی میں کیا فائدے ہیں تو امیری کو اور تاجر اپنی تجارت کو ختم کر دے۔ اسے صرف اس کی ایک بار تسبیح (سبحان اللہ) کہنے کے ثواب کو تقسیم کیا جائے تو اس دنیا کو دس دنیا بنا یا جائے، تو اس کی تسبیح کا ثواب ہر ایک کو پہنچے گا۔

حدیث شریف: مومن کے تین مضبوط قلعے ہیں:

(۱) ذکر اللہ

(۲) قراۃ القرآن

(۳) مسجد شریف

ف: مسجد سے اس کی نماز پڑھنے کی جگہ مراد ہے خواہ اس کے گھر میں ہو یا باہر۔ لیکن عبادت میں صدق اور اخلاص

ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اس کی عبادت کی جھلک ملک و ملکوت میں نمایاں ہو۔ حضرت مولانا روم قدس سرہٗ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں : ؎

ہست تسبیحت بخار آب و گل
مُرغ جنت شد ز نفخ صدقِ دل

ترجمہ : تیری تسبیح آب و گل کا بخار ہے صدق دل کا پھونکا بہشت میں مرغ بنے گا (یعنی بہترین کھانے) اے اللہ! ہمیں یقین کے درجہ تک پہنچا اور ہمارے لیے تمکین کے مقامات میں سے کوئی مقام تیار فرما۔ آمین

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مشرکینِ عرب (جو حقیقۃً جاہل ہیں) یا اہلِ کتاب (جو عمداً جاہل بننے والے ہیں) کہتے ہیں۔ ان سے علم کی نفی عدمِ انتفاع کی وجہ سے ہے کیونکہ علم سے مقصود عمل ہوتا ہے۔

لَوْلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ۔

ترکیب : لَوْلَا تحضیض کے لیے ہوتا ہے اور تحضیص کے حروف جب ماضی پر داخل ہوتے ہیں تو اس وقت توبیخ اور کسی فعل سے روکنا ای لم یفعل۔ اور مضارع میں فاعل کو فعل کی طلب پر ابھارنا مقصود ہوتا ہے۔ اور نیز فعل پر اُبھارنا بھی بمعنی امر کے ہوتا ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ بالمشافہ گفتگو کیوں نہیں فرماتا تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ واقعی آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جیسا کہ ملائکہ کے ساتھ بلا واسطہ کلام کرتا ہے۔ یا ہمارے ہاں فرشتہ کیوں نہیں بھیجتا تاکہ اُس فرشتہ کے واسطہ سے ہمارے ساتھ کلام فرمادے کہ واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں۔ جیسا کہ سابقہ انبیا علیہم السلام کے ساتھ اسی طریقہ سے کلام فرمایا۔ یہ قول جُہلاً بطور تکبّر کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ ہم بھی ملائکہ و انبیاء علیہم السلام کی طرح معظم بالشان ہیں۔ جب ہم ان کی طرح ہیں تو یہ کلام کا اختصاص اُن کے ساتھ کیسا۔

اَوْ تخییر کے لیے ہے تَاْتِیْنَآ اٰیَۃٌ ؕ یا ہمارے پاس کوئی ایسی حجت آئے جو آپ کی صداقت پر دلالت کرے۔ یہ بھی ہٹ دھرمی تھی ورنہ یہ قرآن اور دیگر معجزات کیا معمولی دلائل ہیں۔

ف : جحود انکار مع علم کو کہتے ہیں۔ بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ نفس (جو حقیر ترین ہے) کو اشرف سمجھ کر ان آیات بینات کی اہانت کر رہے تھے جو سب سے عظیم الشان تھیں۔

کَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ سابقہ اُمتیں بھی یونہی کہا کرتیں۔ چنانچہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا :

ارنا اللہ جھرۃ اور لن نصبر علیٰ طعام واحد۔

اور نصاریٰ کہتے تھے :

ھل یستطیع ربك ان ینزل علینا مائدۃ من السماء وغیرہ وغیرہ۔

ف : کذٰلک قال پھر مثل قولھم میں دو تشبیہیں ہیں :

(۱) تشبیہ المقول بالمقول مؤدیٰ و ما حصل میں۔

(۲) تشبیہ القول بالقول بغیر رؤیۃ میں

بلکہ خواہش نفسانی کے مطابق اور اتباع الہویٰ اور سرکشی کے طور پر سوال کرنے میں (نہ سیدھی راہ حاصل کرنے کی غرض پر) اور کذٰلک منصوب المحل اور قال کا مفعول ہے۔ اور مثل قولھم مفعول مطلق ہے۔ در اصل عبارت یُوں تھی :

قال کفار الامم الماضیہ۔

یعنی گزشتہ اُمتوں کے کفار بھی ان کی طرح کہا کرتے تھے جس طرح یہ کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہُوا کہ ایک تشبیہ دوسری تشبیہ سے بے پروا نہیں کرتی۔

تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ان کے اور گزشتہ لوگوں کے قول سے وجہ تشبیہ کی وجہ تعلیل بیان کرنے میں ان کے ولد آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں کیونکہ زبان دل کی ترجمان ہے دل میں اگر کفر وقسوۃ اور اندھا پن، بے وقوفی اور عناد گھر کر جائے تو زبان سے بھی تعلل اور تباعد عن الایمان کا پتا چلتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے : ؎

۱ مرد پنہاں بود بزیر زبان
چوں بگوید سخن بدانندش

۲ خوب گوید لبیب گویندش
زشت گوید سفیہ خوانندش

ترجمہ : ۱۔ انسان زبان کے نیچے چھپا ہُوا ہے جب بولتا ہے تب معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ خُوب بولے تو اسے دانا سمجھتے ہیں غلط بولے تو اسے بیوقوف کہا جاتا ہے۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ انھیں ہم نے حجۃ بیان کر دی کہ ان کو اب یقین ہے کہ واقعی ان کا کوئی معبود ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں :

سبحان من صغر البعوض الخ

(وہ ذات پاک ہے جس نے مچھر کو چھوٹا کر کے اور ہاتھی کو بڑا کر کے پیدا کیا)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیزیں پہلے حجت نہ تھیں اب حجت ہو گئیں بلکہ ہمیشہ حجت ہیں۔

لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ ان لوگوں کے لیے جو یقین کے طالب ہیں۔ طلب کرتے ہیں۔

ف : یقین علم سے ابلغ اور مؤکد ہوتا ہے اور ایسا جازم ہوتا ہے کہ اس میں شک کا احتمال نہیں ہوتا۔ اور

ایسا ثابت ہوتا ہے کہ شک ڈالنے سے زائل نہیں ہوتا اور وہ واقع کے بھی مطابق ہوتا ہے۔ پس ایقان کا طلب الیقین مجازی معنی ہے۔ جیسا کہ مسبّب بول کر سبب کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ طالبانِ یقین کے لیے دلائل قایم کرنا کوئی بڑی بات نہیں تاکہ اسی یقین کو ان دلائل سے حاصل کریں البتہ اسے مجاز پر محمول کیا جائے، تو بہتر ہے کیونکہ معنی مذکور کے یقین کرلے والا دلائل کے قائم کرنے اور آیات کے بیان کرنے کا محتاج نہیں ہے۔ اس معنے پر اسے تحصیل حاصل کا ارتکاب کرنا ہوگا۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ ہم نے آپ کو بھیجا درانحالیکہ آپ بِالْحَقِّ حق سے مؤید ہیں۔ اس سے حجتِ آیات مراد ہے۔ اُن کو حق سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اشیائے حق کی طرف لے جانے والی ہیں بَشِیْرًا درانحالیکہ آپ اس شخص کو جو آپ پر ایمان لائے اسے ان چیزوں کی خوشخبری سنائیں کہ جنھیں نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا اور نہ ہی کسی کے وہم میں ہوں۔

وَّنَذِیْرًا اسے ڈر سنائیں جو آپ کے ساتھ کفر اور آپ کی نافرمانی کرے۔ معنیٰ یہ ہے کہ آپ کی شان یہ ہے کہ آپ دلائل و معجزات سے انہیں دعویٰ رسالت کے صدق کے اظہار کے بعد آپ پر ضروری نہیں کہ آپ انہیں ایمان اور احکام قبول کرنے پر مجبور کریں صرف آپ انہیں خوشخبری اور ڈر سنا کر دعوتِ حق دیجئے۔ اُن کے کفر و عناد پر اصرار کرنے سے آپ کا کوئی نقصان نہیں۔ کیونکہ احوال ذی الحال کے اوصاف ہوتے ہیں اور اوصاف موصوف سے مقید ہوتے ہیں۔

وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ۝ جو ایمان نہیں لاتے، ان کے متعلق آپ سے سوال نہیں ہوگا کیونکہ ان کا انجام جہنم ہے۔

ف: جحیم ایک سخت گرم مکان کا نام ہے۔ ایک قرأت میں بفتح التاء ہے اور لام کی جزم نہی کے لیے ہے۔ یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوین کی دعائے خیر سے روکا جا رہا ہے۔ جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ کاش میرے والدین سے وہ نہ ہوتا جو اُن سے ہُوا۔ نبی علیہ السلام کے والدین مومن تھے۔

عقیدہ: اسلاف میں اختلاف رہا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین کافر ہو کر مرے یا مسلمان ہو کر۔ دوسرا قول راجح اور صحیح ہے۔ دلائل یہ ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب شریف کفر کی گرد و غبار سے پاک ہے اگرچہ قریش میں بُتوں کی پرستش عام تھی لیکن خلیل علیہ السلام کی دُعا "واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام" (مجھے اور میری اولاد کو بُتوں کی پرستش سے بچا) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ بتوں کی پرستش کے مرتکب نہیں ہوئے۔ دوسری آیت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے وجعلھا کلمۃ باقیۃ۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شرک سے دور تھے۔ تو پہلے قول والے لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب حکم ہُوا کہ آپ مومنوں کو خوشخبری اور کافروں کو ڈر سنائیے۔ تو آپؐ نے کفار کی سزائیں سنائیں اندریں اثناء ایک مرد کھڑا ہو کر عرض کرنے لگا، یا رسول اللہ! میرے والدین کہاں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: جہنم میں۔ اس سے وہ شخص غمگین ہُوا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

غم نہ کھا اس لیے کہ میرے اور ابراہیم علیہ السلام کے والدین بھی تو جہنم میں ہیں ۔ اس پر ولا تسئل عن اصحٰب الجحیم آیت نازل ہوئی ۔ یہ آیت لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم کی طرح ہے ۔ یہ قول صاحب تیسیر کا ہے ۔

تحقیقی قول بعض لوگ اس طرف گئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین ماجدین ناجی ہیں ۔ یہی قول امام قرطبی کا ہے (اور یہی صحیح ہے) امام مذکور نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمارے ساتھ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو آپ قصبۃ الحجون سے گزرے تو آپ غمگین ہو کر آنسو بہانے لگے ۔ آپ کو دیکھ کر میری آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں ۔ آپ اونٹنی سے اُترے اور فرمایا ؛ اے حمیرا (عائشہؓ) ذرا رُکیے ۔ میں وہاں ٹھہر گئی آپ تادیر وہاں ٹھہرے رہے ۔ آخر آپ متبسم فرماتے ہوئے واپس تشریف لائے ۔ میں نے عرض کیا ؛ آپ پر میرے ماں باپ قربان ، آپ یہاں پہلے غمگین ہوئے ، گریہ فرمایا ، آپ کو دیکھ کر میرے بھی آنسو بہ نکلے ، لیکن جب آپ لوٹے ہیں تو مسرور و متبسم ، آخر اس کا سبب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ؛ میں نے اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کو دیکھا تو رو دیا ، میں والدہ آمنہ کی قبر پر گیا ، اللہ تعالیٰ سے دعا کی یا اللہ ! میری والدہ کو زندہ کر دے ، اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ کیا اور انھوں نے میرا کلمہ پڑھا ۔

ف ؛ مروی ہے کہ آپ کی خاطر اللہ تعالیٰ نے آپ کے والد ، والدہ ، چچا ابو طالب اور دادا عبدالمطلب کو زندہ کیا اور انھوں نے آپ کا کلمہ پڑھا ۔

حضرت حافظ شمس الدین دمشقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ؎

۱ حبا اللہ النبی مزید فضل

علیٰ فضل وکان بہ رؤفا

۲ فاحیا امہ وکذا ابا

لایمان بہ فضلا لطیفا

۳ فسلم فالقدیم بہ قدیر

وان کان الحدیث بہ ضعیفا

ترجمہ ؛ (۱) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بڑا فضل کیا اور وہ ان کے لیے بڑا رحیم ہے ۔
(۲) ان کی خاطر اُنؐ کی والدہ اسی طرح والد کو زندہ کیا تا کہ آپ پر ایمان لائیں ۔ یہ بہت بڑا فضل ہے ۔
(۳) یہ مان لینا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ اس امر پر قادر ہے ۔ اگرچہ یہ مسئلہ حدیث ضعیف سے ثابت ہے ۔

مسئلہ ؛ الاشباہ والنظائر میں ہے کہ جو بھی کفر پر مرے اس پر لعنت بھیجنا جائز ہے مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین پر لعنت نہ کی جائے ۔ کیونکہ اُن کا زندہ ہو کر اسلام لانا (حدیث سے) ثابت ہے ۔ (کذا فی مناقب الکردی)

حضور اکرمؐ کے والدین کا اسلام لانا

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے والدین کی قبروں پر بہت گریہ فرمایا۔ اس کے بعد آپؐ نے قبروں پر خشک درخت کھڑا کر دیا اور فرمایا:

اگر یہ درخت سبز ہو گیا تو اُن کے ایمان کی نشانی ہے اور اگر خشک رہا تو ان کے کفر کی علامت ہے۔

خدا کی شان وُہ درخت سبز ہو گیا۔ وہ دونوں حضرات قبر سے باہر نکلے، یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا مبارک کا نتیجہ تھا۔ وُہ زندہ ہوتے ہی حضور علیہ السلام پر ایمان لا کر اپنی اپنی قبروں میں واپس چلے گئے۔

ف: حضرت شیخ شہیر بافتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں یہی قول صحیح ہے کیونکہ آپ کے والد ماجد کا نام عبداللہؓ تھا اور لفظاً اللہ کسی بُت کا نام نہیں تھا کیونکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے مخصوص علم میں سے ہے۔ جاہلیت میں ان بتوں کے نام لات وعزیٰ وغیرہ تھے۔

ف: ان حضرات کا زندہ ہونا نہ عقلاً ممتنع ہے نہ شرعاً۔ کیونکہ قرآن شریف میں بنی اسرائیل کے مقتول کا زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتانا ثابت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مُردے زندہ فرمائے۔ جب یہ ثابت ہے تو پھر آپؐ کے والدینؓ کے زندہ ہو کر اسلام لانے پر کون سا اشکال ہے۔ بلکہ یہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید لطف و کرم کی دلیل ہے۔

سوال: حدیث شریف میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک روز اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر تشریف لے گئے خود بھی خوب روئے اور ساتھ والوں کو بھی رُلایا۔ پھر فرمایا: میں نے اپنے رب سے اپنی والدہ کے استغفار کی اجازت چاہی تو مجھے روکا گیا، پھر میں نے ان کی قبر کی زیارت کی اجازت چاہی تو قبر کی زیارت کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: قبور کی زیارت کیا کرو کیونکہ وہ موت یاد دلاتی ہیں۔

جواب: یہ حدیث مذکورہ احادیث سے پہلے یعنی حدیث حجۃ الوداع کے موقعہ کی ہے اور آپ ہر گھڑی بڑے درجات کو پہنچتے رہے یہاں تک کہ وصال شریف تک بڑے درجات آپ نے طے فرمائے۔ ممکن ہے یہ درجہ بھی اسی اثناء میں حاصل ہوا ہو۔

سوال: جب کافر کا ایمان موت کے معائنہ کے وقت غیر قابلِ قبول ہے پھر مرنے کے بعد ایمان لانا کیسے قبول ہو سکتا ہے۔

جواب: معائنہ موت کا ایمان خوف کی وجہ سے ہوتا ہے اسی وجہ سے ناقابلِ قبول ہے البتہ موت کے بعد زندہ ہونے میں خوف کا ہے کا۔ چنانچہ ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه آیتِ قرآنی سے بھی ثبوت ملتا ہے۔

اصحابِ کہف کا بیان

حدیث شریف : اصحابِ کہف رحمہم اللہ تعالیٰ آخر زمانے میں اپنی قبور سے اٹھائے جائیں گے اور وہ حج پڑھیں گے اور وہ اسی اُمت میں شمار ہوں گے ۔ یہ ان کی شرافت و کرامت سے ہوگا ۔

دوسری مرفوع حدیث میں ہے کہ حضرت امام مہدی علیٰ نبینا علیہ السلام کے مددگاروں میں سے یہی اصحابِ کہف ہوں گے ۔ اور جو کچھ اصحابِ کہف اس زندگی میں عمل کریں گے ان کے اعمال نامے میں لکھا جائے گا ۔ اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ السلام کے والدین کی تقدیر میں یہ لکھا ہو کہ ان کی عمر اتنی ہوگی لیکن وقت سے پہلے انھیں موت دی جائے گی پھر ان کی بقایا عمر اسی لحظہ میں شمار ہو جس میں وہ زندہ ہو کر نبی علیہ السلام پر ایمان لائے اور اُن کا ایمان لانا اصحابِ کہف کے اعمال کی طرح اُن کے لیے ان کے اعمال نامے میں شمار ہو ، یہ فاصلہ جو اُن کے مرنے اور پھر اُٹھنے تک کا ہے صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و کرامت کے لیے ہو تو کچھ بعید نہیں جیسے اصحابِ کہف کو اس مدت کے لیے موخر کر کے زندہ کیا گیا صرف ان کی شرافت و کرامت کے پیشِ نظر ہے تاکہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُمتی ہونے کے شرف سے مشرف ہوں ۔

ف : خاتم الحفّاظ والمحدثین امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک آپ کے والدین متعلق توقف کا ہے ۔ چنانچہ مقاصدِ حسنہ میں حضرت حافظ شمس الدین دمشقی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر مذکور نقل کر کے فرمایا کہ اس مسئلہ پر میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے ۔ لیکن میرا مسلک اس میں یہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان و کفر کے متعلق توقف بہتر ہے ۔

ف : حضرت قاضی ابوبکر ابن العربی رحمۃ اللہ تعالیٰ مالکی مسلک کے امام ہیں سے سوال ہوا کہ آپ اس شخص کے متعلق کیا فرماتے ہیں جو حضور علیہ السلام کے آباؤ اجداد کے متعلق کہتا ہے کہ وہ جہنمی ہیں ۔ آپ نے فرمایا : ایسا شخص ملعون ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۔

(بیشک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام کو ایذا دیتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں ملعون بنایا ہے)

اور حدیث شریف میں ہے :

لَا تؤذوا الاحیاء بسبب الاموات ۔

(زندہ لوگوں کو اُن کے مُردوں کی وجہ سے ایذا نہ دو)

ف : حضرت امام رستغفنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پوچھا گیا کہ ایسے شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو کہتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو آپ کا سارا جسم سیاہ ہوگیا۔ پھر جب آپ زمین پر اترے تو اس کے بعد آپ کو نماز اور روزے کا حکم ہوا۔ آپ نے نماز اور روزہ ادا فرمایا پھر آپ کا جسم سفید ہوگیا۔ کیا اس کا یہ قول صحیح ہے؟ آپ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں ایسے قول نہ کہے جائیں کہ جن میں ان کا عیب یا نقص ظاہر ہوتا ہو۔ ہم ان کے متعلق خاموشی پر مامور ہیں کیونکہ ان کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بلند ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "جب میرے صحابہ کا ذکر تمہارے سامنے نقص و عیب کے ساتھ آئے تو تم خاموش رہو"۔ جب ہمیں حضور علیہ السلام کے صحابہ کے متعلق کفِ لسان کا حکم ہے تو پھر انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق بطریق اولیٰ ہے کہ خاموشی سے کام لیں۔

مسئلہ : مسلمان پر لازم ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے نسب کے متعلق جو امور خلل اور عیب پر دلالت کریں ان پر زبان درازی نہ کرے۔ کیونکہ یہ مسائل ایسے اعتقادیات سے نہیں کہ جن سے کوئی فائدہ ہو۔ زبان کے حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ جس میں نقص و عیب کی بات ہو زبان کو بند رکھا جائے۔ خصوصاً ایسی باتیں جن کا عوام میں پھیلنے سے ایسا خطرہ ہو کہ پھر ان کا سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ یہ وہ بیان شافی ہے جو میں نے مختلف کتابوں سے چن کر عرض کر دیا ہے اور ہر مسئلے کی نظیر بھی پیش کر دی ہے۔ (الحمد للہ تعالیٰ وحدہٗ)

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ اس میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو یہودیوں کے اسلام کے داخلہ میں طمع کرنے سے روکا ہے کیونکہ انہوں نے حضور علیہ السلام کو ان کی ملت سے راضی ہونے پر معلق کیا ہے کہ ہم اس شرط پر اسلام لائیں گے اور یہ ایسی شرط ہے کہ بالکل ناممکن بلکہ اس کا وجود بھی ممتنع ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب وہ آپ سے راضی نہیں۔ پھر آپ کی ملت کی اتباع کیسے کر سکتے ہیں۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ آپ سے یہود راضی نہیں ہوں گے جب تک یہودی نہ ہوں اور ان کے قبلہ (جو کہ مغرب ہے) کی طرف منہ کر کے نماز نہ ادا کریں۔ اسی طرح نصاریٰ بھی آپ سے راضی نہ ہوں گے جب تک کہ نصرانی نہ ہوں اور ان کے قبلہ یعنی مشرق کی طرف منہ کر کے نماز ادا نہ کریں۔

سوال : ملت کو واحد کر کے کیوں استعمال کیا گیا ہے۔

جواب : کفر و ملت ایک شے ہے ویسے یہ ان کے قول کی حکایت ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہم آپ سے راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ ہماری ملت کی فرمانبرداری نہ کریں۔ اور مدعی تھے کہ صرف ان کی ملت میں ہدایت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا : **قُلْ** ان کی تردید بطریق قلب کے ہے یعنی اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! انہیں فرمائیے **اِنَّ هُدَى اللّٰهِ** بے شک صرف اسلام ہی **هُوَ الْهُدٰى**

سیدھے راستے کی طرف لے جانے والا ہے۔ نہ وہ جس کی طرف تم بلا رہے ہو۔ اس لیے کہ وہ ملت زائغہ (ٹیڑھی) اور نری خواہش نفسانی ہے جیسے کہ یہ قول اشارہ کرتا ہے وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ یعنی ان کی ملت زائغہ جو اُن کی خواہشاتِ نفسانیہ سے صادر ہونے والے ہیں جنہیں پہلے ان کی ملت فرمایا جس کی طرف وہ خوش ہو کر چلتے ہیں درحقیقت وُہ راہ جو اللہ تعالیٰ انبیاءُ علیہم السلام کی زبانِ اقدس کے ذریعہ سے بیان فرماتا ہے یہی ملت ہے جسے انہوں نے بالکل تبدیل کر دیا۔

حلِ لغات : اَهْوَآءٌ، هویٰ کی جمع ہے۔ وُہ شہوت داعیہ جو گمراہی کی طرف بلانے۔ یہ اس نام سے اس لیے موسوم ہے کہ اپنے صاحب کو دُنیا میں بُرے امر اور آخرت میں دوزخ (هاویه) کی طرف کھینچ لے جانے والی ہے۔

سوال : اَهْوَآءَهُمْ کی بجائے هَوَاءُهُمْ کیوں نہ فرمایا؟

جواب : تنبیہ فرمائی کہ ہرایک کی خواہش اپنی اپنی، اور پھر ہرایک کی خواہش دوسرے کی خواہش کی غیر تھی اور پھر ہرایک کی خواہش کی کوئی انتہا نہیں تھی اسی لیے خبر دی کہ ان میں سے کوئی بھی راضی نہیں جب تک ہرایک کی خواہش کی اتباع نہ کرو گے۔

ف : مشروع راہ کو ملت اس لیے کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے اسے اپنی اُمت کے لیے ظاہر کر کے لکھا ہے۔ جیسا کہ دین کو دین اس لیے کہتے ہیں کہ جس راہ کا طریقہ مقرر ہے اس کی بندے اطاعت کرتے اور اس کی حکمت کے تابع ہوتے ہیں۔ اور اس کا نام شریعت بھی اس لیے ہے کہ گویا وہ پیاسوں کی جائے ورود ہے جو اپنے ثواب اور رحمت کے شفاف پانی کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور ولئن اتبعت میں خطاب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہے۔

سوال : ادھر تو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں اور جانتا ہے کہ یہ حضرت نافرمانی کرنے والے نہیں۔ نہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں نہ ہی نہی کا ان سے ارتکاب ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان کا معصوم ہونا واجب ہے۔ اس تقریر کے مطابق ولئن اتبعت کا خطاب اُمت کو ہو نہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

جواب : کسی کو کسی کے عمل کا مکلف بنانے اور اس کو کسی فعل سے ڈرانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ذات میں ایسے قوی آلات موجود ہوں کہ جن پر تکلیف و تعذیر کا توقف ہے۔ چونکہ وہ باتیں ان میں محتملاً یا متصوراً پائی جاتی ہیں اسی لیے ان کو خطاب کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

خلاصہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا اور پھر اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم دینے میں منافات نہیں کیونکہ ان باتوں میں امکان ذاتی تو ہے۔ اور ایسی بات تکلیف و تعذیر کے لیے شرط ہے۔

بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ بعد ازاں آپ کے پاس قرآن کا علم ہے۔ یہ جملہ جاءك کی ضمیر سے حال ہے۔
مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ سے آپ کا کوئی مِنْ وَّلِیٍّ دوست نہیں ہوگا جو آپ کو نفع پہنچائے۔ ولیٌّ، ولی سے مشتق ہے

بمعنی قُرب۔ وَّلَا نَصِیْرٍ ۝ اور نہ آپ کا کوئی مددگار ہوگا جو آپ سے عذاب کو دفع کر سکے۔ ولی اور نصیر کے مابین عموم و خصوص مِنْ وَجْہٍ کی نسبت ہے۔ کیونکہ ولی مدد کرنے سے کمزور پڑ جاتا ہے اور نصیر کبھی غیر واقف ہونے کے باوجود مدد کرتا ہے گویا کہ وہ مدد کیے جانے والے کا بہت قریبی ہے اسی لیے اُن کو ایک جگہ جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ من ولی محلًّا مرفوع مبتدا اور مالك اس کی خبر مقدم ہے اور مِنْ اتصال کے لیے ہے اور من اللّٰہ منصوب المحل ہے اس لیے کہ حال ہے کیونکہ یہ صفت تو نہیں بن سکتا اس لیے کہ مِنْ وَّلِیٍّ سے مقدم ہے اور صفت اپنے موصوف سے مقدم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کا صفت بننا ممتنع ہوا۔ جیسے لعزۃ موحشا طلل قدیم۔ اس میں موحشا کو حال تو بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن صفت نہیں بن سکتا۔

ربط: جب اُن لوگوں کا بیان ہوا جو حضور علیہ السلام کی نبوت سے تکبّر اور حبِّ ریاست کو ترک کر کے اقرار کیا اور ان میں ان کا صرف رضائے الٰہی اور ثوابِ آخرت مقصود ہے اور حظوظِ نفسانیہ فنا کر کے آخرت کی نعمتوں کے طلب گار ہوئے تو اب ان کا ذکر فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی اس سے حضرت عبد اللّٰہ بن سلام اور اُن کے ساتھی مراد ہیں۔ یہ لوگ یہودی تھے لیکن دولتِ اسلام سے نوازے گئے۔

سوال: کتاب صرف ان کو تو نہیں دی گئی تھی بلکہ جنہوں نے نبی علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر دیا تھا ان کے پاس بھی تو کتاب تھی پھر ان کی تخصیص کیسی؟ **جواب:** چونکہ انہوں نے اس کی کتاب پر عمل کیا تو گویا صرف کتاب انہیں ہی ملی جنہوں نے عمل بھی نہ کیا۔ ان کو ملنا نہ ملنے کے برابر ہے۔ (کتاب سے مراد تورات ہے)

یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اس کتاب کا حق ادا کر کے پڑھتے ہیں۔ یہ جملہ منکرینِ نبوت کے مقابلہ میں ہے کہ وہ کتاب کی تحریف و ترمیم کرتے ہیں۔

ف: معانی و الفاظ کے لحاظ سے ان میں بڑی عجیب مناسبت ہے کہ وُہ لوگ اپنی کتاب کی تحریف کرتے ہیں اور یہ اس پر عمل اور (جو کچھ اس کے اندر ہے) اس پر تدبر کرتے ہیں۔ یہ جملہ اٰتینٰھم کی منصوب ضمیر سے یا الکتاب سے حال مقدر ہے اس لیے کہ کتاب کے بھیجنے کے وقت یہ لوگ تلاوت کرنے والے نہیں تھے اور حق تلاوتہٖ صفت ہے اور اس کا موصوف مصدر محذوف ہے۔ دراصل عبارت یُوں تھی: یتلونہ تلاوۃ حق تلاوتہ۔ مولانا کواشی مرحوم فرماتے ہیں کہ حق تلاوتہٖ کا منصوب ہونا مفعول مطلق کے لحاظ سے ہے۔ اب عبارت یُوں ہوگی: تِلَاوَۃً حَقًّا۔ اس لیے قاعدہ نحویہ ہے کہ مصدر کی صفت کو اس پر مقدم کر کے مضاف کیا جائے تو اس کا منصوب ہونا مفعول مطلق کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جیسے: ضَرَبْتُ اَشَدَّ الضَّرْبِ۔ اشد کا منصوب ہونا مفعول مطلق کے لحاظ سے ہے۔

اُولٰٓئِکَ وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی ہے اور وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ مبتدأ ہے اور اس کی خبر یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ ہے یعنی وُہ اپنی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، محرفین کی طرح نہیں ہیں کہ ان کو اپنی کتاب پر ایمان نہیں، کیونکہ اس فعل کی بنا اپنے مبتدا پر ہے اگرچہ اسم ظاہر حصر کا فائدہ دے رہا ہے۔ جیسے اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ میں ہے۔
وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ اور وہ اس کتاب سے کفر کرتا ہے، خواہ اپنی کتاب کا کفر کہ اس کی تحریف کرے یا اس کتاب سے کفر کرے جو اُن کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ یہی لوگ خسارہ میں ہیں یعنی وہ ایمان کی بجائے کفر کا ارتکاب کر کے ہلاکت میں گرنے والے ہیں۔

يٰبَنِىٓ إِسْرَآءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِىَ الَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّى فَضَّلْتُكُمْ عَلَى
الْعٰلَمِينَ ○ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِى نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ
لَا تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ ○ وَإِذِ ابْتَلَىٰٓ إِبْرٰهِمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ
قَالَ إِنِّى جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِى قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى
الظّٰلِمِينَ ○ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ
إِبْرٰهِمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرٰهِمَ وَإِسْمٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِينَ
وَالْعٰكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ○ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا
وَّارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُم بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ وَ
بِئْسَ الْمَصِيرُ ○ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ
وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ
التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ○ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ
الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○ ع

۱۵ ع ۸ ۱۵

ترجمہ : اے یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد! یاد کرو میری نعمتیں جو میں نے تم پر کیں اور وہ جو میں نے تمہارے ہم زمان لوگوں پر تمہیں فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس میں نہ کوئی جان کسی دوسرے کا بدلہ ہو گی اور نہ کسی کو کچھ دے کر چھوڑ دیں اور نہ کافر کو کوئی شفاعت نفع دے اور نہ کافروں کی مدد ہو اور جب ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے رب نے چند باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں فرمایا: میں تمہیں لوگوں کا مقتدا بنانے والا ہوں۔ عرض کی: اور میری اولاد سے۔ فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ اور یاد کرو جب کہ ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور یعنی امن والا بنایا۔ اور مقامِ ابراہیم نماز کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل (علیہم السلام) کو تاکید فرمائی کہ میرا گھر خوب ستھرا بناؤ، طواف والوں اور رکوع و سجود والوں کے لیے۔ اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے عرض کی اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن والا کر دے اور اس میں رہنے والوں کو ہر طرح کے پھلوں سے روزی دے، جو ان میں سے اللہ تعالٰے اور یوم آخرت پر ایمان لائیں۔ فرمایا اللہ نے: اور جو کافر ہوا تھوڑا برتنے کو اسے بھی

دوں گا پھر اسے دوزخ کے عذاب کی طرف مجبور کردوں گا اور بہت بُری جگہ ہے پلٹنے کی۔ اور جب اٹھاتا تھا ابراہیم اس گھر کی بنیادیں اور اسماعیل، اور عرض کرتے، اے ہمارے پروردگار! ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سمیع علیم ہے۔ اسے ہمارے پروردگار! اور ہمیں اپنے حضور گردن جھکانے والا کر اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو فرمانبردار بنا۔ اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہم پر اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرما بے شک تُو ہی بہت بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اسے ہمارے پروردگار! اور انھیں بھیج ایک رسول انھیں میں سے، ان پر تیری آیات تلاوت فرمائے۔ اور انھیں تیری کتاب اور حکمت سکھائے اور انھیں خوب ستھرا فرمائے۔ بے شک تو ہی غالب حکمت والا ہے۔

تفسیر عالمانہ

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ، اے بنی اسرائیل! میری ان نعمتوں کو یاد کرو۔ جو میں نے تمہارے اوپر انعام کیا ہے۔ منجملہ ان انعامات کے تورات بھی ہے۔ اور نعمت کا ذکر کرنا شکر سے ہوتا ہے اور اس کے شکر مع جمیع مافیہ کا نام ایمان ہے اور سید الانبیا صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرنا بھی ایمان میں شامل ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی ضروریاتِ ایمان میں سے ہے اور ایمان کی ضروریات سے، اور یاد کرو۔ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ○ یعنے میں نے تمہارے ہم عصروں سے تمہیں برگزیدہ کیا۔

وَاتَّقُوْا، اگر تم ایمان لاتے تو ڈرو۔ یَوْمًا، اس دن کے عذاب سے اور وہ یوم قیامت ہے، لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا۔ اس کا مادہ جزی عنی ھذا الامر یجزی ہے جیسے کہا جاتا ہے؛ قضی عنی یقضی۔ یہ دونوں ہم وزن اور ہم معنے ہیں۔ یعنے ادا نہیں کرے گا۔ اس دن کوئی نفس عَن نفس دوسرے سے شَیْـًٔا اس کے حقوق سے جو اس پر لازم ہوتے ہیں۔ کوئی شے یعنے نہیں ادا کرے گا۔ وہ نفس کہ اس پر کوئی شے نہیں ہے۔ اس حقوق سے جو دوسرے پر لازم ہیں۔ یعنے ایک نفس کو دوسرے کے عوض نہیں پکڑا جائے گا۔ یعنے اس سے کسی تکلیف کو رفع نہیں کر سکے گا۔ ہاں اگر اس پر کوئی حق ہو تو وہ ضرور لیا جائے گا۔ اس کی نیکیوں سے لے کر جو حقوق اس پر لازم ہوں گے اسے دیا جائے گا۔

حدیث شریف ابی ہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس پر کسی بھائی کے حقوق ہوں۔ عزت سے یا کوئی اور حق اس دن سے پہلے پہلے اس وقت تمہارے پاس درہم ہوں گے نہ دنیا۔ اگر اس کی نیکیاں ہوں تو وہ اس سے لے کر اس صاحب کو دی جائے گی۔ اگر اس کے کوئی گناہ ہوں گے اس کے گناہ اس کو دیئے جائیں گے۔ ولا یقبل منھا۔ یعنے نفس اولیٰ سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ عَدْلٌ، یعنے فدیہ۔

حلِ لغات عدل بفتح العین وہ ہے۔ جو کسی شے کے قیمتاً مماثل ہو۔ اگرچہ اس کی جنس سے نہ ہو۔ اور عدل بالکسر وہ ہے کسی شے کی جنس اس لیے وزن اور جسم میں مساوی ہو۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ نہ تو اس سے فدیہ لیا جائے گا۔ جو اسے نار سے نجات دلائے۔ اور نہ ہی اس وقت وہ حاصل ہو سکے گا جو اسے دے کر نجات پا سکے۔ اور فدیہ کو عدل سے بھی اسی لیے تعبیر کیا گیا کہ جس سے وہ نجات کا ارادہ رکھتا ہے وہ اس کے مساوی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے۔ "فداہ" وہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کوئی شے دے کر اپنے آپ کو چھڑا لے۔

وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ اگرچہ نفس اولیٰ نفس ثانی کی شفاعت کرے تو بھی اسے شفاعت نفع نہ دے گی

وَلَاهُمْ يُنْصَرُوْنَ اور نہ وہ اللہ تعالےٰ کے عذاب سے روک سکیں گے۔

دنیاوی چار چیزیں ایسی ہیں جو عذاب سے بچنے کی سبب ہیں:

۱۔ طاقت ور دوست اور مددگار کہ اپنی طاقت کو استعمال کر کے اسے عذاب سے بچا لے۔

۲۔ کسی کے حق کے بدلے میں فدیہ دے۔

۳۔ یا خود ایسی طاقت رکھتا ہو جس سے عذاب سے بچ سکے۔

۴۔ کسی کو کوئی سفارش کر کے چھڑا لے۔

اللہ تعالےٰ نے کفار کے لیے ان سب کو غیر مفید بتایا ہے کہ وہاں کفار کے حق میں طاقت استعمال ہو۔ نہ فدیہ اور نہ سفارش۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

قیامت کہ نیکاں با علیٰ رسند
زقعر ثریٰ بر ثریا رسند

ترا خود بماند سر از ننگ پیش
کہ گرد ت بر آید علم ہائے خویش

برادر زکارِ بداں شرم دار!
کہ در روئے نیکاں شوی شرمسار

دراں روز کز فعل پرسند و قول
اولوالعزم را تن بلرزد ز ہول

بجائے کہ دہشت خورد انبیاء
تو عذر گناہ راچہ داری بیا

لے ترجمہ: (۱) قیامت میں کہ لوگ اعلیٰ مراتب پائیں گے تحت الثریٰ سے بلندیوں تک پہنچیں گے (۲) تیرا سر رسوائی سے نیچے ہوگا اور تیرے ارد گرد تیرے عمل حاضر ہوں گے (۳) اے بھائی! برے کاموں سے شرم کر اس لیے کہ نیکیوں کے سامنے شرمسار ہوگا (۴) قیامت میں فعل و قول کی پرسش ہوگی کہ بڑوں بڑوں کو لرزہ ہوگا (۵) وہاں انبیاء علیہم السلام پر رعب ہوگا تیرا گناہوں کا کوئی عذر ہے تو لے آئیے توبہ کر۔

ف : بنی اسرائیل کا قصہ ان دو آیتوں سے شروع فرمایا ہے۔ پہلی آیت میں نعمت کی تذکیر اور دوسری میں اپنے عذاب سے ڈر کا بیان فرمایا ہے۔ اور پھر انہی دو آیتوں پر ان کے قصہ کو ختم فرمایا تاکہ ان کی نصیحت میں مبالغہ ہو اور انھیں معلوم ہو کہ قصہ سنانے کا مقصد صرف یہی ہے نہ کچھ اور۔

مسئلہ : ولئن اتبعت اھواءھم میں اشارہ ہے کہ اہل ہوا اور اہل بدعت (سیئہ) کی صحبت سے کنارہ کشی کی جائے۔ ان کے اقوال و افعال کے اتباع سے کلی احتراز ہو۔

حدیث شریف

حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص کسی قوم کے افعال و احوال کا تابع ہے۔ قیامت میں اس کا حشر انہی سے ہوگا، اور انہی کے ساتھ اس کا حساب ہوگا۔ اگرچہ ان کے تمام کردار کا پابند بھی نہ ہو۔

مسئلہ : حدیث شریف میں ہے جو کسی معصیت کے موقعہ پر پہنچا لیکن اسے دلی نفرت ہے تو اسے اس فعل میں شریک نہیں سمجھا جائے گا۔

مسئلہ : کسی فعل میں اگرچہ شریک نہیں لیکن اس فعل پر خوش ہے تو اسے شریک کار سمجھنا چاہیئے۔

مسئلہ : کسی گناہ کی مجلس میں حاضری کا یہ معنیٰ ہے کہ اتفاق سے وہاں چلا گیا۔ یا کسی ضرورت کے پیش نظر وہاں جانا پڑا یا اتفاقاً اس کے سامنے گناہ کی مجلس قائم ہوئی جس کا دفعیہ اس کے بس میں نہیں، تو وہ معذور ہے۔ اور اسے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اور عمداً شریکِ مجلس ہونا ممنوع ہے۔ اسلاف کا طریقہ تھا کہ وہ اہل لہو و لعب کے مجالس سے کنارہ کشی فرماتے اور اہل ہوی اللہ اہلِ بدعت (سیئہ) کی اتباع سے دور بھاگ گئے تھے۔

حکایت

کسی نے حضرت ابن المبارک رحمۃ اللہ تعالے کو ان کی موت کے بعد خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ اللہ تعالے نے آپ سے کیا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اپنے سامنے تیس سال کھڑا کر دیا۔ اور سخت زجر و توبیخ کی، صرف اس وجہ سے کہ ایک دن میں نے گمراہ بدعتی کو نظرِ شفقت سے دیکھا۔ اس سے اندازہ لگا ئیے کہ ان لوگوں کا جو بے دینوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھتے ہیں۔

مسئلہ : جب کہ مذاہب کا اختلاف اور شر و فساد کا زور ہو تو اس وقت حضور علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنا سو شہیدوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

حدیث شریف

حضور علیہ السلام نے فرمایا: میری امت پر ایک ایسا دور آئے گا کہ میری سنت پرانی ہو جائے گی، لیکن بدعات کا دَور دورہ ہوگا۔ جو شخص اس وقت میری سنت پر عمل کرے گا۔ وہ غریب یعنے ان کی نظروں میں اجنبی سمجھا جاتے گا اور ان کی مجلس کے لائق نہ ہوگا فلہٰذا وہ اسے علیحدہ کر دیں گے۔ اور جو بدعاتِ (سیئہ) پر عمل کرے گا۔ اس کے ساتھی پچاس یا اس سے بھی زائد ہو جائیں گے۔

مسئلہ : صحبت کا دوسرے پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے سے

عدوی البلید الی الجلید سریعة
والجمر یوضع فی الرماد فیخمد

ترجمہ: بیوقوف کی بیوقوفی دانا پر جلد اثر کر جاتی ہے جیسے انگارے کو راکھ میں رکھو تو وہ بجھ جاتا ہے۔

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

نخست موعظۂ پیر مجلس حرفست
کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید[1]

تفسیر عالمانہ وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ۔ قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس کی تفسیر سریانی میں تو وہ ہے جو مذکور ہے اور عربیۃ میں سے ہے وہ جو ابن عطیہ فرماتے ہیں کہ معنی اب رحیم۔ سہیلی فرماتے ہیں: بہت بار عربی و سریانی میں اتفاق ہو جاتا ہے۔ یا لفظاً متقارب ہو جاتے ہیں۔ جیسے ابراہیم کی تفسیر اب رحیم ہے۔ چونکہ وہ بچوں سے رحمت فرماتے۔ بنا بریں اس نام سے موسوم ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ جو بچے اہلِ اسلام کے صغر میں مر جاتے ہیں وہ قیامت تک ان کی کفالت حضرت ابراہیمؑ اور ان کی زوجہ محترمہ کے سپرد ہوتی ہے۔

ف: تذکرۃ الموتیٰ میں ہے کہ ان کا نام ابرم تھا۔ پھر اس میں ہا بڑھائی گئی۔ اور ہا سریانی لغت میں تفخیم و تعظیم کے لیے آتی ہے۔ ربہٗ کی ضمیر ابراہیم کی طرف لوٹتی ہے اور مفعول لفظاً مقدم ہے۔ اگرچہ رتبۃً مؤخر ہے اور تقدیم محض اہتمام کی وجہ سے ہے، تاکہ ذہن میں اس کا شوق اور طلب رہے کہ آزمانے والے کون ہیں۔ یعنی یاد کرو جب کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی۔ ذکر سے مقصود حوادثات سے ایک واقعہ کا یاد کرنا مقصود ہے، کیونکہ وقت اس پر شامل ہوتا ہے۔ پس جب اسے حاضر کرنے کی طلب کی تو وہ اپنی تفاصیل سمیت حاضر ہو گیا کہ گویا وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

حلِ لغات ابتلا بمعنی اختیار آزمائش یعنے جس سے آزمائش مقصود ہے، ان کے سامنے ایسے فعل یا ترک فعل کا حکم پیش کرنا کہ جو نہایت مشکل ہوتا ہے کہ اس کے متعلق معلوم ہو جائے کہ فرمان بجا لاتا ہے یا نہ۔ عموماً آزمائش اس سے ہوتی ہے جسے امور کے انجام سے خبر نہ ہو۔

سوال: اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہو کر بندوں کی آزمائش کیوں کرتا ہے؟

جواب: اس کے لیے اس لفظ کا اطلاق مجازاً ہے۔ بایں معنی کہ بندے کو دو امروں میں سے ایک امر کا اختیار دے کر ظاہر کرتا ہے کہ بندہ اپنی خواہش کے پیچھے پڑتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی رضا پہ چلتا ہے۔ گویا اس کی آزمائش صرف بندہ کی خاطر ہے کہ اس نے میری رضا جوئی کی ہے تو خبردار رہیئے ورنہ مزہ دیکھئے، مثلاً اللہ تعالیٰ ابلیس کے کفر کو جانتا تھا، لیکن لعنتی اس وقت کیا جب اس نے اپنی خواہش پر عمل کیا۔ جب تک اس سے لعنت کا موجب امر سرزد نہ ہوا اسے لعنتی نہیں بنایا۔

بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ کلمات، کلمہ کی جمع ہے۔ وہ لفظ جو کسی معنی مفرد کے لیے موضوع ہو۔ اب کلمات سے

---

[1] ترجمہ: بزرگ کا ایک کلمہ بہترین وعظ ہے وہ یہ کہ ناجنس ساتھی سے کنارہ کرو۔

الفاظ منظور مراد ہوں گے ، لیکن کبھی مجازاً انہی الفاظ کے معانی پر بھی بولے جاتے ہیں ، کیونکہ دال و مدلول کی آپس میں کوئی کوئی نسبت ضرور ہوتی ہے اور متضافیان دو امروں کو کہا جاتا ہے جو وجود تعقلی میں برابر ہوں ، جیسے تمت کلمۃ ربک صدقا و عدلا میں ہے کہ کلمہ بمعنی قبضہ و حکمت اور فرمایا :

قل لو کان البحر مداد الکلمات ربی (فاتمھن) ای قام بھن حق القیام یعنی انھیں اچھے طور ادا کیا ، کم و بیشی کے بغیر اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دین میں جب بھی کسی کی آزمائش ہوئی تو صرف ابراہیم علیہ السلام ہی کامیاب ہوئے کہ انھوں نے حکم کی پوری تعمیل فرمائی ۔ اس لیے اللہ تعالے نے ان کی فضیلت کا بیان فرمایا ۔ ابراھیم الذی و فی یعنے وہ معانی جو کلمات سے ظاہر ہوئے ہیں ، انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پورا کیا ۔

ف : کلمات کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں :

(۱) وہ دس اعمال جو سنت ہیں ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دس عادات جو ان کی شریعت میں فرض تھیں وہ ہماری شریعت میں سنت ہیں ۔ ان میں سے پانچ سر میں ہیں :

(۱) کلی کرنا ۔
(۲) ناک میں پانی ڈالنا ۔
(۳) مانگ نکالنا ۔
(۴) مونچھیں کٹوانا ۔
(۵) مسواک کرنا ۔

اور پانچ دیگر بدن میں ہیں :

(۱) ختنہ کرنا ۔
(۲) زیر ناف کے بال مونڈنا ۔
(۳) بغلوں کے بال اکھیڑنا ۔
(۴) ناخن کترنا ۔
(۵) استنجاء کرنا یعنے بول و غائط کے مقام کو پانی سے دھونا ۔

مذکورہ سنتوں میں سے بعض کی تشریح :

(۱) مانگ نکالنا ۔ یعنے سر کے بالوں کو دو حصے کرنا ، کیونکہ مشرکین کی عادت تھی کہ وہ اپنے بالوں میں تفریق کرتے تھے ۔ اور اہل کتاب سدل کرتے ۔ یعنے بالوں کو پیشانی پر لٹکاتے اور انھیں بکری کے بالوں کی طرح کرتے ۔ یعنے پیشانی کے بالوں کی مانند اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم عموماً اس امر میں کہ جس میں کوئی حکم نازل نہ ہوتا ۔ تو اہل کتاب کی موافقت فرماتے ، اس احتمال سے

کہ شاید یہ حکم منزل من اللہ ہو۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نازل ہو کر مانگ نکالنے کا حکم سنا گئے۔

ف : نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا بال رکھوانا عام تھا، لیکن چند بار بال کٹوائے بھی تھے۔

امام غزالی فرماتے ہیں، ہمارے زمانہ میں بال لٹکانا مکروہ ہے، کیونکہ یہ شعار علویوں کا ہے۔ اگر وہ علوی نہ ہوگا تو التباس پڑ جائے گا۔

مسئلہ : حیات الذخیرہ میں ہے کہ چوٹی رکھنا حرام ہے، کیونکہ لوگ چوٹی رکھوانے میں طرح طرح کے غلط خیالات و توہمات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حکایت ایک شخص نے اپنے بچے کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی خدمت میں لایا۔ اس کے بچے کا آدھا سر مونڈا ہوا اور آدھا باقی تھا۔ حضرت نے اس شخص کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اس نے توبہ و استغفار کی جس پر حضرت نے اسے معاف فرما دیا۔

ف : حضرت شیخ المعروف با فتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اس قتل سے حقیقی قتل مراد نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو ایسا فعل کرے گا وہ قتل کا مستحق ہوگا۔ اس مسئلہ کی نظیر حکایت ہے۔

گستاخ نبوت کا واقعہ حضرت قاضی ابو یوسف کی مجلس میں ذکر کیا گیا کہ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کدّو کو محبوب سمجھتے تھے۔ ایک شخص نے کہہ دیا کہ کدّو مجھے پسند نہیں۔ تو ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اس کے قتل کرنے کا حکم دیا، لیکن اس نے توبہ و استغفار کی۔ تب ابو یوسف نے اسے معاف فرما دیا۔

(۲) مونچھوں کے بال کترنا۔ انھیں مقراض سے کتروانا چاہیئے، کیونکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ قبل صلوٰۃ اپنی مونچھیں کترواتے تھے۔

مسئلہ : امام نووی رحمۃ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ اس میں مختار مذہب یہ ہے کہ مونچھیں اتنی کتروائے کہ ہونٹ کا ایک کنارہ ظاہر ہو اور ابرو کی طرح ہو جائے۔

مسئلہ : احیاء العلوم میں ہے کہ سبالہ چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں، یعنے مونچھوں کے دو کنارے چھوڑنا حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ و دیگر صحابہ کرامؓ یونہی کیا کرتے تھے، کیونکہ یہ سبالہ نہ تو منہ کو ڈھانپتا ہے اور نہ ہی اس میں طعام کا بقایا رہ سکتا ہے۔

مسئلہ : دار الحرب میں مجاہد کے لیے جیسے ناخنوں کا بڑھانا مندوب ہے۔ اسی طرح مونچھوں کا بڑھانا بھی مندوب ہے اگرچہ ان دونوں کا کاٹنا فطرتی امر ہے اس لیے کہ دشمنوں کو یہ ہیئت زیادہ ہیبت ناک نظر آتی ہے۔

مسئلہ : مونچھوں کا کاٹنا مستحب ہے۔ حدیث شریف میں ہے، مونچھیں کاٹو اور داڑھی بڑھاؤ۔

ف : العفو بمعنے کاٹنا اور اعفاء بمعنی بڑھانا اور اپنے حال پر چھوڑنا۔

داڑھی کے فضائل و مسائل

مسئلہ: داڑھی کا مونڈنا قبیح بلکہ حرام اور مثلہ ہے۔ جیسے عورتوں کے سر کے بال مونڈنا ان کے حق میں مثلہ ہے۔ ایسے عورتوں کو مردوں کے مشابہ ہونا حرام ہے۔ اسی طرح مردوں کے لیے داڑھی منڈوانا ان کے لیے مثلہ اور عورتوں سے تشبیہ اور زینت کو ضائع کرنا ہے۔

مسئلہ: فقہاء فرماتے ہیں کہ داڑھی اپنے وقت میں سنگار ہے۔ اور اسے مونڈنا حسن کو پورے طور پر ضائع کرنا ہے اور ملائکہ یوں تسبیح پڑھتے ہیں:

سبحان من زین الرجال بلحیتہ... الخ (پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھی سے مزین کیا اور عورتوں کو زلفوں سے۔

ف: کشاف میں لکھتے ہیں کہ الرجال قوامون علی النساء... الخ میں وہ مرد مراد ہیں۔ جو داڑھی اور پگڑیوں والے ہیں۔

مسئلہ: نصاب الاحتساب میں ہے کہ اگر داڑھی ایک بالشت سے زائد ہو جائے تو زائد کو کٹوا دینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام طول وعرض میں اپنی ریش مبارک کٹوا دیتے تھے، جب ایک بالشت سے زائد ہو جاتی، کیونکہ زیادہ لمبی داڑھی پیدائشی صورت کو بگاڑ دیتی ہے۔

مسئلہ: سفید بال اکھیڑنا مکروہ ہے جیسا کہ آج کل بعض لوگ کرتے ہیں صرف اس خیال پر کہ بڑھاپا نہ ہو، اور جوانی ہی جوانی نظر آئے۔

حافظ شیرازی قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

سواد نامۂ موئے سیاہ چوں طے شد
بیاض کم نہ شود گر صد انتخاب رود

گو ان کے اوپر والے حصہ کو سیاہ کر لیا جائے گا لیکن اصل تو سفید رہے گا۔ اس اعلےٰ میں کیا بھلائی ہے کہ جس کا اصل فاسد ہے۔

(۳) ختنہ کرنا یعنے ذکر سے زائد ٹکڑا گوشت کا کاٹنا۔

مسئلہ: جمہور علماء کا خیال ہے کہ یہ سنن موکدات سے ہے۔ اور فطرتاً اسلام میں وہ درجہ رکھتا ہے کہ مردوں کے لیے اس کتاب کے ترک میں کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں اگر لڑکا ختنہ شدہ پیدا ہو۔

لہ (چہرے کے بال سیاہ کی جب منزل طے ہو گئی اس کی جڑ سفید رہے گی خواہ اسے ہزار بار سیاہ خضاب لگایا۔

ف : تمام انبیاء علیہم السلام ختنہ شدہ اور ناف بریدہ پیدا ہوئے۔ یہ ان کے لیے کرامت ہے، سوائے ابراہیم علیہ السلام کے کہ انھوں نے قدوم کے شہر میں اپنا ختنہ خود کیا۔

ف : بالتخفیف والتشدید ہر دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ آپ ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت اپنا ختنہ خود کیا تو اس وقت آپ کی عمر ایک سو بیس یا اسی سال تھی۔ اس لیے آپ نے اپنا ختنہ خود کیا تاکہ سنت جاری ہو۔

مسئلہ : بچہ جب تک حدِ بلوغ کو نہ پہنچے ختنہ نہ کیا جائے، کیونکہ ختنہ طہارت کے لیے ہے، اور قبل از حد بلوغ اس پر طہارت کا حکم نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بچہ جب دس سال کا ہو جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ جب نو سال کا ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ دس اور سات کے مابین ہونا چاہیئے۔

مسئلہ : حداوی فرماتے ہیں کہ ولادت کے ساتویں روز دس سال کے اثناء میں ہونا چاہیئے۔

مسئلہ : دس سال تک ختنہ نہ کرنا مکروہ ہے۔

ف : اس کی میعاد بتانے میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ نے توقف فرمایا ہے۔

مسئلہ : علماء فرماتے ہیں کہ مرد اگرچہ بڑی عمر میں مسلمان ہو تب بھی ختنہ کرنا مستحب ہے اگرچہ اسی سال کا ہو۔

مسئلہ : حضرت امام حسن بوڑھے کو ختنہ کی اجازت نہ دیتے اور فرماتے کوئی حرج نہیں اگر اس کا ختنہ نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کی گواہی رد کرتے۔ اور نہ اس کی ذبح کردہ شئے کو، اور نہ ہی اس کی نماز و حج کے عدمِ جواز کا فتوٰی دیتے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں، علماء اسی قول پر عمل کرتے رہے ہیں۔

(۴) ناخن کٹوانا۔ اور قلامہ بالضم ناخن کا وہ ٹکڑا جو کاٹ کر پھینکا جاتا ہے۔

مسئلہ : ناخن کٹوانا مستحب ہے کیونکہ جنب کی حالت میں غسل کرتے وقت بوجہ میل کچیل کے کسی وجہ سے پانی اس کے اندر نہیں پہنچ سکے گا۔ اس بنا پر وہ ہمیشہ جنب رہے گا۔

مسئلہ : جنبی کے جسم پر سوئی برابر کوئی حصہ رہ جائے تو وہ بدستور جنب ہے، جب تک کہ تمام جسم نہ دھل جائے۔

حدیث شریف : "جس نے اپنے ناخن جمعہ کے دن کاٹے تو اسے اللہ تعالٰی اگلے جمعہ بلکہ اس سے تین روز اوپر بلا سے محفوظ رکھے گا"

حدیث شریف : "جو چاہتا ہے کہ فقر اور آنکھ کی شکایت سے محفوظ رہے تو اسے چاہیئے کہ عصر کے بعد خمیس کے دن اپنے ناخن کاٹے۔"

ف : مقاصد حسنہ میں ہے کہ ناخن کاٹنے کی کیفیت اور اس کے تعین یوم کے بارے میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہیں ملتی۔ اور "شعر جو حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ کی طرف منسوب ہے، باطل ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

تقلیمک الاظفار فیہ سنۃ و ادب

یمینہا خوالبس یسارہا او نخسب

حدیث شریف : "جو شخص اپنے ناخن مختلف طور کاٹتا ہے ، تو اس کی آنکھ میں درد اور بیماری نہیں ہوگی"

ف : یہ بہت سے ائمہ کا قول تو ہے لیکن احادیث کی روایات سے نہیں ملا، ہاں حافظ شریف و میانی اس بات کو اپنے مشائخ سے بیان فرماتے ہیں ، اور اس طریق کو امام احمد مستحب قرار دیتے ہیں ۔ (انتہیٰ کلام المقاصد الحسنہ)

مسئلہ : امام نووی فرماتے ہیں کہ ناخن کٹوانے میں مستحب یہ ہے کہ پہلے ہاتھوں کے ناخن کاٹے جائیں ۔ بایں طور کہ پہلے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی پھر درمیان والی پھر بنصر پھر انگوٹھا ۔ پھر دائیں ہاتھ سے پہلے بنصر خنصر پھر بنصر ، یہاں تک کہ انگوٹھا تک ترتیب وار چلا جائے ۔ پھر سیدھے پاؤں کی خنصر سے شروع کرکے ترتیب وار چلا جائے ۔ یہاں تک کہ بائیں کہ خنصر ختم کرے ۔ (یہی تقریر امام غزالی کی احیا العلوم میں ہے ۔)

حدیث شریف "نقوا براجمکم" اپنے براجم کو صاف رکھو ۔ براجم انگلیوں کے جوڑوں اور ان عقود کو کہتے ہیں جو ان کے پٹھوں میں ہے کہ جن میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے ۔

برجمہ کی جمع برجمہ بضم الباء والجیم اور ان کے مابین راء ساکن پر جوڑ کے عقدہ کی پشت کو کہا جاتا ہے ۔ عقدہ کی بیچ کا نام برجمہ ہے ۔ اور عقدہ تین کے مابین کا نام راجبہ جس کی جمع رواجب ہے ۔ یعنے وہ ان کے پٹھوں کے قریب ہے یعنے انگلیوں کی گانٹھ ۔ پس ہر انگلی میں دو براجم اور تین رواجب ہیں ، سوائے انگوٹھے کہ اس میں صرف ایک برجمہ اور دو رواجب ہیں ۔

ف : ان کی صفائی کا حکم اس لیے ہوا کہ جنابت باقی نہ رہے ، کیونکہ میل کچیل پانی اور چمڑا کے مابین حاجب ہو جائے گی ۔ (کذا فی تفسیر القرطبی)

حدیث شریف مجاہد فرماتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے چند روز رُک گئے ، جب آئے تو آپ نے فرمایا : "رُکنے کی وجہ کیا تھی ؟" انھوں نے عرض کی کہ ہم کیسے حاضر ہو سکتے ہیں جب کہ آپ کے ہاں نہ تو ناخن کاٹے جاتے ہیں اور نہ مونچھیں اور نہ ان کے جوڑوں کو صاف کیا جاتا ہے اور نہ ہی مسواک کرتے ہیں ، پھر آیت پڑھی : وما نتنزل الا بامر ربك ۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ ۔

ربط : گویا کہا گیا کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے کلمات کی تکمیل کی تو اللہ تعالے نے کیا فرمایا ، جواب ملا کہ اللہ تعالے نے فرمایا : اے ابراہیم ہم نے آپ کو لوگوں کا امام بنا دیا ہے ۔

اِمَامًا[1] یعنے تیری ان عادتوں میں لوگ آپ کی پیروی اور صالحین آپ کی اقتدا کریں ۔

ف : ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ کے نبی تھے ۔ اور قیامت تک تمام لوگوں کے پیشوا ہیں ۔ اور اللہ تعالے نے اپنا وعدہ پورا فرمایا

---

[1] ترجمہ : ناخن کٹوانا سنت اور اچھا عمل ہے سیدھے ہاتھ کے ناخن خنصر سے شروع ، پھر وسطی پھر انگوٹھا پھر بنصر پھر سبابہ اور بائیں ہاتھ میں پہلے انگوٹھا پھر وسطی پھر خنصر پھر وسطی پھر بنصر ۔

کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: اوحینا الیك ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفاً وغیرہ وغیرہ۔ اسی لیے تمام اہلِ ادیان آپ کی تعظیم پر متفق ہیں اور حضور علیہ السلام کی تمام امت اپنی نمازوں کے آخر میں کہتے ہیں: اللھم صلی علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد...الخ۔

ف: بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ جب ہم نے اللھم صلی علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کہا تو ہمیں فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام وہ ہیں جنھوں نے اللہ تعالےٰ سے درخواست کی کہ ان کی طرف وہ رسول بھیجیں جو رحمۃ للعالمین ہیں، چنانچہ قرآن میں ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ط۔ پس تمہارا ان کے لیے کیا تحفہ ہے۔ تو ہم نے کہا: کما صلیت علےٰ ابراھیم...الخ پھر ہم نے غور کیا کہ یہ احسانات سب کے سب اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہیں۔ تو ہم نے عرض کی: انك حمید مجید" تاکہ اس کے احسانات کی شکرگزاری ہو جائے۔

حکایت خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک بڑا لمبا چوڑا باغ دیکھا جس کے ہر درخت پر لکھا ہوا تھا: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جبرائیل علیہ السلام سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ تو جبرائیل علیہ السلام نے تمام ماجرا سنایا۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: یا اللہ! میرا نام امتِ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان پر چلا دے۔ اللہ تعالےٰ نے ان کی دعا قبول فرماتے ہوئے امتِ مصطفویہ علی صاحبہا والتحیۃ والسلام کو نماز میں درود بھیجتے وقت ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجنے کا حکم دیا۔

قال ومن ذریتی ط کہا ابراہیم علیہ السلام نے اور میری اولاد سے بھی۔ اس کا عطف جاعلک کے کاف پر ہے اور مِن تبعیضیہ اور جاعل کے متعلق ہے، یعنے میرے اللہ! میری اولاد سے بھی امام بنا دے تاکہ لوگ ان کی اقتدا کریں۔ اصل میں اجعل ہونا تھا، لیکن ادب کی رعایت کرکے صیغہ امر استعمال فرمایا تاکہ بے ادبی نہ ہو۔ اور بعض کی تخصیص اسی لیے کہ بدیہی بات ہے کہ سب تو امامت کے لائق نہیں، کیونکہ یہ محال ہے کہ سارے کے سارے امام بن جائیں۔ اگرچہ سارے حق پر ہوں۔

(ذریۃ) مرد کی نسل کو کہتے ہیں، کبھی آباء و ابناء پر استعمال کیا جاتا ہے مرد ہو یا عورتیں، چھوٹے ہوں یا بڑے۔ زکریا علیہ السلام کی دعا میں ہے:

رب ھب لی من لدنك ذریۃ طیبۃ (اے اللہ! مجھے نیک لڑکا عطا فرمایا)

وایۃ لھم انا حملنا ذریتھم فی الفلك المشحون۔ یہاں ذریت سے مراد ان کے آباء ہیں جو کشتی میں سوار ہوئے۔ کبھی ذریت کا لفظ واحد کے لیے۔

قَالَ: اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ یہ جملہ بھی مستانفہ ہے۔ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ○ میرے عہد کو

ظالمین حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ تیری اولاد میں سے بعض مومن ہوں گے بعض کافر، پھر وہ کیسے نبوت و امامت و خلافت کو حاصل کر سکیں گے۔ جس امامت کا میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے، اسے وہ حاصل کریں گے جو ظلم سے بری ہوں نہ کہ ہر ایک مسلمان ہو یا نہ، کیونکہ امام تو ظلم کو روکنے کے لیے ہوتا ہے پھر جب وہ خود ظالم ہو تو امامت کیسے کرے گا۔ جیسے مثال مشہور ہے، من استرعی الذئب انفتح الظلم (بھیڑیئے کو بکریوں کا چرواہا بنانا ظلم ہے۔)

ف : معتزلہ نے یہاں سے دلیل پکڑی ہے کہ فاسق نہ امامت صغریٰ کے لائق ہے اور نہ ہی کبریٰ کے۔ اس لیے اسے نماز میں امام نہ بنایا جائے۔ اہلِ سنت اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہاں ظالم سے مراد کافر ہے۔

مسئلہ : امام ظالم کے ظلم پر صبر کرنا اس کی بغاوت سے افضل ہے، کیونکہ اس کی بغاوت میں نقضِ امن اور خونریزی اور بدمعاش گروہ کی چابکدستی اور لوٹ مار اور فساد فی الارض کا خطرہ ہے۔

مسئلہ : آیت سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے اور بعد کو معصوم ہوتے ہیں۔

ف : ابن الشیخ اپنے حواشی میں لکھتے ہیں:

"اس مسئلہ یعنی عصمتہ انبیاء علیہم السلام میں بحث ہے۔ وہ یہ کہ آیت کا مدلول ہے کہ ظالم جب تک ظالم ہے امامت کا اہل نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی وقت اس سے غلطی ہو جائے۔ اور پھر وہ تائب بھی ہو گیا، تب بھی امامت کے لائق نہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ظلم حالی جو ہے وہ اسے امام بننے کے لیے مخل ہے، کیونکہ امامت کا مقصد یہ ہے کہ زمین کو فساد سے خالی کیا جائے اور لوگوں کی عزت و آبرو اور مال و جائیداد کی مفسدین اور شرارتی لوگوں سے حفاظت کی جائے۔ بخلاف اس کے جس سے پہلے کسی زمانہ میں غلطی ہوئی تو وہ اس مقصد کے لیے مخل نہیں، کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہوتا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

مسئلہ : حضرت شیخ افتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ولد الزنا کو بھی امامت سپرد نہ کی جائے۔ فرمایا: اللہ تعالےٰ کا بہت بڑا احسان ہے اور اس کا شکر کرتا ہوں کہ میں وہ ہوں کہ جسے ماں نے جنا اور اس نے کبھی ماں باپ کی نافرمانی نہیں کی۔

حضرت مولانا الہدائی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: مولیٰ تعالےٰ نے میرے اوپر بھی یہی فضل فرمایا ہے۔

سخاوی مقاصد حسنہ میں فرماتے ہیں: حدیث میں ہے کہ ولد الحرام بہشت میں ہرگز نہیں جائے گا۔ اگر یہ صحیح ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس نے اپنے باپ کی طرح عمل کیا ہو تو تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ حدیث اپنے ظاہری معنی پر محمول نہیں یا اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص زنا کا ارتکاب کرتے کرتے مرے، اور اسے ولد الزنا کہنا مجاز ہے۔ جیسے مشاہدین کو ولد الصحف اور بہادروں کو ولد الحرب اور مسلمانوں کو ولد الاسلام کہا جاتا ہے۔

آیت سے یہ ثابت ہوا کہ جسے اللہ تعالےٰ یہ مرتبہ امامت عطا فرمائے۔ اسے چاہیئے کہ وہ حرج کش اور اپنے نفس کو اطاعتِ الٰہی میں لگا دے۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالٰے فرماتے ہیں ؎

چوں یوسف کہ در صلاح وتمیز
بسے سال باید کہ گردد عزیز

تفسیر عالمانہ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ یعنے یاد فرمائیے، اے پیارے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم! اس وقت کہ جب ہم نے کعبہ معظمہ کو بنایا۔ مَثَابَةً، جائے رجوع۔ لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط حاج اور عمرہ کرنے والوں کے لیے جو اس سے جدا ہو کر پھر اس کی طرف لوٹتے ہیں، یعنے اس کی طرف وہ لوگ لوٹتے ہیں۔ یعنے وہ زائرین جو کئی بار کعبہ شریف کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں، پھر ان جیسے اور آتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالٰے کا وفد یا اس کے زائرین کہا جاتا ہے۔

الناس میں الف لام عہد ذہنی ہے وامنا یعنے امن کا مقام کیونکہ مشرکین حرم کے ساکنین کو کچھ نہ کہتے بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ بیت اللہ کا گھر ہے اور اس کے ساکنین اہل اللہ ہیں یعنے اس کے اہل بیت یہاں تک کہ کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو حرم شریف میں دیکھتا تو بھی اسے کچھ نہ کہتا، البتہ اس کے باہر والے کو ضرور پکڑ لیتے۔ یہ طریقہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے چلا، اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس تک بدستور رہا۔ یا یہ معنٰے ہے کہ بیت اللہ شریف حاجی صاحب کو عذاب آخرت سے امن میں رکھتا ہے اس حیثیت سے کہ اس کے پہلے گناہ بخشوا دیتا ہے۔ اور اللہ تعالٰے کے غیر حقوق غیر مالیہ جیسے کفارۂ یمن وغیرہ کو معاف کرا دیتا ہے، لیکن حقوق العباد حج سے معاف نہیں ہوتے۔ (کذا فی حواشی ابن الشیخ)

لیکن روایت ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی معاف ہو جاتے ہیں، چنانچہ مروی ہے کہ اللہ تعالٰے نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مزدلفہ میں قبول فرمائی۔ یہاں تک کہ امت کے ایک دوسرے کے حقوق قتل و دیگر مظالم بھی معاف فرما دیئے۔ (کذا فی الکافی وتفسیر الفاتحہ للفناری) وغیرہما۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ط یعنے اور ہم نے یہ بھی حکم دیا۔ اتخذوا۔ یہ عبارت بارادۂ قول ہے، تاکہ انشائیہ کا عطف خبریہ پر لازم نہ آئے۔ من مقام ابراھیم مصلی یعنے بنالو مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ۔ اس میں من تبعیضیہ ہے اور مقام ابراہیم اس پتھر کا نام ہے جس میں آپ کے قدم کا نشان ہے یا وہ جگہ ہے جہاں پر آپ نے کھڑے ہو کر لوگوں کو حج کی طرف بلایا، یا وہ جگہ ہے جہاں آپ کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر فرماتے رہے جسے آج مقام ابراہیم سے موسوم کیا جاتا ہے یہ وہی پتھر کی جگہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ علیہم السلام کو مکہ کی جگہ میں بٹھا گئے تو عرصہ گذرا واپس تشریف نہ لاتے۔ اور ان کے پاس قبیلہ جرہم اترا اور ان کے ہاں قیام پذیر ہوئے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے ان کی ایک عورت سے نکاح کیا۔ اور حضرت ہاجرہ فوت ہوگئیں ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بی بی

سارہ سے ان کے ملنے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے فرمایا: بے شک تشریف لے جائیں، لیکن ان کے ہاں قیام مت فرمانا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر پہنچے، وہاں ان کی زوجہ کو دیکھ کر پوچھا: تیرا شوہر کہاں ہے؟ اس نے کہا: شکار کو گیا ہے۔ ان کی عادت تھی کہ حرم کے باہر عموماً شکار کو جاتے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس بی بی سے فرمایا کہ کیا مجھے کچھ کھلا سکتی ہو۔ اس نے کہا میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ پھر پوچھا: گذر اوقات کیسی ہے؟ اس نے کہا: تنگ اور پریشان ہیں (بہت شکایت کی) آپ نے فرمایا: جب تیرا شوہر واپس آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اس عورت کو طلاق دے دے، کیونکہ وہ عورت ان کے لائق نہیں تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چلے گئے۔ بعد ازاں اسمٰعیل علیہ السلام تشریف لائے، اور اپنے باپ کی خوشبو پائی۔ اپنی عورت سے پوچھا: میرے گھر میں کون تشریف لائے تھے۔ اس نے حقارت بھرے طرز سے کہا: ایک بوڑھا مرد آیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ کم و بیش الفاظ استعمال کیے۔ ان کے اوصاف بھی بتائے۔ آپ نے پوچھا: کچھ اور بھی فرمایا۔ اس نے کہا: ہاں، وہ تمہیں سلام بھی کہتے تھے اور فرماتے تھے کہ اپنے گھر کی چوکھٹ تبدیل کر دو۔ آپ نے فرمایا: وہ تو میرے ابا جان تھے اور مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تجھے طلاق دے دوں، تم اپنے میکے چلی جاؤ۔ میں نے تجھے طلاق دے دی ہے۔ پھر آپ نے اس قبیلہ سے دوسری عورت سے نکاح کر لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چند روز ٹھہر کر اپنی بیوی سارہ سے اجازت طلب فرمائی تاکہ اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات کر آئیں۔ بی بی نے پھر بھی وہی شرط فرمائی کہ جائیں بڑی خوشی سے لیکن ان کے ہاں ہرگز نہ ٹھہرنا۔ اب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گھر تشریف لائے۔ اور ان کی زوجہ سے فرمایا کہ تیرا شوہر کہاں ہے؟ اس نے کہا: وہ شکار کو گئے ہیں۔ اور انشاء اللہ ابھی تشریف لائیں گے۔ آپ ہمارے ہاں تشریف رکھیں۔ آپ نے کہا: کیا تو مہمانی دے سکتی ہے۔ کہا: ہاں۔ چنانچہ دودھ اور گوشت لائی۔ آپ نے فرمایا: وجہ معاش کیسی ہے؟ عرض کی: اچھی اور الحمد للہ فراخدستی ہے۔ ان کیلئے برکت کی دعا کی۔

ف: اگر وہ بی بی گندم یا جو کی روٹی یا کھجور لاتیں تو زمین میں یہ اشیاء بکثرت ہوتیں، عرض کی: حضور! نیچے اتریئے، آرام فرمائیے اور سر مبارک دھوئیں، لیکن آپ نہ اترے پھر بھی پتھر سامنے لائی۔ اور سیدھی جانب رکھ دیا۔ آپ نے صرف اپنا قدم اس پر رکھا، لیکن بدستور سوار رہے۔ اور اپنے سر کی دائیں جانب دھوئی۔ پھر اس بی بی نے دوسری طرف پھیر کر دائیں جانب دھوئی۔ اس وجہ سے اس پتھر پر آپ کے قدم کے نشان باقی رہے اور روانگی کے وقت فرمایا: اپنے شوہر کو سلام کہنا اور کہہ دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ کو مستقیم رکھیں۔ جب اسمٰعیل علیہ السلام واپس آتے اپنے باپ کی خوشبو پائی۔ بیوی سے پوچھا کہ کون آئے تھے۔ بیوی نے کہا: ایک بزرگ تشریف لائے جو نہایت حسین اور نہایت خوشبودار اطیب اطہر انسان تھے۔ اور مجھے ایسے ایسے کلمات ارشاد فرماتے اور اپنا سر مبارک بھی دھویا۔ اور یہ ان کے قدم مبارک کا نشان ہے۔ اسمٰعیل علیہ السلام نے کہا: وہ میرے والد ماجد تھے۔ اور چوکھٹ سے مراد تو ہے اور مجھے حکم فرما گئے ہیں کہ میں تجھے ہمیشہ کے لیے اپنی رفیقۂ حیات بناؤں۔

ف : یہی کیفیت انبیاء و اولیاء کی ہے کہ جب انہیں کوئی ستاتا ہے تو وہ اس کے لیے رحمت کی دعا مانگتے ہیں۔ دیکھئے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا کہ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، کیونکہ وہ میری شان سے بے خبر ہیں۔ اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ تعالے عنہم خون کے آنسو برساتے جب کہ نفس کی شرارتوں کو دیکھتے اور ہمیشہ حضور علیہ السلام سے نفس کی غلط راہ روی سے نجات پانے کی دعا کرواتے رہتے تھے اور دائماً ظاہری باطنی صفائی میں لگے رہتے تاکہ عذاب دارین سے نجات نصیب ہو۔ اور سب سے بڑا عذاب یہ سمجھتے کہ کہیں ہمیں فراق میں مبتلا کیا جائے۔

تعمیر کعبہ کا واقعہ

چند روز ٹھہر کر پھر تشریف لائے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک بڑے درخت ایک نیچے تیر اندازی فرما رہے تھے۔ جب ابا جی کو دیکھا تو وہی کیا جو بیٹا باپ سے کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل علیہم السلام سے فرمایا: بیٹے! اللہ تعالے نے مجھے ایک حکم دیا ہے۔ کیا تو میرے ساتھ تعاون کر سکتا ہے؟ اسماعیل علیہ السلام نے عرض کی: ہاں۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالے نے حکم دیا ہے کہ میں یہاں پر ایک گھر تیار کروں۔ چنانچہ پھر اس کی تعمیر شروع کر دی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پتھر سر پر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام انہیں تعمیر میں لاتے۔ جب بنا کچھ اونچی ہوئی تو اسمٰعیل علیہ السلام یہی پتھر لائے جس پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر بنا کرتے تھے اور اسماعیل علیہ السلام پتھر وغیرہ دیتے رہے۔ اور دونوں حضرات پڑھتے: ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

دور سے پکارنا اور حج کا اعلان

جب کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انہیں حکم دیا گیا کہ لوگوں کو حج کا اعلان فرمائیے۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: یا اللہ! کیسے ندا دوں، حالانکہ آگے پہاڑ ہیں۔ اور آدمی بھی سامنے کوئی موجود نہیں۔ اللہ تعالے نے فرمایا: تمہارا کام اعلان کرنا ہے پہنچانا میرا کام ہے۔ ابراہیم علیہ السلام ابو قبیس پہاڑ پر چڑھے۔ تو یہی پتھر بھی اونچا ہو گیا۔ طوفان کے دنوں ابو قبیس میں ہی اسے رکھا گیا۔ چنانچہ جتنا ابراہیم علیہ السلام اونچے ہوتے گئے یہ پتھر بھی اونچا ہوتا گیا یہاں تک کہ تمام پتھروں سے اونچا ہو گیا۔ اللہ تعالے نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے زمین کو دستر خوان کی طرح کر کے سمیٹ دیا۔ پھر اعلان کیا: اے لوگو! تمہارے رب نے تمہارے لیے گھر تیار کیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ اس کا حج کرو۔ یہ اعلان سن کر تمام لوگوں نے (جو اپنے آباؤ امہات کے اصلاب و ارحام میں تھے) جواب دیا۔ جس نے ایک بار جواب دیا اسے ایک بار حج نصیب ہوا۔ جس نے دس بار جواب دیا اسے دس بار نصیب ہوا وغیرہ وغیرہ۔

حدیث شریف

"رکن اور مقام یواقیت جنت کے یاقوت ہیں اور اگر کفار و مشرکین ہاتھ نہ لگاتے تو ان کے نور سے مشرق و مغرب چمک اٹھتے (یہاں پر حجر اسود اور مقام سے یہ پتھر جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ شریف کی تعمیر کے وقت کھڑے ہوئے تھے۔) مراد ہے۔

وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ۔ یعنے ہم نے انہیں تاکیدی حکم دیا اور وصیت فرمائی۔

حل لغات: عهد بمعنی امر و وصیت۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: عهد الیه ای امرہ و وصاہ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

الم اعهد الیکم۔ ــــــ اور اسمٰعیل کو اسماعیل اسی لیے کہتے ہیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام دُعا مانگتے تو کہتے: اسمع یا ایل۔ اور "ایل" بمعنے اللہ۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو آپ اسی نام سے موسوم ہوئے۔

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ، یعنے میرے گھر کو بتوں اور پلیدیوں اور جو اس کے لائق نہیں پاک کرو۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اس کی حفاظت کرو۔ اور اس کے اردگرد کوئی گندی چیز کھڑی نہ ہونے دو۔

سوال: طہارت کا حکم کیوں ہوا حالانکہ کعبہ خود طاہر تھا؟

جواب: اس سے برقرار رکھنا مقصود ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ولهم فیها ازواج مطهرة۔ انہیں نجاست سے پاک ہونے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ وہ تو خود ہی طاہرات ہیں۔ یہ ایسے ہے جیسے درزی کو کہا جاتا ہے کہ قمیص دراز رکھنا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ اس سے تنگی ہٹا دے بلکہ مراد یہ ہے کہ ابتداءً اسے فراخ رکھنا۔

لِلطَّآئِفِيْنَ اس کے اردگرد کے زائرین کے لیے۔ **وَالْعٰكِفِيْنَ** ــــ یعنے وہ جو اس کے مجاور ہیں یعنے اس کے نزدیک ٹھہرے رہتے ہیں اور باہر نہیں جاتے۔ اس سے حرم شریف کے مقیم لوگ مراد ہیں۔ اور طائفین سے وہ مسافرین مراد ہیں جو مکہ کی زیارت کے لیے باہر سے آتے ہیں۔

سوال: طواف کی ان کے لیے کیوں تخصیص ہے؟

جواب: اس لیے کہ وہ میقات سے احرام کی حالت سے آتے ہیں۔ اس زیادہ عمل کی وجہ سے ان کا نام خصوصیت سے لیا گیا۔

وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وہ نمازی لوگ۔ رکع، راکع کی اور سجود، ساجد کی جمع ہے، کیونکہ قیام و رکوع و سجود نمازی کی ہیئات سے ہیں۔

سوال: ان کے مابین عطف کیوں ترک کیا گیا؟

جواب: رکوع و سجود ذاتاً و زماناً قریب ہیں۔ اسی اتحاد کی وجہ سے عطف ترک کیا گیا۔

حدیث شریف حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ کی ایک دن میں ایک سو بیس رحمتیں کعبہ پر نازل ہوتی ہیں۔ ساٹھ طواف کرنے والوں کے لیے اور چالیس^۴۰^ نمازیوں کے لیے۔ اور بیس^۲۰^ دیکھنے والوں کے لیے۔

مسئلہ: بیت کی طہارت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی جمیع بیوت کو پاک رکھا جائے کہ جس طرح کعبہ کی طہارت و نظافت

ضروری ہے اسی طرح تمام گھروں کو۔

سوال: صرف کعبہ کو ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: وہاں پر سوائے اس کے اور کوئی نہ تھا اسی بنا پر اسی کا نام لیا۔

حکایت: حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ نے مسجد میں ایک شخص کی اونچی آواز سُنی۔ اسے فرمایا: تجھے پتہ نہیں تو کس متبرک مقام پر ہے؟

حدیث شریف حضور علیہ السلام نے فرمایا: "اللہ تعالے نے میری طرف وحی فرمائی کہ اے ڈرانے والوں کے صاحب اور مرسلین کے رفیق! اپنی قوم کو فرما دو کہ جب میرے کسی گھر میں آئیں تو انہیں چاہیئے کہ اس وقت ان کے دل صاف اور زبان سچی اور ہاتھ ستھرے اور فروج طاہر ہوں۔ اور ایسے وقت میرے کسی گھر میں نہ آئیں جب کہ ان کے پاس اندھیریوں میں سے کوئی اندھیری ہو، کیونکہ ایسی حالت میں آئے گا تو جتنی دیر وہاں ٹھہرا رہے گا میری اس پر لعنت رہے گی۔ یہاں تک کہ اس اندھیری کو دور نہ کرے (یعنے اس سے توبہ نہ کرے) جب صحیح حالت میں حاضری دیتا ہے تو میں اس کے کان ہوتا ہوں جن سے سنتا ہے اور آنکھ ہوتا ہوں جن سے دیکھتا ہے اور وہ میرے خالص دوستوں اور اولیاء سے ہے۔ اور کل قیامت میں انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین کی معیت میں میرے قریب ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ جس گھر کو اللہ تعالے نے اپنی طرف منسوب فرمایا وہ دراصل قلبِ مومن ہے۔ اس کی صفائی کا یہ مطلب ہے کہ اسے غیر اللہ سے متوجہ ہونے سے بچائے، کیونکہ وہ اللہ تعالے کی نظرِ عنایت کا مرکز ہے ؎

۱ دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

۲ کعبہ بنیاد خلیل آزر است
دل نظرگاہ جلیل اکبر است[1]

بنا بریں اسے صاف رکھنا ضروری ہے، یہاں تک کہ اس پر انوار و تجلیات اور اسرارِ رحمانیہ کا نزول ہوگا۔ اور ساتھ ہی اسے سکون و وقار نصیب ہوگا۔ جب بندہ اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے تو حقیقی سجدہ و رکوع سے مشرف ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالے سے ہمکلامی سے اور خصوصی رازداری سے نوازا جاتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ۔ یاد کیجئے، اے میرے حبیب! صلے اللہ علیہ وسلم جب کہ ابراہیم نے دعا مانگی اور کہا، اے رب! اجْعَلْ هٰذَا، کر دے اس گھر کو۔ ھذا کا مشار الیہ مکان ہے یعنے حرم شریف۔ بَلَدًا اٰمِنًا۔ امن والا شہر۔ اس کو اہلِ قحط و تکلیف اور خسف و مسخ اور زلازل اور جنون و جذام و برص اور دیگر تکالیف (جو عام شہروں میں اترتی ہیں) سے محفوظ رکھ۔ یہ باب النسب سے ہے یعنے وہ شہر جو امن کی طرف منسوب ہے جیسے لفظ لابن

دودھ والا اور تامر کھجور والا، کیونکہ ان کا موصوف ان کے ماخوذ کی طرف منسوب ہوتا ہے گویا لابن کو لبنی (دودھ والا)
اور تامر کو تمری کھجور والا کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اسنادِ حقیقی ہے اور یہ معنٰی ہے کہ اس شہر کے اہل امن والے
ہیں۔ یہ اسناد مجازی ہوگا، کیونکہ امن حقیقتاً اہل بلاد کی طرف منسوب ہوا کرتا ہے، لیکن چونکہ مکان کو اسی سے ملابست ہے بنا بریں
اس کی طرف منسوب ہونا بھی جائز ہے۔ ابراہیم علیہ السلام جب پہلی بار مکہ میں تشریف لائے تو یہی دعا مانگی، کیونکہ جب سے
حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ صاحبہ کو جو مکہ میں ٹھہرا کر اپنے ملک شام کو واپس روانہ ہونے لگے تو بی بی ہاجرہ رضی
اللہ تعالٰی عنہا نے آپ سے پوچھا کہ آپ ہمیں کس کے سہارے اس جنگل سنگستان میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ اس پر
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ آخر جب یہ کہا کہ آپ کو اللہ تعالٰی کا حکم ہے؟ اس پر حضرت ابراہیم
علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ بی بی نے کہا: اب میں راضی ہوں، کیونکہ وہ کریم مجھے کہیں ضائع نہیں کرنے والا۔ ان سے الوداع کر کے
کداوادی پر ٹھہرے اور کہا: ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع - الآیۃ

وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ، اور انہیں ثمرات عطا فرما۔ ثمرات ثمرہ کی جمع ہے۔ یعنی کھانے کی چیزیں
جو زمین اور درخت سے نکلتی ہیں۔ اس سے طعام اور میوہ جات مراد ہے۔

سوال: صرف ثمرات کا سوال کیوں؟

جواب: کیونکہ طعام معہود تو ہر جگہ مل جاتا ہے، لیکن میوہ جات نادر ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس کے اہل کے لیے امن اور اسی فراخی
کا سوال کیا جس سے عیش اچھا اور دائمی ہو، ان کی اللہ تعالٰی نے دعا قبول فرمائی۔

اعجوبہ: مروی ہے کہ اللہ تعالٰی نے جبرئیل علیہ السلام کو ثمردار بستیوں کو فلسطین سے نقل کرنے کا حکم دیا۔ جبرئیل علیہ السلام انہیں
اٹھا کر لے آئے اور کعبہ کے اردگرد سات پھیرے لگا کر تین مراحل تک مکہ سے دور رکھا وہ یہی طائف شریف ہے۔ اسی لحاظ
سے اسے طائف کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے مکہ شریف میں ثمرات بکثرت ہوتے ہیں۔ اور نیز مختلف مقامات سے بھی میوہ جات
آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں ایک دن میں سردیوں اور گرمیوں کے میوہ جات مل جاتے ہیں۔

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، یہ اھلہ سے بدل ہے یعنے وہ نعمتیں کہ
صرف مومنین کو عطا ہوں۔ قال اللہ تعالٰی: قَالَ وَمَنْ كَفَرَ۔ اس کا عطف محذوف ہے۔ یعنے ارزق
من اٰمن ومن کفر پر حضرت ابراہیم نے رزق کا قیاس امامت پر کیا۔ اس لیے اب صرف مومنین کے لیے سوال کیا۔
جب پہلے سنا کہ اللہ تعالٰی نے امامت کو ان کے لیے خاص فرمایا۔ کما قال:

لاینال عھدی الظلمین

ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ جب میں نے اپنی اولاد کے لیے امامت کا عرض کیا، تو سب کی بجائے بعض کی اجازت
ہوئی۔ اسی طرح رزق بھی شاید سب کے لیے نہ ہو تو آپ نے مَن اٰمن کی قید لگائی تاکہ سوال میں بے ادبی نہ ہو۔ اس پر اللہ تعالٰی

نے تنبیہ فرمائی کہ رزق کو رحمت رحمانیہ سے تعلق ہے اور اسی لیے یہ مومن و کافر سب کو ملے گا۔ بخلاف امامت اور پیشوائی کے کہ وہ خاص لوگوں کو نصیب ہوگی۔

فَاُمَتِّعُهٗ پھر اس کے لیے عام کر دوں گا تاکہ وہ دنیا کی تمام لذتوں کو حاصل کر لے۔ پھر قیامت میں اس پر حجت قائم کی جائے گی۔ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ لیکن یہ نفع اندوزی چند دنوں تک ہوگی، کیونکہ دنیا چند روزہ ہے اور آخرت کی نعمتیں تو بے پایاں ہیں۔ اسے اس سے کیا نسبت بنا بریں کافر اس سے جتنا ہی نفع اٹھائے بہت تھوڑا ہے، کیونکہ اللہ تعالٰی کی دنیوی نعمتیں اگرچہ کتنا ہی ہوں، لیکن آخرت کی نعمتوں کی نسبت بہت تھوڑی ہیں۔ قلیلاً صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی ، امتعہ زمانا قلیلا۔ اور یہ قلیل مدت کافر کی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔

پھر میں اسے جہنم کی طرف کھینچ لے جاؤں گا۔ اضطرار لغت میں انسان کو ایسی شے کی طرف کھینچ لے جانا جو اُسے نقصان پہنچائے۔ عرف میں اضطرار یہ ہے۔ کسی کو کفر پر مجبور کرنا جب کہ وہ کفر نہ کرے۔ یعنے اسے ہر طرح کا اختیار حاصل ہو، لیکن اسے مجبور کر دیا جائے کہ کفر نہ کرو گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔ کفر و قتل میں سے ایک آسان امر کو اختیار کرنے سے کفر پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن کفار کو یہ بات تو پسند ہے کہ عذاب نار کو اختیار کر رہے ہیں۔ جو ان کے نزدیک ایمان لانے سے آسان نظر آ رہا ہے۔ اب اس مقام پر کفار کے لیے اضطرار کا استعمال مجازی ہوگا۔ اس معنی پر کہ یہ امر ان پر لازم ہو رہا ہے۔ اور ان پر ایسا چسپاں کیا جا رہا ہے کہ اب اس سے بچنا مشکل ہے جیسا کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا: یسحبون فی النار علی وجوھھم۔ اس دن جہنم میں منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب میں انھیں کوئی دخل نہیں ہوگا۔ ہاں، انھیں مضطرین بمعنے مختارین کہا جائے تو بجا ہے کہ کفر کو انھوں نے اپنے اختیار سے کیا بنا بریں انھیں جہنم میں دھکیلا جائے گا۔ اس معنی پر تشبیہاً انھیں مضطرین کہا گیا۔ اب معنٰے یہ ہوا کہ انھیں اللہ تعالٰی نے کفر کی وجہ سے عذابِ نار میں مضطر کی طرح کھینچا۔ اس لحاظ سے کہ انھیں دی ہوئی نعمتوں کو ضائع کر دیا جواب سوائے جہنم کے داخلے کے انھیں کوئی چارہ نہیں۔

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۝ نہت بُرا ہے ان کا ٹھکانا۔ اس میں مخصوص بالذم محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی:

بئس المرجع الذی یرجع الیہ... الخ یعنے ان کا بہت بُرا ٹھکانا ہے جہاں وہ جا کر اقامت کریں گے۔ اس سے مراد جہنم ہے یا عذاب۔

ف: بندہ کو یہاں دنیا فانی میں چند روز مہلت دی گئی ہے۔ مہلت کو دیکھ کر مہمل ہو کر نہ رہے کیونکہ یہاں کے اعمال کے مطابق وہاں جزا و سزا ملے گی۔ اے برادر! دنیا کی جگمگی تجھے دھوکہ میں نہ ڈال دے۔ اطاعت کرو گے تو فائدہ ہوگا معصیت

کروگے تو عذاب ہوگا، دنیا کا ٹھاٹھ کچھ آخرت میں بلندئ درجات کا سبب نہیں بنے گا

حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں ؎

بمہلتی کہ سپہرت دہد ز راہ مرو

ترا کہ گفت کہ آں زال ترک دستان گفت[1]

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے : سنستدرجھم من حیث لا یعلمون (ہم ایسی مہلت دیتے ہیں کہ انہیں علم ہی نہیں۔

حکایت حضرت سہیل تستری رحمۃ اللہ تعالےٰ اس آیت کا معنیٰ یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہم بندے کو نعمتیں دے کر مہلت دیتے ہیں پھر وہ ان کا شکر کرنا بھول جاتا ہے۔ جب وہ نعمتوں میں غرہ ہوکر اپنے مالک کو پورے طور پر بھول جاتا ہے پھر ہم اسکی گرفت کرتے ہیں۔

سبق سمجھدار کو چاہیے کہ دنیا کی رنگینیوں کو دیکھ کر دھوکہ میں نہ آجائے بلکہ اللہ تعالےٰ کے ماسوا کسی شے پر خوشی نہ کرے کیونکہ اللہ تعالےٰ کے ماسوا باقی سب فانی ہے مٹنے والی شے سے دل لگانا کچھ دانائی کا کام نہیں، نہ ہی یہ عقل وفہم اور عرفان ہے۔

سوال : اللہ تعالےٰ عاصیوں کو دنیا میں کیوں مہلت دیتا ہے ؟

جواب : بندوں کو گناہوں کے باوجود مہلت اس لیے دیتا ہے تاکہ بندوں کو پتہ چل جائے کہ اللہ تعالےٰ کو عفو و احسان زیادہ پسند ہے بہ نسبت گرفت اور انتقام کے۔

سبق اس سے بندے معلوم کریں کہ وہ کریم وشفیق ومحسن ہے۔ یہ مسئلہ یوں سمجھ میں آئے گا کہ ایک شخص کا ایسا اعلان ہوکہ میری ضیافت کو جو قبول کرے گا۔ اس کی میں عزت کروں گا۔ دوسرا یوں اعلان کرے کہ جو میری ضیافت کے لیے آئے۔ اس کی عزت کروں گا، جو نہیں آئے گا اسے سخت ماروں گا۔ پہلے کی نسبت دوسرے کا احسان اور شفقت اور کرم زائد سمجھا جائے گا۔ بلاتمثیل یوں سمجھئے کہ ادھر اللہ تعالےٰ نے اپنے ہاں ضیافت کا یوں اعلان فرمایا :

واللہ یدعوا الی دار السلام۔ اللہ تعالےٰ تمہیں اپنی بہشت کی دعوت دیتا ہے۔ ادھر اپنے نبی علیہ السلام کے ہاتھ میں تلوار دے دی اور فرمایا جو بھی میری ضیافت قبول نہ کرے اس کی گردن اڑا دو۔

سبق : دانا کو چاہیئے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی دعوت قبول کرکے اپنے مالک کی طرف لوٹے اور دل سے ہی لوٹے، مجبور ہوکر نہیں، کیونکہ وہی مقصودِ اعظم اور وہی دل کا حقیقی قبلہ ہے۔ تمام قافلے اسی کی طرف پہنچیں گے۔

تفسیر صوفیانہ اس آیت میں بلا سے مراد صورۃ جسمانیہ اور کعبہ سے مراد قلب ہے اور طواف حقیقی یہ ہے کہ قلب بارگاہِ ربوبیت کا طواف کرے۔ یہ بیت اللہ جو ظاہری طور پر اس ملک میں ہے، اسی بارگاہ کے لیے ہے،

---

[1] : وہ مہلت جو تجھے زمانہ نے بخشی ہے راہ سے نہ ہٹ تجھے کیا ہے کہ وہ مکر و فریب والی تیرے ہاتھ میں ہے۔

جس کا آنکھوں سے مشاہدہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ عالمِ ملکوت میں ہے، جیسے انسان کی ظاہری شکل عالمِ شہادت میں مثال ہے اس قلب کی جس کا آنکھوں سے مشاہدہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ عالمِ غیب کی شے ہے۔ اور عارفین کو طواف قلبی حقیقی نصیب ہوتا ہے جن کے متعلق مشہور ہے کہ کعبہ ان کی زیارت کے لیے حاضر ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے :

ان اللہ عباد الطوف بھم الکعبۃ۔ (بے شک اللہ تعالے کے بعض ایسے بندے ہیں۔ جن کا خود کعبہ طواف کرتا ہے۔) ایک صرف کعبہ کی زیارت کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایک وہ ہے جو ربِ کعبہ کا طالب ہے، ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

حکایت ایک بزرگ حج کو روانہ ہوئے، ان کے صاحبزادے نے پوچھا ابا جی کہاں کا ارادہ ہے؟ بزرگ نے فرمایا : بیت اللہ کی زیارت کا۔ صاحبزادے نے خیال کیا کہ جو کسی کے گھر کو دیکھتا ہے تو لامحالہ وہ گھر کے مالک کو بھی ملے گا صاحبزادے نے کہا : مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔ بزرگ نے فرمایا : تو اس کا اہل نہیں۔ صاحبزادہ رونے لگا مجبوراً اسے ساتھ لے جانا پڑا۔ جب میقات میں پہنچے، تو احرام باندھا۔ لبیک پکاری اور حرم میں داخل ہوئے جب بیت اللہ نظر آیا تو لڑکے نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر مر گیا۔ بزرگ رونے لگا، ہائے! میرے لڑکے کو کیا ہو گیا۔ بیت اللہ سے آواز آئی تو گھر کو دیکھنے آیا تھا، تو نے اسے دیکھ لیا اور وہ گھر والے کا طالب تھا۔ وہ گھر والے کو ملنے گیا ہے۔

اسی اثنا میں کچھ غائب ہو گیا۔ اس پر ہاتف نے آواز دی وہ لڑکا کسی مکان میں ہے نہ زمین پر اور نہ بہشت میں بلکہ اسے وہاں پہنچایا گیا ہے جہاں مالکِ حقیقی کا ٹھکانا ہے۔

سبق جو بھی ان جہالت کی پابندیوں سے بچ گیا۔ اس کا قبلہ اللہ تعالے ہوتا ہے۔ پھر وہ جمیع کائنات کا قبلہ بن جاتا ہے، جیسے آدم علیہ السلام ملائکہ کرام کا قبلہ ٹھہرے، کیونکہ وہ فرشتوں کے لیے وسیلۂ حق تھے اس لیے کہ ان پر جلال و جمال کا جامہ تھا۔

حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ تعالے منطق الطیر میں فرماتے ہیں ؎

حق تعالے گفت آدم غیر نیست[1]
کور چشمی و ترا ایں سیر نیست
شد نفخت فیہ من روح آشکار
سرِّ جاناں گشت بر خاک استوار
از دمِ حق آمدی آدم توئی !
اصل کرّمنا بنی آدم توئی
قبلۂ کل آفرینش آمدی !
پائے تا سر عین بینش آمدی

---

[1] ترجمہ (۱) اللہ تعالے نے فرمایا! آدم غیر نہیں تو اندھا ہے اس کا تجھے علم نہیں (۲) نفخت فیہ من روحی صاف بتلا رہا ہے محبوب کے اسرار خاک کے رنگ میں ہیں۔ (۳) حق کے دم سے آیا ہے تو ہی آدم ہے کرّمنا بنی آدم اصل میں تو ہے، تو ہے (۴) تمام کائنات کا قبلہ تو ہے، تو ہے [illegible]

یا اللہ! ہمیں مدینہ تک پہنچا اور جدائی سے نجات دے (امین)

تفسیر عالمانہ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ

سوال: مضارع کیوں استعمال ہوا ہے حالانکہ واقعہ تو ماضی میں ہوا؟

جواب: یہ حال واقعہ کی وجہ سے ہے گویا ابھی واقع ہو رہا ہے اور مخاطب کے تصور میں ایسے ہو کہ ابھی میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔

حل لغات: القواعد، قاعدہ کی جمع ہے۔ دراصل صفت ہے اور بمعنے ثابتۃ کے ہے۔ پھر بوجہ غلبہ اسم ہو گیا یہانتک کہ اب اس کے ساتھ موصوف مذکور بھی نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی مقدر مانا جاتا ہے۔ اور لفظ قعود دراصل اس ہیئت کو کہتے ہیں جو قیام کے بالمقابل ہے اب استعارۃً استقرار پر بولا جاتا ہے۔ اس تشبیہ سے کہ دونوں حالت انتقال و نزول کے مباین ہیں۔

ترکیب: من البیت القواعد سے حال ہے۔ اور من ابتدائیہ ہے نہ کہ بیانیہ کیونکہ من البیت کے بجائے البیت نہیں کہا جا سکتا۔

سوال: رفع بمعنے کسی شے کو زمین سے علیٰحدہ کر کے زمین سے بلند و بالا کیا جائے اور اساس تو ہمیشہ زمین پر مستقر ہوتا ہے۔ اب رفع کا کیا مطلب؟

جواب: رفع اساس سے مراد اس پر بنا کرنا اور بنا علی الاساس مراد لے کر رفع کو استعمال کیا گیا، کیونکہ بنا کو نچائی کی ہیئت سے نقل کر کے اونچائی کی ہیئت میں لے جاتے ہیں۔ اب رفع کا حقیقی معنی مل گیا۔

سوال: بیت کا اساس تو ایک تھا لیکن قواعد جمع سے کیوں تعبیر کیا گیا؟

جواب: اس کے اجزاء کے اعتبار سے گویا اس کا ہر ایک جزا اپنے مافوق کے لیے اساس تھا۔ اب معنٰے یہ ہے کہ یاد فرمایئے اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت کو جب کہ حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی بنیاد کو بلند فرمایا۔

وَاِسْمٰعِیْلُ ط اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام نے

ف: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے تھے:

(۱) اسماعیل (۲) اسحٰق

(۳) مدین (۴) مدائن

ف: اس کا عطف ابراہیم پر ہے۔

سوال: اسے مفعول سے کیوں مؤخر کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کا عطف فاعل پر ہے تو اسے مفعول سے مقدم ہونا چاہیئے؟

اس میں اشارہ ہے کہ رفع بیت میں اصل ابراہیم تھے اور اسمٰعیل ان کی فرع۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام پتھر اٹھا کر دیتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی بنا کرتے۔

تاریخ کعبہ رفع اساس جس پر کعبہ کی بنا کی گئی دلالت کر رہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے وجود مسعود سے پہلے کعبہ کی بنیاد رکھی گئی، پھر ابراہیم علیہ السلام نے آکر اس پر تعمیر فرمائی، لیکن اختلاف یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کی بنیاد کس نے رکھی، بعض کہتے ہیں، فرشتوں نے سب سے پہلے اس کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ مروی ہے کہ جب اللہ تعالٰے نے انھیں فرمایا، میں اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔ تو انھوں نے کہا، مفسد اور خونریز کو پیدا کر رہا ہے، ہم تیری تسبیح و تقدیس کے لیے کافی نہیں؟ اللہ تعالٰے ان پر ناراض ہوا تو انھوں نے اس کے عرش کے پاس آکر پناہ مانگی۔ اور اس کے ارد گرد سات بار طواف کیا تا کہ اللہ تعالٰے راضی ہو جائے۔ اللہ تعالٰے ان سے راضی ہو گیا اور فرمایا کہ میرا زمین پر ایک گھر تیار کرو۔ اس کے قریب آکر جس بنی آدم پر میں ناراض ہونگا پناہ مانگے گا۔ اور جس طرح تم نے میرے عرش کا طواف کیا ہے وہ اس کا طواف کرے گا جس سے میں راضی ہو جاؤں گا۔ اس حکم کے بعد ملائکہ نے اسی بیت اللہ کو تیار کیا۔

ف : بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالٰے نے آسمان پر ایک بیت تیار کرایا ہے جس کا نام بیت المعمور ہے اس کا نام ضراح ہے ملائکہ کو حکم فرمایا کہ زمین میں اس کے مقابل اس کی قدر اس جیسا کعبہ تیار کر لو۔

ف : بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سب سے پہلے کعبہ کی بنیاد آدم علیہ السلام نے رکھی، پھر طوفان نوح سے وہ تعمیر مٹ گئی۔ پھر اللہ تعالٰے نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کا نشان بتایا۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالٰے عنہ سے مروی ہے کہ جب آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر اترے تو اللہ تعالٰے نے انھیں فرمایا: اے آدم! زمین پر جا کر ایک گھر تیار کرو اور اس کے ارد گرد طواف کرو اور وہاں پر مجھے یاد کرو۔ جیسے تم فرشتگان کو میرے عرش کے گرد دیکھتے ہو۔ آدم علیہ السلام حکم سن کر روانہ ہوئے۔ ان کے لیے زمین لپیٹ لی گئی اور جنگل قبض کر لئے گئے۔ جہاں پر قدم رکھتے وہاں آبادی ہو جاتی۔ یہاں تک کہ بیت اللہ شریف کی جگہ تک پہنچ گئے۔ جبریل علیہ السلام نے زمین پر اپنے پَر مارے جس سے ساتویں نیچی زمین تک اس کی بنیاد کا نشان نظر آنے لگا اور فرشتوں نے ایک پتھر لایا جس کو ستّر آدمی بھی نہ اٹھا سکیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر پانچ پہاڑوں سے کی:

(۱) طور سینا

(۲) طور زیتا

(۳) لبنان، جو شام میں ایک پہاڑ ہے۔

(۴) جودی، جو جزیرہ میں ایک پہاڑ ہے۔

(۵) حراء، جو مکہ میں ہے۔ جس کی بنیاد چوڑی رکھی گئی اور پتھروں سے بھر دی گئی تھی۔ یہ تھی

آدم علیہ السلام کی بناء

ف : بعض روایات میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے کعبہ کے مقام کو زمین سے دو ہزار سال قبل پیدا فرمایا جو اس وقت سفید جھاگ کا ٹکڑا پانی پر تھا۔ اس سے زمین کو بچھایا گیا۔ جب آدم علیہ السلام زمین پر اترے تو انھیں وحشت ہوئی۔ اللہ تعالےٰ کی طرف شکایت پیش کی۔ اللہ تعالےٰ نے بیت المعمور (جو اس کے یاقوت بہشت کے یواقیت سے تھا۔ اس کے دو باب زمرد اخضر کے تھے۔ باب شرقی، باب غربی) کو اس بیت کی جگہ پر رکھ کر فرمایا: اے آدم! ہم نے تمہارے لیے اس بیت کو آسمان سے اتارا ہے۔ اس کا طواف کرو، جیسے میرے عرش کے گرد طواف کیا جاتا ہے۔ اور اس کے قریب نماز پڑھیئے۔ جیسے میرے عرش کے قریب پڑھی جاتی ہے۔ بعد ازاں ایک پتھر نازل فرمایا جو پہلے سفید تھا۔ اب زمانۂ جاہلیت کی حیض والی عورتوں کے ہاتھ لگانے سے سیاہ ہوگیا ہے۔ آدم علیہ السلام مکہ کی طرف زمین ہند سے پیدل روانہ ہوئے۔ آپ کی رہبری کے لیے ایک فرشتہ مقرر کیا، جو انھیں راستہ بتاتا تھا۔ (امام مجاہد سے پوچھا گیا کہ آپ سوار ہو کر کیوں نہ آئے۔ آپ نے فرمایا: اس وقت کون سی سواری تھی جو آپ کو لے آتی۔)

آپ کے ایک قدم کی مسافت تین دنوں کے سفر کے برابر تھی۔ آپ مکہ میں آئے حج کے مناسک ادا کئے۔ جب فارغ ہوئے تو ملائکہ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آدم علیہ السلام! آپ کا حج مبرور ہے ہم نے آپ کی پیدائش سے پیچھے دو ہزار سال پہلے اس کا حج کیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے ہند سے مکہ تک چالیس پیدل حج کئے تھے۔ اسی طرح وہ اور دیگر مومنین (ان کی اولاد سے) طوفانِ نوح تک طواف کرتے رہے۔ پھر اللہ تعالےٰ نے اسے چوتھے آسمان کی طرف اٹھا لیا، جہاں ہر یوم ستر ہزار فرشتے حاضر ہوتے (جنھیں پھر حاضری کا موقعہ نہ ملتا) اور جبرائیل علیہ السلام کو بھیج کر حجرِ اسود کو جبل ابی قبیس میں چھپانے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ غرق ہونے سے محفوظ رہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک یہ مقام خالی رہا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کی بنا کا حکم دیا کہ جس میں وہ رہ کر اس کی یاد کریں۔ اللہ تعالےٰ سے عرض کی: الٰہی! مجھے اس مقام کی رہبری فرمائیے۔ اللہ تعالےٰ نے سکینہ کو بھیج کر ان کی رہبری کی۔ (سکینہ الجُ جوج کو کہتے ہیں جس کے دونوں سرے سانپ کی طرح ہوتے ہیں) پھر ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جہاں یہ سکینہ ٹھہر جائے وہاں کعبہ کی بنیاد رکھنا۔ آپ اس کے پیچھے چل پڑے۔ یہاں تک وہ سکینہ اس بیت اللہ والے مقام پر آکر رک گئی اور گھومنے لگی جیسے ڈھال گھیرا مار کر گھومتی ہے اور ابراہیم علیہ السلام سے عرض کی: اسی جگہ پر قبلہ کی بنیاد رکھیئے۔ ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے مل کر تعمیر کا کام شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب حجر اسود والے مقام پر پہنچے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحب زادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے فرمایا: کوئی سفید رنگ کا خوشنما پتھر لائیں اور یہاں نشان کے طور پر رکھ دیں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ایک خوشنما سفید رنگ کا خوشنما سفید رنگ کا پتھر لے آئے، لیکن آپ نے فرمایا: اس سے بھی زیادہ کوئی اور ہو تو بہتر ہے۔ حضرت

ٰمعیل علیہ السلام اس کی تلاش میں نکلے تو ابوقبیس نے پکار کر عرض کیا! اے ابراہیم علیہ السلام میرے پاس ایک امانت ہے وہ لے جایئں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک شاندار بہشت کے یاقوتوں میں سے ایک یاقوتی پتھر دکھو ہے۔ اور اسے حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے اپنے ساتھ لے آئے جیسے بعض روایات میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے بیت المعمور کو نیچے اتارا تو اُس کے ساتھ بھیجا تھا۔ جیسے اس کی تفصیل گزری ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے لے کر اسی مام پر رکھا۔ پھر جب تعمیر کچھ بلند ہوئی تو ایک مربع شکل کا بادل اترا جس کا ایک سر تھا اس نے ندا دی کہ میری صورت کے مطابق ہی س کی تعمیر کیجئے۔ یہ تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کی تفصیل۔

گھوڑا پہلے وحشی جانور تھا مروی ہے کہ جب باپ بیٹا دونوں کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سواری کا گھوڑا انعام میں عطا فرمایا۔ در اصل یہ گھوڑا پہلے دوسرے وحشی جانوروں کی طرح جنگلی جانور تھا۔

ف : مروی ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کعبہ مکرمہ کی تعمیر کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا کہ میں تمہیں اپنے خزانوں میں سے ایک خزانہ عطا فرماؤں گا۔ پھر جب تعمیر مکمل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو فرمایا کہ پہاڑوں کی طرف جایئے وہاں دُعا مانگیے۔ آپ پہاڑوں میں گئے لیکن انھیں نہ دعا مانگنا معلوم اور نہ خزانے کا پتا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک دعا سکھائی۔ جب آپ نے دُعا مانگی تو تمام دیارِ عرب کے گھوڑے آپ کے پاس آگئے اور آپ کے قبضۂ قدرت میں دے دئے گئے۔

حدیث شریف حضور علیہ السلام نے فرمایا،
" اے لوگو! ان گھوڑوں کو سواری بناؤ اور گھاس کھلاؤ، ان میں بڑی برکتیں ہیں اور تمھارے باپ حضرت اسمٰعیلؑ کی وراثت سے تمہیں عطا ہوئے ہیں۔"

گھوڑے کو عربی بھی کہا جاتا ہے اس لیے کہ ایک تو اسمٰعیل علیہ السلام کو اُن کے لیے دعا کا حکم دیا گیا تھا۔ دُوسرا یہ کہ عربی کی نسبت عرَبؔ (بفتحتین) کی طرف ہے۔ اور عربہ بمعنی باحۃ العرب۔ کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام نے عرب میں پرورش پائی تھی۔

ف : ابراہیم علیہ السلام سریانی میں بولتے اور اسماعیل علیہ السلام عربی میں۔ لیکن ایک دوسرے کی بولی سمجھ جاتے۔ ایک دوسرے کی بولی بول نہیں سکتے تھے۔

کعبہ کی تعمیر ثالث قریش کی تعمیرِ کعبہ کا واقعہ تو مشہور ہے اور سانپ کا واقعہ بھی اس میں مشہور ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ قریش نے جب کعبہ کی تعمیر کا ارادہ کیا تو ایک سانپ اس کی تعمیر میں حائل ہُوا وہ کعبہ کی پرانی عمارت کو ڈھانے نہ دیتا تھا۔ تمام قریش جمع ہُوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر عرض کرنے لگے

یا اللہ! تُو جانتا ہے کہ ہم تیرے گھر کو سنگار نا چاہتے ہیں سوائے اس کی زیبائش کے ہمارا اور کوئی ارادہ نہیں۔ اگر تُو اس سے راضی ہے تو ہمیں توفیق دے ورنہ جیسے تو چاہے ہم راضی ہیں۔" چنانچہ اُن کی دُعا مستجاب ہوئی۔ آسمان سے ایک موٹے سے پرندے کے اترنے کی آواز اُنھوں نے سُنی۔ دیکھا کہ وُہ پرندہ چیل سے کچھ بڑا ہے، اس کی پیٹھ سیاہ اور پیٹ اور پاؤں سفید ہیں۔ اُس نے سانپ کے سرے کو چنگل میں دبایا اور اوپر لے اُڑا۔ قریش دیکھتے رہے کہ اس کی دُم بہت چوڑی تھی۔ اس نے اُس سانپ کو پہاڑوں میں جا پھینکا۔ اس پر قریش نے پُرانی عمارت کو منہدم کر دیا اور نئے سرے سے تعمیر شروع کر دی۔ وادیوں سے پتھر اٹھا اٹھا کر بیس گز اونچی عمارت تیار کر دی۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

زہری سے مروی ہے کہ جب وہ رُکن یمانی کے مقام پر پہنچے تو اُن کا آپس میں جھگڑا ہو گیا کہ حجرِ اسود کو وہاں رکھنے کی ہر قبیلے کی خواہش تھی تاکہ یہ برکت انھیں حاصل ہو۔ آخر طے پایا کہ جو اس کوچہ سے سب سے پہلے گزرے گا اسی کو فیصلہ کا حکم ٹھہرایا جائے گا۔ چنانچہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُدھر سے گزر ہُوا۔ سب حضور علیہ السلام کے فیصلہ کو درست ماننے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ حجرِ اسود کو ایک بڑے کپڑے پر رکھ دو اور اس کپڑے کو ہر قبیلے کا سردار پکڑے یوں قبیلوں کے سردار اسے اس مقام کے قریب لے آئیں۔ چنانچہ وہ اس فیصلہ پر راضی ہو گئے۔ جب سب نے اسے اٹھا کر دیوار کے قریب کیا تو آپؐ نے اسے اپنے دستِ مبارک سے اٹھا کر وہاں رکھ دیا۔

ف: بعض روایت میں ہے کہ قریش کے رُکن میں ایک کتاب سریانی لغت کی ملی۔ لیکن اسے وُہ پڑھنا نہیں جانتے تھے ان میں ایک یہودی عالم سریانی لغت کو جانتا تھا۔ اس نے پڑھا تو لکھا ہوا پایا: کعبہ کا مالک میں اللہ ہُوں، میں نے کعبہ اس وقت پیدا کیا جب زمین و آسمان بنائے اور سورج چاند پیدا کیے۔ اور میں نے اس کی حفاظت کے لیے سات فرشتے مقرر کیے ہیں وہ اس وقت اس سے ہٹیں گے جب اس کی آخری تعمیر ختم ہو گی وُہ اپنے اہل کے لیے مبارک اور اس کا پانی اور دُودھ مبارک ہے۔

ف: حضرت اُبو جعفر فرماتے ہیں کہ عمالقہ اور جرہم اور ابراہیم کے زمانے میں مکّہ کا دروازہ زمین پر تھا قریش نے اسے اونچا کیا۔

حدیث شریف

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے دیوار کے بارے میں پُوچھا کہ کیا یہ بھی کعبہ کے حکم میں ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اسے قریش نے کعبہ کے اندر کیوں نہ داخل کیا؟ آپؐ نے فرمایا: اُن کے پاس گنجائش نہیں تھی۔ میں نے پھر کہا: اس کا دروازہ اونچا کیوں ہے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ تیری قوم قریش کی کارگزاری ہے۔ اگر ان میں زمانۂ جاہلیت کے تاثرات نہ پائے جاتے تو میں ان کے اس دروازہ کو توڑ کر

زمین کے برابر کر کے اس کے دو دروازے مقرر کر دیتا، ایک بجانبِ شرق، دوسرا بجانبِ غرب۔ اور حجرِ اسود کی طرف سے چھ ہاتھ اور بڑھاتا۔ چونکہ قریشیوں نے اسی طرح تعمیر کی تو میں بھی اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ تھی تعمیرِ ثالث کی تفصیل۔

تعمیرِ رابع اس کے بعد جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہلِ شام سے جنگ کی۔ اُن کی زیادتیوں سے کعبہ کی تعمیر کچھ جل گئی، تو آپ نے اُسے گرا کر حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ اس کے دو دروازے رکھے گئے، ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے باہر نکلتے۔ حجرِ اسود کے قریب سے چھ گز کا اضافہ کیا۔ اس سے قبل کعبہ معظمہ کی لمبائی اٹھارہ گز تھی۔ حجرِ اسود کی طرف سے تعمیر میں اضافہ کی وجہ سے اب طول میں کچھ کمی آگئی، نو گز کم ہو گئے۔

تعمیرِ خامس جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے تو حجاج ظالم نے اُن کی تعمیر کردہ عمارت کو گرانے کا حکم دیا۔ جتنا اضافہ عبداللہ بن زبیر نے کیا تھا وہ ختم کر کے پہلی تعمیرِ قریش کی طرح کعبہ کی عمارت تیار کرائی، اور مغربی دروازے کو بند کرا دیا۔

تعمیرِ سادس مروی ہے کہ ہارون الرشید کو خیال گزرا کہ حجاج ظالم کی تعمیر کو گرا کر کعبہ کی تعمیر ویسے ہی کرائے جس کی خبر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انھیں دی کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کعبہ معظمہ یوں تعمیر کرایا تھا۔ حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کام کا مشورہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اے ہارون! تجھے ربِ کعبہ کی قسم! ایسا نہ کر، کیونکہ اس طرح ہر آنے والا بادشاہ عمارت کو منہدم کر کے پہلے کے خلاف تعمیر کرتا رہے گا، یوں کعبہ معظمہ ایک مذاق بن کر رہ جائے گا اور لوگوں کے دلوں سے اس کی ہیبت نکل جائے گی۔

تعمیرِ کعبہ دس بار

کہتے ہیں کہ کعبہ کی تعمیر دس بار ہوئی:

(۱) تعمیرِ ملائکہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے

(۲) تعمیرِ آدم علیہ السلام

(۳) آپ کی اولاد میں سے شیث علیہ السلام

(۴) ابراہیم علیہ السلام

(۵) عمالقہ (۶) جرہم (۷) قصی بن کلاب (۸) قریشِ مکہ (۹) عبداللہ بن زبیرؓ

(۱۰) حجاج بن یوسف

ف: تعمیر کا مطلب یہ ہے کہ اس کی دیواروں کو درست کیا جاتا، نہ کہ اس کی اصل مکانیت کو۔

قولِ دیگر حافظ سہیلی قدس سرہٗ فرماتے ہیں :
سارے زمانے میں اس کی تعمیر صرف پانچ بار ہوئی۔ پہلی بار حضرت شیث علیہ السلام نے کی۔

تعمیرِ کعبہ پندرہ بار

حدیث شریف : پانچویں تعمیر اُن پندرہ تعمیروں میں سے ہے جو اس سے پہلے ہو چکی تھیں۔ سات بار ان میں سے آسمانوں میں یوں ہوئی کہ ساتویں تعمیر اس کے عرش تک پہنچی۔ پھر ساتویں بار زمین تک اترنے کی تھی۔ جس کا نچلا حصہ زمین میں اور اوپر والا عرش کے نیچے بیت المعمور میں ہے۔ لیکن جہاں جہاں اس کی تعمیر ہوتی رہی وہاں اس کے ایسے ہی حرم مقرر ہوئے جیسے یہاں اس کا حرم شریف ہے، ان ساتوں میں سے کوئی ایک گرے تو ساتوں گرتے گرتے اس کو بھی گرا دیں گے۔ جیسے زمین پر اس کی تعمیر کی جاتی ہے ویسے ہی آسمانوں میں بھی۔ اسی طرح محدث کارزونی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مناسک میں ذکر فرمایا ہے۔

حدیث شریف میں ہے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ عرش آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش سے پہلے پانی پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا چلائی جس سے پانی متحرک ہوا تو اس کے اندر سے اس کعبہ معظمہ کے مقام سے ٹکڑی ظاہر ہوئی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک قبہ ہے اس کا حدود اربعہ اس بیت اللہ کے مطابق تھا جیسے آج ہمارے ہاں موجود ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ نے زمین کو بچھانے کا حکم دیا وہاں سے زمین پھیلتی گئی۔ اسے پھر پہاڑوں کی میخوں سے مضبوط کر دیا گیا۔ پہاڑوں میں سے سب سے پہلے ابوقبیس کو رکھا گیا۔ اسی لیے مکہ مکرمہ کو اُمّ القریٰ کہا جاتا ہے۔

ف : حضرت کعب فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر اس طریق سے فرمائی جیسے ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر فرمائی۔ ان دونوں کی تعمیر قدیمی تعمیر کے مطابق تھی۔ یعنی ملائکہ کی تعمیر پانی پر۔

حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہم السلام جب کعبہ تعمیر کر رہے تھے تو یہی کہتے تھے :

رَبَّنَا اے ہمارے رب تَقَبَّلْ مِنَّا ط ہم سے قبول فرما

مسئلہ : دُعا وغیرہ منجملہ ان قربتوں اور طاعتوں سے ہے کہ تقبل تکلفات کے افعال سے ہے کہ ہمارا عمل تو ناقص ہے مگر تو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔ اور قبول اس استعمال میں نہیں آتا۔ اس میں اشارہ ہے کہ ہم اپنے عمل میں عجز و انکساری اور قصور کا اعتراف کرتے ہیں۔

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ بے شک تو تمام مسموعات کو سنتا ہے منجملہ ان کے ہماری اس دُعا و تضرع کو بھی تو سننے والا ہے۔ تو تمام معلومات کو جانتا ہے منجملہ ان کے ہماری نیتیں بھی، جو ہمارے اعمال میں پائی جاتی ہیں۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہُوا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے کسی حکم میں کمی تو کوئی واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے فرمان کی تعمیل میں پُوری ہمت سے کام لیا ورنہ وہ اتنی جرأت کب کرنے والے تھے کہ اسے نہایت کُھلے الفاظ سے اور دل کی گہرائیوں سے کیسے کہتے کہ تُو ہی سُن رہا ہے اور تُو ہی جانتا ہے۔

مسئلہ: آیت سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ جب کوئی بندہ مامور بہ کی تعمیل سے فارغ ہو جائے اور اپنی وسعت کے مطابق اس میں خلوص سے حکم کی تعمیل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع کا اظہار کرے تاکہ اس سے وہ عمل قبول ہو جائے اور اس کے منہ پر نہ مارا جائے اور اس کی تمام کوششیں ضائع نہ ہو جائیں۔

مسئلہ: کچھ ضروری نہیں کہ ہر عمل اگرچہ بڑی کوشش سے کیا جائے وہ قبول ہو جائے۔ کیونکہ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ حضرات اس قسم کی دُعا نہ مانگتے۔ کیونکہ قبول کرنا نہ کرنا اس ذات کے ارادۂ مقدسہ پر منحصر ہے۔ اس پر کوئی شے واجب نہیں۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ یعنی اے رب! ہمیں اپنا مخلص بنا دے۔ مسلم سے وہ شخص مراد ہے جو اپنی ذات اور نفس کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے خالص کرے۔ یعنی جسم و جان اور زبان و دل سے عجز و زاری کا اظہار کرے اور اس کی تعظیم جیسی کسی اور کی نہ کرے۔ اور یہ عقیدہ رکھے کہ میری ذات و صفات و افعال ہر لحاظ سے اللہ کی مِلک ہیں۔ وہی ان کا خالق ہے۔ کسی دوسرے کو اس میں دخل نہیں، یا یہ معنی ہیں کہ یا اللہ! ہمیں اپنا فرماں بردار بنا کہ ہم اپنے مقدور بھر تیری رضا کے سوا اور کوئی کام نہ کریں۔ تیرے احکام کی ادائیگی میں حُجّت بازی سے کام نہ لیں۔

قاعدہ: جب لفظ اسلام کے بعد سلام آئے تو وہاں اسلام بمعنی فرمانبردار اور رضا طلبی مراد ہوتی ہے۔

سوال: جب وہ دونوں حضرات اس دعا کے وقت نہایت درجہ کے فرمانبردار مخلصین تھے تو پھر دعا مانگنے کا کیا معنیٰ؟

جواب: اخلاص و توجہ کی زیادتی اور اس پر ثابت قدمی مطلوب تھی۔ اس سے لوگوں کو تعلیم بھی ہے کہ وُہ اپنے ایمان پر ثابت قدمی کی دعائیں مانگیں۔ کیونکہ وہ حضرات جبکہ ہر طرح سے معصوم اور مصئون و مامون تھے۔ لیکن پھر بھی ثابت قدمی کی دعا مانگ رہے ہیں تو ما و شما کہاں! باوجودیکہ ہم ہر طرح سے معرضِ نقصان میں ہیں۔ پھر اس فرماں برداری پر ثابت قدمی بھی مقصود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دُعا مستجاب ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نار گلزار بن گئی اور اسمٰعیل علیہ السلام ذبح ہونے سے بچ گئے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اور ہماری اولاد میں سے ایک جماعت کو اپنی فرمانبردار بنا تاکہ وہ تیری عبادت میں مخلص ترین ثابت ہوں۔

سوال: صرف اولاد کے لیے دُعا مانگنے کا کیا معنیٰ، حالانکہ ایسے حضرات کے ظرف تو وسیع ہوتے ہیں بالخصوص انبیاء علیہم السلام کہ ان کو ہر عام و خاص کو اپنی دُعاؤں میں شامل کرنا چاہیے۔

جواب (۱): شفقت کے لحاظ سے اولاد کو ترجیح دی ہے۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
یاایھا الذین اٰمنوا قوا انفسکم و اھلیکم ناراً۔ اولاد کی تخصیص سے اپنے ثواب میں اضافہ مقصود تھا۔
حدیث شریف : جو شخص اپنی ایسی اولاد چھوڑ جائے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت گزار ہو اُسے قیامت تک اس کے ثواب سے ثواب ملتا رہے گا۔
(۲) بظاہر اس میں اولاد کی تخصیص ہے لیکن درحقیقت یہ دعا سب کو شامل ہے اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد کی اصلاح عوام کی اصلاح کا ذریعہ بنتی ہے۔ گویا یوں دُعا کی ہے: یا اللہ! ہماری بعض اولاد کی اصلاح عوام کی اصلاح کا ذریعہ بنا۔

سوال : اولاد میں سے بعض کی تخصیص کیوں؟
جواب : اُن کو معلوم تھا کہ ان کی اولاد میں سے بعض نیک ہوں گے بعض بد۔ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا:
لاینال عھدی الظالمین۔ میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔
ف : اللہ تعالیٰ کی حکمت نے چاہا کہ عالم دنیا میں تین قسم کے آدمی ہوں:

۱۔ افاضل
۲۔ اوساط
۳۔ اراذل

___ افاضل تو وہ اولیاءُ اللہ ہیں جو اس کی اطاعت میں ہر ساعت سرگرم ہیں۔
___ اوساط وہ جنہیں آخرت کا خوف ہے، گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں تو جہنم کے خطرہ سے اور نیکی کرتے ہیں تو بہشت کی لالچ میں۔
___ اراذل وہ ہیں جو شب و روز دُنیوی امور میں منہمک ہیں جنہیں آخرت کی کوئی فکر نہیں۔ وہ اسی کوشش میں ہیں کہ دنیا کے کاروبار خُوب چلیں اور اسبابِ دنیا فراوانی سے ہوں۔

ف : دنیا کی تعمیر تین چیزوں سے ہے:
۱ - زراعت و باغبانی
۲ - حمایت و حرب
۳ - ایک شہر سے دوسرے شہر سامان کی نقل و حمل۔

جو بھی ان تینوں کاموں میں اُلجھ گیا اسے آخرت بالکل یاد نہیں رہے گی۔ جو دنیاوی مشاغل میں اس قدر پھنس گیا کہ

آخرت کو بھلا ہی دیا تو یوں سمجھو کہ اس نے جہالت وحماقت کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ اسی لیے عربی مقولہ ہے:

لولا الحمقی لخربت الدنیا۔

(اگر احمق دُنیا میں نہ ہو تو دنیا خراب ہو جائے)

مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ ایں جہاں ویراں شدے اندر زماں
حرصہا بیروں شدے از مرد ماں

۲ ایں عالم اے جانِ غفلت است
ہوشیاری ایں جہاں رافت است

۳ ہوشیاری زاں جہاں است و جواں
غالب آید پست گردد ایں جہاں

۴ ہوشیاری آفتاب و حرص و یخ
ہوشیاری آب و ایں عالم وسخ

ترجمہ: ۱۔ یہ جہاں برباد ہو جاتا اگر لوگوں کے دلوں سے حرص نکل جاتی۔

۲۔ یہ جہاں سراسر غفلت ہے ہشیاری اس عالم کے لیے آفت ہے۔

۳۔ ہشیاری سے جہان جوان ہے، غالب آئے گی تو جہان ویران ہوگا۔

۴۔ ہشیاری آفتاب ہے اور حرص یخ، ہشیاری پانی ہے اور جہان میل کچیل۔

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا مناسک، منسک کی جمع ہے۔ منسک بفتح السین وکسرہا۔ یعنی ہمیں منسک کے مقامات دکھا اور ہمارے مقدرات کی خبر دے۔ یعنی ان مقامات کی اطلاع دے جہاں حج کے افعال ادا کیے جاتے ہیں۔ یعنی وہ مواقیت جہاں سے احرام باندھا جاتا ہے اور وہ جگہ جہاں عرفات میں ٹھہر کر دُعا کی جاتی ہے اور طواف اور صفا و مروہ اور ان کے مابین سعی کی جگہ اور رمی جمار وغیرہا۔ یا مناسک سے یہاں صرف حج کے افعال مراد ہیں نہ کہ اس کے مقامات۔ بایں معنی کہ منسک مصدر میمی ہو نہ کہ اسم مکان اور اس کا جمع ہونا باعتبار مختلف انواع کے ہے۔ اور اَرِنَا بمعنے عرفنا ہے کیونکہ افعال حج کی آنکھ سے نہیں دیکھے جاتے بلکہ قلب کی آنکھ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور نسک اللہ تعالیٰ کی عبادت کو کہتے ہیں۔ اب حج کے افعال میں استعمال ہوا ہے۔ اسی لیے حج کے افعال نہایت مشقت بھرے ہیں کہ تکلیف اور جد وجہد کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے۔ وَتُبْ عَلَيْنَا جو صغار یا خلاف اولیٰ ہم سے سرزد ہوا اس کی توبہ قبول فرما، یا ہماری اولاد سے جو کبائر واقع ہوئے ہیں ان کی توبہ قبول فرما۔ یہ جملہ آپ نے کسر نفسی سے کہا ہے یا اپنی

اولاد کی رہبری کے لیے فرمایا ہے کیونکہ جب انھوں نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو یہ مقصد مدِنظر تھا کہ لوگوں کو نیکی کا طریقہ معلوم ہو جائے اور انھیں پتا چل جائے کہ اس گھر کے متعلق جتنے افعال و اعمال کیے جائیں گے سب میں مقصدِ اعلیٰ گناہوں سے بچنے اور ان سے توبہ کرنے کے طریقے بتائے جائیں گے۔ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ بے شک تُو توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔ توبہ کا لغوی معنی ہے رجوع کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت ہو تو بمعنے بندہ کی توبہ قبول کرنا اور اس میں اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق اور گنہگاروں کے دل میں رجوع الی اللہ کی توفیق ڈالنا۔ اور اس کے ظاہری اعضاء کو طاعات کی زینت بخشنا، بعد اس کے کہ اس نے انہیں گناہوں اور غلطیوں سے ملوّث کر دیا ہے۔

ف: تواب مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر اس کا اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ یہ فعل اس سے بکثرت ہوتا، اور اپنے بندوں کے گناہ کثرت سے معاف کرتا ہے

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ اے اللہ! ان میں بھیج یعنی ہماری اولاد کی جماعت اُمّتِ مُسلمہ میں سے، رَسُوْلًا مِّنْهُمْ رسول انہی کے نفسوں میں سے۔ منھم کی قید بڑھانے سے یہ فائدہ ہے کہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان میں کوئی رسول تشریف لائے اور ان کی اولاد میں سے نہ ہو۔ ان دونوں کی اولاد میں سے سوائے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کے کوئی اور تشریف نہیں لایا۔ یہ اُن کی دُعا کی قبولیت کی نشانی ہے۔

ف: مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اسی وقت ہی فرما دیا کہ ہم نے تم دونوں کی دُعا قبول فرمائی ہے۔ چنانچہ تمھاری منشاء کے مطابق آخر الزماں نبی علیہ السلام تشریف لائیں گے۔

حدیث شریف "میں اس وقت سے اللہ تعالیٰ کے ہاں خاتم النَّبِيّين لکھا جا چکا ہوں جبکہ آدم علیہ السلام اپنے گارہ میں تھے۔ اور میں تمہیں اپنے اوّل امر کی خبر دیتا ہوں، تمھیں معلوم ہو کہ میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دُعاؤں سے آیا ہُوں۔ اور میں وہی ہُوں جس کی خوشخبری حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سنائی تھی۔ اور میں وہی نور ہوں جبکہ میری والدہ ماجدہ نے مجھے جننے وقت دیکھا کہ اس نور کی وجہ سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔" اور دعوتِ ابراہیمؑ سے مراد یہی دُعا ہے جو آیت میں مذکور ہوئی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے دُعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ بنی اسماعیل میں ایسا ہی نبی بھیجے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ ان پر تیری آیات پڑھیں۔ یعنی انھیں تیری توحید اور اپنی نبوّت کی تبلیغ کریں جو تو انھیں حکم فرمائے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ اور انہیں ان کے نظریہ کی قوت کے مطابق قرآن پاک کی تعلیم دیں وَالْحِكْمَةَ اور حکمت، اور ایسے اعمال کہ جن سے معارفِ حق سے ان کے نفوس مکمّل ہوں اس سے احکامِ شریعت مراد ہیں۔

ف: حضرت ابن درید فرماتے ہیں کہ جس کلمہ سے نصیحت نصیب ہو اور وُہ عمل جو عزّت کی طرف لے جائے اور بُرے

اعمال سے روکے وہی حکمت ہے۔

وَيُزَكِّيهِمْ ط ان کی قوتِ عملیہ کے مطابق ان کا تزکیہ فرمائیں۔ یعنی انہیں شرک کی غبار سے بچائیں اور گناہوں کی خرابیوں سے دُور رکھیں۔ گناہوں کا صدور ترک واجبات یا برائیوں کے ارتکاب سے۔

ربط : حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین دُعائیں مانگ کر ان کو اللہ تعالیٰ کی ثنا پر ختم کیا۔

چنانچہ کہا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ بے شک وُہ غالب ہے کہ جس پر کسی دوسرے کے غلبے کا امکان ہی نہیں بلکہ تُو وہ ہے کہ جس پر چاہے غلبہ کرسکتا ہے الْحَكِيْمُ ۝ وہ حکیم کہ اس کا ہر کام حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں۔ وُہ سب پر غالب ہے اور باقی سب اس کے عاجز بندے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو خود ہی جانتا ہے اس کے سوا اور کون جانے، بلکہ بندے تو اپنی حقیقت سے بھی بے خبر ہیں۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ شرح اسماءُ الحسنیٰ میں فرماتے ہیں : عزیزؔ وہ ہے جس کا ثانی ممتنع ہو اور اسی کے آگے ہر حاجت پیش کی جائے لیکن اس کی طرف پہنچنا مشکل ہو۔ جس میں یہ تین اوصاف نہ ہوں اسے عزیز کہنا ٹھیک نہیں۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا ثانی ملنا مشکل تو ہوتا ہے لیکن وہ ایسی نہیں کہ ان کی طرف حاجات پیش کیے جاسکیں۔ جب وہ ایسے ہو تو ان کے وجود سے اتنے بڑے منافع بھی حاصل نہیں ہوسکیں گے۔ اسی لیے انہیں عزیز کہنا مناسب نہ ہوگا۔ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی شان تو بہت بلند ہے اور ان کے وجود سے فوائد بھی بہت حاصل ہوتے ہیں اور ان کی نظیر ملنا بھی مشکل ہے اور ان تک پہنچنا بھی دشوار، تاہم انہیں عزیز نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً سورج، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے ——— اسی طرح زمین۔ ان دونوں (سورج اور زمین) سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں اور ان کی حاجت بھی ہے لیکن انہیں عزیز سے موصوف نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان کے مشاہدات کی طرف پہنچنا کچھ مشکل نہیں۔ اس سے ثابت ہُوا کہ مذکورہ تین امور ان کے لیے ضروری نہیں پھر ان میں کمال ونقص کا اعتبار بھی ہے۔ مثلاً قلتِ وجود کو دیکھئے کہ یہاں آخری وجود کا ورود نہ ہونے کے بعد کوئی عدد ہے ہی نہیں۔ پھر وہ ایسا واحد کہ اس کی نظیر ممتنع ہے اور وہ صرف باری تعالیٰ ہے اور بس۔ سورج بھی اگرچہ وجود میں ایک ہے لیکن اس کا ثانی پایا جانا دائرۂ امکان میں ہے۔ اسی طرح وہ عزیز ایسا ہو کہ اس کی طرف ہر شے کا رجوع ہو۔ یہاں تک کہ ہر شے اپنے وجود اور بقا اور صفات کی وجہ سے اس کی محتاج ہو۔ یہ کمال صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مطلقاً عزیز وہی ذاتِ حق ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

ف : اس کے بندوں میں بھی بعض حضرات عزیز ہیں کہ جن کی طرف عام بندوں کو ان کی احتیاج ہے کہ وُہ اپنے اہم امور میں ان کی خدمت میں اپنی حاجات پیش کرتے ہیں، خصوصاً حیاتِ اُخرویہ اور سعاداتِ ابدیہ کے بارے میں۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کے بندوں میں قلیل ہیں جن کی طرف پہنچنا مشکل ہے۔ اور یہ مرتبہ حضرات انبیاء کرام

علیہم السلام کا ہے۔ اور اُن کے مرتبہ کے قریب قریب وہ حضرات بھی ہیں جو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ جیسے خلفائے راشدین اور اُن کے وارثین، اور ان کا یہ مرتبہ ان کے حسبِ استعداد ہوتا ہے۔ جتنا ارشادِ خلق اور طاعاتِ حق میں تکلیف اٹھاتے ہیں اتنا ہی یہ شان ملتی ہے۔

ف : حکمت کا مطلب یہ ہے کہ اجل الاشیاء یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت اجل العلوم سے حاصل ہو۔ اور اس ذات کی کُنہ سے تو ادراک عاجز ہے اور وہی حکیم مطلق ہے جو اپنے اجل العلوم کو جانتا ہے۔ اور اس کا اجل العلوم علم ازلی اور دائمی ہے کہ جس کا زوال ممتنع ہے۔ اور وہ معلوم کے مطابق علم رکھتا ہے جس میں خفا اور شبہ کا شائبہ تک نہیں اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔ مجازاً اور کو حکیم کہا جاتا ہے۔ جو صناعات کے دقائق سے واقف اور اُن کی صنعت میں پختگی رکھتا ہو۔ لیکن کمال صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے ورنہ مجازی حکیم میں کئی نقائص ہوتے ہیں۔

مسئلہ : جو صناعات کی حقیقت سے تو واقف ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے عرفان سے محروم ہو وہ بھی (شرعاً) حکیم نہیں کیونکہ وُہ اجل اور افضل اشیاء کے عرفان سے خالی ہے۔

مسئلہ : حکمت اجل العلوم سے ہے۔

مسئلہ : حکمت معلوم کی قدر کے مطابق ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے کون زیادہ اجل ہو سکتا ہے۔

مسئلہ : جسے عرفان حاصل ہے (حقیقتاً) وہی حکیم ہے اگرچہ وہ رسمی علوم سے غیر واقف ہو اور بولنے میں اتنی مہارت نہ رکھتا ہو۔ یعنی ولی اللہ۔

مسئلہ : بندہ کی معرفت کی نسبت کو اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات کو جاننے کے مابین بہت بڑا فرق ہے۔ کہاں بندہ کا عرفان اور کہاں خلاّقِ کون و مکاں کا اپنی ذات کا عرفان۔ باوجود اس کے یہ بندہ نفیس ترین عارف سمجھا جاتا ہے بلکہ اُسے ہی ہر بھلائی کا مرکز سمجھا جائے۔ کیونکہ جسے ایسی حکمت دی جاتی ہے وُہ خیرِ کثیر کا مجمع ہوتا ہے لیکن اسے حسّل والوں کے سوا اور کون جانے۔ مگر جو اللہ تعالیٰ کا عرفان رکھتا ہو اس کا کلام عام حکماء کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا کلام تو عین حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ وقتی منافع کا خواہاں نہیں ہوتا۔ اسے تو وُہ چاہیے جو آخرت میں اُسے نفع دے۔ چونکہ عوام کی نظروں میں رسمی حکماء کی باتیں مفید نظر آتی ہیں اور عارف کا کلام سمجھ نہیں آتا۔ اسی لیے رسمی حکیم پر حکمت کا اطلاق کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ منطقی کو بھی حکیم کہتے ہیں۔

حدیث شریف حضور سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حکمت کا سرتاج خوفِ خدا ہے۔ اور جو اپنے نفس کو حقیر سمجھے اور آخرت کے لیے ہر وقت تیار رہے اور جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کا تابع نہ بنائے وہ عاجز بندہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے وُہ مانگتا ہے جو بالکل کچھ نہیں اور اعلیٰ بندوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے۔ نیک بخت وُہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے۔ قناعت ایسا مال ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

(باقی برصفحہ ۵۲۶)

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ
فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ وَوَصّٰى
بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ
اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ ۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ تِلْكَ اُمَّةٌ
قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا
اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ
اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى
وَعِيْسٰى وَمَاۤ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ اٰمَنُوْا
بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِىْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ○ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا
فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ○ اَمْ تَقُوْلُوْنَ
اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ
اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ تِلْكَ اُمَّةٌ
قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ○ ع

ترجمہ : اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے سوائے اس کے جو دل کا احمق ہے اور بے شک ضرور ہم نے دنیا میں اسے چن لیا اور بیشک وُہ آخرت میں ہمارے خاص قُرب والوں میں ہے جبکہ اُس سے اس کے پروردگار نے فرمایا گردن رکھ عرض کی میں نے گردن رکھی اس کے لیے جو رب ہے سارے جہان کا اور اسی دین کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے کہ اے میرے بیٹو ! بے شک اللہ نے یہ دین تمہارے لیے چُن لیا تو نہ مرنا مگر مسلمان کیا تم خود موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی جبکہ اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی عبادت کرو گے انہوں نے جواب دیا کہ ہم عبادت کریں گے اس کی جو معبود ہے آپ کا اور آپ کے

آبا ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق کا ایک معبود اور ہم اس کے حضور گردن رکھے ہیں۔ یہ ایک اُمت ہے کہ گزر چکی ان کے لیے جو انھوں نے عمل کیا اور تمہارے لیے ہے وہ جو تم عمل کرو اور ان کے اعمال کا تم سے سوال نہ ہوگا اور اہلِ کتاب نے کہا یہودی یا نصرانی بن جاؤ ہدایت پاؤ گے تم فرماؤ بلکہ ہم تو ابراہیم کا دین لیتے ہیں جو ہر باطل سے جُدا تھے اور مشرکوں سے نہ تھے یُوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اتارا گیا ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق و یعقوب اور ان کی اولاد پر اور جو عطا کیے گئے موسیٰ و عیسیٰ اور جو عطا کیے گئے باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے ہم ان میں کسی پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھتے ہیں پھر اگر وُہ بھی یُوں ہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وُہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیریں تو وہ نری ضد میں ہیں تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا اور وہی ہے سنتا جانتا ہم نے اللہ کی رینی لی اور اللہ سے بہتر کس کی رینی ہے اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں تم فرؤ کیا اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وُہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی اور ہمارا عمل ہمارے ساتھ اور تمہارا عمل تمہارے ساتھ اور ہم نرے اسی کے ہیں بلکہ تم تو یُوں کہتے ہو ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے تم فرماؤ کیا تمہیں علم زیادہ ہے یا اللہ کو اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس کے پاس اللہ کی طرف کی گواہی ہو اور وُہ اسے چھپائے اور خدا تمہارے کردار سے بے خبر نہیں وہ ایک گروہ ہے کہ گزر گیا ان کے لیے ان کا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل اور ان کے اعمال کا تم سے سوال نہ ہوگا۔

(بقیہ صفحہ ۵۲۴)

صبر ایمان کا نصف ہے۔ یقین سارے کا سارا ایمان ہے۔"

مذکورہ جملے حکمتیں ہیں اور ان کا عامل حکیم ہے۔ امام غزالی کی تقریر شرح اسماء الحسنیٰ یہاں ختم ہوئی۔

خلاصۂ تفسیر آیت میں اشارہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے میں حکمت ہے وُہ ایک ایسی مصلحت ہے جو انجام بخیر کی طرف پہنچاتی ہے۔ کیونکہ ان حضرات کے صدقے ہی ظاہر و باطن سنورتا ہے اور عالم کا نظام انہی کے طفیل صحیح رہتا ہے مگر ان کے ورثہ اولیاء کاملین کو بھی ان کی تعلیم کے صدقے یہ مرتبہ حاصل ہے کہ وہ عوام کی صحیح رہنمائی کریں۔ عوام کو مرشد کی بیعت ضروری ہے تاکہ ان کے ذریعے منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔ جس کا کوئی مُرشد نہ ہو اس کا مرشد شیطان ہوتا ہے۔ حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے:

عشق منہ بے دلیل راہ قدم
کہ من بخویش نمودم صد اہتمام نشستند

ترجمہ : عشق میں رہبر کے بغیر قدم نہ رکھنا میں نے اس کے لیے ہزاروں اہتمام کیے تو منزل پر پہنچا۔

مسئلہ : مرشد کامل اس کی رہبری کرتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ وہ کسی کو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ پھر وہ ایسی صفائی کرتا ہے کہ مرید کو غیر اللہ کی توجہات سے ہٹا دیتا ہے اور ایسے انفسیہ اور آفاقیہ کے اسرار سے واقف کراتا ہے تاکہ مرید کو اہلِ یقین کا درجہ نصیب ہو اور وہ بھی نعیم روحانی سے حظ وافر حاصل کر کے اولیاء اللہ کے زمرہ میں داخل ہو جائے۔ یزکیھم کا اشارہ انہی سلوک کی منازل کی طرف ہے۔

سبق : سالک کو چاہیے کہ یہ اسباق یاد کر لے۔ یہ اس کے لیے بہت مفید ہیں۔

اے اللہ! ہمیں ان راستوں سے بچا جو تجھ تک پہنچنے سے روکیں کیونکہ ہر امید کی پناہ گاہ تیری درگاہ ہے۔

(تفسیر آیاتِ صفحہ)

تفسیر عالمانہ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ مَنْ استفہامیہ ہے اس سے انکار و تقریع مراد ہے۔ یعنی مَن استفہامیہ و تقریعیہ ہے۔

ف : یَرْغَبُ کا صلہ جب لفظ فی آئے تو اس کا معنی ارادہ کرنا ہوگا۔ اگر اس کا صلہ عن آئے تو اس کا معنی ترک کرنا ہوگا۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین کو نہ کوئی ترک کرے اور نہ ہی اس کی شریعت و طریقت سے کوئی اعراض کرے اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ط مگر جس نے اپنے نفس کو ذلیل و خوار کیا۔ نفسہٗ کا منصوب ہونا مفعول بہ کی وجہ سے ہے۔

شانِ نزول حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجوں سلمہ اور مہاجر کو اسلام کی طرف بلایا اور فرمایا کہ تورات میں موجود ہے کہ میں اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک پیغمبر بھیجوں گا جس کا اسمِ گرامی احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا جو ان پر ایمان لائے گا وہ ہدایت پائے گا اور جو انکار کرے گا وہ ملعون ہوگا۔ سلمہ نے اسلام قبول کر لیا لیکن مہاجر نے انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی :

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ج قسم ہے اللہ کی ہم نے ابراہیم کو نبوت و حکمت میں تمام مخلوق سے چن لیا۔ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ اس کا تعلق لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ سے ہے۔ یعنی وہ آخرت میں ان لوگوں سے ہیں جن کی صلاح و خیر اور ثبات علی الاستقامۃ کی شہادت دی گئی ہے۔ اور جس شخص کی دنیا میں آخرت کے لیے چناؤ کی گواہی دی گئی ہو اس کی اتباع کی جانی چاہیے۔ اس کی اتباع سے سوائے اس بیوقوف کے کوئی اعراض نہیں کرے گا جو اصل خلقت کے لحاظ سے بے عقل ہے۔ وہ عمداً جاہلوں جیسے اعمال کرتا ہے اپنے اختیار سے اور اپنے نفس کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔ جہالت کی وجہ سے اور نظر و تامل سے اعراض کر کے وانّہٗ فی الآخرۃ الخ میں اس کے حسنِ خاتمہ اور

اس کے وعدہ کی بشارت سے ورنہ بہت سے لوگ ہیں جو پہلے وقت تو صالح رہے لیکن ان کا انجام بُرا رہا۔ اور آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا ہوئے، جیسے بلعم بن باعورا، قارون، ثعلبہ۔ اِذْ قَالَ لَهٗ کی ظرف اور تعلیل ہے جب اسے کہا رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ اپنے دین کو اپنے رب کے لیے خالص کرو اور اس کے دین پر ثابت قدم رہو۔ یہ اس وقت ہے جب آپ نے غار سے نکل کر چاند ستاروں اور سورج کو دیکھا تو ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اخلاص الہام فرمایا قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ میں نے اس کے لیے اپنا دین خالص کیا۔ چنانچہ فرمایا: انی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوٰت والارض الآیہ۔ جس کا انہیں حکم دیا گیا اسے خلوص اور فرمانبرداری سے پورا کیا اور اپنے قول پر مستقل رہے۔ اپنا جسم و جان اور مال و اولاد سب اسی کے سپرد کر دیا۔ اور جب انہیں جبریل علیہ السلام نے سجدے میں گرتے دیکھا تو فرمایا، اگر کوئی حاجت ہو تو بتائیے۔ آپ نے فرمایا: اگرچہ ضرورت ہے لیکن تجھ سے نہیں۔ جبریل علیہ السلام نے کہا، تو پھر اُسی سے سوال کیجئے۔ آپ نے فرمایا: اس کا علم میرے حال کو محیط ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ

مفسرین فرماتے ہیں کہ آپ کی ولادت نمرود بن کنعان کے زمانہ میں ہُوئی۔ نمرود پہلا بادشاہ ہے جس نے تاج سر پر رکھا اور لوگوں کو اپنی عبادت کا حکم دیا۔ اس نے نجومی اور کاہن رکھے ہُوئے تھے۔ انہوں نے خبر دی کہ اسی سال ایک لڑکا تیرے شہر میں فلاں طرف سے پیدا ہونے والا ہے جو اہلِ ارض کے دین کو تبدیل کر کے تجھے ہلاک کر دے گا اور تیرا ملک بھی چھین لے گا۔ نمرود نے سنتے ہی اسی سال شہر کی اس جانب کے تمام نومولود بچے ہلاک کرنے کا حکم دے دیا۔ جب ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کا وقت قریب ہوا تو آپ کی والدہ ماجدہ وہاں سے بھاگ کر ایک خشک نہر میں پہنچیں اس خطرہ سے کہ شاید بچے کو ذبح کر دیا جائے۔ جب آپ پیدا ہُوئے تو ماں نے ایک کپڑے میں لپیٹ کر حلفا میں رکھ دیا۔ حلفا ایک گھاس کا نام ہے جو پانی میں پیدا ہوتی ہے جسے ترکی زبان میں حصیر قمشی کہتے ہیں۔ واپس آکر آپ کے باپ کو اطلاع دی اور بتایا کہ بچہ فلاں جگہ پڑا ہے۔ انہوں نے وہاں جا کر بچے کو اٹھا لیا اور زمین میں ایک گڑھا کھود کر مکان کی طرح بنا کر ابراہیم علیہ السلام کو اس میں چھپا دیا تاکہ درندوں سے محفوظ رہیں۔ اور اس گڑھے کے اوپر پتھر رکھ دیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ روزانہ آکر آپ کو دُودھ پلا جاتیں۔ شباب وقوت کے لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک دن دیگر لڑکوں کی نسبت ایک ماہ کے برابر ہو جاتا تھا، اور ایک ماہ سال کے برابر۔ آپ اس غار میں پندرہ ماہ یا سات یا اس سے زاید رہے۔ جب آپ اس غار میں نوجوان ہُوئے۔ اپنی ماں سے پُوچھا: میرا رب کون ہے؟ والدہ نے کہا: میں ہُوں۔ آپ نے پُوچھا: تیرا رب کون ہے؟ اس نے کہا: تیرا باپ۔ آپ نے فرمایا: اس کا رب؟ بی بی نے فرمایا: چُپ رہو۔ اس کے بعد واپس چلی گئی۔ اور اپنے شوہر کو کہا کہ واقعی بات سچی ہُوئی کہ جو بچہ اہل ارض کے دین کو تبدیل کر دے گا وُہ یہی ہے۔ آپ کا سارا گزشتہ واقعہ سنایا۔ پھر آپ کے باپ یعنی چچا آذر

آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے انہیں فرمایا، اے اباجان! بتائیے میرا رب کون ہے؟ اس نے کہا، تیری ماں۔ فرمایا، اس کا رب کون؟ اس نے کہا، میں۔ فرمایا، تیرا رب کون ہے؟ کہا، نمرود۔ آپ نے فرمایا، نمرود کا رب کون ہے؟ آذر نے آپ کے منہ پر ایک طمانچہ دے مارا اور کہا، چپ ہو جاؤ۔ پھر رات ہوئی تو غار کے دروازے کے قریب ہو کر پتھر کے سوراخ میں سے آسمان اور اس کے مافیہا (یعنی ستاروں وغیرہ) کو دیکھ کر آسمان و زمین کی پیدائش میں تفکر کیا اور کہا: بے شک وہ ذات جس نے مجھے پیدا کیا مجھے روزی اور پانی عطا کیا میرا رب ہے، میں اس کے ماسوا کی پرستش ہرگز نہیں کروں گا۔ پھر آسمان کو دیکھ کر ستارے پر غور فرما کے سوچا کہ یہی میرا رب ہے، اسے دیکھتے رہے حتیٰ کہ وہ غائب ہو گیا تو فرمایا، میں گم ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ پھر چاند کو دیکھا پھر سورج کو۔ وہ بھی غائب ہو گئے تو آپ نے وہی فرمایا جو ستاروں کے بارے میں فرمایا تھا۔

ف: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ کو بعض نے اس کے ظاہر پر محمول فرمایا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ چونکہ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کی تلاش میں تھے اس لیے یہ کہہ دیا۔ بنا بریں ان کا یہ کہنا کوئی غلطی نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے توحید کی راہ کھول دی۔ ازراہِ استدلال اس میں کوئی برائی نہیں۔ بعض نے فرمایا آپ اس وقت بچے تھے اور بچے مرفوع القلم ہوتے ہیں فلہٰذا ان کا یہ کہنا کفر نہ ہوگا۔ متاخرین نے ان تقریروں کا انکار کیا ہے اس لیے کہ جب یہ کلمات کفریہ ہیں تو پھر ان سے کیسے متصوّر ہو سکتا ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھیں کہ یہ ستارے وغیرہ خدا ہیں۔ اور یہ عقیدہ ہمیشہ کفر ہے خواہ طفولیت کا دور ہو یا بعد کا۔ انھوں نے اس کا مطلب کچھ اور بیان کیا ہے جس کی تفصیل امام محی السنۃ کی تفسیر سورہ انعام میں موجود ہے۔

خلاصۂ تفسیر: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کو پورے طور مانا اور وہ صحیح راستہ پر تھے فلہٰذا اب جو بھی ان کی اقتداء نہ کرے گا وہ احمق ہوگا۔ یعنی جیسے انھوں نے انفس و آفاق میں تفکر کیا ویسے کرنا چاہیے۔ کما قال تعالیٰ: و فی انفسکم افلا تبصرون۔

ف: سفاہت یعنی جہالت وضعف الرائی۔ ہر سفیہ جاہل ہوتا ہے کیونکہ جو غیر اللہ کی پرستش کرتا ہے اس جیسا احمق اور کون ہوگا، اس نے یہ نہ جانا کہ ہم سب کا خالق اللہ ہے۔

ف: "جس نے خود کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔"

ف: اخبار میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے آپ کو عاجز و کمزور اور ضعیف سمجھ اور اللہ تعالیٰ کو قادر اور صاحب بقاء۔

مثنوی شریف میں ہے: ~

۱	چیست تعظیم خدا افروشتن	خویشتن را خاک و خواری داشتن
۲	چیست توحید خدا آموختن	خویشتن درپیش واحد سوختن
۳	ہست در ہست آں ہستی نواز	ہمچو مس در کیمیا اندر گداز
۴	جملہ معشوق است عاشق پردۂ	زندہ معشوقست و عاشق مردۂ

ترجمہ :۱۔ تعظیم الٰہی یہ ہے کہ اسے بلند سمجھا جائے اور خود کو خاک و خواری میں ملایا جائے ۔

۲۔ توحیدِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچانا جائے اور اپنے آپ کو اس کے آگے جلاکر راکھ بنا دیا جائے ۔

۳۔ اس کی ہستی میں ہمارے وجود کی وہی کیفیت ہے جیسے تانبہ کیمیا میں مل کر کیمیا بن جائے ۔

۴۔ تمام عالم معشوق ہے عاشق صرف پردہ ہے زندہ تو صرف معشوق ہے اور عاشق تو مُردہ ہے ۔

وَوَصّٰى بِهَآ

رلط : جب ابراہیم علیہ السلام خود کمال کو پہنچے تو دوسروں کو بھی اکمل بننے کی وصیت فرمائی ۔
یعنی کسی کے سامنے وہ امر پیش کرنا جس میں قولاً و فعلاً بہتری اور بہبود ہو، بطریق تفضل و احسان کے ، خواہ وہ امر دینی ہو یا دُنیوی ۔ بہا یعنی ملت جو ومن یرغب عن ملۃ ابراہم میں مذکور ہوئی ہے ۔

اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ بعض کے نزدیک اپنی اولاد نرینہ میں سے آٹھ افراد کو وصیّت فرمائی :

(۱) اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ ہاجرہ

(۲) اسحٰقؑ اور ان کی والدہ سارا

باقی چھ جو کہ قنطورا بنت یقطن کنعانیہ سے تھے ۔ اس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بی بی سارا کے انتقال کے بعد نکاح کیا اور چھ لڑکے پیدا ہوئے ۔

(۳) مدینؑ (۴) مدائنؑ (۵) زمرانؑ (۶) یقشانؑ (۷) یشبقؑ (۸) نوخؑ

وَيَعْقُوْبُ ط مرفوع ہے اور ابراھم پر عطف ہے ۔ یعنی یعقوب علیہ السلام نے بھی وصیت کی تھی ۔ یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام کے بارہ صاحبزادے تھے :

۱۔ روبیل	۲۔ شمعون	۳۔ لاوی
۴۔ یہودا	۵۔ یستسوخور	۶۔ زبولون
۷۔ زوانا	۸۔ نفتوقا	۹۔ کوزا
۱۰۔ ردشیر	۱۱۔ بنیامین	۱۲۔ یوسف علیہ السلام

یعقوبؑ کی وجہ تسمیہ یعقوب کو اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ اپنے بھائی عیصو کے ساتھ جوڑا ہو کر ایک بطن سے پیدا ہوئے۔ عیصو نے عجلت کر کے پہل کی آپ اس کے پیچھے آئے۔
عقب بمعنی پیچھے آنا۔

واقعہ یوں ہے کہ یعقوبؑ کی والدہ بیک وقت دو بچوں سے حاملہ ہوگئیں۔ جب حمل کی مدت پوری ہونے کے بعد وضعِ حمل کا وقتِ مقررہ قریب آیا تو یہ دونوں پیٹ کے اندر بول رہے تھے اُن کی والدہ انکی باتیں سُن رہی تھی۔ ایک دوسرے سے کہتے کہ پہلے مجھے راستہ دو میں باہر جاتا ہوں۔ اُن میں سے ایک نے کہا، اگر تُو نے مجھے راستہ نہ دیا تو میں ماں کے پیٹ کو چاک کر کے کمر کی طرف سے نکل جاؤں گا۔ دوسرے نے کہا، اتنی غلطی نہ کرو، پہلے تمہی چلے جاؤ لیکن والدہ کی جان نہ گنواؤ۔ والدہ دونوں کی بات سُن رہی تھی۔ پہلے پیدا ہونے والے کا نام عیصو رکھا کیونکہ اس نے پیٹ میں نافرمانی کی تھی۔ اور دُوسرے کا نام یعقوب رکھا بوجہ پیچھے آنے کے۔ عیصو میں تو سختی اور شدت تھی۔ وہ دائماً شکاری رہا۔ یعقوب علیہ السلام میں شفقت و نرمی تھی ہمیشہ کھیتی باڑی میں مصروف رہے۔

اعجوبہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جیسے وہ دونوں ایک ہی دن میں پیدا ہوئے اسی طرح ایک ہی دن فوت ہوئے۔ اور بعض روایات میں آیا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی ایک سو سینتالیس سال عمر تھی اور مصر میں انتقال ہوا۔ آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ بیت المقدس میں دفن کیا جائے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے قریب یوسف علیہ السلام نے انہیں اٹھا کر حسبِ وصیت دفن کیا۔

یٰبَنِیَّ یہاں قول کا فعل مصریوں کے نزدیک محذوف ہے کیونکہ ان کے نزدیک یٰبنیّ جملہ ہے اور جملہ سوائے افعال قلوب اور قول کے اور کسی فعل کا مفعول نہیں ہوتا اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ دین سے اسلام مراد ہے کیونکہ تمام ادیان سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی دین پسندیدہ ہے اور اس کے نزدیک دین صرف یہی دین اسلام ہے فَلَا تَمُوْتُنَّ تمہیں موت نہ آئے لیکن اس خیال میں اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ کہ تم مخلصین بالتوحید اور اپنے رب سے نیک گمان کرنے والے ہو۔ اس میں بظاہر موت سے نہی ہے۔ لیکن حقیقت میں ترک اسلام سے نہی مطلوب ہے کیونکہ موت ان کے ہاتھ میں نہیں تھی۔

دراصل واقعہ یوں ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام مصر میں تشریف لائے تو وہاں کے لوگوں کو اصنام پرستی میں مبتلا پایا۔ بنابریں اپنی اولاد کو اسلام پر ثابت قدمی کی وصیت فرمائی کیونکہ ان کی موت کہ جس میں ثبات علی الاسلام نہ ہو اس موت میں کوئی خیر نہیں، کیونکہ ایسی موت سعادت مندوں کی موت نہیں ہے اس لیے کہ موت کے حقوق سے ایک حق یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا خلل نہ ہو۔

سوال : وصیت میں ابناء کی خصوصیت کیوں، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کے خصائل میں سے تو یوں ہونا چاہیے

کہ وہ تمام لوگوں کو دین و اسلام کی طرف بلائیں۔

جواب: اس طرف اشارہ ہے کہ امر اسلامی افضل ترین امور سے ہے کہ جس میں اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ اپنے قریبی لوگوں کو وصیت فرما رہے ہیں جو کہ شفقت و محبت اور ارادہ خیر کے زیادہ مستحق دلائل ہیں۔ علاوہ ازیں اپنی اولاد کی اصلاح عام لوگوں کی اصلاح کا موجب ہے کیونکہ متبوع اپنے جمیع احوال میں اچھا ہو جائے تو اس کے تابع بھی اچھے ہو جاتے ہیں۔

حدیث شریف جب آیہ وانذر عشیرتک الاقربین نازل ہوئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اقارب کو جمع کر کے نصیحت فرمائی کہ اے بنی کعب بن لوی! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنی مرہ بن کعب! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنی عبد شمس! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنی عبد المطلب! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے فاطمہ! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ کیونکہ میں تمہارے لیے کسی قسم کا مالک نہیں ہوں یعنی میں قادر نہیں ہوں کہ آخرت میں تم سے کوئی برائی دفع کر سکوں اگر اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ کر لے تو میں اس کی سفارش کروں گا جس کی مجھے اجازت ہوگی، مجھے ان کی سفارش کی اجازت نہ ہوگی جن کے لیے وہ عذاب دینے کا ارادہ کرے۔ یعنی کافر کے لیے۔

ف: یہ کلمات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے محض ایمان و عمل کی ترغیب کے لیے فرمائے ہیں تاکہ کوئی قرابت و رشتہ داری پر بھروسا کر کے عمل صالح میں سستی نہ کرے۔ اسی لیے دین کے معاملہ میں وصیت ضرور کرنی چاہیے کیونکہ جب کوئی اہلِ شر سے مانوس ہوتا ہے تو اسے خوف ہوتا ہے کہ کہیں اس میں بھی وہ عادات نہ آجائیں جن سے وہ جہنم کا ایندھن بن جائے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

۱ نفس از ہم نفس بگیرد خوے
پُر حذر باشی از لقائے خبیث

۲ باد چوں بر فضائے بد گزرد
سوئے بد گیرد از ہوائے خبیث

ترجمہ: ۱۔ ایک نفس دوسرے نفس سے خصلت لیتا ہے فلہذا خبیث انسان کے میل جول سے بچئے۔

۲۔ ہوا جب بدبو دار جگہ سے گزرتی ہے تو اس خبیث طرف سے بدبو لے کر جاتی ہے۔

ف: ابو عبید صوری نے اپنے بعض احباب کو لکھا کہ اگر تو نے اللہ تعالیٰ سے درازیٔ عمر چاہی تو پھر تیرے اندر بُرے اعمال کی آرزو بھی پیدا ہو جائے گی اب سرے سے آرزو کو ہی دبا دے۔

مسئلہ: حال کی اصلاح ہو تو پھر حُسنِ ظن بھی فائدہ دیتا ہے۔

ف: حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بہت لوگ آرزو میں پھنسے رہتے ہیں یہاں تک کہ مرتے وقت

نیکیوں سے خالی ہاتھ جاتے ہیں۔

مسئلہ ؛ جو شخص یُوں کہے کہ مجھے اللہ کی رحمت پر حُسنِ ظن ہے وہ غلط کہتا ہے جبکہ اس کے اعمال بُرے ہوں۔ چنانچہ آیت وذالکم ظنکم سے معلوم ہوتا ہے یا اللہ! ہمیں مرنے سے پہلے علم و عمل کی توفیق عطا فرما۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ یہ حکم ان اہلِ کتاب کو ہے جو ابراہیم علیہ السلام سے روگردان تھے۔ اور اَمْ منقطعہ ہے جو بل اور ہمزہ کے ساتھ مقدر ہے۔ تیسیر میں فرمایا کہ اَمْ سے پہلے اگر ہمزہ استفہام نہ ہو تو وہ بمنزلہ استفہام کے ہوتا ہے اور یہ ہمزہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ یعنی کیا تم حاضر تھے؛ شھداء شہید کی جمع ہے بمعنی حاضر۔ معنی یہ ہوا کہ تم حاضر نہیں تھے اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ یعنی اس پر موت کے علامات و اسباب پائے گئے اور روح کے خروج کا وقت قریب آیا۔

شانِ نزول جب یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کیا آپ نہیں جانتے کہ یعقوب علیہ السلام کا جب انتقال ہُوا تو اپنی اولاد کو یہودیت کی وصیّت فرمائی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم تو ان کے وصال شریف کے وقت حاضر تھے نہیں تمہیں کیا خبر کہ اُنھوں نے کیا فرمایا؛ ورنہ تم ایسا دعویٰ نہ کرتے بلکہ ملّتِ اسلام پر تمہیں حرص ہوتی۔

اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ اذ حضر سے بدل ہے اور اس کا عامل شھداء ہے مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ط یعنی میرے انتقال کے بعد تم کس کی عبادت کرو گے۔ اس سے اُن کی اسلام و توحید پر ثابت قدمی مقصود تھی۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ یعقوبؑ کا ارادہ عبادت سے عبادتِ مشروعہ کا نہیں تھا بلکہ یہ ارادہ فرمایا کہ تمہارا ہر عمل اس کی رضا کی خاطر ہو، اور جو عمل اس کی راہ سے روکے اُسے چھوڑ دو۔ گو یا انھیں اس بات کی دعوت دی کہ اپنے اعمال میں سوائے اس ذات باری تعالیٰ کی رضا کی کسی کی خوشنودی کو جگہ نہ دو اور اُن سے یہ خوف بھی نہ تھا کہ وہ بُتوں کی پرستش میں مبتلا ہوجائیں گے بلکہ اس خوف میں تھے کہ دنیوی امور میں منہمک ہو جائیں گے اسی لیے کہا جاتا ہے ؛

جو شے اللہ تعالیٰ کی راہ سے پھیر دے اس کا نام طاغوت ہے۔

اسی لیے فرمایا :۔

واجنبی ان نعبد الاصنام ۔ یعنی ما سوا اللہ کی خدمت کریں۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و میزان و زن

ترجمہ، دنیا کیا ہے اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا نہ کھیل تماشہ نہ دنیا و دولت اور نہ عورت وغیرہ۔

قاعدہ ؛ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ما عام ہے۔ یعنی ضرورت کے وقت ذوی العقول وغیرہ پر

اس کا اطلاق جائز ہے خواہ استفہام کے لیے ہو یا غیر استفہام کے لیے۔ اور سب کو معلوم ہے کہ مَن ذوی العقل و العلم کے لیے آتا ہے۔ یہی فرق ہے مَن و ما میں، کہ مَن ذوی العقول والعلوم کے لیے آتا ہے اور ما غیر ذوی العقول کے لیے۔ یہاں علامہ کا کلام ختم ہوا، یہاں اُن کے انکار کی تردید ہوگئی اور ان کے گمان کے خلاف بیان نکلا کر یعقوب علیہ السلام نے یہودیت کی نہیں بلکہ توحید کی وصیت فرمائی تھی۔

قَالُوْا گویا کہا گیا کہ انھوں نے کیا جواب دیا تو فرمایا، نَعْبُدُ اِلٰھَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ہم اس معبود کی عبادت کرتے ہیں جس کے واجب الوجود ہونے پر اور اس کی الوہیت اور عبادت پر اتفاق ہے۔

سوال: حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اس کے آباء میں کیوں گنا گیا ہے حالانکہ وہ تو یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے۔

جواب: (۱) جد کی وجہ سے تغلیباً انھیں بھی آباء میں شمار کیا گیا۔

(۲) چچا بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے جیسے خالہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے کیونکہ وہ دونوں ایک ہی تاگہ کے دانے ہوتے ہیں بوجہ اخوت کے، اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عم الرجل صنو ابیہ۔ (چچا بمنزلہ باپ کے ہے)

یعنی وہ ایک ہی ہیں، جیسے کھجور کے دو درخت ایک تنے میں ہوتے ہیں یہ بھی اسی طرح ہیں۔

اِلٰھًا وَّاحِدًا ایک ہی معبود کی پرستش کریں گے۔ الٰھاً واحداً، الٰه اٰبائك سے بدل ہے۔

سوال: اسے بدل بنانے سے کیا فائدہ؟

جواب: (۱) توحید کے متعلق پوری تصریح مقصود ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ان کا کوئی اور معبود ہوگا۔

(۲) اس وہم کا دفعیہ کہ الٰه اٰبائك سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا معبود اور ہے اور ان کا کوئی اور، اس لیے کہ الٰه کو اٰبائك سے مضاف اور پھر اسے منصوب پڑھنے سے اختصاص پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا اب یوں کہا گیا ہے کہ الٰه اٰبائك سے ہماری مراد وہ ایک معبود ہے نہ کوئی اور۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ اور ہم اسی کو ہی مانیں گے۔ یہ جملہ نعبد کے فاعل سے حال ہے۔ تِلْكَ اُمَّةٌ مذکورہ کی طرف اشارہ ہے، یعنی حضرت ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام اور اُن کی اولاد جو اہلِ توحید تھے۔ اُمَّةٌ اُمّت بمعنی مقصود، جیسے عہدہ بمعنی معہود ہے۔ جماعت کو اُمّت اس لیے کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے دینی معاملہ میں انھیں مقصود سمجھتے ہیں اور شرعی امور میں انہی کی اقتدا کرتے ہیں۔ تلک بتدا اور امۃ اس کی خبر ہے۔ قَدْ خَلَتْ وہ بھی چل بسے۔ یعنی انھیں موت نے گھیر لیا اور اپنے عزیزوں سے بچھڑ گئے۔ اصل میں خلت بمعنے جنگل کے ایسے کونے میں چلے جانا جہاں کوئی ساتھی نہ ہو۔ قد خلت، امۃ کی صفت ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ انھیں وہ ملے گا جو وہ

عمل کر گئے۔

سوال : مسند کو مسند الیہ پر کیوں مقدم کیا گیا ہے ؟

جواب : صرف اس لیے کہ مسند مسند الیہ کے لیے محصور ہے یعنی انہیں صرف وہی ملے گا جو انہوں نے عمل کیا۔
وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ اور تمہیں وہی ملے گا جو تم عمل کر رہے ہو نہ کہ کسی دوسرے کا وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ٥ ان کے اعمال کی وجہ سے تمہارا مواخذہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا :
وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا۔

(ہمارے جرموں کے متعلق تم سے سوال نہیں ہوگا) (اس طرح مجرمین کہیں گے)

شانِ نزول جب یہودیوں نے دعویٰ کیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام تو یہودیت پر مرے ہیں اور انہوں نے مرتے وقت اپنی اولاد کو بھی یہودیت پر کاربند رہنے کی وصیّت کی تھی۔ تو ان کا یوں رد کیا گیا :

ام کنتم شہداء اذ حضر یعقوب الموت۔

پھر انہوں نے کہا ہاں بات اسی طرح ہے۔ لیکن ہمیں فخر تو ہے کہ ہم ان حضرات کی اولاد سے ہیں اور ہمیں اُن کی اس نسبت سے بہت فائدہ ہوگا۔ اس کا بھی رد ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نسب کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہاں اعمالِ صالح اور تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"اے بنو ہاشم ! میرے ہاں اعمال لے کر آؤ، جس کے پاس اعمال نہیں اسے نسب کوئی فائدہ نہیں دے گا۔"

یعنی جس نے توشۂ آخرت تیار نہیں کیا، برائی میں وقت بسر کیا اور صالح عمل کوئی نہ کیا تو نسب اسے کوئی فائدہ نہ دے گا۔

فلہذا نسب پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔ کسی شاعر نے خوب فرمایا : ؎

۱ اتفخر باتصالك من علیٍّ
واصل البوسة الماء القراح

۲ ولیس بنافع نسبٌ زکیٌّ
یُدَنِّسُهٗ صنائعك القباح

ترجمہ : ۱۔ کیا تجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نسب کے اتصال کا فخر ہے ہر ایک کی اصل پانی ہے۔
۲۔ پاکیزہ نسب کوئی فائدہ نہ دے گی جبکہ اسے تیرے گندے کردار گرد آلود بنا چکے ہیں۔

ف : اگرچہ اولاد اپنے آباء کی بزرگی سے نفع پاتی ہے لیکن نفخِ صور کے بعد نسب کا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اس پر فخر کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ تو ایسے ہے جیسے کسی دوسرے کے اسباب پر فخر کا اظہار کیا جائے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو اسے پاگل کہا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نیکی میں نیتِ خالص کا ہونا ضروری ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ

نجات دلانے والی ہے۔

ایک طویل حدیث میں وارد ہے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

حدیث شریف میں نے گزشتہ شب خواب میں ایک عجیب بات دیکھی، وُہ یہ کہ میرے ایک اُمتی کے پاس ملک الموت تشریف لائے اور اس کی رُوح قبض کرنے لگے، وُہ والدین کا فرمانبردار تھا اس لیے اُسے مہلت مل گئی۔ ایک دوسرے کو دیکھا کہ اس پر عذابِ قبر کا حملہ ہُوا۔ وہ چونکہ وضو پر مداومت کرتا تھا اس لیے عذابِ قبر سے بچ گیا۔ ایک اور کو دیکھا جس پر شیاطین حملہ آور ہوئے وہ چونکہ ذکر اللہ کا عادی تھا اس لیے ان کے شر سے بچ گیا۔ ایک اور کو دیکھا جسے عذاب کے فرشتے ڈرانے لگے چونکہ وُہ نمازی تھا اس لیے عذاب کے فرشتے دُور ہو گئے۔ ایک اور کو دیکھا کہ وُہ پیاس سے جاں بلب تھا اور میرے حوض سے بھی اُسے ہٹایا گیا، وُہ چونکہ روزے رکھتا تھا اس لیے روزہ نے آکر اسے جامِ طہور پلایا اور بالکل سیراب کر دیا۔ ایک اور منظر سامنے آیا، وُہ یہ کہ انبیاءؑ علیہم السلام حلقہ بنا کر تشریف فرما تھے میرا ایک اُمتی ان کے قریب ہونا چاہتا تھا لیکن اسے دُور بھگا دیا گیا تھا، چونکہ وہ غسلِ جنابت میں کبھی سُستی نہیں کرتا تھا اس لیے اس عمل نے اسے پکڑ کر میرے قریب بٹھا دیا۔ ایک اور اُمتی کو مَیں نے دیکھا کہ اُس کے دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور وُہ اس حالت میں حیران و پریشان ہے اس کا حج اور عمرہ اُسے اُجالے میں لے گئے اور وہ ہمیشہ کے لیے مسرور و مفروح ہو گیا۔ اسی طرح ایک اور اُمتی کو دیکھا کہ وُہ مومنین سے بولتا ہے لیکن وُہ اس سے بات نہیں کرتے اس کا صلہ رحمی کا ایک عمل آیا اس نے مومنین سے کہا بھائیو! اس سے کلام ضرور کرو۔ ایک اور کو دیکھا کہ جس کے منہ پر آگ چڑھتی ہے جسے وہ ہاتھ سے ہٹاتا ہے لیکن پھر بھی اس سے بچ نہیں پاتا۔ اس کا صدقہ آ کر اسے بچا لیتا ہے اور اُس آگ کے سامنے پردہ بن کر اس کے سر پہ چھتری کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے ایک اور کو دیکھا کہ دوزخ کے فرشتے اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں لیکن اس نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عمل کیا تھا جس سے وُہ بچ گیا اور یہ دونوں عمل اُسے وہاں سے لے کر رحمت کے فرشتوں کی جماعت میں لے گئے۔ ایک اور کو دیکھا کہ وہ گھٹنوں کے بل پڑا ہے اس کے اور اللہ تعالیٰ کے مابین پردہ ہے اور وہ دیدارِ الٰہی سے محروم ہے اس کا حُسنِ خلق آیا اس نے اسے اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کر دیا۔ ایک اور کو دیکھا کہ اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑایا گیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا تھا اس لیے اس کے اسی خوف نے اس کا نامۂ اعمال لے کر اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ایک اور کو دیکھا کہ اس کے اعمال نامہ کے ترازو میں نیکی کا پلڑا ہلکا ہے تو اس کی وہ اولاد جو بچپن میں فوت ہُوئی اس کے نیکی کے پلڑے میں بیٹھ گئی۔ جس سے اس کا نیکی کا پلڑا بوجھل ہو گیا۔ ایک اور کو دیکھا کہ وُہ جہنم کے کنارے تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن وہ اللہ

سے ڈرتا تھا۔ اسی ڈر نے اسے بچا کر بہشت کے دروازے پر پہنچا دیا۔ ایک اور کو دیکھا کر اسے جہنم میں جھونکا جا رہا ہے لیکن وہ اللہ کے خوف سے گریہ کرتا تھا اس کے وہی آنسو آئے اور اسے جہنم سے بچا گئے۔ ایک اور کو دیکھا کہ وہ پل صراط سے گزر رہا ہے لیکن لرزہ طاری ہے قریب ہے کہ وہ گر کر جہنم رسید ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دُنیا میں نیک گمان رکھتا تھا اس نیک عمل کی وجہ سے لرزہ ختم ہو گیا اور پُل صراط سے باسلامت گزر گیا۔ ایک اور کو دیکھا کہ وہ پل صراط پر گزر رہا ہے۔ کسی وقت تو وہ لرزنے لگ جاتا ہے اور کبھی چلا نگیں لگاتا ہُوا جاتا ہے اور کبھی پُل صراط سے چمٹ جاتا ہے۔ اور گزر نہیں سکتا۔ اس کی نماز آئی اور اس کا ہاتھ تھام کر بسلامت پل صراط سے پار لے گئی۔ ایک اور کو دیکھا کہ وہ بہشت کے دروازے تک پہنچ گیا ہے لیکن اس کے آگے دروازے بند کیے جاتے ہیں، کلمۂ شہادت آتا ہے بہشت کے دروازے کھلوا کر اسے بہشت میں لے جاتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو شخص بھی خلوصِ قلب سے کلمۂ شہادت پڑھتا ہے وہ ضرور بہشت میں جائے گا۔

عرض کیا گیا: حضور! اخلاص کس طرح سے ہو؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے محارم سے بچ کر رہنا۔

ف : اس طویل حدیث سے معلوم ہوا کہ اگرچہ نجات اللہ تعالیٰ کے فضل سے نصیب ہوگی لیکن اس کا دار و مدار اعمالِ صالح پر ہے۔

مسئلہ : اگر بُرے عمل ہوں تو قرابت بھی کوئی فائدہ نہیں دے گی۔

سوال : کسی شاعر نے کہا: ؎

إِذَا طَابَ أَصْلُ الْمَرْءِ طَابَتْ فُرُوْعُهٗ

(جب کسی کی اصل اچھی ہے تو اس کی اولاد بھی اچھی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسب سے فائدہ حاصل ہوگا۔

جواب : یہ شعر ضابطہ کے طور پر نہیں بلکہ اکثریت پر مبنی ہے کیونکہ وہ مالک مُردے کو زندہ سے اور زندہ کو مردے سے زندہ فرماتا ہے۔ کسی نے کیا خوب فرمایا: ؎

۱ اصل را اعتبار چنداں نیست
روئے ترگل زخار خنداں نیست

۲ می زغورہ شود شکر از نے
عسل از نحل حاصلست بقے

ترجمہ: (۱) اصل کا کوئی اعتبار نہیں گل کا چہرہ کانٹے سے خوش نہیں۔

(۲) شراب نچوڑ (انگور وغیرہ) سے اور شکر نَے سے بنتی ہے شہد مکھی کی قے سے حاصل ہوتا ہے۔

ف : اگر بتی بھی ایک لکڑی ہے لیکن اس سے خوشبو مہکتی ہے۔ اگرچہ وہ بھی درخت ہے لیکن خوشبو کی وجہ سے اس کی لکڑی تمام لکڑیوں سے فائق ہوگئی۔ چونکہ اس میں اس کی استعداد ہے اسی لیے اتنا بڑا مرتبہ حاصل کرکے اپنے ابنائے جنس سے ممتاز ہوگئی۔ ایسے ہی مُشک کا حال ہے کہ وہ بھی خوشبودار ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو اپنے اصل عہدے کو سنبھال سکیں۔ اسی طرح بالعکس ہوجاتا ہے کہ باپ اگرچہ فاسق ہوتا ہے لیکن بیٹا بلند پایہ متقی۔ اس کا اندرونی فساد بیٹے پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اصل اچھی ہو تو کچھ ضروری نہیں کہ فرع بھی اسی طرح ہو۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ فرع اصل کے مطابق ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کیسے تھے اور ان کے دو صاحبزادے ہابیل و قابیل کیسے ہوئے۔ اسی طرح تاقیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا اَوْ نَصٰرٰى

شانِ نزول مدینہ کے یہود اور نجران کے سرداروں کے متعلق نازل ہوئی۔ یعنی یہود کہتے ہیں کہ یہودی ہوجاؤ۔ کیونکہ ہمارے نبی موسیٰ علیہ السلام ہیں، جو افضل الانبیاء ہیں۔ اور ہماری کتاب تورات ہے جو تمام کتابوں سے افضل ہے۔ اور ہمارا دین بھی تمام دینوں سے افضل۔ اور انھوں نے عیسیٰ اور انجیل اور سید نا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ساتھ کفر کیا۔ اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ نصرانی ہوجاؤ کیونکہ ہمارے نبی علیہ السلام تمام نبیوں سے افضل ہیں۔ اور ہماری کتاب انجیل جو افضل الکتب ہے۔ اور ہمارا دین بہتر دین ہے۔ انہوں نے بھی موسیٰ علیہ السلام اور تورات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ساتھ کفر کیا۔

تَهْتَدُوْا امر کا جواب ہے۔ یعنی اسی طرح ہو جاؤ تو گمراہی سے ہدایت پالو گے۔ قُلْ اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بطریق تردید کے فرمائیے کہ جو تم کہتے ہو ہم نہیں ہوں گے بَلْ بلکہ ہم تو ہوں گے مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ ابراہیم علیہ السلام کی ملت و دین پر۔ اصل یہاں مضاف محذوف ہے۔ فرماؤ کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے فرمانبردار ہوں گے حَنِيْفًا ہر باطل دین سے ہٹ کر دینِ حق کی طرف رجوع کرنے والے اور یہودیت و نصرانیت سے دُور رہنے والے۔ یہ مضاف الیہ سے حال ہے یعنی ابراہیم سے جیسے اس عبارت میں رأیتُ فی وجه هند ہندہ کے منہ کو دیکھنا اسے دیکھنا ہے۔ یہاں پر حال مفعول یا مضاف یعنی ملت کی ہیئت بیان کرتا ہے۔ حنیفا کو مذکر لایا گیا ہے ملت کو دین سے مؤول کرکے، کیونکہ وہ دونوں ذاتی طور پر متحد ہیں اگرچہ اعتباراً مختلف۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞ وہ مشرکین سے نہیں تھے۔ یہ جملہ بطور تعریض کے ہے اور انھیں اُن کے دعویٰ کے بطلان کا پتا دینا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے فرمانبردار ہیں تو پھر شرک کیوں کرتے ہو، وہ تو مشرک نہیں تھے تم عزیر اور مسیح علیٰ نبینا علیہما السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہو۔

مسئلہ: آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی فرمانبرداری کا حکم ہے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اور اولیائے ملت رضی اللہ تعالیٰ عنہم انہی کی ملت پر ہیں۔

قُوْلُوْٓا اے مومنو! تم انہیں کہو اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ہم اللہ واحد پر ایمان لائے وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا اور اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل ہوا۔

سوال: آیت میں قرآن کو اُمت کی طرف کیوں منسوب کیا گیا ہے؟

جواب: اُمت اپنے نبی علیہ السلام کے تابع ہوتی ہے تابع اور متبوع کا ایک ہی حکم ہوتا ہے۔

وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ اور ان صحیفوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئے اور اُن احکام پر بھی ہمارا ایمان ہے جو وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ حضرت اسمٰعیل و حضرت اسحٰق و حضرت یعقوب علیہم السلام پر نازل ہوئے وَالْاَسْبَاطِ اور جو کچھ ان کی اولاد پر نازل ہوا اُس پر بھی ہمارا ایمان ہے، اسباط، سبط کی جمع ہے اور سبط دراصل اس درخت کو کہتے ہیں جس کی بہت سی ٹہنیاں ہوں۔ اور یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد مراد ہے۔ وہ بارہ تھے۔ انھیں اسباط اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان ہر ایک کی اولاد کثرت سے ہوئی اور سبط پوتے کو کہتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے لیے اسباط کا اطلاق ایسے ہے جیسے عرب کے لیے قبائل کا اطلاق ہوتا ہے، اور شعوب عجم کے لیے۔ یعنی وہی قبیلے جو ماں اور باپ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اسباط میں انبیاء علیہم السلام تھے اُن پر صحیفے بھی نازل ہوئے۔

سوال: صحیفے تو صرف حضرت ابراہیمؑ پر اُترے پھر اسباط کی طرف صحف کی نسبت کیسی؟

جواب: چونکہ وہ حضرات سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے صحائف پر عمل کرتے ان کی طرف نسبت کا جواب وہی ہے جو وما انزل الینا میں گزرا۔ یعنی تابع اور متبوع کا ایک ہی حکم ہوتا ہے۔

وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى اور ہمارا ان کتابوں پر بھی ایمان ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام پر نازل ہوئیں، یعنی تورات و انجیل پر۔

سوال: اس آیت میں اسباط کے بعد موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کا نام خصوصی طور پر کیوں لیا گیا؟

جواب: چونکہ نبی علیہ السلام کی گفتگو یہود و نصاریٰ سے تھی اور وہ ان کے پیروکار تھے اس لیے ان کو مخصوص کر کے بیان کیا گیا۔

وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ اور ہمارا باقی نبیوں پر نازل شدہ کتب پر ایمان ہے خواہ ان کا ذکر قرآن میں ہے یا نہیں۔ مِنْ رَّبِّهِمْ ج ترکیب میں حال کے مقام پر ہے جو ایک محذوف ضمیر سے واقع ہوا۔ اصل عبارت یوں تھی:

وما اوتی النبیون منزلاً علیہم من ربھم لانفرق بین احد منھم۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ہم کسی ایک نبی علیہ السلام میں فرق نہیں کرتے سب پر ہمارا ایمان ہے یہودیوں کی طرح نہیں کہ بعض انبیاء پر ایمان لائیں اور بعض کے ساتھ کفر کریں، اور ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں جبکہ ہمارے پاس سب پر ایمان لانے کی دلیل موجود ہے کیونکہ ہمیں ان کی خبر ایسے نبی علیہ السلام نے دی ہے جس سے اللہ کی تائید سے معجزات کا صدور ہوا ہے۔ اگر ہم بعض انبیاءؑ سے کفر کریں تو پھر اپنے نبی علیہ السلام کے خلاف ہو جائیں اور ایسا ہم سے نہیں ہو سکتا۔ یہ جملہ امنا سے حال واقع ہوا ہے۔

سوال: ایمان لانے کی بات تو کتابوں کے بارے میں ہو رہی تھی اب انبیاء علیہم السلام میں فرق کرنے کا کیا مطلب۔

جواب: جب اُن کی کتابوں پر سب کا ایمان ہے تو اُن کی ذات میں تفرقہ کا کیا معنی۔ اس لیے واجب ہوا کہ تصریح ہو جائے کہ جس طرح ہمارا ان کی کتابوں پر ایمان ہے اسی طرح ان کی ذات پر بھی ہے اور ایک کے انکار سے سب کا انکار لازم آتا ہے۔

وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ اور ہم سب اسی اللہ تعالیٰ کے لیے گردن جھکانے والے ہیں۔ یعنی حال یہ ہے کہ ہم اس ذات کے لیے مخلص اور یقین رکھنے والے ہیں فَاِنْ اٰمَنُوْا اگر یہود و نصاریٰ ایمان لے آئیں بِمِثْلِ مَا مثل اس دین کے اٰمَنْتُمْ بِهٖ جس کے ساتھ تم ایمان لے آئے ہو۔ یہ تعجیب و تبکیت کے باب سے ہے۔ یعنی مخالف کو الزام دے کر اور اسے حق کے لیے اعتراف کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ معاملہ کو کچھ ڈھیلا کر کے اس کے جھگڑے کی راہ بند کرنا ہے۔ یہ لفظ مثل زاید کے ہے کیونکہ فَاِن اٰمنتم بہٖ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے اور اللہ تعالیٰ پاک ہے، نہ ہی دینِ اسلام کا کوئی مثل ہے فَقَدِ اهْتَدَوْا بیشک راہِ حق کی طرف ہدایت یافتہ ہو اور حقیقت کو پہنچ جائیں گے۔ اور نہ تم ہدایت پا گئے ہو اور تمہارے مابین اتحاد و اتفاق ہو گیا ہے وَاِنْ تَوَلَّوْا اگر جس طور کہ بیان ہوا ہے اس سے رُوگردان ہو بایں طور کہ اس میں کسی قسم کا خلل پیدا کر دیں کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض سے کفر کریں جیسا کہ ان کا طریقہ ہے فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ یعنی وہ خلاف عظیم میں حق سے بالکل دُور ہیں اس سے ازالہ توہم کیا گیا کہ شاید اُن سے اتحاد کا یہ معنیٰ ہے کہ بعض باتوں کو وہ مان جائیں تو پھر تم ان سے مل جاؤ۔ ایسا ہرگز نہ ہو بلکہ جب تک وہ تمام اسلام کی باتوں کا اعتراف نہ کر لیں تم ان سے ملنے کا نام تک نہ لو۔ فی شقاق خبر اور هُم مبتدا ہے اور فی شقاق، هُم کی ظرف بھی ہے اور هُمْ، فی شقاق کا مظروف ہے۔ بطور مبالغہ کے ایسا کیا گیا کہ وہ اتنے شریر ہیں کہ اختلاف ان پر سوار ہے۔ یہ وَهُمْ، شَاقّون سے زیادہ بلیغ ہے۔ شقاق، شق سے مشتق ہے بمعنی جانب، گویا ایک گروہ دوسرے گروہ کی جانب دوسرے کنارے پر ہے بوجہ عداوت کے، اور شقاق کی تنکیر بتاتی ہے کہ اُن سے موافقت کا صدور ممتنع ہے کیونکہ ان کا کام جدال و قتال ہی ہے اور بس۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دی اور اہلِ اسلام کو خوش فرمایا کہ ان کو نصرۃ اور

غلبہ کا وعدہ دیا اور تائید و اعزاز کا ارشاد فرمایا فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ ج کا سین تاکید کے لیے ہے جو دلالت کرتا ہے کہ جو وعدہ دیا گیا وہ ضرور ہو کر رہے گا۔ چنانچہ فرمایا ،پس عنقریب تمہاری اُن سے کفایت کرے گا۔

حلِ لغات فسیکفیکھم اللہ کی دونوں ضمیریں منصوب المحل ہیں اس بنا پر کہ یہ دونوں یکفی کا مفعول ہیں جیسے کہتے ہیں ، کَفَاهُ مَئُونَتَهٗ كِفَايَةً ۔ اگرچہ اس کا استعمال متعدی بیک مفعول سے ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے ، كَفَاكَ الشَّيْءُ ۔ اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ کا ایفا فرمایا کہ بنو قریظہ کو قتل و قید کرایا اور بنی نضیر کو شام کی طرف جلا وطن کیا اور جزیہ و ذلت نجران کے نصاریٰ کو دی۔

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ط اور وہ اللہ سمیع و علیم ہے۔ وعدہ کے ایفاء کی طرف اشارہ ہے۔ پھر اس کی تاکید بھی ہے۔ کیونکہ معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری سنتا ہے اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا دین غالب ہو تو وہ تمہاری توبہ قبول کر کے تمہیں اپنے مقصود تک پہنچائے گا۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ ج

حلِ لغات الصبغ جس سے کپڑا رنگا جائے۔ اور صبغ مصدر ہے اور صبغۃ بروزن فعلۃ ہے۔ نوع و حالت کے لیے ہے الصبغ سے جیسے جلسۃ از جَلَسَ ، یعنی وہ حالت جس پر رنگ واقع ہو۔ اور صبغۃ آیت ہذا میں مستعار ہے اس فطرۃ سے جس پر لوگوں کو پیدا کیا۔ خلقتِ سلیمہ (کہ جس سے انسان ایمان و دیگر عبادات کی استعداد حاصل کرتا ہے) کو کپڑے سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ جیسے رنگ زیب و زینت کا سبب ہے ویسے ہی یہ فطرت بھی روحانی زیب و زینت کا سبب ہے۔ اصل عبارت یوں تھی ، صبغنا اللہ صبغۃ (ہم نے اس کو ہی فطرت پر پیدا کیا ہے) کہ اس کی استعداد سے حق اور ایمان کو قبول کرتا ہے صبغۃ مصدر اور مفعول مطلق مؤکد لنفسہ ہے کیونکہ یہ اپنے عامل مقدر سے مل کر بعینہٖ وہی جملہ مقدرہ کا مضمون بن جاتا ہے۔

اٰمنّا باللہ اور اس کے سوائے مصدری معنے کے اور کوئی معنیٰ نہیں بنتا کیونکہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ان میں اسی استعداد کی بنا پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان میں پیدا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعے وُہ ایمان کے نور سے آراستہ ہوئے ہیں۔

اس کا معنیٰ یُوں بھی ہوسکتا ہے کہ طَهَّرَنَا اللّٰهُ تَطْهِيرَةً ، یعنی ہم نے انھیں پورے طور پر پاک کیا اس لئے کہ ایمان کفر کی تمام غلاظتوں سے پاک کرتا ہے۔ مشاکلۃ کی وجہ سے اسے صبغۃ سے تعبیر کیا گیا ہے اس لئے کہ وُہ شے اسی غیر کی صحبت میں ہے یا تو وُہ غیر محقق طور پر مذکور ہو یا مقدر ہو۔ اور مقدر بھی مذکور کے حکم میں ہوتا ہے کیونکہ اس پر قرینہ دلالت کرنے والا ہوتا ہے یا جیسے دو اسموں کے مابین جاری ہوتا ہے اسی طرح دو فعلوں کے مابین جاری ہوتا ہے۔ جیسے تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك ۔ اللہ تعالیٰ پر لفظِ نفس کا اطلاق

کیا گیا ہے جبکہ وہ نفس کے لفظ کے مقابلہ میں واقع ہوا ہے۔ اسی طرح فطرۃ کو صبغۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نصارٰی کے صبغۃ کے مقابلہ میں واقع ہُوا ہے کہ وہ ساتویں دن اپنے بچّوں پر رنگ ڈالتے، بجائے ختنہ کرنے کے۔ کیونکہ مسلمان اپنے بچّوں کا ختنہ کرتے ہیں اور وُہ اپنے بچّوں پر پیلا رنگ ڈالتے ہیں۔ وہ اسے معمودیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ پانی میں غوطہ دینے کا اگرچہ ذکر نہیں۔ چونکہ ان کا فعل ہی ایسا تھا اس لیے وُہ مذکور ہے قرینہ حالیہ سے معلوم ہو رہا ہے اور پھر آیت ان کے رَد میں نازل ہُوئی ہے کہ تمہارا رنگدار کرنا بے سُود ہے۔ اصل میں رنگ اللہ تعالیٰ کا چاہیے کہ وُہ اپنے بندوں کو پاک کرتا ہے نہ کہ بچّوں کو معمودیہ (حنا) میں ڈبو دینے سے۔ معمودیہ ایک پانی کا نام ہے جس سے عیسٰی علیہ السّلام نے غسل فرمایا۔ انہوں نے اسے دوسرے پانی میں ملا دیا تھا۔ جب بھی کسی کو رنگدار کرتے تو اس میں دوسرے پانی کی ملاوٹ سے غوطہ دیتے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مبتدا خبر میں یہ استفہام انکاری ہے۔ یعنی کون زیادہ اچھا ہے مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً صبغۃً منصوب اور احسن سے تمیز ہے۔ مبتدا سے منقول ہے۔ اصل یُوں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صبغۃ سے اور کون زیادہ احسن ہے۔ یہ تفصیل صبغتین میں ہے نہ کہ فاعلین میں۔ اب معنٰی یہ ہُوا کہ اللہ تعالیٰ کی صبغۃ سے اور کون زیادہ احسن ہو سکتا ہے کیونکہ وُہ اپنے بندوں کو ایمان سے رنگدار کر کے انھیں کفر کے زنگ سے پاک کرتا اور شرک سے بچاتا ہے۔ بنا بریں اس سے کوئی اور زیادہ احسن نہیں ہو سکتا۔ وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ اور ہم اسی کے لیے ہی عبادت گزار ہیں یعنی اس ذات کے لیے جس نے ہمیں نعمتوں سے نوازا۔ اس کی شکر گزاری کے لیے بلکہ تمام نعمتوں کی وجہ سے ہم اس کی عبادت کرتے ہیں۔ ظرف کی تقدیم، اس کی اہمیّت اور فواصل کی رعایت کی وجہ سے ہے۔ اس کا عطف اٰمَنَّا پر ہے اور یہ امر قُوْلُوْا کے تحت ہے۔ جب بندے کا کام عبادت گزاری ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے نفس کو اچھے رنگ سے رنگ کر مزیّن کیا اور جملہ عیوب سے دور رکھا۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

صبغۃ اللہ نام آں رنگِ لطیف

لعنۃ اللہ بُوئے ایں رنگِ کثیف [1]

ترجمہ: صبغۃ اللہ اس لطیف رنگ کا نام ہے اور لعنۃ اللہ اسی رنگِ کثیف کی بد بُو ہے۔

---

[1] مطبوعہ پارہ پر اشعار غلط اور ادھورے ہیں، صحیح یُوں ہیں: ؎

۱ کو گُل رنگ از برون مرد را — از درون چوں رنگ سرخ و زرد را

۲ رنگ ہائے نیک از خُمِ صفاست — زشتاں از سیاہابۂ جفاست

۳ صبغۃ اللہ نام آں رنگِ لطیف — لعنۃ اللہ بُوئے ایں رنگِ کثیف

ترجمہ: (۱) کسی کا وہ گلِ رنگ جو باہر سے نظر آتا ہے در اصل اندرونی سُرخ و زرد رنگ کا نتیجہ ہے (۲) مٹکا صاف ہو تو رنگ بھی صاف ہو گا، گندے رنگ در اصل غلط کرداری کی وجہ سے ہیں (۳) صبغۃ اللہ اسی لطیف رنگ کا نام ہے لعنۃ اللہ اس

تفسیر صوفیانہ وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ میں اشارہ ہے کہ عارفین صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی عبادت کرتے ہیں۔ زبور میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوگا جو میری عبادت محض اس لیے کرتا ہے کہ میں اسے جنّت دُوں اور دوزخ سے بچاؤں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میں بہشت و دوزخ کو پیدا نہ کرتا تو وہ میری عبادت ہی نہ کرتا۔

ف: عابد وُہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو معبود سمجھ کر صرف اس کی رضا طلبی کے لیے عبادت کرے اور بس۔ عبادت درجہ میں عبودیت سے کم ہے اور عبودیت عبودۃ سے کم ہے۔ کیونکہ جو اپنے مالک پر روح کو قربان کر دے اس کا نام عبودۃ ہے۔ اور عبادۃ یہ ہے کہ وُہ اپنے مالک کی مرضی میں نفس کو قربان کرے۔ اس لحاظ سے عبادت کا درجہ عبودۃ سے کم ہُوا۔

حضرت سہیل بن عبد اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عبادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک چار چیزوں پر عمل نہ کیا جائے:

۱۔ بھُوک ۲۔ ننگ ۳۔ فقر ۴۔ ذلّت

حضرت شیخ ابوالعباس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندے کے لیے چار ضروری اوقات ہیں:

۱۔ طاعت ۲۔ معصیت ۳۔ نعمت ۴۔ مصیبت

ان سب میں عبودیت کا حق ہے۔ حق تعالیٰ بحکم ربوبیت ان میں سے اپنا حق چاہتا ہے۔ جسے نعمت نصیب ہو اس کے لیے شکر کرنا ضروری ہے اور اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے قلبی فرحت کا اظہار کرے، اگر مصیبت آئے تو صبر کرے۔ بندے کو چاہیے کہ اپنی عبادت کی ادائیگی میں سُستی نہ کرے تاکہ بلند درجات حاصل ہوں۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱	کافرم من گر زیاں کردست کس	دورۂ ایمان طاعت یک نفس
۲	سر شکستہ نیست ایں سر را مبند	یک دو روزہ جہد کن باقی بخند
۳	تازہ کن ایمان نہ از گفت زبان	اے ہوا را تازہ کردہ در نہاں
۴	تا ہوا تازہ است ایمان تازہ نیست	کیں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

ترجمہ: ۱۔ میرے نزدیک وُہ کافر ہے جو ایمان و طاعت میں پل بھر بھی نقصان کرتا ہے۔

۲۔ یہ سر شکستہ نہیں اس کا سر بند کر ایک دو دن کوشش کر پھر زندگی بھر خوشی سے گزار۔

۳۔ ایمان کو صرف زبان سے نہیں حقیقی طور تازہ کر تو تو اندر سے خواہشات سے پُر ہے۔

۴۔ جب تک خواہشاتِ نفسانی تازہ ہیں ایمان تازہ نہیں ہو سکتا یہ خواہشات تو ایمان کی نورانیت کا تالہ ہیں۔

حکایت حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں بیس سال خلقِ خدا کے تجسس میں رہا۔ صرف ایک ہی بندۂ خدا مجھے ملا۔ وُہ جامع مسجد بغداد میں جمعہ کا خطبہ دیتا تھا۔ میں نے کہا مجھے اس ضعیف پر بڑا تعجب ہے کہ اپنی

بڑی طاقت والے کی نافرمانی کرتا ہے۔ جب کل صبح ہفتہ کے دن میں نے صبح کی نماز ادا کی تو ایک نوجوان آیا اور اُس کے پیچھے چند سوار تھے جن کے آگے آگے حسین نوجوان لڑکے اور وُہ خود بھی سواری پر تھا میرے قریب آکر سواری سے اترا اور پوچھا سری سقطی کہاں ہیں؟ میرے ساتھیوں نے میری طرف اشارہ کیا مجھے السلام علیکم کہہ کر بیٹھا اور کہا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ مجھے اُس ضعیف سے تعجب ہے جو اپنے سے قوی کی نافرمانی کرتا ہے۔ اس سے آپ کی مراد کیا ہے۔ میں نے کہا: تمام ابنِ آدم سے بہت کمزور اور کون ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمام بڑی قوت والوں سے قوی ہے ابنِ آدم اپنی کمزوری کے باوجود اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ یہ سُن کر اس نے ایک درد بھری آہ سے کہا کہ بھلا بتاؤ مجھ جیسے گناہوں میں غرق شدہ کے گناہ معاف کرے گا کہا اے سری سقطی! آپ کو معلوم ہو کہ میں بڑا مُجرم و گنہگار ہوں اور مجھ پر حقوق العباد لا تعد ولا تحصیٰ ہیں۔ اب میں کیا کروں۔ میں نے کہا: جب تیرا ارادہ اسی ذات کو راضی کرنے کا مکمل ہو جائے گا تو وُہ تیرے حقدار سے تیری معافی کرا کے تجھے بخش دے گا۔

حدیث شریف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل قیامت میں اللہ تعالیٰ کے بندے کے جب حقدار جمع ہوں گے تو ان کے لیے ایک فرشتہ آکر کہے گا اس بندہ کو کچھ نہ کہو تمہارے معاملے اللہ کے سپرد ہو گئے۔

سری سقطیؒ فرماتے ہیں جب میں نے اُسے یہ حدیث سنائی تو وہ بندۂ خدا رونے لگا اور کہنے لگا: اب مجھے اللہ تعالیٰ سے ملنے کا راستہ بتائیے۔ میں نے اسے کہا اگر سالکین کا راستہ چاہتے ہو تو دن کو روزے رکھو اور رات کو جاگو اور گناہوں کو چھوڑ دو۔ اور اگر تجھے ولیوں کا راستہ چاہیے تو مخلوق سے علیحدگی اختیار کر کے صرف اللہ تعالیٰ کے ہو جاؤ۔ یہ بات سُن کر وُہ خوب رویا اور اس کا رومال آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ مجھ سے فارغ ہو کر اہل و عیال چھوڑ کر چین او رقرار ختم کر کے گورستان میں رہنے لگا۔ نہایت مغموم و محزون رہتا اور اسی حالت میں فوت ہو گیا۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا کہ ریشمی لباس میں نہایت فخر و ناز سے بہشت میں ٹہل رہا ہے۔ اور مجھے دیکھ کر کہنے لگا: اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ میں نے پوچھا: کیسی گزری؟ کہا: مجھے اللہ تعالیٰ نے مرتے ہی بہشت میں داخل فرما دیا اور گناہوں کا نام تک نہیں لیا۔

تفسیر عالمانہ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا

حل لغات: المحاجۃ بمعنی مجادلہ و دعویٰ حق؟ اور اس پر جانبین سے ہر ایک کی دلیل قایم کرنا۔ ہمزہ انکار و توبیخ کے لیے ہے۔

شانِ نزول اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ انبیاء علیہم السلام ہم میں سے اور ہمارے دین پر تھے۔ اور ہمارا دین سب سے پہلے ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا اے

میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! یہود ونصاریٰ سے فرمائیے کیا تم ہمارے ساتھ مجادلہ ومخاصمت کرتے ہو فِی اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں اور دعویٰ کرتے ہو کہ ہمارا دین حق ہے یعنی یہودیت ونصرانیت، پھر اس پر دخولِ جنت اور ہدایت کی امید رکھتے ہو۔ لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودًا او نصٰرٰی۔ اور کبھی کہتے ہو: کُونُوا ھُودًا اونصٰرٰی۔ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ حالانکہ جھگڑے کی کوئی بات ہی نہیں کیونکہ وہی ہمارے اور تمہارے تمام امور کا مالک ہے۔ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا ہمارے لیے نیکی ہے جو اس کے امر کے موافق ہے وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ تمہارے لیے تمہاری برائی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مخالف ہے پھر کیوں دعویٰ کرتے ہو کہ تم اولیٰ ہو وَنَحْنُ لَہٗ اور ہم اللہ تعالیٰ کے لیے مُخْلِصُوْنَ ۙ اس کی عبادت میں مخلص ہیں کہ ہمیں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے کسی کی طلب نہیں۔ پس تم کیسے دعویٰ کرتے ہو اور اپنے مذہب کی حقیقت پہ کیوں جھگڑتے ہو اور اس کے سبب دخولِ جنت کی امید کیوں رکھتے ہو اور لوگوں کو اس کی طرف کیوں بلاتے ہو حالانکہ اصل میں تم مشرک ہو۔ اخلاص بمعنی عمل کو شرک وریا سے پاک رکھنا۔ دراصل اخلاص کا معنی ہے اپنے فعل کو مخلوق کے ریاء سے پاک رکھنا۔ اَمْ تَقُوْلُوْنَ ام ہمزہ کا عوض ہے جو کہ احتجاجونہ میں ہے۔ امر کے مقام میں واقع ہے۔ اب مطلب یوں ہوا کہ تم دو امروں میں سے کسے پسند کرتے ہو یا تو حجت اور دلیل مضبوط پیش کرو کہ واقعی تم حق پر ہو جیسے کہ تمہارا گمان ہے یا یہ مانو کہ تم اندھی تقلید میں پھنسے ہوئے ہو اور خواہ مخواہ انبیاء علیہم السلام پر افتراپردازی کرتے ہو۔ اور یہ کہتے پھرتے ہو کہ بیشک ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب یہود ونصاریٰ تھے۔ اِنَّ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ، اسباط یعنی یعقوب علیہ السلام کے پوتے، یعنی ان بارہ صاحبزادوں کی اولاد۔

زجاج فرماتے ہیں کہ اسباطِ اسحٰق بمنزلہ قبائل کے ہے۔ یعنی اسحاق علیہ السلام کی اولاد کو سبط اور اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کو قبیلہ کہتے ہیں۔

کَانُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ تم کہتے ہو کہ وہ حضرات یہود ونصاریٰ تھے (معاذ اللہ) اور ہم ان کے مقتدی ہیں۔ آیت میں ان دونوں باتوں کا انکار ہے اور ان کو توبیخ ہے۔ یعنی اے یہود ونصاریٰ! ان انبیاء علیہم السلام کے لیے یہ باتیں کیوں کہتے ہو جبکہ وہ تورات وانجیل کے نزول سے پہلے گزر چکے ہیں۔ جب وہ تم سے پہلے گزر چکے ہیں تو پھر وہ کیسے یہود ونصاریٰ تھے اور تم کیسے ان کے مقتدی ہوئے۔ قُلْ ءَاَنْتُمْ استفہام تقریر وتوبیخ کے لیے ہے غرض کیا تم ان کے دین کو زیادہ جاننے والے ہو اَمِ اللّٰہُ ؕ یا اللہ تعالیٰ زیادہ علم والا ہے وَمَنْ اَظْلَمُ اور کون زیادہ ظالم ہے۔ اس میں یہ بات ہے کہ تم میں سے اور کوئی زیادہ ظالم نہیں۔ استفہام بمعنی نفی ہے۔ مِمَّنْ کَتَمَ چھپاتا ہے یعنی اس سے کون زیادہ ظالم ہے جو حق کو چھپاتا ہے شَھَادَۃً شہادت کو جو ثابت ہے، عِنْدَہٗ جو اس کو معلوم ہے مِنَ اللّٰہِ یعنی اللہ سے گواہی چھپانے والا بہت بڑا ظالم ہے۔ عندہٗ اور من اللہ دونوں صفتیں ہیں۔ ان کا موصوف شہادت ہے۔ یعنی ایسی شہادت جو اسے معلوم ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے صادر ہونے والی؛

یعنی اے اہلِ کتاب! تم شہادت کو جانتے ہو اور تمہیں حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ہی صادر ہونے والی ہے کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد (علیہم السلام) پکے سچے مسلمان تھے اور اس کی خبر اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری کتاب میں بیان فرمائی ہے جسے تم چھپاتے ہو اور حقیقی گواہی کے خلاف ظاہر کرتے ہو۔ اس لحاظ سے تم بیں سے اور کون زیادہ ظالم ہے کہ تم اللہ کی تکذیب کی جرأت کرتے ہو جبکہ اُس نے کچھ کہا ہے اور تم کچھ اور اس کے خلاف بیان کرتے ہو اور اظلمیت کو مطلق کتمانِ شہادت سے معلق کیا گیا ہے۔ اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص حق کو عمداً مخفی رکھتا ہے اس کی سزا اتنی زیادہ ہے کہ دائرۂ بیان سے باہر ہے۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کردار سے بے خبر نہیں ہے۔

حدیث شریف حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کبیرہ گناہوں سے ہے شرک اور جھوٹی گواہی اور شہادت کو چھپانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو حق کو چھپاتا ہے اس کا دل آثم ہے۔" (یعنی اس کا دل مسخ ہو جائے گا۔ نعوذ باللہ من ذلک)

تِلْكَ اُمَّةٌ یعنی انبیاء علیہم السلام کی جماعت قَدْ خَلَتْ گزری ہے موت کے ذریعے لَهَا مَا كَسَبَتْ ان کے لیے وہ اعمالِ صالح ہیں جو انہوں نے کئے وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ اور تمہارے لیے وہ اعمال جو تم کر رہے ہو۔ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ یعنی کوئی کسی کے عمل سے نہ پوچھا جائے گا ہر ایک اپنے عمل سے سوال کیا جائے گا۔ پھر اسے جزا دی جائے گی۔

سوال: آیت کا تکرار کیوں ہے؟

جواب: مبالغہ ہے اُن کی تردید میں کہ تم جو اپنے آباء کے کردار کی وجہ سے فخر کر رہے ہو بے جا ہے۔ انہیں ڈر سنایا جا رہا ہے کہ تم اپنے اعمال کا محاسبہ کرو ورنہ تمہیں اپنے نسب کا تعلق کوئی فائدہ نہیں دے گا، اس لیے کہ جب نفخ صور ہو گا اس کے بعد تو نسب ختم ہی ہو جائے گا۔

حکایت ہارون الرشید حج سے فراغت کے بعد چند روز کے لیے کوفہ میں مقیم ہوا۔ جب وہ باہر نکلا تو اسے راستے میں بہلول مجنون ملے انہوں نے باآوازِ بلند تین بار کہا: اے ہارون الرشید۔ ہارون الرشید نے تعجباً پوچھا: کون ہے جو مجھے پکار رہا ہے؟ لوگوں نے کہا: بہلول مجنون۔ ٹھہر کر حکم دیا کہ پردہ ہٹا دو۔ اس کی عادت تھی کہ لوگوں سے باپردہ ہو کر کلام کرتا تھا۔ اس نے بہلول سے کہا: کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ بہلول نے جواب دیا: جانتا ہوں، تو وہ ہے کہ اگر کوئی مشرق میں ظلم کرے اور تو مغرب میں ہو تب بھی تجھ سے اللہ تعالیٰ اس کے متعلق پوچھے گا۔ ہارون الرشید نے کہا: تو میرا حال کیسے جانتا ہے؟ بہلول نے کہا: میں تیرے حال کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس میں ہے کہ ابرار جنت میں ہوں گے اور فجار جہنم میں۔ ہارون الرشید نے کہا: ہمارے اعمال کس طرح ہوں گے؟ بہلول نے کہا: اللہ تعالیٰ متقین کے اعمال قبول فرماتا ہے۔ ہارون الرشید نے کہا: ہماری قرابت جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کا کیا حال ہو گا؟ بہلول نے کہا: جب نفخ صور ہو گا تو تمام حسب نسب منقطع ہو جائیں گے۔

ہارون الرشید نے کہا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کہاں جائے گی؟ بہلول نے کہا: اس دن شفاعت نفع نہیں دے گی مگر اللہ تعالیٰ جس کے متعلق اجازت دے گا اور جس سے وُہ راضی ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اعمالِ صالح میں خلوص ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے اعمال کو قبول کرے گا۔ جنید قدس سرّہٗ فرماتے ہیں کہ اخلاص اور بندہ کے مابین راز ہے کہ فرشتے کو بھی پتا نہیں چلتا کہ اسے لکھ سکے۔ نہ ہی شیطان کو خبر ہوتی ہے کہ اسے خراب کر سکے۔

مسئلہ: فضیل فرماتے ہیں کہ عمل کو لوگوں کی خاطر ترک کرنا بھی ریا ہے اور لوگوں کی خاطر عمل کرنا شرک ہے لیکن اخلاص دونوں کو خلاصی دیتا ہے۔

مسئلہ: تاتارخانیہ میں ہے نماز شروع تو کی خلوص سے لیکن بعد میں ریاء کا دخل ہوا تو وہ ریاء نہیں۔ ریاء یہ ہے کہ اگر لوگوں سے علیحدہ ہوتا تو نماز نہ پڑھتا۔

مسئلہ: لوگوں کے سامنے ہوتا ہے تو نماز اچھی کر کے پڑھتا ہے لیکن تنہائی میں ایسا نہیں کرتا تو اسے نفس صلوٰۃ کا ثواب تو ملے گا لیکن احسان کا درجہ اسے نصیب نہیں ہوگا۔

حکماء فرماتے ہیں اس شخص (جو ریاء کی طاعت کرتا ہے) کی مثال ایسی ہے جو بازار کی طرف اپنا دامن کنکریوں سے پُر کر کے نکلتا ہے تو لوگ دیکھ کر کہتے ہیں دیکھئے اس کا دامن بھرا ہوا ہے۔ اسے اس میں کوئی فائدہ نہیں، صرف لوگوں کی باتیں ہی سنتا رہے گا اور بس۔

حدیث شریف میں ہے کہ اپنے اعمال کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان اعمال کو قبول کرتا ہے جو صرف اسی کے لیے کیے جائیں۔ اور یوں بھی نہ ہو کہ یہ عمل اللہ تعالیٰ اور صلہ رحمی کی خاطر ہو۔ اللہ تعالیٰ سے اس میں کوئی ثواب نہیں۔

مشارق الانوار میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے لعنت کرتا ہے جو غیر اللہ کی خاطر ذبح کرتا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں: غیر اللہ کے لیے ذبح کا مطلب یہ ہے کہ اس کی خاطر ذبح کیا جائے۔ مثلاً بت کے لیے یا موسیٰ علیہ السلام وغیرہ کے لیے۔

مسئلہ: شیخ ابراہیم مرادوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ بادشاہ کے استقبال کی خاطر اس کی تقریب کے لیے ذبح کرتے ہیں اہلِ بخارا کا فتویٰ ہے کہ وہ حرام ہے کیونکہ یہ بھی "ما اهل لغير الله به" میں داخل ہے۔

امام رافعی فرماتے ہیں کہ یہ حرام نہیں کیونکہ یہ تو صرف خوشی کی خاطر ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے بچّے کی ولادت میں عقیقہ کی خوشی میں ذبح کیا جاتا ہے اور یہ حرام نہیں ہے۔ اسی پر مسلمانوں کے افعال کو نیکی پر محمول کرنا چاہیے تاکہ وہ کفر سے بچیں اور ان کے اعمال ضائع نہ ہوں کیونکہ موحد کا مطمحِ نظر مولا کی رضا اور اس کی عبادت ہی ہوتی ہے جس طرح بھی جو عبادت میسر ہوئے۔ (اللهم اعصمنا من الزلات) (اے اللہ! ہمیں لغزشوں سے محفوظ رکھ)

حاشیہ آئندہ صفحہ پر

تحقیق اُویسی غفرلہٗ: الحمد للہ امام رافعی رحمہ اللہ نے صدیوں پہلے وہی فرمایا جو آج امام احمد رضا قدس سرہٗ فرما رہے ہیں اور مخالفین بادشاہ کی دعوت والے قول کی آڑ میں مسلمانوں کی بہت سی نیکیاں برباد کا فتویٰ بلکہ انہیں مشرک گردان رہے ہیں اس موضوع پر مفصل بحث فقیر کی کتاب "فیصلۂ حق و باطل" میں ہے بقدرِ ضرورت یہاں عرض ہے۔

مخالفین کی تقریر: جس طرح بادشاہ کی دعوت میں بادشاہ کی خوشنودی سے جانور حرام ہو گیا ایسے ہی میلاد، گیارہویں، پیر کا بکرا اور دیگر وہ اشیاء جس سے پیروں فقیروں کی خوشنودی کو دخل ہو اگرچہ اس پر اللہ تعالیٰ کا نام بھی آیا ہو جیسے بادشاہ کی دعوت "وما اھل لغیر اللہ بہ" سے۔

جواب ۱: بادشاہ کی دعوت کا قول مرجوح ہے۔ راجح قول فقہ حنفی میں امام رافعی رحمہ اللہ کا ہے جو اوپر مذکور ہوا ہے اور اس کی علت بھی واضح فرمادی جو روحِ اسلام کے عین مطابق ہے اور مرجوح قول اسلامی اصول کے بھی خلاف ہے کہ مسلمان کی نیت پر حملہ کے علاوہ بدظنی اور محبوبانِ خدا سے رابطہ جوڑنے کے بجائے توڑنے والی بات کرتے ہیں مخالفین ان سے رشتہ توڑ چکے ہیں وہ توڑنے والی بات کریں تو انہیں سلامت۔

۲۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اولیاء کرام کی خوشنودی و رضا کو بادشاہ کی خوشنودی پر قیاس، قیاس مع الفارق ہے اس لیے کہ رضائے مصطفیٰ اور رضائے اولیاء عین رضائے خدا ہے اسی کو ہم عین اسلام سمجھتے ہیں اور مخالفین اسے شرک سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم اپنے فتویٰ کے مطابق حق پر ہیں اور مخالفین منافقین کے نقشِ قدم پر کہ وہ بھی رضائے مصطفیٰ سے روگرداں ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں تنبیہ فرمائی، ولو انھم رضوا ما اتاھم اللہ ورسولہ اور فرمایا، واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ۔ ان کا یہ فتویٰ غلط بھی ہے کہ غیر اللہ کی رضا جوئی و خوشنودی کی طلب شے کو حرام کر دیتی ہے تو پھر مہمان نوازی بھی حرام ہو اور فقراء و مساکین اور غرباء و مسلمین کو خوش کرنا حرام اور ماں باپ، استاذ، مرشد اور دیگر جملہ اہلِ اسلام کو خوش کرنا حرام ہو بلکہ روحِ اسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است

لیکن مخالفین اسلام کی روح کو مجروح کرتے ہیں کیونکہ منافقین کے وارث جو ہیں۔

عبارتِ فقہاء کرام کا جواب: جن فقہاء کرام نے بادشاہوں کی دعوت کا کہا ہے وہ ان کے دور کے مطابق ہے کہ ظالم بادشاہ جہاں جاتے غرباء و مساکین کے اوپر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے کہ ان کی دعوتوں پر غرباء و مساکین کے جانور ظلماً پکڑ کر دعوتیں اڑائی جاتیں ایسے ظالموں کی دعوت کے جانوروں کا فتویٰ حرمت ہو تو مبنی بر صواب ہے نہ کہ صلاح الدین ایوبی اور عالمگیر اور نور الدین اور سلطان محمود رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے بادشاہ جو بظاہر امیر لیکن درحقیقت فقیر (اولی اللہ) تھے۔

جوابِ استدلال: آیت "وما اھل لغیر اللہ بہ" سے ان کا استدلال ایسے غلط ہے جیسے وہ خود غلط ہیں۔ فقیر نے اس آیت کی تشریح اسی تفسیر فیوض الرحمٰن ترجمہ

روح البیان کے پارہ ۲ کے حاشیہ میں لکھ دی ہے۔ یہاں بقدر ضرورت حاضر ہے۔

یہ آیت قرآن مجید میں چار جگہ ہے۔ تمام جگہوں میں الفاظ کے تقدم و تاخر کا فرق ہے۔ مطلب ایک ہے۔ فقیر پ ۶ رکوع ۵ (کنز الایمان) امام احمد رضا خان قدس سرہ کے ترجمہ و تفسیر سمیت مختصر عرض کرتا ہے۔ آیۂ مبارکہ یوں ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَ	تم پر حرام ہے مردار اور خون اور سور کا
لَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ	گوشت اور وہ جس کے ذبح میں غیر
اللّٰهِ بِهٖ	خدا کا نام پکارا گیا۔

ف: اصل مطلب یہی ہے جو اعلیٰحضرت امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جملہ تفاسیر و مباحث کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے "کنز الایمان" میں لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہے "جس کے ذبح میں غیر خدا کا نام پکارا گیا" اور یہی معنیٰ عقل و نقل کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ اس میں ان مشرکین کا رد ہے جو بوقت ذبح "بسم اللات والعزّٰی" پکارتے تھے لہذا اس کے بالمقابل بوقت ذبح بسم اللہ اللہ اکبر کی تعلیم دی گئی۔ یہی مفہوم و مطلب قرن اول سے تاحال کے جملہ محققین و مفسرین (صحابہ، تابعین، تبع تابعین وغیرہم) نے بیان فرمایا جن کے اسماء گرامی اور چند عبارات فقیر نے پ ۲ کی تفسیر آیت ہذا میں نقل کیے ہیں لیکن افسوس کہ مخالفین کسی کی بھی نہیں مانتے۔

تحریفِ قرآن: مخالفین کے تراجم و تفاسیر (نام نہاد) پڑھیں تو وہ آیت قرآنی "وَمَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" میں تحریف کر کے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کرام سے منسوب مثلاً میلاد شریف اور عرس و گیارہویں پر چسپاں کر کے حرام ٹھہراتے اور یہ تأثر دیتے ہیں کہ ان پر چونکہ غیر اللہ کا نام دیا گیا ہے اس لیے یہ حرام ہے۔ (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ)

خلاصہ: آیۂ مبارکہ کا مذکور مفہوم بیان کرنا اس کی معنوی تحریف کے مترادف ہے کیونکہ اس کا اگر بوقت ذبح کے نام کا اطلاق و استعمال ہوتا ہے تو کیا منکرین گیارہویں ان سب کو حرام قرار دیں گے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر صرف گیارہویں ہی کو کیوں نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کیا یہ محض بغض و عناد کا مظاہرہ نہیں ہے؟

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے استاذِ محترم حضرت ملا جیون رحمہم اللہ صاحب نور الانوار و تفسیر احمدی کی تحقیق وَمَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے تحت اختصار کے باوجود بہت جامع و قولِ فیصل ہے۔ فرماتے ہیں اس کا معنیٰ یہ ہے کہ "جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے مثلاً لات و عزیٰ وغیرہ (جیسا کہ مشرکین کا طریق تھا) لیکن اگر بسم اللہ اللہ اکبر کہنے اور جانور کو لٹانے سے پہلے یا ذبح کے بعد غیر اللہ کا نام لے تو کوئی حرج نہیں جیسا کہ "ہدایہ" میں مذکور ہے اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ اولیاء کرام کے ایصالِ ثواب کے لیے جو گائے کی نذر مانی جاتی ہے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں اہلِ اسلام کا دستور ہے تو یہ حلال و طیب ہے اس لیے کہ بوقتِ ذبح اس پر غیر اللہ کا نام